حقوقِ نسواں کا بین اقوامی سال

۵۰ پیسے

اپنی بات

پندرہ اگست کو یوم آزادی کی تقریبات ملک بھر میں جوش و خروش کے ساتھ منائی گئیں۔ ان تقریبات میں قومی یک جہتی، رواداری اور دعوت عمل پر زور دیا گیا۔ اتر پردیش میں ہماری آزادی کا اکیسواں سال کئی اعتبار سے شاندار اور کامیابیوں اور ترقیاتی سرگرمیوں کا سال رہا۔ سیاسی اعتبار سے زیر نظر سال کی سب سے قابل ذکر بات پردیش کی پہلی غیر کانگریسی حکومت کا زوال ہے جس کے نتیجے میں لیجسلیٹو اسمبلی کو توڑ دیا گیا اور اس سال ۲۵ فروری سے ریاست میں صدر راج نافذ کر دیا گیا۔ گورنر کو جو حصول آزادی کے بعد سے ریاست کے دستوری سربراہ تھے، پہلی بار ریاست کے نظم و نسق کو چلانے کی عظیم ذمے داری سنبھالنا پڑی۔ اس حقیقت سے پورے طور پر باخبر ہوتے ہوئے کہ عوامی حکومت کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا، گورنر نے اس خلا کو پر کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اس مقصد کے پیش نظر ایک طرف انھوں نے نظم و نسق کو چلانے کے لیے تجربہ کار سینیر افسروں کی ایک مشاورتی کمیٹی کی تشکیل کی اور دوسری طرف ریاست کی معاشی ترقی کے لیے چوتھے منصوبے کی تشکیل کے اہم کام کے سلسلے میں غیر سرکاری افراد یعنی عوام کے نمائندوں، ماہرین معاشیات، ماہرین زراعت، صنعت کاروں اور دوسرے ممتاز افراد کی ایک وسیع البنیاد منصوبہ بندی مشاورتی کونسل کی تشکیل کی۔ انھوں نے مختلف سرکاری محکموں کی اعلیٰ کارکردگی کے سلسلے میں اصلاح و مشورہ دینے کے لیے ودھان پریشد کے ممبروں پر مشتمل آٹھ کمیٹیاں قائم کیں۔ کسانوں، خاص طور پر چھوٹے کسانوں کی مدد کے لیے وضع کی ہوئی مختلف اسکیموں پر عمل درآمد کے نتیجے میں غذائی پیداوار میں قابل ذکر اضافہ ہوا۔ تازہ ترین اعداد و شمار جو دستیاب ہوئے ہیں ان کے مطابق اس سال ۱۷۱ لاکھ ٹن غذائی پیداوار ہوئی جو گزشتہ سال کی پیداوار سے ۱۴ فی صدی زیادہ ہے۔ اس طرح اس سال کی پیداوار نے ۶۵-۱۹۶۴ء کی سب سے زیادہ پیداوار یعنی ۱۵۰ لاکھ ٹن کا ریکارڈ بھی ۲۱ لاکھ ٹن سے توڑ دیا۔ ریاست کے چوتھے پنج سالہ منصوبے کی تشکیل کا کام بھی اس سال شروع ہوا۔ زراعتی ترقی پر سب سے زیادہ زور دینے کا فیصلہ کیا گیا اور خاص طور پر چھوٹے کسانوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے پر خاص توجہ دی گئی۔ معاشی ترقی کے معاملے میں ریاست کو دیگر ریاستوں کے برابر لانے کے لیے آبادی اور پسماندگی کی بنیاد پر پہلے سے زیادہ مالی امداد دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ریاست کے وسائل کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانے کی نہ صرف کوشش کی گئی بلکہ یہ کوششیں جاری بھی ہیں۔ صنعتی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے حکومت نے صنعتی واحدوں کو ۵ سال تک کے لیے سیلز ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے کا اعلان کیا۔ صنعتی واحدوں کے مسائل پر غور و خوض کرنے اور انھیں فوری طور پر حل کرنے کے لیے چیف سکریٹری کی صدارت میں ایک خصوصی مشینری بھی قائم کی گئی۔ زیر نظر سال کی دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس مدت میں بجلی کی پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بجلی کی پیداواری صلاحیت میں ۵۶۲ میگاواٹ کا اضافہ ہوا جو پہلے اور دوسرے منصوبوں کی مجموعی پیداواری صلاحیت سے بھی زیادہ ہے۔ جہاں تک اساتذہ کا تعلق ہے زیر نظر سال میں انھیں بھی خاص سہولتیں دی گئیں۔ یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ کو مہنگائی بھتہ دیا گیا اور یونیورسٹی کے غیر تدریسی عملے اور پرائمری اور جونیر ہائی اسکول کے استادوں کی تنخواہ کی شرحوں میں اضافہ کیا گیا۔

یہ کامیابیاں اور سرگرمیاں ایسی ہیں جن پر یقیناً ہم خوش ہو سکتے ہیں لیکن جیسا کہ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے آزادی کی ۲۱ ویں سال گرہ کے موقع پر قوم کے نام اپنا پیغام نشر کرتے ہوئے کہا "جب ہم سوچتے ہیں کہ ہمیں ابھی کیا کچھ کرنا باقی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم نے ابھی تک کیا ہے وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے"۔ صدر جمہوریہ نے یہ بھی فرمایا کہ "ہم اپنی اقتصادی حالت کو بنیاد سے ہی بدلنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں لیکن اس عظیم کام میں جب تک عوام کا جوش، دلی تعاون اور لگاتار منظم کوشش نہیں ہوگی ہمارے لیے آگے بڑھنا مشکل ہے۔ ترقی کے لیے منصوبے بنانا اور انھیں عملی جامہ پہنانا خالی سرکار کا ہی کام نہیں ہے بلکہ عوام کا بھی کام ہے کہ اپنی حالت سدھارنے میں تیز تیز آگے بڑھیں تاکہ ملک کا مستقبل شاندار بن سکے۔ ایک بامعنی طاقت جو اس ترقی میں ہمیں تعاون دے سکتی ہے وہ ہے صحت مند قومیت کا سچا جذبہ جو تخریبی رجحانوں کو بڑھاوا نہیں دیتا"۔ اس میں شک نہیں کہ آج بھی ہم سنگین مسائل سے دوچار ہیں۔ ان میں بڑھتی ہوئی آبادی اور بیرونی خطرات کے مسائل خاص طور سے قابل لحاظ ہیں۔ جیسا کہ وزیر دفاع شری سورن سنگھ نے ابھی چند روز پہلے کہا ہے "چین اور پاکستان دونوں طرف سے ہندستان کو خطرہ اب ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں قیاس آرائی کی جائے بلکہ یہ خطرہ حقیقی اور سنگین ہے"۔ دوسرا بڑا مسئلہ اضافہ آبادی کا ہے۔ اس کے خطرناک عواقب سے سبھی آگاہ ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم رواداری آپسی سوجھ بوجھ سے کام لیں اور پھوٹ پیدا کرنے والی تمام ترغیبات کا مقابلہ کرکے ملک میں یک جہتی اتحاد اور محبت کو برقرار رکھیں اور اپنے مسائل کو جوش اور وحدت عمل کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کریں۔

نیا دور اپنے قلمی معاونین کو نذرانہ پیش کرتا ہے اس لیے وہ یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہے کہ اشاعت کے لیے جو چیزیں موصول ہوں وہ پہلے کہیں اور شایع نہ ہو چکی ہوں یا اشاعت کے لیے ساتھ ساتھ دوسرے رسائل کو نہ بھیجی گئی ہوں۔ کبھی کبھی ہمیں یہ شکایت موصول ہوتی ہے کہ نیا دور میں شایع ہونے والی کوئی نظم یا مضمون پہلے بھی شایع ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے پرچے کی ساکھ پر اثر پڑتا ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی اپنے قلمی معاونین سے استدعا کر چکے ہیں کہ نیا دور میں اشاعت کے لیے جو چیزیں بھیجی جائیں وہ نیا دور کے لیے مخصوص ہوں اور آج ایک بار پھر ان سے ہم یہ استدعا کریں گے کہ وہ ہمیں اپنی شایع شدہ تخلیقات بھیجنے کی زحمت نہ کریں بلکہ جو کچھ بھیجیں وہ تازہ ہوں اور کہیں اور شایع یا نشر نہ کی گئی ہوں۔

—— ایڈیٹر

ستمبر ۱۹۶۸ء

بھادوں ۱۸۹۰ شک

اُردو رباعی

علی عباس حسینی

کلیم الدین احمد اپنی کتاب اردو شاعری پر ایک نظر میں یوں فرماتے ہیں : "غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی کے علاوہ اردو میں دیگر اصناف بھی موجود ہیں مثلاً مسدس، مخمس، مربع، مثلث، ترکیب بند، ترجیع بند۔ لیکن ان اصناف کو اردو شعرا نے زیادہ اہمیت نہ دی۔ عموماً ان نظموں کی اہمیت ایک شاعرانہ مشق سے زیادہ نہیں . . . ان صنفوں میں شاذ و نادر ہی ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں ذاتی واقعات و تجربات ہیں اور بعض مثالیں موثر بھی ہیں۔ لیکن عموماً مشق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں کامیاب ہوں یا ناکامیاب محض حواشی ہیں اور اردو شعرا ان کی طرف پوری توجہ نہیں کرتے۔ مسدس میں البتہ چند بند مربوط ہوتے ہیں۔ خیالات و جذبات کی ابتدا، ترقی اور انتہا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مسدس میں مثلث، مربع، مخمس سے زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ اور ترکیب بند کی طرح یہ وسعت دشواری نہیں پیدا کرتی۔ لیکن یہ صنف بھی غزل گو شعرا میں مقبول نہ ہو سکی . . . صورت حال یہ ہے، اردو شاعری میں محض دھجیاں اور پرزے ہیں۔ غزلیں اور اشعار بے شمار ہیں۔ لیکن صورت غزل میں اس کے نقائص کی وجہ سے اعلیٰ پیمانے کی شاعری ممکن ہی نہ تھی۔ شعر مفرد بھی اپنی کم بضاعتی کی وجہ سے شاعری کے بار گراں کا متحمل نہ ہو سکا۔ دیگر اصناف اس قابل نہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو شاعری کی بضاعت صرف اس قدر نظر آئے گی۔ چند قطعے، چند قصیدے، چند ہجویں، چند ٹکڑے مثنوی اور مرثیے کے اور بس! پھر یہ کہنا غلط نہیں اردو شاعری میں صرف چند دھجیاں اور پرزے ہیں . . ."

اردو شاعری کے پورے سرمایے کی یہ تنقید، تنقیص کی حدوں کو پار کر کے تحقیر و تذلیل و توہین کی سرحد میں پہنچ گئی ہے اور ان لوگوں کے لیے جو اپنی زبان، اپنے کلچر اور اپنے ادب سے محبت رکھتے ہیں بے حد دل آزار۔ غالباً ایسی ہی تلخ گفتاری پر غالب نے نصیحت کی ہے ؎

"تلخی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

بہر حال کلیم الدین احمد کی مردود و مطعون "دیگر اصناف سخن" میں سے ان صفحات میں ہم صرف رباعی سے بحث کریں گے اور اسی کے نمونے پیش کریں گے۔ عمر خیام کی رباعیات کے تصدق اور فٹز جیرالڈ کے انگریزی ترجمے کے صدقے میں اب مغرب بھی مشرق کی اس نایاب صنف سخن سے آشنا ہو گیا ہے۔ اس لیے ایسے حضرات بھی جو اردو فارسی سے نابلد ہیں، انگریزی ہی کے ذریعے سہی، مگر رباعی کے نام سے ضرور واقف ہیں لیکن تعجب ہے کہ کلیم الدین احمد "مربع" کی لفظ استعمال کر کے رباعی کا نام لینے تک سے احتراز کرتے ہیں "مربع" میں تین طرح کی نظمیں شامل کی جا سکتی ہیں، ایک تو وہ جن کا ہر بند چار مصرعوں کا ہو، دوسرے وہ قطعہ جو اکثر چار ہی مصرعوں میں تمام ہو جاتے ہیں اور تیسری وہ جلیل القدر قسم ہے جسے "رباعی" کہا جاتا ہے۔

اہل عروض نے رباعی کے لیے بحر ہزج مخصوص کر دی ہے۔ وہ زحافات ملا کر چوبیس بحروں تک پہنچتی ہے اور پھر حشو و عروض و ضرب ملا کر چھپانوے تک۔ ہم اس کی ہیئت کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ جسے اس صنف کے اس پہلو سے دلچسپی ہو وہ ڈاکٹر سلام سندیلوی کی ضخیم کتاب اردو رباعیات کا مطالعہ کرے اور ان عروضی اساتذہ کی تصنیفات پڑھے جن کا ڈاکٹر صاحب موصوف نے حوالہ دیا ہے۔ ہمیں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ رباعی گوئی صد درجہ مشکل فن ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے بھی اور مفرد مواد کے لحاظ سے بھی۔ رباعی کہنے کے لیے بڑی بالغ نظری کی ضرورت ہے۔ جب تک شاعر تفکر کا عادی نہ ہو، جب تک وہ

اپنے میں ذاتی مشاہدات و تجربات سے نتائج استنباط کرنے کی صلاحیت نہ پیدا کرلے جب تک اسے زبان و بیان پر مکمل دسترس اور پوری قدرت نہ حاصل ہو جائے، وہ رباعی اور اچھی رباعی نہیں کہہ سکتا۔ بقول جوش ملیح آبادی "یہ کافر صنف بڑے بڑوں کے بھی قابو میں اس وقت تک نہیں آتی جب تک کہ زمانے کی سرد و گرم ہوائیں شاعر کی حساس اور مفکر زندگی کے تقریباً چالیس پچاس اوراق نہیں الٹ دیتیں!—" اور یہ کیوں؟ اس لیے کہ بقول سلام سندیلوی "اس کے لیے نظر کی وسعت اور شعور کی پختگی کی ضرورت ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ شعر مفرد کے بعد یہ نظم کا مختصر ترین ڈھانچہ ہے اور ایک کامیاب رباعی میں ایجاز و اختصار کی وجہ سے اور اس کے پر مغز اور تفکر سے مملو موضوع و مضمون کے بنا پر جو دیرپا حسن و تاثر، دل آویزی و دل نشینی، کیف و سرخوشی اور نشہ و سرور پیدا ہو جاتا ہے، وہ اکثر بڑی بڑی نظموں میں بیجا اطناب سے، بات کو پھیلا کر کہنے سے اور ایک ہی خیال کو بار بار دہرانے سے معدوم و مفقود ہو جاتا ہے۔

فارسی میں تقریباً ہر مشہور شاعر نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان میں سے کسی کو وہ مقام ارفع نصیب نہ ہوا جو عمر خیام اور سرمد کے لیے مخصوص ہے۔ اردو کے ہر بڑے شاعر نے رباعیاں کہی ہیں۔ مرثیہ گویوں کے لیے تو رباعی کہنا ایک طرح کے واجبات میں داخل تھا۔ اس لیے کہ مرثیہ خوانی کی ابتدا اسی صنف کلام سے کی جاتی تھی۔ ان میں سے بعض اساتذہ کے کلام کا خاصا اہم حصہ رباعیوں پر مشتمل ہے۔ جن نامداروں نے اس صنف سخن کو چار چاند لگایا ہے اور اسے بام عروج کی آخری منزل تک پہنچایا ہے، ان کے سرخیل میر انیس، مرزا دبیر، پیارے صاحب رشید، حالی، اکبر، رواں، مخدوم، امجد، شہید، یگانہ، کیفی، نجم آفندی، جوش، فراق، ڈاکٹر آہ، ہاشمی فریدآبادی، جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، اور ڈاکٹر سلام سندیلوی ہیں۔ ان میں سے اکثر کے رباعیات کے مجموعے الگ کتابوں کی صورت میں شایع ہو گئے ہیں۔ ان نغز گویوں نے ہر طرح کے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ مابعد الطبیعات، الٰہیات، مناظر فطرت و قدرت، مشاہدات و تجربات، خمریات و شبابیات، پیری و شیب کی شکایت، قبر کے اندر کی سرگزشت، زاد سفر کی عدم موجودگی کا نوحہ، اخلاق و اصلاح کی باتیں، سرمایہ داری و مزدوری کی آویزش، سامراج کے خلاف بغاوت، فلسفہ و حکمت کے رموز، سیاست و تدبر کا فقدان، قدامت پرستی و جدت پسندی، قید و بند میں سلاسل کا نغمہ اور حریت و آزادی کا ابدی سرور غرض زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس کے متعلق آپ کو رباعی نہ مل جائے اور یہ سب کچھ ایک تیکھی سنجیدگی اور مفکرانہ رنگ میں ڈوب دی ہوئی ملے گی۔

ڈاکٹر کلیم الدین احمد اردو رباعی کو بھی "مربع" کی چادر میں لپیٹ کر اس جواہرات سے پر کٹھری پر "مشق" کی تختی لگا دیتے ہیں۔ یہاں مختلف اساتذہ کے کلام سے کچھ نمونے اس صنف سخن کے پیش کیے جا رہے ہیں جو ان کے اس خیال یا ان کی صنف رباعی کی تنقیص کی تردید کے لیے کافی ہوں گے۔ مثالوں کی تعداد کچھ زیادہ ضرور ہے لیکن اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مختلف اساتذہ کے کلام سے چیدہ چیدہ نمونے پیش کر کے یہ ثابت کر دیا جائے کہ ہماری شاعری نہ "چند دھجیاں" ہے اور نہ "چند پرزے"!

اب ممتاز ترین اور چیدہ چیدہ شعرا کی کچھ منتخب رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

ہم نے بھی کبھو جام و سبو دیکھا تھا   جو کچھ کہ نہیں ہے رو برو دیکھا تھا
ان باتوں کو اب جو غور کیجیے اے درد   کچھ خواب سا تھا، جو کبھو دیکھا تھا (میر درد)

کچھ آپ ہی گرا کے آپ کچھ چنتا ہے   کہتا ہے کچھ آپ آپ ہی کچھ سنتا ہے
اے درد ہمیشہ یہ دل دیوانہ   کیا کیا ادھیڑتا ہے اور بنتا ہے (میر درد)

مومن نہیں زنار سے میرے آگاہ   اس رشتے کو ہے سبحۂ اسلام میں راہ
اس بت کا برہمن ہوں کہ ہم صوفی و شیخ   کہتے ہیں جسے دیکھ کے اللہ اللہ (مرزا سودا)

سودا پے دنیا تو بہر سو کب تک   آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے   بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک (مرزا سودا)

افسوس کریموں میں نہیں یہ دستور   مفلس پہ کرم کر کے نہ ہو دیں مغرور
جھکتا ہے اگر شاخ ثمردار کا ہاتھ   پھل دے کے وہیں آپ کو کھینچے ہے دور (مرزا سودا)

مسجد میں شیخ کو خروشاں دیکھا   میخانے میں جوش بادہ نوشاں دیکھا
اک گوشۂ عافیت جہاں میں ہم نے   دیکھا تو محلۂ خموشاں دیکھا (میر تقی میر)

جی تک آپ کو رضا پر رکھیے   مائل دل کو تنک قضا پر رکھیے
بندوں سے تو کچھ کام نکلا اے میر   سب کچھ موقوف اب خدا پر رکھیے (میر تقی میر)

دنیا کے الم ذوق اٹھا جائیں گے   [illegible]
[illegible]

اس جہل کا ہے ذوق نہ ٹھکانہ کچھ بھی — دانش نے کہا دل کو نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے — جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی (ذوق سلیمانی)

ہے عہدِ شباب زندگانی کا مزا — پیری میں کہاں وہ نوجوانی کا مزا
اب یہ بھی کوئی دن میں فسانہ ہوگا — باتوں میں جو باقی ہے کہانی کا مزا (حکیم مومن)
مومن لازم ہے وضع مرغوب بنے — جو رنگ ہو آدمی خوش اسلوب بنے
کیا خرقہ و عمامہ ہے، اللہ اللہ! — جب شکل بگڑ گئی تو تم خوب بنے (حکیم مومن)

ہر چند ہوں پیر اور سر پہ ہے اجل — تس پر نہیں پیٹ کے سوا فکرِ عمل
ہے رشتۂ عمر مختصر سا لیکن — شیطان کی آنت ہے مرا طولِ امل (ناسخ لکھنوی)

قلت بھی جو ہو شکر بہ کثرت کیجے — ہرگز کس و ناکس کی نہ منت کیجے
گھر بیٹھے اگرچہ ایک دانہ بھی ملے — اے بحر صدف وار قناعت کیجے (بحر لکھنوی)

غلہ سے ہے ہر کشتِ تمنا خالی — ہاتھوں کی طرح پیٹ ہے سب کا خالی
سب بھوک کے مارے قحط میں مرتے ہیں — دوزخ نہ بھرا ہو گئی دنیا خالی (منیر شکوہ آبادی)
ہے دشمنِ جاں نرخِ گرانِ گندم — سب ڈھونڈتے پھرتے ہیں نشانِ گندم
خورشیدِ فلک اگر خبر پا جائے — بدلے ابھی قرصِ زر سے نانِ گندم (منیر شکوہ آبادی)

خورشید کا ماہ کا نکلنا دیکھو — تاروں کا ہجوم کر کے چلنا دیکھو
ہے دن کو سفیدی شب کو پوشاک سیاہ — گردوں کا ذرا رنگ بدلنا دیکھو (امیر لکھنوی)
کیا غم ہے اگر زمیں میں سونا ہوگا — ہونے دو اگر لحد کا کونا ہوگا
کیا خوفِ فشار، کیا نکیرین کا ڈر — آئے تو اجل جو ہوگا ہونا، ہوگا (امیر لکھنوی)

کیا لطف اگر سارا زمانہ دیکھے — دیکھے تو نگاہِ چشمِ دانا دیکھے
گر گلشنِ الفت میں گزر مثلِ نسیم — آنا دیکھے نہ کوئی جانا دیکھے (امیر مینائی)

[illegible]
[illegible]

نمائشِ جدید ہے ہر ایک پلِ حیات کی — جو آنکھ ہو تو دیکھ لیں نہ دن کی حد نہ رات کی
مناظر وسیع ہیں، عجب نہیں کہ موت بھی — اک اور راہِ سیر ہو نئی کائنات کی (... آبادی)

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے (میر انیس)
آدم کو عجب خدا نے رتبا بخشا — ادنیٰ کے لیے مقامِ اعلیٰ بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں — اس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا (میر انیس)
جو سو خرمن سے خوشہ چیں ہوتا ہے — دانائے جہاں وہ نکتہ داں ہوتا ہے
ملتا نہیں نامِ نیک بے کاہشِ جاں — کٹتا ہے عقیق تب نگیں ہوتا ہے (میر انیس)
مٹی سے بنا ہے دل کو تو سنگ نہ کر — ہر بات پہ معترض نہ ہو جنگ نہ کر
منظور اگر ہے جا دلوں میں لے دوست — بہتر ہے کہ دشمن کو بھی دل تنگ نہ کر (میر انیس)
ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے — جاگو جاگو کہ خوف اسی راہ میں ہے
اٹھو اٹھو! یہ خوابِ غفلت کب تک — دیکھو دیکھو اجل کمیں گاہ میں ہے (میر انیس)
رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتا ہے تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے (میر انیس)

ادنیٰ سے جو سر جھکائے اعلیٰ وہ ہے — جو خلق سے بہرہ ور ہے زیادہ وہ ہے
کیا خوب دلیل ہے یہ خوبی کی دبیر — سمجھے جو برا آپ کو اچھا وہ ہے (مرزا دبیر)

بے برگ و نوا ہے ساتھ پیچھے پیچھے — مشتاقِ بقا ہے ساتھ پیچھے پیچھے
اے عمرِ رواں اپنی سواری ٹھہرا — اک آبلہ پا ہے ساتھ پیچھے پیچھے (ذوق)
ہر چند کہ نفسِ مطمئن باقی ہے — لیکن نہ وہ دل ہے نہ وہ تن باقی ہے
بالوں کی سیاہی پہ سپیدی آئی — راتیں تو کٹیں ہجر کا دن باقی ہے (ذوق)

ہر شے میں ہے فیضِ شفقت تیری — احسان ہے اے کریم عادت تیری
ہر سمت رواں ہے بن کے ابرِ رحمت — سائل کی تلاش میں سخاوت تیری (شفیق)

پیارے صاحب رشید نے اپنی رباعیوں میں علاوہ دوسرے موضوعات کے پیری کے مضمون کو پچاسوں طریقوں سے پیش کیا ہے۔ ان میں سے چند حاضر ہیں:

کب کوئی بلا نگاہ بانی سے رکی — اک لحظہ نہ موت زندگانی سے رکی
پیری کا نام گو ضعیفی ہے رشید — پر ایسی قوی ہے کہ جوانی سے رکی (رشید)

پیری میں اگر جھک کے کماں ہوتی ہے ۔۔۔ آنکھوں سے بصارت بھی نہاں ہوتی ہے
دے دیتے ہیں تجربے بصیرت کو شباب ۔۔۔ انسان کی معرفت جواں ہوتی ہے (رشید)

بالوں کی سیاہی ہیہات گئی ۔۔۔ کہتے ہیں جوانی جسے وہ رات گئی
پیری نے زباں کی فصاحت کھو دی ۔۔۔ لو صبح ہوئی، رات گئی، بات گئی (رشید)

طفلی نہ رہی کہ تھی وہ جانے والی ۔۔۔ کیا رہتی جوانی کہ تھی مٹانے والی
پیری کو رشید بس غنیمت سمجھو ۔۔۔ اب فصل نہیں ہے کوئی آنے والی (رشید)

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی ۔۔۔ ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت سیکھو ۔۔۔ عزت کے لیے کافی ہے لے دل نیکی (اکبر الٰہ آبادی)

وہ لطف اب ہندو مسلماں میں کہاں ۔۔۔ اغیار ان پہ گزرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا، زباں کی کبھی بحث ۔۔۔ ہے سخت مضر یہ نسخۂ گاؤ زباں (اکبر الٰہ آبادی)

کیا دل ضرور ہے پارسائی کے لیے ۔۔۔ تسبیح فقط ہے خود نمائی کے لیے
اے زاہد سالوس نہ دے مجھ کو فریب ۔۔۔ ساری ہے یہ بندگی خدائی کے لیے (شاد عظیم آبادی)

یہ سچ کہ ہجوم کار میں رکھا ہے ۔۔۔ یہ جھوٹ کہ اضطرار میں رکھا ہے
قانون میں فطرت کے نہیں جبر روا ۔۔۔ سب کچھ ترے اختیار میں رکھا ہے (شاد عظیم آبادی)

جس دل میں غبار ہو وہ دل صاف کہاں ۔۔۔ پھر خلق کہاں، وفا و الطاف کہاں؟
جس قوم میں آگیا تعصب کا قدم ۔۔۔ اس قوم میں اے شاد انصاف کہاں؟ (شاد عظیم آبادی)

فراغت دے اسے کار جہاں سے ۔۔۔ کہ چھوٹے ہر نفس کے امتحاں سے
ہوا پیری سے شیطاں کہنہ اندیش ۔۔۔ گناہ تازہ تر لائے کہاں سے (اقبال)

دگرگوں عالم شام و سحر کر ۔۔۔ جہانِ خشک و تر زیر و زبر کر
رہے تیری خدائی داغ سے پاک ۔۔۔ مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر (اقبال)

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں ۔۔۔ محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
سوئی کو ملی نہ قوم کی چوپائی ۔۔۔ جب تک نہ چرائیں بکریاں اس بن میں (حالی)

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور ۔۔۔ ہر عیب سے بچیے حتی المقدور
عیب اپنے گھٹاؤ خبردار رہو ۔۔۔ گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور (حالی)

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں ۔۔۔ شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا ۔۔۔ وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں (حالی)

ہر ذرے پہ فضلِ کبریا ہوتا ہے ۔۔۔ اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دلی زبان سے یہ کہتے ہیں ۔۔۔ وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے (محمد حسین تجلی)

یہ سنگ نشاں ہے منزلِ وحدت کا ۔۔۔ پیدا ہوا پھر کوئی نہ اس صورت کا
انسان جسے کہتے ہیں دنیا والے ۔۔۔ قد آدم ہے آئینہ قدرت کا (محمد حسین تجلی)

دولت ہم میں ہے پھر بھی دولت کی تلاش ۔۔۔ راحت ہم میں ہے، پھر بھی راحت کی تلاش
ہم اپنی خودی سے بے خبر ہیں کتنے ۔۔۔ جنت ہم میں ہے، پھر بھی جنت کی تلاش (آثر لکھنوی)

نیکی سے بدی، بدی سے نیکی مانگو ۔۔۔ شعلے سے تری آگ سے خنکی مانگو
دنیائے دنی سے ہے اگر کوئی امید ۔۔۔ دشمن سے مراد اپنے دل کی مانگو (آثر لکھنوی)

دنیا تھی یہی صدق و صفا کی دنیا ۔۔۔ رحم و کرم و مہر و وفا کی دنیا
انساں نے بنا دیا بالآخر اس کو ۔۔۔ جور و ستم و کذب و ریا کی دنیا (تلوک چند محروم)

جنگل کی یہ دل نشیں فضا یہ برسات ۔۔۔ یہ نغمۂ باراں، یہ ہوا، یہ برسات
ساماں دل افسردگیٔ شاعر کے ہیں ۔۔۔ کوئل کی یہ کوک، یہ گھٹا یہ برسات (تلوک چند محروم)

اے حاصلِ دہر، تجھ کو حاصل کی تلاش ۔۔۔ اے بر لبِ ساحل، تجھے ساحل کی تلاش
تو خضر بھی، منزل بھی، رہ منزل بھی ۔۔۔ رہبر کی تلاش کر، نہ منزل کی تلاش (اثر صہبائی)

چارہ نہیں کوئی چلتے رہنے کے سوا ۔۔۔ سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیاتِ فانی کیا ہے ۔۔۔ جھونکا کھانے سنبھلتے رہنے کے سوا (یگانہ چنگیزی)

مشکل کوئی مشکل نہیں جینے کے سوا ۔۔۔ خاموش لہو کا گھونٹ پینے کے سوا
کھلتے ہیں تبھی جوہرِ تسلیم و رضا ۔۔۔ جب کوئی سپر ہی نہ ہو سینے کے سوا (یگانہ چنگیزی)

وہ غم نہیں جس غم سے خوشی پیدا ہو ۔۔۔ افسردگی میں بات نئی پیدا ہو
اس مرنے کو مرنا نہیں کہتے کشفی ۔۔۔ جس سے کہ پھر ایک زندگی پیدا ہو (منظور حسین کشفی)

دل جس کا ہے نرم بس ولا ور ہے وہی ۔۔۔ باطل کے جو آگے نہ جھکے سر ہے وہی
دولت پہ تو نگری نہیں کچھ موقوف ۔۔۔ جو ہاتھ نہ پھیلائے تو نگر ہے وہی (منظور حسین کشفی)

کر خدمتِ خلق کا ر دینی ہے یہی ۔۔۔ ڈھونڈ اپنے عیب دور بینی ہے یہی
مظلوم کے دل میں بھی جگہ پیدا کر ۔۔۔ عزت ہے یہی گوشہ نشینی ہے یہی (منظور حسین کشفی)

عیسیٰ مسیح

تھا دل میں ہر اک گل کا ہر اک خار کا درد   سمجھا یہ طبیب اپنے بیمار کا درد
تعذیرِ گناہ کے تو حامی ہیں سبھی   کس کے سینے میں ہے گنہ گار کا درد؟

محمد عربیؐ

کیفیتِ باز اس کے شیون سے سنو   کیا کہتا ہے وقت اس کی جتون سے سنو
پیغامِ محمدیؐ کی تشریحِ جدید   تہذیب کے دل کی تیز دھڑکن سے سنو

حسینؑ ابن علیؑ

اے خالقِ ارض زندگی پیدا کر   ذرات میں روحِ سرمدی پیدا کر
مٹی کو پلا چکا ہے خونِ شبیرؑ   اب تو مٹی سے آدمی پیدا کر!

ڈاکٹر صفدر آہ نے "عقل کی شکست" کے نام سے ایک ایکٹ کا ایک ڈراما رباعیوں میں لکھا ہے۔ اس کے تین کردار ہیں — (۱) حسینہ (۲) عقل (۳) شباب — ان کی گفتگو کا موضوع شباب کی بے راہ رویاں اور عقل کا احتساب ہے۔ پوری بحث بہت گرم اور تیز ہے اور بڑے ڈرامائی انداز میں پیش کی گئی ہے۔ بخوفِ طوالت پورا ڈراما تو نقل نہیں کیا جا سکتا مگر ڈاکٹر آہ کی صنفِ رباعی اور فنِ تمثیل میں مہارت مندرجہ ذیل مکالمے سے واضح ہو جائیگی۔

حسینہ (گنگناتی ہے) یہ چاندنی رات، یہ گلستاں، یہ بہار   لپٹیں خوشبو، فضائیں سب عنبر بار
کھوئے کھوئے سے سناٹے ہوئے سرد   بہکی بہکی ہوائے صحنِ گلزار

کہتا ہے یہ جی کہ بس کسی کی ہو جا   سینے پہ کسی کے رکھ کے عارض سو جا
دکھتے ہوئے اس جسم کو تسکین ملے   مضبوط کسی کے بازوؤں میں کھو جا

دفعتہً خمیدہ کمر، سفید مُو عقل آکر ڈانتی ہے:

عقل — بلے دلئیہ تو طفلکِ نا تجربہ کار   کیا تو نے کہا، پھر تو کہنا اک بار
کر کے مضبوط بازوؤں کی جو تلاش   میں بھی تو سنوں کون ہے وہ نا ہنجار

ہے دشمنِ آبرو تقاضائے شباب   شیطان ہو بہو تقاضائے شباب
یہ توسن سرکش ہے اگر چھوٹی لگام   بھٹکائے گا کو بہ کو تقاضائے شباب

دفعتہً شباب ایک نوجوان کی صورت میں داخل ہوتا ہے اور عقل کو ڈانٹتا ہے:

شباب — بس بس نہ عقل بس بہت بکے بس   بکواس تیری سننے کا مجھ میں نہیں ہے کس
برسا نہ یہاں بے ضرورت پانی   بادل کو جو برسنا ہے، کہیں اور برس

جناب سلام سندیلوی نے ان دونوں سے الگ اپنے لیے رباعیوں میں ایک مخصوص راہ نکالی ہے۔ ان کی رباعیوں کی خصوصیات خود انہیں کی زبانی سنیئے۔

"ان رباعیات کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف تو ان کا تعلق منظر نگاری سے ہے اور دوسری طرف واقعہ نگاری سے، یعنی ہر رباعی کے پہلے مصرعے یا دو یا تین مصرعوں میں کسی فطری منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے اور تیسرے اور چوتھے مصرعوں یا صرف چوتھے مصرعے میں اس منظر کی تشبیہ کسی تاریخی، افسانوی یا روایتی واقعے سے دی گئی ہے۔"

آئیے تو پھر ہم بھی نئے جاموں میں بھری ہوئی پرانی شرابوں سے اپنے ہونٹ تر کر لیں:

بکھرا ہوا چمن، یہ پھیلی ہوئی باس   پھولوں کے حسین جام، یہ بھونروں کے پاس
جس طرح ہَون کرتے ہوئے آریہ لوگ   ہاتھوں میں لیے ہوں سوم کے رس کا گلاس

یہ خنک خنک ہوا، یہ نکھری ہوئی شام   تاباں ہے برجِ قوس میں وہ ماہِ تمام
جس طرح ہو سیتا کے سوئمبر کے وقت   رنگین دھنش کے بیچ میں چہرۂ رام

اٹکھیلیاں کرنے لگی گلشن میں نسیم   دی بوئے گل نے غنچۂ دل کو شمیم
جس طرح کہ اکبر کی ولادت کے وقت   مغلوں میں کرے مشک ہمایوں تقسیم

رعد کی صدا سے کانپتے ہیں جنگل   لرزاں ہیں ہوا سے اُجلے اُجلے بادل
یا تیغ زنی سے لکشمی بائی کی   انگریزوں کی لشکر میں مچی ہے ہلچل

بجھنے لگا مغرب میں وہ سورج کا چراغ   دامانِ شفق میں دکھلے خون کے داغ
جس طرح سپوتوں کے لہو سے ہو لعل   پنجاب کی آغوش میں جلیان کا باغ

اردو رباعی کے یہ چند نمونے اس کے شاہد ہیں کہ اردو رباعی وہ صنفِ سخن نہیں جس پر کوئی بابصیرت ناظر یا ناقد سرسری یا معاندانہ نظر ڈالنے کی جسارت کر سکے — اردو رباعی یا اس کا نقشِ اول فارسی رباعی، کبھی بھی غیر متعارف کھلونا نہیں بنی۔ بقول علی جواد زیدی "رباعی — جی ہاں، وہی خیام والی صنفِ سخن چار مختصر سے مصرعوں میں مقید ایک مسلسل اور مکمل خیال، بے مقصد یا کوری تغزلی شاعری کے لیے کبھی بھی استعمال نہیں کی گئی۔ حکیم خیام نے بھی جب

(بقیہ صفحہ ۱۷ پر)

حرمت الاکرام

کیا چیز ہے حیات کی اس طرفگی کا زہر
دل میں سمو کے بیٹھے ہیں دیدہ وری کا زہر

اے نقرئی فضاؤ ! غضب اس طرح نہ ڈھاؤ
گھل جائے روح میں نہ کہیں چاندنی کا زہر

ناداں کب اتنا کوئی ہے، لیکن یہ سوچیے!
پیتا ہے کس خوشی سے زمانہ خوشی کا زہر

ہوتی ہے کتنی روح فزا، یہ کسے بتائیں
وہ رات جس کے جام میں ہو چاندنی کا زہر

تلخابۂ حیات ہوا اور جاں گداز
چپکے سے کون گھول گیا آگہی کا زہر

شکوہ نہیں، یہ سادہ دلی کا ہے تجربہ
ہوتا ہے دشمنی سے سوا دوستی کا زہر

اک تیرا غم تھا، مٹ نہ سکیں جس کی تلخیاں
تھا ورنہ خوش گوار بہت زندگی کا زہر

تارو ! یہ رات مجھ سے گزاری نہ جائے گی
دل میں مرے اتار دو اپنی ہنسی کا زہر

اے گردشِ حیات ! نہ لے مجھ سے انتقام
میرے لیے بہت ہے مری سادگی کا زہر

حرمت ! دو آتشہ ہے بلا کی، سرشتِ دل
کچھ گمرہی کا زہر ہے، کچھ سرکشی کا زہر

کیا مولانا ابوالکلام آزاد

کی اُردو ٹکسالی ہے

حبیب احمد صدیقی

مندرجہ بالا عنوان سے میرا ایک مضمون نیا دور کے اکتوبر ۱۹۶۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو ہندوستان اور پاکستان کے کئی رسالوں نے نقل کیا اور کچھ ارباب فکر و نظر نے مجھے تحسینی خطوط لکھے۔ استاذ محترم جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی کے دو جملے نقل کرتا ہوں۔
"مولانا آزاد کی زبان پر آپ کا مضمون لاجواب تھا۔ یہ بات اخلاقاً نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ یہاں کے دانشوروں نے اس پر اتفاق کیا اور ہر گرفت کی تصدیق کی۔"

کچھ حضرات نے اس خیال کا اظہار کیا کہ شاید مولانا آزاد کی مایۂ ناز تصنیف غبارِ خاطر میں اس قسم کی غلطیاں نہ ملیں اور مجھ سے مطالبہ کیا کہ اگر غبارِ خاطر میں بھی زبان کی غلطیاں ہوں تو ان کی بھی نشان دہی کی جائے۔ غبارِ خاطر پہلی بار ۱۹۴۶ء میں چھپی تھی اور میں نے اسے چھپنے کے تھوڑے دن بعد ہی پڑھا تھا۔ بیس سال گزر جانے کے باوجود مجھے اتنا یاد تھا کہ جہاں اسلوبِ نگارش کی دلآویزی نے دامنِ دل کھینچا تھا وہیں کچھ غیر مانوس الفاظ اور محاوروں کو پڑھ کر حیرت بھی ہوئی تھی۔ اب جو یہ سوال اٹھا کہ آیا غبارِ خاطر زبان کی غلطیوں سے پاک ہے یا نہیں تو میں نے پھر اس کتاب کی ورق گردانی کی۔ اس بار میرے پیشِ نظر غبارِ خاطر کی طبع ثالث تھی جسے مکتبۂ احرار نے آزاد پبلیکیشنز لمیٹڈ ۸۰ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا تھا جیسا میرا خیال تھا اس میں کافی غلطیاں ملیں، نہ ملتیں تو تعجب ہوتا کیوں کہ ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر جب ایک ہی شخص کی لکھی ہوئی ہیں تو ان کی زبان بھی ملتی جلتی ہی ہوگی۔

چند دن ہوئے کہ جناب مالک رام کی مرتب کی ہوئی یہ کتاب دستیاب ہوئی۔ جناب مالک رام نے جو حواشی شامل کیے ہیں وہ ایک سو چند نکتوں پر مشتمل ہیں اور نہایت ہی مفید اور دلچسپ ہیں۔ انھوں نے چھ سو سے زیادہ اشعار کی نشاندہی کر کے شعرا کے نام بتائے ہیں۔ جہاں جہاں لفظی تفاوت پایا گیا (اور یہ اشعار کی ایک بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے) اسے حواشی میں عیاں کر دیا۔ اس لفظی تفاوت و تغیر میں مولانا کے بدلے ہوئے الفاظ عموماً اتنے موزوں نہیں معلوم ہوتے جتنے کہ وہ تھے جنھیں بدلا گیا۔ مثلاً عرفی کے اس شعر میں جو مولانا نے کئی مقام پر درج کیا ہے۔

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحونِ عشق ۔۔۔ روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

مولانا نے "جیحون" کو "اقلیم" سے بدل دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں "روئے دریا" اور "قعرِ دریا" کا ذکر ہو وہاں "جیحون" ہی مناسب ہوگا۔

اسی طرح بیدل کے شعر۔

اگر دماغم درین خمستان خمارِ شرمِ عدم نگیرد ۔۔۔ زچشمکِ ذرہ جام سرم بآں شکوہے کہ جم نگیرد

میں مولانا نے "خمستاں" کو "شبستاں" سے بدل دیا ہے مگر یہاں محل "خمستاں" ہی کا ہے۔

حافظ شیرازی کا شعر ہے۔

جوہرِ جامِ جم از کانِ جہانِ دگر ست ۔۔۔ تو تمنا ز گلِ کوزہ گراں میداری

مولانا نے دونوں مصرعوں میں تصرف کر کے اس شعر کو یوں درج کیا۔

جوہرِ طینتِ آدم ز خمیرِ دگر ست ۔۔۔ تو توقع ز گلِ کوزہ گراں میداری

حافظ کے شعر کی لطافت باقی نہ رہی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کیا واقعی کوئی کوزہ گروں سے توقع رکھ سکتا ہے کہ وہ آدمی کے ڈھانچے بنا بنا کے دیں گے۔ جام کے متعلق تو یہ توقع رکھی جا سکتی ہے۔ مولانا کے مصرع

سے شعر سہم ہو جاتا ہے۔

یہی حال اور تصرفات کا بھی ہے۔ کسی بڑے شاعر کے کسی لفظ کو یا ترتیب الفاظ کو بدل دینے سے شعر ہمیشہ پست ہو جائے گا کیوں کہ جو الفاظ ایک بڑا شاعر منتخب کرتا ہے وہ موزوں ترین ہوتے ہیں اور جس طرح انھیں بٹھاتا ہے وہی بہترین نشستِ الفاظ ہوتی ہے۔

مولانا نے کہیں کہیں ایک شاعر کے شعر کو کسی دوسرے شاعر سے منسوب کر دیا تھا۔ جناب مالک رام کی سعیِ بلیغ صحیح شاعروں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئی۔ حکیم محمد سمیع ذرہ لکھنوی کی مشہور رباعی ہے۔

گرما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں — سرما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں
القصہ ہزار گرم و سردِ عالم — بر ما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں

اس کے پہلے، دوسرے اور تیسرے مصرعوں میں مولانا نے تصرف کیا ہے اور اسے سرمد کی رباعی کہا ہے۔ اس رباعی کی شہرت کی خاص وجہ یہ ہے کہ پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں صرف ایک لفظ بدلا ہے اور باقی الفاظ میں سر مو فرق نہیں۔

بیدل کی رباعی ہے۔

زاہد بہ تماشۂ ورزہ ضبطے دارد — صوفی بہ مشبانہ ربطے دارد
بیدل ہمہ را بکمالِ خود می بینم — ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد

مولانا نے اس کے پہلے شعر میں تصرف کر کے سرمد سے اسے منسوب کر دیا۔

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد — سرمد بہ مے و پیالہ ربطے دارد

اور دوسرا شعر جس میں بیدل کا تخلص موجود تھا درج نہیں کیا۔

نواب محمد یار خاں امیر کا شعر ہے۔

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن — مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مولانا آزاد نے اس شعر میں میر کا تخلص درج کر کے اسے یوں لکھا ہے۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر — مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

جناب مالک رام نے اشعار کے حوالے دینے اور ان کی تصحیح کرنے کے علاوہ ایک اور مفید کام کیا ہے۔ مولانا کے خطوط میں مشاہیر کے سیکڑوں نام آئے تھے جناب مالک رام نے ان سب پر حواشی لکھے ہیں۔ حواشی میں اور مفید معلومات بھی ملتی ہیں۔ مثلاً کلام پاک کی آیتوں کے حوالے یا تاریخی واقعات کا مختصر بیان۔ مختصر یہ کہ اس کتاب کو مرتب کرنے میں جو کام جناب مالک رام نے کیا وہ بہت صبر آزما تھا۔ ان کی عرق ریزی لائق صد تحسین ہے۔

یوں بھی غبارِ خاطر دامنِ دل کھینچنے والی کتاب تھی اس کی دل کشی میں جناب مالک رام کے حواشی نے دو چند اضافہ کر دیا۔ چناں چہ اب جو میرے ہاتھ میں یہ کتاب آئی تو شروع سے آخر تک پڑھے بغیر دل نہ مانا۔

مولانا آزاد کے یہاں زبان کی غلطیوں کا معمہ جناب مالک رام کے اس بیان سے بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے:

"مولانا آزاد مکہ (حجاز) میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ایک عرب خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ظاہر ہے کہ گھر میں بات چیت عربی میں ہوتی ہوگی جو گویا ان کی مادری زبان تھی۔ جب تک خاندان حجاز میں مقیم رہا وہاں اردو کی باقاعدہ تعلیم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ البتہ گھر میں والد سے گفتگو اردو میں ہوتی تھی اور جو ہندستانی استاد ان کے پڑھانے کو مقرر کیے گئے تھے ان سے بھی۔ لیکن قدرتی طور پر ابتدا میں ان کے اردو سیکھنے کا کوئی اطمینان بخش انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کے والد خاندان سمیت آخری مرتبہ ۱۸۹۸ء میں حجاز سے ہندستان آئے تو اس وقت تک مولانا آزاد کو جن کی عمر کم و بیش دس سال کی تھی اردو کی بہت کم واقفیت تھی۔ مزید براں اردو کے غلط الفاظ اور غلط محاورے جو مکہ میں عرب بولتے ہیں ان کی زبان پر بھی رائج تھے جنھیں انھوں نے بتدریج کوشش کر کے دور کیا۔ چونکہ حجاز سے واپسی پر ہندستان میں بھی خاندان کا قیام کلکتہ میں رہا جو اردو کا علاقہ نہیں لہذا اردو مراکز سے بعید دور رہے، اس پر تعلیم بھی سراسر عربی اور فارسی کی رہی اس لیے اس دوران میں بھی اردو میں ترقی کرنے کے امکانات کم تھے۔ اس کے بعد اگرچہ مشق و مزاولت اور محنت سے انھیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہو گئی لیکن ان کے تلفظ میں کہیں کہیں غرابت اور قدامت کے اثرات آخر تک قائم رہے۔"

جس کی مادری زبان اردو نہ ہو اور جس نے کلکتہ میں رہ کر اردو سیکھی ہو اس کے یہاں زبان کی غلطیاں ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مجھے جو غلطیاں غبارِ خاطر میں ملی ہیں ان کی نشاندہی جناب مالک رام کے مرتبہ نسخے کو سامنے رکھ کر کرتا ہوں۔ یہ کتاب ساہتیہ اکادمی نئی دلی نے شائع کی ہے۔

صفحہ ۸: "اور قطب احمد نگر کی تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیر کے جاری رہیں۔"

'معمولات' مونث نہیں ہے مذکر ہے۔

صفحہ ۹: "قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی جسم و صورت کی تھی قلب باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے جلنے سے بچا لیا تھا۔"

کہنا یہ مقصود ہے کہ بیگم کے انتقال سے جو ناقابل برداشت صدمہ ہوا تھا، اس کا اثر جسم و صورت پر نمایاں نہ ہونے دیا۔ اس کو یوں کہنا کہ جسم کو میں نے جلنے سے بچا لیا تھا، عجیب سی اردو ہے۔

صفحہ ۱۱: "مجھے یہ حال معلوم تھا مگر اپنے توبۂ اضطرار پر کبھی پشیمان نہیں ہوا۔"

'توبہ' مذکر نہیں ہے مونث ہے۔ جناب مالک رام نے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ سب اشاعتوں میں "اپنے" چھپا ہوا تھا متن میں "اپنی" لکھ دیا۔ وہ اسے مصنف کے بجائے کاتب کی غلطی سمجھتے ہیں۔ حواشی پڑھنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا نے طبع اول کے بعد ضا سب تغیر و تبدل کئی جگہ کیا تھا۔ اگر یہ کاتب کی غلطی ہوتی تو اسے بھی یقیناً درست کر دیتے۔

صفحہ ۱۱: "محرومی پر ماتم ہوا تھا۔ حصول پر نشاط ہوا۔"

'نشاط' مونث ہے۔ مولانا نے نشاط ہوا لکھا ہے۔

صفحہ ۱۲، ۱۳: "راہ میں کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اٹھا دیا تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔"

مولانا کی اس عبارت میں دو جگہ 'موڑ' آیا ہے مگر دونوں جگہ مونث ہی ہے۔ حالانکہ موڑ مذکر ہے۔ جناب مالک رام نے اس عبارت کو اپنے مقدمہ کے صفحہ ۱۵ پر نقل کیا ہے مگر 'ملی' اور 'ملتی' کو حذف کر دیا ہے۔ البتہ حاشیے میں اسے سہو قلم کہا ہے۔

قدم اٹھا دیا اور قدم اٹھایا کے معنوں میں بہت فرق ہے۔ قدم اٹھا دینے کے معنی ہیں بھگانا۔ شکست دینا۔ جو یہاں مقصود نہیں۔ مولانا نے اسے قدم اٹھایا کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

صفحہ ۱۵: "آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانہ میں جا بیٹھ رہا۔"

جا بیٹھ رہا۔ صحیح نہیں۔ جا بیٹھا ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۶: "وہی سا بچہ کام و دہن رہا ہے اور اب اس قدر پختہ ہو گیا ہے

کہ ٹوٹ جا سکتا ہے مگر لچک نہیں کھا سکتا۔"

ٹوٹ جا سکتا ہے کے بجائے ٹوٹ سکتا ہے ہونا چاہیے۔ لچک نہیں کھا سکتا بھی محل نظر ہے۔

صفحہ ۲۷: "ہم ان ہی باتوں پر قناعت نہیں کر لے سکتے۔"

کر لے سکتے۔ صحیح نہیں۔ کر سکتے ہونا چاہیے۔

صفحہ ۲۸: "اور انھوں نے حیرانگی کو شک تک اور شک کو انکار تک پہنچا دیا۔"

حیرانگی غلط ہے۔ صحیح حیرانی ہے۔

صفحہ ۲۹: "بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد....."

حیرانگیوں غلط ہے۔

صفحہ ۴۰: "کیونکہ یہاں خود زندگی کے تقاضے ہوئے جن کا ہمیں جواب دینا ہے اور خود زندگی کے مقاصد ہوئے جن کے پیچھے والہانہ دوڑتا ہے۔"

مولانا کے یہاں ہوئے، ہوئی، ہوئیں اور ہوا کا استعمال اکثر ملتا ہے۔ میں ایسی اور چند مثالیں ذیل میں درج کیے دیتا ہوں۔

ص۴۲: "سب سے بڑا کام زندگی ہوئی یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔"

ص۹۵: "فطرت کی یکسانیوں اور ہم آہنگیوں کی طرح اس کی گاہ گاہ ناہمواریاں بھی ہوئیں۔"

ص۱۷۲: "سردی اور آتش دان کا رشتہ چولی دامن کا رشتہ ہوا ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔"

تقاضے ہیں۔ مقاصد ہیں۔ زندگی ہے۔ ناہمواریاں ہیں۔ رشتہ ہے پڑھ کر دیکھیے عبارتیں فصیح ہو جائیں گی۔

صفحہ ۴۸: "طبیعت وقت کی کشاکش سے یک قلم فارغ اور دل فکر و اندیشہ سے یکسر آسودہ ہے۔"

آسودہ کے معنی ہیں راحت پانے والا، آرام پانے والا، مطمئن، شکم سیر۔ مولانا کا مطلب ہے کہ انھیں فکر و اندیشہ مطلقاً نہیں مگر الفاظ سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ فکر و اندیشہ دل کی آسودگی کا باعث ہے۔ میرے خیال میں یہاں آسودہ محلِ نظر ہے۔

صفحہ ۴۹: "ان کا معمول تھا کہ رات کا پچھلا پہر ہمیشہ بیداری میں بسر کرتے۔"

پہر مذکر ہے۔ البتہ جب یہ یا سے کے ساتھ مرکب ہو کر آتا ہے تو وہ مرکب لفظ مونث استعمال ہوتا ہے۔

جو روز ہے وہ طول میں گویا ہے روز حشر ــــ برسوں سے دو پہر نہیں ڈھلتی پہر میں (ناسخ)
ایک ایک گھڑی روز قیامت سے بڑی ہے ــــ کس طرح کٹیں چار پہر ہجر کی شب کے (امیر)

جناب مالک رام نے رات کی پچھلی پہر میں کمی کی ذمہ داری کاتب پر ڈالی ہے تو پھر پچھلی لکھنے کا خطا وار بھی اسے ہی ٹھہرایا جائے اور صفحہ ۵۰ صفحہ ۲۵۸ اور صفحہ ۲۶۱ پر جو پچھلی پہر موجود ہے اُسے بھی کاتب ہی کی کارگزاری کہا جائے۔ میرے خیال میں کاتب سے مستقل مزاجی کی اس حد تک توقع کرنا زیادتی ہوگی۔

صفحہ ۵۰: "وہ بھی شاہ عبدالعزیز سے علی الصباح سن لیا کرتے تھے اور پچھلی پہر سے اٹھ کر اس کی تیاری میں لگ جاتے تھے"

پچھلے پہر ہونا چاہیے۔

صفحہ ۵۵: مرزا غالب کا مصرع تھا: کبھی حکایت صبر گریز پا کہیے

مولانا نے 'حکایت' کو 'شکایت' سے بدل دیا ــــ

کبھی شکایت صبر گریز پا کہیے

شکایت کی جاتی ہے یا لکھی جاتی ہے، کہی نہیں جاتی۔ "شکایت کہیے" صحیح نہیں۔ غالب کے پہلے مصرع میں "شکایت" کا لفظ آیا تھا اور اس کے ساتھ "لکھیے" کہا گیا تھا جو صحیح تھا۔

کبھی شکایت رنج گراں نشیں لکھیے
کبھی حکایت صبر گریز پا کہیے

صفحہ ۷۳: "اس سے ہم چینی فلسفۂ حیات کا زاویۂ نگاہ معلوم کر لے سکتے ہیں۔"

معلوم کر لے سکتے ہیں کے بجائے معلوم کر سکتے ہیں ہونا چاہیے۔

صفحہ ۷۶: "آج ہم اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے انھیں حل نہیں کر دے سکتے۔"

حل نہیں کر دے سکتے کے بجائے حل نہیں کر سکتے ہونا چاہیے۔

صفحہ ۷۹: "پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو۔"

جگہ نکال لے سکتی ہو کے بجائے جگہ نکال سکتی ہو ہونا چاہیے۔

صفحہ ۸۷: "ایک مطمئن زندگی بسر کر دی جا سکتی ہے۔"

بسر کر دی جا سکتی ہے کے بجائے بسر کی جا سکتی ہے ہونا چاہیے۔

صفحہ ۸۰: "ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کھل جا سکتے ہیں۔"

کھل جا سکتے ہیں کے بجائے کھل سکتے ہیں ہونا چاہیے۔

صفحہ ۹۳: "یہ موثرات اکثر صورتوں میں آشکارا ہوتے ہیں اور سطح پر سے دیکھ لیے جا سکتے ہیں۔"

دیکھ لیے جا سکتے ہیں کے بجائے دیکھے جا سکتے ہیں ہونا چاہیے۔

صفحہ ۹۶: "بلاشبہ اس کے بعد قدم کھلے اور ہندستان کے باہر تک پہنچے"

قدم کھلنا کوئی محاورہ نہیں۔

صفحہ ۹۷: "کتابوں کے درس میں منحصرہ گئی ہے۔"

منحصر کے ساتھ پر یا پہ آتا ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ــــ ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے (غالب)

صفحہ ۹۹: "والد مرحوم کی ایما سے چند مزید کتابیں بھی نکال لی تھیں۔"

ایما لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ مذکر بولا جاتا ہے۔

کچھ بھی ایما جو آپ کا پائیں ــــ سیکڑوں روز نستعلیق آئیں (قلق)

واں ہلے ابرو یہاں گردن پہ پھیری ہم نے تیغ
بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے (ذوق)

صفحہ ۹۹: "ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا۔"

طبیعت کا سکون ہلنا اردو کے لیے بار خاطر ہوگا۔

صفحہ ۱۰۰: "اُسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر دے سکتی۔"

جکڑ بند نہیں کر دے سکتی کے بجائے جکڑ بند نہیں کر سکتی ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۰۴: "تاہم وہ قدم اٹھا دیتے ہیں کیونکہ قدم اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

قدم اٹھا دینے کے بارے میں پہلے رائے زنی کر چکا ہوں۔

صفحہ ۱۰۶: "پھر اُسے اچھی طرح ہلا دیا کہ روشنائی کی دھودن پوری طرح نکل آئے۔"

دھودن مونث نہیں بلکہ مذکر ہے۔

عمر خضر سے اس کی زیادہ ہو زندگی ــــ دھوون پیے جو یار کی زلف دوتا کا (آتش)

صفحہ ۱۰۷: "اور دیکھیں اس تقاضا کا جواب ملتا ہے یا نہیں۔"

تقاضا کا کے بجائے تقاضے کا ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۱۲: "مثلاً اس کی ہر کل پیچ نکل جاتی ہے اور ساری چولیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک آ کر بیٹھ جاتی ہیں۔"

کل پیچ صحیح ترکیب نہیں ہے کیونکہ یہاں کہنا یہ مقصود ہے کہ ہر

کبھی وہ بیچ نکل جاتا ہے۔ اگر کج بیچ کو صحیح مانیں تو اس کے معنی ہوں گے ٹیڑھے بیچ۔

صفحہ ۱۱۳: "اگر جسم میں روح بولتی ہے اور لفظ میں معنی ابھرتا ہے تو ....."
اگر کوئی کہے کہ "اس لفظ کا معنی کیا ہے" یا "اس چیز کا دام کیا ہے" تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ وہ اہلِ زبان نہیں۔ معنی ابھرتا ہے کے بجائے معنی ابھرتے ہیں ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۱۴: "ہم حقیقت تولنے کے لیے اپنے محسوسات ہی کا ترازو ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔"
کا ترازو کے بجائے کی ترازو ہونا چاہیے۔ ترازو مونث ہے۔
نکلتے ہیں برابر اشک میری دونوں آنکھوں سے — متاعِ درد تُلنے کی ترازو ہو تو ایسی ہو (نسیم)

صفحہ ۱۲۳: "لیکن پھر بھی اسے ہردم جھانک لگائے تاک رہا ہو۔"

صفحہ ۱۲۴: "بلاشبہ تیرا پروردگار تجھے ہردم جھانک لگائے تاک رہا ہے۔"
جھانک لگائے تاکی اردو کا محاورہ نہیں۔ نہ محض جھانک لگانا کوئی محاورہ ہے۔ سورۂ فجر کی جس آیت کا ترجمہ مولانا آزاد نے کیا ہے کہ "بلاشبہ تیرا پروردگار تجھے ہردم جھانک لگائے تاک رہا ہے" اس کا ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے کیا ہے کہ "بے شک تیرا رب لگا ہے گھات میں۔"

صفحہ ۱۲۵: "اسے کارخانۂ قدرت کی لاانتہائیوں کے مقابلہ میں اپنی درماندگی کا قدم قدم پر اعتراف کرنا پڑتا ہے۔"
لاانتہائیوں کی ترکیب محلِ نظر ہے۔

صفحہ ۱۲۷: "جو حاصلات (RESULTANTS) یہاں کام کر رہی ہیں ہم ان کی توضیح ......"
حاصل اور حاصلات دونوں مذکر ہیں اس لیے کام کر رہے ہیں ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۲۷: ارتقائی تقاضا کا نچائی ظہور (EMERGENCE) جس طرح ابھرتا رہتا ہے ......"
تقاضا کا کے بجائے تقاضے کا ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۲۸: "جو حقیقت کی کسی آخری منزل تک ہمیں پہنچا دے سکتا ہو۔"
پہنچا دے سکتا ہو کے بجائے پہنچا سکتا ہو ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۲۸: "البتہ اس کی گرمی سے ہاتھ تاپ لیے جاسکتے ہیں۔"
تاپ لیے جاسکتے ہیں کے بجائے تاپے جاسکتے ہیں۔ ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۲۸: "اٹھارویں اور انیسویں صدی نے جو عقائد پیدا کیے تھے وہ اس صدی کے شروع ہوتے ہی ہلنا شروع ہو گئے۔"
عقائد ہلنا شروع ہو جانا عجیب سی اردو ہے۔ اسے سندِ قبول ملنا مشکل ہے۔

صفحہ ۱۳۷: "تصوف کی اکثر متداول مصنفات تقریباً اسی صدی اور اس کے بعد کی صدی میں مدون ہوئیں۔"
مصنفات مذکر ہے کی کے بجائے کے اور ہوئیں کے بجائے ہوئے ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۳۸: "ملا معین واعظ کاشفی وغیرہ کی مصنفات ایسے قصوں سے بھری ہوئی ہیں۔"
مصنفات مذکر ہے۔

صفحہ ۱۴۰: "جو بعد کی مصنفات میں طرح طرح کے ناموں سے ملتی ہیں۔"
مصنفات مذکر ہے۔

صفحہ ۱۴۱: "وہ جب چاہے ان کی زندگیوں کا خاتمہ کرا (دیے) سکتا ہے۔"
جناب مالک رام نے کرا دے سکتا ہے میں سے دیے نکال دیا۔ طبع ثالث کے صفحہ ۱۷۸ پر جہاں یہ عبارت درج ہے "خاتمہ کرا دے سکتا" لکھا ہے۔ اوپر دی ہوئی مثالوں سے یہ خوب واضح ہے کہ ایسے موقع پر مولانا خاتمہ کرا دے سکتا ہے ہی لکھتے۔

صفحہ ۱۵۹: "ہندوستان اور سیلون کی سیاہ پتی اُن کے ذوقِ چائے نوشی کا منتہائے کمال ہوا۔"
سیاہ پتی کے لیے ہوا کے بجائے ہوئی ہونا چاہیے۔ یعنی سیاہ پتی ان کے ذوقِ چائے نوشی کا منتہائے کمال ہوئی۔

صفحہ ۱۶۰-۱۵۹: اس میں ٹھنڈے دودھ کا ایک چمچہ ڈال کر کافی مقدار میں گدگی پیدا کر دی جاسکتی ہے۔"
پیدا کر دی جاسکتی ہے کے بجائے پیدا کی جاسکتی ہے ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۷۰: "اس ملک میں بارہ مہینے ہوائے معتدل کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ خیر بارہ مہینا کہنا تو صریح مبالغہ تھا۔"
بارہ مہینا کے بجائے بارہ مہینے ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۷۶: "جیسے دکھیو سردی کی بجبا ستانیوں کا شاکی ہے۔"
ستانی کو کسی اسم کے ساتھ مرکب کر کے استعمال کرتے ہیں جیسے

دل ستانی۔ جاں ستانی۔ رشوت ستانی۔ لیکن خوش ستانی۔ ناخوش ستانی بے جا ستانی۔ بر جا ستانی کہنا صحیح نہ ہوگا۔ میری رائے میں جا ستانیوں صحیح نہیں ہے۔

صفحہ ۱۷۹: "غیر نمایاں طور پر تو ہر طرح کی مصنفات میں مصنف کی انانیت ابھر سکتی ہے۔"

مصنفات مذکر ہے اس لیے ہر طرح کے مصنفات ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۸۰: "اس کی فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے جسے وہ دبا نہیں سکتا۔"

مولانا نے سرجوش انتہائی جوش یا ولولہ کے معنی میں استعمال کیا ہے لغت میں سرجوش کو صفت لکھا ہے اور اس کے معنی منتخب۔ عمدہ کے بتائے ہیں مثال میں یہ شعر پیش کیا ہے۔

تھی لبِ کہ شرابِ عشق سرجوش یہ کہتے ہی وہ ہوگئی بے ہوش (راسخ)

سرجوش کے دوسرے معنی جو لغت میں ملتے ہیں وہ ہیں "شوربا جو اول جوش کھا چکا ہو۔ مجازاً خلاصہ۔" یہاں ان دونوں معنوں میں سے کوئی معنی بھی ٹھیک نہیں بیٹھتے اور اس لفظ کا استعمال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

صفحہ ۱۸۳: "جو مصنف اپنی انانیت کی بے ساختہ تصویر کھینچ دے سکتے ہیں وہ ....."

کھینچ دے سکتے ہیں کے بجائے کھینچ سکتے ہیں ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۸۴: "انسان کی تمام معنوی محسوسات کی طرح اس کی انفرادیت کی نمود بھی مختلف حالتوں میں مختلف طرح کی نوعیتیں رکھتی ہے۔"

محسوسات مذکر ہے اس لیے کی کے بجائے کے ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۸۴: "ایسے افراد اپنی 'میں' کا سرجوش کسی طرح نہیں دبا سکتے۔"

سرجوش پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔

صفحہ ۱۸۵: "ایسے لوگ فکر و نظر کے عام ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے۔"

ترازو مونث ہے۔ کے کی جگہ کی ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۸۸: "اردو میں ہم 'ایگو' بجنسہ لے (لے) سکتے ہیں۔"

یہ جملہ طبع ثالث کے صفحہ ۲۳ پر درج ہے جہاں لے لے سکتے ہیں لکھا ہے۔ جناب مالک رام نے متن میں ایک 'لے' حذف کر دیا۔ انھوں نے اپنے ایڈیشن کے متن کو ۱۹۳۷ء کے طبع ثالث کے متن پر مبنی کیا ہے مگر ایک 'لے' حذف کر دینے کی کوئی وجہ ظاہر نہیں کی۔ ایسے ہی ایک اور حذف کی مثال پہلے گزر چکی ہے۔ مولانا کے یہاں کر دے سکتے۔ کر لے سکتے وغیرہ اس قدر استعمال ہوئے ہیں کہ ان کی کتابوں میں قدم قدم پر ملتے ہیں یہاں لے لے سکتے ہیں میں دو 'لے' کاتب کی عنایت کے مرہون منت نہیں بلکہ یقین ہے کہ مصنف ہی نے دو 'لے' لکھے ہوں گے۔ ابھی او پر نکال لے سکتی ہو اور معلوم کر لے سکتے ہیں درج کیے جا چکے ہیں۔ اس لحاظ سے یہاں لے لے سکتے ہیں بالکل قرینِ قیاس ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ طبع ثالث کی شہادت موجود ہے۔ اگر طبع اول یا دوم میں صرف ایک 'لے' پایا گیا ہوتا تو جناب مالک رام ضرور حاشیہ میں لکھ دیتے کہ فلاں متن کے مطابق تصحیح کر دی گئی۔ مگر شاید یہ امر واقعہ نہیں ہے۔

صفحہ ۱۹۰: "گویا دانہ کی پیش کش بھی ایک جرم ہوا۔"

جب پیش کش مونث ہے تو پھر پیش کش ایک جرم ہوا کہنا کیونکر درست ہوگا۔

صفحہ ۱۹۰: "اپنی غُرغُر اور چیوچیو کے شور سے کان بہرا کر دیتے ہیں۔"

یہاں کان بصیغۂ جمع استعمال ہونا چاہیے تھا۔ بہرا کی جگہ بہرے کا محل ہے۔

صفحہ ۲۰۲: "جن پھولوں کو یہ خارجی رعایت ..... نہیں ملتی بانجھ ہو کر بغیر بیج بنائے ختم ہو جاتے ہیں۔"

بیج پیدا کرنے کے مفہوم میں بیج بنانا کہنا صحیح نہیں ہے۔

صفحہ ۲۰۹: "زندگی نے بہت سی کہانیاں بنائیں۔ خود زندگی ایسی گزری جیسے ایک کہانی ہو۔"

ہے آج جو سرگزشت اپنی کل اس کی کہانیاں بنیں گی

مولانا نے امیر مینائی کا جو شعر نقل کیا ہے اس میں سرگزشت کی کہانیاں بننا کہا گیا ہے اور یہ صحیح ہے زندگی کہانی بن جاتی ہے یا اس کی کہانیاں بن جاتی ہیں مگر زندگی نے کہانیاں بنائیں نہیں بولتے۔

صفحہ ۲۱۰: "وہ ٹیلوں پر گر کے اسے کوڑے کرکٹ سے اَٹ دیتے۔"

اَٹ دینا نہیں بولتے۔ کہتے ہیں کہ گرد سے کمرہ اَٹ گیا مگر یہ نہیں کہیں گے کہ گرد نے کمرہ اَٹ دیا۔

صفحہ ۲۱۴: "یہ بات طے کر لی گئی کہ صبح کی معمولی صفائی کے علاوہ بھی کرے

میں بار بار جھاڑو پھر جانا چاہیے۔"

جھاڑو پھر جانے کے معنی ہیں گھر کا صفایا ہو جانا۔ برباد و تباہ ہو جانا۔ صبا کا شعر ہے:

آتے ہی بادِ صبا نے جھاڑو پھیری جائے گُل پتا چمن میں باغباں رکھتا نہیں

مولانا نے جھاڑو پھر جانا جن معنوں میں استعمال کیا ہے صحیح نہیں۔

صفحہ ۲۱۴: "ایک نیا جھاڑو منگوا کر الماری کی آڑ میں چھپا دیا۔"

"اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ خود ہی جھاڑو اٹھالیا اور ہمسایوں کی نظریں بچا کر جلد جلد دو چار ہاتھ مار دیے۔"

جھاڑو مونث ہے مولانا نے جھاڑو کے لیے نیا۔ چھپا دیا، اٹھالیا لکھا ہے جو صحیح نہیں۔

صفحہ ۲۷۱: "سلسلہ تعارکی درازی سے اکتا کر بیباکانہ قدم اٹھا دیا"

قدم اٹھا دیا پر پہلے اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔

صفحہ ۲۳۲: "عقاب دار فضائے لامتناہی کی لا انتہائیوں کی پیمائش کر رہا تھا۔"

لا انتہائیوں پر رائے زنی کی جا چکی ہے۔

صفحہ ۲۳۳: "ٹھیک اسی طرح انسان کے اندر کی خود شناسی بھی جب تک سوئی رہتی ہے ...."

خود شناسی تو اندر ہی کی چیز ہے۔ اندر کی خود شناسی سننے میں عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

صفحہ ۲۲۹: "تاہم میں نے محسوس کیا طبیعت کا سکون ہل گیا ہے۔"

طبیعت کا سکون۔ ہلنے پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔

صفحہ ۲۲۹: "یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں ان میں فرق نہ آنے پائے۔"

معمولات مذکر ہے۔

صفحہ ۲۴۰: "چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں اس لیے ....."

معمولات مونث نہیں بلکہ مذکر ہے۔

صفحہ ۲۴۴: "یکایک اس شاخ بریدہ سے پاؤں ٹھکرا گیا۔"

پاؤں ٹھکرا گیا۔ صحیح اردو نہیں ہے۔

صفحہ ۲۴۵: "لیکن ملک کا خزانہ دیکھیے تو اشرفیوں سے بھرپور ہو رہا ہے۔"

بھرپور کا یہ صحیح استعمال نہیں ہے۔ اشرفیوں سے بھرا ہوا ہے ہونا چاہیے۔ بھرپور مکمل کے معنی میں آتا ہے جیسے بھرپور شباب۔

صفحہ ۲۵۸: "جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی ہے تو چاند پردہ ہٹا کر جھانکنے لگتا ہے۔"

پہر مذکر ہے۔ اس پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔

صفحہ ۲۶۱: "رات کی پچھلی پہر میں ان کی ترنم کی نوائیں ایک سماں باندھ دیا کرتی تھیں۔"

پہر مذکر ہے۔

صفحہ ۲۶۵: "جس میں اس نے اپنی تمام مصنفات کا بہ تفصیل ذکر کیا تھا"

اپنی مصنفات کے بجائے اپنے مصنفات ہونا چاہیے۔

صفحہ ۲۶۸: "ان سے ہم مسلمانوں کے ذوق و اشتغال کے نتائج بآسانی نکال لے سکتے ہیں۔"

نکال لے سکتے ہیں کے بجائے نکال سکتے ہیں ہونا چاہیے۔

صفحہ ۲۷۸: "نہیں معلوم اس قضیہ کا غنچہ کیونکر گل کرتا ہے۔"

مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نہیں معلوم یہ غنچہ پھول بن کر کیا شکل اختیار کرے گا غنچہ۔ کے پھول ہونے کے معنی میں اردو میں گل کرنا نہیں بولتے۔ گل کرنا کے معنی چراغ بجھانے کے ہیں۔

گُل کر دیا ہوا نے جو شمع مزار کو (رشک)

صفحہ ۲۸۲: "لیکن اس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل جا سکتا۔"

مولانا کا مقصد ہے کہ شریعت کا حکم اٹل ہے وہ اپنے مقام سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ نہیں ہل جا سکتا صحیح نہیں۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ ہل جا سکتا میں جا زائد ہے۔

آخر میں ضمناً شریعت کے اس حکم کا ذکر بھی کر دینا چاہتا ہوں جسے مولانا آزاد نے نہ بھلنے والا کہا ہے انھوں نے سورہ اعراف کی اس آیت سے

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ

(ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے

بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟) موسیقی کا جواز ثابت کیا ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اس بات کی کوئی اصلیت نہیں کہ اسلام کا مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرماتِ شرعیہ میں داخل ہے۔ میں نے ایک عالمِ دین سے پوچھا کہ کیا مندرجۂ بالا آیت سے موسیقی کا جواز نکلتا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ حیرت ہے کہ مولانا آزاد جیسے عالمِ دین نے اس آیت سے وہ چیز ثابت کرنے کی کوشش کی جس کی تائید آیت کے الفاظ سے ہرگز نہیں ہوتی۔ پھر فرمایا کہ مولانا کے علم میں رسول کریمؐ کی وہ متعدد حدیثیں بھی ہوں گی جن میں غنا کی مذمت کی گئی ہے مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت جو انھوں نے آنحضرتؐ سے کی ہے:

الغنا ینبت النفاق فی القلب کما ینبت الماء البقل۔

(غنا دل میں ایسے نفاق پیدا کرتا ہے جیسے پانی سبزی اگاتا ہے)

تعجب ہے کہ پھر بھی مولانا آزاد نے موسیقی کو جائز سمجھا اور جواز میں وہ آیتِ قرآنی پیش کی جس کا موسیقی سے کوئی تعلق نہیں۔

اُردُو رُبَاعی

(بسلسلہ صفحہ)

جام و مینا و ساقی و ساغر و بربط و مے کے دور آئے اور روحِ پر ور نغمے چھیڑے تو ساقی کی آنکھوں کے اشاروں میں ہماری اس وقت کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی جھومتی جھولتی نظر آئی اور سازِ رباعی سے فلسفۂ حیات کے راگ سنائی دینے لگے۔ رندی کی وہ بے فکری اور دنیا کی بے ثباتی کا وہ شدید احساس جسے بھول جانے کی دعوت خیام نے بار بار دی تھی، زندگی کا ایک فطری نوحہ بن گئی تھی۔"

اردو کے قدیم غزل گو اساتذہ نے زیادہ تر خیام ہی کی ریس کی اور تصوف کے مرغزار میں گشت لگاتے رہے۔ مرثیہ گویوں نے رثائی فضا اور مجلسِ عزا کا ماحول برقرار رکھنے کے خیال سے اس میں مرحیہ و حزنیہ مضامین بڑھائے اور اسے اخلاقیات کے درس کا ایک آلہ بنایا۔ اور ان کے سرخیل انیس نے اپنی سحر بیانی سے اس میں بیان کردہ خشک سے خشک اور تلخ سے تلخ مضمون کو عنبِ شاداب جیسی تازگی اور شہد جیسی شیرینی بخشی۔ اکبر و حالی و شاد نے اس میں قومی و ملی اصلاح کے اجزا کا اضافہ کیا۔ امجد و شہید و کشفی و رواں نے مختلف النوع مضامین سے اسے گراں بار کیا اور اقتضائے زمانہ کے مطابق سنوارا اور نکھارا۔ فراق نے اس میں روپ سنگار اور حکایتِ جسم رنگین کا ایک نیا باب کھولا۔ جوش نے اسے شبابیات و جمالیات و طنزیات و الہیات کا گنجینہ بنایا۔ جمیل مظہری اور ملا نے اس پر فلسفہ، حکمت، قومیت و سیاست کا رنگ و روغن چڑھایا۔ ڈاکٹر صفدر آہ نے اس میں تمثیل نگاری کی ایک نئی شاخ نکالی اور ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اسے دیومالائی اور تاریخی تلمیحات کا جدید ترین زیور پہنا کر ایک خالص ہندی دلہن بنا دیا۔

غرض، اب ہماری زبان کی رباعی کا کسی مشرقی و مغربی زبان میں کوئی حریف بن سکتا ہے اور نہ مدِ مقابل۔ اردو رباعی کا کارواں ان سب آگے نکل گیا ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج اردو رباعی کا جھنڈا رفعتوں کے ایورسٹ پر لہرا رہا ہے!——

★

حسن ڈیرہ دون

آنند موہن زتشی گلزار دہلوی

یہ حسن ڈیرہ دون گھٹائیں یہ گھاٹیاں
یہ سبزہ زار و کوہ یہ منظر یہ وادیاں

برکھا کی رت کی شان یہاں کچھ عجیب ہے
بہتا ہوا ہے چاندی سا پانی کہ سیل ہے

چشمے ابل رہے ہیں جو ایک ایک گام سے
دو گھونٹ ان کے بڑھ کے ہیں صہبا کے جام سے

گھر گھر میں برگ و بار ہیں لیچی کے آم کے
قربان غنچہ غنچہ کے رنگین جام کے

حدِ نگاہ تک جو ہے سبزہ بچھا ہوا
رشتہ زمین کا ہے افق سے ملا ہوا

ہر سمت شعر و نغمہ ہے دورِ شراب ہے
سورج مکھی کھلی ہے خجل آفتاب ہے

چاول کے اور چائے کے ہر سمت کھیت ہیں
برکھا کی بیٹیاں" ہیں ہزاروں ادائیں

ہیں ملگجے لباس میں سب شاہزادیاں
رنگین جن کے دم سے ہوئی ہیں یہ وادیاں

زیور نہیں ہے تن پہ مگر حسن واہ وا
"اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا"

بستے ہیں جلترنگ شب و روز خوش نصیب
دن بھی یہاں عجیب ہے اور رات بھی عجیب

ہیں جگنوؤں کی شب میں عجب خوش نمائیاں
تاریکیِ فضا میں ہیں چنگاریاں رواں

جگنو چمک رہے ہیں یہاں تخت تخت پہ
روشن ہزاروں بلب ہیں اک اک درخت پہ

رستے دکھا رہے ہیں چمن میں یہ التفات
جنگل میں چپے چپے پہ خنداں گلِ حیات

معلوم ہو رہے ہیں فرشتے یہ نور کے
یا ذرے منتشر ہیں فضاؤں میں طور کے

تاریک وادیوں میں پرافشاں ہیں ضو فشاں
کالی گھٹا پہ رقص کرے جیسے کہکشاں

یا منعکس ہوئے ہیں فضا میں اک آن سے
چادر گری ہے تاروں کی یا آسمان سے

یا رات کو یہاں یہ نگینے برستے ہیں
یا شب چراغ بن کے پسینے برستے ہیں

اک شاخِ گل جو بوجھ سے ان کے لچک گئی
جیسے نظر کے سامنے بجلی چمک گئی

یا پارے ماہتاب کے ٹوٹے ہیں چرخ سے
یا آتشیں انار یہ چھوٹے ہیں چرخ سے

شاداب کیا ری کیاری میں ہیں چاندنی کے پھول
پیغامِ حسن لائے ہیں یہ نور کے رسول

مخمل چمن میں دیکھیے چادر سی کھنچی ہوئی
جنگل میں کامدانی کی چنری بچھی ہوئی

یوں کرنیں پھوٹتی ہیں یہاں برگ برگ سے
جیسے کہ کامنی کوئی آئی ہو سنگھار سے

پوجا کو کام دیو کی آئی ہے رات کو
تسخیر کرنے حسن سے کل کائنات کو

ہاتھوں میں آرتی کی ہے تھالی لیے ہوئے
روشن دیے ہزاروں لوں کے کیے ہوئے

یا شمعِ گلستاں کی زباں شعلہ بار ہے
پروانہ وار لیلیِ شب خود نثار ہے

دیپک کی سیکڑوں ہیں قطاریں بنی ہوئی
جنگل میں پر شباب دوالی منی ہوئی

بانات کا ہے قدرتی پردہ تنا ہوا
جنگل میں مختصر یہ ہے منگل منا ہوا

منظر ہزار وقت سفر اور نگاہ ایک
ہر سمت واہ وا کا سماں دل کی آہ ایک

ان منظروں سے روح پہ طاری سرور ہے
پرتو کسی کے حسن کا ان میں ضرور ہے

اک آرزو نے دل میں لیا ہے جنم یہاں
اپنا الگ بنایئے دیر و حرم یہاں

کہتا ہے دل کہ پریم کا مسکن بنایئے
گلشن میں ڈیرہ دون کے ڈیرہ جمایئے

اقبال کا کہا ہوا پورا کریں گے ہم
دامانِ کوہسار میں جا کر بسیں گے ہم

پیری میں آکے دون میں دھونی رمائیں گے
گلزار دہلوی یہیں کٹیا بنائیں گے

فلمی دنیا اور قومی یک جہتی

خواجہ احمد عباس

ایک زمانہ تھا کہ ہندستانی فلمی دنیا قومی یک جہتی کا نمونہ تھی۔ شاید اب بھی ہے۔

ہیرو پشاور کا (مثلاً دلیپ کمار یا راج کپور) ہیروئن مدراس کی (مثلاً وجینتی مالا یا پدمنی) ولین پنجاب کا (مثلاً پران) ڈائرکٹر بنگال کا (مثلاً بمل رائے مرحوم یا رشی کیش مکرجی) کہانی لکھنے والا میسور کا (مثلاً آر۔ کے۔ نرائن) یا پانی پت کا (مثلاً خواجہ احمد عباس) ڈائلاگ لکھنے وا

"ہم ایک تھے" "ہم ایک ہیں"

لکھنؤ کا (مثلاً آغا جانی کشمیری یا مرزا وجاہت) کیمرہ مین بمبئی کا (مثلاً فریدوں ایرانی) یا دہلی کا (مثلاً آر۔ ڈی۔ ماتھر) ساؤنڈ ریکارڈسٹ گجرات کا (مثلاً مینو کاترک) میوزک ڈائرکٹر حیدرآباد کا (مثلاً شنکر) یا راجستھان کا (مثلاً جے کشن) سیلے بیک سنگر مہاراشٹر کا (مثلاً لتا منگیشکر) ڈانس ڈائرکٹر بنارس کا (مثلاً گوپی کرشن) اور رقاصہ مارواڑی یا گجراتی یا سندھی۔ ایک ہی فلم کی تیاری میں پنجابی، بنگالی، تامل، آندھرا، مرہٹہ، گجراتی، اتر بھارتی، ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ، عیسائی فن کاروں اور ٹیکنیشنز کا اشتراک ضروری ہے۔ یا کم سے کم ضروری تھا۔

فلمی ہندوستانی، غیر سرکاری راشٹر بھاشا!

ایک زمانہ تھا جب بڑا اور دیو کی بوس کی فلموں کے ڈائلاگ لکھتے تھے پنجاب کے کردار شرما اور گیت لکھتے تھے حضرت آرزو لکھنوی اور ان کی دھنیں بناتے تھے بنگالی آر۔ سی بورال۔ جب شانتا رام کی فلموں کے افسانے اور ڈائلاگ اردو کے مشہور شاعر وادیب دیوان شرر لکھتے تھے۔ جب یو۔ پی کے بھگوتی چرن ورما کا ناول چترلیکھا کلکتہ میں فلمایا جاتا تھا اور بنگال کے ٹیگور کا ملن (نوکا ڈوبی) بمبئی میں فلمایا جاتا تھا اور بنگال کا ہمانسو رائے بمبئی ٹاکیز قائم کرتا تھا اور پنجاب کا آر۔ ڈی۔ نارنگ بنگال میں فلمیں بناتا تھا اور تامل ناڈ کا واسن مدراس میں ہندی فلمیں بناتا تھا اور کوئی ڈی۔ ایم۔ کے والے اس کا ہاتھ نہیں روکتے تھے۔ سارے ہندستان کے کونے کونے

(کیا) ہم ایک رہیں گے"

سے آئے ہوئے فلم آرٹسٹ مہاراشٹر کی راجدھانی بمبئی میں رہتے اور کام کرتے تھے اور کوئی شیو سینا اُن پر اعتراض نہیں کرتی تھی۔

تب ہی تو دھیرے دھیرے چپکے چپکے بغیر کسی سیاسی لڑائی جھگڑے کے، بغیر کسی ہنگامے یا پروپگنڈے کے، بغیر کوئی قانون بنائے یا کوئی قانون توڑے، فلمی ہندستانی (جسے کوئی ہندی کہتا تھا کوئی اردو) اپنے ڈائلاگ اور گیتوں کی مقبولیت کی وجہ سے سارے ملک میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اگر کوئی بنگالی یا تامل ناڈ کا رہنے والا کسی پنجابی یا لکھنوی سے ناگپور کی سڑکوں پر ملتا تھا تو وہ جس بھاشا میں بات چیت کرتے تھے وہ یہی فلمی ہندستانی تھی جو پورے دیس میں ہندی یا ہندستانی فلموں کی مقبولیت کے باعث ہندستان کی راشٹر بھاشا بنتی جا رہی تھی۔

ایکتا کے ترانے

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی سامراج کے ہوتے ہوئے بھی

ہریانہ کے خواجہ احمد عباس کی لکھی ہوئی اور جھانسی کے بنگالی شاشادھر مکرجی کی پروڈیوس کی ہوئی فلم "نیا سنسار" میں علی گڑھ کی رینو کا دیوی اور بنگال کا اشوک کمار دونوں مل کر اتر پردیش کے ہندی کوی پردیپ کا لکھا ہوا گانا گاتے تھے :

"ایک نیا سنسار بسالیں ایک نیا سنسار
ایسا ایک سنسار کہ جس میں بھارت ہو آزاد
کہ جس میں جنتا ہو آزاد
جنتا کا ہو راج جگت میں جنتا کی سرکار
مسجدوں کی میناریں بول اٹھیں
مندروں کی دیواریں بول اٹھیں
بند کرو مذہب کے جھگڑے آپس کی تکرار
ایک نیا سنسار بسالیں ایک نیا سنسار"

اور جب فلم "قسمت" میں اسی کوی پردیپ کا لکھا ہوا گیت ممتاز شانتی کی زبانی سُنائی دیتا تھا :

"دور ہٹو اے دنیا والو
ہندوستان ہمارا ہے"

اور جب پرتھوی تھیٹر کے ناٹک "دیوار" میں جوش بھرا گیت سنائی دیتا تھا:

"ہم ایک تھے ۔ ہم ایک ہیں ۔ ہم ایک رہیں گے"

تو سارے ہندوستان میں شلانگ میں اور راج کوٹ میں اور دہلی میں اور لاہور میں (کیونکہ اس وقت لاہور بھی ہندوستان میں ہی تھا) اور لکھنؤ میں اور ناگپور میں اور مدراس میں اور ترچناپلی میں لاکھوں کروڑوں ہندوستانی جب ایسے گانے سنتے تھے تو ان کے من میں ہندوستانیت جاگ اٹھتی تھی ۔ ہندوستانی ہونے کا احساس — اور اس کے ساتھ ہی ایک گہری محبت — ہندوستان سے — ہندوستانیوں سے اور اس زبان سے جسے وہ فلمی ہندوستانی کہتے تھے اور جس میں اُن کے دل کی تڑپ اور اُن کے دماغ کی گونج تھی ۔

ہندوستانی سینما فنی اعتبار سے اچھا تھا یا بُرا تھا "دیوداس" اور "ودیاپتی" جیسی فلمیں بنی چاہیے تھیں یا "خزانچی" اور "کھڑکی" اور "رتن" "شن شن سنا کی بولا بو" جیسی ...... یہ ایک الگ بحث ہے لیکن اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستانی فلم سٹوڈیو ایک طرح سے ہندوستان کے پنچ رنگی کلچر کا نمونہ تھے اور ہندوستانی فلم کے کلاکار جو گھر میں پنجابی، سندھی، تامل، تیلگو، بنگالی، گجراتی، مرہٹی کچھ بھی بولتے ہوں، اسٹوڈیو میں آکر سب نہ صرف ہندوستانی فلموں میں کام کرتے تھے بلکہ آپس کی بول چال میں بھی وہی ایک بھاشا بولتے تھے جو فلموں کے ذریعے بن رہی تھی اور سارے دیش میں پھیل رہی تھی ۔ اور اس لحاظ سے ہندوستانی سینما نے قومی اتحاد، ہندوستانیت ہندوستانی کلچر اور ہندوستانی بھاشا کا پرچار کرکے دیش کی بہت بڑی سیوا کی ہے ۔

ہندوستانی فلموں کے خلاف تحریک

آج وہ دور ختم ہو رہا ہے ۔ یا اس کو ختم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں ۔

آج ہندی، ہندوستانی، اردو فلموں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے پہلے تین سو ہندوستانی فلمیں بنتی تھیں اب صرف سو سوا سو بنتی ہیں ۔ باقی دوسری زبانوں میں بنتی ہیں — تامل میں ۔ تیلگو میں ۔ بنگالی میں ۔ آسامی میں ۔ اڑیا میں ۔ مرہٹی میں ۔ گجراتی میں ۔ پوربی میں ۔ بھوجپوری میں ۔ سندھی میں ۔ ملیالم میں ۔ کنڑ میں ۔

پہلے فلمیں بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں بنتی تھیں، سارے ہندوستان کے لیے ۔

اب کلکتہ میں بنگالی فلموں کا زور ہے ۔ سال میں دو تین سے زیادہ ہندوستانی فلمیں نہیں بنتیں ۔ مدراس میں تامل فلموں کا زور ہے ۔ حیدرآباد میں تیلگو فلموں کا ۔

جب سے زبان کی بنیاد پر ہندوستان کا بٹوارہ کیا گیا، تب سے علاقائی بھاشاؤں میں فلمیں بنانے کا دستور ہو گیا ہے ۔

ہر پردیس اپنی علاقائی زبان میں فلم بنوانے کی کوشش کر رہا ہے ۔

ان فلموں کو ہر قسم کی رعایتیں دی جاتی ہیں تاکہ ہندی فلموں کے مقابلے میں علاقائی فلمیں زیادہ کامیاب ثابت ہوں ۔ بنگال میں ایک تحریک چل رہی ہے کہ سب سینما گھروں کو مجبور کیا جائے کہ ہر برس میں اتنے ہفتے بنگالی فلمیں دکھائیں

بمبئی میں مرہٹی فلموں کے چلانے کے لیے قانون بن چکا ہے۔ اور جگہ بھی ایسے قانون بنیں گے۔ قانون نہیں بھی بنیں گے تو جیسے تامل ناڈ میں ہندی کے خلاف تحریک چلی اور سب ہندی فلموں کا چلنا بند کر دیا گیا تھا ایسے ہی اور اندولن چلیں گے۔

اتحاد کا علمبردار

میں علاقائی زبانوں کی ترقی چاہتا ہوں۔
میں علاقائی کلچروں کی ترقی چاہتا ہوں۔
میں چاہتا ہوں کہ بنگالی تھیٹر زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔
میں چاہتا ہوں کہ ملیالم ناول اور افسانہ ترقی کرے۔
میں چاہتا ہوں کہ تامل ڈرامہ اور نرتیہ کلا ترقی کرے۔
میں چاہتا ہوں کہ مرہٹی اسٹیج کی پھر وہی شان ہو جو پہلے تھی۔

لیکن میں چاہتا ہوں کہ اور سب آرٹ اور تمدنی ذرائع علاقائی زبانوں اور علاقائی کلچر کی ترقی کے لیے بے شک استعمال ہوں مگر سنیما آرٹ کو قومی یک جہتی کے لیے چھوڑ دیں اور اس کو ملک میں سیاسی، سماجی، تمدنی اتحاد پیدا کرنے کے لیے استعمال کریں، کیونکہ اس آرٹ کی خصوصیات ہی ایسی ہیں، اس کی ضروریات ہی ایسی ہیں، اس کی تاریخ ہی ایسی ہے کہ یہ لاکھوں کروڑوں روپے کا کھلونا بہت بڑے پیمانے پر ہی استعمال ہو سکتا ہے۔ اس کو علاقائی زبانوں میں محدود کرنے کی کوششیں نہ صرف ہمارے قومی اتحاد کے نصب العین کو نقصان پہنچائیں گی بلکہ خود ہندوستانی سنیما کو بھی نقصان پہنچائیں گی... تجارتی اعتبار سے بھی اور آرٹ کے اعتبار سے بھی!

فلم کا بجٹ

اگر ہم فلم کے بجٹ پر ہی غور کریں تو ہم کو یقین ہو جائے گا کہ جب تک فلم کو سارے ملک میں نہ دکھایا جا سکے تو اچھا فلم نہیں بن سکے گا۔ آج ایک رنگین فلم کے بنانے میں کم سے کم بیس تیس لاکھ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ کیا کوئی بھی علاقائی زبان کا فلم اتنا خرچہ برداشت کر سکتا ہے؟ ہندی فلموں میں (تمام دنیائی فلموں کی طرح) تکنیک کی سطح اونچی اور مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ بنگالی، گجراتی، مرہٹی، پنجابی، آسامی اور یہ فلمیں اپنے چھوٹے سے علاقے سے زیادہ سے زیادہ دو تین چار لاکھ ہی بنا سکتی ہیں۔ تامل اور تیلگو فلم پروڈیوسر کسی قدر مہنگے فلم بنا سکتے ہیں مگر وہ بھی ہندی فلموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بنگالی فلم آرٹ کے اعتبار سے اور فلموں سے بہتر ہوتے ہیں لیکن جب بنگالی ڈائرکٹر ہندی فلم بناتے تھے اس زمانے میں بھی اُن کے فلم آرٹ کے اعتبار سے بہتر ہوتے تھے۔ اگر اچھے اور قابل بنگالی ڈائرکٹروں سے کم بجٹ میں بنگالی فلم بنوانے کے بجائے زیادہ بجٹ میں ہندی فلمیں بنوائی جائیں تو ہندی سنیما کی فن کارانہ سطح اونچی ہو سکتی ہے۔ لیکن صرف بنگال میں محدود ہو کر اُن کے فلم تکنیک کے لحاظ سے دنیا کے فلموں بلکہ ہندی فلموں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔

یہ تو ہوا فلموں کا فن کارانہ اور تجارتی پہلو۔ مگر میں جس پہلو پر زور دوں گا وہ ہے فلموں کے ذریعے قومی یک جہتی کا پرچار اور پھیلاؤ۔ تعلیم، کتابیں، اخبار، تھیٹر، گیت ـــــ سب علاقائی زبانوں میں ہوں گے اور ہوا کریں گے۔ کم سے کم ایک آرٹ تو ایسا ہونا چاہیے جس سے ہمارے ملک کے لوگوں میں (چاہے وہ کسی علاقے کے ہوں، کوئی بھی زبان بولتے ہوں) ہندوستانیت کا احساس، قومی یک جہتی اور وحدت کا جذبہ پیدا ہو اور پروان چڑھے۔ وہ آرٹ۔ بڑا خوبصورت اور طاقتور آرٹ ـــــ سنیما ہی ہو سکتا ہے جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لا سکتا ہے، قریب لایا ہے اور قریب لائے گا۔ اگر ہم ملک کی طرح اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیں۔

★

غزل

طاہرہ رضوی برق

آپ کی طرزِ جفا انجمنی کیا ہو گی
پھر وہی کم نگہی، کم سخنی کیا ہو گی

ہم نشیں سُن کے مرا قصۂ غم ہنستے ہیں
اس سے بڑھ کر مری خاطر شکنی کیا ہوگی

دیکھ اس طرح کہ محروم تبسم ہنس دیں
ورنہ زخموں کی یہ غنچہ دہنی کیا ہوگی

رشکِ فردوس یہ گل زار سہی تو جو نہیں
شاخ در شاخ یہ گل پیرہنی کیا ہوگی

لو وہ ہونے لگی سرگوشیِ جام و مینا
شیخ اور رند میں ایسی بھی چھنی کیا ہوگی

شاخِ گل کتنی اداؤں سے لچک جاتی ہے
اے صبا! پوچھ یہ نازک بدنی کیا ہوگی

ایک حساس دل اور اتنے مصائب اے برق!
یہ نہ سوچا کہ مری جاں پہ بنی کیا ہوگی

غزل

عابد متین

کیا کروں شرح، کیا کروں تفسیر
حُسن آزاد ہے، نہ عشق اسیر

آپ آئیے برائے سیرِ بہار
یا چمن کی بدل گئی تعدیر

تیری زلفوں سے شام میں نکہت
تیرے عارض سے صبح میں تنویر

سر خود دار کیا جھکا اپنا
آستانے کی بڑھ گئی توقیر

جب سے قسمت پہ فیصلہ چھوڑا
اور ناراض ہو گئی تدبیر

یا شریکِ دُعا خلوص نہیں
یا دوا میں نہیں رہی تاثیر

یا شعورِ نظر ہوا رُسوا
جلوے جلوے کی ہو گئی تشہیر

تیرگی میں مرے نقوشِ قدم
بانٹ دیتے ہیں راہ کو تنویر

حادثوں نے بدل دیا ہے مزاج
اب نہیں لب پہ نالۂ شب گیر

پھول اُن کو عزیز، خار مجھے
وہ نصیب اُن کے، یہ مری تقدیر

دیجیے، اے متینؔ! دل کا لہو
کیجیے قصرِ شعر کی تعمیر

تخلّص کی داستان

علی جواد زیدی

شکسپیر نے کہا تھا کہ "نام میں کیا دھرا ہے؟" لیکن ناموں میں بھی تاریخ و روایت کی طویل داستانیں چھپی ہوتی ہیں۔ مُلک مُلک، خطّے خطّے، مذہب مذہب، مرد، عورت، غلام آقا کے نام مختلف ہوتے ہیں اور یہ اختلافات بڑے دلچسپ اور لائقِ مطالعہ ہیں۔ اس پوری داستان کا دہرانا ناممکن ہے۔ ناموں کی صرف ایک صنف "تخلص" کے بارے میں اتنا مواد موجود ہے کہ ایک کیا کئی مضمون لکھے جاسکتے ہیں۔

عام طور سے تخلص، نام سے مختلف ہوتے ہیں، لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنے نام ہی کو تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مثلاً ہدایت اللہ خاں ہدایت، صفدر علی صفدر، خواجہ وزیر وزیر، امیر احمد امیر مینائی، الٰہی بخش الٰہی، نواب محبت خاں محبت، موجی رام موجی، نوازش حسین خاں نوازش، بندہ علی بندہ، ہر چند کشور ہر چند، شاہ نصیر الدین نصیر، حکیم مومن خاں مومن، قدرت اللہ قدرت، لالہ لچھمن لال لچھمن وغیرہ۔ ایسے تخلص بے شمار ہیں۔ بعض نے تو پورے پورے ناموں کو تخلص قرار دے کر تلاشِ تخلص سے نجات پالی تھی۔ مثلاً علی جان، اعلیٰ علی، کرم علی، روح الامین، غلام حسین خاں وغیرہ[1]۔

بعض شعرا نے اپنی قومیت اور نسب کو تخلص کے لیے منتخب کیا۔ یہ صورت سیّدوں کے یہاں زیادہ نظر آتی ہے۔ میر مجاہد الدین کا تخلص سیادت تھا اور میر غلام رسول، میر غالب علی خاں، میر امام الدین، میر قطب الدین یا قطب علی، میر یادگار علی، ان میں سے ہر ایک کا تخلص سیّد تھا۔ عیا الشعرا میں قطب الدین کو مرزا بتایا گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ان کو اس فہرست سے خارج سمجھنا چاہیے۔ لیکن قومیت کو تخلص کے طور پر استعمال کرنے والوں میں سیّد تنہا نہیں ہیں۔ ان میں محمدی خاں خاںؔ کی طرح کے لوگ بھی ہیں اور چکبستؔ اور ملّاؔ کی طرح کے اکابر بھی۔

دو چار شاعر ایسے بھی ملے جنھوں نے اپنی عرفیت کو تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مثلاً جگنؔ جو شیر افگن کے اعزا میں تھے۔ میاں میرن سبز داری نے میرنؔ تخلص اپنایا۔ محمد علی خاں عرف مرزائی نے مرزائیؔ تخلص اختیار کیا۔

کم از کم ایک شاعر ایسے بھی ملے جنھوں نے وطنیت کو تخلص کے لیے چُنا۔ یہ شاہ امام بخش ہیں جن کا تخلص تفسیری مذکور ہوا ہے۔ ان کا وطن تھا تفسیر محلہ۔

عرفیت، وطنیت اور قومیت کے ساتھ ساتھ پیشے کی جھلک بھی بعض تخلصوں میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً عنایت اللہ حجّام جن کی دوکان دلی میں مدرسہ غازی الدین خاں (متصل اجمیری دروازہ) تھی، نہ صرف حجّام تخلص کرتے تھے بلکہ مقطع میں اسی مناسبت سے مضامین بھی نظم کرتے تھے ؂

کام کیا زور یہ حجّام نے   شیخ کی داڑھی کو تمر کر گیا

ندر جیت جوہری کا پیشہ بھی ان کے تخلص سے ظاہر ہے۔ غلام ناصر جرّاح کا تخلص بھی ان کے آبائی پیشے کا اعلان کرتا ہے۔ محمد عارف تخلص ہی کے نہیں بلکہ سچ مچ کے رفوگر تھے۔ میر محمد حسین منشی کا پیشہ آج کل کی منشی گری نہیں بلکہ انشا پردازی تھا۔ چنچل ایک شاعرہ کا تخلص بھی تھا اور اس سے اس کی اصل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ طبیبوں کے پیشے میں اس کا خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ حکیم محمد اشرف خاں اور حکیم محمد پناہ خاں، دونوں ہی کا تخلص حکیم تھا۔ حکیم بار علی نے شفا تخلص اختیار کیا۔

---

[1] مسرت افزا: ۱۳۰

جب سے نظم گوئی کا دور شروع ہوا، اکثر شعرا نے تخلص ترک کر دیا۔ نظموں میں تخلص نہیں کرتے تھے۔ غزلوں میں بھی مقطع کی پابندی نہیں رکھی، لیکن اس معاملے میں دو پیش رو قرار نہیں دیے جا سکتے تھے۔ قدما میں بھی کم از کم ایک شاعر ایسا نظر آتا ہے جس نے غزلوں میں تخلص نظم کرنا ترک کر دیا تھا۔ ان کا نام جان عالم خاں تھا۔ یہ نواب روشن الدولہ کے بھائی اور میر سوز کے شاگرد تھے۔ میر حسن لکھتے ہیں کہ غزلوں میں تخلص نظم ہی نہیں کرتے، محتاج شہرت نہیں ہیں۔[1]

کچھ زندہ دلوں نے عجیب و غریب تخلص اختیار کیے۔ مثلاً محمد شاہ کے زمانے میں ایک عجیب و غریب شخص تھا۔ اس کے سامنے کوئی بھی شعر یا رباعی یا دوہرہ یا عربی فارسی میں کچھ پڑھا جاتا تو لفظوں کی ساخت کے مطابق کوئی بے معنی شعر یا رباعی نظم کر دیتا۔ ذرا بھی فکر و تامل نہ کرتا۔ اگر کوئی دہرانے کو کہتا تو دہرا نہ پاتا بلکہ اسی طرح کی کوئی اور چیز فی البدیہہ نظم کر دیتا۔ اسی مناسبت سے تخلص اٹکل پچو اختیار کیا۔ اس شاعر کا نام زمانے نے بھلا دیا، تخلص باقی رہ گیا۔ میر علی نقی دہلوی شروع میں تیکتی اور جنون تخلص کرتے تھے، لیکن چوں کہ افکار و خیالات میں نامقید تھے اس لیے انھوں نے اپنا تخلص کافر قرار دے لیا۔ جو شعر ان کے دل کو لگتا کہتے کہ یہ "پکا ہے" اسی بنا پر وہ "کافر پکا" مشہور ہو گئے۔[2] لیکن میر نے لکھا ہے کہ کافر جن شعروں میں تخلص نظم کرتے تھے انھیں "کافر پکا" کہتے تھے۔ چنانچہ اکثر مجلسوں میں یہ کہہ کے شعر سناتے کہ "آج کل ایک کافر پکا نظم کیا ہے"۔[3]

قدیم روایت یہ بھی کہ اپنے بارے میں نہایت خاکسارانہ لہجہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ خطوں اور دیباچوں میں لوگ بہت بعد تک اپنے کو خاکسار، بندہ، احقر، فدوی وغیرہ لکھا کرتے تھے۔ اس روایت نے تخلصوں میں بھی راہ پائی۔ مثلاً مرزا جواد علی قزلباش احقر لکھنوی، میر بندہ علی بندہ لکھنوی اور میر محمد یار عرف کلو خاکسار دہلوی۔ فدوی تخلص خاصا مقبول رہا ہے۔ میر فضل علی دہلوی، سید محمد محسن لاہوری ثم دہلوی، مرزا محمد دہلوی عرف مرزا بجو اور مکند لال لاہوری ان سب کے تخلص فدوی تھے۔ عارف الدین عاجز کا تخلص بھی اسی زمرے میں آتا ہے اور میاں کترین کا تخلص بھی اسی رجحان کا غماز ہے!

شاعرات کے تخلص میں نسوانی خصوصیات کا پرتو نظر آتا ہے۔ مثلاً نزاکت، دلبر، نازک، شمع، فرح، چندا، چمپا، خانم، اور جیتا، جانی، جانان، زینت، حیا، ادا۔

امیروں، بادشاہوں اور شاہزادوں کے تخلص میں شان و شوکت اور عیش و عشرت کا اظہار کچھ ضروری سا ہو گیا تھا۔ مثلاً شاہ عالم آفتاب، بہادر شاہ ظفر، مبارز الدولہ نامی، وجیہ الدولہ وجیہ، امین الدولہ امیر، نواب محمد یار خاں امیر، کلب علی خاں ناظم، مرزا محمد صادق ثروت، مرزا محمد تقی ہوس، مرزا محمد تقی خاں بہادر ترقی، راجہ بلاس رائے بریلوی بہار، آج، مرزا زین العابدین خاں سر تیز، میرزا مغل کیوان، نواب وزیر علی وزیر، آصف الدولہ آصف، نواب نصر اللہ خاں سلطان، راجہ بہادر راجہ وغیرہ۔

کچھ شاعروں نے ہندی کے تخلص پسند کیے تھے۔ مثلاً میر میراں بھید، سید اللہ بخش تہر، میاں غلام محی الدین راجا، میر عبد الجلیل بلگرامی اٹل اور آج کل بیکل اتساہی۔ پہلے میر عبد الوہاب افتخار کا بھی یہ تخلص رہ چکا ہے۔

بعضوں نے تخلص ایسا بھی اختیار کیا جو قواعد کی رو سے غلط ہو۔ مثلاً عشاق کہ یہ جمع کا صیغہ ہے اور اس کا استعمال کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اردو کے شعرائے قدیم لفظ عشاق کو "زن چھنی باز" کے لیے استعمال کرتے تھے۔[4] اس اعتبار سے بھی یہ تخلص اختیار کرنے کے قابل نہ تھا۔ لیکن ایک نہیں دو دو شعرا نے اپنایا۔ شیخ احمد بخش منبری عشاق اور جیون لال دہلوی عشاق۔

بعض تخلص شاعر کی کسی اور خصوصیت کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً محمد امان اللہ کا تخلص غریب تھا لیکن زبان میں لکنت تھی اس لیے کبھی کبھی الکن تخلص بھی کرتے تھے۔

کچھ تخلص ایسے بھی ہیں جن سے کلام شاعر کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً شاہ معصوم ہوس کے بیٹے نے اپنا تخلص شہوت اختیار کیا۔ یہ بے انتہا فحش گو شاعر تھے۔ چرکینی، بول و براز کی شاعری کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔

دو ایک تخلص ایسے بھی ہیں جو "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے مصداق ہیں۔ مثلاً سید درویش علی نے اپنا تخلص ثروت رکھا۔ اس طرح نام اور تخلص مل کر صنعت تضاد کا مکمل نمونہ بن گئے۔

۱؎ تذکرۂ شعرائے اردو: ۴۴۔ ۲؎ گلزار ابراہیم: ۲۰۷۔ ۳؎ نکات الشعرا: ۱۴۸۔ ۴؎ ۵؎ مخزن نکات: ۶۳۔

مرثیہ گویوں کے تخلص بھی دیکھیے۔ صبرؔ، افسردہؔ، غمگینؔ، نجاتؔ وغیرہ۔

صوفیہ کے تخلصوں پر نظر کیجیے تو وہاں بھی یہ معنوی ہم آہنگی نظر آئے گی۔ مثلاً مرزا جان جاناں مظہرؔ، خواجہ میر دردؔ، ولایت شاہ ولایتؔ، سید صلاح الدین عرف کھمن پاک بازؔ، شاہ نیاز علی نیازؔ، شاہ قلندر قلندرؔ، شاہ محمد علی بخت، شاہ مجنوں عرف شاہ سر برہنہ مجنوںؔ، شاہ کاکل کاکلؔ۔ ان تخلصوں کے آئینے میں ظاہر و باطن سب جھلک رہا ہے۔

بہت سے تخلصوں میں ناموں کی مناسبت ملحوظ رکھی گئی ہے مثلاً محمد اسمٰعیل ذبیحؔ، محمد اسمٰعیل فداؔ، محمد ابراہیم خلیلؔ، خواجہ آفتاب خاں منیرؔ، امام الدین مظلومؔ، میر شبّر علی زورغؔ، شبّر علی جرأتؔ۔

باپ بیٹے اور بھائی اگر شاعر ہوتے تو کبھی کبھی یہ مناسبت تخلصوں میں بھی ظاہر ہوتی۔ مثلاً شاہ عالم آفتاب کے بیٹے شاہزادہ محمد اکبر نے اپنا تخلص شعاعؔ قرار دیا۔ خواجہ میر درد کے صاحب زادے سید محمد نصیر نے رنجؔ تخلص اختیار کیا۔ ان کے بیٹے میر ناصر جان نے روایت قائم رکھی اور محزونؔ تخلص قرار دیا۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ کے صاحب زادے (یا متبنّیٰ) غلام حیدر نے مجذوبؔ تخلص رکھا۔ میر نجف علی جنونؔ کے والد محمد علی خاں کا تخلص دیوانہؔ تھا۔ یہ روایت موجودہ دور تک چلی آئی ہے چنانچہ مجنوںؔ گورکھپوری کے والد محمد فاروق کا تخلص بھی دیوانہؔ تھا۔ اکثر باپ بیٹوں کے تخلصوں میں مشتقات کے اعتبار سے مناسبت ہوتی مثلاً خلیقؔ اور خُلقؔ، منتؔ اور ممنونؔ۔ بعض باپ بیٹے ہم قافیہ تخلص کرتے تھے جیسے نجم الدین علی سلامؔ ابن شرف الدین علی پیامؔ۔ میر انیسؔ کے صاحبزادے کا تخلص نفیسؔ تھا۔ بھائی بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں تھے۔ مصطفیٰ خاں یک رنگؔ کے بھائی دلاور علی خاں نے اپنا تخلص ہم رنگؔ رکھا لیکن بعد میں تبدیل کر دیا۔ پھر بھی تلفیے کا رنگ نہیں رہا۔ یعنی اب یہ "بیرنگؔ" ہو گئے۔

بعض تخلص اور نام ایک دوسرے سے مشتق ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر محمد صدیق صدقؔ اور رؤف احمد رافتؔ۔

غلام محی الدین الہ آبادی، شاہ خوب اللہ کے صاحب زادے تھے۔ شاہ خوب اللہ کا اصلی نام محمد یحییٰ تھا۔ اس مناسبت سے غلام محی الدین نے یحیائیؔ تخلص اختیار کیا[1]

بعض تخلص ایسے بھی ہیں جن سے دھوکا ہوتا ہے۔ اوباشؔ لکھنو کے شیخ زادے تھے۔ اور صلاحیت شعار نوجوان تھے۔ مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے "تذکرۂ ہندی" میں ان کے جتنے شعر نقل کیے ہیں وہ سب سنجیدہ ہیں، مثلاً

خوں ہو دل کاوش سے اس کی بہہ گیا ٹوٹ کر سینے میں پیکاں رہ گیا

مجھ سے مت منزل کی پوچھو سرگزشت ہمرہاں آگے گئے میں رہ گیا

اس سے بھی زیادہ قیامت خیز تخلص سنبر خاں یا ببر خاں برہان پوری کا ہے۔ انھوں نے زانیؔ تخلص اختیار کیا تھا اور اشعار بھی بہت فحش کہتے تھے لیکن ساری زندگی پاک بازی سے گزاری۔ ایک سو دس برس کی عمر میں کبھی کسی عورت کے پاس بھی نہیں گئے۔ ارتکاب گناہ کا سوال ہی کب اٹھتا ہے[2]

ایسے مرثیہ گو جو غزل نگاری بھی کرتے تھے اکثر مرثیوں اور غزلوں میں الگ الگ تخلص اختیار کر لیتے تھے۔ میر منو حیرانؔ عظیم آبادی مرثیوں میں مظلومؔ تخلص کرتے تھے انھوں نے مرثیوں میں اشرفؔ، خلیقؔ نے ظہورؔ، طربؔ نے دلگیرؔ تخلص اختیار کیے۔ یہاں بھی ذاتی مناسبت عیاں ہے۔

بعض شاعر فارسی اور اردو میں الگ الگ تخلص نظم کرتے تھے مثلاً وجیہ الدولہ اردو میں وجیہؔ اور فارسی میں برترؔ تخلص کرتے، شاہ حلیم اردو میں بیتابؔ اور فارسی میں حیرتؔ، میر عبدالوہاب اردو میں بیکلؔ اور فارسی میں افتخارؔ۔

استاد اور شاگرد اکثر ہم قافیہ تخلص رکھتے تھے۔ فاخر مکینؔ نے اپنے شاگرد بقائے لیے غمینؔ تخلص تجویز کیا۔ فرزند علی مضمونؔ کے شاگردوں کے تخلص مفتونؔ اور ممنونؔ (عظیم آبادی) ہیں۔ غلام رسول شوقؔ کے شاگرد شیخ ابراہیم ذوقؔ تھے، اسیرؔ کے شاگرد اثیرؔ، مرزا علی ثمرؔ کے شاگرد مرزا مغل بیگ ہنرؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے شاگرد شاہ مبارک آبروؔ، بھورے خاں آشفتہؔ کے شاگرد شگفتہؔ، جعفر علی حسرتؔ کے شاگرد قسمتؔ، محبتؔ، مدحتؔ، کرامتؔ، جراتؔ، عظمتؔ اور وحشتؔ۔ جراتؔ کے شاگرد غیرتؔ، محنتؔ، مہلتؔ، الفتؔ، شہرتؔ، رقتؔ، رفاقتؔ، رافتؔ، حقیقتؔ، سبقتؔ، شہرتؔ، کرامتؔ، نصرتؔ وغیرہ اور میر نصیرؔ کے شاگرد ضمیرؔ، منیرؔ، نظیرؔ، اسیرؔ وغیرہ۔ دبیرؔ لکھنوی کے شاگرد دشتیرؔ اور خود دبیرؔ ضمیرؔ کے شاگرد تھے۔

بہت سے ایسے شاعر بھی گزرے ہیں جو ایک تخلص سے مطمئن نہیں ہوئے تو دو بلکہ بعض اوقات تین اور چار تخلصوں تک نوبت پہنچی۔ محمد علی حسین شاہجہاں پوری کے چار تخلص تھے۔ شوخؔ، طرازؔ، برقؔ، بیقرارؔ۔ جس بحر میں جو تخلص آسانی سے نظم ہو جاتا تھا وہی لکھ دیتے تھے مگر زیادہ تر برقؔ نظم کرتے تھے[3] مرزا معز مخاطب بہ موسوی خاں

---

[1] مسرت افزا : ۱۵۱
[2] گلشن گفتار : ۶۶
[3] خمخانۂ جاوید : ۵ : ۵۹

نے اپنے دیوان میں تمیز، فطرت اور موسوی تینوں تخلص نظم کیے ہیں[1] اسی طرح میر علی نقی دہلوی نے قصر ، اس میں تسکین اور جنون دو تخلص قرار دیے اور آخر میں کافر کے دامن میں پناہ لی۔[2]

تخلص کی تبدیلیاں بھی شاذ نہیں تھیں۔ غالب کا تخلص اسد بھی تھا اور ان کے دیوان میں دونوں ہی تخلص آج بھی موجود ہیں۔ قیام دلی کے زمانے تک اسد تخلص کرتے تھے۔ کسی نے ان کے سامنے میر امانی اسد کا یہ مطلع پڑھا ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی — مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

اور غالب سے تعریف کی کہ "یہ شعر آپ نے خوب کہا ہے۔" مرزا یہ سن کر بہت جھنجلائے اور جواب دیا کہ صاحب! اگر یہ شعر میرا ہے تو مجھ پر خدا کی لعنت اور اگر کسی اور کا ہے تو اس پر اسی کے بقول خدا کی رحمت ہو۔" اس التباس سے بچنے کے لیے انھوں نے علی العموم اسد تخلص ترک کرکے حضرت علی کے لقب "اسد اللہ الغالب" کی مناسبت سے غالب تخلص قرار دے لیا۔ اگرچہ بعد میں بھی انھوں نے کبھی کبھی ضرورتاً اسد تخلص نظم کیا ہے، لیکن عام طور سے اسے ترک کر دیا تھا۔[3] اسی طرح مصحفی نے سوز کے بارے میں لکھا ہے کہ پہلے میر تخلص کرتے تھے لیکن چونکہ اسی زمانے میں میر تقی میر بھی اسی تخلص سے مشہور تھے اس لیے "میر" کی بجائے "سوز" تخلص قرار دے لیا۔[4]

میرزا علی اکبر بیگ کا تخلص پہلے مضطرب تھا۔ جب نواب معتمد الدولہ کے ملازم ہوئے تو نواب نے مضطرب تخلص غالباً اپنی شان امارت کے خلاف سمجھا۔ ان کے حکم سے مضطر نے عشرتی تخلص اختیار کیا۔[5] عماد الملک کی اہلیہ گنا بیگم شروع میں منت تخلص کرتی تھیں۔ جب انھوں نے قمر الدین منت کی استادی کا حال سنا تو یہ تخلص چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سے مقطعوں میں کوئی تخلص نظم ہی نہیں کرتی تھیں۔[6] مہاراج سنگھ برہمن متھرادی ثم دہلوی جوانی میں جوان تخلص کرتے تھے۔ جب جوانی کے دن گزر گئے تو انھوں نے اپنا تخلص بدل کے پیر کر لیا۔[7]

یہ تو وہ ہیں جن کے تخلصوں کی تبدیلی کا سبب معلوم ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے تخلصوں کی تبدیلی کا سبب معلوم نہیں۔ جیسے میر کے بیٹے میر حسن عرف کلو پہلے زار تخلص کرتے تھے، بعد میں جو پرواز کی تو عرش کے زیر سایہ پناہ لی۔

تحقیق کا کام کرنے والے جس الجھن سے اکثر دوچار ہوتے ہیں وہ تخلصوں کا اشتراک ہے۔ تذکروں میں بعض شعرا کے صرف تخلص درج ہیں۔ ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر ایک تخلص کے دو ہی شاعر ہوں تو کام پھر بھی آسان ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ایک ہی تخلص کے کئی شاعر مل جاتے ہیں۔ اسیر نے اسی کی طرف اشارہ کیا تھا ؎

شاعران حال کیا مضمون نو پائیں اسیر — ڈھونڈتے ہیں اور تخلص بھی نیا ملتا نہیں

ذرا غور کیجیے کہ حسن تخلص کے آٹھ شاعروں کے نام یادگار شعرا میں درج ہیں۔ حیدر تخلص کے سات، حیرت تخلص کے چھ، دل تخلص کے نو، رضا تخلص کے تیرہ، عاشق تخلص کے گیارہ، فدوی تخلص کے چھ، مائل کے تخلص کے سات، مرزا تخلص کے دس، مشتاق تخلص کے بارہ، مفتون تخلص کے چھ، موزوں تخلص کے سات شعرا اس ایک تذکرے میں جلوہ گر ہیں۔ فرض کیجیے کہ آپ کی نظر سے کسی بیاض میں غالب کے نام سے کوئی شعر درج ملتا ہے۔ اسے مرزا اسد اللہ غالب سے منسوب کرنے کے پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ غالب (علی) خاں[8] لالہ موہن لال اور بہادر بیگ خاں کا تخلص بھی غالب رہ چکا ہے اور یہ سب اردو کے شاعر تھے۔ اگر اسد اللہ خاں غالب بھی لکھا ہو تو ذرا ٹھٹک جائیے کیونکہ ایک نواب اسد اللہ خاں بھی غالب تخلص کرتے تھے اور وہ بھی دلی ہی کے رہنے والے تھے۔ سید الملک قیام جنگ خطاب تھا۔ اسد کے بارے میں صورت حال معلوم ہی ہو چکی ہے، لیکن میر امانی کے علاوہ میر اسد علی دہلوی اور کیرت سنگھ دہلوی کا بھی یہی تخلص تھا۔[9]

ان حالات میں چکبست نے اچھا ہی کیا کہ انھوں نے اپنے قومی نام کو تخلص قرار دے کر یہ دعویٰ کیا کہ ع "میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں"

با معنی تخلصوں سے ذہن متعلقہ مضامین کی طرف بھی جاتا تھا۔ چنانچہ میر نے کہا کہ ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں — اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

مومن تو التزام کے ساتھ کفر و ایمان کے مضامین نظم کرتے تھے۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

بھورے خاں آشفتہ تخلص کی مناسبت سے مقطع میں زلف کے مضمون نظم کیا کرتے تھے۔[10] میر محب علی مفلس افلاس کے مضامین ڈھونڈھا کرتے تھے۔[11] عنایت اللہ حجام سہارن پوری ثم دہلوی اپنے مقطعوں میں حجامت کے پیشے سے متعلق مضامین نظم کرتے اور سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔[12]

---

[1] دو تذکرے (شورش) ۲ : ۱۲۲ [2] گلزار ابراہیم (زردر) ۲۰۷ [3] ذکر غالب : ۲۷۰ (طبع چہارم) (کوہ نور پرنٹنگ پریس دلی ستمبر ۱۹۶۴ء) [4] تذکرۂ ہندی : ۱۱۱ [5] ریاض الفصحا : ۲۲۰ [6] مسرت افزا : ۲۱۵ [7] سخن شعرا : ۸۰ [8] مجموعۂ نغز ۱ : ۳۱ [9] ریاض الفصحا : ۲۶۵ [10] تذکرۂ ہندی : ۷۷

رضو بجیا

عبدالمجیب سہالوی

ہماری رضو بجیا نہ کوئی قومی یا بین اقوامی شخصیت ہیں اور نہ کوئی فلمی شہرت کی مالک مقبول ایکٹرس بلکہ وہ اوسط درجے کے خاندان کی ایک فرد ہیں لیکن اپنے محلے، پاس پڑوس اور کنبے میں بلا لحاظ عمر اور رشتہ سب کی چہیتی بجیا ہیں۔ ان کی چاہت ان کی دولت کی دین نہیں کیوں کہ دولت سے ان کی ہمیشہ دوری کی یا دالشر رہی، نہ وہ ان کے پاس آئی اور نہ انھوں نے آگے بڑھ کر فلک سے اسے پکارا اس لیے دولت سے ان کے تعلقات یہیں پر آکر ختم ہو گئے کہ ؎

تمھیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ ہم خالی نہ تم خالی

وہ بچاری غم سے خالی رہتیں تو کیسے؟ اپنے گھر کے جنجال کے علاوہ انھیں ناتے رشتے اور محلے پڑوس کے دکھ درد اور شادی غمی کی بھی تو فکر لگی رہتی تھی۔ اگر خود نہ جا سکتیں تو آنے جانے والیوں سے سب کی خیریت، خیر سلا تو ضرور ہی پوچھ لیتیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے ان کے یہاں آنے جانے والوں کی کمی ہی کیا تھی۔ دیہات سے آنے والے رشتے دار مہمانوں کے علاوہ شہر میں محلے، پڑوس اور جان پہچان کی منھ بولی بہنوں اور سہیلیوں کی آمد و رفت کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ صبح سے شام تک اس طرح قائم رہتا کہ ان کے میاں اپنی بیگم کی مقبولیت سے جل کر یا اپنے گھر کو ریلوے پلیٹ فارم میں تبدیل ہوتے دیکھ کر وکالت کا پیشہ چھوڑ سیاست کے میدان میں اس لیے کود پڑے کہ موکلوں اور مہمانوں سے ایک ساتھ پیچھا چھوٹ جائے اور وہ کسی تحریک میں شریک ہو کر شاہی مہمان کی حیثیت کچھ دن جیل میں سکون سے گزار سکیں۔

ابھی ابھی رضو بجیا اپنے ماموں زاد بھائی کی بیوی کی بہن کو ناشتہ کھلا کر رخصت کرنے کے بعد دم لینے کے لیے کمرے میں لیٹی ہی تھیں کہ دیوار پر کوا بولنے کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ دروازے کی کنڈی کھٹکی اور ان کی نزہت بہن برقعہ سنبھالے باسکٹ ہاتھ میں لیے ہانپتی کانپتی پہنچیں اور بیٹھنے سے پہلے ہی بیٹا بی سے پوچھا بجیا نہیں نظر آ رہی ہیں کیا کہیں گئی ہیں؟

لڑکیوں نے چھیڑنے کے لیے کہا کہ بجیا اپنی سسرال گئی ہیں! اس پر وہ بگڑ کر بولیں اے، ہئے! یہ کل کی چھوکریاں جن کے ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے ہمیں بنانے چلی ہیں۔ بچاری بجیا کے ساس، سسر تو کب کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ گھر بھی کھنڈر ہو گیا۔ وہ سسرال کیا جائیں گی اب تو تم لوگوں کے سسرال جانے کے دن آ گئے۔

دیکھو نا جب سے شمو کی بات پکی ہو گئی اس وقت سے چکر گھنی ہو کر رہ گئی ہوں۔ ایک منٹ پیر نہیں رکتے۔ ابھی گیارہ بھی نہ بجے ہوں گے بازار کے کئی پھیرے لگا چکی ہوں۔ اب سیدھی کامدانی والے کے یہاں سے ادھر چلی آ رہی ہوں۔ کچھ بھی نہ کرو پھر بھی شادی بیاہ میں سیکڑوں الجھنیں ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں ہم اوسط درجے کے لوگوں کے لیے تو بڑی مصیبت ہے۔ ہم لوگ رہتے تو جھونپڑیوں میں ہیں لیکن خواب دیکھتے ہیں محلوں کا۔

لڑکیوں نے کہا کہ نزہت خالہ قطع کلام معاف! اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس میں ہماری ایک ترمیم منظور کر لیں وہ یہ کہ ہم محلوں کا خواب خوشی سے نہیں دیکھتے بلکہ دیکھنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔

بیٹی! تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ ہم بیچ کے لوگوں کا شمار نہ چھوٹوں میں ہوتا ہے نہ بڑوں میں۔ ہماری آمدنی کم تعلقات زیادہ ہوتے ہیں پھر لٹیرے ہونے کے باوجود رکھ رکھاؤ بڑوں ہی جیسا رکھنا پڑتا ہے پھر شادی بیاہ

کے موقعے پر تو خاص طور پر ناک کٹنے کے ڈر سے اپنا پیٹ کاٹ کر سب تمام کرنا ہی پڑتا ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ جہیز کی فہرست بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ پہلے زمانے میں جوڑے، زیور، برتن اور پلنگ، پردے ہی کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ اب نہ جانے کیا الا بلا ریڈیو سیڈیو سیکڑوں چیزیں فراہم کرنی پڑتی ہیں۔ پھر بھی کسر رہ جاتی ہے۔ اور اس پر لطف یہ کہ نئے زمانے کے سامان کے ساتھ ساتھ ہم اوسط درجے کے لوگوں کو پرانی ریتوں کو بھی نبھانا پڑتا ہے اور گرم کوٹ اور کمبل کے ساتھ رضائی دینا بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

میں نے کہا تھا کہ شمو کو شال، دوشالہ اور لحاف تو دیا ہی جا رہا ہے، اب رضائی دینے کی کیا ضرورت؟ مگر بوڑھا کو کوئی کیا کہے، سنتے ہی بپھر گئیں اور بولیں تجھے میکے سے چار رنگ کی چار رضائی، دلائی ملی تھیں اور اب یہ دن آ گئے ہیں کہ اس گھر کی پوتی بے رضائی کے رخصت کر دی جائے۔ وہ تو بس اتنا کہہ کر فرصت پا گئیں مگر میری جان جنجال میں پڑ گئی۔ رضائی کا کپڑا تو خیر جوں توں آ ہی گیا لیکن رضائی پر گوٹ چڑھانا قیامت ہو گئی۔ کوٹھے پر والی وکیل صاحب کی بیوی نے ساری گوٹ چوپٹ کر کے رکھ دی۔ پہلے ہی کہہ دیتیں کہ میں گوٹ کاٹنا نہیں جانتی تو کون ان کی ناک کٹ جاتی۔ مگر بھل نہ پا دیں گدن نام، والی مثل! کاٹنا، اٹنا خاک نہیں جانتیں لیکن قینچی لے کر جٹ گئیں۔ وہ تو کہو خیریت ہوئی کہ اسی وقت نیاں گنج والی خالہ آ گئیں ورنہ ساری گوٹ کتر کر رکھ دیتیں۔ اتفاق کی بات کہ خالہ جو رضائی اوڑھ کر آئی تھیں اس پر اونچی کاٹ کی ایسی صاف گوٹ چڑھی ہوئی تھی کہ آنکھیں جم کر رہ گئیں۔ میں نے فوراً کہا خالہ! اللہ آپ ہی جیسی رضائی کی گوٹ ہماری بھی کاٹ دیجیے۔ دیکھیے نا! ہماری نکہت بہن کب سے ہلکان ہو رہی ہیں لیکن گوٹ کٹتی نظر نہیں آ رہی ہے۔

اس پر خالہ نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے کہا یہ کون سی بڑی بات تھی منٹوں میں کاٹ دیتی مگر تمھیں نہیں معلوم جب سے آنکھوں میں پانی اترنا شروع ہوا ہے اس وقت سے سوائے سوا ہی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ تمھارا چاند جیسا چہرہ بھی دھلا دھلا دکھائی دے رہا ہے۔ اپنی رضائی پر گوٹ میں نے تھوڑی چڑھائی ہے۔ اس کے لیے مجھے خاص طور پر گونگے نواب پارک والی بجیا کے یہاں جانا پڑا۔ گھر میں اللہ نظر بد سے بچائے ایک چھوڑ درجنوں سیانی سیانی لڑکیاں ہیں مگر کیا مجال جو کوئی بھولے سے بھی سوئی پکڑے۔ آج کل کی لڑکیاں گوٹ چڑھانا تو بڑی بات ہے ٹھیک سے دو ڈوب لگانا بھی تو نہیں جانتیں۔ سوائے مشین کھٹکھٹانے کے انھیں کاج بنانا تک نہیں آتا۔ اللہ جیتا رکھے بجیا کو کہ ان کی وجہ سے پھر اس سال جاڑوں میں رضائی اوڑھنے کو مل گئی ورنہ انھوں نے تو ایسی دغا دی تھی کہ شاید رضائی اوڑھنا نصیب نہ ہوتی۔ اپنے گھر میں کیا محلے پڑوس میں تک کی گوٹ کاٹنے والی کوئی بی بی نہ ملیں تب مجبوراً مجھے بجیا کو تکلیف دینا پڑی۔ وہ بچاری ایک انار صد بیمار والی مثل اپنے ہی بال بچوں کی بیماری آزاری سے دم مارنے کی فرصت نہیں پاتیں، اس پر میں دیکھتی ہوں کہ جسے دیکھو کپڑا بغل میں دبائے بجیا کے گھر چلا آ رہا ہے مگر صاحب! میں نے ایسی نیک دل بی بی نہیں دیکھی کہ کیا مجال کسی کو ٹال دیں۔ اسی وجہ سے تو بجیا کہتے کہتے محلے پڑوس سب کا منھ نہیں تھکتا۔ وہ اپنے اسی اخلاق کی بنا پر جگت بجیا بن گئی ہیں۔ چھوٹے بڑے سبھی ان کو بجیا کہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ تم نہیں جانتیں؟

میں نے کہا کہ ارے! ہم اپنی رضو بجیا کو نہیں جانیں گے تو پھر کون جانے گا۔ اس پر انھوں نے کہا تو پھر خواہ مخواہ کپڑا کیوں کا رت کر دا رہی ہو۔ انھوں نے یہ بات اس طرح چٹاک سے کہہ دی کہ بچاری وکیل صاحب کی بیوی شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔ انھوں نے چپکے سے قینچی رکھ دی اور گوٹ لپیٹ کر میری طرف بڑھا دی۔ میں کہتی ہوں لوگ بے مروتی سے کیسے پھٹ سے منھ پر بات کہہ دیتے ہیں۔ میں تو چاہے پورا کپڑا برباد ہو جاتا کبھی اس طرح نہ کہہ سکتی۔

لڑکیوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ خالہ بات یہ ہے کہ آنکھوں میں پانی اترنے سے آب آید تیمم برخاست، کی طرح مروت۔ نو بکڑہ ہو جاتی ہے۔

وہ بولیں نہ نہیں! مجھے تو پانی والی کچھ نظر نہیں آیا۔ کوڑی جیسے دیدے چلا کر باتیں کر رہی تھیں۔ میں تو سمجھتی ہوں اپنی بلا بچاری بجیا پر ٹال دی یا پھر سرے سے گوٹ کاٹنا ہی نہ جانتی ہوں گی۔ شان میں بٹہ لگ جانے سے پانی اترنے کا بہانہ کر دیا۔ وہ تو ہماری رضو بجیا ہی کا حاتم دل ہے کہ کبھی کوئی مایوس نہیں لوٹتا۔

لڑکیاں بجیا کی تعریفیں سن رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں کیوں کہ گوٹ کٹانے، مونڈھے چڑھوانے اور رگلا بنوانے سے پہلے ہر آنے والی بی بی کے منھ سے بجیا کی شان میں اسی طرح کے مدحیہ قصیدے بارہا سن چکی تھیں۔ وہ

لکھنؤ میں ۴ر اگست ۷۶ء کو تلسی جینتی شاندار طریقے سے منائی گئی۔ گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم۔ گوپال ریڈی اس تقریب میں حاضرین کو خطاب کر رہے ہیں

یو۔پی فروٹ پراڈکٹس مینوفیکچررس اسوسی ایشن کی ۲۳ ویں سالانہ کانفرنس لکھنؤ میں ۲۳ جولائی کو منعقد ہوئی۔ تصویر میں گورنر ڈاکٹر ایم۔ گوپال ریڈی کانفرنس کو خطاب کر رہے ہیں

گورنر یو۔پی ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی سینیئر پولیس افسروں کی کانفرنس منعقدہ ۱۹ جولائی ۶۹ء کو خطاب کر رہے ہیں

پھلوں سے مختلف چیزیں تیار
قیصر باغ بارہ دری میں رکھے۔

سکریٹری محکمہ صحت نے ضلع فیملی پلاننگ افسروں کی تیسری کانفرنس کو خطاب کیا

ضلع فیملی پلاننگ افسروں کی تیسری کانفرنس کے آخری اجلاس کو چیف سکریٹری شری بی۔ بی لال ۲۰ جولائی ۱۹۶۶ء کو خطاب کر رہے ہیں
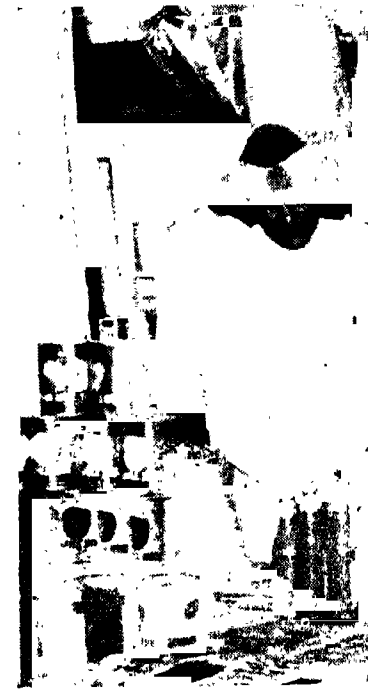
ضلع فیملی پلاننگ افسروں کی تیسری کانفرنس کا جو لکھنؤ میں ۱۹ جولائی ۱۹۶۶ء کو منعقد ہوئی ایک حصہ

... ۲۲ ... کانفرنس کے موقعے پر

... بی۔ گوپال ریڈی دیکھ رہے ہیں

لکھنؤ میں ۲۰ جولائی ۱۹۷۸ء کو آچاریہ نریندر دیو پستکالیہ کو نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کی جانب سے کتابیں پیش کرنے کی ایک تقریب ہوئی۔ تصویر میں
نیشنل بک ٹرسٹ کے چیرمین ڈاکٹر بی۔ وی کیسکر پستکالیہ کو دو اسو کتابیں پیش کر رہے ہیں

آچاریہ نریندر دیو پستکالیہ کو نیشنل بک ٹرسٹ کی جانب سے کتابیں پیش کرنے کی تقریب میں وزیر ریاست برائے تعلیم پروفیسر شیر سنگھ تقریر کر رہے ہیں

جانتی تھیں کہ کام کی بھرمار اور بیماری آزاری کی تکان کے باوجود یہ تعریفیں بجیا کے لیے ایسے زبردست ٹانک کا کام کرتیں کہ رگوں میں خون دوڑنے لگتا، جھکے چہرے پر تازگی آجاتی اور وہ تازہ دم ہو کر کپڑا کاٹنے بیٹھ جاتیں۔ بجیا جو کمر میں درد کی وجہ سے منھ لپیٹے کمرے میں لیٹی تھیں بیٹھ دیکھے برائی نہیں تعریفیں سُن کر کر دٹیں بدلنے اور انگڑائیاں لینے لگیں اور محض یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ سو نہیں، جاگ رہی ہیں بار بار کھانسنے لگیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ نزہت بہن نے جو بجیا کو کھنکھناتے اور کھانستے سُنا تو چٹ گوٹ بغل میں دبا سیدھی کمرے میں جا دھمکیں اور بلائیں لے کر خیریت دریافت کرنے لگیں۔

رضو بجیا انھیں دیکھ کر فوراً اٹھ کر بیٹھ گئیں اور کمزور آواز میں بولیں۔ بہن نزہت! کیا کہوں اس موئی ہچکش نے تو زندگی اجیرن کر دی ہے۔ کبھی پنڈلیاں اینٹھ رہی ہیں، کبھی کمر ٹوٹی جا رہی ہے، کبھی درد سے سر پھٹا جا رہا ہے، کبھی چکر آرہا ہے تو کبھی غشی طاری ہو رہی ہے۔ نگوڑی ہچکش نہ ہوئی بلا ہو گئی کہ جوڑ جوڑ اور رگ رگ میں اس کا اثر پہنچ جاتا ہے۔

نزہت ـــــ رضو بجیا! گستاخی معاف ہچکش سے پیٹ میں مروڑ ہو جانا چاہیے نہ کہ پنڈلی اور کمر میں اینٹھن۔ یہ تو یہی ہوا، مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ!

رضو بجیا ـــــ بہن ٹھیک کہتی ہو جب پہلے پہل ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ پنڈلی کی اینٹھن اور کمر کا درد یہ سب ہچکش کے کرشمے ہیں تو میں ہکا بکا ہو کر ان کا منھ تکنے لگی۔ وہ مجھے اس طرح اچنبھے میں دیکھ کر سمجھ گئے اور کہنے لگے پرانی ہچکش زیادہ پرانی ہو جانے پر آسیب بن جاتی ہے اور رگ رگ میں سرایت کر کے وہ کرتب دکھاتی ہے کہ لوگ اسے بیماری کے بجائے برا سایہ سمجھ کر دوا چھوڑ جھاڑ پھونک کرانے لگتے ہیں۔ مجھے ان کی بات پر یقین نہ آیا لیکن میں نے دیکھا کہ جب تک ہچکش کی دوا کھاتی اور پرہیز کرتی رہتی ہوں، پنڈلی کی اینٹھن اور سر کا چکر سب مدھم رہتے ہیں تو بہن میں بھی قائل ہو گئی اور جب کبھی تکلیف ہوتی ہے انھی کی بتائی دوا کھا لیتی ہوں۔

نزہت ـــــ تو پھر بجیا جلد دوا کھا کیوں نہیں لیتیں اپنے کو خواہ مخواہ کیوں ہلکان کر رہی ہو؟

رضو بجیا ـــــ دونوں لڑکے اسکول چلے گئے ہیں۔ رمضانی نہیں معلوم کتنی مرتبہ میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے یہاں جا چکا ہے لیکن جب اسے اکیلا بھیجو تو یہ راستہ بھول جاتا ہے اور صبح کا بھولا پھر شام ہی کو واپس آتا ہے۔ تو بھلا بہن! تمھیں بتاؤ کہ اسے بھیج کر کوئی کاہے کو اپنی جان جنجال میں ڈالنے لگا۔

نزہت بہن یہ سنتے ہی بگڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور کہنے لگیں غضب خدا کا دو دو پڑھی لکھی لڑکیاں گھر میں موجود اور ماں بن دوا کے پلنگ پر پڑی تڑپا کرے۔ بھلا ان کی پڑھائی لکھائی پھر کس دن کام آئے گی۔ کالجوں میں پڑھنے والی ان لڑکیوں کا تو بس دھوبی کے کتے جیسا حال ہے نہ گھر کی نہ گھاٹ کی۔

اس پر لڑکیوں کو صبر نہ ہوا اور بڑی لڑکی بولی نزہت خالہ! گھر میں آپ کی بجیا ہاتھ لگانے نہیں دیتیں۔ انھیں کسی کے ہاتھ کا کوئی کام پسند ہی نہیں آتا، خواہ مخواہ کوئی نہ کوئی خرابی نکال ہی دیتی ہیں۔ رہا گھاٹ! وہاں جانے لگیں تو آپ لوگ سر پکڑ کر دہائی دینے لگتی ہیں اور کہنے لگتی ہیں کہ اے ہے! اب شریف گھر کی لڑکیاں ہاٹ، بازار کے چکر لگانے اور سودا سلف خریدنے لگیں اس پر الٹا یہ الزام کہ پڑھی لکھی لڑکیاں نہ گھر کی نہ گھاٹ کی۔

نزہت خالہ نے لڑکیوں کے منھ لگنا مناسب نہ خیال کیا اور خون کا گھونٹ پی کر خاموش رہیں۔ پھر برقعہ سنبھالتی ہوئی بولیں لاؤ رضو بجیا! مجھے نسخہ دو میں ڈاکٹر صاحب سے حال بتا کر ابھی دوا لیے آتی ہوں۔

رضو بجیا (گھبرا کر) نوج بہن! تم کہاں جاؤ گی۔ میری طبیعت کچھ سنبھل گئی ہے شام کو خود ڈاکٹر صاحب کو دکھا کر دوا لے آؤں گی۔ اب تو شاید ڈاکٹر صاحب مطب سے چلے بھی گئے ہوں گے۔

نزہت ـــــ ڈاکٹر صاحب چلے گئے ہوں گے تو کیا اپنے ساتھ دواخانہ بھی لیتے گئے ہوں گے۔ اور فرض کرو ان کا دواخانہ بند بھی ہو گیا ہو گا تو کیا نسخہ کسی دوسرے دواخانے میں نہیں بندھ سکتا۔ امین آباد میں تو اللہ نظرِ بد سے بچائے اب ہر چالیس قدم پر دواؤں کی ایسی شاندار دوکانیں کھل گئی ہیں کہ بے بیماری دوا خریدنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔

اس پر لڑکیوں نے ہنستے ہوئے کہا بجیا آپ کیوں رکتی ہیں۔ نزہت خالہ دوا لینے نہیں شاندار دوکانیں دیکھنے کے شوق میں جا رہی ہیں۔

نزہت خالہ بگڑ کر بولیں نوج! میں نئے زمانے کی لڑکیوں کی طرح ندیدی نہیں ہوں کہ دوکانیں جھانکتی پھروں۔ مگر ضرورت پڑنے پر بھی پاؤں

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

ترائیلے

(فرانسیسی شاعری کی ایک مقبول اور حسین صنف)

نریش کمار شاد

۱۔ واہمہ

زیست ہمسائے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں [۱]
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا
یوں تو ہونے کو یہ بے شک ہے دل آویز و حسین
زیست ہمسائے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں
یہی اندیشہ مرے ذہن میں رہتا ہے کہ کہیں
خوف سا رہتا ہے اک حادثہ ہو جانے کا
زیست ہمسائے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

۲۔ اُلجھن

کچھ اُن کا حسن بھی بیگانۂ ذوقِ محبت تھا
کچھ اُن کے حسن کے قابل محبت بھی نہ تھی اپنی [۲]
بڑا اُلجھا ہوا افسانۂ ذوقِ محبت تھا
کچھ اُن کا حسن بھی بیگانۂ ذوقِ محبت تھا
بس اک لے دے کے دلِ دیوانہ ذوقِ محبت تھا
بقدرِ آرزوئے دل محبت بھی نہ تھی اپنی
کچھ اُن کا حسن بھی بیگانۂ ذوقِ محبت تھا
کچھ اُن کے حسن کے قابل محبت بھی نہ تھی اپنی

۳۔ اچھا کیا

اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا [۳]
وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو ذہن سے روپوش کر دیا
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا
اچھا کیا جو اُن سے سبک دوش کر دیا
دل پر تعلقات کی شرطیں گراں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا
وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

---

[۱] یہ شعر محسن بھوپالی کا ہے۔
[۲] یہ شعر بسمل سعیدی کا ہے۔
[۳] یہ شعر غالباً ماہرالقادری کا ہے۔ (شاد)

رُباعیات

اختر انصاری

یہ گردشِ دوراں کے لُٹائے ہوئے زخم
یہ دستِ حوادث کے سجائے ہوئے زخم
اللہ رے اِک عمرِ رواں کا حاصل
یہ وقت کے خنجر کے لگائے ہوئے زخم

میں بھی تو یہ جانوں کہ مرے حال پھرے
نومیدی و اُمید کے ٹل جائیں سرے
خواہش ہے یہی ٹوٹ پڑے گنبدِ چرخ
اب چاہے وہ بدبخت مرے سر پہ گرے

ایّام کی گردش سے نکلنا ہے تجھے
اس قالبِ خاکی کو بدلنا ہے تجھے
سانچوں میں شب و روز کے ڈھلنے والے
کل گور کے سانچے میں بھی ڈھلنا ہے تجھے

کچھ فیض تو میں نے بھی لُٹایا بارے
کچھ رنگ تو محفل میں جمایا بارے
سرمایۂ عبرت ہوں زمانے کے لیے
دُنیا کے کسی کام تو آیا بارے

معبود کے گُن گانے پہ مجبور ہوئے
تقدیر کے پرچانے پہ مجبور ہوئے
دُنیا میں جب اپنا نہ کسی کو پایا
اللہ کو اپنانے پہ مجبور ہوئے

قبلِ مسیح کے بہار پر ایک نظر

محمد قیصر

بہار کی تاریخی روایات قدیم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ انتہائی شاندار بھی ہیں۔ ہندوستان بلکہ بین ملکی قدیم تاریخ میں بہار کا مقام بہت بلند ہے۔

ریاست بہار قدیم زمانے سے مذہبیات کے زیر اثر (دھرم پردھان) رہی ہے۔ گوتم بدھ کے زمانے میں عوام کی مذہبی ذہنیت کو اور بھی جلا ملی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ریاست میں بڑے پیمانے پر خانقاہیں اور سٹھ (جنھیں وہار کہتے تھے) وجود میں آنے لگے۔ قدیم زمانے میں بہار کا نام بہار نہیں بلکہ متھلا (मिथिला)، انگ، مگدھ اور ویشالی (वैशाली) وغیرہ تھا، لیکن جب مسلمانوں کا اس خطے پر قبضہ ہوا تو چوں کہ ریاست میں ہر طرف وہار ہی وہار پھیلے ہوئے تھے، اس لیے غالباً اس کا نام "وہار" پڑ گیا یعنی ایسی سرزمین جو خانقاہوں اور وہاروں سے بھری ہوئی ہو اور یہی "وہار" بعد میں بہار ہو گیا۔

جیسا کہ شروع میں اشارہ کیا گیا، بہار کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس کے تذکرے وید، اپنشد، پرانوں اور دیگر قدیم ترین مذہبی اور تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم بہار کئی راجیوں یعنی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا، جن کے نام تھے 'ودیہہ' (विदेह)، 'متھلا'، 'ویشالی'، 'انگ'، 'جھارکھنڈ' اور 'مگدھ'۔

ودیہہ —— چمپارن، سارن، مظفرپور اور دربھنگہ کے نام سے آج جو علاقے مشہور ہیں وہ قدیم زمانے میں ریاست ودیہہ میں شامل تھے، جس کی راجدھانی جنک پور تھی۔ جنک پور کا علاقہ موجودہ نقشے کے لحاظ سے ریاست نیپال سے ملا ہوا سرحدی مقام ہے۔ اس سے اندازہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت ریاست ودیہہ میں آس پاس کے کچھ حصے بھی شامل رہے ہوں گے کیوں کہ راجدھانیاں عموماً ریاست کے وسطی حصے میں ہی ہوا کرتی تھیں تاکہ انتظامی معاملات کی دیکھ بھال اور ڈاک کی آمد و رفت کی سہولت ہو۔

ریاست ودیہہ کا قدیم ترین تذکرہ یجر وید کی توضیحی تکملہ کتاب شت پتھ براہمن (शतपथ ब्राह्मण) میں ملتا ہے۔ اس کے مطابق یہ علاقہ پہلے گھنے جنگلوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا، جس سے متصل گنڈک ندی بہتی تھی۔ سب سے پہلے ودیہہ مادھو ودیہہ آریوں کے ساتھ یہاں پہنچے اور ان لوگوں نے مل کر اس جنگلی علاقے کو رہنے کے قابل بنایا۔ دریا کا ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے زمین بہت زرخیز ثابت ہوئی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ علاقہ آباد ہوتا گیا اور زراعت و صنعت کا مرکز بنتا گیا۔ ودیہہ مادھوی کے نام پر اس علاقے کا نام "ودیہہ" پڑ گیا۔ لیکن پرانوں میں ایک دوسرا خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے وہ یہ کہ "اکچھواکو" کے لڑکے "نمی" (निमि) نے ریاست ودیہہ کی بنیاد ڈالی۔ انھیں نمی کے لڑکے "متھی جنک" تھے جن کے نام پر بعد میں اس ریاست کا نام متھلا (मिथिला) پڑ گیا اور اس خاندان کے حکمراں اپنا شاہی خطاب "جنک" رکھنے لگے۔

انھیں جنک راجاؤں میں سب سے زیادہ مشہور سیردھوج جنک (सीरध्वज जनक) ہوئے ہیں جنھیں بعد میں لوگ صرف "جنک" کے نام سے یاد کرنے لگے۔ راجہ جنک مذہبی علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے اور ساتھ ہی حکمرانی کی اہلیت بھی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ان خوبیوں کی وجہ سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب ایودھیا پر راجہ دشرتھ حکمراں تھے۔ ان کے لڑکے رام چندر جی کی شادی انھیں راجہ جنک کی لڑکی سیتا جی سے ہوئی تھی۔

راجہ سیردھوج جنک کے بعد اس خاندان میں ۳۲ راجاؤں کا ذکر ملتا ہے لیکن ان کا دورِ حکومت کوئی خاص اہمیت و شہرت نہیں رکھتا۔ آخری راجہ کرال جنک کے دورِ حکومت میں ریاست ودیہہ کی سیاسی بنیادیں بالکل کمزور ہو چکی تھیں۔ اس لیے متھلا کی اس ریاست کا ورجیوں (वृज्जि) کے فیڈریشن (سنگھ) میں الحاق کر دیا گیا اور طرزِ حکومت کسی حد تک جمہوری ہو گیا

ویشالی ـــــ ریاست ویشالی کا نام وشال نامی ایک حکمراں کے نام پر رکھا گیا۔ رامائن اور پُرانوں میں ایک پُر جلال حکمراں وشال کا ذکر ملتا ہے۔ غالباً اسی کے نام سے یہ ریاست موسوم ہوئی۔

ورجیہ (वज्जि संघ) فیڈریشن یا وفاق میں جتنی بھی ریاستیں تھیں، بعد میں ویشالی کو ان سب ریاستوں کی مشترک راجدھانی بنا دیا گیا۔ گوتم بدھ کے کچھ ہی زمانے پہلے تک ویشالی کی جمہوری حکومت عالم وجود میں آچکی تھی لیکن اس طرز حکومت کا نظم و ضبط زیادہ مستحکم نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ورجیہ وفاق کے جنوبی علاقے میں دریائے گنگا سے متصل ریاست مگدھ کے حکمرانوں نے موقع پاکر اس وفاق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ورجیہ وفاق کا ایک اجمالی خاکہ جو آج سے ہزاروں سال پہلے وجود میں آچکا تھا، یہاں پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

۱۔ اس فیڈرل ریاست میں حکمرانوں کی ایک مجلس یا انجمن قائم تھی جس کی مثال کسی حد تک آج کل کی پارلیمنٹ سے دی جا سکتی ہے۔

۲۔ اس انجمن یا پارلیمنٹ کا ایک صدر ہوتا تھا، جسے صدر مملکت کہتے تھے۔ اس کے بعد دیگر اہم عہدے تھے مثلاً نائب صدر، سپہ سالار (کمانڈر)، وزیر اعظم، سکریٹری وزیر اعظم اور ارکان مجلس وغیرہ!

۳۔ سپہ سالار ساری افواج کا سالار اعظم ہوتا تھا۔

۴۔ مجلس کے اجلاس صدر یا نائب صدر کی صدارت میں ہوا کرتے تھے۔

حکومت ساز مجلس کے ،،،،،، ممبر ہوتے تھے۔ یہ ایسے نمائندے تھے جو عوام کی طرف سے چُنے جاتے تھے اور جو وفاق کی ساری ریاستوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ سارے اہم فیصلے کثرت رائے سے کیے جاتے تھے۔

ریاست ویشالی کی تاریخی قدر و منزلت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ہندستان کی دو عظیم و محترم شخصیتوں ـــ مہابیر جی اور گوتم بدھ ـــ کا یہیں سے خاص تعلق رہا ہے۔ اول الذکر جین دھرم اور موخر الذکر بدھ مذہب کے بانی ہوئے ہیں اور جن کی دعوتِ امن اہنسا، مساوات و صداقت اور مذہبی رواداری کی ہر انسان کے دل میں قدر و منزلت ہے۔

انگ ـــ راجہ بلی کی حکومت موجودہ بھاگل پور اور اس کے گرد و پیش کے علاقے میں قائم تھی۔ راجہ بلی کے پانچ لڑکوں میں سے "انگ" نامی لڑکے کو باپ کی حکومت کا جو حصہ ملا (یعنی سنتھال پرگنہ کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر موجودہ بھاگل پور کمشنری) وہ تاریخ میں ریاست انگ (अंग) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی راجدھانی مالنی (मालिनी) تھی۔ بعد میں اسی خاندان کے ایک حکمراں "چمپا" نے مالنی کی راجدھانی کا نام بدل کر چمپا کر دیا۔ یہی چمپا شہر عرصے تک ریاست انگ کا دار السلطنت رہا۔ قدیم مذہبی کتابوں میں اس کا ذکر اس حیثیت سے ملتا ہے کہ یہ اپنے وقت میں کافی طاقت ور ریاست بن کر ابھری تھی جس کی وجہ سے گرد و پیش کی ریاستیں اس سے خائف رہتی تھیں اور اسے تحفے تحائف بھی پیش کیا کرتی تھیں۔ مہابھارت کی بعض تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ دور مہابھارت میں کرن (कर्ण) ریاست انگ کا حکمراں تھا، جس نے ریاست کی خوش حالی اور قوت و حشم میں اور بھی اضافہ کیا۔ مہابھارت میں کرن کو اسی وجہ سے "انگ راج" کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔

چھٹی صدی قبل مسیح تک ریاست انگ عوام کی ۱۶ مقبول ترین طرز حکومت (جن پدوں) میں سے ایک تھی۔ ریاست انگ اور ریاست مگدھ میں برابر کشمکش رہا کرتی تھی جس میں اکثر انگ کا ہی پلہ بھاری رہتا۔ آخر کار یہ مستقل کشمکش ہی ریاست انگ کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مگدھ کے چالاک سیاست داں بمبسار (बिम्बिसार) نے آخر کار اسے فتح کر کے ریاست مگدھ میں ملا لیا۔

جھارکھنڈ ـــــ موجودہ بہار کے جنوبی علاقے میں آج بھی جنگلات اور جھاڑیوں کی کثرت ہے۔ قدیم زمانے میں تو یہ سارا علاقہ جھاڑ جھنکاڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اس علاقے میں آنے والے آریوں نے اسی مناسبت سے اس کا نام "جھارکھنڈ" رکھ دیا تھا۔ زمانۂ قبل از تاریخ ہی ان علاقوں میں جنگلی قومیں رہتی تھیں، جنھیں "ادی واسی" کہتے ہیں۔ آریوں کی آمد کے بعد یہ قومیں جنوبی پہاڑیوں میں روپوش ہو کر زندگی بسر کرنے لگیں۔ بہار میں آج بھی ان کی کثرت ہے، خصوصاً سنتھال پرگنہ میں منڈا، اراؤں اور سنتھال، وحشی قبائل کے لوگ اب بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں جن میں تہذیب و تمدن کی روشنی آج بھی برائے نام ہی پہنچ پائی ہے۔ اسی وجہ سے اس علاقے میں ہمیں کوئی تاریخی سرمایہ بھی نہیں ملتا۔

مگدھ ـــــ ہندستان کی قدیم تاریخ میں مگدھ کی ریاست کو وہی شہرت حاصل تھی جو ویشالی کو لیکن جہاں ویشالی کے ورجیہ وفاق کی ریاستیں کمزور ہو کر جلد ختم ہو گئیں، وہاں ریاست مگدھ کا ایک عرصے تک زور رہا۔

پٹنہ اور گرد و پیش کا علاقہ قدیم مگدھ ریاست میں شامل تھا۔ اُن دنوں جبکہ متھلا اور ویشالی میں آریوں کی منظم ریاستیں قائم تھیں، مگدھ کا علاقہ غیر آریوں کے تصرف میں رہا۔ راماین میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ (موجودہ پٹنہ کے قریب) گنگا کے کنارے رشی وشوامتر نے اپنا آشرم بنالیا تھا۔ لیکن (غالباً اسے ایک سیاسی پیش قدمی تصور کرکے) مگدھ کے غیر آریوں نے انھیں پریشان کرنا شروع کیا۔ چنانچہ انھوں نے شری رام چندر جی اور لچھمن جی کی مدد سے غیر آریوں کو ان علاقوں سے بے دخل کر دیا اور ان لوگوں نے بھاگ کر دشوار گزار جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں میں پناہ لی۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندستان میں اس طرح کی تقریباً سولہ ریاستیں قائم تھیں۔ مگدھ کی ریاست بھی انھیں میں سے ایک تھی۔ مگدھ کو اپنے وقت کی ایک منظم اور طاقت ور ریاست ہونے کے باعث عرصے تک گرد و پیش کی تمام ریاستوں پر بالادستی حاصل رہی۔ بمبسار کے زمانے میں اس ریاست نے خاص طور سے ترقی کی جس کا تذکرہ تاریخوں میں قدرے تفصیل سے ملتا ہے۔ بمبسار کی شخصیت میں ایک کامیاب حکمراں بننے کی صلاحیتیں اور قابلیتیں موجود تھیں چنانچہ اس نے حکمت عملی سے کام لیا اور ریاست کو مزید وسعت دینے اور مستحکم بنانے کی خاطر اس نے تین شادیاں کیں۔ قرب و جوار کی ریاستوں کے ساتھ اس نے امن اور دوستی کی فضا بھی قائم کی۔ ایک شادی اس نے مدر ([illegible]) کی راج کماری کے ساتھ کی۔ دوسری ویشالی کے صدر مملکت کی بہن سے اور تیسری شادی اس نے کوشل کی راج کماری کے ساتھ کی۔ اس طرح کاشی کی ریاست اسے تیسری رانی کے جہیز کے طور پر حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ اس نے "انگ" پر چڑھائی کرکے اس ریاست کو بھی مگدھ میں شامل کر لیا۔ اس طرح اپنی حکمت عملی اور تدبر سے بمبسار نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی تھی۔

بمبسار اگرچہ خود بدھ دھرم کا پیرو تھا مگر اس نے تمام مذاہب کے احترام و آزادی کو برقرار رکھ کر ہر فکر و خیال کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ خوش اور مطمئن رکھنے کی سعی و کوشش کی اور اس میں اسے بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن بمبسار کی یہ پالیسی اس کے لڑکے اجات شترو ([illegible]) کو پسند نہیں آئی۔ بمبسار کے آخری ایام بہت سخت گزرے۔ اس کے لڑکے نے اسے قید کر دیا اور وہیں اس کی موت واقع ہوئی۔ اس کی اقتدار پسندی نے اس سے آگے بڑھ کر پاس پڑوس کی ریاستوں پر بھی ڈورے ڈالنے شروع کر دیے اور وہ ایک عظیم سمراٹ بننے کے خواب دیکھنے لگا۔

ورجیہ وفاق کی شہرت اس زمانے میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی جو مگدھ ہی کی طرح ایک طاقت ور حکومت تھی۔ اس وفاق کو توڑنے کے لیے ایک طرف اس نے اپنے جاسوسوں کے ذریعے اندرونی پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی اور دوسری طرف فوجی کارروائی کے بہانے تلاش کرنے لگا۔ حسن اتفاق کہ اسے یہ بہانا ہاتھ آ بھی گیا۔ گنگا ندی کے ایک چھوٹے سے بندرگاہ کے سلسلے میں جس کا آدھا حصہ مگدھ میں شامل تھا اور آدھا ورجیہ وفاق کے ماتحت تھا، کچھ اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس موقعے کو غنیمت سمجھ کر اجات شترو نے ورجیہ وفاق پر بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی کر دی۔ اندرونی پھوٹ کی وجہ سے اسے زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور اس طرح اس نے ورجیہ وفاق پر قبضہ کر لیا۔ اس نے پاٹلی پتر کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔ یہ خود بھی بودھ دھرم کا پیرو تھا اور اسے پھیلانے میں بھی بڑی دلچسپی لی۔

اجات شترو کا انتقال ۴۷۵ ق م میں ہوا۔ اس کے بعد اس کے لڑکے اُدے بھدر ([illegible]) کے ہاتھوں میں زمام حکومت آئی۔ لیکن یہ اس بڑی سلطنت کو سنبھال نہ سکا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ششو ناگ نے مگدھ کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ کچھ مدت تک مگدھ پر اس خاندان کی حکمرانی رہی یعنی صرف دو پشت تک۔ ششو ناگ خاندان کے راجہ کال اشوک کا کام تمام کرکے مہاپدما نند نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور رفتہ رفتہ اس نے ششو ناگ کے خاندان کے سارے افراد کو ختم کروا دیا۔ البتہ اس نے ریاست مگدھ کی سرحدیں اور وسیع اور مضبوط کر لیں۔ اس نے اپنی حکومت مغرب میں پنجاب اور سندھ تک یعنی گویا پورا شمالی ہند اور جنوب میں گوداوری کے ساحل تک پھیلائی۔

نند خاندان کے دوسرے حکمراں دھن نند ([illegible]) کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکا۔ تاریخوں میں اس کا تذکرہ مغرور اور عیش پرست حکمراں کی حیثیت سے کیا گیا ہے جس کے دور حکومت میں عوام پریشان اور غیر مطمئن تھے۔ ان کے دلوں میں اس شہنشاہ سے نفرت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ سکندر اعظم کے حملے ہندستان پر شروع ہو گئے تھے۔ ادھر موریہ خاندان سے تعلق رکھنے والے چندر گپت اپنی ذہانت اور تدبر کی وجہ سے

نمایاں شخصیت کا مالک بنتا جا رہا تھا۔ سکندر کی فوجی چھاؤنی میں کچھ دنوں رہ کر چندر گپت نے فوجی تربیت حاصل کی۔ اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ سکندر سے پورے ہندستان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے لہذا اس نے علاحدگی اختیار کر لی اور آزادانہ طریقے سے اپنی فوج بنانے اور منظم کرنے میں لگ گیا۔ ادھر وشنو گپت بھی۔ [تاریخ جسے چانکیہ (चाणक्य कौटिल्य) کے نام سے یاد کرتی ہے] اس تدبیر میں تھا کہ مگدھ کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے۔ اس نے چندر گپت کو اس کام کے لیے مناسب سمجھا۔ اتفاق سے مگدھ کے حکمراں دھن آنند کے وزیر راکشش کی ہمدردیاں بھی اسے حاصل ہو گئیں۔ اب کام بہت آسان ہو گیا تھا۔ چانکیہ نے چندر گپت کے ساتھ ریاست مگدھ پر چڑھائی کر دی اور دھن آنند کو قتل کر کے مگدھ پر چندر گپت کا قبضہ کرا دیا اور اس سلسلے میں راکشش کو چندر گپت کا وزیر بنوا دیا۔

چندر گپت بہت بیدار مغز اور کامیاب حکمراں ثابت ہوا۔ اس کی حکومت کی خوبیاں چانکیہ کی مشہور زمانہ کتاب ارتھ شاستر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

چندر گپت کے زمانے میں ہندستان کی شہرت دور دراز ملکوں میں بھی پہنچی۔ تجارتی لین دین کو بڑھاوا ملا اور ملکی تہذیب و تمدن کے اثرات بھی دور دور تک پھیلے اور ایک دوسرے سے گلے ملے۔

چندر گپت کے بعد اس کا لڑکا اشوک (۲۷۳ سے ۲۳۶ ق م) ریاست مگدھ کا والی ہوا، جو اپنی شہرت و نیک نامی اور بے داغ حکمرانی کی وجہ سے تاریخ کا ایک مایۂ ناز حکمراں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے دور حکمرانی کا ایک خاص اور قابل ذکر واقعہ ریاست کلنگ (कलिंग) کی فتح ہے۔ کلنگ کی ریاست ناقابل تسخیر سمجھی جاتی تھی۔ کلنگ کے باشندے بڑے بہادر اور جنگ جو تھے اس لیے ان پر فتح پانا انتہائی دشوار کام تھا لیکن اشوک کے حملے کی تاب وہ نہ لا سکے۔ اس فتح نے اشوک کی زندگی کا نقشہ ہی یکسر بدل دیا۔ کلنگ کی جنگ میں جو خوں ریزی ہوئی اس نے اسے شانتی اور اہنسا کے علمبردار بدھ دھرم کے آغوش میں پہنچا دیا۔ اس کو جنگ و جدل سے سخت نفرت ہو گئی یہاں تک کہ اس نے سارے اسلحے تباہ کرا دیے اور خود بھکشو بن گیا۔ اس نے بدھ مت کی بے شمار یادگاریں ملک میں جابجا قائم کروائیں اور ملک سے باہر بھی بدھ دھرم کے پرچار کے لیے وفود روانہ کیے۔ اشوک کی ان کوششوں کے نتیجے میں لنکا، برما، سیام (تھائی لینڈ) جاوا، سماترا، چین، کوریا، منگولیا اور جاپان وغیرہ ملکوں میں بدھ مذہب کی تعلیمات کو فروغ ہوا۔

اشوک کے بعد مگدھ کی حکومت روز بروز کمزور ہوتی چلی گئی۔ موریہ خاندان کے آخری راجہ "برہ درتھ" (बृहद्रथ) کو اس کے سپہ سالار نے تہہ تیغ کر دیا اور اس طرح ۱۸۰ یا ۱۸۵ ق م میں موریہ خاندان کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

اس کے بعد مگدھ پر شُنگ خاندان کے راجاؤں کی ایک حکومت قائم ہوئی جس کا پہلا حکمراں پُشپ مِتر (पुष्य मित्र) تھا۔ اس کے دور حکومت میں ہندستان پر یونانیوں کے حملے شروع ہو گئے تھے لیکن اس نے اپنی سوجھ بوجھ سے یونانیوں کے حملوں کو ناکام بنا دیا۔ شنگ خاندان میں کل دس حکمراں ہوئے جنھوں نے مگدھ پر کوئی ۱۱۲ سال حکومت کی۔ شنگ خاندان کا زوال ۷۰ ق م میں ہوا جب "کنووں" (कण्वों) نے مگدھ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔

مگدھ پر کنو (कण्व) خاندان کی حکمرانی صرف ۷۰ سے ۳۱ ق م تک رہی۔ اس خاندان کے حکمراں کوئی مضبوط ضبط و نظم قائم نہ کر سکے چنانچہ صرف ۲۵ سال بعد ہی "آندھر" (आंध्र) نامی ایک سپہ سالار نے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد شمالی مغربی ہندستان کی کوشان (कुषान) قوم نے مگدھ پر چڑھائی کی اور اس پر اپنا قبضہ جما لیا۔ تقریباً سو سال تک مگدھ ان کے زیر اثر رہا۔ اس کے بعد اقتدار کی باگ ڈھیلی ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ مختلف ریاستیں جو مگدھ میں ضم ہو گئی تھیں، پھر سے آزاد ہونے اور اپنا علاحدہ وجود برقرار رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگیں۔ آزاد ہونے والی ریاستوں میں سے ایک کا حکمراں چندر گپت اول ہوا اور اس نے گپت خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ چندر گپت اول صرف آٹھ سال ہی حکومت کر سکا لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے اپنی حکمت عملی اور تدبر سے مگدھ کی حکومت کو کافی طاقت ور بنا دیا اور دوسری کئی ریاستوں کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ گپت خاندان کی حکمرانی تقریباً ۵۰۰ عیسوی تک قائم رہی۔ اس کے بعد بہار پر پال خاندان کا اور پھر سین خاندان کا اقتدار قائم ہو گیا۔ لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد سین خاندان کی حکمرانی ختم ہو گئی

اس طرح دیکھا جائے گا کہ بہار کی تاریخ نہ صرف بہت قدیم ہے بلکہ

جمہوریت اور مشترکہ طرزِ حکومت کے نقوش سب سے پہلے بہار ہی میں ملتے ہیں۔ اشوک جیسے شانتی اور امن کا پیغامبر مانا جاتا ہے، بہار ہی کا حکمراں تھا۔ بوک، برش اور کالی داس جیسے اہلِ علم و دانش کو بہار ہی کی سرزمین نے جنم دیا۔ یہ بہار کی علمی مرکزیت ہی تھی جو دور دراز کے ملکوں سے طالبانِ علم کو کھینچ کر یہاں لاتی تھی۔ قدیم ہندستان کی اکثر یونی ورسٹیاں — مثلاً نالندہ، وکرم شلا اور اُدنت پور وغیرہ بہار ہی میں واقع تھیں جن کے شاندار روایات تاریخِ بہار کے قابلِ فخر زرّیں اوراق ہیں۔

لہ کچھ لوگ کالی داس کی جائے پیدائش کشمیر یا اس کے آس پاس کے علاقے کو بتاتے ہیں۔

رضو بجیا

(بقیہ صفحہ ۲۹)

کٹائے لیے اپاہج بنی بیٹھی بھی نہیں رہ سکتی۔

رضو بجیا — بہن نزہت! تم ان سنڈی لڑکیوں کی بات کا برا نہ مانو یہ تو نرے چھوٹا دیکھیں نہ بڑا، یونہی ہر شخص سے ہنسی مذاق کرنے لگتی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ان کے ہاتھ سے برقعہ چھین کر الگنی پر ٹانگ دیا اور کہا یہ تو بتاؤ بہن اس وقت ادھر کیسے آنکلیں؟

نزہت — ادھر آنکلیں کا کیا مطلب! میں تو خاص طور پر اپنی رضو بجیا سے ملنے نہیں بلکہ انھیں تکلیف دینے آئی ہوں ورنہ بہن! مجھے کہیں آنے جانے کی کیا دم مارنے کی فرصت نہیں۔ تم جانتی نہیں ہو مجھ کی شادی کی تاریخ سر پر آگئی ہے۔ صرف ایک مہینہ رہ گیا ہے اور سب سینا پرونا اسی طرح پڑا ہے۔ خیر اور سب کام تو کسی نہ کسی طرح نپٹ ہی جائیں گے لیکن رضو بجیا! رضائی کی گوٹ کاٹنا میرے بس کی بات نہیں اور جس سے کہو وہ کانوں پر ہاتھ رکھنے لگتا ہے اور کاٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کوئے پر والی وکیل صاحب کی بیوی مارے شیخی کے قینچی لے کر گوٹ کاٹنے بیٹھ گئیں لیکن جب اینڈے بینڈے ہاتھ چلانے لگیں تو میرا دل دھک سے ہو گیا اللہ خیر کرے کہیں اچھا خاصا کپڑا ستیاناس نہ کر دیں۔

اللہ کو گوٹ بچانی منظور تھی اس لیے اسی وقت خیالی گنج والی خالہ زینتؔ رحمت ہو کر آگئیں اور انھوں نے کہا کہ تم گوٹ کے لیے کاہے کو پریشان ہوتی ہو کیا تم نہیں جانتیں کہ تمھاری رضو بجیا رضائی کی ایسی گوٹ کاٹتی ہیں کہ لوگ تماشا دیکھیں۔ وہ اتفاق سے جو رضائی اوڑھے ہوئے تھیں اس میں آپ ہی کے ہاتھ کی گوٹ ٹکی ہوئی تھی۔ نہ کہیں جھول نہ کان۔ اب ایسی سڈول گوٹ تو شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔

لڑکیاں کمرے کے باہر سے یہ باتیں سن رہی تھیں اور مسکرا کر کہہ رہی تھیں کہ اب کیا ہے؟ اب تو بجیا کمر کا درد اور پنڈلیوں کی اینٹھن سب بھول جائیں گی اور بالکل جاتے جو ہنڈ بھکو گوٹ کاٹنے بیٹھ جائیں گی جس طرح شاعر اپنے شعر کی تعریف سننے کے لیے ہر زحمت اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اسی طرح بجیا کپڑے کی کتر بیونت میں اپنی مہارت کی تعریف سُنا کر سب درد، دکھ بھول جاتی ہیں۔

لڑکیاں کمرے کے باہر یہ کہہ رہی تھیں اور کمرے کے اندر بجیا کی قینچی گوٹ پر بڑی روانی سے چل رہی تھی۔ اینٹھن، درد، دُور ہو چکا تھا اور چہرہ فخر و مسرت سے چمک رہا تھا۔

★

بہادر ۱۸۹۰ تک

غزل

غلام مرتضیٰ راہی

راستہ مرے غم کا منزلِ سفر تک ہے
روشنی ستاروں کی بس حدِ سحر تک ہے

تم چمن کے گل بوٹو، کس لیے پریشاں ہو
بجلیوں کی یورش تو میرے بال و پر تک ہے

میرا ذوقِ نظارہ مطمئن نہیں ورنہ
روشنی چراغوں کی عارضِ قمر تک ہے

شہرِ زندگی تیری بے حسی کا یہ عالم
آج سونی سونی سی دل کی رہگزر تک ہے

آپ اپنے دامن پریشاں کو جذب کیوں کیجے
سلسلہ ان اشکوں کا شعلہ و شرر تک ہے

ایک ایک لمحے کو عرصۂ غنیمت جان
کائنات بس اس کی جنبشِ نظر تک ہے

اک صدائے سنگ زنی ہر کانوں میں
بازگشت صحرا کی لبِ نوحہ گر تک ہے

آہ! ان سفینوں کی بے بسی کا یہ منظر
سرخوشی طوفاں کیا؟ رقص میں بھنور تک ہے

شانِ بے نیازی سے کام لیجیے، ورنہ
گردِ راہ تو راہیؔ منزلِ سفر تک ہے

زاہدہ تحسین

زندگی مٹتی رہی ہے، داستاں کوئی نہیں
ہم نفس کوئی نہیں ہے، ہم زباں کوئی نہیں

مہرباں کہیے کسے، نامہرباں کس کو کہیں
صورتِ بیداد ہیں، آرامِ جاں کوئی نہیں

لمحہ لمحہ ہیں بہاریں، لمحہ لمحہ ہے خزاں
فصلِ گل کچھ بھی نہیں، دورِ خزاں کوئی نہیں

زندگی موجِ بلا ہے، زندگی سیلِ طرب
جیسے سب کچھ امتحاں ہے، امتحاں کوئی نہیں

جب بھی چاہا زندگی سے ہم نے اس کا بانکپن
فاصلے بڑھتے رہے ہیں درمیاں کوئی نہیں

شعر کے خاکوں میں رنگِ زندگی بھرنا پڑا
چیستانِ شعر کیوں، طرزِ بیاں کوئی نہیں

ختم یوں کردی گئی ہے جرم کی ہر اک دفعہ
آپ کے ترکش میں اب تیر و کماں کوئی نہیں

ہم فلک پر اُڑ رہے ہیں ذہن کی پرواز میں
فرش کی پہنائیوں میں آشیاں کوئی نہیں

آپ تحسیںؔ انجمن ہیں، آپ ہی تنہائیاں
حاصلِ غم، حاصلِ عمرِ رواں کوئی نہیں

(افسانہ)

اچل سنگھ

"بی۔ایس سی کر لینے کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے؟" میں نے اچانک موضوع کا رُخ بدلتے ہوئے سوال کیا۔

کامنی نے میز پوش پر اپنی خوبصورت مخروطی انگلی کے فیشن ایبل ناخن سے تجریدی آرٹ قسم کی ٹیڑھی میڑھی لکیریں بناتے ہوئے کہا: "ابھی تو دماغ میں ڈاکٹر بننے کی دُھن ہے۔ آئندہ دیکھئے مقدر میں کیا لکھا ہے۔"

"ارادہ تو بہت نیک ہے مس کامنی! مگر ڈاکٹر بننے کے بعد اس بات کا ضرور خیال رہے کہ کسی روز اگر یہ خاکسار بیمار ہو کر آپ کے اسپتال پہنچ جائے تو اس کو پہچاننے میں تکلف نہ برتیں گی۔"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں مسٹر پرکاش بھگوان نہ کرے آپ کو کبھی اسپتال کا منہ دیکھنا پڑے۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ اپنی زندگی کچھ اس طور سے گزر رہی ہے کہ چند برس بعد اپنی زبان پر یہ مصرع ہوگا "کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر۔"

کامنی نے ایک معصوم سا نسوانی قہقہہ لگایا جس کے جواب میں میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

کامنی سے میری پہلی ملاقات دو برس پہلے اپنے کالج کی بزم اردو میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ سرو قد، متناسب اعضا، روشن آنکھیں، مسکراتا ہوا چہرہ، شوخی کے اعتبار سے نہ وہ بیباک تھی اور نہ سنجیدگی کے لحاظ سے بور۔ اس کی شخصیت پرکشش اور باوقار تھی۔ ادب سے اُسے گہری دلچسپی تھی اور آرٹ اور موسیقی سے فطری لگاؤ۔ یہی وجہ تھی کہ ہم ذہنی اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب آ گئے لیکن ہم نے کبھی ایک دوسرے کو باہمی تعریف سے بور نہیں کیا تھا۔

دو برس بعد ہماری ملاقات اچانک لاہور کے کافی ہاؤس میں ہوئی۔

میں ملازمت کے سلسلے میں چند ہفتے قبل ہی لاہور آیا تھا۔ کامنی کے والد ڈاکٹر بہاری لعل کھنہ لاہور کے اچھے ڈاکٹروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ کامنی کے والدین اگرچہ نئی روشنی کے پرستار نہ تھے لیکن انھیں کسی طرح پرانے خیالات کے لوگوں کے زمرے میں بھی نہیں لایا جا سکتا تھا۔ میں ان سے کئی مرتبہ مل چکا تھا۔ انھیں میرے خیالات و افکار اور میرے عادات و اطوار سے واقف ہو جانے کے بعد قطعی مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ انھیں میرے اوپر کافی اعتماد ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وہ ذہنی اعتبار سے بحاظ انسان کسی کو بلا وجہ شک و شبہے کی نظر سے نہیں دیکھتے۔

ایک غیر شادی شدہ برسر روزگار اور ہوٹل کے کمرے میں زندگی بسر کرنے والے کے بارے میں یہ قیاس کر لینا قطعی مشکل نہیں کہ دفتر کے اوقات سے پیشتر اور اس کے بعد کیا مشاغل ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صبح دیر سے بیدار ہونا ایک کپ چائے اور سگریٹ ضروریات سے فارغ ہونے سے پہلے اور ایک کپ چائے اور ایک سگریٹ شیو کرتے وقت ملنا ضروری ہے۔ غسل کے لئے کافی وقت ہونا چاہئے اور مداخلت کا بھی اندیشہ نہ ہو۔ البتہ شام کے وقت جب وہ ہاتھ منہ دھو کر اور لباس تبدیل کر کے یعنی بشاش موڈ میں ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلتا ہے تو دیکھنے کی چیز ہوتا ہے۔ جب بازار میں مال روڈ پر یا کسی ریستوراں میں جاتا ہے تو اُسے ساری کائنات حسین نظر آتی ہے، ہر نسوانی آواز قلقلِ مینا کی سی سُنائی دیتی ہے اور زندگی آغازِ بہار دکھائی دیتی ہے۔ ریستوراں میں دوستوں کی خوش گپیوں اور لطیفوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد دن بھر کی تکان دور ہو جاتی ہے اور گزرتے ہوئے وقت کا احساس نہیں رہتا۔ اور اچانک جب کسی شادی شدہ دوست کی نظر گھڑی پر پڑتی ہے تو وہ شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگتا ہے کہ آج اُسے گھر پہنچنے میں بہت دیر ہو گئی ہے۔ بچے انتظار کر کے سو گئے ہوں گے اور بیوی سوئیٹر بُنتے بُنتے تنگ آکر

ریلیز ہو چکی رہی ہوگی اور اس طرح وہ نیند کو پلکوں پر حاوی ہونے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ چنانچہ گھر پہنچنے کے لئے اس کا اجازت لینا مذاق کا موضوع بن جاتا ہے۔ "ارے چلے جانا یار! ابھی وقت ہی کیا ہوا ہے۔ ابھی تو نو بج کر بیس منٹ اور مٹھو فنوش نے ایک غزل کہی ہے۔ ذرا تم بھی سنتے جاؤ۔

کچھ ایسی ہی زندگی میری بھی تھی۔ کبھی دس بجے ہوٹل پہنچے اور کبھی سنیما کا سکنڈ شو دیکھ کر۔ رات کا کھانا اکثر ٹھنڈا اور بدمزہ کھایا لیکن کبھی افسوس نہ ہوا۔

ہفتہ میں ایک دو بار ڈاکٹر صاحب کے ہاں بھی چلا جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں اور آدھ پون گھنٹہ بیٹھ کر چلا آتا۔ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پکچر کا پروگرام بھی بن جاتا۔ اور کبھی کسی اتوار کو ان کے ساتھ پکنک پر بھی چلا جاتا۔

ایک شام ان کی کوٹھی کے لان پر کامنی اور میں بیٹھے ہندستان کی سماجی زندگی کے موضوع پر تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ موضوع کا رُخ ازدواجی زندگی کی جانب مڑ گیا۔ ازدواجی زندگی کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد میں نے کامنی سے سیدھا سوال کیا "آپ کا اپنی شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

کامنی بہت ذہین لڑکی تھی۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے لبِ لعلیں پر نمودار ہوئی اور مجھے اس کا چہرہ ماہِ کامل نظر آنے لگا۔ اس نے کہا: "اگر آپ کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے تو میں اتنا ہی کہوں گی کہ میرا ارادہ شادی کرنے کا قطعی نہیں ہے اور میں اس مسئلے پر اپنے والدین سے بھی گفتگو کر چکی ہوں۔ انھوں نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا البتہ قدرے خاموش سے ہو گئے تھے۔ ممکن ہے انھیں کچھ مایوسی ہوئی ہو لیکن انھیں میری خوشی کا زیادہ خیال ہے۔ میں یہ بھی خوب جانتی ہوں کہ آپ کو بھی کچھ مایوسی ہوئی ہے مسٹر پرکاش! کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"جی نہیں! میں نے کبھی ایسی خواہش کو اپنے دل میں پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔ میرا ذہن اور میرا دل ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ میں اپنی موجودہ زندگی سے قطعی مطمئن ہوں۔ میری زندگی میں کوئی خلا نہیں جس کو پُر کرنے کی ضرورت محسوس ہو" میں نے نہایت پُرسکون لہجے میں کہا۔

"میرا بھی ایسا ہی خیال ہے مسٹر پرکاش! ڈاکٹر بننے کے بعد اسپتال میں مریضوں کی دیکھ بھال کے بعد اتنا وقت نہ بچے گا کہ زندگی بور معلوم ہو۔ غریب مریضوں کا علاج کروں گی اور ان کو نئی زندگی دیے جانے کے لئے خدا سے دعا کیا کروں گی۔ اس سے بڑی انسان کی خدمت اور بھگوان کی پوجا کیا ہو سکتی ہے" کامنی کے لہجے میں اعتماد و استقلال تھا۔

"لیکن مس کامنی! میں نے بہت کم ایسی لڑکیوں کو دیکھا یا سُنا ہے جو شادی سے انکار نہ کرتی ہوں اور بعد ازاں والدین کے سمجھانے بجھانے پر چپکے سے ڈولی میں نہ بیٹھ جاتی ہوں اور جھوٹے آنسو نہ بہاتی ہوں" میں نے کامنی کو چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

اس پر کامنی بھڑک اُٹھی۔ کہنے لگی "لیکن میں ایسی لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ اور پھر آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان لڑکیوں کی شادی بھی تو مردوں ہی سے ہوتی ہے اور ان میں سے ایک مرد آپ بھی ہو سکتے ہیں جو برات لے کر اس لڑکی کے در پر جبیں سائی کریں" کامنی کا نقرئی قہقہہ فضا میں اُبھرا اور میں خاموش ہو گیا' لاجواب!

اس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ کبھی پکچر دیکھنے چلے جاتے اور کبھی میوزک کانفرنس' کلچرل پروگرام یا مشاعرے میں شریک ہوتے۔ آپس میں ان پروگراموں پر تبادلہ خیال بھی کرتے۔ ہمارے درمیان دوستانہ تعلقات ہمیشہ خوش گوار رہے۔ اچانک میرا تبادلہ لاہور سے دہلی ہو گیا اور میں بھی کامنی اور اس کے والد سے مل کر اور انھیں الوداع کہہ کر دہلی چلا آیا۔

چند ماہ بعد ہندستان آزاد ہو گیا اور تقسیم ملک کی وجہ سے مجھے کامنی کے بارے میں برسوں تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ ویسے بھی میں خط و کتابت کے معاملے میں بے حد بے نیاز واقع ہوا ہوں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی کوئی خط کامنی کو لکھا ہو۔ اور پھر میں ماضی کے دھندلکوں کو حسین یادوں کے چراغ سے روشن کرنے میں یقین نہیں رکھتا۔ ہر صبح کی نئی کرن مجھے بے حد خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔

دہلی کی تیز رَو زندگی میں نئی دہلی اور پرانی دلّی کے درمیان طویل فاصلے میرے لیے طویل تر ہوتے گئے۔ یہاں کی اقتصادیات کی وجہ سے میری معقول آمدنی اخراجات کے سامنے دَم توڑنے لگی اور میرے مشاغل کم سے کم تر ہوتے گئے۔ میرے دوستوں کی تعداد کم ہونے لگی اور میں ہوٹل کے بجائے ایک کمرے میں جو بہ مشکل تمام حاصل ہو سکا تھا' رہنے لگا۔ میرے دوستوں نے میرا کمرہ دیکھ کر اظہارِ مسرت کیا اور مجھ سے کہا۔ "خدا کا شکر بجا لاؤ دوست! تمھیں ایک خوبصورت کمرہ ملحقہ غسل خانے کے ساتھ مل گیا اور وہ بھی کناٹ پلیس سے صرف چار میل

کے فاصلے پر۔ بہت خوش نصیب ہو دوست!" اور میں اس تعریف سے جھینپ گیا۔

ایک شام کو میں اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا دن بھر کی تکان دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیٹے لیٹے میں اپنی گزشتہ تیز رفتار زندگی کا جائزہ لینے لگا۔ ماضی کے دھندلکے سے کامنی کی بھی تصویر ابھری اور متعدد دوستوں کے قہقہے میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ریستورانوں کی بظاہر دل فریب فضا میں میں اپنے آپ کو گم ہوتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ اچانک ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں نے محسوس کیا کہ میں ایک ایسا مسافر ہوں جو اپنے غلط زعم میں زندگی کے حسین فریب کھاتا رہا اور مطمئن رہا۔ لیکن اب بھی میں زندگی کے حقیقی صبر و سکون کی منزل سے بہت دور تھا۔ ہوٹل کا وہ ٹھنڈا اور بدمزہ کھانا بھی یاد آیا جس پر مجھے کبھی افسوس نہ ہوا تھا۔ اب اس کھانے کے تصور ہی سے، جو میں بیس برس سے کھاتا چلا آیا تھا، میرے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی۔ ذہن کے آئینہ خانے میں میں نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا تو مجھے کوئی تصویر دیوار پر سلیقے سے لگی ہوئی نہ دکھائی دی۔ پردوں پر شکنیں اور دھبے جا بجا نظر آنے لگے۔ کتابوں کے گرد پوش پر جمی ہوئی گرد میرا منہ چڑھانے لگی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اور میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا: "اف! اوہ! کس قدر بھیانک تصور تھا۔"

اس شام کے بعد سے اپنے کمرے میں رکھی ہوئی کتابوں، دیوار پر آویزاں تصویروں، میز کرسیوں، پلنگ اور دیگر چھوٹی چھوٹی چیزوں سے میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے دن میں کئی کئی بار تصویروں کی ترتیب، کتابوں کی صفائی اور دوسری چیزوں کو ان کی معینہ جگہ پر رکھنے پر توجہ دینا شروع کر دی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ میرا گھر ہے اور میں نے ان بے جان چیزوں سے کتنی بے اعتنائی برتی ہے۔ میرا کمرہ میرے حسنِ ذوق کا آئینہ دار ہے۔ محض میرا اچھا سا سوٹ، پالش کیے ہوئے بوٹ اور چمکتی ہوئی ٹائیاں میری صحیح شخصیت کو ظاہر نہیں کرتیں۔ میرا یہ احساس روز بروز بڑھتا ہی گیا۔

آخر ایک روز میں نے اپنے دیرینہ عزم کی سپر ڈال دی اور اپنے ایک محترم بزرگ راشٹے صاحب گوڈھاری لال سے درخواست کی کہ وہ مجھے ازدواجی رشتے میں منسلک ہونے میں میری مدد کریں۔ اس پر راشٹے صاحب مسکرا دیے۔ میرے ذہن میں ان کی یہ معنی خیز مسکراہٹ تیر کی طرح پیوست ہو گئی۔ یہ درست ہے کہ اس وقت میری عمر چالیس برس کے قریب تھی لیکن زندگی کا آخری دور ہی تو سہارے کا طالب ہوتا ہے۔ اب میں بھی اپنے آپ کو ان ہی لوگوں میں شمار کرنے لگا تھا۔

راشٹے صاحب نے کہا کہ وہ اخبارات میں اشتہار دیں گے اور امید ہے کہ جلد ہی خطوط مع تصویروں کے موصول ہونے لگیں گے۔ پھر آپس میں مشورہ کر کے طے کر لیا جائے گا کہ کون میری بہترین رفیقۂ حیات ہو سکتی ہے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور واپس چلا آیا۔

پندرہ روز بعد مجھے راشٹے صاحب کا فون ملا۔ انھوں نے مجھے شام کو چھ بجے اپنی کوٹھی پر بلایا تھا۔ میں وقت مقررہ پر ان کے ہاں پہنچ گیا۔ راشٹے صاحب ڈرائنگ روم میں موجود تھے اور ایک مصور رسالہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے نمسکار کیا اور قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ ابھی سلسلۂ کلام شروع ہی ہوا تھا کہ ایک خاتون گلابی رنگ کی ساڑی میں ملبوس کمرے میں داخل ہوئیں اور راشٹے صاحب کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"ان سے ملئے۔ آپ ہیں مسٹر پرکاش ملہوترہ اور آپ ڈاکٹر کامنی کھنہ۔"

ہم نے ایک دوسرے کو نمسکار کیا۔ میں نے سوچا شاید راشٹے صاحب سے کوئی رشتے داری ہو گی۔ ان سے ملنے آئی ہوں گی۔ بیس برس بعد میں کامنی کو دیکھ رہا تھا۔ بالکل ویسی ہی۔ لیکن چہرے پر اب وہ شگفتگی نہ رہی تھی۔ پھر بھی وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

راشٹے صاحب نے پھر سلسلۂ کلام شروع کیا۔ "بھئی پرکاش سنو! ڈاکٹر کھنہ اس اشتہار کے جواب میں خود ہی چلی آئیں۔ انھوں نے تصویر بھیجنا مناسب نہیں سمجھا۔ ان سے بات چیت کر لو اور بعد میں مجھ سے مل لینا اور ....."

راشٹے صاحب کا جملہ ابھی مکمل نہ ہوا تھا کہ کامنی نے نئی نویلی دلہن کی طرح شرما کر سر جھکا لیا۔

★

شرابی

انتخاب سید

نشے میں چور گناہ و ثواب کا مارا
قدم قدم پہ نئے زاویے بناتا ہوا
کبھی خموش، کبھی تیوری چڑھاتا ہوا
پلٹ پلٹ کے غمِ زندگی کو دیکھتا ہے
بڑے خلوص سے ہر آدمی کو دیکھتا ہے !

کسی کو روک کے کہتا ہے میں نشے میں نہیں
کسی سے اپنی شرافت کے گیت گاتا ہے
کسی سے وعدۂ فردا کا تذکرہ کرتا
کسی سے خود کو بھی انساں بتا کے روتا ہے

نشے میں چور اک آوارہ بوئے گل کی طرح
تلاشِ سرحدِ نورِ سحر میں سرگرداں
ہر اک نگاہِ حقارت کے بار اٹھائے ہوئے
خود اپنی روح کی پاکیزگی کو کھوتا ہے
فریب کھاتا ہوا زندگی کے ہاتھوں سے
ٹوٹتا ہوا ماحول کو گزرتا ہے
بڑے خلوص سے ہر آدمی کو دیکھتا ہے!!

ڈنک ترنک

پریم واربرٹنی

نرم پلکوں میں ہے اَن دیکھی بہاروں کا سرور
نیند کے نشے میں کیا عالمِ بیداری ہے
تیرے جلوے میں گھلا ہے مرے گیتوں کا گلال
ہر ادا رنگ میں ڈوبی ہوئی پچکاری ہے
تیری پائل کی صدا رات کے بندرابن میں
کسی جوگن کے تصور کی طرح بھٹکی ہے
نرم ماکھن کی طرح چاند ہوا اُجلا اُجلا
چاندنی ہے کہ تری دودھ بھری مٹکی ہے
جھلملاتے ہوئے سپنوں کا سویمبر بن کر
کچھ بہاریں مرے احساس میں لہرائی ہیں
نظر آتا نہیں کچھ بھی ترے جلووں کے سوا
تیری آنکھیں مری آنکھوں میں اُتر آئی ہیں
میری ہر سانس نے پوجا ہے ہمیشہ تجھ کو
رنگ لائی ہیں محبت کی جواں فریادیں
دل کے مندر کی سلگتی ہوئی تنہائی میں
آرتی بن کے چمکتی ہیں ہزاروں یادیں
کتنی یادوں کے تاگے ترے ہاتھ سے دُھلے
کتنے سپنوں کے گھٹ ٹوٹ گئے اک پل میں
میں نے دھوئے ہیں ترے دھول بھرے پاؤں مگر
اپنی آنکھوں کے چھلکتے ہوئے گنگا جل میں
کتنے پاکیزہ ہیں بھرپور جوانی کے کلس
نظر آتا ہے ترا جسم شوالے کی طرح
اپنے گیتوں کے مدھوبن میں بلاتا ہے مجھے
میرا بچپن کسی گوکل کے گوالے کی طرح

جی ہاں یہ ایک حقیقت ہے۔ مگر میں مشینوں کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ بعض جانداروں
کی بات کر رہا ہوں جو پر نہ ہونے کے باوجود اڑ سکتے ہیں۔ میرے نزدیک جانوروں کی دنیا
انسانی دنیا سے کہیں زیادہ متنوع
اور بوقلمونی ہوتی ہے۔ انسانوں
میں آپ نیگرو، چینی، جاپانی،
ہندستانی، یورپی اور سرخ ہندی
وغیرہ ہی پیش کر سکیں گے جو ایک
دوسرے سے بہت زیادہ مختلف
ہوتے ہیں لیکن ہر جانور اپنے
اندر ایک انفرادی خصوصیت
رکھتا ہے۔ غذا، رہن سہن سے
لے کر اس کی شکل و صورت بھی
ایک دوسرے سے اس درجہ مختلف
ہوتی ہے کہ انھیں دیکھ کر ہم حیران
رہ جاتے ہیں۔ بلی کے خاندان کو لے
لیجئے۔ اپنے اندر بہت زیادہ یکسانیت
رکھنے کے باوجود بھی وہ ایک دوسرے
سے کتنے الگ ہوتے ہیں۔ شیر اور
ببر شیر TIGER & LION
میں آپ کوئی ہم آہنگی بتا سکتے
ہیں، سوائے اس کے کہ دونوں چیر پھاڑ
کرنے والے اور گوشت خور ہوتے
ہیں۔ خشکی کے دیو پیکر جانور ہاتھی
سے چوہے تک نظر دوڑائیے ان دونوں کے درمیان آپ کو حیوانوں کی ایک ایسی انوکھی
اور نرالی زنجیر نظر آئے گی جس کی ہر کڑی ایک دوسرے سے مختلف اور جس کی دنیا ہی الگ ہے۔

یہ تو اس دنیا کی بات کر رہا ہوں جس پر آپ ہم سوتے بیٹھتے، چلتے
پھرتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر بھی ایک دنیا آباد ہے جسے سمندری
دنیا کہتے ہیں۔ یہاں تو زمین
سے بھی زیادہ متنوع اور
نرالے جانور نظر آئیں گے۔
ان کے بے پناہ بھڑکیلے
اور خوب صورت رنگ،
جسمانی ساخت اور عادات
وغیرہ تھوڑی دیر کے لئے
آپ کو محو حیرت کر دیں گے۔
ان دو دنیاؤں کے علاوہ
ایک دنیا اور بھی ہے جسے
آپ ہوائی دنیا کا نام دے
سکتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کو پرندوں
کی لاثانی صناعی کے ایسے شاہکار
نظر آئیں گے کہ آپ انگشت بدنداں
رہ جانے کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں
سکیں گے۔ اس دنیا کے بعض
جانوروں کے مطلقاً پر نہیں ہوتے
مگر وہ اپنے اندر اڑنے کی
صلاحیت رکھتے ہیں ــــــ

ماہرین حیوانات کا خیال ہے کہ
زندگی کا آغاز سب سے پہلے
پانی میں ہوا۔ پانی کے بعض جانوروں میں زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں پیدا ہوتی
گئیں چنانچہ بعض تو رینگ کر خشکی پر آ گئے اور اسی کو اپنی ترقی کی معراج سمجھ کر

یہیں رہ پڑے اور جو زیادہ تیز تھے وہ پانی سے خشکی پر اور خشکی سے ہوا میں داخل ہوگئے۔ ابتدا میں ان کے پر نہیں تھے، صرف جسم کی کھال بڑھ آئی تھی اور اسی سے وہ اُڑنے کا کام لیتے تھے۔ اس قسم کے جانوروں کی نمائندگی کرنے والے بعض جانور آج بھی دنیا میں موجود ہیں جن میں سے چند کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

چمگادڑ

چمگادڑ ہی دنیا میں ایک ایسا جانور ہے جو ہمیشہ سے موضوعِ بحث رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر حیوانوں میں بھی بحث مباحثے کی عادت ہوتی تو چرندوں اور پرندوں کے درمیان چمگادڑ پر نہ صرف بحثیں ہوتیں بلکہ اسی کو بہانہ بنا کر وہ آپس میں جنگ و جدل کرتے، مگر شکر ہے کہ حیوان، انسان کی طرح بحث کے عادی نہیں۔ اس کے موضوعِ بحث بننے کی وجہ یہ ہے کہ مادہ چمگادڑ کے تھن ہوتے ہیں اور یہ اُڑ بھی سکتے ہیں۔

ماہرین حیوانات کا بیان ہے کہ ان کے آلۂ پرواز میں قدرت نے بڑی صناعی سے کام لیا ہے۔ اس کے پہلوؤں کی کھال دو تہوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جن میں ایک پنجے کی کھال سے بڑھ آتی ہے اور دوسری پیٹ کی کھال سے۔ جب چمگادڑ آرام کی غرض سے اُلٹا لٹک جاتا ہے تو اس کی پرواز کی جھلی چھتری کی طرح سمٹ کر جسم سے لگ جاتی ہے۔

تمام دنیا کے جانوروں میں اس کی پرواز کی جھلیوں سے زیادہ نازک اور حساس کوئی اور شئے نہیں ہوتی۔ تاریک جگہوں پر اس کے نہ ٹکرانے کی وجہ یہی حساس جھلی ہے جو قوتِ لامسہ کا کام بھی دیتی ہے۔

اُڑنے والے مینڈک (FLYING FROG)

یہ بھی عام مینڈکوں جیسے ہی ہوتے ہیں، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی اگلی پچھلی ٹانگوں کی انگلیاں دوسرے مینڈکوں سے نسبتاً بہت زیادہ لانبی ہوتی ہیں اور انگلیوں کے درمیان جھلی مڑی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے پیر چھتری نما نظر آتے ہیں اور پھیلانے پر ان کا رقبہ ۱۲ مربع انچ ہوجاتا ہے جبکہ جسم صرف چار یا پانچ انچ کا ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے اُڑنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ ان کے رنگ چمک دار اور جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔ یہ مینڈک عموماً ان رنگوں میں پائے جاتے ہیں ـــــ پیر اور پیٹھ زمردی ہری، چہرے اور پنجے کی انگلیاں پیلی اور جھلی کالی دھاریوں سے مزین ہوتی ہے۔ اس قسم کے مینڈک اگر آپ کو دیکھنا ہوں تو ایسٹ انڈیز، جاوا اور سماترا میں درختوں پر عام طور سے نظر آئیں گے۔

اُڑنے والے لیمر - اُڑنے والے مینڈک

اُڑنے والے لیمر

ایسٹ انڈین پتانیہ جانوروں میں سے ایک لیمر بھی ہے جو قد و قامت میں بلّی کے برابر ہوتا ہے اور جس کے دونوں جانب گردن سے دم تک پیراشوٹ (PARACHUTES) کی طرح کھال پھیلی رہتی ہے۔ اس کی کھال بہترین فروں (FUR) میں شمار کی جاتی ہے۔ بجز اس کے کہ دونوں بازوؤں پر کھال لٹکی رہتی ہے اور کوئی بات دوسرے لیمروں سے مختلف اس میں نہیں پائی جاتی۔ ان کی عادتیں اور دوسری باتیں عام لیمروں جیسی ہی ہوتی ہیں۔

ڈراکو (اُڑنے والا گرگٹ ـــــ DRACO)

گرگٹ حقیقتاً گرم ممالک یا گرم خطوں میں پایا جاتا ہے۔ ہموار سطح پر دوڑنے کے لئے قدرت نے اس کے پیر کے انگوٹھے بہت زیادہ موزوں بنائے ہیں۔ ڈراکو یا اُڑنے والا ڈریگن (FLYING DRAGON) جنوب مشرقی ایشیا اور ایسٹ انڈیز میں پایا جاتا ہے۔ اس کے جسم کے دونوں جانب بہت پتلی جھلی سمٹی ہوئی حالت میں رہتی ہے اور کھولنے پر کسی کشتی (PLATE) کی طرح پھیل جاتی ہے جو اُڑنے میں مدد و معاون ہوتی ہے۔ یہ بے ضرر جانور بہت زیادہ چمک دار رنگوں سے سجا سجایا رہتا ہے۔

اُڑنے والی مچھلی (FLYING FISH)

یہ مچھلی کی غالباً سب سے عجیب وغریب اور مشہور ترین نوع ہے۔ اس کی خصوصیات بہتیری ہیں۔ تیرنے میں یہ مچھلیاں کتنی ماہر ہوتی ہیں اس کا تو ذکر ہی بیکار ہے، مگر جب کوئی دشمن اُڑنے والی مچھلی پر حملہ آور ہوتا ہے تو یہ پانی سے نکل کر ہوا میں جست لگا جاتی ہیں اور اڑتی ہوئی سَو، پچاس گز دور جا گرتی ہیں اور بیچارہ حملہ آور محجوب اور شرمندہ ہو کر خلا میں دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اس طرح یہ ہمیشہ اپنے دشمنوں سے محفوظ رہتی ہیں۔ مگر بعض اوقات یہ اُڑان اس کے لئے مصیبت کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ مثلاً جب وہ کسی جہاز کے عرشے پر آجاتی ہے تو پھر دوبارہ اُڑنا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس کے اگلے پر بہ نسبت پچھلے پروں کے زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ تر ان سمندروں میں پائی جاتی ہیں جو سرطان کے دونوں جانب واقع ہیں۔

اڑنے والی لومڑی

اڑنے والی گلہری درخت پر چڑھنے کے بعد

دوائیں اڑنے والی مچھلی (بائیں اڑنے والا گرگٹ یا ڈراکو)

اُڑنے والی گلہری

گلہریوں کی بہت سی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک مشہور نوع کا نام ہے "ٹرومس"۔ اسی کو اُڑنے والی گلہری بھی کہتے ہیں۔ ان کے دونوں پہلوؤں کی کھال اگلی اور پچھلی ٹانگوں کے درمیان لٹکتی رہتی ہے جس سے اس کو اُڑنے میں مدد ملتی ہے مگر ان کی یہ اڑان پرندوں سے یکسر جداگانہ نوعیت کی ہوتی ہے کیونکہ یہ درختوں پر بڑی بڑی چھلانگیں لگا کر ایک درخت سے دوسرے درخت کی قریبی شاخ پر جا گرتی ہیں یا پھر ہوا میں تیرتی ہوئی بڑی ہی آہستگی سے زمین پر اُتر آتی ہیں۔ انھیں جب ایک درخت سے دوسرے درخت پر جانا ہوتا ہے تو یہ کبھی زمین پر نہیں اُترتیں بلکہ درخت کی سب سے اونچی شاخ پر چڑھ کر اڑان بھرتی ہیں اور ہوا کے دوش پر اُڑتی ہوئی دوسرے درخت کی نچلی شاخ یا تنے پر جا کر ٹِک جاتی ہیں۔ (تصویر دیکھئے)

اُڑنے والی لومڑی (FLYING FOX)

یہ حقیقت میں چمگادڑ ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے مگر چونکہ جسامت میں بڑی اور اس کی تھوتھنی لومڑی سے مشابہ ہوتی ہے اس لئے اسے اُڑنے والی لومڑی کہتے ہیں۔ یہ ہندستان کے علاوہ لنکا، ایسٹ انڈیز، آسٹریلیا اور برما میں بھی پائی جاتی ہیں اور ہر جگہ مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہیں۔ شمالی ہندستان والے "بادون" اور جنوب کے لوگ "گدل" کہتے ہیں۔ اس کی لمبائی ۱۲ انچ اور بازوؤں کی جھالر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ۴ فٹ ہوتی ہے۔

غزل

حافظ سرہنوی

اے خضرِ رہِ عشق مرے دل کا یقیں ہے
ہے بارگہِ ناز جہاں یہ بھی وہیں ہے

یہ بات کسی اور حسیں میں تو نہیں ہے
جب دیکھنا چاہو اسے نظروں کے قریں ہے

یوں پوچھتے پھرتے ہیں وہ ہر بزم میں مجھ کو
معلوم ہو، وہ سوختہ ساماں بھی کہیں ہے

سب کچھ ہے اسی میں تری قدرت کے میں قرباں
کہنے کو تو یہ خاک ہے مٹی ہے زمیں ہے

اے جذبۂ الفت ترے اعجاز کے صدقے
جھک جائے جہاں سر در جاناں بھی وہیں ہے

ہم خود ہی ہوئے دور زمانے کی روش سے
دنیا تو حقیقت میں جہاں کل تھی وہیں ہے

کیوں پاؤں اٹھائے نہیں اٹھتے ہیں یہاں سے
اے دل یہ کہیں کوچۂ جاناں تو نہیں ہے

فراست رضوی

کون کہتا ہے کہ میں ان سے گلا کرتا ہوں
ظلمتِ شب میں انھیں یاد کیا کرتا ہوں

ہر نئے دَور میں عنوانِ عبارت ہوں گے
وہ فسانے جو سرِ دار کہا کرتا ہوں

کون جانے، دلِ برباد کہاں لے جائے
درد کی آنچ سے بے تاب رہا کرتا ہوں

وہ ترا وقتِ سفر یاد ہے اب تک مجھ کو
تیرا حسرت سے وہ کہنا کہ دعا کرتا ہوں

تیرے دیدار کی خواہش میں تڑپ بھی ہے مگر
کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ خطا کرتا ہوں

دوست دشمن کا کوئی فرق نہیں ہے اس میں
وعدہ کرتا ہوں کسی سے تو وفا کرتا ہوں

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی مری تقدیر میں ہے
نہ کسی سے میں شکایت نہ گلا کرتا ہوں

اُن کے ہونٹوں سے تبسم کی حرارت لے کر
اے فراست میں زمانے پہ ہنسا کرتا ہوں

اترپردیش کے قدیم باشندے ــــ تھارو

امیر حسن

کہتے ہیں کہ مدتوں پہلے یو۔ پی کے ترائی بھابھر کے علاقے میں ایک تھادر راجہ حکومت کرتا تھا اس کا نام تھا ڈنگوا۔ وہ اپنے محل کی ایک خواص فریفتہ ہوکر اس سے اس نے تعلقات قائم کر لیے۔ حالاں کہ اس کی رانی خود اپنے زمانے کی حسین ترین عورتوں میں سے تھی۔ بہرحال راجہ اور ملازمہ کے تعلقات نے ایک بچے کو جنم دیا۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اور ریاست کی بہبودی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ راجہ اور ملازمہ کے تعلقات اور ناجائز بچے کی پیدائش کو طشت ازبام ہونے سے ہر قیمت پر بچایا جائے۔ چناں چہ اس نوزائیدہ بچے کو ایک "کٹھوری" یعنی کاسہ میں چھپا کر اس کی پیدائش کو صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ اس کی پرورش بھی خفیہ طریقے سے کی گئی۔ اسی زمانے میں رانی سے بھی ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جہاں اس بچے کی پرورش محل میں راج کمار کی حیثیت سے عیش و عشرت میں ہوئی وہاں دوسرا بچہ نہ صرف گمنامی کی حالت میں بلکہ غریبی اور افلاس کے ماحول میں پروان چڑھا۔ راجا کے انتقال کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں کو یہ واقفیت تو ہوگئی کہ دوسرا لڑکا بھی راجا سے ہے مگر اس کو یا اس کی اولاد کو وہ رتبہ حاصل نہ ہوسکا جو راجا ڈنگوا کے جائز لڑکے اور جانشین کو اور بعد میں اس کے ورثا کو ملا۔ راجا کے ولی عہد کو جو بعد میں اپنے باپ کا جانشین ہوا نیز اس کی نسل کو "ڈنگوا" کی رعایت سے "ڈنگریا" کہا گیا اور ناجائز لڑکے کی اولاد کو کٹھوری کی رعایت سے "کٹھریا" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

ڈنگریا اور کٹھریا اترپردیش کے تھارودں کے دو خاص فرقے ہیں۔ ان فرقوں کا نام ڈنگریا اور کٹھریا کیوں کر پڑا اس کے بارے میں مندرجہ بالا حکایت ڈنگریا تھارو ہی بیان کرتے اور اس طرح اپنی فوقیت کٹھریا لوگوں پر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تھادر کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کئی روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لوگ "تھر" کے ریگستان سے یہاں آئے۔ اسی بنا پر ان کا نام تھارو پڑا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ راجستھان سے ہجرت کرکے آنے کے بعد یہ لوگ کچھ عرصے تک بھٹکتے پھرے اور بالآخر ترائی میں ٹھہر گئے۔ اسی "ٹھہرنے" سے ٹھاڑو اور بعد میں تھارو بنا۔ بہرحال یہ دونوں ہی روایتیں غلط ہیں کیوں کہ یہ لوگ حقیقتاً منگولیائی نسل کے ہیں۔ ان کا نام تھارو کب اور کیوں کر پڑا اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔

اسی طرح راجہ ڈنگوا بھی کوئی تاریخی شخصیت نہیں ہے۔ ان کی ابتدا کے بارے میں اوپر جو کچھ بیان کیا گیا وہ تھارووں ہی کی بیان کی ہوئی روایت ہے۔ تھارووں کا یہ بھی کہنا ہے کہ راجہ ڈنگوا کشتری (چھتری) تھا اور اسی بنا پر وہ خود کو چھتری بتاتے ہیں۔

ان دو فرقوں کے علاوہ تھارووں میں اور بھی فرقے ہیں جیسے ڈھکیر، کمار، پوجیلا، ڈانور، جوگی اور کسُہا مگر یہ سب اکثر و بیشتر جنوبی نیپال میں پائے جاتے ہیں۔ نیپال کے ان علاقوں سے ملحق جہاں تھارو آباد ہیں، شمالی یو۔ پی کے ترائی کے اضلاع کے جنگلوں میں یا اُن کے کنارے کے مواضعات میں تھارووں کی آبادی ہے۔ اگرچہ یہ اپنے کو راجپوت نسل سے بتاتے ہیں لیکن ان کے خدوخال سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ منگولائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یو۔ پی میں ان کا ماضی شاہانہ رہا ہے کیونکہ ترائی کے علاقے میں یہ لوگ کافی عرصے تک بھر، ڈوم اور دوسری نچلی قوموں پر حکمرانی کرتے رہے۔

تھارو لوگ عام طور سے زراعت پیشہ اور جانوروں کے ...

بڑے ریوڑ رکھنے کے شوقین ہیں کیونکہ جنگلوں میں چارے اور چراگاہ کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ لوگ گوشت خور ہیں۔ اکثر سور کے گوشت کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے بہت سے تھارو مواضعات میں سور بکثرت نظر آتے ہیں۔ ان کی عام غذا چاول ہے جسے سبزی، مچھلی، گوشت یا دال کے ساتھ کھاتے ہیں۔ روٹی اُن کی روزانہ کی غذا میں شامل نہیں ہے مگر کبھی کبھار کھاتے ہیں۔ شراب نوشی کا رواج عام ہے۔ تھاروؤں کے بہ قول ترائی کی مرطوب آب و ہوا میں شراب کا استعمال ناگزیر ہے۔ آزادی سے قبل تھاروؤں کا خطہ بڑا ہونا نیپارہ وغیرہ ریاستوں اور تعلقداریوں میں شامل تھا۔ اُس وقت انھیں جو، چاول وغیرہ سے شراب کشید کرنے کا پٹہ حاصل تھا مگر آزادی کے بعد سے اس طرح شراب بنانے کی قطعی ممانعت ہے اگرچہ کچھ تھارو اب بھی ناجائز طریقے سے چوری چھپے شراب کشید کر لیتے ہیں۔ اب قانوناً سرکاری ٹھیکے دار ہی شراب فروخت کر سکتے ہیں۔ شراب نوشی کا رواج عورتوں اور بچوں میں بھی ہے۔ خاص خاص مواقع پر اور شادیوں اور تہواروں میں شراب کا استعمال خوب ہوتا ہے۔ دلچسپ بات تو یہ کہ ان لوگوں کی نظر میں شراب دین و دنیا دونوں بناتی ہے کیونکہ ان کے ہاں دیوتاؤں پر شراب چڑھانا متبرک سمجھا جاتا ہے۔ شراب کے ساتھ ساتھ تھاروؤں میں جاڑ کا استعمال بھی عام ہے۔ یہ لوگ بھات (اُبلے چاول) میں کافی پانی ڈال دیتے ہیں اور اُسے مٹی کے برتن میں رکھ کر زمین کے اندر گاڑ دیتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد اِس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں اور تلخی آجاتی ہے اس طرح جاڑ تیار ہو جاتا ہے۔ یہ نشہ آور ہوتا ہے اسے تھارو لوگ بڑے شوق سے پیتے ہیں۔

تھاروؤں میں متحدہ خاندان کا رواج ہے۔ ایک خاندان میں عام طور سے ۱۲۔۱۴ افراد ہوتے ہیں مگر ان میں ۲۰۔۲۷ ممبروں کا بھی خاندان پایا جانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی عورتوں میں جھگڑے ہو جاتے ہیں مگر یہ خاندان کی یک جہتی میں عام طور پر حائل نہیں ہوتے۔ خاندان کا مالک سب سے بزرگ مرد ہوتا ہے مگر گھر کی چہار دیواری کے اندر مکمل اختیارات عموماً اُس کی بیوی یا بزرگ ترین خاتون ہی کو حاصل ہوتے ہیں۔ غیر منقولہ جائداد میں لڑکیوں یا عورتوں کا حصہ نہیں ہوتا۔ اُسے لڑکوں میں برابر سے تقسیم کر دیتے ہیں۔ بڑے لڑکے کو "جھٹواس" کا حق ملتا ہے۔ عموماً یہ سامان یا نقد کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ منقولہ جائداد میں سے کبھی کبھی شادی شدہ لڑکیوں کو بھی حصہ مل جایا کرتا ہے۔

وراثت سے محروم رہنے کے باوجود تھاروؤں کے سماج میں خواتین ایک اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ پردے کا بالکل رواج نہیں ہے۔ گھر کے اندر تو اُن کا سکہ چلتا ہی ہے باہر کے معاملات میں بھی اُن کی رائے اور مرضی بڑا وزن رکھتی ہے۔ غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ تھارو مرد عام طور سے "زن مرید" خیال کئے جاتے ہیں۔ درحقیقت بات صرف اتنی ہے کہ تھارو عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ

تھارو عورتیں اور بچے ایک سر برآوردہ تھارو کے مکان کے سامنے

محنت کش ہوتی ہیں اس لئے مردوں کو بہت سے معاملات میں اُن کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ عورتیں کافی اچھی دستکار ہوتی ہیں۔ خاص طور سے مونج کا کام بہت اچھا جانتی ہیں۔ کڑھائی بُنائی کا شوق بچپن ہی سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے لباس کڑھائی کے جیتے جاگتے نمونے ہوتے ہیں۔ عورتیں اپنے گھر کی دیواروں اور ستونوں پر مختلف رنگوں سے تصاویر اور خاکے بناتی ہیں۔ جسم پر گودنا گودوانے کا رواج بھی شاید اسی شوق کا دوسرا پہلو ہے۔ لڑکی کی شادی سے پہلے گودنا گودوانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ عام طور سے ہاتھ اور پیر پر جانوروں کی تصویریں یا رام نام گودوائے

ہیں۔ ان کا لباس لہنگا (گھانگھرا) اوڑھنی (دوپٹہ) اور چولی ہے۔ اب چولی کے بجائے بلاوز پہننے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ کپڑے عام طور سے شوخ رنگوں کے ہوتے ہیں۔ زیورات کا شوق فطری ہے مگر عام طور سے چاندی اور دوسری ارزاں دھاتوں کے زیورات استعمال کئے جاتے ہیں۔ زیورات میں ہنسلی، ٹڑیا، بچھیا، جھلنی، سونیا، پچھیا، نتھیا اور بالا مقبول ہیں۔ غیر تھارووں میں یہ عام خیال ہے کہ تھارو عورتیں جادو ٹونا کرنے میں بڑی مہارت رکھتی ہیں اور چراغ جلا کر منتر پڑھ کر ایک

تھارو دستکاری کے نمونے ایک معمر خاتون ڈلیا بُنتے ہوئے

خاص طریقے سے یہ عمل کرتی ہیں مگر درحقیقت اس خیال کی کوئی صداقت نہیں ہے۔

شادی عام طور سے کم عمری میں کی جاتی ہے۔ شادی کے وقت لڑکے کی عمر ۱۰-۱۲ سال اور لڑکی کی عمر ۸-۱۰ سال کی ہوتی ہے۔ شادی کی بات چیت میں لڑکے والے پیش قدمی کرتے ہیں۔ رواج کے مطابق لڑکے والے برات کے ساتھ کھانے کا سامان — ۵ من چاول، ۲ ½ من دال، تیل، نمک اور لکڑی لے جاتے ہیں۔ پہلے گوشت کے لئے سور اور شراب بھی لے جاتے تھے۔ برات میں چالیس پچاس نفر ہوتے ہیں۔ شادی میں نہ تو کوئی پنڈت بلایا جاتا ہے اور نہ "بھانور" پڑتا ہے۔ شادی کے بعد دولہا دلہن کو دیوتاؤں کے استھانوں پر لے جاتے ہیں۔ شگن کے لئے دولہا کاندھے پر ایک لاٹھی رکھ کر چلتا ہے جس میں ایک طرف پھولوں کا ایک گچھا بندھا رہتا ہے اور دوسری طرف دو ہانڈیاں باندھ دی جاتی ہیں۔ ایک میں شراب اور دوسری میں زندہ مچھلی پانی میں رکھی جاتی ہے۔ شادی میں شراب اور گوشت سے خاطر کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ شادی کی رسم ادا ہونے کے بعد دُلہن دولہا کے ہمراہ جاتی ہے مگر ۲-۳ روز کے بعد واپس آجاتی ہے۔ تقریباً ایک سال گزرنے پر کھچڑی کے تیوہار کے بعد "گون" ہوتا ہے۔ اِس وقت لڑکی کی باقاعدہ رخصتی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی گون کی رسم لڑکی کے سنِ بلوغ کو پہنچ جانے پر ہی کی جاتی ہے۔

شادی کے اس رسمی طریقے کے علاوہ شریک زندگی حاصل کرنے کے دوسرے طریقے بھی ہیں۔ تھارو آبادی میں چونکہ مردوں کی تعداد عورتوں سے کسی قدر زیادہ ہے اس لئے قابل شادی لڑکیوں کی اکثر قلت رہتی ہے۔ بہت سے مرد نیپال سے بیویاں خرید کر لاتے ہیں۔ اگرچہ اب بھی یہ رواج چلا آرہا ہے مگر اب لڑکیوں کی خرید و فروخت کا کام بہت مشکل ہوگیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے نیپال کے زمیندار لگان کے بقایاداروں کی عورتوں اور لڑکیوں کو نیلام کر دیتے تھے۔ مگر اب نیپال کی حکومت نے اسے سختی سے بند کر دیا ہے۔ لیکن اب بھی غریب نیپالی تھارو چوری چھپے اپنی غیر شادی شدہ یا بیوہ لڑکیوں کو ہندستانی تھاروؤں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں جن کی قیمت ۱۰۰-۲۰۰ روپئے سے لے کر ۵۰۰ روپئے تک ہوسکتی ہے۔ تھاروؤں کے اکثر گاؤں ایسے ہیں جن میں ۲-۳ نیپالی بیویاں اب بھی موجود ملیں گی۔ نیپالی اور ہندستانی تھاروؤں میں چونکہ آپس کی شادی کا بھی رواج ہے اس لئے اُن خرید و فروخت کے معاملات کا پتہ لگانا یا پتہ لگنے پر ان کا ثابت کرنا ازحد مشکل ہے۔

بیواؤں سے شادی کرنا بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ اسی لئے بہت سے غرض مند تھارو خصوصاً غریب لوگ بیواؤں سے بھی شادی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر شادی شدہ لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کو اغوا کر کے بیوی بنانے کا طریقہ بھی رائج ہے۔ ایسی صورت میں معاملہ پنچایت میں

پیش ہوتا ہے جو کہ مناسب جرمانہ کر کے اور سابق شوہر کو شادی کا خرچہ دلا کر جوڑے کو بطور میاں بیوی رہنے کی اجازت دیتی ہے۔

رسمی طریقے کے علاوہ کسی اور طریقے سے بیوی حاصل کرنے پر دھوم دھام سے شادی نہیں ہوتی۔ درحقیقت ان طریقوں سے عورت کو "بٹھا لیتے ہیں" جو کہ قانونی شادی نہیں ہے مگر تھاروؤں کی نظر میں رسمی شادی اور "بٹھانے" میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

مرد کے لئے ایک سے زیادہ شادی کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ صاحبِ حیثیت لوگ یا دوسرے لوگ بھی ضرورتاً کئی شادیاں کرتے ہیں۔

باہمی نزاع، خاندانی جھگڑوں، اغوا، ناجائز جنسی تعلقات

فی زمانہ اس بڑی پنچایت کا بلانا آسان کام نہیں ہے اس لئے عموماً چودھری چند خاص اشخاص کی مدد سے کافی معاملات کا تصفیہ کر دیتا ہے۔ دو تین سال میں ایک بار سے زیادہ پنچایت بلانا امر محال ہو گیا ہے۔ ضلع بہرائچ کی آخری بڑی پنچایت کی نشست آج سے ڈھائی سال پہلے موضع رام پُروا میں ہوئی تھی۔ عدالتی سرپنچ کے چھوٹے بھائی نے اپنی ہی ذات کی ایک شادی شدہ لڑکی کا اغوا کر لیا تھا۔ پنچایت نے لڑکے پر ۲۰۰ روپیہ نقد اور برادری کے لئے طعام و شراب کا جرمانہ کر کے لڑکی کو لڑکے کے حوالے کر دیا اور سابق شوہر کو شادی کا خرچہ دلوا دیا گیا۔

تھاروؤں کے مذہب پر ہندو دھرم کی چھاپ بہت واضح ہے۔

تھارو علاقوں میں چھپر کی تعمیر کا کام اجتماعی ہوتا ہے

وغیرہ کے معاملات کو طے کرنے کے لئے تھاروؤں کی ایک اپنی پنچایت ہے۔ یہی پنچایت وقتاً فوقتاً سماجی حالات اور اجتماعی زندگی کے مسئلوں پر غور کرتی ہے اور ممبروں کی راہبری کے لئے احکام جاری کرتی ہے۔ پنچایت کے احکام اور فیصلوں کی پابندی لازم ہے۔ اس کی کوئی اپیل نہیں ہے۔ ایک پنچایت میں کئی گاؤں آتے ہیں۔ پنچایت کی بیٹھک سے پہلے ہر گاؤں سے چار پانچ رکن باہمی رائے اور مشورے سے پنچایت میں حصہ لینے کے لئے چنے جاتے ہیں۔ اس طرح سے پنچایت کے تقریباً پچاس رکن ہوتے ہیں۔ پنچایت کے صدر کو چودھری کہتے ہیں۔ یہ عہدہ موروثی نہیں ہوتا مگر عموماً ایک بار چودھری چُن لئے جانے کے بعد اُس کی حیات میں دوسرا انتخاب نہیں ہوتا۔

درحقیقت اسے ہندو مذہب کا ہی ایک ضمیمہ سمجھنا چاہئے۔ مگر یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ ان لوگوں کے بہت سے رسوم اور عقائد ہندوؤں سے مختلف ہیں۔ تھاروؤں کے کچھ اپنے دیوتا ہیں جنھیں ہندو حضرات نہیں مانتے مثلاً "دیوہار بابا" کے ناخوش ہونے پر بیماریاں آتی ہیں۔ "سوم بابا" گاؤں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر کوئی گاؤں میں داخل نہیں ہو سکتا۔ "جکھنی دیوی" ان داتا ہیں۔ "کٹیار بابا" منتوں اور خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔ "مولے بابا" اور "جگر ناتھ" دوسرے اہم غیر ہندو تھارو دیوتا ہیں۔ ان میں سے اکثر دیوتاؤں کی صرف علاقائی اہمیت ہے۔ کوئی کسی گاؤں میں مقبول ہے تو دوسرا

کہیں اور۔ ہندو دیوتاؤں میں سے رام، شنکر، گنیش اور ہنومان جی مقبول ہیں۔ ضلع گونڈہ کے تھارو گاؤں میں ہنومان جی کا پرچم ہر مکان کے سامنے لہراتا نظر آئے گا۔ مگر بہرائچ کے تھاروؤں کے ہاں ہنومان جی کے لئے کوئی خاص عقیدت نہیں ہے۔ عموماً تھاروؤں کے اپنے مندر نہیں ہوتے مگر اب کچھ خوش حال تھاروؤں نے ہندو مندروں کے انداز پر عبادت گاہیں بنوانا شروع کیا ہے۔ دیوتاؤں پر دھوتی، کڑھائی (تلا ہوا پکوان) ناریل، چاول وغیرہ چڑھاتے ہیں۔ پانی اور شراب چڑھانا عام رواج ہے۔ کچھ خاص دیوتاؤں پر جانوروں کی قربانی (بلی دان) کی جاتی ہے۔ بلی دان میں مرغ، بکرے اور بھیڑ وغیرہ چڑھائے جاتے ہیں۔

تھارو عام طور سے بھوت پریت پر اعتقاد رکھتے ہیں اور توہم پرست ہوتے ہیں۔ تھاروؤں کا عقیدہ ہے کہ خاص خاص موقعوں یا تہواروں میں دیوتا انسانی جسموں میں حلول کر جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ایسے لوگوں پر حال کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ بُری روحوں اور بھوت پریت کا بھی انسانوں پر سایہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاج کے لئے تھارو اوجھا اور سیانے بلائے جاتے ہیں جو منتر پڑھ کر اور دھونی رما کر ان سایوں کو بھگاتے ہیں۔ عام طور سے بیماروں کے علاج کے لئے بھی یہی اوجھا بلائے جاتے ہیں کیونکہ ایسا یقین کیا جاتا ہے کہ اکثر بیماریاں بُری روحوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ ہندوؤں کی طرح سے بعض تھارو "دشاشول" میں یقین رکھتے ہیں مثلاً یکشنبہ اور سہ شنبہ کو جانبِ شمال سفر کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔

ان قدیم باشندوں کی زندگی میں تہواروں کو اہم مقام حاصل ہے۔ کارتک کے مہینے میں یہ لوگ دسیاں کا تہوار مناتے ہیں۔ دوج کے دن گیہوں، جو، مکئی کے بیج ہانڈیوں میں مٹی بھر کر بو دیتے ہیں۔ جا پانچ روز میں اکھو نکل آتے ہیں۔ اشٹمی کو ان ہانڈیوں میں اُگے ہوئے پودوں کو جلوس کی شکل میں لے جا کر دیوتاؤں پر چڑھاتے ہیں۔ اسے جوارہ کہتے ہیں۔ ماگھ میں کھچڑی کا تہوار آتا ہے۔ اس روز عورتیں فاقہ کرتی ہیں اور مرگھٹے بابا مہادیو وغیرہ پر پانی چڑھاتے ہیں، کھچڑی کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ ساون میں گڑیا کا تہوار خاص طور سے لڑکیاں بڑے شوق سے مناتی ہیں۔ اس روز پوڑیاں پکائی جاتی ہیں اور ناگ دیوتا کی پوجا کی جاتی ہے۔ پھگوا جسے ہولی یا ڈھیا بھی کہتے ہیں، بڑے زور شور سے مناتے ہیں۔ یہ کئی روز تک منایا جاتا ہے۔ رنگ کے بجائے کیچڑ سے ہولی کھیلنے کا رواج زیادہ ہے۔ اس تہوار میں شراب کا استعمال بہت بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔

تھارو لوگ، خاص طور سے نوجوان اور بچے مختلف تفریحوں سے اپنی زندگی کو خوشگوار بناتے ہیں۔ گانے بجانے کا شوق عام ہے مگر ناچنے کا رواج صرف مردوں تک محدود ہے۔ کہتے ہیں کہ نیپال کی تھارو عورتیں خاص خاص مذہبی موقعوں پر رقص کرتی ہیں۔ عام طور پر رقص کرنے والے نوعمر لڑکوں کی ایک ٹولی ہوتی ہے۔ وہ عورتوں کا لباس پہن کر اور زیورات سے آراستہ ہو کر رقص کرتے ہیں۔ رقص موسیقی کی دھن پر ہوتا ہے۔ رقص کے ساتھ مردنگ، مجیرہ اور کرتار جیسے باجے بجائے جاتے ہیں۔ تفریح کے لئے نقالی اور سوانگ بھی کرتے ہیں۔ لڑکوں اور نوجوانوں میں کبڈی اور بیجا لا کھیل کافی مقبول ہیں۔ عورتیں گانا گانے کی شوقین ہوتی ہیں۔ اُن کے ترنم میں ایک خاص دلکشی اور لوچ پایا جاتا ہے۔

تھاروؤں کی زندگی اِس پریشان کن زمانے میں بھی بہت سی پریشانیوں اور تفکرات سے پرے ہوتی ہے۔ شراب کا استعمال ان کے ہاں خالصتاً "مے سے غرض نشاط ہے" کے مصداق ہوتا ہے۔ اُن کی نظر میں بھی

زندگی زندہ دلی کا نام ہے مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

★

اُتّر پردیش شاہراہِ ترقی پر

بجلی اور آب پاشی کی توسیع کے لیے مشاورتی کمیٹی کے اہم مشورے ـــ گورنر کی جانب سے ان پر مکمل غور و خوض کی یقین دہانی • • • صنعتی ترقی کے لیے چوتھے منصوبے میں ۱۵ کروڑ روپے کے مصارف کی تجویز • • • بے زمین لوگوں کے مسئلے کا جائزہ لینے کے اعلیٰ طاقتی کمیٹی کا تقرر • • • زراعت کے لیے سرمایے کی فراہمی کے واسطے زراعتی کارپوریشن کا قیام • • • خاندانی منصوبہ بندی افسروں کا کانفرنس کی سفارشیں • • • تکنیکی تعلیم کے ضمن میں تقریباً ۴۳ کروڑ کے لیے ورکنگ گروپ کی سفارش • • • تقاوی قرضوں کے سلسلے میں آسان طریقۂ کار • • • آب رسانی کی اسکیم کے لیے قرضے • • • برما اور سیلون سے آنے والے مہاجرین کے لیے روزگار کی سہولت • • • متفرقات

بجلی اور آب پاشی سے متعلق مشاورتی کمیٹی کے ممبروں کا ایک جلسہ حال ہی میں گورنر ڈاکٹر بی۔ گوپالا۔ ریڈی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ کمیٹی یو۔ پی لیجسلیٹو کونسل کے ممبروں پر مشتمل ہے۔

کمیٹی کے ممبروں کا خیر مقدم کرتے ہوئے گورنر نے اپنی تقریر کی ابتدا میں کہا کہ لیجسلیٹو کونسل کے ممبروں پر مشتمل آٹھ مشاورتی کمیٹیوں کی تشکیل میں ان کی یہ خواہش کارفرما ہے کہ انھیں رائے عامہ سے بھی واقفیت رہے نیز غیر سرکاری افراد کے خیالات سے نہ صرف مختلف سرکاری محکموں کے طریقۂ کار کو بہتر بنانے میں بلکہ چوتھے پنج سالہ منصوبے کی تشکیل میں بھی فائدہ اٹھایا جائے۔

گورنر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر ریاست کو صنعت اور زراعت میں ترقی کرنا ہے تو بجلی اور آب پاشی پر خصوصی توجہ دینا ہوگی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ اپنے مشورے پیش کرنے کے سلسلے میں ممبران ریاست کے عوام کے مفاد کو سب سے مقدم رکھیں گے

کمیٹی کے ممبروں نے بجلی اور آب پاشی کی سہولتوں کی توسیع کے لیے متعدد اہم مشورے پیش کیے۔ بیشتر ممبروں نے ٹیوب ویلوں کو بجلی فراہم کرنے کے پروگرام کو تیز تر کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے ٹرانسمیشن لائنوں کی معقول اور مناسب تقسیم کے لیے بھی حکومت اتر پردیش پر زور دیا تاکہ ریاست کے زیادہ سے زیادہ بڑے علاقے میں بجلی کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور صارفین کو کم لاگت پر بجلی فراہم کی جا سکے۔

ممبروں نے منطقائی منصوبہ بندی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہر منطقے کے اپنے مخصوص مسائل ہیں جنھیں حل کرنے کی ضرورت ہے۔ جلسے میں پسماندہ منطقوں پر خاص توجہ دینے کی اپیل کی گئی اور یہ مشورہ دیا گیا کہ ریاست کے مغربی منطقوں میں ٹیوب ویلوں کو نہروں پر ترجیح دی جائے۔

ممبروں نے مغربی اتر پردیش بالخصوص متھرا اور آگرہ کے اضلاع میں پانی جمع ہو جانے اور مشرقی اتر پردیش میں بار بار سیلاب آنے کے سنگین مسئلے کو حل کرنے پر زور دیا۔

جلسے میں اس امر پر زور دیا گیا کہ نہروں کے قرب و جوار کے علاقوں میں ٹیوب ویل لگانے کے سلسلے میں عدم اعتراض سرٹیفکٹ حاصل کرنے میں صارفین کو جو دشواری پیش آتی ہے اسے دور کیا جائے۔

شری پربھو نارائن سنگھ نے مختلف اسکیموں کی مالی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے بہتر شرح سود پر سیونگس سرٹیفکٹ جاری کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ رقم چھوٹے پیمانے پر آب پاشی کے لیے ہی مخصوص کی جانا چاہیے۔

شری گوری شنکر رائے اور شری وندھیا چل رائے نے نہروں کے آخری سرے پر پانی نہ پہنچنے کی دقت کی طرف توجہ مبذول کی اور اس سلسلے میں اپنے مشورے بھی پیش کیے۔

آب پاشی اور بجلی کے سکریٹری شری جے نارائن تیواری نے آب پاشی اور بجلی سے متعلق سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلے میں سرکاری کوششوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حکومت ان سہولتوں کی توسیع پر پوری پوری توجہ دے رہی ہے۔

شری تیواری نے کہا کہ ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سٹیشنوں کو بجلی فراہم کرنے کے کام کو اولیت دی گئی ہے اور اس مقصد کے لیے سال رواں میں ۸ کروڑ روپیہ دیا گیا ہے۔ گزشتہ مالیاتی سال کے آخر میں تقریباً ۵ ہزار درخواستیں زیر غور تھیں اور امید ہے کہ اس سال اس سلسلے میں ۵-۷ ہزار درخواستیں اور موصول ہوں گی۔ انھوں نے کہا کہ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مزید وسائل بروئے کار لانے کے پیش نظر مرکزی اور ریاستی سطح پر نجی بینکوں اور مالیاتی کارپوریشنوں سے رجوع کیا جا رہا ہے تاکہ اس مقصد کے لیے رقم حاصل کی جا سکے۔

سکریٹری موصوف نے کمیٹی کو بتایا کہ نہروں کے آب پاشی کے دائرۂ عمل میں آنے والے علاقوں میں ٹیوب ویل لگانے کے سلسلے میں عائد پابندیوں کو نرم تر کیا جا رہا ہے لیکن تمام پابندیوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے کہا کہ صارفین کو عدم اعتراض سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے سلسلے میں نرمی برتی جائے گی۔

شری تیواری نے کہا کہ حکومت پس ماندہ علاقوں پر پوری توجہ دے رہی ہے۔ آگرہ، میرٹھ اور بریلی ڈویژنوں کے مغربی اضلاع میں ۷۸ اور گورکھپور، فیض آباد اور وارانسی ڈویژنوں کے مشرقی اضلاع میں ۲۰۱ ریاستی ٹیوب ویل لگائے گئے۔ مالیاتی سال رواں میں مغربی اضلاع میں ۱۷۷ اور مشرقی اضلاع میں ۱۸۴ ٹیوب ویل لگائے جائیں گے۔

شری تیواری نے کہا کہ نہروں کے آخری سرے تک پانی پہنچانے کے لیے ایسی نہروں کی تعمیر کی جا رہی ہے جن سے پانی اٹھا کر آب پاشی کی جا سکے۔ انھوں نے بتایا کہ اس طرح کی تین نہریں —— بھوپالی، زمانیہ اور ڈلمئو آئندہ سال تک بن کر تیار ہو جائیں گی۔ انھوں نے کہا کہ سنہ ۱۹۷۰-۷۱ء تک مکمل ہو جانے والے رام گنگا پروجیکٹ اور سرجو گھاگھرا ال کے پانی کو خاص طور پر گنگا اور شاردا نہروں کے موجود نظام کو پانی فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ مغربی اترپردیش میں پانی لگنے کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے سکریٹری نے کہا کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ۵ کروڑ روپے کی لاگت سے گوردھن نالے کو نئی شکل دی جائے گی۔ حکومت ہند سے اس اسکیم کی منظوری حاصل ہو جانے کی توقع کی جاتی ہے۔ سرکار نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ ہریانہ اور راجستھان اترپردیش کو اپنے حصوں کی ادائیگی کر دیں گے۔ ضلع بلیا کو سیلاب سے محفوظ رکھنے سے متعلق اسکیم کے سلسلے میں انھوں نے بتایا کہ ایک دو مرحلے والی اسکیم شروع کی جائے گی۔ پہلے مرحلے کے تحت تقریباً ۱۲۰۰۰ ایکڑ اور دوسرے مرحلے کے تحت تقریباً ۲۵۰۰۰ ایکڑ زمین محفوظ کی جائے گی۔

ریاستی بجلی بورڈ کے چیرمین شری ایل۔ سی جین نے کہا کہ اگر ریاست میں ایک ایٹمی بجلی گھر قائم ہو جائے تو بجلی کی لاگت کم ہو جائے گی۔

زراعتی پیداوار کمشنر شری ایم۔ اے قریشی نے بتایا کہ چوتھے منصوبے میں چھوٹے پیمانے پر آب پاشی کو سب سے زیادہ اولیت دی جا رہی ہے اور اس مقصد کے لیے آئندہ منصوبے میں ۳۹۸ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی جانے کی توقع کی جاتی ہے۔ اس رقم میں سے ۱۸۸ کروڑ روپے عوام سے حاصل ہوگا اور ۲۰ کروڑ روپے کا بندوبست تقاوی کی شکل میں اور بقیہ رقم کی فراہمی بینکوں اور کارپوریشنوں سے قرض لے کر کی جائے گی۔

چوتھے پنج سالہ منصوبے کے دوران اترپردیش کی صنعتی ترقی میں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں نمایاں رول ادا کریں گی جن کی ترقی کے لیے مجموعی طور پر ۱۴۷٫۹ کروڑ روپے کے مصارف کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے جو مصارف تجویز کیے گئے ہیں وہ گزشتہ تین منصوبوں کے دوران اس زمرے کی صنعتوں کے ۱۳۱٫۹ کروڑ روپے کے مجموعی مصارف سے زیادہ ہیں۔ ریاست کی معاشی پسماندگی اور بے روزگاری کے مسئلے کو حل کرنے کے پیش نظر مجوزہ مصارف ضروری خیال کیے گئے ہیں۔

چوتھے منصوبے کی مدت میں ریاست میں منتخب مقامات پر چھوٹے پیمانے کے واحدوں کی تعداد میں کم سے کم ۵۰ فی صدی تک اضافہ کرنے کی تجویز ہے۔

چوتھے منصوبے میں شامل اہم پروگراموں کے تحت موجودہ واحدوں کی توسیع اور نئے واحدوں کے قیام کے لیے ۶ کروڑ روپیے مالی امداد اور قرضوں کی شکل میں تقسیم کیا جائے گا۔ اترپردیش کی چھوٹی صنعتوں سے متعلق کارپوریشن کو قسطوں پر مشینوں کی سپلائی کرنے

کے لیے بہ طور قرض ۵ کروڑ روپیہ دیا جائے گا اور کارپوریشن کا شیئر حصص ۶۰ لاکھ روپے سے بڑھا کر ۱۰۵ لاکھ روپیہ کر دیا جائے گا۔
اس کے علاوہ تکنیکی امداد پروگرام پر ۴۰ لاکھ روپے، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے متعلق موجودہ اور نئی امداد باہمی انجمنوں کی ترقی پر ۴ لاکھ روپے، بجلی کی کھپت پر بہ طور مالی امداد ۱۰ لاکھ روپے اور چھوٹے پیمانے کے وا صدوں کی ایسوسی ایشنوں کو پیداوار وغیرہ کے بہتر طریقے اپنانے کے لیے مالی امداد دینے پر ۲ لاکھ روپے خرچ کیا جائے گا۔

ریاستی حکومت نے ایک اعلیٰ طاقتی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی ہے کہ وہ بے زمین افراد کے مسئلے کا جائزہ اور ان کے لیے فاضل زمین کی دستیابی کے معاملے پر غور و خوض کرے۔

یہ کمیٹی ضلع نینی تال میں سرکاری ریاست کی زمین کے کسانوں کو زیادہ مستحکم حقوق دینے اور وہاں کرائے کی شرحوں پر نظر ثانی کرنے کے معاملے پر بھی غور و خوض کرے گی۔

کمیٹی سے تین ماہ کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ کمیٹی سے مندرجہ ذیل امور پر رپورٹ طلب کی گئی ہے۔

(۱) بے زمین افراد کے مسئلے پر غور و خوض کرنا اور جنگلات میں شامل زمین، گاؤں سبھاؤں کی زمین اور آراضیات کی انتہائی حد سے متعلق قانون سنہ ۱۹۶۰ء کے تحت فاضل قرار دی جانے والی زمینوں کا جائزہ لینا جو نینی تال، پیلی بھیت، کھیم پور کھیری، بہرائچ، گونڈہ، بستی اور گورکھپور اضلاع میں بے زمین افراد کو دی جاسکتی ہیں نیز ریاست کے مستحق ترین بے زمین افراد میں زمینیں تقسیم کرنے کے لیے بہترین طریقہ کار پیش کرنا۔

(۲) ضلع نینی تال میں گورنمنٹ اسٹیٹ کی زمین پر مداخلت بیجا کو ضابطہ کے تحت لانے کے سوال پر غور کرنا۔

(۳) اس امور پر غور کرنا کہ ضلع نینی تال کے ترائی اور بھابھر علاقے میں کرائے کی مروجہ شرحوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے یا نہیں۔

(۴) یو۔پی خاتمہ زمینداری اور اصلاح آراضی ایکٹ سنہ ۱۹۵۰ء کا ضلع نینی تال کے ترائی اور بھابھر علاقے پر اطلاق کرنے کی غرض سے ایکٹ مذکور میں مناسب رد و بدل کی تجویز پیش کرنا۔

زراعتی سرمایہ کارپوریشن نے حکومت اتر پردیش کو مخصوص قسم کے زرعی پراجیکٹوں کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کرنے کا یقین دلایا ہے۔ ہر پراجیکٹ میں خطرے کے پیش نظر کارپوریشن مختلف شرحوں پر سود وصول کر رہی ہے گا۔

اس کارپوریشن کو ریزرو بینک آف انڈیا ایکٹ سنہ ۱۹۳۴ء کی دوسری فہرست میں شامل بینکوں نے ۱۰۰ کروڑ روپے کے مجاز سرمائے سے قائم کیا ہے جس کا مقصد ہندستانی زراعت کو جدید بنانے کے لیے مزید اقتصادی وسائل فراہم کرنا ہے۔ موٹے طور پر بینک کا کام (۱) کاروباری بینکوں کی جانب سے زرعی ترقی کے لیے دیے جانے والے قرضوں کو فروغ دینا اور (۲) زرعی مہمات شروع کرنے والے افراد، اداروں یا تنظیموں کو مالی امداد دینا ہے۔

کارپوریشن نے ریاستی حکومت کو اپنے حالیہ خط میں مطلع کیا ہے کہ کارپوریشن نے ابھی تک سود کی کوئی یکساں شرح مقرر نہیں کی ہے بہرحال یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ سود کی شرح ۵ء۷ فی صدی سے ۵ء۹ فی صدی تک ہوگی لیکن یہ محض ایک اشارہ ہے اور ابھی اس کو قطعی نہیں کیا گیا ہے۔

کارپوریشن سے قرض لینے کے خواہش مند افراد اور تنظیموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہ طور خود پراجیکٹ یا اسکیمیں وضع کریں نیز ضروری حقائق اور اعداد و شمار مہیا کریں تاکہ کارپوریشن ان کا تفصیلی جائزہ لے سکے اور ان کی تکنیکی اور معاشی افادیت کا تعین کر سکے۔ پراجیکٹوں اور اسکیموں کے خاکے میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہونا چاہیے کہ پیداوار میں اضافے کے سلسلے میں یہ اسکیمیں کس حد تک اثر انداز ہوں گی۔
قرضہ لینے کے خواہش مند افراد کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے پراجیکٹ اور اسکیمیں براہ راست یا متعلقہ حکومت، تنظیم یا ادارے کے توسط سے کارپوریشن کو بھیجیں۔

▼ انٹی بائیٹکس دواؤں کے اندھادھند استعمال، نس بندی کرانے والے مردوں اور لوپ استعمال کرنے والی عورتوں کا مناسب طبی معائنہ اور آپریشن سے پہلے، آپریشن کے دوران اور آپریشن کے بعد خصوصی توجہ اور نگہداشت

لوپ لگانے کے بعد ممکن اثرات سے آگاہ کرنا، مانع حمل گولیوں کے استعمال میں احتیاط، صحت سے متعلق تعلیم کی ترویج، خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق ڈاکٹروں، نرسوں اور ملازمین کی مناسب ٹریننگ وغیرہ کچھ اہم سفارشات ہیں جو خاندانی منصوبہ بندی افسروں کی دو روزہ کانفرنس کے اختتام پر کی گئیں۔ یہ کانفرنس حال ہی میں ودھان بھون لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی۔

کانفرنس نے نس بندی آپریشنوں کے سلسلے میں معمول کے طور پر اینٹی بائیٹکس دوائیں اور اے۔ ٹی۔ ایس کے استعمال کی حوصلہ افزائی نہ کرنے کی سفارش کی۔ کانفرنس نے خیال ظاہر کیا کہ آپریشن کرنے والے ایسی احتیاط برتیں کہ پیچیدگیاں نہ پیدا ہوں۔

خاندانی منصوبہ بندی کمشنر ڈاکٹر دیپک بھاٹیا نے اس خیال کا اظہار کیا کہ نس بندی کے معاملات میں سرجن کی ناکامی کے باعث پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نس بندی آپریشن آسان ضرور ہے پھر بھی اس کو معمولی آپریشن نہ سمجھا جائے۔

کانفرنس نے نس بندی کرانے والے افراد کی مناسب جانچ پر خاص زور دیا تاکہ ذیابیطس اور دماغی کمزوری کے مریضوں کو خارج کیا جاسکے اور انھیں خاندانی منصوبہ بندی کے ایسے طریقے اختیار کرنے کا مشورہ دیا جائے جو ان کے لئے مناسب ہوں۔ اسی طرح کانفرنس نے اس پر بھی زور دیا کہ لوپ استعمال کرنے کی خواہشمند عورتوں کا احتیاط سے طبی معائنہ کیا جائے۔ لوپ کا طریقہ اپنانے والی عورتوں کو ممکن اثرات سے باخبر کیا جائے۔

کانفرنس نے پرزور الفاظ میں سفارش کی کہ ضبط تولید آپریشن کرانے والے مردوں اور عورتوں پر نہ صرف آپریشن سے قبل اور آپریشن کے وقت خصوصی توجہ دی جائے بلکہ آپریشن کے بعد بھی ان پر خاص توجہ دی جائے تاکہ انھیں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

کانفرنس میں لوپ پروگرام کے سلسلے میں لیڈی ڈاکٹروں کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا گیا کہ لوپ پروگرام پر ان علاقوں میں خاص زور دیا جائے جہاں لیڈی ڈاکٹر دستیاب ہوں۔

کانفرنس نے خیال ظاہر کیا کہ دیہی علاقوں میں کنڈوم زیادہ مقبول ہے۔ چنانچہ یہ مشورہ دیا گیا کہ ان کی مفت اور برائے نام قیمت پر تقسیم کا بندوبست کیا جائے۔

کانفرنس نے مشورہ دیا کہ مانع حمل گولیوں کے استعمال کے سلسلے میں انتہائی احتیاط برتی جانا چاہئے کیونکہ ان سے نقصان پہنچنے کا امکان بھی ہے۔ ڈاکٹر بھاٹیا نے بتایا کہ بیرونی ممالک میں ان گولیوں کی مقبولیت ختم ہو گئی ہے۔

کانفرنس میں خاندانی منصوبہ بندی کی متعلق تعلیم اور نشرواشاعت پر خاص زور دیا گیا۔ کانفرنس نے مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں اور زیادہ کام ہونا چاہئے اور چھوٹی چھوٹی نمائشوں، فلموں، کانفرنسوں، ڈراموں اور مشاعروں وغیرہ کے ذریعے خاندانی منصوبہ بندی کی نشرواشاعت کا زیادہ سے زیادہ کام کیا جانا چاہئے۔

تکنیکی تعلیم سے متعلق ورکنگ گروپ نے جس کا جلسہ حال ہی میں تکنیکی تعلیم کے سکریٹری شری آر۔ کے۔ تلوار کی صدارت میں سکریٹریٹ میں منعقد ہوا، مجوزہ چوتھے پنجسالہ منصوبے کے دوران تکنیکی تعلیم کے لئے ۹۵ء۲۳ کروڑ روپے کے مصارف کی تجویز پیش کی ہے۔

ڈپلوما نصابوں کے لئے ۱۵ء۲۰ کروڑ روپے اور ڈگری نصابوں سے متعلق اسکیموں کے لئے ۱۵ء۱۱ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

ورکنگ گروپ نے ڈگری نصابوں سے متعلق اسکیموں کے تحت جو تجاویز پیش کی ہیں ان میں موجودہ نصابوں کو یکجا کرنا، مخصوص پیشوں مثلاً دواسازی، صنعتی انجینیرنگ (جس میں پیداواری انجینیرنگ بھی شامل ہے) چمڑا اور پرنٹنگ ٹیکنالوجی سے متعلق نصاب شروع کرنا شامل ہیں۔ انجینیرنگ اور ٹیکنالوجی کے پوسٹ گریجویٹ نصابوں اور تحقیق کی توسیع پر بھی کافی زور دیا گیا ہے۔

ڈپلوما نصابوں سے متعلق تجاویز میں آٹو موبائل، انجینیرنگ کیمیکل ٹیکنالوجی، الیکٹرانکس، زراعتی انجینیرنگ، انسٹرومینٹیشن ٹیکنالوجی، فارمیسی اور شیشے اور مٹی کے برتن بنانے کی صنعتوں سے متعلق نصاب اور آٹو موبائل انجینیرنگ، ریفریجریشن اور ایرکنڈیشننگ، صنعتی انجینیرنگ، مشین ٹول ٹیکنالوجی اور فاؤنڈری ٹیکنالوجی سے متعلق ایک سال کے پوسٹ گریجویٹ کورس کے بارے میں تجاویز شامل ہیں۔ یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ پرنٹنگ ٹیکنالوجی میں ایک سال کا ریفریشر کورس اور ٹیچروں کو تربیت دینے کے لئے ایک سال کے تربیتی نصاب شروع کئے جائیں۔

اساتذہ اور طلبا کا تناسب بہتر بنانے، ہندستان اور غیر ممالک میں ٹیچروں کی تربیت، طلبا کی عملی تربیت، فیلوشپ اور لیاقت کے وظیفوں، ہاسٹلوں میں رہائش کی سو فیصدی سہولتوں، عملے کے لئے کوارٹروں کے بندوبست اور تجربہ گاہوں کو جدید ترین ساز و سامان سے آراستہ کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے۔

گروپ نے مشورہ دیا ہے کہ نظامت کی سطح پر ایک اعلیٰ مشاورتی تنظیم قائم کی جائے جو اہم صنعت کاروں پر مشتمل ہو تاکہ تکنیکی تعلیم سے متعلق امور کے سلسلے میں ان کا تعاون لازمی طور پر حاصل کیا جائے۔

تقاوی قرضے حاصل کرنے کے سلسلے میں کسانوں کے لئے طریقہ کار اور زیادہ آسان بنا دیا گیا ہے۔ نئے قواعد کے تحت تقاوی حاصل کرنے کے خواہشمند کسانوں کو درخواست کے ساتھ حلف نامہ پیش نہیں کرنا پڑے گا۔

پہلے ہر کسان کو تقاوی قرضہ کے لئے درخواست کے ساتھ ایک حلف نامہ بھی پیش کرنا پڑتا تھا اور اس حلف نامہ کی "نوٹری" سے تصدیق کرانا پڑتی تھی۔ اس سلسلے میں حکومت کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کی گئی کہ اس طریقہ کار کے تحت کسان کا زیادہ وقت صرف ہوتا ہے اور اس کو زیادہ اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ دراصل "نوٹری" تحصیل یا بلاک میں نہیں رہتے اس لئے قرضہ حاصل کرنے کے خواہش مند کسان کو نوٹری کی تصدیق کے لئے اسٹامپ ڈیوٹی کے علاوہ سفر کے مصارف بھی برداشت کرنا پڑتے تھے۔

کسانوں کی ان پریشانیوں کے پیش نظر حکومت نے نوٹری کی تصدیق کرانے کا طریقہ ختم کر دیا ہے۔ نئے طریقے کے مطابق کسان کو اب خود تحریری طور پر یہ تصدیق کرنا ہوگی کہ اس کے علم و یقین کے مطابق اس کی درخواست میں درج امور درست ہیں اور وہ قرضہ منظور ہونے کی صورت میں متعلقہ سرکاری قواعد کا پابند ہوگا۔ کسان کے لئے اپنی تحریری تصدیق کے نیچے دستخط کرنا ضروری ہوگا۔

ریاستی حکومت نے سرساگنج (مین پوری) میونسپل بورڈ اور نوٹی فائیڈ ایریا سمتھر (جھانسی) کو اپنی پانی کی سپلائی کی اسکیمیں مکمل کرنے کے لئے ۸۰۰۰۰ روپے اور ۸۷۰۵۵ روپے کے قرضے منظور کئے ہیں۔ سرساگنج پانی کی سپلائی کی اسکیم کی تخمینی لاگت ۳۰ء۲ لاکھ روپیہ اور سمتھر نوٹی فائیڈ ایریا کی اسکیم کی لاگت ۲۵ء۲۰ لاکھ روپیہ ہے۔

قرضے کی رقم سوا چھ فیصدی سالانہ سود کے ساتھ ۳۰ مساوی سالانہ قسطوں میں واجب الادا ہوگی۔ قرضے کی آخری قسط موصول ہونے کے ایک سال بعد قرض کی ادائیگی شروع ہوگی۔

حکومت اترپردیش نے برما اور سیلون سے آنے والے ہندستانیوں کے سلسلے میں برما اور سیلون میں حاصل کردہ تعلیمی استعداد کو روزگار کے مقاصد کے پیش نظر ریاست میں حاصل کردہ تعلیمی استعداد کے مساوی تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

یہ فیصلہ اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر برما اور سیلون سے ہجرت کرنے والے ہندستانیوں کو اب تک ریاستی حکومت کی ملازمتوں کا اہل تصور نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ ان ممالک میں حاصل کردہ تعلیمی استعداد کو اب تک یہاں تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ اس فیصلے سے ان مہاجرین کو دوسرے شہریوں کی طرح روزگار تلاش کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔

متفرقات

لوپ سے کینسر نہیں ہوتا۔ سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ کے ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر اے۔ بی۔ کار نے آج یہاں بتایا کہ لوپ لگوانے سے کینسر نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے یہ بیان اس طبی تحقیق کے نتائج کی بنیاد پر دیا ہے جو چار سال تک بندروں پر تجربات کرنے کے بعد حاصل ہوئے ہیں۔

ستارگنج کیمپ میں زرعی پیداوار دوگنی۔ قیدیوں کے ستارگنج کیمپ (ضلع نینی تال) میں زرعی پیداوار سنہ ۶۷-۱۹۶۶ء کے مقابلے میں سنہ ۶۸-۱۹۶۷ء میں دوگنی ہوئی۔ کیمپ میں سنہ ۱۹۶۸ء کے ربیع کی فصل ۱۱۸۰۰ کوئنٹل ہوئی جبکہ اس سے قبل والے سال میں ۶۵۰۰ کوئنٹل ہوئی تھی۔ ربیع اور خریف دونوں فصلوں کی مجموعی پیداوار ۱۶۸۰۰ کوئنٹل رہی جبکہ سنہ ۶۷-۱۹۶۶ء میں یہ پیداوار صرف ۸۸۶۰ کوئنٹل تھی۔

لکھنؤ میں دستکاری میوزیم کا قیام۔ حکومت اترپردیش نے روایتی دستکاری کی مصنوعات کو قبول عام بنانے اور ان کی خرید و فروخت میں اضافہ کرنے کے پیش نظر لکھنؤ میں دستکاری کا ایک میوزیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو سنٹرل ڈزائن سینٹر سے ملحق ہے۔

شکار کئے ہوئے جانوروں کی کھال بنانے کی سہولت۔ ماڈل ٹریننگ پروڈکشن سینٹر بخشی کا تالاب لکھنؤ میں مناسب داموں پر شکار کئے ہوئے جانوروں کی کھالیں بنانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں خواہشمند افراد کو دفتر کے اوقات میں یعنی صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک اور ایک بجے سہ پہر سے ۴ بجے سہ پہر تک سینٹر کے پرنسپل سے فون نمبر ۲۲۳۹۶ پر رجوع کرنا چاہئے۔

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

بے بات کی بات ۔

مصنف : بیگم سیدہ نسیم چشتی ۔ ناشر : مکتبۂ مہر و ماہ ۔ نعمت اللہ روڈ ۔ لکھنؤ ۔ قیمت : چار روپے ۔ صفحات : ۲۰۷

یہ بیگم نسیم چشتی کے اکتیس (۳۱) مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر مضامین آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر لکھے اور نشر کیے گئے۔

طنز نگاری یا مزاح نگاری آسان چیز نہیں ۔ اسی لیے ہر شخص مزاح نگار نہیں بن پاتا۔ لیکن بے بات کی بات کے کسی مضمون کو لے لیجیے اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو مزاح نگاری کا جوہر فطرت کی طرف سے عطا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ ایک زبردست قوت مشاہدہ بھی۔ بیگم نسیم چشتی روزمرہ کی چیزوں میں ان گوشوں کو دیکھ لیتی ہیں جو ہماری نظروں کے سامنے آتے ضرور ہیں مگر ہم انھیں نہ دیکھ پاتے ہیں اور نہ محسوس کر پاتے ہیں۔ بیگم نسیم چشتی کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیں یہ گوشے دکھا دیتی ہیں ۔ اس خوبی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر میں روانی، شگفتگی، بے ساختگی اور ادبیت پائی جاتی ہے۔ ان کی طرز نگارش ان کی تخئیل، ان کے مشاہدے، ان کی کردار شناسی، ان کی ژرف نگاہی اور باریک بینی سب مل کر روز کے پیش آنے والے واقعات کا ایسا نقشہ کھینچ دیتی ہیں کہ کہیں قاری مسکرا دیتا ہے، کہیں اسے خود کوئی سوئی چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور کہیں اسے "تحریر" کی وہ لذت ملتی ہے کہ اس کی زبان پر بے ساختہ آجاتا ہے کہ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔" غرض پروفیسر احتشام حسین کے لفظوں میں ان کا مشاہدہ قوی، ذہن دراک اور ان کا تخیل جولاں ہے۔ وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات میں چھپی ہوئی خوبیاں اور خامیاں دیکھ ہی نہیں لیتیں، انھیں دل کش انداز میں دوسروں کو دکھا بھی سکتی ہیں۔" یا بہ قول رشید احمد صدیقی صاحب" ان کی تصویریں جیتی جاگتی تصویریں ہیں جن میں متین اور شوخ الوان کا امتزاج بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے"۔

کتاب کے بعض مضامین کے عنوانات یہ ہیں :- ایک دن نائن کے جیون کا۔ لیلیٰ بہ چشم لیلیٰ (ایک مرد کا نقطۂ نظر)۔ لیلیٰ بہ چشم مجنوں (ایک عورت کا نقطۂ نظر) ۔ کا ناٹک۔ مشترکہ خاندان۔ کیسے بچیا چھڑائیں ... ایسے بڑ دبیوں سے ۔ ناک میں دم ہے بڑی نند کے مارے ۔ یہ بھی ایک فن ہے ... دوستوں میں ہر دل عزیزی۔ معروف شوہر ... منطق بگھارتے ۔ انھیں پڑھنے کا مرض ہے ۔ شوہر اگر باتونی ہے ... عنوانات، خود بیگم نسیم چشتی کے سوچے ہوئے عنوانات نہیں ہیں بلکہ ریڈیو کی فرمائشات ہیں۔ اس لیے ان میں بے چارے شوہر کو جو کچھ کہا گیا ہے اسے "مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات" سے زیادہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

سرورق، کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے۔

صباح الدین عمر

شاہکار ناولٹ نمبر

شاہکار کا شمارہ نمبر ۵۵ ناولٹ نمبر ہے۔ یہ ایک مضمون "ناولٹ کا مسئلہ" اور چار ناولٹ ــــ کمیں گاہ از شوکت صدیقی، چراغ تہ داماں از اقبال متین، کیمیائے دل از جیلانی بانو اور آتش رفتہ از جمیلہ ہاشمی پر مشتمل ہے۔ سائز کتابی ہے، صفحات ۳۶۰ صفحے اور قیمت صرف تین روپے ہے۔

ناولٹ کے مسئلے پر ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑی قابلیت سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اقلیدس کی شکلیں تک بنا کر سمجھایا ہے کہ افسانہ کیا ہے، ناول کیا ہے اور ناولٹ کیا ہے۔ مگر آخر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے : یعنی "اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا" کہہ کر اپنا قلم رکھ دیا ہے۔

بہرحال ناولٹ، افسانہ اور ناول سے جداگانہ کوئی صنف ادب ہو یا نہ ہو جو چار ناولٹ شاہکار کے زیر نظر شمارے میں شامل ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک شاہکار ہے۔ پہلے ہی ناولٹ "کمیں گاہ" کو پڑھ کر لکھنے والے کے زور قلم کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ دوسرا ناولٹ "چراغ تہ داماں" پڑھیے تو اس کی ہیروئن "گوش" سے انتہائی ہمدردی اور اس کے ہیرو "ڈیر بالڈ" سے سخت نفرت ہوتی ہے۔ یہ دونوں ناولٹ ہمارے سماج کی ہوسناکیوں اور سفاکیوں کی ایسی پردہ دری کرتے ہیں کہ پڑھنے والا بہ ہزار ندامت و شرمندگی سے سوچنے لگتا ہے کہ ایسے سماج سے بھاگ کر وہ کہاں نکل جائے ۔

قنوطیت، مایوسی اور غم و غصہ کے عین اس عالم میں جو پڑھنے والوں پر طاری ہوتا ہے جیلانی بانو اپنے ناولٹ کیمیائے دل میں "شہزاد آپا" کے چاند سے مکھڑے کی عقاب کشائی کرتی ہیں۔ ان کا لاکھ کا گھر خاک ہو گیا ہے ان کی معصومیت پر ہزاروں بے بنیاد الزاموں کے تیر چلائے جاتے ہیں مگر وہ ہمت نہیں ہارتیں۔ مجبوری کے ہاتھوں سہی آخر وہ نئی قدروں کا سہارا لیتی ہیں۔ پردے کی چہار دیواری سے باہر آتی ہیں اور کالج کی لکچرر بن جاتی ہیں۔ پرانی قدروں کے ماننے والے اس پر آٹھ آٹھ آنسو روئیں گے کہ وہ چراغ خانہ سے چراغ محفل بن گئیں۔ مصلے سے اٹھ کر کلب میں جا بیٹھیں ۔ مگر جینے کا ایک راستہ تو نکلتا ہے، امید کی ایک کرن تو پھوٹتی ہے ۔

چوتھا ناولٹ "آتش رفتہ" ہے جس میں جمیلہ ہاشمی نے دو سردار خاندانوں کی زندگی پیش کی ہے۔ پہلے تو وہ اسی کے لیے قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے جینے اور جینے دینے کا پیغام محبت سنانے کے لیے "سرداروں" کو وسیلہ بنایا جن کے بارے میں کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ بس مرنا مارنا جانتے ہیں اور اس طرح انھوں نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے۔ اس کے بعد ان کا مطالعہ، مشاہدہ اور کردار آفرینی بھی کم قابل تعریف نہیں ہے ۔

کرتار کور اپنے شوہر انوپ سنگھ اور جوان بیٹے اوتم سنگھ کے قتل پر قتل کے بعد اپنے پوتے دلدار سنگھ کو صرف اس لیے پال پوس کر بڑا کرتی ہے کہ وہ حاکم سنگھ سے خون کا بدلہ خون لے گا۔ مقتول باپ کی روح بھی خواب میں آکر دلدار سنگھ سے عہد لیتی ہے کہ وہ جب تک اپنے باپ کا بدلہ نہ لے چین سے نہ بیٹھے۔ مگر محبت کا جادو چلتا ہے، سچائی اپنا کرشمہ دکھاتی ہے اور حاکم سنگھ خود دلدار سنگھ سے کہتا ہے کہ میں نے تیرے باپ کو پھانسی دلائی تیرے دادا کو قتل کرایا ... تیرا دین ...

چوں تو اپنے باپ کی موت کا بدلہ مجھ سے لے لے اور مجھے مار ڈال مگر انتقام کا بیہیمانہ جذبہ عدو کے شریفانہ جذبے کے سامنے بھڑک بھڑک کر رہ جاتا ہے اور دلدار سنگھ کا ہاتھ خون سے ناپاک نہیں ہوتا۔

پہلے دو ناولٹ پڑھ کر سماج سے جتنی نفرت ہوتی ہے دوسرے دو ناولٹ پڑھ کر اتنا ہی پیار آتا ہے۔ اس انتخاب و ترتیب کے لیے مدیر شاہکار جناب محمود احمد ہنر قابل مبارکباد ہیں۔

فرحت اللہ انصاری

بشیشور پرشاد منور لکھنوی کی ۴ کتابیں

(۱) ابھگیان شکنتلا: کالی داس کے ناٹک کا ترجمہ۔ صفحات: ۲۱۶
قیمت: ۶ روپیہ۔

(۲) گیت گووند یا سرمدی نغمے۔ جے دیو کے گیتوں کا ترجمہ۔ صفحات: ۱۹۲
قیمت: ۳ روپیہ

(۳) نوائے کفر۔ غزلوں کا مجموعہ۔ صفحات: ۱۱۲
قیمت: ۲ روپیہ ۵۰ پیسے

(۴) ادائے کفر۔ ۳۰۰ غزلوں کا انتخاب۔ صفحات: ۱۱۲
قیمت: ایک روپیہ ۵۰ پیسے

چاروں کتابوں کے ملنے کا پتہ:۔
آذرش کتاب گھر ۲۹۔ ۱۵۲۸ فیض گنج دریا گنج۔ دہلی۔

جناب بشیشور پرشاد منور لکھنوی جو تقریباً نصف صدی سے اردو شعر و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں، ان گنے چنے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں جنھیں زبان و بیان پر زبردست قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے انیسویں صدی کے آخری برسوں میں لکھنؤ کے جس ادبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی، ان کے والد منشی دوارکا پرشاد افق اور بعد میں منشی نوبت رائے نظر کی رہنمائی میں ان کی ذہنی و فکری تربیت جس انداز سے ہوئی تھی اور ۱۹۲۷ء کے بعد دلی میں انھیں جس قسم کی ادبی فضا میسر ہوئی ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے لیے غزل کا میدان منتخب کیا ہوتا تو آج انھیں نسبتاً کہیں زیادہ شہرت، مقبولیت اور ادبی اہمیت حاصل ہوتی لیکن انھوں نے اپنے ذہن اور تخلیقی سفر کے لیے جان بوجھ کر ایک پرخار وادی کا انتخاب کیا۔ انھوں نے انگریزی، فارسی اور خاص طور سے سنسکرت کے بعض شاہکاروں کو اردو شاعری کا جامہ پہنانے کا بیڑہ اٹھایا اور ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر برسوں سے اس کام کو شاعرانہ دیانتداری خلوص اور لگن کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اس مخصوص میدان میں انھوں نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ شاید ہی اب تک کسی ایک شاعر نے کی ہو۔ لیکن افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر جن میں یہ ادبی تعصب شامل ہے کہ ترجمہ بہرحال ترجمہ ہوتا ہے تخلیق نہیں، انھیں اس بلند مقام سے محروم رہنا پڑا جس کے وہ بلاشبہ مستحق ہیں اور شاید یہی سبب ہے کہ بعض اوقات ان کے لہجے سے جھنجھلاہٹ ٹپکنے لگتی ہے (مثلاً شکنتلا میں "شکنتلا کا یہ ترجمہ کیوں؟" کے عنوان سے لکھے ہوئے ان کے ابتدائیے کے بعض حصے یا نوائے کفر "چند الفاظ" کا ابتدائی حصہ)

کالی داس کے مشہور ناٹک شکنتلا کے ترجمے میں منور صاحب نے یہ خیال کیا ہے کہ سنسکرت میں جو حصے نثر میں ہیں ان کا ترجمہ نثر میں اور جو نظم میں ہیں ان کا ترجمہ نظم میں کیا ہے۔ اس طرح اصل سے مطابقت تو یقیناً پیدا ہو گئی ہے اور منور صاحب کا کام بھی بڑی حد تک آسان ہو گیا ہے کیونکہ نثری حصہ منظوم حصے سے زیادہ ہے لیکن ایک قسم کی ناہمواری بھی پیدا ہو گئی ہے۔ منظوم حصے بہت رواں، بھرپور اور جاندار ہیں اور جگہ جگہ ان کے شاعرانہ کمال کی جھلک ملتی ہے لیکن نثری حصہ نسبتاً کمزور ہے۔ ایک طرف تو شکنتلا کے کرداروں کے منہ سے ایسی پُرتصنع زبان سن کر حیرت ہوتی ہے:

(۱) "ماشاء اللہ حضور کی آنکھیں شکنتلا سے چار ہو گئیں" ص۴۵ (۲) "آیا خیال شریف میں حضرت" ص۵۶ (۳) "واللہ کیا کہنا" ص۵۹ (۴) "حضور انور کا خیال تھا کہ وہ آپ پر جیسے غش ہو کر لٹو کی طرح آپ کی گود میں لڑھک آئے گی" ص۶۱

اور دوسری طرف کہیں کہیں ایسے جملے بھی نظر آتے ہیں:

"اور آپ منہ بائے دیکھتے رہ جائیں گے"

جہاں تک گیت گووند کا تعلق ہے منور صاحب شکنتلا کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب ہیں۔ دراصل یہ ان شاہکاروں میں سے ہے جن کو سامنے رکھ کر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ معیاری ترجمہ معیاری تخلیق کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔ بھگتی اور شرنگار رس کی ایسی بھرپور ترجمانی کی کوئی دوسری مثال اردو میں شاید ہی مل سکے۔ منور صاحب ایک عجیب کیف و مستی کے عالم میں تخلیقی مراحل سے گزرے ہیں۔ کوئی صفحہ ایسا نہیں ملتا جس کے اشعار بے اختیار سر دھننے کو جی نہ چاہے۔

بسنت کی بہار تھی	نسیم مشک بار تھی
خمار سا فضا میں تھا	شباب سا ہوا میں تھا
اسی میں رادھکا للی	ادا میں ناز میں ڈھلی
رواں دواں برنگِ برق	تمام مستیوں میں غرق
اکیلے محوِ گشت تھیں	جنوں فزائے دشت تھیں
محال ضبط شوق تھا	گلے میں غم کا طوق تھا
غضب کی چوٹ کھائی سی	تمام تلملائی سی

نوائے کفر اور ادائے کفر غزلوں کے مجموعے ہیں۔ نوائے کفر راج نرائن راز نے منتخب غزلوں کے منتخب اشعار سے ترتیب دیا ہے اور ادائے کفر کو جگدیش بھٹناگر حیات نے۔ منور صاحب کی غزلیں استادانہ پختگی کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں غزل کی تمام صالح صحت مند اور جاندار روایات کی جھلک ملتی ہے۔ لیکن اردو شاعری کے تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے مزاج اور خود غزل کے نئے لب و لہجہ اور نئے فکری پس منظر کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ منور صاحب کی غزلیں ان کی اس شہرت میں اضافہ کا باعث بن سکتی ہیں جو انھیں سنسکرت شاہکاروں کے مترجم کی حیثیت سے حاصل ہوئی ہیں۔

منظر سلیم

بقایا ص ۱۸۹ تک

۱۹۶۸

سانی کا بین اقوامی سال

۵۰ پیسے

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہرحال متفق ہو۔

اپنی بات

ہم ہر سال ۲ اکتوبر کو گاندھی جینتی مناتے ہیں۔ اس سال بھی منانے جارہے ہیں۔ لیکن اس سال اس تقریب کی اہمیت کچھ اور ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں اس عظیم المرتبت رہنما کی ولادت کو پورے سو سال ہو جائیں گے اور ہم صد سالہ جشن ولادت منائیں گے۔ صد سالہ جشن کو ابھی سال بھر باقی ہے لیکن ہندستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں اس جشن کی تیاریاں بڑے پیمانے پر کی جارہی ہیں۔ ہندستان میں جشن صد سالہ کی تقاریب کا سلسلہ جس کا آغاز اس سال ۲ اکتوبر سے ہو رہا ہے سال بھر جاری رہے گا۔ اس موقع پر ملک کی اور دنیا کی بڑی شخصیتیں گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کریں گی اور اپنے تاثرات کا اظہار کریں گی۔ اس کا سلسلہ شروع بھی ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسی شمارے میں ہم ملک کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین، وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور ہندستان کی جنگ آزادی کے ایک عظیم ہیرو خان عبدالغفار خاں کے افکار و تاثرات بھی جو ان حضرات نے جشن صد سالہ کے آغاز کے موقعہ پر ظاہر فرمائے ہیں شایع کرنے کا فخر اور مسرت حاصل کر رہے ہیں۔

مہاتما گاندھی نے ایک نہتی قوم کو برطانیہ جیسی عظیم طاقت کی غلامی سے جس طرح آزادی دلائی، ہندستان کے لوگوں کو ذہنی پستی سے نکال کر ان کے دل و دماغ و نظر کو جو بلندی اور رفعت عطا کی، انھیں مساوات اور بھائی چارے کا جو سبق دیا، حق شناسی و حق گوئی کی جو تعلیم دی، ہندستانیوں کو ہر مذہب کا جو احترام کرنا سکھایا، لوگوں کو صاف ستھری اور آلودگیوں سے پاک زندگی بسر کرنے کے جو گر بتائے اور اخلاق و زندگی کا جو اعلیٰ فلسفہ پیش کیا اس نے عوام اور خواص کے دلوں میں ان کے لیے اتھاہ محبت پیدا کر دی جو آج بھی باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس لیے ان کے صد سالہ جشن ولادت کے سلسلے میں ہمارا جوش و انہماک بالکل قدرتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ساری دنیا میں اس جشن کے سلسلے میں ابھی سے جو تیاریاں کی جارہی ہیں اور جو انہماک دکھایا جارہا ہے وہ کیوں؟ کیا یہ سیاسی مصالح کی بنا پر ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ مہاتما گاندھی بڑے آدمی تھے، غیر معمولی انسان تھے۔ ان کی بڑائی، ان کی عظمت اور ان کی بزرگی کا راز اگر ہم تلاش کرنا چاہیں تو یہ ہمیں ان کے بلند فلسفۂ اخلاق و زندگی، ان کی سچائی، ان کے اونچ نیچ اور ذات پات کی بلندی و پستی سے بالاتر ہونے، ان کے عزم و استقلال، ان کی عملی زندگی، کسی کے لیے حتیٰ کہ دشمنوں کے لیے بھی دل میں نفرت اور عناد نہ رکھنے، ان کے جذبۂ ترحم اور عفو اور ان کے اہنسا کے فلسفہ میں مل سکتا ہے۔ گاندھی جی کے یہ وہ اوصاف تھے جنھوں نے ساری دنیا کے دل ان کی طرف جھکا دیے تھے اور آج بھی ان کی عظمت کا سکہ بدستور جاری ہے۔ اسی لیے دنیا بھر میں ان کے صد سالہ جشن ولادت کی تیاریاں خلوص و عقیدت کے ساتھ کی جارہی ہیں۔

نیا دور کے زیر نظر شمارے کو قارئین صد سالہ جشن کے آغاز کے مبارک اور ولولہ انگیز موقع پر ایک مختصر سا نذرانۂ عقیدت تصور کریں۔ آئندہ سال ۲ اکتوبر کو اس سے بہتر طریقے پر نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ شمارہ گاندھی جی کی سی عظیم المرتبت اور جامع صفات شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اپنے صفحات میں سمیٹ لے گا۔ یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ البتہ ہم اتنا ضرور عرض کر سکتے ہیں کہ اسے ایک نمائندہ شمارہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

اس سال فروری میں غالب صد سالہ جشن بھی منایا جارہا ہے۔ اس جشن کے منانے کے سلسلے میں بھی بہت سے ملکوں میں تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس موقع پر ہندستان کے رسائل و جرائد خصوصی نمبر شایع کریں گے۔ نیا دور کا ۲۶ جنوری (فروری) کا شمارہ بھی غالب نمبر ہوگا۔ اس نمبر کی کامیابی غالب دوستو اور غالب شناس حضرات کی قلمی اعانت پر منحصر ہے۔ امید ہے کہ یہ قلمی معاونت ہمیں حاصل ہوگی اور ہم قارئین نیا دور کی خدمت میں اس عظیم شاعر کے شایان شان نمبر پیش کر سکیں گے۔

——— ایڈیٹر

آشون ۱۸۹۰ شک

اخلاقی بیداری

ڈاکٹر ذاکر حسین

یہ جون ۱۹۲۶ء کی ایک صبح تھی۔ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اپنے تین رفقائے کار کے ساتھ گاندھی جی کے درشن کے لیے سابرمتی آشرم آیا تھا۔ ہم پچھلی رات کو کچھ دیر سے آئے تھے اور وہیں ٹھہرانے کا انتظام بہ سرعت کیا گیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہم گاندھی جی کی کٹیا میں ناشتہ کریں گے۔ اس وقت ہم چاروں ایک قطار میں باورچی خانے کی طرف منہ کیے بیٹھے ہوئے تھے یا کھانا پروس رہی تھیں۔ اچانک ہم نے پیچھے کی طرف سے ایک آواز سنی :

واہ، بہت خوب !

ہم سب پیچھے کی طرف مڑے اور دیکھا کہ گاندھی جی ہماری طرف چلے آ رہے ہیں۔ وہ آ کر مسکراتے ہوئے اپنی چارپائی پر بیٹھ گئے اور ہنس ہنس کر ہم سے اس بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتے رہے، جیسے ہمیں برسوں سے جانتے ہوں۔

گاندھی جی کا جرمنی میں بہت چرچا تھا۔ وہاں روماں رولاں کی کتاب کا ترجمہ کثیر تعداد میں بکا تھا۔ میں جب وہاں تھا، تو میں نے بھی گاندھی جی پر ایک کتاب لکھی تھی اور ان کے عدم تشدد کے پیغام سے متعلق تقاریر بھی کی تھیں۔ لیکن یہ میری ان کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ آشرم میں دو تین روز کے قیام کے دوران میں نے ان کے ساتھ کافی طویل گفتگو کی تھی۔ میں جامعہ ملیہ میں کام کرنے کے لیے پہلے ہی سے قول دے چکا تھا۔ اس قول کے سبب مجھے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی ممتاز ہستیوں کے بہت قریب آنے اور ان سے گہرا رابطہ قائم کرنے کا موقع ملا تھا، اور یہ بات فطری تھی کہ میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوتا کہ مجھے ان اصحاب سے کتنی رہنمائی اور مدد مل سکے گی اور کس طرح کے طریقۂ عمل سے بہترین نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ گاندھی جی کے پاس ملاقات کے لیے آنے کا بھی میرا یہی مقصد تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ جامعہ ملیہ کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات کیا ہیں اور وہ کس طرح اس کی خبر گیری اور توسیع کے کام میں مدد کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء میں بھی اسے بچایا تھا، جب اس کے کتنے ہی بااثر حامیوں نے یہ اعلان کیا یا اشارہ دیا تھا کہ اسے چلانا اب ضروری یا ممکن نہیں ہے۔ اس بار وہ اس کے لیے کیا کریں گے ؟

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس وقت وہ پھیلے ہوئے شبہات اور تناؤ کے سبب، زیادہ مدد نہیں کر سکیں گے۔ اگر انھوں نے کچھ دوسرے ڈھنگ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہوتا اور فراخ دلانہ مالی امداد کا وعدہ کیا ہوتا، تو شاید میں اتنا زیادہ متاثر نہ ہوتا اور مجھ میں اتنا یقین پیدا نہ ہوتا۔ مجھے روپیہ مل سکتا تھا، لیکن تب مجھے یہ بھی محسوس ہوتا کہ افراد کی وجہ سے نہیں، بلکہ روپے کی وجہ سے جامعہ ملیہ بنے گا۔ وہ جس ڈھنگ سے بات کہتے تھے، بات کہتے وقت جس انداز سے دیکھتے تھے، اس سے میں متاثر ہوا۔ مجھے یہ نہیں محسوس ہوا کہ جامعہ ملیہ یا میرے لیے زندگی آسان رہے گی۔ لیکن میں نے جو کچھ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اس کے لیے میں نے اپنا ارادہ اور پختہ کر لیا۔

یہ کس وجہ سے تھا ؟

گاندھی جی جس انداز سے بات کر رہے تھے، اس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ سچائی کی تلاش کر رہے تھے، اس سچائی کی تلاش جو جامعہ ملیہ کے ساتھ ان کے تعلقات کی بنیاد ہوگی۔ اس میں کوئی غیر یقینی بات نہیں تھی۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ جامعہ ملیہ کی جڑیں جمیں اور وہ مضبوط ہوں اور وہ اس خیال کی نمائندگی کر سکے جو ان کے دماغ میں واضح تھا۔ لیکن اسے ان کے ذریعے سے نہیں بلکہ اپنے آپ ترقی کرنا ہوگا۔ اس کی تعمیر میں ان کی گہری دلچسپی رہے گی، وہ اس کی ترقی کو دیکھتے رہیں گے اور اس کی کامیابی کے لیے پرامید رہیں گے۔ لیکن وہ امداد کی شکل

میں ایسا کچھ نہیں کریں گے جس سے جامعہ ملیہ کی اپنی انفرادیت کو فروغ دینے کی آزادی خطرے میں پڑے۔ انسانوں کی طرح اداروں کو بھی وہی بننا چاہیے جو وہ بننا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی نے جو کچھ کہا اس سے میں بے حد متاثر ہوا اور میں اس کی وجہ جاننا تھا۔ ان کی تمام شخصیت ان کے خیالات اور باتوں سے عیاں ہوتی تھی۔ ان کی شخصیت قدرت کی دین یا وراثت میں ملی ثقافت کی پیداوار نہ تھی بلکہ انھوں نے اس کو خود اپنی کوششوں سے سنوارا تھا۔ انھوں نے ایک اخلاقی ڈھانچے میں اپنی شخصیت کو ڈھالا تھا۔ انھوں نے اس سمت میں ایک صناع کی طرح صبر و استقلال کے ساتھ طویل عرصے تک کام کیا تھا اور پھر بھی وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ انھوں نے خلوت یا تنہائی میں نہیں، بلکہ زندگی کے میدان عمل میں یہ کام کیا تھا، جہاں سب لوگ ان کے اس مستحکم ارادے اور انتھک طاقت کو دیکھ سکتے تھے، جس سے انھوں نے اپنی شخصیت کو اپنی پسند کا روپ دیا تھا اور اس کی طاقت کی آزمائش کر سکتے تھے۔ ان کی مسکراہٹ، ان کی ہنسی، ان کی دلکشی، ان کی سچائی اور انکساری — سب اس ڈھانچے کے لازمی جز تھے۔ وہ اس شخص کی طرح بات نہیں کرتے تھے، جو اپنا مقصد پورا کر چکا ہو، بلکہ وہ اس شخص کی طرح بات کرتے تھے جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش کر رہا ہو، جو غلطی کر سکتا ہو اور جس کی اپنے مقصد کے حصول کے طریقوں پر گرفت ابھی ڈھیلی ہو سکتی ہو یا جس کے قدم اپنے ارادے سے ابھی ڈگمگا سکتے ہوں۔ اصول اور عمل میں مکمل ہم آہنگی ہمیشہ کے لیے حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے مسلسل کوشش اور لگاتار اپنے نفس کی جانچ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس عمل میں سچائی اور انکساری میں ایک نادر وصف ہو جاتا ہے۔ گاندھی جی کی سچائی نہ صرف ایک کوشش تھی، بلکہ اس سے مجھے بھی ان کے برابر سچا اور حق پرست بننے کا چیلنج ملا، اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ مجھے اپنے کام کو احترام کے جذبے سے انکساری کے ساتھ کرنا ہوگا کیونکہ جتنا بڑا کام ہوگا، اسے کرنا اتنا ہی مشکل ہوگا۔ ہر شخص کو اپنا کام کرنے کے لیے ہمیشہ ہر طرح سے لائق ہونا چاہیے۔

جن مخصوص سرگرمیوں کے ذریعے سے کوئی شخص اپنے ساتھیوں کی خدمت کرنا چاہتا ہے، وہ فطری طور پر وقت اور حالات کی تابع ہوتی ہیں۔ وہ جن طریقوں کو اختیار کرتا ہے، ان پر اس صورت حالات سے الگ ہٹ کر غور نہیں کیا جانا چاہیے، جس میں انھیں اپنایا گیا ہو۔ عظیم ہستیوں کے بارے میں اس بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر گاندھی جی کے برت ان کے یقین کا ایک جز تھے کہ مقاصد کی پاکیزگی دل کی پاکی پر منحصر ہوتی ہے اور اگر وہ کسی اہم مقصد کی تکمیل میں ناکام رہتے ہیں تو اس کا سبب ان کا مناسب طریقے پر پاک نہ ہونا ہے۔ ایک اصول کی صورت میں برت رکھنے کا مشورہ وہ ان لوگوں کو دیتے تھے، جو اپنی ذات پر پورا کنٹرول چاہتے تھے۔ مقصد کے حصول کی شکل میں اسے انھوں نے اپنے لیے محفوظ رکھا تھا، کیونکہ اس کے غلط استعمال کے خطرے واضح ہیں۔ آج جو لوگ گاندھی جی کی یاد کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں، انھیں گاندھی جی کے برتوں کے اسباب یا مواقع کو یاد رکھنا اتنا ضروری نہیں ہے، جتنی یہ سادہ حقیقت یاد رکھنا ضروری ہے کہ اقتدار ان لوگوں کو خراب کر دے گا جو اسے بجا طور پر اور ان مقاصد کے لیے جن کے لیے اسے بروئے کار لایا جانا چاہیے، استعمال کرنے کے لیے موزوں طریقے پر پاک نہیں ہیں۔ جو لوگ اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں، انھیں مقصد کی وہ پاکی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس کی گاندھی جی نے ایک قابل فخر مثال قائم کی ہے اور جو ان لوگوں کو اقتدار دلانا چاہتے ہیں انھیں ان میں مقصد کی پاکی کی مانگ کرنی چاہیے۔

جس عدم تشدد کا گاندھی جی نے دلی خلوص اور انتہائی گرم جوشی کے ساتھ اپدیش دیا اور جس پر بڑی ثابت قدمی سے انھوں نے عمل کیا تھا، اس کے بارے میں ہم صرف زبانی باتیں کرتے ہیں اور ایسے سوالات اٹھاتے ہیں جس سے یہ محسوس ہونے لگے کہ عدم تشدد پر عمل کرنا ناقابل عمل ہے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ عدم تشدد کی پالیسی امن دشمن کے سامنے بے اثر ہے جو مہلک ہتھیاروں سے لڑنا چاہتا ہے، لیکن کیا ہم آپس کے تعلقات میں اس پر عمل نہیں کر سکتے؟ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کرم النفسی، فراخدلی، ہمت اور اخلاقی قوت کا ظاہری پہلو عدم تشدد ہے۔ جب تک اخلاقی قانون کی برتری تسلیم کی جاتی ہے، ان تمام اوصاف کو فروغ دینے کے لیے ہر جگہ اور ہمیشہ کوشش کی جانی چاہیے۔ ہمارے جیسے ملک میں جہاں امن اور تعاون تقریباً مکمل طور سے مذہب، زبان اور ثقافت کے تنوع کے باوجود فراخ دلانہ رواداری کا جذبہ اپنانے پر منحصر ہے، وہاں ان اوصاف کو فروغ دینا نہ صرف زندگی کی عظمت برقرار رکھنے کے لیے بلکہ بقا کے تحفظ کے لیے بھی ضروری ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ گاندھی جی اخلاقی قانون کی برتری میں یقین رکھتے تھے اور ستیہ گرہ ان کا اس یقین کا اظہار کرنے اور اس کا پرچار کرنے کا طریقہ تھا۔ جنوبی افریقہ میں بھارت میں برطانوی حکومت نے ان کی ستیہ گرہ کو ایک تاریخی روپ دیا۔ لیکن اگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ستیہ گرہ مختلف صورت حالات میں استعمال کی جا سکتی ہے تو ہمیں اس کے مخصوص سیاسی اظہار سے پرے دیکھنا ہوگا۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ اخلاقی بیداری کو مسلسل فروغ دے کر ہی سچائی اور انصاف کو قائم کیا جا سکتا ہے۔

اخلاقی بیداری طاقت کے استعمال سے نہیں، بلکہ لوگوں کو یہ سمجھا کر پیدا کی جا سکتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر آزاد ہیں اور اس اخلاق قانون کے مطابق کام کر رہے ہیں، جس پر عمل کرنا ان کا فرض ہے۔ یہ بات دیکھنے میں بڑی آسان لگتی ہے، لیکن اگر ہم اس کے عملی مضمرات پر غور کرنے لگیں تو ہم ان کی قدر و اہمیت سے بے حد مرعوب ہو جائیں گے۔ جو شخص دوسروں میں اخلاقی بیداری پیدا کرنا چاہتا ہے، اسے خود اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے طاقت یا اختیار کا استعمال کرنے کی خواہش کو ترک کرنا ہوگا۔ اسے اپنی ذات کے تئیں بے چین ہونے کے باوجود دوسرے لوگوں کے لیے لامحدود صبر و تحمل کا جذبہ رکھنا ہوگا۔ اسے ہر وقت حقیقی اخلاقی بیداری پیدا کرنے کے نہایت موزوں طریقوں کی تلاش کرنی ہوگی۔ جہاں اخلاقی بیداری موجود ہے وہاں اسے مضبوط و مستحکم بنانا ہوگا اور اسے ذاتی اظہار کے مواقع فراہم کر کے زیادہ سے زیادہ پر اثر اور قابل عمل بنانا ہوگا۔ یہ ایک طرح کے ایثار ہی سے ممکن ہے۔ اس کے لیے رہنما کو اپنے پیروکاروں ہی سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے تیار کرنا ہوگا۔ اسے مسلسل احتساب ذات کے ذریعے وقار کا خیال اپنے دماغ سے نکالنا ہوگا۔

ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ اصول کے مطابق ہی عمل ہونا چاہیے۔ لیکن کتنے لوگوں میں اتنی سچائی ہے کہ وہ اپنی تمام زندگی کو اصول اور عمل میں یکسانیت کی مثال بنا سکیں۔ گاندھی جی نے عمل اور اصول میں مکمل یکسانیت لانے کی کوشش کی۔ ہم اس کے لیے ان کی زندگی ان کے لباس، ان کے کھانے اور ان کے معمولات زندگی کی تفصیلات دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم سب سے اہم بات اپنے رفقائے کار کے تئیں ان کے رجحان کو لے سکتے ہیں۔ اسے نظر انداز کیے جانے کا زیادہ امکان ہے کیونکہ اس کے لیے انتہا درجے کی ذمے داری کی ضرورت ہوگی۔ سچے لوگ صرف الفاظ ہی سے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ وہ کام بھی کرنا چاہتے ہیں مثلاً گاندھی جی کے الفاظ میں "تعمیری کام" اس کا ایک پہلو کام ہے اور دوسرا جس پر کارکردگی کا معیار منحصر ہے، کام کرنے والا خود ہے۔ گاندھی جی کے سن بلوغ کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر تفصیل اس بات کی شاہد ہے کہ وہ جس بات میں یقین رکھتے، اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دوسروں میں سچائی اور دیانت داری پیدا کرنے کا واحد طریقہ خود کو سچا اور حق پرست بنانا ہے۔ اپنے کام کے تئیں میرا جو کچھ انہماک ہے وہ گاندھی جی کی اپنے کام کے بارے میں جان کاری کے جذبے کی ایک جھلک ہے۔ دیگر متعدد لوگ بھی ان سے اسی طرح متاثر ہوئے ہوں گے۔ انھوں نے اپنی صلاحیت کا پورا استعمال کیا ہوگا کیونکہ ایک عظیم اور قابل تقلید مثال قائم کرنے کے علاوہ گاندھی جی نے انھیں اس بات کا چیلنج دیا کہ وہ اخلاقی قدروں میں یقین رکھنے والے انسانوں کی طرح اپنی آزادی کا استعمال کریں۔ گاندھی جی کا مخصوص تعمیری کام تاریخ کا ایک جز بن سکتا ہے۔ انھوں نے جو لوگ تیار کیے اس کی بھی ہمیشہ اہمیت رہے گی۔

اس وقت سب سے زیادہ ضرورت یہ بات یاد رکھنے کی ہے۔ آزاد ہونے کے رشتے سے ہم لوگوں کو، جن کی سرکار کو اپنا اقتدار چلانا ہے، ایسی قیادت رکھنی ہوگی جو طاقت کی بجائے اپنی سچائی کے وقار، تعمیری کام کے تئیں جذبۂ ایثار و انہماک اور ایسے افراد کو جو نسلاً بعد نسلٍ کام کرتے رہیں گے تیار کرنے کی صلاحیت پر دار و مدار رکھے۔

(ماخوذ از مہاتما گاندھی: سو برس۔ مولفہ: ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن، شایع کردہ: گاندھی پیس فاؤنڈیشن نئی دہلی۔ کاپی رائٹ: گاندھی پیس فاؤنڈیشن)

★

اک نیا پیغمبرِ امن و اماں پیدا ہوا
کارواں میں اک امیرِ کارواں پیدا ہوا

ایک خضرِ عصرِ حاضر، اک کلیمِ عہدِ نو
ایک صدرِ محفلِ روحانیاں پیدا ہوا

خوں سے اس کے آج بھی گلرنگ ہے خاکِ وطن
فخرِ عالم، نازشِ ہندوستاں پیدا ہوا

—— مجاز

سابرمتی کا سادھو

ساغر نظامی

ہزار انجمِ رخشاں نچوڑ کر تو نے
شبِ سیہ کو کیا مطلعِ سحر تو نے

کرن سحر سے تھی محروم، شب ستاروں سے
ستارے شب کو دیے، نور کو سحر تو نے

ہر اک شعاع تھی جس کی پیامِ مشرقِ نور
سنائی رات کو اس صبح کی خبر تو نے

فغانِ نیم شبی کو نئی تڑپ بخشی
دعا کو، بے اثری کو، دیا اثر تو نے

نزاکتِ گل و لالہ کو دی صلابتِ برق
مزاجِ کاہ کو بخشا دمِ شرر تو نے

جو کانپتے تھے ممولوں کے چہچہانے سے
عطا کیا انھیں شاہین کا جگر تو نے

جو اپنی قوتِ پرواز بھول بیٹھے تھے
لگا دیے انھیں ذرّوں میں بال و پر تو نے

نہ موج ہی کو چھوا اور نہ سبزہ و گل کو
کچھ اس طرح کیے آزاد بحر و بر تو نے

دلِ خواص کو تو نے غمِ عوام دیا
عطا عوام کو کی چشمِ حق نگر تو نے

بہار کو شفقی کر دیا لہو نے ترے
چمن کی خاک کو بخشا لباسِ زر تو نے

دلِ زمانہ دمکتا رہے گا صدیوں تک
لہو سے ثبت کیا نقش کالحجر تو نے

گاندھی جی کی وراثت

شریمتی اندرا گاندھی

ہر شخص نے اپنی دماغی نشو و نما اور صلاحیتوں کے مطابق گاندھی جی کو سمجھا ہے۔ گاندھی جی سب بہ قید حیات تھے، اس وقت میری عمر کے بہت سے لوگوں کے لیے انھیں سمجھنا مشکل تھا۔ ان کی کچھ باتوں کو ہم ان کے من بسے خیالات سمجھتے تھے اور کبھی کبھی اپنا تحمل کھو بیٹھتے تھے۔ ان کے بہت سے اصول غیر واضح معلوم ہوتے تھے۔ ہم انھیں مہاتما ضرور مانتے تھے، لیکن سیاست میں تصوف کا عنصر لانے کے سبب ہم ان سے جھگڑ بھی پڑتے تھے۔

یہ بات میری ہی نسل کے لیے سچ ہو، ایسا نہیں ہے۔ اپنی سوانح عمری میں میرے والد نے ان مشکلات کا ذکر کیا ہے جن کا احساس انھیں اور ان کی نسل کے دوسرے لوگوں کو گاندھی جی کے خیالات اور اپنے خیالات کے ڈھانچے میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں ہوا۔ لیکن آہستہ آہستہ قومی تحریک کے اتار چڑھاؤ کے دوران میں جو تجربہ ہوا اس سے میرے والد کو گاندھی جی کو پوری طرح سمجھنے اور ان کے بنیادی خیالات کو اپنے خیالات کے ساتھ گوندھنے کا موقع ملا۔ میرے والد انھیں "جادوگر" کہا کرتے تھے۔ اور انھوں نے ان کے خیالات کو نئی اصطلاح دینے اور نوجوانوں و دانشوروں کے سامنے انھیں واضح شکل میں پیش کرنے اور ان پر اثر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ گاندھی جی بھی اتنی نرم برداری نہیں چاہتے تھے کہ ان کے سامنے کوئی اپنا منہ نہ کھول سکے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بغیر مکمل احتساب کے کوئی ان کے اصولوں کو مان لے۔ وہ کھل کر تبادلۂ خیالات کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ جب میں چھوٹی بچی تھی، تو نہ معلوم کتنی بار ان سے بحث کرنے لگتی تھی۔ ایمانداری سے دی گئی کسی بھی رائے کو وہ حقیر نہیں سمجھتے تھے۔ جو لوگ گاندھی جی سے ناراض تھے ان کے پاس ان سے بھی بات کرنے کا وقت تھا۔ ہمارے ملک کے اساتذہ میں یہ وصف شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ وہ ایک بے مثل پیغمبر تھے اور اس حیثیت میں بھی انھوں نے کبھی کسی پر سچائی کے اسرار کو پالینے کا دعویٰ نہیں کیا۔ انھیں نہ تو انعام کا لالچ تھا اور نہ سزا کا خوف۔ اپنے مشن کا بوجھ بھی ان کے دماغ پر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے سنت تھے جو طعنہ زنی اور کھل کر ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔

گاندھی جی کی جنم شتابدی کا سال جلیان والا باغ کے المیے کی ۵۰ ویں سالگرہ کا سال بھی ہے۔ جو لوگ اپنی خام خیالی کے سبب سخت گیری اور سنگ دلی ہی کو طاقت کا دوسرا نام سمجھتے ہیں، انھیں اس بات پر ضرور غور کرنا چاہیے کہ جلیان والا باغ کے المیے جیسے ظالمانہ اقدام کا برطانوی سامراج کے مستقبل پر کیا اثر پڑا۔ شاید ہی پہلے کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو جس نے پوری قوم کو جھنجھوڑ دیا ہو اور اتنا غمگین بنا دیا ہو کہ اسے اپنی قدروں اور مقاصد پر پھر سے غور کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہو۔ اس واقعے نے پنڈت موتی لال نہرو اور شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور جیسی ہستیوں پر بھی زبردست اثر ڈالا۔ شری ٹیگور نے اپنا 'سر' کا خطاب واپس کر دیا اور نوآبادیاتی نظام کے مسئلوں پر اثر انگیز نظمیں لکھیں۔ میرے دادا اپنے پورے خاندان کے ساتھ گاندھی جی کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ ہم سب کی پوری زندگی ہی بدل گئی۔ سارے ملک کی فضا ہی بدل گئی۔ اسی سال گاندھی جی ہماری سیاسی تحریک کے روح رواں بن کر ابھرے۔ گزشتہ ۵۰ برسوں پر نظر ڈالیں تو ہم بہ خوبی سمجھ سکیں گے کہ ان کی شخصیت اور ان کے خیالات کا کتنا زبردست اثر پڑا۔ ویسے ان کے اثر کو پوری طرح سمجھنا اب بھی ہماری طاقت سے باہر ہے۔ گاندھی جی کے کام کا بھارت اور تمام انسانیت پر کتنا گہرا اثر پڑا اس کا صحیح اندازہ ہم ابھی بیسیوں برس تک نہ کر پائیں گے۔ پھر بھی ہم ششدر رہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جلیان والا باغ کے المیے کے اس ایک ہی سال میں گاندھی جی نے ہماری تاریخ کو ایک نیا موڑ دے دیا۔ گاندھی جی نے اپنے دو دبلے پتلے ہاتھوں سے تمام قوم کو اونچا اٹھا دیا۔ انھوں نے معمولی اور ممتاز سبھی طرح کے ہزاروں لوگوں کی نجی زندگی میں بے مثل انقلاب برپا کر دیا۔ ملک کی سیاست کی روح رواں ہونا اتنی بڑی کامیابی نہیں ہے جتنی یہ کہ گاندھی جی لوگوں کے

دلوں کو اتنی گہرائی سے چھو سکے۔ گاندھی جی نے اس سیاست کو ٹھکرا دیا جس میں کچھ بڑے لوگوں ہی کو عزت ملتی ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کامیابی کی کنجی تو عوامی تحریکوں میں ہے۔ اس معاملے میں اپنے پیشروؤں سے ان کا نظریاتی اختلاف بھی رہا ہے۔ گاندھی جی ایسے رہنما تھے جنھیں عوام کی نفسیات اور ان کی ذہنی کیفیات کا گہرا علم تھا۔ وہ عوام کے ذہنوں کے تاثرات کو سمجھ کر ان کی تشریح بھی کرتے تھے اور انھیں نیا موڑ بھی دیتے تھے۔

گاندھی جی نے ہمیں خوف سے نجات دلائی۔ ملک کی سیاسی آزادی کا حصول ہی تنہا مقصد نہ تھا، وہ تو روح کی نجات کے راستے میں ایک ضمنی کامیابی ہے۔ بھارت کی سماجی زندگی میں ان کی بدولت جو انقلاب آیا وہ اور بھی زیادہ دور رس تھا۔ گاندھی جی نے سماجی روایت کی دیواروں اور بیڑیوں سے بھی ہمیں نجات دلائی۔ عورت، مرد کے درمیان، اونچے اور غریب گھرانے میں جنم لینے والے کے درمیان، دیہاتی اور شہری کے بیچ مکمل مساوات میں ان کا یقین تھا۔ اس لیے ان کی تحریکوں نے انسانی ذہن کو متاثر کیا۔ بھارت کی لمبی تاریخ میں ہر مصلح نے ذات پات کے تصور اور عورتوں کو کمتر سمجھنے کی لعنت کے خلاف جد و جہد کی ہے، لیکن ان امتیازات کی دیوار کو توڑنے میں جس حد تک گاندھی جی کامیاب ہوئے اتنا کوئی نہیں ہوا۔

بھارت کی عورتوں پر گاندھی جی کے خاص احسانات ہیں اور وہ تمام طبقے بھی ان کے احسان مند ہیں جو صدیوں پرانے بندھنوں کا شکار رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"میں نہیں چاہتا کہ کوئی شخص میرا پیرو کار ہونے کا دعویٰ کرے۔ میں خود اپنا مقلد بنا رہا ہوں، یہی کافی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں اپنا کتنا نااہل مقلد ہوں کیوں کہ جو میرے عقائد ہیں، میں انھیں نباہنے سے قاصر رہتا ہوں۔"

گزشتہ بیس برسوں میں ہم نے منصوبہ بند صنعتی ترقی کی جو پالیسی اپنائی ہے اس پر کبھی کبھی یہ کہہ کر نکتہ چینی کی جاتی ہے کہ یہ جان بوجھ کر گاندھی واد سے انحراف ہے۔ جو لوگ ایسا الزام لگاتے ہیں اور گھریلو صنعتوں کی وکالت کرتے ہیں وہ بھی ہوائی جہاز، موٹر گاڑی اور ٹیلی فون جیسی بھاری صنعتوں کی مدد کے بغیر اپنا کام نہیں چلا سکتے۔ گاندھی جی نے ریلوں سے پرہیز نہیں کیا اور گھڑیوں کا بھی وہ باقاعدہ استعمال کرتے تھے۔ جب ہم ریلوں اور گھڑیوں کا استعمال کرتے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے کہ ہم ان چیزوں کو اپنے ہی ملک میں تیار کریں۔ گاندھی جی نے گھریلو صنعتوں کی جس طرح وکالت کی ہے اسے صحیح طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ تو غریبی کا نام و نشان مٹانا چاہتے تھے۔ انھیں فضول خرچی سے سخت نفرت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ گاؤں کے بے روزگار لوگوں کی طاقت ملک کے لیے زیادہ مقدار میں سامان تیار کرنے اور اپنے لیے بھی کچھ دولت کمانے میں صرف ہو۔ صنعت کاری کے عمل کے پہلے مرحلے کا چھوٹی صنعتوں پر جو برا اثر پڑ رہا تھا، اس سے وہ اپنے وقت کے دیگر حساس لوگوں کی طرح ہی متاثر تھے۔ وہ ایک مہاتما تھے اور انسان کی مجبوریوں سے واقف تھے۔ وہ ہمیں خبردار کر دینا چاہتے تھے کہ ہم اپنی خواہشات کے غلام نہ بنیں۔ مشین کی افادیت کے بارے میں انھوں نے جو لکھا ہے اس میں کئی ٹکڑے ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس ضمن میں گاندھی جی کا زاویۂ نگاہ کتنا وسیع اور عملی طور پر ہمدردانہ تھا۔

میرے لیے گاندھی جی خشک خیالات کا مجموعہ نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک زندۂ جاوید ہستی ہیں جو ہمیشہ انسانیت کے اس اعلیٰ ترین معیار کی یاد دلاتے ہیں جس تک کوئی انسان پہنچ سکتا ہے۔ ماضی سے بہترین استفادہ حاصل کر کے گاندھی جی مستقبل کا خیال ذہن میں رکھ کر زمانۂ حال میں کام کرتے تھے۔ ان کے بلند خیالات ملک اور زمانے کی حدود سے ماورا تھے۔ جو کچھ انھوں نے کہا اور لکھا اس میں سے زیادہ تر مسوا فوری ضرورت کے مسئلوں کو سلجھانے کے بارے میں تھا۔ انھوں نے افراد کی باطنی رہنمائی کے لیے بھی کچھ لکھا ہے۔ ان کی عقل و فراست اِدھر اُدھر کی معلومات پر مبنی نہیں تھی۔ اپنی زندگی کی آزمائش گاہ میں تجربات کے دوران میں گاندھی جی اپنے خیالات کو آلات کی شکل میں استعمال کرتے تھے۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے کام کا ذکر کرتے ہوئے گوپال کرشن گوکھلے نے کہا تھا کہ گاندھی جی نے مٹی میں سے سورما تیار کیے۔ کبھی کبھی مجھے تعجب ہوتا ہے کہ کہیں ہم پھر سے تو مٹی ہی نہیں ہو گئے ہیں۔ ایک عظیم اپدیشک اپنے زمانے میں جو امنگ پیدا کرتا ہے وہ امنگ بہت عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔ لیکن ایسے لوگوں کے اپدیش ملک اور زمانے کے حدود سے ماورا ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں پر جو گاندھی جی کے دور اور ان کے ملک میں پیدا ہوئے، اس بات کی خصوصی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ ہم ان کی صحیح تصویر اپنے سامنے رکھیں۔ الفاظ سے زیادہ خود ان کی زندگی ان کا پیغام ہے۔ سچی آفاقیت اور عالمی بھائی چارگی کوئی شخص اپنے ہی دور اور ملک میں حاصل کر سکتا ہے۔ گاندھی جی بھارت کے عام لوگوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنا لباس تک بدل ڈالا۔ پھر بھی وہ دنیا کے دیگر حصوں سے حاصل ہونے والے بہترین خیالات کا خیر مقدم کرنے کو تیار تھے۔ انگلینڈ اور جنوبی افریقہ میں قانون کے طالب علم اور بیرسٹر ہونے کے رشتے سے ان کے جو دن گزرے ان

گاندھی جی اور کستوربا

(جب وہ ۱۹۱۵ء میں لندن سے ہندستان واپس آئے)

کا اثر ان کی آئندہ زندگی پر پڑا یہ اس بات سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی [illegible] فانی دستگرائی اور ہر بات کی تہہ تک پہنچنے پر زور دیتے تھے جس چیز کو وہ غلط [illegible] سمجھتے تھے اس پر پوری طرح سے قابو حاصل کر لیتے تھے۔ وہ بھارتی مسائل کا بھارتی [illegible] حل ہی تلاش کرتے تھے۔

ان کی ایک اور [illegible] سیکولرازم کا [illegible] ہے جس کے لیے [illegible] قربان کر دیا۔ سیکولرازم کا مطلب [illegible] [illegible] اس کا مطلب [illegible] مذہب کے لیے [illegible] احترام اور [illegible] کی حد تک ہی نہیں بلکہ حقیقی جذبۂ احترام ہے۔ [illegible] کی کامیابی کے لیے مسلسل احتساب نفس اور لگاتار کوشش کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ مہاراجہ اشوک نے اس سچائی کو چٹانوں پر اس طرح کندہ کرایا ہے کہ "کوئی بھی شخص اپنے مذہب کا احترام اس وقت تک نہیں کرتا جب تک وہ دوسروں کے مذہب کا بھی احترام نہ کرے۔" جب حکمراں اس سچائی کو عملی طور پر استعمال کرتے تھے تو بھارت عظیم تھا اور ترقی کی چوٹی پر پہنچ گیا تھا۔ ہمارے دور میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو نے ہمارے لیے ان اصولوں کو زندہ حقیقت کے روپ میں پیش کیا۔

گاندھی جی کے دوسرے عظیم پیغام "عدم تشدد" پر کچھ کہنے میں مجھے ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ میں تشدد کو صحیح یا حق بجانب سمجھتی ہوں۔ انسان نے اتنے ہلاک اور تباہ کن ہتھیار جمع کر رکھے ہیں کہ میں کبھی کبھی یہ سوچتی ہوں کہ کیا ہمیں ابھی امید رکھنے کا کوئی حق ہے بھی یا نہیں۔ اب بھی کہیں کہیں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں لیکن اس سے زیادہ فکر و تشویش کی بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام حصوں کے خیالات میں نفرت کا عنصر پیدا ہو گیا ہے اور کاموں میں تشدد کا دخل ہو گیا ہے۔ گاندھی جی کہتے تھے — "بھیانک اندھیرے میں روشنی ہوتی ہے" ہمیں اعتماد رکھنا چاہیے۔ گاندھی جی نے یہ دکھا دیا کہ مسلح طاقت کا مقابلہ ہتھیاروں کے بغیر پُر امن طریقے پر کس طرح کیا جا سکتا ہے جب یہ کرامت ایک بار ظہور میں آ چکی ہے تو کیا دوبارہ نہیں آ سکتی۔

زندگی کا نام جد و جہد ہے۔ تمہارا مقصد جتنا اونچا ہوگا، کامیابی حاصل کرنے کی تمہاری خواہش جتنی شدید ہوگی، تم سے اتنا ہی عظیم کام اور اتنی ہی بڑی قربانی مانگی جائے گی۔ تمام مذاہب کے لوگوں نے ابدی سچائی پر عمل کیا ہے۔ یہ شہرت بھارت ہی کو حاصل ہے کہ اس نے ایسے عظیم سپوتوں کو جنم دیا ہے، جنھوں نے بھارت کے قدیم خیالات کو مستحکم بنایا ہے اور انھیں لوگوں کی زندگی کا جز بنایا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی مشکل موقعوں پر ہم نے مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو سے رہنمائی حاصل کی۔ ان دونوں عظیم ہستیوں نے عوام کی بھلائی کے کام میں خود کو پوری طرح کھپا دیا تھا۔ دونوں اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہر معاملے پر عوام کی بھلائی کی کسوٹی پر رکھ کر غور کرنا چاہیے۔ جواہر لال نہرو نے کہا تھا:

"گاندھی جی کے لیے سب سے بڑی دعا ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچائی اور ان زرّیں اصولوں کے لیے وقف کرنے کا عہد کریں جن کے لیے ہمارے ملک کا یہ عظیم سپوت جیا اور مرا۔"

ماخوذ از مہاتما گاندھی: سو برس۔ مولفہ: ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن، شائع کردہ گاندھی پیس فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔ کاپی رائٹ: گاندھی پیس فاؤنڈیشن۔

★

"میں ایک ایسا ہندستان تعمیر کرنے کی کوشش کروں گا جس میں غریب سے غریب بھی یہ محسوس کر سکے کہ یہ اس کا اپنا ملک ہے جس کی تعمیر میں اس کی آواز کو ایک خاص وزن حاصل ہے ایک ایسا ہندستان جس کے باشندوں میں نہ اعلیٰ طبقہ ہوگا نہ ادنیٰ۔ ایک ایسا ہندستان جس میں تمام فرقے مکمل یگانگت اور اتحاد کی زندگی بسر کریں گے۔ اس ہندستان میں چھوت چھات یا منشیات کی لعنت نہ پائی جائے گی۔ عورتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مردوں کو ہیں۔"

———— مہاتما گاندھی

پیغمبرِ امن

عرش ملسیانی

صد سالہ تیرا جشنِ ولادت منائیں ہم — نغمہ الوہیت کا جہاں کو سنائیں ہم
محبوب ہر بشر تھا تو منظورِ ہر نظر — کرتے ہیں یاد آج بھی تیری ادائیں ہم
تو نے کہا تھا ایشور اللہ ہے ایک نام — اے کاش! اس خیال کو دل میں بسائیں ہم
تو تو بسا گیا تھا ہمیں ملکِ امن میں — جائیں تو کیوں فساد کی دنیا میں جائیں ہم
تو نے کیے تھے لاکھ اشارے نجات کے — رازِ نجات تیرے اشاروں سے پائیں ہم
تیری ہدایتیں تو ہیں دنیا کی رہنما — ممکن اگر نہیں تجھے دنیا میں لائیں ہم
تلقینِ امن تیری امانت ہے دہر کو — لازم ہے ہم کو بارِ امانت اٹھائیں ہم
انسانیت کا تو نے بتایا تھا جو عمل — ہر چند سخت ہے وہ، اسے آزمائیں ہم
لازم یہی ہے تیری شہادت کے فیض سے — خون اپنا راہ عشقِ وطن میں بہائیں ہم
ہر سمت ہم بنائیں مساوات کی فضا — خورد و کلاں کے بیچ میں دھوکا نہ کھائیں ہم
اہلِ وطن کے دل میں عداوت کا شور ہے — اہلِ وطن کو درسِ اخوّت پڑھائیں ہم

درسِ مہاتما کا اگر عرش پاس ہے
پردہ جو ہے دوئی کا دلوں سے اٹھائیں ہم

یادیں[1]

خان عبدالغفار خاں

گاندھی جی سے میرے تعلقات بہت قریبی اور گرمجوشانہ رہے۔ مماثل تعلقات کے ضمن میں میرے ذہن میں جواہر لال نہرو اور راجیندر پرساد کے نام آتے ہیں۔

گاندھی جی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۰ء میں دلی میں خلافت کانفرنس میں ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور دیگر رفقائے کار تھے۔ مجھے ان سب سے ملاقات کا فخر اس سے پہلے کبھی حاصل نہ ہوا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو دیش کی خوشحالی اور آزادی کے لئے کام کر سکتے ہیں اور قربانی دے سکتے ہیں۔

گاندھی جی سے میری دوسری ملاقات ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں ہوئی جبکہ کانگریس اور خلافت کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ کانگریس کے اجلاس میں ہم گاندھی جی کی تقریر سن رہے تھے کہ ایک بپھرا ہوا آدمی کود کر ڈائس پر چڑھا اور تقریر میں رکاوٹ ڈالنی چاہی۔ وہ چلایا "مہاتما جی! آپ بزدل ہیں، آپ بزدل ہیں"۔ گاندھی جی نے یہ الفاظ سنے اور مسکرا دیے اور اپنی تقریر جاری رکھی۔ میں اس ذہنی سکون پر عش عش کر اٹھا۔ اس سے ان کی عظمت ظاہر ہوتی تھی۔

مجھے ہزاری باغ جیل سے اگست ۱۹۳۴ء میں رہا کیا گیا۔ رہائی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کو چھوڑ کر جہاں چاہے جا سکتا ہوں۔ گاندھی جی نے مجھے تار سے واردھا آنے کی دعوت دی۔ جمنالال بجاج کی بھی یہی خواہش تھی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ ہم روزانہ گاندھی جی کے پاس جاتے اور ان کی پرارتھنا میں شرکت کرتے۔ ایک دفعہ گاندھی جی نے مجھ سے کہا: "شوکت علی اور محمد علی سے میرے تعلقات انتہائی خوشگوار تھے لیکن مجھے نہیں معلوم کیا ہوا کہ وہ مجھ سے ناراض ہو گئے اور میرے پاس آنا جانا بھی ترک کر دیا۔ آپ کا اس بارے میں کیا تاثر ہے؟ اور آپ میرے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کریں گے؟" میں نے جواب میں کہا: "یہ سوال دراصل محبت و شفقت کا ہے۔ دو آدمیوں کے مابین تعلقات کی بنیاد اپنے اپنے رجحانات اور خیالات پر ہوتی ہے۔ جو کچھ خیالات اور نظریات آپ کے ہیں یہی میرے ہیں۔ آپ کا مقصد خدا کی مخلوق سے پیار اور اس کی خدمت ہے۔ یہی کچھ میرا ہے۔ اس لئے جب تک آپ اپنے مقصد میں ثابت قدم ہیں اور میں اپنے مقصد میں سچا ہوں تو ظاہر ہے کہ ہماری اور آپ کی جدائی ممکن نہیں۔ اختلاف کی صورت میں ہی لوگ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں"۔

میری فطرت بحث مباحثہ کی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں گفتگو کم اور کام زیادہ کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے اور گاندھی جی کے مابین طول طویل بات چیت یا اختلاف رائے نہیں ہوا۔ ہمارے نظریات میں یا طریق انداز نظر میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ خدا کی مخلوق کی خدمت ہم دونوں کا مشترکہ مقصد تھا۔ ہم نے ہر پہلو کو اسی زاویے سے جانچا۔

واردھا کے دوران قیام میں، میں گاندھی جی کی پابندی وقت کی عادت

---

[1] یہ مضمون اس سلسلہ وار انٹرویو پر مبنی ہے جو ایک گروپ نے اپریل ۱۹۶۸ء میں جلال آباد (افغانستان) میں خان عبدالغفار خاں سے لیا تھا۔ شری یو۔ آر۔ راؤ نے جو اس گروپ کے ممبر تھے، یہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ [ماخوذ از مہاتما گاندھی ہنڈرڈ ایئرس۔ مولفہ ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن۔ شائع کردہ: گاندھی پیس فاونڈیشن۔ کاپی رائٹ: گاندھی پیس فاونڈیشن]۔

متاثر ہوا۔ کھانے، ٹہلنے، سونے، پڑھنے لکھنے وغیرہ میں وہ وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھتے۔

میں نے گاندھی جی میں ایک اور بات پائی کہ گاندھی جی کبھی بھی کٹر نہیں تھے۔ وہ اپنے نظریے میں کبھی بھی شدت کا پہلو اختیار نہیں کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ میں واردھا میں گاندھی جی کے پاس گیا، تو میرے بچے بھی جو میرے ساتھ تھے کبھی کبھی میرے ساتھ جاتے تھے۔ ایک روز جو گاندھی جی کا جنم دن تھا جب ہم ان کے پاس گئے اور کھانا کھانے بیٹھ گئے تو میرے بیٹے غنی نے گاندھی جی سے کہا: "مجھے یہاں آکر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ آج گاندھی جی کا جنم دن ہے تو ہمیں کیک، پلاؤ، مرغا وغیرہ کھانے کو ملیں گے اور ہم مزے لے کر یہ سب کھائیں گے لیکن آج بھی حسب معمول کدو ہی کی ترکاری ہے۔ ہر روز کدو۔ آج یہ ابلا ہوا ہے" یہ سن کر گاندھی جی ہنس پڑے اور مجھے ایک طرف لیجا کر کہنے لگے "دیکھئے! یہاں بچے آئے ہیں اور ہمیں ان کی من پسند غذا دینی چاہئے۔ ہمیں ان کے لئے انڈا وغیرہ فراہم کرنا چاہئے"۔ میں نے جواب دیا کہ وہ صرف مذاق کر رہے ہیں۔ ہم جہاں کہیں بھی جاتے ہیں تو صرف وہی کچھ کھاتے ہیں جو میزبان کی طرف سے پیش کیا جائے۔ اگر آپ انھیں کچھ اور کھلانا بھی چاہیں گے تو وہ نہیں کھائیں گے اس لئے مہاتما جی کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ میرے بچوں نے بھی یہ بات نہ مانی۔ اپنی طرف سے مہاتما جی لوگوں کو ان کی من چاہی غذا دینے کو تیار تھے۔

مجھے ان کی ایک اور بات نے بے حد متاثر کیا تھا۔ وہ تھی ان کا پُرمذاق مزاج۔ وہ بچوں، بچیوں، جوانوں اور بوڑھوں کے ساتھ ہنسا کرتے تھے۔ ان میں مزاح کی صلاحیت بدرجۂ اتم تھی۔ ان کا دل محبت سے بھرپور تھا۔ وہ خدا کی مخلوق کی خدمت کے لئے فکرمند رہا کرتے تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ واردھا میں بھنگی نے اپنا کام چھوڑ دیا اور بھاگ گیا۔ جب گاندھی جی کو یہ خبر پہنچائی گئی تو انھوں نے کہا کہ ہمیں ایک جھاڑو اور بالٹی لے کر جانا چاہئے اور صفائی کرنی چاہئے۔ چنانچہ صفائی سے متعلقہ فرائض ہم نے انجام دیئے۔

گاندھی جی ۱۹۳۸ء میں دوسری بار صوبہ سرحد میں گئے۔ انھیں چارسدہ میں ٹھہرانے کا پروگرام تھا۔ اس مقام پر سنتری تعینات کر دیئے گئے تھے۔ یہ صرف احتیاطی تدبیر تھی۔ گاندھی جی نے سنتریوں کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کیوں! میں نے کہا: تاکہ کوئی غیر آدمی داخل نہ ہو سکے لیکن گاندھی جی اس بات پر راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ محافظوں سے بندوقیں لے لی گئیں۔ ہم لوگوں پر اس واقعہ سے گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے کہا کہ اس اجنبی آدمی کا خیال کرو۔ اس کا خدا پر اتنا بھروسہ ہے کہ اسے ہتھیاروں کی مطلق ضرورت نہیں۔

ابتدا میں صوبہ سرحد میں بڑے پیمانے پر تشدد کی کارروائیاں ہوتی تھیں۔ بعد میں عدم تشدد اپنا لیا گیا۔ میں آپ کو بتاؤں کہ تشدد کے جواب میں برطانیہ نے اس قدر جبر سے کام لیا کہ بہادر آدمی بھی بزدل ہو گئے اور عدم تشدد کی راہ کھلی تو بزدل پٹھان بھی دلیر ہو گئے۔ اس سے پہلے پٹھان جیل سے ڈرتے تھے اور سپاہیوں سے گفتگو کرتے ہوئے بھی خوف کھاتے تھے لیکن عدم تشدد نے انھیں ہمت بخشی اور اس کے سبب وہ بہادر بن گئے اور بھائی چارگی کے اصولوں سے آشنا ہوئے۔ اب بچے مسکراتے ہوئے جیلوں میں جاتے تھے۔ ان میں اتنی ہمت آگئی کہ وہ بڑے سے بڑے آدمی کا سامنا کر سکتے تھے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ پٹھان بہادر ہوتا ہے اور اس کی بہادری اس بات میں ہوتی ہے کہ وہ جوابی حملہ کرتا ہے۔ اگر پٹھان پر کوئی حملہ کرے تو اس کے جواب میں وہ بھی حملہ کرے گا۔ لیکن دراصل یہ بزدلی ہے۔ اصل بہادری یہ ہے کہ وہ جوابی کارروائی سے باز رہے۔ یہ انسان کی عظیم ترین صفت ہے۔ ہم اگر تشدد سے کام لیتے تو برطانوی حکام اس شورش کو آسانی سے کچل ڈالتے اور دبا دیتے لیکن ہمارا عدم تشدد ایک ایسی قوت ہے جسے نہ برطانیہ دبا سکا اور نہ پاکستان۔

میں عدم تشدد کا حامی ہوں۔ ہم میں سے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ صرف تشدد سے ہی مقصد حاصل ہو گا۔ میں اس بات سے متفق نہیں۔ میرا مقصد عوام کی خدمت ہے اور یہ مقصد صرف عدم تشدد سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جو لوگ تشدد کے ذریعے عوامی خدمت کے کام انجام دینا چاہتے ہیں مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں ہے لیکن ہمارے طریقے مختلف ہیں۔ میں ان کی دلیری، جنگجوئی اور دلیری سے ان کے پیار و محبت کی قدر کرتا ہوں۔

عدم تشدد محبت ہے، تشدد نفرت ہے۔ تشدد سے کبھی مسئلے حل نہیں ہو سکتے یا دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ بات ہوتی تو پہلی جنگ عظیم کے بعد امن قائم ہو چکا ہوتا لیکن کیا امن قائم ہوا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ پھر دوسری جنگ عظیم ہوئی۔ کیا اس کے بعد امن قائم ہوا؟ جواب

پھر نفی میں ہے۔ تشدد ایک ایسا عمل ہے کہ ایک بار وقوع پذیر ہونے کے بعد اس کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ ایک بار تشدد کی کارروائی کے نتیجے میں دوسری بڑی کارروائی جو شاید پہلے سے بھی بڑی کارروائی ہو، ہوتی ہے۔ تیسری جنگ شاید سب سے زیادہ ہولناک اور تباہ کن ہو۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر دنیا چاہے تو امن قائم ہو سکتا ہے لیکن صرف عدم تشدد سے اور اگر امن نہ چاہے تو جنگ ہوگی اور ایسی جنگ جس کی مثال تاریخ میں نہ مل سکے کیوں کہ ایٹمی ہتھیاروں سے دنیا تباہ ہو جائے گی۔

جب سنہ ۱۹۴۵ء میں مجھے رہا کیا گیا تو میں بیمار تھا۔ گاندھی جی بمبئی میں برلا ہاؤس میں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے مجھے خط لکھا اور بمبئی آنے کی دعوت دی۔ میں گیا۔ ایک دن وہ تشدد کے موضوع پر بات چیت کر رہے تھے۔ میں نے گاندھی جی سے کہا آپ کتنے جوش و خروش سے لوگوں کو عدم تشدد کی تعلیم دیتے ہیں۔ لیکن کیا آپ کے کارکن بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ بہت سے ایسے رئیس آدمی ہیں جو آپ کو مالی امداد دیتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی دیش کے بہت سے حصوں میں تشدد کی کارروائیاں ظہور میں آتی ہیں۔ ہمارے صوبے میں بھی امیر آدمی ہیں وہ کسی کو بھی کھانا اور رقم دے سکتے ہیں۔ لیکن دیش اور عوام کے لیے وہ زیادہ رقم نہیں دیں گے۔ پھر صوبہ سرحد میں تشدد کے لیے زیادہ امکانات ہیں اور وہاں اس طرح کے مواقع زیادہ ہیں جو یہاں نہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود صوبہ سرحد میں عدم تشدد کا راستہ اپنا لیا گیا ہے جب کہ یہ بات یہاں نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ گاندھی جی اس سوال پر ہنسے۔ انھوں نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ عدم تشدد بزدلوں کے لیے ہے لیکن دراصل یہ بہادروں کے لیے ہے۔ صوبہ سرحد میں تشدد اس لیے نہیں کہ وہاں کے لوگ یقیناً بہادر ہیں۔

تقسیم وطن کے دوران فسادات کے بعد بہار میں جب ہم دیہات کا دورہ کر رہے تھے، کچھ مسلم پناہ گزین گاندھی جی کے پاس آگئے اور کہا کہ گاندھی جی! ہم کیا کریں۔ یہاں تشدد قتل و غارت گری اور عدم تحفظ کی فراوانی ہے۔" گاندھی جی نے جواب دیا، "میں تو صرف بہادری کا سبق دے سکتا ہوں۔ آپ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ انھوں نے پوچھا کہ ہم کیسے جا سکتے ہیں اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہم کو قتل نہیں کر دیا جائے گا۔ گاندھی جی نے کہا کہ میں آپ کو کیا ضمانت دے سکتا ہوں لیکن اگر تم میں سے کوئی بھی مارا گیا تو ہندوؤں کو اس کی قیمت گاندھی جی کی زندگی کی صورت میں ادا کرنی ہوگی۔ میں صرف آپ کی اس طرح یقین دہانی کرا سکتا ہوں اس پر مسلمانوں میں ہمت پیدا ہوئی اور وہ گھر واپس چلے گئے۔ ایک پرارتھنا سبھا میں گاندھی جی نے کہا: "میں نے اس جگہ کے مسلمانوں کو یہ باور کرایا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی بھی مارا گیا تو بہار کے ہندو اس کی قیمت گاندھی جی کی زندگی سے چکائیں گے۔"

گاندھی جی کے الفاظ محبت اور اخلاص سے بھرے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عوام پر ان کا پورا اثر تھا۔ انھوں نے لاکھوں انسانوں کو خدمت سے مسحور کیا اور محبت اور خدائی محبت سے ان پر اثر ڈالا۔

میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں کھانا کھا رہا تھا کہ ریڈیو پر اطلاع آئی کہ گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ سن کر میں اور میرے ساتھی جو کھانے میں شریک تھے، کھانا چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ سکتے کے عالم میں تھے۔ اس کے بعد ہم کھانا نہیں کھا سکے۔ ہم باہر گئے اور خدائی خدمتگاروں کو اکٹھا کیا۔ سب کے سب اس خبر سے حیران و پریشان تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ایک سچی محبت کرنے والا انسان، معاون اور دوست ان سے جدا ہو گیا۔

گاندھی جی کا قتل خدا کے خلاف ایک جرم تھا۔ ایک ایسے آدمی کی جان لینا جس نے اپنی پوری زندگی سب کی خاطر تیاگ میں گزاری ہو، دیش کی خاطر ظلم و ستم سہے ہوں اور خدمت کی ہو، خوفناک جرم تھا۔

گاندھی جی کی سب سے بڑی دین کیا تھی؟ اس کے بارے میں کسی ایک چیز کی نشاندہی مشکل ہے۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جو انھوں نے بھارت واسیوں کو دیں۔ سب سے پہلے انھوں نے اہل وطن کو بزدلی کی جگہ ہمت دی۔ سب سے بڑی بات جو انھوں نے کی اور جو نہ صرف بھارت کے لیے تھی بلکہ پوری دنیا کے لیے اہم تھی، وہ تھی عدم تشدد کا سبق۔ گاندھی جی کے عدم تشدد کا مطلب کمزوری نہیں تھا بلکہ بہادری تھا۔ جو کچھ برائی واقع ہوئی وہ اس لیے نہیں کہ عدم تشدد کو اپنایا گیا بلکہ اس لیے کہ عوام نے اسے پوری طرح نہیں اپنایا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ بھارت کو مہاتما گاندھی کا طریقہ اپنانے سے ہی آزادی حاصل

(بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

اتما کی آواز

شمیم کرہانی

ہمارا نام ہے خوش بو، ہمارا کام ہے رنگ
بکھرتے ہوئے چلتے ہیں جذب و رعنائی
قدم قدم پہ لپٹتی ہیں آ کے زنجیریں
چمن بدوش خراماں ہیں پھر بھی سودائی

گئی نہ دل سے کبھی اُلفتِ نگارِ وطن
بُجھا سکی کوئی آندھی نہ اپنے غم کا دیا
شکست کھا نہ سکا اپنا عزم درویشی
ہر اک ہَوا میں جلا اپنے آشرم کا دیا

تمام عمر رہے ہم حریفِ دار و رسن
کٹی ہے طوق و سلاسل میں زندگی اپنی
کوئی کرن درِ زنداں سے چھن کے آئی ہے
تو بن گئی شبِ زنداں میں چاندنی اپنی

چمن میں آج جو بادِ صبا ہے بے زنجیر
روش روش پہ جو اک رنگ و بو کا جلوہ ہے
اُٹھائیں جام تو اہلِ چمن سے کہہ دینا
کہ یہ بہار ہمارے لہو کا جلوہ ہے

یہ اک صدی نہیں، صدیاں ہزار آئیں گی
نہ چھو سکے گی ہمیں گردشِ زمان و زمن
ہماری خاک کبھی رائگاں نہ جائے گی
ہماری خاک کو پہچانتی ہے خاکِ وطن

آشون ۱۸۹۰ شک

سماجی انقلاب کا علمبردار گاندھی

گوپی ناتھ امن

بدقسمتی سے گاندھی جی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کو آزاد کرایا۔ بے شک یہ ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن گاندھی جی کی منزلِ مقصود اس سے بہت آگے تھی۔ آزادی ان کے لیے پہلی منزل تھی اس کے ذریعے ملک میں وہ سماجی انقلاب لانا چاہتے تھے، جس کا ذکر انھوں نے اپنی سب سے پہلی تصنیف ہند سوراج میں کیا۔ افسوس کہ پہلی منزل کے حاصل ہوتے ہی وہ دنیا کی منزل سے چل بسے۔ آج بہت لوگ یہ کہتے ملتے ہیں کہ کاش گاندھی جی زندہ ہوتے۔ بے شک ایک عظیم ہستی کا ملک میں موجود رہنا خوش قسمتی کی بات ہے لیکن سماجی زندگی کا کوئی ایسا صیغہ نہیں ہے جس پر گاندھی جی اپنی رائے نہ دے گئے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ملک کی آدھی آبادی عورتوں کی ہے۔ عورتوں کے بارے میں انھوں نے اپنی متعدد تحریروں میں یہ بات صاف صاف کہی ہے کہ انھیں مردوں کا کھلونا بن کر نہ رہنا چاہیے۔ جب تک وہ اپنے فیشن کے ذریعے دل کشی پیدا کرنے کی کوشش کریں گی وہ مرد کی غلام رہیں گی۔ اُن میں خودداری کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ اسی لیے گاندھی جی نے ۱۹۳۰ء کی تحریک میں شراب کی دُکانوں پر پکٹنگ کا کام عورتوں سے لیا۔ انھوں نے فرمایا کہ "۱۹۲۱ء کی تحریک میں میں نے ایک گناہ کیا ہے کہ صرف مردوں ہی سے کام لیا۔ اب میں اُس کی تلافی کر رہا ہوں۔" یہ گاندھی جی کی ہی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ سمجھنا چاہیے کہ ۱۹۳۷ء میں جو صوبائی وزارتیں قائم ہوئیں تو ہندوستان میں پہلی بار ایک خاتون وزیر ہوئیں۔ یہ شریمتی وجے لکشمی پنڈت تھیں جو اتر پردیش میں لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزیر بنیں۔ ۱۹۵۵ء میں پہلی بار ہندوستان میں ایک خاتون اسمبلی کی اسپیکر بنیں۔ یہ تھیں ڈاکٹر سوشیلا نائر اور آج ہندوستان کی وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی ہیں۔ لیکن گاندھی جی کی منزلِ مقصود اب بھی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ ہندوستان کے گاؤں میں کروڑوں عورتیں تقریباً ویسی ہی زندگی بسر کر رہی ہیں جیسی وہ آزادی سے پہلے بسر کرتی تھیں۔ عورتوں میں تعلیم ضرور پھیلی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر بیداری بھی ہوئی ہے لیکن گاندھی جی یہ نہیں چاہتے تھے کہ تعلیم یافتہ عورتیں مغرب زدگی کا شکار ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی ہندوستانی عورت اپنے کلچر پر قائم رہے۔ بچپن کی شادیوں کی انھوں نے اس لیے مخالفت کی کہ اس سے عورت کی غلامی مستحکم ہو جاتی ہے۔ گاندھی جی نے لکھا ہے کہ نو عمر لڑکیوں کو بیوہ دیکھ کر مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ لڑکیوں کی شادی اسی صورت میں ہونی چاہیے جب وہ بالغ ہو جائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مرد کو دوسری شادی کرنے کا حق ہے تو وہ حق ایک بیوہ عورت کو بھی ہونا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے فرمایا کہ میں اس بیوہ کی انتہائی قدر کرتا ہوں جو اپنی بیوگی پر قائم نہ کر اپنے مرحوم شوہر کے مشن کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔ گاندھی جی زیورات سے آراستگی نہیں چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ عورت کی سب سے بڑی سجاوٹ اُس کا کیرکٹر ہے۔ گاندھی جی زندگی کے داخلی پہلو کو دیکھتے تھے۔ اس لیے خارجی پہلو اُنھیں کبھی اپیل نہ کرتا تھا۔ خوش قسمتی سے انھیں کستوربا جیسی

شریک حیات تھیں جنھوں نے زندگی کی ہر منزل پر اُن کا ساتھ دیا۔ آج کستوربا کے نام پر جگہ جگہ لڑکیوں اور عورتوں کے آشرم قائم ہیں جن میں گاندھی جی کے آدرشوں پر اُن کی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گاندھی جی اس بات کو غلط بتاتے تھے کہ عورت کو [illegible] کہا جائے۔ ہندی میں عورت کو 'ابلا' کہا جاتا ہے یعنی جس میں [illegible] نہ ہو۔ گاندھی جی نے [illegible] الفاظ [illegible] کی تردید کی۔ انھوں نے [illegible] بے شک حیوانی طاقت [illegible] سے عورت مرد سے کمزور ہے لیکن انسانی زندگی کا خاص جوہر خدمت اور محبت ہے [illegible] برداشت اور رواداری ہے۔ اس میں عورت مردوں سے کہیں آگے ہے۔ اس لیے وہ حقیقی طاقت کی مالک ہے لیکن چونکہ سماج کا نظام غلط ہے اس لیے حیوانی طاقت کو ہی طاقت سمجھا جاتا ہے۔

گاندھی جی نعرے لگا کر اور جلوس نکال کر عورتوں کی آزادی حاصل کرنے کے حق میں نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ طبقۂ نسواں اپنے اندر وہ کیریکٹر اور کردار پیدا کرے جس سے اس کے مطالبات ناقابلِ انکار ہو جائیں۔ اہنسا کی قوت وہ عورتوں میں زیادہ مانتے تھے۔ ماں کے روپ میں وہ بچوں کی پرورش کرے اور انھیں اچھے شہری بنانے کی داغ بیل ڈالے۔ بیوی کی صورت میں نہ صرف وہ اپنے شوہر کی خدمت کرے بلکہ اُسے غلط کاری اور غلط روی سے بھی باز رکھے کیونکہ یہ اس شوہر کی حقیقی خدمت ہوگی۔ مثلاً انھوں نے عورتوں کو یہ مشورہ دیا کہ اگر تمھارا شوہر مارکاٹ اور بلوے میں شریک ہو کر آئے تو اس کے لیے کھانا بنانے سے انکار کر دو اور پھر اس کے نتیجے کے طور پر تم پر جو سختی ہو اُسے برداشت کرنے کے لیے تیار رہو۔ شراب پینے والے شوہروں کے خلاف بھی انھوں نے اسی طرح کی خاموش ستیہ گرہ کا مشورہ دیا۔ اس طرح سماج میں انقلاب لانے سے پہلے وہ گھروں میں انقلاب لانے کے کوشاں تھے کیونکہ سیاست کی طرح سماجی زندگی میں بھی اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ تنظیم لامرکزی بنیاد پر شروع ہونا چاہیے۔

چھوت چھات کے مسئلے پر بھی گاندھی جی نے بہت توجہ دی۔ وہ اسے انسانیت کے اصول کے خلاف سمجھتے تھے۔ آج تو ہمارے آئین میں بھی چھوت چھات کو ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ چیز ہمارے دلوں سے نکل گئی ہے؟ گاندھی جی نے ہریجن سیوک سنگھ اسی لیے قائم کیا تھا کہ اس کے ذریعے ہریجنوں کی حالت بہتر ہو سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ سماجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی ہر میدان میں ہریجنوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ ہریجن اپنے حقوق کے لیے [illegible] وہ چاہتے تھے کہ اس طبقے میں وہ صلاحیت پیدا ہو جس سے اس کی حالت بہتر ہو سکے [illegible] وہ خودداری کا جذبہ پیدا ہو [illegible] کمتری دور ہو جائے۔ انھیں اس بات کا بہت دکھ تھا کہ ہریجنوں کی مختلف ذاتوں میں آپس میں بھی چھوت چھات مانی جاتی ہے مثلاً چماروں کے کنووں سے ایک مہتر پانی نہیں بھر سکتا اور ایک مہتر بھی ایک ڈوم کو اپنے کنویں سے پانی نہیں بھرنے دیتا۔ گاندھی جی اس بات کے خلاف تھے کہ ہریجنوں کے لیے الگ کنویں ہوں، الگ چوپال ہو، الگ تعلیمی ادارے ہوں اور الگ ہوسٹل ہوں، کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے علیحدگی اور تفرقے کا جذبہ اور بڑھے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہاسٹلوں، مندروں اور چوپالوں میں ہریجنوں کو بے روک ٹوک دخل حاصل ہوں۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہریجن اپنا کام چھوڑ دیں لیکن ان کا نظریہ یہ تھا کہ ایماندار مزدور کی قدر ہونی چاہیے چاہے وہ کسی قسم کا کام کر رہا ہو۔ اس بات سے ان کا جی کڑھتا تھا کہ سڑک پر جھاڑو دینے والا مہتر یا چمڑا کمانے والا یا جوتے بنانے والا چمار تو ذلیل سمجھا جائے اور بد نیتی سے پیسہ کمانے والا، چور بازاری کرنے والا، ملاوٹ کرنے والا اور ناجائز منافع خور محض روپے کے بل پر سماج میں اونچی جگہ حاصل کرے۔ دراصل وہ عزت اور وقار کا معیار روپے پیسے پر مبنی رکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وقار کا معیار کردار ہو نہ کہ مالی حیثیت۔ وہ ایک سماجی انقلاب لانا چاہتے تھے جس میں زندگی کی قدریں بدلیں۔ محکوم ہندوستان میں یہ ممکن نہ تھا اس لیے انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے ایک مہم چلائی اور تیس سال کی جدوجہد کے بعد اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن اس کے چند مہینے بعد ہی وہ شہید ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کے آئین میں ان کے بہت سے نظریے اپنائے گئے ہیں۔ اگر انھیں عملی صورت میں لانا ہے تو اس کے لیے انتھک اور مخلصانہ کوشش کرنی ہوگی۔

★

۲ اکتوبر

جگن ناتھ آزاد

مسکراتی جو چلی موجِ صبا آج کے دن
غنچۂ خوبیِ تقدیر کھلا آج کے دن

مل گیا آج کے دن جادۂ منزل کا سراغ
رہ برِ منزلِ مقصود ملا آج کے دن

اُٹھ گیا روے معانی سے حجابِ الفاظ
پردۂ چہرۂ مقصود کھُلا آج کے دن

اے وطن ! جو ترے ہونٹوں پہ رہی مدت تک
آخرش وہ ہوئی مقبول دُعا آج کے دن

حرفِ ناگفتہ کو تھی گوہرِ معنی کی تلاش
مل گیا گوہرِ معنی کا پتا آج کے دن

گم جو تھا سلسلۂ جہدِ مسلسل کا سِرا
وہ سِرا قوم کے ہاتھ آ ہی گیا آج کے دن

شکر صد شکر کہ اک بار چلے حسبِ مراد
گردشِ ارض تھی یا دَورِ سما آج کے دن

ناز ہم کیوں نہ کریں آج کے دن پر آزاد
ہم کو گاندھی سا ملا راہ نما آج کے دن

جزوِ ایمان[1]

(گاندھی جی کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد کی مذہبی اہمیت)

ڈاکٹر عابد حسین

سطحی نظر سے دیکھنے والے خواہ وہ ہندستان میں ہوں یا دوسرے ملکوں میں یہ سمجھتے ہیں کہ گاندھی جی کو ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے سے دلچسپی محض سیاسی مصلحت کی بنا پر تھی اور وہ جانتے تھے کہ ہندستان کی تحریک آزادی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ ملک کے دونوں بڑے مذہبی فرقے مل کر اپنی آزادی کے لیے نہ لڑیں۔ ان حضرات کے نزدیک یہی واحد سبب تھا یا کم سے کم سب سے بڑا سبب تھا کہ انھوں نے ہندو مسلمانوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کو اپنی سیاسی مہم کا نقطۂ آغاز بنایا اور اسے اپنے تعمیری پروگرام میں بھی بڑی اہم جگہ دی۔ ان کے اس خیال کو گاندھی جی کے بعض اقوال سے بھی تقویت پہنچتی ہے مثلاً:

"میرے نزدیک ملک کے سامنے ایک ہی مسئلہ ہے جسے حل کرنا ہے اور وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے ... مجھے اس مصیبت زدہ ملک کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی جب تک کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پائیدار قلبی اتحاد نہ ہو..." "ہمیں اب اس کا پورا احساس ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں تھا کہ بغیر اس اتحاد کے ہم اپنی آزادی ہرگز نہیں حاصل کر سکتے۔"

مگر جن لوگوں نے گاندھی جی کے فکر و عمل اور ان کی شخصیت کا زیادہ وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی دراصل مذہبی آدمی تھے اور ان کے فکر و عمل کا سرچشمہ تھا خدا پر ایمان اور اس کی معرفت حاصل کرنے کی آرزو۔ انھوں نے اپنی تیس سال کی پبلک لائف پر جو ۱۹۲۹ء تک گزری تھی تبصرہ کرتے ہوئے تلاش حق میں لکھا ہے:

"وہ چیز جس کی مجھے تلاش ہے جس کی آرزو اور جس میں تیس سال سے بے چین ہوں معرفت نفس، دیدار الٰہی حصول "موکش"[2] ہے۔ یہی تلاش یہی کوشش میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ میری تحریر و تقریر کا میری ساری سیاسی جد و جہد کا یہی مقصد ہے۔"

گاندھی جی نے مسلمانوں کا اعتماد اور ان کی محبت حاصل کرنے کے لیے دل و جان سے ان کی جو خدمت انجام دی اس کی اصل وجہ محض یہ اتفاقی بات نہیں تھی کہ ان دونوں مسلمانوں کا تعاون ہندستان کی آزادی حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا، بلکہ ان کا یہ سچا اور پکا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا ان کے اعلیٰ ترین مذہبی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔

اس کو ثابت کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اختصار کے ساتھ گاندھی جی کے بنیادی مذہبی تصورات کا ذکر کریں اور یہ دکھائیں کہ وہ ہندستان کے مسلمانوں کی خدمت اور ان سے محبت کرنے کو بہ حیثیت ایک ہندو کے اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔

گاندھی جی کے مذہبی عقیدے کے دو بنیادی عناصر حسب ذیل ہیں:

(۱) "ایک ایسی پراسرار قوت پر ایمان جو ہر شے میں جاری و ساری ہے اور جس سے ساری کائنات قائم ہے۔ وہ اس پراسرار ربوبیت کو "قانون حق" یا محض "حق" کہتے ہیں اور اسی کو خدا کے مترادف سمجھتے ہیں۔"

---

[1] یہ اس کتاب کا ایک حصہ ہے جو گاندھی جی اور فرقہ وارانہ اتحاد کے عنوان سے انگریزی میں گاندھی پیس فاؤنڈیشن کی طرف سے شائع ہوگی۔ [2] نجات ابدی

"میں خدا کا تصور شخص کی حیثیت سے نہیں کرتا۔ حق میرے نزدیک خدا ہے۔ ذاتِ الٰہی اور قانونِ الٰہی الگ الگ نہیں ہیں، اس معنی میں جس میں دنیا کا کوئی بادشاہ اور اس کا بنایا ہوا قانون الگ الگ ہوتا ہے۔ حق اور قانونِ حق ہر جگہ موجود ہے اور ہر چیز پر اس کی حکمرانی ہے۔"

(۲) اس بات پر ایمان کہ اہنسا یا محبت حق کی معرفت کا بہترین ذریعہ ہے۔
گاندھی جی کے یہاں اہنسا یا محبت کی اصطلاح بہت وسیع معنی میں استعمال ہوتی ہے جس میں محبت، ہمدردی، رحم، فیاضی، خدمت، ایثار کا ایجابی مفہوم اور عدم تشدد یا اذیت نہ پہنچانے کا سلبی مفہوم دونوں شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ گاندھی جی کے نزدیک مذہبی مقصد "حق" یا خدا کی معرفت حاصل کرنا اور سب سے بڑا مذہبی فرض (جو حق کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے) محبت ہے جس سے مراد ہے سارے نوعِ انسانی سے اُنس اور اس کی خدمت :-

"انسان کا اصل مقصد خدا کی معرفت ہے اور اس کی ساری سماجی، سیاسی اور مذہبی جد و جہد اس آخری مقصد یعنی مشاہدہ حق کو مدنظر رکھ کر ہونی چاہیے۔ سب انسانوں کی بلا واسطہ خدمت اس جد و جہد کا لازمی جز بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ خدا کو پانے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ہم اس کا جلوہ اس کی مخلوق میں دیکھیں اور اس مخلوق کے ساتھ گھل مل کر ایک ہو جائیں۔ یہ صرف کل نوعِ انسانی کی خدمت ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ میں کل کا ایک جز ہوں اور خدا کو باقی نوعِ انسانی سے الگ نہیں پا سکتا۔"

لیکن "ساری نوعِ انسانی کی بلا واسطہ خدمت" عملاً ممکن نہیں ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ موقع ملتا ہے اور وہ بھی کبھی کبھی کہ کوئی ایسا کام کر سکیں جس سے بلا واسطہ کل نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچے۔ عام طور پر انسان اپنے مقدور بھر نوعِ انسانی کے صرف ایک چھوٹے سے جز کی خدمت کر سکتا ہے یعنی اپنے گاؤں یا اپنے ضلعے یا اپنے صوبے یا اپنے ملک کے لوگوں کی۔ سودیشی کے اصولوں کے مطابق جو گاندھی جی کی مذہبی فکر میں ایک اہم مقام رکھتا ہے، انسان کو اپنی قوت اس بے کار کوشش میں ضائع نہیں کرنا چاہیے کہ وہ بلا واسطہ کل نوعِ انسانی کی خدمت کرے بلکہ سب سے پہلے اسے اپنی ساری کوششیں ان لوگوں کی خدمت میں صرف کرنی چاہییں جن تک اس کی پہنچ ہے۔

"سودیشی اس جذبے کا نام ہے کہ ہم دور کے ماحول کو چھوڑ کر قریب کے ماحول سے کام لیں اور اپنے آس پاس کے لوگوں کی خدمت کریں۔"

لیکن ایک چھوٹے سے علاقے میں اپنے آس پاس کے لوگوں کی خدمت اس طرح کرنی چاہیے کہ اس میں ساری نوعِ انسانی کی خدمت کا جذبہ شامل ہو۔ اسے بجائے خود مقصد نہیں بلکہ ساری نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا ذریعہ سمجھنا چاہیے۔

گاندھی جی کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ انسان اپنے ہمسایوں کی اور کل نوعِ انسانی کی خدمت ساتھ ساتھ کر سکتا ہے بشرطیکہ ہمسایوں کی خدمت کرنے میں کسی اور انسان کی حق تلفی نہ ہوتی ہو۔ ایسی صورت میں ہمسائے یہ سمجھ لیں گے کہ اس خدمت کی تہ میں کون سا جذبہ کام کر رہا ہے۔ انھیں یہ بھی محسوس ہوگا کہ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بھی اپنے ہمسایوں کی خدمت کریں۔ اس طرح یہ سلسلہ برف کے ایک گولے کی طرح دونا چوگنا بڑھتا چلا جائے گا اور سارے رُبعِ مسکوں کو اپنی فیض رسانی کے دائرے میں گھیرے گا۔

اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ گاندھی جی کے نزدیک انسان جن لوگوں کے درمیان رہتا سہتا ہو ان کی خدمت اور ان سے محبت اہنسا کا لازمی جز ہے۔ چناں چہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسے جز و ایمان سمجھتے تھے۔ اب اسے اتفاق کہیے یا تقدیرِ الٰہی کہ گاندھی جی نے اپنی پبلک لائف جنوبی افریقہ میں شروع کی جہاں وہ ان ہندستانیوں کے درمیان رہتے تھے جو مذہب اسلام کے پیرو تھے۔ چوں کہ گاندھی جی اس اصول کے دل سے قائل تھے کہ سب مذاہب در اصل ایک ہیں اس لیے عقیدے اور عمل کا وہ فرق جو ان میں اور ان کے مسلمان ہمسایوں میں تھا، دوسروں کے نزدیک کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو ان کی نظر میں محض سطحی تھا اور وہ اس امر میں مانع نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ان مسلمانوں کی، جنھیں تقدیر نے ان کا ہمسایہ بنایا ہے، خدمت اور ان سے محبت کریں۔ وہ ان مسلمان تاجروں کی خدمت کو جنھوں نے انھیں مشیرِ قانونی کی حیثیت سے افریقہ بلایا تھا، بجائے خود اہم سمجھتے تھے اور اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ گئی تھی کہ ان ہی لوگوں کی مدد اور تعاون سے وہ ہندستان سے آئے ہوئے ان پابند مزدوروں کی خدمت کر سکتے تھے جن سے ان کے گورے آقا غلاموں کا سا سلوک کرتے تھے اور بڑی بے دردی کے ساتھ ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔

"میں اپنے بھائی کے کچھ مسلمان دوستوں کے ایک مقدمے کے سلسلے میں جنوبی افریقہ گیا تھا۔ گیا تو اسی غرض سے تھا کہ روزی کماؤں مگر خدمت کو میں مقدم سمجھتا تھا۔ میں وہاں اپنے مزدور دوستوں کی خدمت کے لیے قلی بیرسٹر بن گیا اور اس طرح ان مسلمانوں کے ذریعے سے جن کا ملازم تھا، ہندوؤں کی خدمت کرتا رہا۔ ہندو مسلم اتحاد تو میری زندگی کا جز بن گیا۔"

مندرجہ بالا قول کا آخری جملہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ گاندھی جی ہندو مسلم اتحاد کو بے حد اہمیت دیتے تھے۔ اس کے لیے تھوڑی سی تشریح کی ضرورت ہے۔ جنوبی افریقہ ہی میں انھوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس لیے کہ دونوں ایک دوسرے سے طرح طرح کی بدگمانیاں رکھتے تھے اور ان میں آپس میں کسی قسم کے معاشرتی تعلقات نہیں تھے۔ جب وہ ہندوستان واپس آئے اور یہاں کی پبلک لائف میں داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ اور بھی زیادہ مشکل ہے اس لیے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اونچے اور متوسط طبقوں میں معاشی مفاد کے تصادم کی وجہ سے ان کی آپس کی بدگمانیاں بڑھ کر دشمنی کی حد تک پہنچ گئی تھیں۔ وہ اس صورتِ حال کو اپنے امن و محبت کے مشن کے لیے ایک چیلنج اور اپنے اہنسا کے عقیدے کا امتحان سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انھوں نے اس چیلنج کو قبول نہ کیا اور خود اپنے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد نہ پیدا کر سکے تو وہ تمام دنیا کے لوگوں میں اتحاد پیدا کرنے میں جو ان کا اصل مقصد تھا ہرگز کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں فرقہ وارانہ اتحاد کی کوشش گویا ایک لیبوریٹری کا تجربہ تھا جس کے نتائج سے آگے چل کر بین الاقوامی تعلقات کے وسیع تر میدان میں کام لیا جا سکتا تھا۔

"مجھے شروع ہی میں جنوبی افریقہ میں اس حقیقت کا علم ہو گیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پکی دوستی نہیں ہے۔ میں نے ان رکاوٹوں کو جو اتحاد کی راہ میں تھیں دور کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جنوبی افریقہ کے تجربوں سے مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے میں میری اہنسا کا سب سے کڑا امتحان ہو گا اور مجھے اہنسا کے تجربوں کے لیے سب سے وسیع میدان ملے گا۔ یہ یقین میرے دل میں بدستور موجود ہے۔ زندگی کے ہر لمحہ میں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا میرا امتحان لے رہا ہے۔"

اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ گاندھی جی کو جو ہندو مسلم اتحاد کی دل و جان سے خواہش تھی اور جس کے لیے وہ ساری عمر کوشش کرتے رہے وہ در اصل کسی سیاسی مصلحت سے نہیں بلکہ مذہبی عقیدے کی بنا پر تھی۔ ان کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی کوشش محض ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ نہ تھی بلکہ ایک روحانی ریاضت تھی کہ محبت کے اسمِ اعظم سے معرفتِ حق کے اعلیٰ مقصد کو حاصل کریں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے جو کام گاندھی جی نے خالص مذہبی جذبے کے ماتحت شروع کیا تھا اسے انجام دینے کا ارادہ ان کے دل میں اس وجہ سے اور بھی مضبوط ہو گیا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایک متحدہ محاذ بنانے کے لیے یہ اتحاد ضروری تھا۔ مگر ان کی سیاست بھی زمانہ حال کی موقع پرستانہ سیاست سے بالکل مختلف تھی۔ ایک پیشہ ور سیاست داں تو یہی غنیمت سمجھتا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں غیر ملکی حکمرانوں سے نپٹنے کے لیے عارضی اتحاد پیدا ہو جائے، مگر گاندھی جی اس سے کم پر کسی طرح راضی نہ تھے کہ دونوں میں دوستی کا پائدار رشتہ قائم ہو جائے۔

"ہم جو اتحاد چاہتے ہیں وہ کوئی وقتی سمجھوتہ نہیں بلکہ قلبی اتحاد ہے جس کی بنا اس حقیقت کے واضح شعور پر قائم ہو کہ جب تک اس ملک میں ہندو اور مسلمان اتحاد کے اٹوٹ رشتے میں مربوط نہ ہوں سوراج محض ایک خواب ہے جو کبھی حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکتا۔ یہ اتحاد کوئی عارضی صلح نہیں۔ یہ باہمی خوف پر مبنی نہیں ہو سکتا یہ تو برابر کے حصہ داروں کی جو ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے ہوں شرکت باہمی ہے۔"

ذرا سوچیے کہ اگر ہندو مسلم اتحاد کی فکر گاندھی جی کو محض اس وجہ سے ہوتی کہ یہ اتحاد ملک کی آزادی کے لیے ضروری تھا تو جنوری ۱۹۴۸ء میں جب آزادی حاصل ہو چکی تھی اور ملک تقسیم ہو چکا تھا وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی جان کی قربانی کیوں دیتے۔ جی نہیں یہ سیاست کا کھیل نہیں محبت کا کرشمہ تھا۔ حق کا طالب یہ جانتا تھا کہ موت کے گھاٹ اترنے ہی سے اسے وہ راہ ملے گی جو محبوب کے آستانے تک پہنچاتی ہے۔ ذرا غور سے سنیے کہ راج گھاٹ سے کسی مردِ مجاہد کی خاک بڑے فخر سے کہہ رہی ہے

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

★

گوندھا ہے جو بوڑھے مالی نے وہ ہار نہ ٹوٹے، اے ساتھی!

نذیر بنارسی

یہ کس نے بسایا پہلے پہل جاں دے کے کنارا جمنا کا
یہ کس کے لہو سے روشن ہے ہر ایک منارا جمنا کا
یہ کس کی سمادھی ہے جس نے چمکایا ستارا جمنا کا
یہ کس کی کتھا دہراتا ہے، بہتا ہوا دھارا جمنا کا
پڑھ سکتا ہے اگر اَن پڑھ بھی مانی سے لکھا ہے ماٹی پر
جمنا کے کنارے بھارت کا اتہاس دھرا ہے دھرتی پر

وہ پھول تھے لیکن پھول ایسے اب تک ہے جگت میں جن کی مہک
دیپک تھے مگر اک گھر کے نہیں دنیا کے اندھیرے کے دیپک
ہیرے تھے مگر ایسے ہیرے، ہر دیش میں پہنچی جس کی چمک
اس دیش کی سوندھی مٹی کی سنسار میں پھیلی جس کی مہک
انسان کے قد میں آئی تھی اونچائی ہمالہ پربت کی
باپو کی اکیلی اک ہستی، تصویر تھی پورے بھارت کی

سینے سے لگایا کرتے تھے ہر غم کو سمجھ کر اپنا غم
غمگین کوئی جب ہوتا تھا ہو جاتی تھیں ان کی آنکھیں نم
بیوہ کے، یتیموں کے ہمدم، مظلوں کے زخموں کے مرہم
گو روشنی آنکھوں کی مدھم، روشن مگر ان پر اک عالم
اس بوڑھے بدن کی ہر جھرّی اک موج رواں تھی گنگا کی
پتوار تھے دونوں ہاتھ ان کے مجبوروں کے جیون نیّا کی

ہر سمت گرائی جاتی تھیں جب امن و اماں کی دیواریں
وہ کون سی طاقت تھی جس سے رک جاتی تھیں چلتی تلواریں
انگلی کا اشارہ پاتے ہی دب جاتی تھیں ظالم للکاریں
رستے سے اجل ہٹ جاتی تھی مڑ جاتی تھیں چھریوں کی دھاریں
ہر فتنے کا سر جھک جاتا تھا جب اُن کا قدم آ جاتا تھا
آندھی بھی طرح دے جاتی تھی، طوفان بھی کترا جاتا تھا

ملتے ہی نظر شرمانے لگا ہر جذبہ ستم ایجادی کا
انساں کی روش اپنانے لگا اٹھ اٹھ کے چلن جلادی کا
پھیلا دیا جب بھی دستِ دعا، در بند ہوا بربادی کا
وہ ہاتھ میں پرچم کیا لیتے، پرچم تھے خود آزادی کا
ہر برے سمے کے مانجھی تھے، طوفاں میں بھی بیڑا کھیتے تھے
لاٹھی کا سہارا لے لے کر بھارت کو سہارا دیتے تھے

رکھتا ہے اگر باپو کو سکھی اپدیش کا اُن کے پالن کر
انساں کا اگر دل پایا ہے خوش ہو دلوں کی دھڑکن کر
جو اپنی ہی [illegible] بجھنے کا گرنے کا مقصد بن بن کر
کیوں نذرِ نشیمن کرتا ہے، آزاد ہے شنکرِ گلشن کر
چاہے کسی عنواں سے دیکھیں، انساں کو اب انساں دیکھیں گے
یا سب کے لبوں پر ہوگی ہنسی یا سب کو پریشاں دیکھیں گے

دیش ایک شوالہ ہے جس پر پڑتی ہے زمانے بھر کی نظر
پرتیک عبادت گاہیں ہیں اس ایک شوالے کے اندر
گردوارے، کلیسا، مسجد، مندر ہم کرتے ہیں سب کا آدر
آپس کی لڑائی پھر کیسی، مذہب کے حسیں چوراہے پر
اس شانتی والے داتا سے بیوہار نہ ٹوٹے، اے ساتھی!
مندر کا کلس یا مسجد کا مینار نہ ٹوٹے، اے ساتھی!

درد اور ستاتا ہے اٹھ کر جب آدمی تنہا ہوتا ہے
دکھ بانٹ لیں آپس میں پہلے پھر دیکھیں دکھ کیا ہوتا ہے
مذہب کے بھی رشتے سے محکم انسان کا ناتا ہوتا ہے
جینا ہو کہ مرنا، اے ساتھی! سب ساتھ کا اچھا ہوتا ہے
دم ٹوٹے تو ٹوٹے آپس کا بیوہار نہ ٹوٹے، اے ساتھی!
گوندھا ہے جو بوڑھے مالی نے وہ ہار نہ ٹوٹے، اے ساتھی!

گاندھی جی کا ابتدائی دور

۱۸۶۹ء سے ۱۹۱۵ء تک

عبداللطیف اعظمی

میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو گاندھی جی کی بے تکلف صحبتوں میں شریک ہونے اور قومی مسائل پر براہ راست گفتگو کرنے کی تو عزت حاصل نہیں ہوئی، مگر قریب سے بارہا اور بہت قریب سے چند مرتبہ دیکھنے اور ان کی باتوں کو سننے کی عزت حاصل ہوئی، ان کی پراتھنا سبھا میں پابندی کے ساتھ شرکت کرنے کا موقع ملا۔ ان کی زندگی تکلف سے اس قدر بیگانہ اور طور طریقے اتنے سادہ تھے کہ جو ان سے واقف نہ ہو، وہ کسی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ اتنے بڑے آدمی ہیں، جتنے وہ فی الواقع تھے۔ لیکن اگر ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کی عظمت اور اس کے اسباب آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ خاص طور پر انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں، جب وہ جنوبی افریقہ میں تھے، جس خلوص اور محبت کے ساتھ انسانیت کی خدمت کی، اس نے ان کی عظمت کی ایسی مضبوط بنیاد قائم کر دی، جو بڑے سے بڑے زلزلے میں بھی قائم اور برقرار رہی۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر میں ان کے ابتدائی دور کو یہاں پیش کر رہا ہوں۔

گاندھی جی کے ابتدائی دور کے متعلق جب میں نے متعدد کتابیں پڑھیں تو محسوس ہوا کہ تلاش حق سے زیادہ دل چسپ اور مفید کتاب کوئی اور نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے انگریزی کی جتنی کتابیں پڑھیں ان میں سے بیشتر کی بنیاد گاندھی جی کی یہی کتاب تھی۔ افسوس کہ ایک طویل عرصے سے یہ کتاب ناپید ہے، اس لیے سوچا کہ اگر اسی کتاب کے اقتباسات سے یہ مضمون مرتب کیا جائے تو زیادہ دلچسپ اور مفید ہوگا۔

چونکہ گاندھی جی کا مقصد آپ بیتی لکھنا نہیں تھا، بلکہ حق کی تلاش میں جو تجربے حاصل ہوئے تھے، انھیں بیان کرنا مقصود تھا، جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ "اصل میں میرا مقصد اس قسم کی کتاب لکھنا نہیں ہے جو آپ بیتی کہلاتی ہے، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میں نے حق کی تلاش میں جو تجربے کیے ہیں، ان کی کہانی سنا دوں۔" اس لیے گاندھی جی نے تاریخوں کا التزام بہت کم کیا ہے، اس کے علاوہ اس کہانی کے لکھتے وقت ان کے سامنے کوئی یادداشت نہیں تھی، اس لیے ایک آدھ جگہ تاریخوں میں مجھے اختلاف بھی نظر آیا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ دوسری مستند کتابوں کی مدد سے جہاں تک ممکن ہو، تاریخوں کا اضافہ کر دوں، تاکہ واقعات کے تسلسل کو سمجھنے میں مدد ملے اور اگر کہیں کوئی اختلاف نظر آیا تو حاشیے میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔

اس مضمون میں پانچ سو سے زائد صفحات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ خاصا مشکل کام ہے۔ کہاں تک مجھے اس میں کامیابی ہوئی ہے، اس کا فیصلہ خود قارئین بنیاد دو کریں گے۔

خاندان ۔ گاندھی خاندان کے لوگ ذات کے بنیے ہیں اور ابتدا میں پنساری کی دوکان کرتے تھے، لیکن تین پشتوں سے یعنی میرے دادا کے وقت سے وہ کاٹھیاواڑ کی مختلف ریاستوں میں دیوان رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے میرے دادا اتم چند گاندھی عرف اوتا گاندھی اپنے اصول کے پکے تھے۔ ریاست کی سازشوں سے مجبور ہو کر انھیں پوربندر سے کہ جہاں وہ دیوان تھے جوناگڑھ جانا پڑا۔ دادا گاندھی کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا اور انھوں نے دوسری شادی کی۔ پہلی بیوی سے ان کے چار لڑکے تھے، دوسری سے دو لڑکے [illegible] میں مجھے

کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ اوتا گاندھی کے یہ سب لڑکے ایک ماں سے نہیں ہیں۔ ان چھ بھائیوں میں تلسی داس گاندھی سب سے چھوٹے تھے اور ان سے بڑے کرم چند گاندھی عرف کبا گاندھی تھے۔ یہ دونوں بھائی آگے پیچھے پوربندر کے دیوان رہے۔ کبا گاندھی میرے والد تھے، وہ راجستھانی عدالت کے رکن بھی تھے۔ یہ عدالت اب ٹوٹ گئی ہے، مگر ان دنوں والیان ریاست اور ان کے برادری والوں کے باہمی جھگڑوں کو نپٹانے کے لیے یہ ایک بڑی بااثر جماعت تھی۔ کبا گاندھی کچھ دن راج کوٹ میں رہے اور اس کے بعد بنکانیر میں بھی۔ جب ان کا انتقال ہوا اس زمانے میں وہ ریاست راج کوٹ سے پنشن پاتے تھے۔

میرے والد اپنی برادری کے بڑے خیر خواہ اور بہادر اور فیاض آدمی تھے، لیکن نازک مزاج بھی بہت تھے۔ وہ کبھی رشوت نہیں لیتے تھے اور اپنوں اور بیگانوں میں ان کی منصف مزاجی کی دھوم تھی۔ ریاست کے ساتھ ان کی وفاداری مشہور تھی۔ انھیں دولت جمع کرنے کی ہوس نہ تھی، انھوں نے ہمارے لیے بہت کم جائداد ترکے میں چھوڑی۔ انھوں نے سوائے تجربے کے مدرسے کے کہیں تعلیم نہیں پائی، زیادہ سے زیادہ ان کی لیاقت گجراتی کے پانچویں درجے کے برابر ہوگی۔ تاریخ اور جغرافیہ سے وہ بالکل ناواقف تھے، لیکن عملی کاموں میں بہت وسیع تجربہ رکھتے تھے، جس سے انھیں بڑی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور سیکڑوں آدمیوں سے نپٹنے میں بہت مدد ملتی تھی۔ ان کی مذہبی تعلیم بہت کم تھی، لیکن ان میں وہ دین داری موجود تھی جو مندروں میں آنے جانے اور مذہبی تقریروں کے سننے سے بہت سے ہندوؤں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر عمر میں وہ ایک عالم برہمن کے کہنے سے بھگوت گیتا کا پاٹ کرنے لگے تھے اور پوجا کے وقت اس کے چند اشلوک زور سے پڑھا کرتے تھے۔

والدہ صاحبہ کے متعلق میرے حافظے میں سب سے گہرا نقش ان کی عبادت اور پرہیزگاری کا ہے۔ وہ بڑی پکی دین دار تھیں، ناممکن تھا کہ وہ کبھی اندعا کے بغیر جو وہ روز پڑھا کرتی تھیں کھانا کھالیں۔ "حویلی" یعنی وشنو مندر میں جانا ان کے روزانہ فرائض میں داخل تھا۔ میری والدہ بڑی سمجھدار تھیں، انھیں ریاست کے معاملوں کے متعلق اچھی معلومات تھی اور محل کی خواتین ان کی ذہانت کو بہت مانتی تھیں۔ میں اکثر بچپن کے حقوق سے فائدہ اٹھا کر ان کے ساتھ محل میں جایا کرتا تھا اور مجھے اب تک یاد ہے کہ ان سے اور ٹھاکر صاحب کی والدہ سے بارہا خوب بحثیں ہوتی تھیں۔

پیدائش، بچپن، تعلیم۔ میں ان ماں باپ کے گھر میں ۲ر اکتوبر ۱۸۶۹ء کو بہ مقام پوربندر، جسے سداما پری بھی کہتے ہیں، پیدا ہوا۔ میرا بچپن کا زمانہ پوربندر ہی میں گزرا۔

میری عمر سات برس کی ہوگی کہ میرے والد راجستھانی عدالت کے رکن ہو کر پوربندر سے راج کوٹ گئے۔ وہاں میں ایک ابتدائی مدرسے میں داخل کیا گیا۔ میری پڑھائی جاری رہی۔ ہائی اسکول میں میں کودن نہیں سمجھا جاتا تھا، میرے استادوں کو ہمیشہ مجھ سے محبت رہی۔ تعلیمی ترقی اور چال چلن کے سرٹیفکیٹ ہر سال لڑکوں کے والدین کے پاس بھیجے جایا کرتے تھے۔ مجھے کبھی خراب سرٹیفکیٹ نہیں ملا۔ بلکہ دوسرا درجہ پاس کرنے کے بعد میں نے انعام بھی پائے، پانچویں درجے میں مجھے چار روپے کا اور چھٹے میں دس روپے کا وظیفہ ملا۔ اس میں میری قابلیت سے زیادہ میری خوش قسمتی کو دخل تھا، کیونکہ وظیفے عام نہ تھے، بلکہ کاٹھیا واڑ کے علاقے سورٹھ کے لڑکوں میں جو سب سے اچھے طالب علم تھے، ان کے لیے مخصوص تھے اور ان پچاس ساٹھ طالب علموں کی جماعت میں سورٹھ کے لڑکے زیادہ نہ ہوں گے۔

میں نے انٹرنس کا امتحان ۱۸۸۷ء میں پاس کیا۔ اس زمانے میں امتحان دو جگہ ہوا کرتا تھا، احمد آباد میں اور بمبئی میں۔ ملک کے عام افلاس کی وجہ سے کاٹھیا واڑ کے طلبہ احمد آباد جایا کرتے تھے، کیونکہ یہ قریب بھی پڑتا تھا اور یہاں خرچ بھی کم تھا۔ میرا خاندان بھی مفلس تھا اس لیے میں بھی یہی صورت اختیار کرنے پر مجبور تھا۔ یہ پہلا سفر تھا جو میں نے راجکوٹ سے احمد آباد تک کیا اور وہ بھی بغیر کسی ساتھی کے۔

میرے بزرگ چاہتے تھے کہ میں انٹرنس پاس کرنے کے بعد کالج میں پڑھوں۔ کالج بھاؤنگر میں بھی تھا اور بمبئی میں بھی، مگر چونکہ بھاؤنگر میں خرچ کم تھا اس لیے میں نے یہ طے کیا کہ وہاں جا کر ساملداس کالج میں داخل ہو جاؤں۔ جانے کو تو میں چلا گیا، لیکن وہاں پہنچ کر میرے حواس جاتے رہے، ہر چیز میرے لیے مشکل تھی۔ پروفیسروں کے لکچروں میں دل چسپی ہونا تو درکنار میں انھیں سمجھ بھی نہ سکتا تھا۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا، اس کالج کے پروفیسر اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے تھے، یہ میری خامی تھی کہ میں ان کے درس سے استفادہ نہ کر سکا۔ پہلی ٹرم ختم ہوتے ہی میں گھر چلا آیا۔

انگلستان جانے کی تجویز اور تیاری۔ ماؤجی دوے ایک عالم اور دانش مند برہمن اور ہمارے خاندان کے قدیم دوست اور مشیر تھے، ان کے تعلقات پہلے کی

سے والد کے انتقال کے بعد بھی باقی رہے۔ اتفاق سے وہ میری تعطیل کے زمانے میں ایک دن تشریف لائے اور والدہ اور بڑے بھائی سے باتیں کرنے لگے۔ گفتگو کے دوران میں انھوں نے میری تعلیم کا حال پوچھا۔ انھیں معلوم ہوا کہ میں سامل داس[۱] کالج میں پڑھتا ہوں تو انھوں نے کہا: "اب زمانہ بدل گیا ہے اور تم میں سے کوئی بغیر معقول تعلیم حاصل کیے اپنے والد کی گدی پانے کی توقع نہیں کر سکتا، اس لڑکے کی تعلیم ابھی جاری ہے اس لیے اسی کی ذات سے تمھیں یہ امید ہو سکتی ہے کہ یہ گدی کو قائم رکھے گا۔ بی۔اے پاس کرنے میں اسے چار پانچ سال لگیں گے اور سند ملنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ساٹھ کی نوکری ملے گی، دیوان کا عہدہ ملنے سے رہا، اگر میرے لڑکے کی طرح اس نے قانون پڑھا تو اور بھی زیادہ دن لگیں گے اور اتنے عرصے میں خدا جانے کتنے آدمی وکالت پاس کر کے اس عہدے کے امیدوار ہو جائیں گے۔ میری رائے میں اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم اسے انگلستان بھیج دو۔ میرا بیٹا کیول رام کہتا ہے کہ بیرسٹری کا امتحان بہت سہل ہے، تین سال میں یہ لوٹ آئے گا، خرچ بھی چار پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہوگا۔ ذرا اس بیرسٹر کو دیکھو جو ابھی انگلستان سے آیا ہے، کیسی شان سے رہتا ہے، وہ جس دن چاہے دیوان ہو جائے، میں تو تمھیں بہت اصرار کے ساتھ مشورہ دیتا ہوں کہ موہن داس کو اسی سال انگلستان بھیج دو۔ کیول رام کے بہت سے دوست وہاں ہیں، وہ ان کے نام تعارف کے خطوط دے گا اور موہن داس بڑے آرام سے رہے گا۔"

جوشی جی... اسی لقب سے ہم لوگ ماؤجی دیو کو پکارتے تھے۔ بڑے اطمینان کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے پوچھا: "کیا تم انگلستان جانے کو یہاں پڑھنے پر ترجیح نہیں دیتے؟" میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا چیز ہو سکتی تھی۔ میں اپنی مشکل پڑھائی سے یوں ہی جی چراتا تھا، جھٹ سے اس تجویز پر راضی ہو گیا۔ میں نے کہا: "مجھے کل کے بجائے آج بھیج دیجیے، مگر اتنی جلدی جلدی قانون کے امتحان پاس کرنا مشکل ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ڈاکٹری پڑھنے جاؤں؟"

میرے بھائی نے میری بات کاٹ کر کہا: "والد کو یہ پیشہ بالکل پسند نہیں تھا۔ تمھارا ہی خیال کر کے انھوں نے کہا تھا کہ ہم وشنو لوگوں کو مردوں کی چیر پھاڑ کے پاس نہ پھٹکنا چاہیے، وہ بھی چاہتے تھے کہ تم قانون پڑھو۔"

جوشی جی بولے: "میں گاندھی جی کی طرح ڈاکٹری پیشہ کا مخالف نہیں ہوں، ہمارے شاستروں نے اس کی ممانعت نہیں کی، لیکن ڈاکٹری پڑھ کر تم دیوان نہیں بن سکتے اور میں چاہتا ہوں کہ تمھیں دیوان کا عہدہ بلکہ اس سے بڑھ کر رتبہ ملے۔ یہی ایک صورت ہے کہ تم اتنے بڑے خاندان کی پرورش کر سکو۔ زمانہ روز بروز بدل رہا ہے اور بڑے سخت دن آ رہے ہیں، اس لیے دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ تم بیرسٹر بنو۔" میری ماں سے مخاطب ہو کر انھوں نے کہا: "جو بات میں نے کہی ہے، مہربانی سے اس پر غور کیجیے، اب کی جب میں یہاں آؤں گا تو امید ہے کہ انگلستان کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو مجھے ضرور بتائیے گا۔"

جوشی جی چلے گئے، اور میں شیخ چلی کے سے منصوبے باندھنے لگا۔

میرے بڑے بھائی بہت متفکر تھے، مجھے انگلستان بھیجنے کے مصارف کہاں سے آئیں گے؟ یہ تردد بھی تھا کہ میرے جیسے کمسن لڑکے کو تنہا پردیس میں بھیجنا مناسب ہے یا نہیں، ادھر میری والدہ عجب کشمکش میں تھیں، انھیں میری جدائی بہت ناگوار تھی۔ انھوں نے اس معاملے کو ٹالنے کی کوشش کی، کہنے لگیں "اب تمھارے چچا گھر بھر میں سب سے بڑے ہیں، پہلے ان سے صلاح لینا چاہیے، اگر وہ راضی ہو گئے تو دیکھا جائے گا۔"

میرے بھائی کو ایک اور خیال آیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا "ریاست پوربندر[۲] ہمارا حق ہے۔ لیلی صاحب[۳] آج کل ریاست کے منتظم ہیں، وہ ہمارے خاندان کی بڑی عزت کرتے ہیں اور چچا سے بہت خوش ہیں، ممکن ہے وہ ریاست میں سفارش کر دیں کہ تمھیں انگلستان میں تعلیم دلانے کے لیے کچھ مدد دی جائے۔"

مجھے یہ بات پسند آئی اور میں پوربندر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہاں جلد سے جلد پہنچا اور چچا کو آداب کر کے سارا ماجرا سنایا۔ انھوں نے کچھ دیر سوچ کر کہا: "مجھے یقین نہیں کہ آدمی انگلستان میں رہ کر اپنے دھرم پر قائم رہ سکتا ہے، جو کچھ میں نے سنا ہے اس سے تو بہت شبہ ہوتا ہے۔ جب میں ان بڑے بڑے بیرسٹروں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان کی اور یورپ والوں کی زندگی میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ انھیں کسی چیز کے کھانے پینے میں باک نہیں، سگار ان کے منہ سے کبھی جدا نہیں ہوتا، لباس ویسا ہی بے شرمی کا ہے جیسا کہ انگریزوں کا۔ یہ سب باتیں ہمارے خاندان کے رواج سے میل نہیں کھاتیں، میں چند روز میں یاترا کے لیے جا رہا ہوں اور میری زندگی تھوڑی رہ گئی ہے، بھلا ایسے وقت میں کہ موت سر پر ہے میں تمھیں کیونکر سمندر

---

۱ SAMALDAS ۲ PORBANDAR ۳ MR. F. S. P. LELY

انگلستان جانے کی اجازت دوں؟ مگر نہیں، روکنا بھی نہیں چاہتا۔ اصل میں اجازت جو کچھ ہے تمھاری ماں کی ہے، اگر وہ کہہ دیں تو شوق سے سدھارو، اللہ نگہبان ہے۔ ان سے کہہ دینا کہ میں دخل نہیں دوں گا۔ اگر تم گئے تو میری دعائیں تمھارے ساتھ جائیں گی۔"

میں نے کہا کہ "میں جانتا تھا کہ آپ اس سے زیادہ کچھ نہ کریں گے، اب میں والدہ کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا، مگر کیا آپ لیلی صاحب سے میری سفارش بھی نہ کریں گے؟" انھوں نے کہا: "میں یہ کیسے کر سکتا ہوں، مگر وہ بڑے اچھے آدمی ہیں، تم انھیں اپنے خاندانی تعلقات بتاؤ اور ملنے کی درخواست کرو، وہ یقیناً تم سے ملیں گے، بلکہ ممکن ہے مدد بھی کریں۔"

میں نے لیلی صاحب کو لکھا اور انھوں نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ وہ جب مجھ سے ملے تو سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے، چلتے چلتے انھوں نے مجھے دو ٹوک جواب دے دیا: "پہلے بی۔ اے پاس کرو پھر میرے پاس آنا، اس وقت تمھیں کوئی مدد نہیں دی جا سکتی۔" میں نے ان سے ملنے کے لیے بڑی تیاریاں کی تھیں، بہت سوچ سمجھ کر چند جملے یاد کیے تھے اور جب ان کے سامنے آیا تو زمین دوز ہو کر دونوں ہاتھوں سے سلام کیا، مگر یہ سب بیکار گیا۔ میں پوربندر سے راجکوٹ آیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ میں نے جوشی جی سے مشورہ لیا۔ ظاہر ہے انھوں نے جانے پر اصرار کیا اور کہا کہ اگر ضرورت ہو تو قرض تک لینے میں تامل نہ کرنا چاہیے۔ میں نے اپنی بیوی کا زیور بیچنے کی تجویز پیش کی، جس سے دو تین ہزار روپیہ مل جاتا۔ میرے بھائی نے وعدہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح روپے کا بندوبست کر دیں گے۔ مگر میری والدہ اب تک راضی نہ تھیں۔ انھوں نے لوگوں سے کھود کھود کے انگلستان کے حالات پوچھے، کسی نے ان سے کہہ دیا کہ نوجوان وہاں بگڑ جاتے ہیں، کسی نے کہا وہ گوشت کھانے لگتے ہیں، کسی نے کہا وہاں بغیر شراب کے گزر نہیں ہوتا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا "جب یہ حال ہے تو کیسے کام چلے گا؟" میں نے کہا: "آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں؟ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا، اگر ایسا خطرہ ہوتا تو بھلا جوشی جی مجھے جانے دیتے؟"

انھوں نے کہا: "مجھے تم پر اعتبار ہے، مگر پردیس میں کیسے اعتبار کروں؟ میں حیران ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ اچھا بیچار جی سوامی سے پوچھوں گی۔"

بیچار جی سوامی اصل میں مودھ بنیا تھے، مگر اب جین سادھو ہو گئے تھے۔ وہ بھی جوشی جی کی طرح ہمارے خاندان کے مشیر تھے۔ انھوں نے میری مدد کی اور کہا: "میں اس لڑکے سے تین باتوں کا پکا عہد لوں گا، پھر اسے اجازت دینے میں کوئی حرج نہیں۔" انھوں نے مجھ سے قسم کھلوائی اور یہ عہد لیا کہ میں شراب، عورت اور گوشت کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ جب یہ ہو گیا تو میری ماں نے جانے کی اجازت دے دی۔

لندن میں۔ اپنی ماں کی اجازت اور دعائیں لے کر اپنی بیوی اور تین چار مہینے کے بچے سے رخصت ہو کر میں خوشی خوشی ۱۰ اگست ۱۸۸۸ء کو بمبئی کے لیے اور ۴ ستمبر کو بمبئی سے لندن کے لیے روانہ ہوا۔ ۲۷ اکتوبر کو سنیچر[1] کے دن ہمارا جہاز سدھمپٹن (SOUTHAMPTON) بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ جہاز پر کسی نے ہمیں یہ مشورہ دیا تھا کہ لندن میں وکٹوریہ ہوٹل میں ٹھہریں، اس لیے مجمدار جی[2] نے اور میں نے وہیں قیام کیا۔

مجمدار جی کو اور مجھے ہوٹل میں تکلیف تھی اور خرچ بھی بہت تھا۔ مالٹا سے ہمارے ہم سفر ایک سندھی تھے، جن سے مجمدار جی کی دوستی ہو گئی تھی، وہ لندن میں اجنبی نہ تھے، اس لیے انھوں نے کہا کہ اگر کہو تو تمھارے لیے کمرے تلاش کر دوں، ہم راضی ہو گئے اور دوسرے دن ان کمروں میں اٹھ گئے، جو سندھی دوست نے ہمارے لیے کرایہ پر لیے تھے۔ نئے کمروں میں بھی میں پریشان تھا، مجھے اپنا گھر اور اپنا ملک بہت یاد آتا تھا، ماں کی محبت کا خیال دم بھر دل سے جدا نہیں ہوتا تھا، رات کو میرے رخساروں پر آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا اور گھر کی ایک ایک چیز کی یاد نیند حرام کر دیتی تھی۔ ہر چیز اجنبی تھی۔ لوگ، ان کے طور طریقے یہاں تک کہ ان کے گھر بھی۔ میں انگریزی آداب و رسوم کے معاملے میں بالکل مبتدی تھا اور مجھے ہر وقت احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ پھر ترکاری کے سوا کچھ نہ کھانے کا عہد ایک اور مصیبت تھی، جو کھانا میں کھا سکتا تھا وہ بے مزہ اور پھیکے تھے۔ غرض میں عجب مخمصے میں پھنسا تھا نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ انگلستان میں رہنا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا اور ہندوستان واپس جانا محال تھا، میرا ضمیر یہ کہتا تھا کہ اب تو تم آ ہی گئے ہو، کسی نہ کسی طرح یہ تین سال پورے کرو۔

---

[1] جیسا کہ گاندھی جی حصہ اول انیا پاٹا صفحہ ۲۲۹، نیز نوشتی صفحہ ۲۸۔ لیکن 'تلاش حق' میں گاندھی جی نے لکھا ہے کہ "۴ ستمبر کے آخری دنوں کا ذکر ہے" (صفحہ ۵، طبع اول) مقصد اور کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ ستمبر کے آخر میں گاندھی جی لندن پہنچے، مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس زمانے میں ۴ ستمبر کو روانہ ہو کر کوئی شخص کیونکر آخر ستمبر میں انگلستان پہنچ سکتا ہے، اس لیے میں نے پہلے بیان کی تاریخ کو ترجیح دی ہے۔ جوشی

[2] جوناگڑھ کے ایک وکیل تری امبک رائے جی مجمدار کا بمبئی ہی سے ساتھ ہو گیا تھا۔ ان ہی کے کیبن میں گاندھی جی نے لندن تک سفر کیا تھا۔ جوشی

یہ کہانی جون (۱۸۸۹ء) کے آخر کی بات ہے۔ میں نے میٹریکولیشن کے امتحان میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ بیرسٹری کے امتحان کے لیے زیادہ مطالعے کی ضرورت نہیں، اس لیے میرے پاس وقت کی کمی نہ تھی۔ میری انگریزی کمزور تھی اور اس کی مجھے ہمیشہ فکر رہتی تھی۔ لیلی صاحب ـــ جو آگے چل کر سر فریڈرک کہلائے ـــ کے الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونجتے تھے "پہلے بی۔ اے پاس کر لو تب میرے پاس آؤ"۔ میں نے سوچا کہ مجھے بیرسٹری کے علاوہ کوئی ادبی سند بھی لینا چاہیے۔ میں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کے نصاب کے متعلق دریافت کیا اور چند بھی خواہوں سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ اگر میں ان دونوں یونی ورسٹیوں میں سے کسی میں جاؤں تو بہت خرچ پڑے گا اور انگلستان میں بہت ٹھہرنا ہوگا، اس کے لیے میں تیار نہیں تھا۔ ایک دوست نے کہا کہ اگر تمھیں واقعی کوئی مشکل امتحان دینے کا شوق ہے تو لندن کا میٹریکولیشن پاس کر لو، اس میں محنت بھی کافی ہے، تمھاری عام استعداد بھی بہت بڑھ جائے گی اور کچھ ایسا زائد خرچ بھی نہیں۔ میں نے اس تجویز کو بہت پسند کیا، لیکن اس امتحان کے نصاب نے مجھے ڈرا دیا۔ لاطینی اور کوئی جدید یورپی زبان ـــ انگریزی کے علاوہ ـــ لازمی تھیں۔ میں نے کہا بھلا میں لاطینی کیسے سیکھ پاؤں گا، مگر میرے دوست نے اس کے فوائد پر بہت زور دیا "لاطینی زبان وکیلوں کے لیے بڑے کام کی چیز ہے، قانون کی کتابوں کو سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے اور بیرسٹری کے امتحان میں رومن قانون کا پورا پرچہ لاطینی میں ہوتا ہے، اس کے علاوہ لاطینی جاننے سے انگریزی زبان پر عبور ہو جاتا ہے"۔ یہ بات میرے دل میں کھب گئی اور میں نے طے کر لیا کہ لاطینی چاہے جتنی مشکل ہو میں اسے سیکھ کر رہوں گا۔ فرانسیسی میں پہلے ہی شروع کر چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ جدید زبان میں سے اسی کو لوں۔ میں میٹریکولیشن کے ایک پرائیوٹ کلاس میں شریک ہو گیا۔ امتحان سال میں دو بار ـــ جنوری اور جون میں ـــ ہوا کرتا تھا اور اب اگلے امتحان کو پانچ مہینے باقی تھے۔ اتنے عرصے میں تیار کر لینا میرے لیے قریب قریب ناممکن تھا، مگر اب محنتی طالب علم بننے پر تیار ہو گیا۔ میں نے ایک ایک منٹ کا نقشۂ اوقات بنایا، لیکن نہ تو میری ذہانت سے اور نہ میرے حافظے سے یہ توقع تھی کہ اتنے دن میں امتحان کے دوسرے مضامین کے ساتھ لاطینی اور فرانسیسی دونوں قابو میں آ جائیں گی۔ چنانچہ جب ۱۹ فروری (۱۸۹۰ء) کو نتیجہ شایع ہوا تو میں لاطینی میں فیل تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ مجھے لاطینی کا مذاق پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ دوسری بار کوشش کروں گا تو فرانسیسی اور اچھی ہو جائے گی اور اب کی میں سائنس کے گروپ میں بھی کوئی نیا مضمون لے لوں گا۔ کیمیا جو میرا مضمون تھی بہت دل چسپ ہونا چاہیے تھی، لیکن تجربات کا موقع نہ ملنے سے اس میں جی نہیں لگتا تھا۔ یہ میرے ہندستان کے امتحان میں لازمی مضامین میں سے تھی، اسی لیے میں نے لندن میں میٹریکولیشن میں بھی اسی کو لے لیا تھا، مگر اس بار میں نے بجائے کیمیا کے "روشنی اور حرارت"[1] کا انتخاب کیا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ مضمون آسان ہے اور مجھے بھی آسان معلوم ہوا۔ (ان تیاریوں کے بعد گاندھی جی نے میٹریکولیشن کے اگلے امتحان میں جو جون ۱۸۹۰ء میں منعقد ہوا تھا، دوبارہ شرکت کی اور اس مرتبہ وہ کامیاب رہے)

باضابطہ بیرسٹر بننے کے لیے دو شرطیں پوری کرنا پڑتی تھیں۔ بارہ ٹرم یعنی تین سال کی حاضری اور امتحانوں میں کامیابی۔ حاضری سے مراد یہ تھی کہ ہر ٹرم کی چوبیس ڈنر کی دعوتوں میں سے کم سے کم چھ میں شرکت کی جائے۔ شرکت کے لیے کھانا کھانے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ مقررہ وقت پر پہنچ جانا اور ڈنر کے آخر تک موجود رہنا کافی تھا۔ عام طور پر لوگ بہت خوشی سے یہاں کے ڈنر اور نفیس شرابوں سے لطف اٹھاتے تھے۔ ایک ڈنر کی قیمت ڈھائی شلنگ سے تین شلنگ تک یعنی دو روپے سے تین روپے تک ہوتی تھی۔ میری سمجھ میں نہ اس وقت آیا تھا اور نہ اب تک آیا ہے کہ یہ ڈنر کھا کر طالب علموں میں بیرسٹری کی قابلیت کیونکر ہو جاتی ہے۔ ایک زمانے میں ان دعوتوں میں بہت کم طالب علم آیا کرتے تھے، اس لیے انھیں منتظموں سے گفتگو کا موقع ملتا تھا اور تقریریں بھی ہوتی تھیں۔ ان تجربوں سے انھیں دنیا کا تجربہ حاصل ہوتا تھا، ان کے مذاق میں ستھرا پن اور نفاست پیدا ہوتی تھی اور ان کی قوت گویائی بڑھ جاتی تھی، لیکن میرے زمانے میں یہ باتیں ناممکن تھیں، کیونکہ منتظموں کی میز حفظ مراتب کے خیال سے طالب علموں سے دور رکھی جاتی تھی۔ یہ رسم رفتہ رفتہ بے معنی ہو گئی ہے، لیکن قدامت پسند انگلستان نے اسے بدستور قائم رکھا ہے۔

نصاب تعلیم بہت سہل تھا اور بیرسٹروں کو لوگ مذاق میں "ڈنر بیرسٹر" کہتے تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ امتحانوں کی کوئی وقعت نہیں ہے، میرے زمانے میں دو امتحان ہوتے تھے، ایک رومن قانون میں اور ایک عام قانون میں۔ ان کے لیے باقاعدہ کتابیں

[1] HEAT AND LIGHT

مقرر تھیں، جن میں لوگ کئی بار کرکے امتحان دے سکتے تھے اگر شاید ہی کوئی شخص ان کتابوں کو پڑھتا تھا۔ لیکن میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ ساری درسی کتابیں پڑھوں۔ میرے خیال میں کتابوں کو نہ پڑھنا دغابازی تھی میں نے ان کے خریدنے میں بہت روپیہ صرف کیا، میں نے یہ طے کیا کہ رومن قانون، لاطینی کتابوں سے پڑھوں گا۔ جتنی لاطینی میں نے لندن کے میٹریکولیشن امتحان کے لیے پڑھی تھی وہ بہت کام آئی اور اس مطالعے سے آگے چل کر جنوبی افریقہ میں بڑا فائدہ ہوا، کیوں کہ وہاں رومن ولندیزی قانون رائج تھا۔ جسٹینین (JUSTINIAN) کی کتابیں پڑھنے سے مجھے جنوبی افریقہ کا قانون سمجھنے میں بہت مدد ملی۔

ہندستان میں۔ میں نے [۲۲ سال کی عمر میں ۲۰ مئی ۱۸۹۱ء کو] اپنے امتحانات پاس کر لیے، ۱۰ جون ۱۸۹۱ء کو مجھے بیرسٹر کی سند ملی، ۱۱ جون کو میرا نام ہائی کورٹ میں درج ہوا اور ۱۲ جون کو میں جہاز میں بیٹھ کر ہندستان روانہ ہوگیا اور جولائی کو "آسام" نامی جہاز سے ساحل بمبئی پر اترا۔ میرے بڑے بھائی [لکشمی داس] مجھ سے ملنے کے لیے بندرگاہ پر آئے تھے اور چوں کہ ڈاکٹر مہتا نے [جو اپنی تعلیم ختم کرکے پہلے ہی انگلستان سے واپس آچکے تھے] مجھے اپنے یہاں ٹھہرانے پر اصرار کیا تھا، اس لیے ہم سیدھے ان کے یہاں گئے۔

میں اپنی ماں کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے گلے سے لگانے کے لیے دنیا میں موجود نہیں، اب مجھے یہ اندوہناک خبر ملی۔ مجھے اتنا رنج ہوا کہ والد کے مرنے کا بھی نہ ہوا تھا۔ بہت سی امیدیں، جنھیں میں نے دل میں جگہ دی تھی، خاک میں مل گئیں۔

میرے بڑے بھائی نے مجھ سے بہت کچھ امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ ان کو مال و دولت اور عزت و شہرت کی بڑی آرزو تھی۔ انھوں نے خواہ مخواہ یہ سمجھ رکھا تھا کہ میری وکالت خوب چلے گی اور اس توقع پر گھر کا خرچ بڑھا دیا تھا۔ انھوں نے میری وکالت کے لیے زمین ہموار کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔

راجکوٹ میں وکالت شروع کرنا اپنا مضحکہ کرانا تھا۔ میری قابلیت ایک اچھے وکیل کے برابر بھی نہ تھی اور فیس میں دس گنی چاہتا تھا، کون موکل ایسا بیوقوف تھا کہ میرے پاس آتا اور فرض کیجیے کوئی پھنس بھی جاتا تو کیا میں اپنی جہالت پر، خود پسندی اور فریب کا بھی اضافہ کر لیتا اور دنیا کا مجھ پر جتنا قرض تھا اس کا بوجھ بڑھا لیتا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ کچھ دن کے لیے بمبئی جاؤں، وہاں ہائی کورٹ کے کام کا تجربہ حاصل کروں، ہندستان کے قانون کا مطالعہ کروں اور مقدمے حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر ماروں۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور بمبئی چلا گیا۔

مگر بمبئی میں میرے لیے چار پانچ مہینے سے زیادہ رہنا ناممکن تھا، کیوں کہ خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور آمدنی کچھ نہ تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ مدرسی کروں۔ میری انگریزی اچھی تھی اور اگر مجھے کسی اسکول میں انٹرنس کے لڑکوں کو انگریزی پڑھانے کا کام مل جاتا تو میں بڑی خوشی سے کرتا۔ اس طرح میرے خرچ کا کچھ حصہ تو نکل ہی آتا۔ میں نے اخبار میں اشتہار دیکھا "ضرورت ہے انگریزی کے مدرس کی، ایک گھنٹہ روز سبق، تنخواہ پچھتر روپیہ"۔ یہ اشتہار ایک مشہور اسکول کی طرف سے تھا۔ میں نے درخواست بھیجی اور ملاقات کے لیے طلب ہوا۔ میں خوش خوش پہنچا، مگر جب پرنسپل کو معلوم ہوا کہ میں گریجویٹ نہیں ہوں تو انھوں نے افسوس کے ساتھ انکار کر دیا۔ "مگر میں نے لندن میٹریکولیشن پاس کیا ہے اور میری اختیاری زبان لاطینی تھی" "یہ سچ ہے مگر ہمیں تو گریجویٹ چاہیے"

ایسی صورت میں مجبوری تھی، میں مایوس ہو کر کف افسوس ملنے لگا۔ میرے بھائی کو بڑی تشویش تھی، ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ اب بمبئی میں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں، ہمیں راجکوٹ میں رہنا چاہیے، وہاں میرے بھائی کی وکالت تھوڑی بہت چلتی ہے اور وہ درخواستیں اور عرض داشتیں لکھنے کا کام دے سکتے ہیں، پھر راجکوٹ میں گھر بار موجود ہی تھا ہے اس لیے گھر لے کر رہنے کا بھاری خرچ بچ جائے گا۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی، اس طرح بمبئی میں چھ مہینے قیام کرنے کے بعد میں بوریا بدھنا اٹھا کر چل دیا۔ میں مایوس ہو کر بمبئی سے راجکوٹ آیا اور یہاں میں نے اپنا دفتر قائم کیا۔ اب میرا کام خاصا چلنے لگا، درخواستوں اور عرض داشتوں کے مسودے لکھ کر میں اتنا کما لیتا تھا کہ میری آمدنی کا اوسط تین سو روپیہ ماہوار تھا۔

جنوبی افریقہ کے لیے پیش کش۔ [گاندھی جی کو انگلستان سے لوٹے ڈیڑھ سال سے زیادہ ہو چکا تھا، مگر حالات ابھی اطمینان بخش نہیں تھے اور وہ ہر وقت پژمردہ رہتے تھے۔] اس عرصے میں ایک میمن نے جن کی دکان پوربندر میں تھی میرے بھائی کو یہ پیغام بھیجا "ہم جنوبی افریقہ میں تجارت کرتے ہیں، ہمارا کاروبار بڑا ہے اور وہاں عدالت میں ہمارا ایک بہت بڑا مقدمہ ہے، جس میں ہماری طرف سے چالیس ہزار پونڈ کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ بہت دن سے چل رہا ہے، ہم نے بہترین وکیلوں اور بیرسٹروں کی خدمات حاصل کی ہیں، اگر آپ اپنے بھائی کو وہاں بھیج دیں تو ان کے لیے بھی اچھا ہے

ہمارے لیے بھی۔ وہ ہمارے وکیلوں کو ہم سے بہتر ہدایتیں دے سکیں گے انہیں یہ فائدہ ہوگا کہ ایک نئے ملک کی سیر کریں گے اور نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔

بھائی صاحب نے مجھ سے اس معاملے میں گفتگو کی، میں یہ صاف طور پر نہیں سمجھ سکا کہ مجھے صرف وکیلوں کو ہدایتیں دینا ہوگا یا عدالت میں بھی جانا پڑے گا، مگر بات ایسی تھی کہ میرا جی للچا گیا۔ بھائی صاحب نے مجھے سیٹھ عبدالکریم جھاویری سے ملوایا۔ یہ اسی عبداللہ کمپنی میں جس کا یہ معاملہ تھا حصے دار تھے۔ سیٹھ صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ کام کچھ ایسا مشکل نہیں۔ انھوں نے کہا: "وہاں ہم سے بڑے بڑے یورپیوں سے دوستی ہے، آپ کی بھی ان سے ملاقات ہو جائے گی، آپ سے دکان کے کام میں بھی مدد ملے گی، ہماری خط وکتابت زیادہ تر انگریزی میں ہوتی ہے، اس میں آپ ہاتھ بٹائیں گے، ظاہر ہے آپ وہاں ہمارے مہمان ہوں گے اور آپ کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑے گا۔"

میں نے پوچھا: "آپ میری خدمات کتنے دن کے لیے چاہتے ہیں اور معاوضہ کیا ہوگا۔"

"آپ کو ایک سال سے زیادہ نہیں لگے گا، ہم آپ کو آنے جانے کا اول درجے کا کرایہ دیں گے اور کل اخراجات کے علاوہ ایک سو پانچ پاؤنڈ اور۔"

یہ بیرسٹر کی حیثیت سے جانا تو کہا نہیں جا سکتا۔ یوں کہنا چاہیے کہ میں دکان کے ایک ملازم کی حیثیت سے جا رہا تھا، لیکن مجھے تو یہ فکر تھی کسی طرح ہندستان سے نکلوں۔ پھر یہ لالچ تھا کہ نیا ملک دیکھنے میں آئے گا اور نیا تجربہ حاصل ہوگا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ایک سو پانچ پاؤنڈ بھائی صاحب کو بھیج سکوں گا، جس سے گھر کے خرچ میں مدد ملے گی۔ غرض میں نے بغیر رد و بدل کیے ان شرطوں کو منظور کر لیا اور جنوبی افریقہ جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

جنوبی افریقہ جاتے وقت مجھے جدائی کا وہ درد محسوس نہیں ہوا جو انگلستان جاتے وقت ہوا تھا۔ اب میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا، میں دنیا دیکھ چکا تھا اور غیر ملکوں کے سفر کا تجربہ حاصل کر چکا تھا، اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا کہ راجکوٹ سے بمبئی جانا غیر معمولی بات ہو۔ اس بار مجھے صرف اپنی بیوی کی جدائی شاق گزری۔ میرے انگلستان سے واپس آنے کے بعد ایک اور بچہ پیدا ہو چکا تھا، جب سے میں یورپ سے واپس آیا مجھے بہت کم ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تھا۔ اب جیسا کچھ برا بھلا مجھ سے ممکن تھا، انھیں پڑھاتا تھا اور بعض اصلاحوں میں ان کی مدد کرتا تھا، اس لیے ہم دونوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ہم زیادہ دن یکجا رہیں تاکہ یہ اصلاحیں جاری رہ سکیں، لیکن جنوبی افریقہ کے شوق میں میں فراق کا صدمہ برداشت کرنے کو تیار ہو گیا اور راجکوٹ سے بمبئی روانہ ہو گیا اور بمبئی سے اپریل ۱۸۹۳ء میں میں دل میں بڑے بڑے ولولے لیے ہوئے قسمت آزمائی کرنے جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا اور مئی کے آخر میں نٹال پہنچ گیا۔

جنوبی افریقہ میں

نٹال کی بندرگاہ ڈربن ہے، اسے پورٹ نٹال بھی کہتے ہیں، وہاں عبداللہ سیٹھ مجھے لینے کے لیے آئے تھے، میں ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے جہاز پر آئے تھے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہندوستانی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ عبداللہ سیٹھ کے جاننے والوں کا جو برتاؤ ان کے ساتھ تھا اس سے ایک طرح کی رعونت ظاہر ہوتی تھی جس سے میرے دل پر چوٹ لگی، عبداللہ سیٹھ اس کے عادی ہو گئے تھے۔ مجھے لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں اپنے لباس کے سبب اور ہندستانیوں سے ممتاز نظر آتا تھا۔ میں فراک کوٹ پہنے تھا اور میرے سر پر بنگالی وضع کی پگڑی تھی۔

میں دکان کی عمارت میں پہنچایا گیا اور جس کمرے میں عبداللہ سیٹھ رہتے تھے اس کے برابر والے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی طبیعت کا اندازہ کرنے میں دقت ہوئی۔ ان کاغذات کو پڑھ کر جو ان کے بھائی نے میرے ساتھ بھیجے تھے وہ الجھن میں پڑ گئے۔ وہ سمجھے کہ ان کے بھائی نے ان کے گھر ایک سفید ہاتھی بھیج دیا ہے جسے کھلاتے کھلاتے دیوالہ نکل جائے گا۔ میرے لباس اور طرز معاشرت میں انھیں فرنگیوں کا سا اسراف نظر آیا۔ انھوں نے سوچا کہ اس وقت کوئی خاص کام بھی نہیں، جو ان حضرت کو دیا جا سکے، مقدمہ ٹرانسوال میں ہے، فوراً وہاں بھیجنا بالکل فضول ہے، پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قابلیت اور دیانت داری پر کہاں تک اعتبار کیا جا سکتا ہے، مدعا علیہ سب وہیں ہیں، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان پر ناجائز اثر ڈالیں، اب اگر مقدمے کا کام نہیں دیا جا سکتا تو پھر اور کون سا کام دیا جائے، دوسرے کام تو میرے محرر ان سے کہیں اچھا کر لیتے ہیں اور محرر اگر غلطی کریں تو ان سے باز پرس ہو سکتی ہے، لیکن ان سے غلطی ہو تو کیا کیا جائے، اس لیے اگر مقدمے کے متعلق کوئی کام انھیں نہ دیا جائے تو گویا مفت میں ان کا بار میرے سر پڑ گیا۔

میرے آنے کے دوسرے تیسرے دن وہ مجھے ڈربن کی عدالت دکھانے لے گئے۔ وہاں انھوں نے مجھے کئی آدمیوں سے ملوایا اور اپنے وکیل کے پاس بٹھایا۔

الہ آباد کے ایک جلسے میں، جس کی صدارت پنڈت موتی لال نہرو (کھڑے ہوئے) نے کی۔ جلسے میں جواہر لال نہرو تقریر کر رہے ہیں

کچھ قومی رہنماؤں کے ساتھ

پنڈت مدن موہن مالویہ کے ساتھ

گاندھی جی اور خان عبدالغفار خاں

جواہر لال نہرو کے ساتھ سیواگرام میں

اندرا گاندھی کے ساتھ اپنے ایک برت کے دوران

سبھاش چندر بوس کے ساتھ

ڈاکٹر راجیندر پرشاد اور گاندھی جی

مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ مصروف گفتگو۔

بلگام کانگریس اجلاس ۱۹۲۴ء میں علی برادران کے ساتھ۔ گاندھی جی نے اجلاس کی صدارت کی تھی۔

مجسٹریٹ مجھے دیر تک گھورتا رہا، آخر میں اس نے کہا کہ "پگڑی اتار ڈالو" میں نے انکار کیا اور عدالت سے اٹھ کر چلا آیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہاں بھی میری تقدیر میں لڑائی لڑنا لکھا ہے۔ عبداللہ سیٹھ نے مجھے سمجھایا کہ بعض ہندستانیوں کو پگڑی اتارنا پڑتا ہے۔ انھوں نے کہا جو لوگ اسلامی لباس پہنتے ہیں وہ پگڑی باندھے رہتے ہیں لیکن اور ہندستانیوں کو عموماً عدالت میں جاتے وقت پگڑی اتارنے کا حکم ہے... ایسی صورت میں پگڑی کا مسئلہ بہت اہم تھا، پگڑی اتارنے کے معنی یہ تھے گویا چپ چاپ ذلت سہہ لی، اس لیے میں نے یہ سوچا کہ اب ہندستانی پگڑی کو خیرباد کہہ کر انگریزی ہیٹ استعمال کرنا چاہیے تاکہ میری ذلت نہ ہو اور اس ناگوار جھگڑے سے پیچھا چھوٹے۔ مگر عبداللہ سیٹھ نے اس خیال کو ناپسند کیا۔ انھوں نے کہا: "اگر تم ایسا کروگے تو بہت برا اثر پڑے گا: تمھارے سبب سے ان لوگوں کی بات بگڑ جائے گی جو پگڑی باندھنے پر اڑے ہوئے ہیں اور تمھارے سر پر ہندستانی پگڑی بھلی بھی معلوم ہوتی ہے، اگر تم انگریزی ہیٹ لگاؤگے تو ہوٹل کے بیرے معلوم ہونے لگوگے۔" یہ نصیحت مصلحت اندیشی، حب وطن اور کسی قدر تنگ نظری پر مبنی تھی۔ مصلحت تو ظاہر ہے اور حب وطن نہ ہوتا تو وہ ہندستانی پگڑی باندھنے پر اصرار کیوں دیتے، مگر بیرے کی حقارت آمیز پھبتی سے ایک طرح کی تنگ نظری ظاہر ہوتی تھی۔ مجموعی حیثیت سے مجھے سیٹھ عبداللہ کی نصیحت پسند آئی۔ میں نے اخباروں میں اس واقعے کا حال لکھا اور اپنے پگڑی باندھ کر عدالت میں جانے کو جائز ثابت کیا۔ اس مسئلے پر اخباروں میں خوب بحث ہوئی اور انھوں نے میرا لقب "ناپسندیدہ نو وارد" (UNWELCOME VISITOR) رکھ دیا۔ بعض میری تائید کرتے تھے اور بعض میری بیباکی پر سختی سے اعتراض کرتے تھے۔ میں جب تک جنوبی افریقہ میں رہا قریب قریب ہمیشہ پگڑی باندھتا رہا، البتہ ایک زمانے میں پگڑی، ٹوپی وغیرہ سب چھوڑ دی تھی اور ننگے سر رہتا تھا۔

ڈربن میں ایک ہفتہ قیام کے بعد گاندھی جی پریٹوریا (PRETORIA) کے لیے روانہ ہو گئے جہاں مقدمہ شروع ہونے والا تھا جس کے لیے وہ جنوبی افریقہ تشریف لائے تھے۔ سیٹھ طیب حاجی خاں محمد کی پریٹوریا میں وہی حیثیت تھی جو نٹال میں دادا عبداللہ کی تھی کوئی عام تحریک بغیر ان کے نہیں چل سکتی تھی۔ میں نے پہلے ہی ہفتے میں ان سے واقفیت پیدا کر لی، اور ان سے اپنے اس ارادے کا ذکر کیا کہ پریٹوریا میں جتنے ہندستانی ہیں میں ان سے ملوں گا۔ میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہاں کے ہندستانی باشندوں کے حالات تحقیق کروں اور ان سے اس بارے میں مدد چاہی، انھوں نے بڑی خوشی سے مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

میں نے سوچا کہ پہلا قدم یوں اٹھاؤں کہ پریٹوریا کے سارے ہندستانیوں کا جلسہ کرکے ایک تقریر کروں جس سے ان کو یہ اندازہ ہو کہ ٹرانسوال میں ان کا کیا حال ہے۔ یہ جلسہ سیٹھ حاجی محمد حاجی جوسب کے یہاں ہوا، جن کے نام میں تجارت کا خط لایا تھا۔ اس میں زیادہ تر میمن تاجر تھے، مگر اکا دکا ہندو بھی نظر آتے تھے۔ اصل میں پریٹوریا میں ہندوؤں کی آبادی بہت کم تھی۔ میں نے اس جلسے میں جو تقریر کی وہ ساری عمر میں میری پہلی تقریر کہی جا سکتی ہے۔ اس کا عنوان تھا "کاروبار میں سچائی سے کام لینا"۔ مجھے یہ اندازہ ہوا کہ میری تقریر کا حاضرین پر گہرا اثر ہوا۔

پریٹوریا کے قیام سے مجھے یہ موقع ملا کہ ٹرانسوال اور اورینج فری اسٹیٹ (ORANGE FREE STATE) کے ہندستانیوں کی سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کا گہرا مطالعہ کروں۔ مجھے سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ مطالعہ میرے لیے آگے چل کر اس قدر مفید ثابت ہوگا.... یہاں کے ایک سال کا قیام میری زندگی میں سب سے زیادہ قابل قدر تجربہ تھا۔ یہیں مجھے قومی خدمت کے طریقے سیکھنے کا موقع ملا اور اسے انجام دینے کی تھوڑی بہت قابلیت پیدا ہوئی، یہیں وہ مذہبی روح جو میرے دل میں تھی قوت سے فعل میں آئی، یہیں مجھے وکالت کے متعلق صحیح واقفیت حاصل ہوئی اور میں نے وہ چیزیں سیکھیں جو ایک نیا بیرسٹر ایک پرانے بیرسٹر کے دفتر میں سیکھتا ہے، یہیں مجھے یہ اعتماد پیدا ہوا کہ میں وکالت میں کچھ ایسا برا نہ رہوں گا اور یہیں کامیابی کی کنجی میرے ہاتھ لگی۔

اب مجھے جنوبی افریقہ میں آئے تین سال ہو چکے تھے۔ میں یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا اور یہ بھی مجھے خوب جان گئے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں میں نے ان سے چھ مہینے کے لیے اجازت مانگی، کیوں کہ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے افریقہ میں بہت دن رہنا ہے۔ میری وکالت اچھی خاصی چلتی تھی اور مجھے احساس ہو گیا تھا کہ لوگوں کو میری ضرورت ہے اس لیے میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ گھر جاکر بیوی بچوں کو لے آؤں اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لوں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ وطن جاکر لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے آگاہ کروں اور یہاں کے ہندستانیوں کا ہمدرد بناؤں تو پھر قومی خدمت بھی ہو جائے گی۔

ؔ غالباً [illegible] کی طرف اشارہ ہے۔

وطن میں۔ میں ۵ جون ۱۸۹۶ء کے وسط میں[1] پنگولا جہاز سے جو کلکتہ جا رہا تھا وطن روانہ ہوا۔ چوبیس دن کے بعد یہ خوش گوار سفر ختم ہو گیا اور میں دریائے ہوگلی کے حسن پر سر دُھنتا ہوا کلکتہ پہنچ گیا۔ اسی دن[2] میں ریل میں بیٹھ کر بمبئی روانہ ہو گیا۔ میں بغیر بمبئی میں ٹھہرے سیدھا راجکوٹ پہنچا اور جنوبی افریقہ کے حالات پر ایک پمفلٹ لکھنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کے لکھنے اور شائع کرنے میں ایک مہینہ لگ گیا۔ اس کا سرِ ورق سبز تھا، اس لیے آگے چل کر اس کا نام "سبز پمفلٹ" پڑ گیا۔ اس میں میں نے جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کی مشکلات خاص کر کے ہلکے رنگ میں دکھائیں اور طرزِ بیان بھی معتدل رکھا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ دور کی چیزیں جتنی اصل میں ہوتی ہیں اس سے بڑی معلوم ہوا کرتی ہیں۔ میں نے اس پمفلٹ کی دس ہزار کاپیاں چھپوائیں اور ہندستان کے سارے اخباروں کو اور سب پارٹیوں کے لیڈروں کو بھیجیں۔ سب سے پہلے پانیر کے ایڈیٹر نے تبصرہ کیا۔[3] رپورٹر نے اس کے مضمون کا خلاصہ تار کے ذریعے سے لندن بھیجا اور وہاں کے رپورٹر کے صدر دفتر نے اس خلاصے کا خلاصہ نٹال پہنچایا۔ یہ آخری تار تین سطر سے زیادہ نہ تھا۔ میں نے جو تصویر اس سلوک کی جو نٹال میں ہندستانیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا کھینچی تھی، اس کا اس تار میں چھوٹا سا عکس تھا، مگر اس میں بہت مبالغے سے کام لیا گیا تھا اور جو الفاظ نقل کیے گئے تھے وہ میرے نہیں تھے۔ اس کا نٹال میں جو اثر ہوا، اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ ہندستان کے ہر معقول اخبار میں اس پر بحث کی گئی۔

میرا ارادہ تھا کہ سب شہروں میں جلسے کر کے لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں۔ بمبئی سے میں نے ابتدا کی، سب سے پہلے میں جسٹس رانڈے سے ملا۔ انھوں نے میری گفتگو غور سے سنی اور مجھے سر فیروز شاہ مہتا سے ملنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد میں جسٹس بدر الدین طیب جی سے ملا، انھوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ میں خود سر فیروز شاہ مہتا سے ملنا چاہتا تھا، لیکن جب ان بزرگوں نے مجھے ان کے مشورے پر عمل کرنے کی رائے دی تب مجھے پورا اندازہ ہوا کہ سر فیروز شاہ مہتا کا پبلک میں کتنا اثر ہے۔ کچھ دن کے بعد میں ان کے پاس حاضر ہوا۔ میرا خیال تھا کہ جب میں ان کے سامنے جاؤں گا تو مجھ پر رعب طاری ہو جائے گا، ان کو پبلک نے جو خطاب دیے تھے وہ میں سن چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں "شیرِ بمبئی" "احاطۂ بمبئی کے بے تاج بادشاہ" کی ملاقات کے لیے جا رہا ہوں، مگر بادشاہ نے مجھے اپنے جاہ و جلال سے مرعوب نہیں کیا۔ وہ مجھ سے اس طرح پیش آئے جس طرح باپ بیٹے سے ملتا ہے۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ غور سے سنتے رہے، آخر انھوں نے کہا: "گاندھی میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ضرور تمہاری مدد کرنی چاہیے، مجھے یہاں جلسہ کرنا پڑے گا۔" پھر اپنے سکریٹری کو جلسے کی تاریخ مقرر کرنے کا حکم دیا۔ تاریخ طے ہو گئی اور انھوں نے مجھے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ جلسے سے ایک روز پہلے میرے پاس پھر آنا۔ میرے دل میں جو دیک کھٹکا تھا وہ اس ملاقات سے جاتا رہا اور میں خوش خوش گھر لوٹ آیا۔

بمبئی سے پونا پہنچا، یہاں دو پارٹیاں تھیں، میں ہر خیال کے لوگوں کی مدد چاہتا تھا۔ پہلے میں لوکمانیہ تلک سے ملا، انھوں نے کہا: "آپ کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ ہر پارٹی سے مدد لینا چاہیے، جنوبی افریقہ کے معاملے میں کسی اختلافِ رائے کی گنجائش نہیں مگر یہ بہت ضروری ہے کہ آپ صدر ایسے شخص کو بنائیں جو کسی پارٹی میں نہ ہو۔ آپ پروفیسر بھنڈارکر سے ملیے انھوں نے کچھ دن سے پبلک معاملات میں حصہ لینا چھوڑ دیا ہے۔" ان سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ ان کی غیر معمولی ہر دل عزیزی کا راز کیا ہے۔ اس کے بعد میں گوکھلے کے پاس گیا۔ انھوں نے بڑی محبت سے میرا استقبال کیا اور ان کے اخلاق نے میرے دل کو تسخیر کر لیا۔ ان سے بھی میں پہلی بار ملا تھا، مگر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے مدتوں کے بچھڑے ہوئے دوست ملے ہوں۔ سر فیروز شاہ میری نظر میں ہمالیہ کی طرح تھے اور لوکمانیہ سمندر کی طرح، مگر گوکھلے گنگا کے مانند تھے۔ اس پاک دریا میں آدمی جی کھول کر نہا سکتا تھا، ہمالیہ پر چڑھنا محال تھا اور سمندر میں کشتی لیجانا دشوار، مگر گنگا گود پھیلائے اپنی طرف بلاتی تھی، اس میں کشتی لے جانے سے روحانی

---

[1] ۵ جون ۱۸۹۶ء کی صبح کو (مہاتما گاندھی، از پیارے لال، حصہ اول، صفحہ ۱۷۱)۔ [2] ۴ جولائی ۱۸۹۶ء (مہاتما گاندھی، از پیارے لال، حصہ اول، صفحہ ۱۷۵)۔

[3] ساؤتھ افریقہ سے واپسی پر اسی سفر میں جس کا ابھی ذکر آیا ہے، الہ آباد میں ٹرین چھوٹ جانے پر گاندھی جی، الہ آباد کے مشہور انگریزی روزنامہ پانیر کے اڈیٹر مسٹر چیسنی (CHESNEY, SR.) سے ملے۔ گاندھی جی کو معلوم ہوا تھا کہ یہ اخبار ہندستانیوں کے مطالبات کا مخالف ہے، مگر وہ ہر پارٹی کی مدد حاصل کرنا چاہتے تھے، اس لیے اڈیٹر سے مل کر ان کو تفصیلات سے آگاہ کیا۔ سننے کے بعد انھوں نے فرمایا: "تم جو کچھ لکھو گے اس پر میں اپنے اخبار میں تبصرہ کر دوں گا، مگر اس کا وعدہ نہیں کرتا کہ ہندستانیوں کے سارے مطالبات کی تائید ہی کر دوں گا۔" اس ملاقات اور وعدہ کا نتیجہ تھا کہ پانیر میں سب سے پہلے تبصرہ شائع ہوا۔

مسرت ہوئی تھی۔ میں ان کے پاس سے اٹھا تو میرا دل خوشی سے معمور تھا۔ سیاسی لوگوں میں سے میرے دل کو جو تعلق گوکھلے سے ان کی زندگی میں تھا اور اب تک ہے وہ اور کسی سے نہیں۔

ڈاکٹر بھنڈارکر میرے ساتھ پدرانہ شفقت سے پیش آئے۔ میں جب ان کے پاس پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا۔ اس عالم مرتاض پر اس بات کا بڑا اثر ہوا کہ میں ایسی دھوپ میں لوگوں سے ملتا پھرتا ہوں۔ میری یہ تجویز کہ جلسے کا صدر ایسا ہو جو کسی پارٹی میں نہ ہو، انھیں بہت پسند آئی اور وہ بے اختیار چلا اٹھے "بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک"۔ جب میں اپنی داستان سنا چکا تو انھوں نے کہا: "تم جس سے پوچھو گے وہ کہہ دے گا کہ میں سیاست میں حصہ نہیں لیتا، مگر تم سے میں عذر نہیں کر سکتا، تمھارا کام اتنا اہم ہے اور تمھاری محنت اس قدر قابلِ تعریف ہے کہ مجھے تمھارے جلسے میں شریک ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ تلک اور گوکھلے سے مشورہ کر لیا، اگر تکلیف نہ ہو تو ان سے جا کر کہہ دینا کہ میں بہت خوشی سے دونوں انجمنوں کے متحدہ جلسے کی صدارت کروں گا۔ پونا کے ان بے نفس عالموں نے بغیر کسی تکلف اور نمائش کے ایک چھوٹا سا جلسہ کیا جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اپنے مشن میں کامیابی کا یقین ہو گیا۔

اس کے بعد میں مدراس گیا۔ یہاں لوگوں میں بے حد جوش تھا۔ میری تقریر چھپی ہوئی تھی اور میرے اندازے میں خاصی طویل تھی، مگر حاضرین ایک ایک لفظ کو غور سے سنتے رہے۔ جب جلسہ ختم ہوا تو لوگ سبز پمفلٹ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اس پر نظر کرنے کے بعد دوبارہ دس ہزار چھپوایا، اس کی بڑی خوب ہوئی۔ یہاں سب سے زیادہ مدد مجھے آنجہانی جی پرمیشورن پلے اڈیٹر مدراس اسٹینڈرڈ سے ملی۔ انھوں نے اپنے اخبار کے کالم میرے لیے وقف کر دیے اور میں ان کی عنایت سے اکثر فائدہ اٹھاتا تھا۔

مدراس سے میں کلکتہ گیا۔ یہاں مجھے بڑی دقت کا سامنا ہوا، کیونکہ میں اس شہر میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مجھے سب سے پہلے "بنگال کے دیوتا" سر سریندرناتھ بنرجی سے ملنا تھا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو دوستوں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے، میری درخواست سن کر کہنے لگے: "مجھے اندیشہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو آپ کے کام میں دلچسپی نہ ہوگی۔ مگر آپ اپنی طرف سے پوری کوشش کیجیے، آپ کو مہاراجوں کی ہمدردی حاصل کرنا ہوگی، برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نمائندے سے ضرور ملیے، راجا سر پیارے موہن مکرجی اور مہاراجا ٹیگور کے پاس جائیے۔ یہ دونوں آزاد خیال ہیں اور پبلک کاموں میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔"

میں ان حضرات سے ملا مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی، دونوں مجھ سے سرد مہری سے پیش آئے۔ بازار پتریکا کے دفتر میں گیا، جو حضرت وہاں ملے وہ مجھے یہ سمجھے کہ یہ کوئی آفاقی (WANDERING JEW) ہے جو یونہی مارا مارا پھرتا ہے، بنگباسی والے (BANGA BASI) ان سے بھی بڑھ گئے۔ اس کے اڈیٹر نے مجھے ایک گھنٹہ انتظار میں رکھا۔ یہ میں بھی دیکھ رہا تھا کہ ان سے ملنے کے لیے بہت سے لوگ کھڑے ہیں، مگر ان سب کو نپٹانے کے بعد بھی انھوں نے میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا، اس لیے میں نے جرأت کر کے خود گفتگو شروع کی۔ انھوں نے کہا "تم دیکھتے نہیں کہ میں مصروف ہوں، تمھارے جیسے لوگ صبح سے شام تک سیکڑوں آیا کرتے ہیں، بہتر ہے تم یہاں سے چل دو، مجھے تمھاری باتیں سننے کی فرصت نہیں"۔ حسبِ معمول اینگلو انڈین اڈیٹروں کے یہاں بھی گیا، اسٹیٹسمین اور انگلشمین نے اس مسئلے کی اہمیت محسوس کی۔ میں نے ان سے اس کے متعلق طویل گفتگو کی اور انھوں نے یہ پوری گفتگو چھاپ دی۔ انگلشمین کے اڈیٹر مسٹر سانڈرس نے مجھے اپنی حمایت میں لے لیا۔ انھوں نے اپنا اخبار اور اپنا دفتر میرے لیے وقف کر دیا بلکہ یہاں تک کیا کہ اس مسئلے پر جو اڈیٹوریل لکھا تھا، اس کے پروف میرے پاس بھیج دیے اور مجھے اجازت دے دی کہ اس میں حسبِ خواہش تبدیلی کر دوں۔ مسٹر سانڈرس کی غیر متوقع مدد سے مجھے یہ امید ہو چلی تھی کہ کوئی تعجب نہیں کلکتہ میں بھی جلسہ کرنے کی کوئی صورت نکل آئے کہ میرے پاس ڈربن سے یہ تار پہنچا:

"پارلیمنٹ کا اجلاس جنوری سے شروع ہے فوراً واپس آؤ۔"

دوبارہ جنوبی افریقہ میں

میں نے بمبئی میں عبداللہ کمپنی کے ایجنٹ کو تار دیا کہ جو پہلا جہاز جنوبی افریقہ جاتا ہو اس کا ٹکٹ میرے لیے خریدے۔ دادا عبداللہ نے اسی زمانے میں مسافر جہاز "کورلینڈ" نیا نیا خریدا تھا، انھوں نے بہت اصرار کیا کہ اسی جہاز سے چلو، میں تمھیں اور تمھارے خاندان کو مفت میں پہنچا دوں گا۔ میں نے ان کی پیش کش شکریے کے ساتھ قبول

کرلی اور شروع دسمبر[۱] میں اپنی بیوی، دونوں لڑکوں[۲] اور اپنی بیوہ بہن کے اکلوتے لڑکے[۳] کو ساتھ لے کر دوبارہ جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا۔ ہمارے جہاز کے ساتھ ایک اور جہاز نذیری بھی ڈربن جا رہا تھا۔ اس کمپنی کی ایجنسی دادا عبداللہ کمپنی کے پاس تھی، ان دونوں جہازوں کے مسافر آٹھ سو کے قریب ہوں گے، ان میں سے آدھے ٹرانسوال جا رہے تھے۔

چونکہ جہاز بغیر درمیانی بندرگاہوں پر ٹھہرے ہوئے سیدھا نٹال جا رہا تھا، اس لیے ہمارا سفر صرف اٹھارہ دن کا تھا، مگر نٹال پہنچنے سے چار دن پہلے بڑی سخت آندھی آئی، کرۂ ارض کے جنوبی حصے میں دسمبر برسات کا مہینہ ہے، اس لیے اس زمانے میں بحر جنوبی میں چھوٹی بڑی آندھیاں آیا کرتی ہیں۔ جس آندھی کا میں ذکر کر رہا ہوں یہ اتنے زور سے آئی اور اتنی دیر تک رہی کہ مسافر ڈر گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ طوفان چوبیس گھنٹے کے قریب رہا۔ اس طوفان کے سبب مجھ میں اور دوسرے مسافروں میں بہت میل جول ہو گیا۔ مجھے طوفان کا ڈر نہیں تھا، کیونکہ میں ایسے موقعے پہلے بھی دیکھ چکا تھا، میری طبیعت بحری سفر سے مناسبت رکھتی ہے اور مجھے کبھی متلی یا دورانِ سر کی شکایت نہیں ہوتی، اس لیے میں بے دھڑک سارے جہاز میں گشت لگاتا تھا، مسافروں کی تسلی اور دل دہی کرتا تھا اور انھیں ہر گھنٹے کپتان کا پیغام پہنچاتا تھا۔ آگے چل کر ان لوگوں کی دوستی میرے بڑے کام آئی۔ ۱۸ یا ۱۹ دسمبر کو جہاز ڈربن میں لنگر انداز ہوا۔ "نذیری جہاز" بھی اسی دن پہنچا۔ مگر اصلی طوفان اب آگے آنے والا تھا۔

ڈربن کے یورپی باشندوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ لوگ یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ہم سب اپنے ملک کو لوٹا دیے جائیں، یورپی روز بڑے بڑے جلسے کرتے تھے۔ یہ لوگ دادا عبداللہ کمپنی کو طرح طرح کی دھمکیاں دیتے تھے اور کبھی کبھی لالچ بھی دلاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر دونوں جہاز واپس کر دیے جائیں تو ہم ہرجانہ دینے کو تیار ہیں، لیکن دادا عبداللہ کمپنی ان دھمکیوں میں آنے والی نہ تھی۔ اس طرح ڈربن ایک زبردست اور ایک کمزور فریق کی جنگ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ایک طرف تھوڑے سے ہندوستانی اور ان کے معدودے چند انگریز دوست تھے اور دوسری طرف یورپیوں کی صف تھی جو تعداد میں، قوت میں، تعلیم میں اور دولت میں ان سے کہیں بڑھے ہوئے تھے، پھر نٹال کی حکومت بھی کھلم کھلا ان کی مدد کر رہی تھی۔ میرا دل اس لڑائی میں لگا ہوا تھا کیونکہ اصل میں میرے ہی خلاف تھی۔ مجھ پر دو الزام تھے، ایک یہ کہ میں نے ہندوستان میں نٹال کے یورپیوں کو بے جا مطعون کیا، دوسرے یہ کہ میں خاص کر دو جہاز بھر کے ہندوستانی لایا ہوں کہ نٹال کو ہندوستانیوں سے بھر دوں۔ آخرکار ایک دن میرے اور دوسرے مسافروں کے پاس یہ اعلانِ جنگ پہنچا کہ اگر تم اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو جو ہم کہتے ہیں اسے چپ چاپ مان لو۔ اس کے جواب میں میں نے اور دوسرے مسافروں نے کہلا بھیجا کہ ہمیں نٹال کی بندرگاہ میں اترنے کا پورا حق ہے اور ہم نے جی میں ٹھان لی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے نٹال میں ضرور داخل ہوں گے۔

بالآخر جہاز گودی پر لائے گئے اور مسافر اترنے لگے۔ مگر مسٹر ہیری اسکومبے (MR. HARRY ESCOMBE) نے، جو کابینہ کے سب سے زیادہ بااثر وزیر تھے، کپتان کو کہلا بھیجا کہ گاندھی سے کہہ دو "یورپی تم سے سخت بیزار ہیں، تمھاری اور تمھارے خاندان کی جان خطرے میں ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ تم جھٹپٹے وقت اترو اور گودی کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ٹیٹم (MR. TATUM) کی حفاظت میں گھر جاؤ۔" کپتان نے یہ پیام مجھ سے کہا اور میں اس پر عمل درآمد کرنے پر تیار ہو گیا، مگر مسٹر لاٹن کپتان کے پاس آئے اور کہنے لگے "اگر مسٹر گاندھی راضی ہوں تو میں انھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" اس کے بعد

---

[۱] روانگی کی تاریخ میں کچھ اختلاف ہے، پیارے لال نے تو وہی تاریخ لکھی ہے جو تلاش حق میں ہے، مگر ڈی جی تنڈولکر نے اپنی کتاب مہاتما میں لکھا ہے کہ گاندھی جی ۲۸ نومبر ۱۸۹۶ء کو روانہ ہوئے (ملاحظہ ہو حصہ اول صفحہ ۵۰)۔ اسی طرح بی آر نندا نے اپنی کتاب مہاتما گاندھی میں لکھا ہے کہ نومبر ۱۸۹۶ء کے آخر میں کورلینڈ (COURLAND) اور نذیری (NADERI) جہاز تقریباً ساتھ ہی روانہ ہوئے اور ۱۹ دسمبر کو ڈربن کی بندرگاہ میں دونوں جہاز ساتھ ہی پہنچے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۵۴)

[۲] ہیرا لال اور منی لال [۳] گوکل داس۔

انھوں نے مجھ سے بھی کہا: "اگر آپ ڈرتے ہوں تو میری رائے ہے کہ آپ کی بیوی بچے گاڑی میں رستم جی کے یہاں چلے جائیں، ہم آپ پیدل چلیں، مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ آپ چوروں کی طرح رات کو شہر میں داخل ہوں، میرے خیال میں آپ پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں، شہر میں ہر طرف سکون ہے، یورپی منتشر ہو چکے ہیں۔" میں فوراً راضی ہو گیا، میری بیوی اور بچے گاڑی میں سوار ہو کر حفاظت کے ساتھ رستم جی کے یہاں پہنچ گئے۔ میں کپتان کی اجازت سے مسٹر لاٹن کے ساتھ روانہ ہوا، مسٹر رستم جی کا مکان گودی سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔

جیسے ہی ہم کنارے پر پہنچے، چند لڑکوں نے مجھے پہچان لیا اور "گاندھی گاندھی" پکارنے لگے۔ پانچ چھ آدمی اور دوڑ آئے اور انھوں نے لڑکوں کے ساتھ مل کر چلانا شروع کیا۔ مسٹر لاٹن ڈرے کہ کہیں مجمع زیادہ نہ ہو جائے، انھوں نے ایک رکشا والے کو پکارا، مجھے رکشا پر بیٹھنا پسند نہ تھا، آج پہلی بار اس کا اتفاق ہوتا، مگر لڑکوں نے مجھے بیٹھنے نہیں دیا۔ انھوں نے رکشا والے کو ایسا دھمکایا کہ وہ اپنی جان لے کر بھاگا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے مجمع بھی زیادہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ رستہ بالکل رک گیا۔ پھر انھوں نے مسٹر لاٹن کو پکڑ کر مجھ سے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد مجھ پر اینٹ، پتھر اور گندے انڈوں کی بوچھار کر دی۔ ایک شخص میری پگڑی لے بھاگا اور کچھ لوگ مجھے گھونسے اور لاتیں مارنے لگے۔ مجھے غش آنے لگا اور میں ایک مکان کے جنگلے کے سہارے کھڑا ہو گیا کہ ذرا دم لے لوں مگر لوگوں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی جو مجھ سے واقف تھیں، ادھر سے گزر رہی تھیں۔ یہ بہادر خاتون میری مدد کے لیے آگئیں اور اپنی چھتری کھول کر میرے اور مجمع کے درمیان حائل ہو گئیں۔ اس عرصے میں ایک ہندوستانی لڑکا جس نے یہ واقعہ دیکھا تھا دوڑ کر کوتوالی پہنچ گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر الیگزینڈر نے سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا کہ مجھے حلقے میں لے کر گھر پہنچا دے۔ پولیس کی حفاظت میں بغیر کسی مزید دقت کے رستم جی کے یہاں پہنچ گیا۔ جہاز کے ڈاکٹر دادی بارجو روہیں موجود تھے، انھوں نے بہت توجہ سے میری مرہم پٹی کی۔

گھر کے اندر سکون تھا، مگر باہر یورپی مکان گھیرے ہوئے تھے۔ رات ہونے والی تھی اور مجمع گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا "گاندھی کو ہمارے حوالے کر دو۔" بیدار مغز سپرنٹنڈنٹ پولیس موقعے پر پہنچ گئے تھے اور مجمع کو دھمکا کر نہیں بلکہ پرچا کر قابو میں لانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن دل میں وہ بھی پریشان تھے۔ مجھ سے کہلا بھیجا کہ "اگر آپ اپنے دوست کے گھر بار کو اور اپنے خاندان کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے بچانا چاہتے ہیں تو جیسے میں کہوں بھیس بدل کر نکل جائیے۔" چنانچہ ان کے مشورے کے مطابق میں نے ایک ہندوستانی کانسٹیبل کی وردی پہن لی اور سر پر ایک دھات کی طشتری رکھ کر اس پر مدراسی صافہ لپیٹ لیا کہ خود کا کام دے سکے۔ میرے ساتھ دو سراغرساں تھے، جن میں سے ایک نے ہندوستانی تاجر کا بھیس بدلا اور چہرے کو رنگ کر ہندوستانیوں کی شکل بنا لی تھی، دوسرے کا بھیس مجھے یاد نہیں۔ ادھر میں بھاگ رہا تھا اور ادھر مسٹر الیگزینڈر یہ بول گا کر مجمع کو بہلا رہے تھے:

بھانسی دے دو گاندھی کو
کھٹے سیب کے پیڑ پر

جب انھیں یقین ہو گیا کہ میں حفاظت کے ساتھ کوتوالی پہنچا دیا گیا تو انھوں نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا: "بھئی تمھارا شکار تو قریب کی دوکان سے ہو کر نکل گیا، میری صلاح یہ ہے کہ اب تم بھی گھر کی راہ لو۔" بعض لوگ بگڑے، بعض ہنسنے لگے اور بعض کو اس کا یقین نہیں آیا۔

مسٹر چیمبرلین آنجہانی نے جو اس زمانے میں وزیر نو آبادیات تھے، نٹال کو تار کے ذریعے ان لوگوں پر مقدمہ چلانے کا حکم دیا جنھوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ مسٹر اسکومبے نے مجھے بلایا اور کہا: "مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ کو یہ اذیتیں اٹھانا پڑیں، اگر آپ حملہ کرنے والوں کو شناخت کر سکیں تو میں اس کے لیے تیار ہوں کہ انھیں گرفتار کرا کر ان پر مقدمہ چلاؤں۔" میں نے جواب دیا: "میں کسی پر مقدمہ چلانا نہیں چاہتا۔" جس روز میں جہاز سے اترنے والا تھا، اسی روز نٹال ایڈورٹائزر (NATAL ADVERTISER) کا نمائندہ مجھ سے انٹرویو لینے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس سے ان تمام الزامات کی جو مجھ پر لگائے گئے تھے، تردید کی اور اسے یہ بھی یقین دلایا کہ کورلینڈ اور نادری کے مسافروں کو جنوبی افریقہ لانے میں مجھے مطلق کوئی دخل نہیں ہے۔ جب میرا یہ بیان شائع ہوا، ادھر میں نے حملہ آوروں پر مقدمہ چلانے سے

انکار کر دیا۔ ان باتوں کا بڑا گہرا اثر ہوا اور ڈربن کے یورپی اپنی حرکتوں پر سخت نادم ہوئے۔ اخباروں نے میرا بے قصور ہونا تسلیم کر لیا اور عوام کو سخت لعنت ملامت کی۔ اس طرح یہ حملہ آگے چل کر میرے لیے یعنی قومی مقصد کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس سے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی وقعت بڑھ گئی اور میرے کام میں آسانی پیدا ہو گئی۔

جنگ بوئر میں خدمت ۔ میں سنہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۸۹۶ء تک کے بہت سے واقعات کو چھوڑ کر صرف جنگ بوئر کا ذکر کرتا ہوں۔

اعلانِ جنگ[1] کے وقت مجھے ذاتی طور پر بوئروں سے ہمدردی تھی، مگر ان دنوں میرا خیال تھا کہ ایسے معاملات میں مجھے یہ حق نہیں کہ دوسروں کو اپنی انفرادی رائے پر چلاؤں۔ میں نے "جنوبی افریقہ کی ستیہ گرہ کی تاریخ" میں اس اندرونی کشمکش کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ برطانوی حکومت کی وفاداری کے جذبے نے مجھے اس لڑائی میں انگریزوں کی طرف کھینچ لیا۔ میں نے سوچا اگر میں سلطنت برطانیہ کے شہری کی حیثیت سے حقوق کا طالب ہوں تو میرا فرض ہے کہ اس سلطنت کی حفاظت میں شرکت کروں۔ میرا ان دنوں یہ خیال تھا کہ ہندوستان کی کامل آزادی صرف سلطنت برطانیہ کی مدد سے اور اس کے ماتحت رہ کر حاصل ہو سکتی ہے، اس لیے مجھے جتنے ساتھی مل سکے، سب کو جمع کر کے میں نے ایک ایمبولنس کور بنائی اور حکومت نے اس کی خدمات قبول کر لیں۔

ہماری کور میں کل گیارہ سو آدمی تھے، جس میں چالیس افسر تھے۔ ہماری کور نے اچھا خاصا کام کیا۔ ہمارا مقام محاذ جنگ کے پیچھے تھا اور ہم ریڈ کراس کی حفاظت میں تھے مگر ایک بار ایک نازک موقعے پر ہم سے میدان جنگ میں کام لیا گیا، ہم تو خود یہی چاہتے تھے۔ ابتدا میں جنگی افسر ہمیں گولہ باری کی زد میں نہیں بھیجنا چاہتے تھے، مگر اسپیوں کاپ (SPIONKOP) کی پسپائی کے بعد صورت حال بدل گئی۔ ہمارے پاس جنرل بلر کا پیام آیا کہ گو آپ لوگ اس پر مجبور نہیں کہ اپنی جان خطرے میں ڈالیں، لیکن آپ زخمیوں کو میدان جنگ سے لے آیا کریں تو حکومت آپ کی بہت ممنون ہوگی۔ ہم نے یہ تامل منظور کر لیا، اس لیے اسپیوں کاپ کے معرکے میں ہم خط جنگ پر موجود تھے۔ ان دنوں ہمیں زخمیوں کو ڈولی میں اٹھا کر بیس پچیس میل روزانہ چلنا پڑتا تھا۔ اس موقعے پر حقیر خدمت کی بہت تعریف کی گئی اور لوگوں کی نظر میں ہندوستانی کی وقعت بڑھ گئی۔ جنرل بلر نے اپنی رپورٹ میں کور کے کام کی تعریف کی اور اس کے افسروں کو تمغۂ جنگ عنایت کیا۔

ہندوستان کی واپسی ۔ جنگ کی خدمت سے فرصت پانے کے بعد[2] مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرا کام اب جنوبی افریقہ میں نہیں بلکہ ہندوستان میں ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ جنوبی افریقہ میں اب کچھ کرنے کے لیے نہیں تھا، بلکہ یہ خوف تھا کہ کہیں میرے وقت کا زیادہ حصہ روپیہ کمانے میں نہ صرف ہو جائے۔ اس لیے میں نے اپنے رفیقوں سے رخصت کی درخواست کی، یہ درخواست بڑی مشکل سے منظور ہوئی اور وہ بھی اس شرط پر کہ اگر جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک سال کے اندر میری ضرورت پڑی تو مجھے واپس آنا پڑے گا۔ مجھے یہ شرط بڑی سخت معلوم ہوئی، مگر اس محبت کی وجہ سے جو مجھے اپنے وطنی بھائیوں سے تھی، میں نے اسے منظور کر لیا۔

ہندوستان پہنچ کر[3] کچھ دن میں سارے ملک کا دورہ کرتا رہا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں کانگریس کلکتہ میں ہو رہی تھی، میں بھی اس میں شریک ہوا۔ میرے لیے کانگریس کی شرکت کا یہ پہلا موقع تھا۔ چند روز میں میں کانگریس کے طور طریقے سے اچھی طرح سے واقف ہو گیا۔ مجھے اکثر لیڈروں سے ملنے اور گوکھلے اور سریندر ناتھ جیسے شیر مردوں سے واقف ہونے کا موقع مل گیا۔ دل بادل خیموں کو، رضاکاروں کی شاندار صفوں کو اور ڈائس پر بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں، میں دل میں کہتا تھا کہ اس عظیم الشان اجتماع میں مجھے کون پوچھے گا۔

کانگریس ختم ہو گئی، مگر مجھے جنوبی افریقہ کے کام کے سلسلے میں لوان تجارت کے ممبروں اور کچھ اور لوگوں سے ملنا تھا، اس لیے میں کلکتہ میں ایک مہینہ اور ٹھہر گیا۔ مجھے کلکتہ سے راج کوٹ جانا تھا اور راستے میں

---

[1] ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۹۹ء
[2] فروری سنہ ۱۹۰۰ء میں برطانیہ کی کامیابی کے بعد ایمبولنس کور ختم کر دی گئی تھی، ویسے بوئروں نے ۳۱ مئی سنہ ۱۹۰۲ء کو ہتھیار ڈالے۔
[3] گاندھی جی ۱۹ دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء کو بمبئی پہنچے تھے۔

بنارس، آگرہ، جے پور اور پالن پور ٹھہرنے کا قصد تھا اور مقامات پر بھی ٹھہرتا، مگر اتنا وقت نہیں تھا۔ ہر شہر میں میں نے ایک ایک دن قیام کیا اور سوائے پالن پور کے سب کہیں معمولی یاتریوں کی طرح دھرم شالوں میں یا پنڈتوں کے یہاں مہمان رہا۔

گوکھلے کا اصرار تھا کہ میں بمبئی میں بس جاؤں اور وکالت کے ساتھ ساتھ قومی کام بھی کروں۔ قومی کام سے مراد ان دنوں کانگریس کی خدمت تھی اور انھوں نے جو ادارہ قائم کیا تھا وہ بھی زیادہ تر کانگریس ہی کا کام کرتا تھا۔ مجھے گوکھلے کا مشورہ پسند آیا، مگر مجھے وکالت چلنے کی کچھ زیادہ امید نہیں تھی۔ میں اب تک پہلی ناکامی کی تلخی کو نہیں بھولا تھا اور مقدمے حاصل کرنے کے لیے خوشامد کرنا مجھے اب زہر لگتا تھا۔ مگر مجھے اپنے پیشے میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ میرے جنوبی افریقہ کے موکل اکثر مجھے اپنے مقدمے دیا کرتے تھے اور میرے گزر اوقات کے لیے کافی تھے۔

عین اس وقت جب میں یکسوئی کے ساتھ اپنے کاروبار میں مشغول ہونے والا تھا جنوبی افریقہ سے اچانک یہ تار پہنچا: "یہاں چیمبرلین کے آنے کی خبر ہے، مہربانی کرکے فوراً چلے آیئے۔" مجھے اپنا وعدہ یاد آیا اور میں نے اس مضمون کا تار دیا کہ "میں آنے کے لیے تیار ہوں، جب آپ ذریعہ بھیجیں گے فوراً روانہ ہوجاؤں گا۔"

جنوبی افریقہ میں تیسری مرتبہ

میں عین وقت پر ڈربن[1] پہنچا۔ میرے لیے کام تیار رکھا تھا۔ مسٹر چیمبرلین کی خدمت میں وفد کے جانے کی تاریخ مقرر ہوچکی تھی، مجھے ان کے سامنے پیش کرنے کے لیے عرض داشت مرتب کرنا تھی اور وفد کے ساتھ جانا تھا۔ مسٹر چیمبرلین جنوبی افریقہ سے ساڑھے تین کروڑ پونڈ نذر لینے اور انگریزوں اور بوئروں کی دل جوئی کرنے آئے تھے، اس لیے انھوں نے ہندوستانی وفد کو سوکھا ٹال دیا۔ انھوں نے کہا: "آپ جانتے ہیں کہ جن نوآبادیوں کو حکومت خود اختیاری حاصل ہے، ان کے معاملات میں دخل دینے کا امپیریل گورنمنٹ کو بہت کم حق ہے۔ آپ کی شکایتیں بجا معلوم ہوتی ہیں، مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا کروں گا، مگر آپ کو یورپیوں کے ساتھ رہنا ہے تو انھیں خوش رکھنے کی کوشش کیجیے۔"

(جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے صحیح حالات اور خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے "انڈین اوپنین" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنے کی تجویز گاندھی جی کے سامنے پیش کی گئی جسے انھوں نے بہت پسند کیا) یہ اخبار ۱۹۰۴ء میں جاری کیا گیا اور من سکھ لال جی نظر پہلے اڈیٹر مقرر ہوئے، مگر زیادہ تر کام مجھی کو کرنا پڑتا تھا، بلکہ اکثر اداریہ کے فرائض بھی میں ہی انجام دیتا تھا۔ اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ من سکھ لال جی اخبار کو چلا نہیں سکتے تھے، وہ ہندوستان میں عرصے تک اخبار نویسی کرچکے تھے، مگر جنوبی افریقہ کے پیچیدہ مسائل پر وہ میرے ہوتے ہوئے قلم اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ انھیں میری سوجھ بوجھ پر پورا بھروسہ تھا، اس لیے اداریہ لکھنے کی ذمے داری انھوں نے مجھ پر ڈال دی۔ جب تک یہ میرے انتظام میں رہا، اس کی حالت میری زندگی کے ساتھ بدلتی رہی، جس طرح آج "ینگ انڈیا" اور "نوجیون" میری زندگی کا آئینہ ہیں، ان دنوں "انڈین اوپنین" تھا۔ ہر ہفتے میں اس میں اپنی واردات قلب کی داستان، اپنے درد دل کی کہانی کہا کرتا تھا اور ستیہ گرہ کے اصول اور عمل کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیا کرتا تھا۔ دس سال کے عرصے میں یعنی ۱۹۱۴ء تک بجز اس زمانے کے جو میں نے قید میں گزارا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اس میں مضمون نہ لکھا ہو۔ مجھے یاد نہیں کہ ان مضامین میں میں نے ایک لفظ بھی بغیر سوچے سمجھے لکھا ہو یا کبھی جان بوجھ کر مبالغہ یا خوشامد کی ہو۔ سچ پوچھیے تو یہ اخبار نویسی میرے لیے ضبط نفس کی تربیت تھی اور میرے دوستوں کے لیے میرے خیالات سے باخبر رہنے کا ذریعہ۔ نقادوں کو اس پر اعتراض کا موقع بہت کم ملتا تھا، بلکہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ "انڈین اوپنین" کے لہجے نے نقادوں کو قلم روک کر لکھنے پر مجبور کردیا، اگر یہ اخبار نہ ہوتا تو ستیا گرہ کبھی نہ چل سکتی۔

جنوبی افریقہ کی بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں، مگر مجبوراً ان کا ذکر چھوڑتا ہوں۔ ۱۹۱۴ء میں جب ستیا گرہ کی جد و جہد ختم ہوگئی تو گوکھلے کا حکم پہنچا کہ لندن ہوتے ہوئے ہندوستان آجاؤ۔ اس لیے میں کستوربا اور کیلن باخ کو ساتھ لے کر انگلستان روانہ ہوگیا[2]۔ مدیرا میں ہم نے سنا کہ کوئی دن میں بہت بڑی جنگ چھڑنے والی ہے۔ بحیرۂ انگلستان میں اصل

---

[1] دسمبر ۱۹۰۲ء [2] ۱۸ رجولائی ۱۹۱۴ء کو

بہت سے تخریبی کارروائی بیچ شروع ہوگئی۔ وہاں ہمارے جہاز کو کچھ دیر ٹھہرنا پڑا۔ لڑائی کا اعلان ۴ راگست کو ہوا تھا، ہم ۶ راگست کو لندن میں داخل ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کے ساتھ ہمدردی۔ انگلستان پہنچ کر معلوم ہوا کہ گوکھلے جو علاج کے لیے پیرس گئے تھے، آمدورفت کا سلسلہ بند ہوجانے کے سبب سے وہیں رہ گئے ہیں اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کب تک لوٹیں گے۔ میں ان سے ملے بغیر ہندوستان نہیں جانا چاہتا تھا، مگر ان کی واپسی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ اتنے دن کیا کروں؟ جنگ کے سلسلے میں میرا کیا فرض ہے؟ میری رائے تھی کہ جتنے ہندوستانی انگلستان میں مقیم ہیں سب کو اپنی بساط کے مطابق جنگ میں حصہ لینا چاہیے۔ جس طرح انگریز طالب علموں نے اپنی خدمات فوج کے لیے پیش کی ہیں ہندوستانیوں کو بھی کرنا چاہیے۔ اس پر بہت سے اعتراض کیے گئے، مگر میں اپنی رائے پر قائم رہا اور میں نے کہا کہ جس کا جی چاہے وہ اپنا نام رضاکاروں میں لکھوادے۔ مجھے اچھی خاصی کامیابی ہوئی اور تقریباً ہر صوبے اور مذہب کے نمائندے رضاکار بن گئے۔ میں نے لارڈ کریو کو خط لکھا کہ اگر ہماری خدمات کا قبول کیا جانا اس شرط پر منحصر ہو کہ پہلے ہم ایمبولینس کا کام سیکھیں تو اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ لارڈ کریو نے کچھ تامل کے بعد ہماری خدمات قبول کرلیں اور ہمارا شکریہ ادا کیا کہ ہم ایسے نازک وقت میں سلطنت کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔

انگلستان پہنچ کر میں پسلی کے ورم (ذات الجنب[1]) میں مبتلا ہوگیا تھا۔ میرے پہنچنے کے تھوڑے دن بعد گوکھلے لندن واپس آگئے[2]۔ ہم دونوں میں زیادہ تر لڑائی کے متعلق گفتگو ہوا کرتی تھی۔ کیلن باخ کو جرمنی کا جغرافیہ از بر تھا اور انھوں نے یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی بہت سفر کیا تھا اس لیے وہ ہمیں نقشے میں وہ مقامات دکھایا کرتے تھے جو لڑائی کے سلسلے میں اہمیت رکھتے تھے۔ وہ میرے ساتھ ہندوستان جانے کے ارادے سے آئے تھے، لندن میں میرے ساتھ ہی رہتے تھے اور ہم دونوں ایک ہی جہاز میں روانہ ہونے والے تھے مگر جرمن نسل کے لوگوں کی نگرانی اس قدر سختی سے کی جارہی تھی کہ انھیں پاسپورٹ ملنا بہت مشکل نظر آتا تھا۔ میں نے اس معاملے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی، مسٹر رابرٹس[3] انھیں پاس پورٹ دیے جانے کے حامی تھے، چنانچہ انھوں نے اس کے متعلق وائسرائے کو تار دیا، مگر لارڈ ہارڈنگ نے صاف جواب دے دیا:

"مجھے افسوس ہے، حکومت ہند ایسے خطرے میں پڑنے کے لیے تیار نہیں۔" ہم سب لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب کوشش کرنا بے کار ہے۔ مجھ پر کیلن باخ کی جدائی بہت شاق گزری اور انھیں مجھ سے بھی زیادہ صدمہ ہوا۔ اگر وہ ہندوستان آتے تو آج میرے ساتھ کسان اور بنکر کی سیدھی سادی زندگی کا لطف اٹھا رہے ہوتے۔

ہم تیسرے درجے کا ٹکٹ لینا چاہتے تھے مگر پی۔ اینڈ او (P. & O.) کے جہاز میں تیسرا درجہ ہی نہیں تھا، اس لیے مجبوراً دوسرے درجے میں سفر کرنا پڑا۔ چند روز میں ہم بمبئی پہنچ گئے[4]۔ دس سال کی جلاوطنی کے بعد وطن کی صورت دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ دل ہی جانتا ہے۔ گوکھلے باوجود اپنی صحت کی خرابی کے مجھ سے ملنے بمبئی تک آئے تھے۔ ان کی تحریک پر یہاں میرا استقبال کیا گیا۔ میں دل میں یہ امید لیے ہوئے آیا تھا کہ ان کا دامن تھام لوں گا تو میرا بوجھ ہلکا ہو جائے گا، مگر تقدیر کا کچھ اور منظور تھا۔

اس کے بعد گاندھی جی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، جسے نیا دور کے قارئین سے، شاید کوئی شخص بیان کرے۔ میں، جو گاندھی جی کے لفظوں میں یہ کہانی سنا رہا تھا، اب اجازت چاہتا ہوں۔

---

[1] PLEURISY

[2] اکتوبر میں آئے تھے۔

[3] انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ

[4] ۱۹ دسمبر کو روانہ ہوئے۔ ۹ جنوری ۱۹۱۵ء کو۔

★

اے باپو

نازش پرتاپ گڑھی

حق گو رہا ہے تلخیِ گفتار کے بغیر — تو وہ گُلِ عجیب جو ہو خار کے بغیر

بولا نہ تو بلندیِ افکار کے بغیر — آگے بڑھا نہ جرأتِ رفتار کے بغیر

عُمرِ عزیز کاٹ دی تکرار کے بغیر — دشمن سے بھی ملا نہ کبھی پیار کے بغیر

تو تھا وہ بے نیاز مُعلّم کہ تیری بات — سب مانتے رہے ترے اصرار کے بغیر

تو نے دیا زمانے کو یہ درسِ زندگی — جینا عبث ہے عظمتِ کردار کے بغیر

تھا اس قدر بلند کہ اپنی خطائیں بھی — تو مانتا رہا کسی تکرار کے بغیر

بتلا گیا ہے سینے پہ تو کھا کے گولیاں — انساں نہ بن سکے گا کوئی پیار کے بغیر

چل کر ترے اصولوں پہ ہم نے دکھا دیا — ممکن ہے فتح خنجر و تلوار کے بغیر

گُم کردگانِ ہوش و خرد سے بتا گیا — مذہب کا احترام ہو پیکار کے بغیر

احسان ہے اہلِ ہند پہ تیرا کہ تجھ سے قبل — ہم تھے عمل کی دولتِ بیدار کے بغیر

تشنہ رہے گا واقعتاً اس صدی کا ذکر — تیرے شعور و فکر کے اقرار کے بغیر

" اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتا رہا ہے ہاتھ میں تلوار کے بغیر"

جشنِ صد سالہ کے دھندلکے میں

علی جواد زیدی

ہم کیا ساری دنیا باپو کا جشن صد سالہ منانے جا رہی ہے۔ یہ ان کی صد سالہ برسی نہیں ہے بلکہ جشن ولادت ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ وہ ہم میں تھے اور ہماری رہنمائی کر رہے تھے۔ ان کی صحت اتنی اچھی تھی کہ اگر ان کی شہادت نے انھیں اتنے جلد ہم سے چھین نہ لیا ہوتا تو وہ آج بھی زندہ ہوتے اور ہم ان کا صد سالہ جشن پیدائش مناتے ہوتے۔ آج بھی منا رہے ہیں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

وہ یقیناً زندہ ہیں، کیونکہ ان کے کارنامے زندہ ہیں اور اس لیے ہم ان کا صد سالہ جشن ولادت منانے میں ایک اچھی روایت کی پیروی کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو ہمارے جذبات کچھ اور ہوتے اور اس جشن کی نوعیت ہی کچھ اور ہوتی۔ آزادی کے بعد ہم نے مشہور ہندی انجینیر وسویسوریا کا صد سالہ جشن منایا تھا۔ وہ گاندھی جی کی سی عظمت کے مالک نہیں تھے، پھر بھی ہمارے دل خوشی اور مسرت سے لبریز تھے کہ ہم ہندیوں میں ایسی ہستی بھی ہے۔ سارے ملک میں خوشی تھی، اب سے کچھ پہلے ہم نے ایک اور عظیم ہندستانی کا جشن صد سالہ منایا، رابندرناتھ ٹیگور، جس نے علم و فن کی دنیا میں اسی طرح ہندستان گیر ہی نہیں عالمگیر شہرت حاصل کی جیسے گاندھی جی نے سیاست کی دنیا میں دھومیں مچا دی تھیں۔ مقابلے ہمیشہ ناخوش گوار ہوتے ہیں۔ میں نے دونوں ہی سرچشموں سے فیض حاصل کیا ہے، لیکن حالی کی طرح بس یہ کہہ کر خاموش ہو جانا چاہتا ہوں کہ

ہے ادب شرط، منھ نہ کھلوائیں

ابھی جشن صد سالہ کو سال بھر باقی ہے لیکن ساری دنیا بڑے انہماک اور خلوص کے ساتھ بہت پہلے سے تیاریاں کر رہی ہے۔ ہر شخص، ہر ادارہ اور ہر ملک اپنی حیثیت اور ہمت کے مطابق تقاریب کا لائحۂ عمل مرتب کر رہا ہے۔ مجھے بھی اسی طرح خوشی ہو رہی ہے جیسے سورج کی پہلی کرن کو چوم کر سمندر میں قطرہ اور میدان میں ذرّہ خوش ہوتا ہوگا کہ اس کے چمکنے کا بھی لمحہ آگیا۔ گاندھی جی میرے قریب، اتنے قریب محسوس ہو رہے ہیں جیسے وہ مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہوں — لیکن — مجھے گفتگو کا رُخ بدل دینا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ ذاتی تصورات کے اظہار کو لوگ شاعری سمجھنے لگیں۔

گاندھی جی اب ہم میں نہیں بھی ہیں اور ہیں بھی۔ تو پھر کہاں ہیں؟ کیا اُن چمکیلی کتابوں میں ہیں جو وفات کے بعد بلا مبالغہ سیکڑوں کی تعداد میں لکھی جا چکی ہیں یا پلیٹ فارم کی ان تقریروں میں ہیں، جن سے آج بھی سیاسی اور فکری دنیا گونجتی رہتی ہیں، یا ان جگ مگ کرتے طاقوں میں ہیں، جہاں ان کی مورتیاں سجا دی گئی ہیں؟ ہاں ہاں، وہ سب جگہ ہیں لیکن کچھ اس طرح کہ گویا ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں!

گاندھی جی اپنی زندگی ہی میں پوجے جانے لگے تھے۔ ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء کی بات ہے کہ میں بمبئی اور گجرات کے بعض علاقوں میں گھوم رہا تھا۔ وہاں مجھے کچھ گجراتی گھروں میں بھی جانے اور قیام کرنے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ گاندھی جی کی مورتی بھی ایک طاقِ عقیدت میں سجائی جا چکی ہے۔ اس کے قدموں میں بھی پھول نذر کیے جاتے ہیں اور مسحور کن خوشبوئیں۔ اگر، عنبر اور عود کی خوشبوئیں — اس کا احاطہ کیے رہتی ہیں۔ مسٹر سے مہاتما گاندھی تک کی داستان سب کو معلوم ہے لیکن گاندھی جی کے پوجے جانے کا قصہ کم ہی لوگوں تک پہنچا ہوگا۔ کسی نے ان کے دیوتا ہونے کا دعویٰ

نہیں کیا لیکن محبت بھرا دل اور عقیدت بھری نگاہ بہت سی داستانیں سناتی رہتی ہے۔ گاندھی جی کو مہاتما کہنے والے تو کروڑوں تھے ہی، لیکن ان کی پوجا کرنے والے بھی موجود تھے۔ ان دونوں کے مابین ایک اور گروہ تھا جو گاندھی جی کو باپو کہتا تھا اور اس کی تعداد بھی خاصی تھی۔

لوگوں کو ہر اس ہستی سے لگاؤ تھا، جو گاندھی جی کے قریب ہو۔ جو گاندھی جی کو باپو کہتے تھے وہ ان کی شریک حیات کو 'ماں' بھی کہتے تھے۔ ان کا نام ہی کستور با[1] پڑ گیا تھا۔ مہادیو دیسائی مہادیو بھائی ہو گئے تھے۔ بلکہ آشرم والے سبھی کو بھائی یا بہن کہہ کر پکارتے تھے۔ گاندھی جی کے بچوں میں کوئی بھی حلقۂ سیاست میں نہیں آیا۔ لوگ اکثر کے ناموں سے بھی واقف نہیں تھے۔ بس ایک دیوداس گاندھی تو ضرور تھے، جنھوں نے صحافت کی وجہ سے نام پیدا کیا۔ ان کو راجہ جی جیسے برہمن کی صاحب زادی منسوب تھیں اور ان کا نام "ہندوستان ٹائمز" کی ادارت سے وابستہ تھا۔ لیکن سیاست کے معاملے میں یہ بھی الگ تھلگ ہی رہتے تھے۔ گاندھی جی نے قومی سیاست کو کبھی گھریلو معاملہ نہیں بننے دیا۔ ان کا گھر، ان کا کنبہ ان کے آشرم والوں اور سیاسی کارکنوں پر مشتمل ہو گیا اور وہ اسی کے ہو رہے۔ لوگ ان سے جو گہرا لگاؤ محسوس کرتے تھے، اس میں اس احساس کو بھی بڑا دخل تھا کہ وہ مہاتما کے وسیع سیاسی اور اخلاقی کنبے کے افراد ہیں۔

یہ میں آزادی سے پہلے کی باتیں کر رہا ہوں۔ اسی زریں زمانے میں وہ قیادت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ گئے تھے۔ اس پر ان کی شہادت نے عقیدت کی ایک اور گہری تہ چڑھا دی —— عوام کے دلوں میں گاندھی جی کے لیے اعتقاد و محبت بھی بڑھ رہے۔ ایسے لوگ بھی تھے جو ان کی زندگی ہی میں ان کی مخالفت کرنے لگے تھے۔ ان میں بڑی بڑی سیاسی ہستیاں بھی تھیں۔ ان میں سیاسی مربی بھی تھے اور سیاسی حریف بھی، انگریز نواز بھی تھے اور انگریز دشمن بھی، اشتمالی خیالات رکھنے والے بھی تھے اور فرقہ پرست بھی۔ کوئی ان کے لباس فقیری کی تضحیک کرتا، کوئی ان کے فلسفۂ عدم تشدد کا مذاق اڑاتا، کوئی انھیں کورا رجعت پسند مانتا اور کوئی انھیں شہرت پسند تک کہہ ڈالتا۔ کوئی انھیں مسلم دوست اور مصلحت باز قرار دیتا اور انھیں ہندو پرور اور ماضی پرست کہتا۔ ہماری زندگیوں ہی میں تیس پچھلی چند صدیوں میں، کسی کی ذات نے اتنے متضاد جذبات نہیں ابھارے اور اگر ابھارے بھی تو عقیدت اور نفرت کے جذبات میں اتنی گہرائی نہیں آئی کہ کچھ لوگ پوجا کریں اور کچھ جان کے دشمن ہو جائیں۔ اگر غور کیجیے تو مفکروں اور مصلحوں کے ہجوم میں جن لوگوں نے جامِ شہادت پیا اور جن کی پوجا کی گئی، ان سب کی زندگیوں کا انداز یہی تھا۔

دوستوں کی تو بات ہی نہ کیجیے۔ ان کے تو دشمن بھی ان کے دوست تھے اور ان دوستوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ مخالفوں اور موافقوں کے اس ہجوم میں ایک بات خاص طور سے سامنے آتی ہے کہ جو بھی ان سے ملتا، جو بھی ان کے خیالات اور زندگی کی خلوت میں جھانکتا وہ متاثر ضرور ہوتا، چاہے یہ تاثر عقیدت مندانہ ہو یا معاندانہ!

ذرا اس کارواں پر نظر دوڑائیے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، خان عبد الغفار خاں، خان عبد الصمد خاں، خان عبد القیوم خاں، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، کنور محمد اشرف، میاں افتخار الدین، منظر علی سوختہ، حیات رشید انصاری، بہن امتہ السلام، مولانا حسین احمد مدنی —— ان میں کوئی مفسر ہے، کوئی خطیب، کوئی ادیب و صحافی ہے، کوئی طبیب، کوئی فقیہ و صوفی ہے تو کوئی ڈاکٹر، کوئی معلم ہے تو کوئی مصلح، کوئی رئیس ہے تو کوئی "بادشاہ"، کوئی بوڑھا ہے تو کوئی نوجوان، کوئی بارئیش و بردت ہے تو کسی نے چار ابروؤں کا صفایا کرا رکھا ہے۔ اور سب کسی نہ کسی حیثیت سے گاندھی جی سے رابطہ رکھتے ہیں۔ ان میں کنور محمد اشرف کی طرح کے پکے کمیونسٹ اور مخالف بھی ہیں، میاں افتخار الدین کی طرح کے متشکک بھی اور خان عبد الغفار خاں اور خان عبد الصمد خاں جیسے احباب بھی جو علی الترتیب "سرحدی گاندھی" اور "بلوچی گاندھی" کے خطابوں سے سرفراز ہوئے۔ اس میں مولانا شوکت علی اور خان عبد القیوم خاں جیسی ہستیاں بھی ہیں، جو بعد میں اس سے کٹ کے جدا ہو گئیں، لیکن یہ سب گاندھی جی کے حلقہ بگوش رہ چکے ہیں۔ منظر علی سوختہ نے تو اناؤ (یو۔ پی) کے قریب اپنا ایک جداگانہ آشرم بنا لیا تھا۔

اب ذرا دوسری فہرست دیکھیے۔ سی۔ آر۔ داس، سوبھاش چندر بوس، موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، رفیع احمد قدوائی، پرشوتم داس ٹنڈن، راج گوپال اچاریہ، بھولا بھائی دیسائی، آصف علی، راج کماری امرت کور، جیو راج مہتا، مولانا ابو الکلام آزاد، پٹابھی سیتا رامیہ، اچاریہ نریندر دیو،

---

[1] 'با' گجراتی میں ماں کو کہتے ہیں

یوسف مہر علی، اچیت پٹوردھن، سردار پٹیل، جواہر لال نہرو۔ سب کانگریس سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ ان میں مخالفین، متشککین اور موافقین سبھی ہیں۔ ان میں بھی سبھی طبقات، سبھی خیالات کے لوگ ہیں۔ چونکہ ان میں سے سبکے بارے میں عام طور سے لوگ واقف ہیں، اس لیے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سب کو ایک پلیٹ فارم پر ایک جھنڈے تلے جمع کر دینا، پنڈت مدن موہن مالویہ سے اچھوت ادھار کا کام لینا اور سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو کو کھدر پہنوا دینا، سرحدی پٹھان عبدالغفار خان کو اہنسا کا قائل کر دینا معمولی قائد کا کام نہیں تھا۔

اب یہ کارواں بھی ایک ایک کر کے بکھرتا جا رہا ہے۔ سیاسی اسٹیج پر نئی نئی ہستیاں نظر آ رہی ہیں، لیکن ابھی تک ہندستان کی فضا پر گاندھی جی کی شخصیت چھائی ہوئی ہے اور یہ اسی کا فیض ہے کہ گرد و پیش کے تمام ملکوں کے مقابلے میں ہندستان میں سب سے زیادہ سیاسی استحکام ہے۔ اور یہ انھیں کی دور رس سیاست اور جواہر لال نہرو کی قیادت کا کرشمہ ہے، کہ ہندستان منظم اور منصوبہ بند طریقے پر ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور تشدد کے بغیر خالص جمہوری طریقوں سے آگے بڑھ رہا ہے۔

کچھ لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ اگر گاندھی جی ہوتے تو کیا ہوتا؟ مجھے یہ سوال کچھ بے معنی سا لگتا ہے۔ کیا وہ آج ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کی کتاب ہمارے سامنے کھلی ہوئی ہے، ان کے الفاظ کتابوں کے سینے پر نقش ہو چکے ہیں۔ ہم بتا سکتے ہیں کہ آج اگر وہ ہوتے تو کیا کرتے اور کیا نہ کرتے۔ بعض اوقات وہ کچھ عجیب فیصلے کر لیتے تھے۔ اپنے دل کی آواز پر چلتے تھے کیوں کہ انھوں نے سیاست میں عشق کا فلسفہ چلایا تھا۔ اسی لیے وہ دل کے قریب ایک قوی پاسبان عقل رکھنے کے باوجود کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دیتے تھے!

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ایسے لمحوں میں جب گاندھی جی کوئی بات کرتے تو لوگ متحیر ہو جاتے تھے۔ جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے نوجوان جھنجھلا اٹھتے تھے، لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہوا کہ دوسروں کی عقل غلط اور گاندھی جی کا دل صحیح رہنما نکلا۔ انھوں نے غلطیاں بھی کیں اور ایک بار انھوں نے اپنی ایک "ہمالیائی غلطی" کا اقرار بھی کیا۔ غلطی کرنے کے بعد وہ اس پر اڑے نہیں رہتے تھے۔ وہ فوراً غلطی کا اعتراف کر کے اس کی تلافی کی کوشش کرتے۔

گاندھی جی عدم تشدد کے پیامی تھے لیکن تشدد نے ان کی زندگی کا سفر مختصر کر دیا۔ کچھ عجیب بات ہے کہ جن بانوں کو تشدد کے بل بوتے پر گنگ کرنے کی کوشش کی گئی وہ نہ صرف یہ کہ اور زیادہ شیرینی اور دلکشی سے چہکتی رہیں بلکہ ان کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی ان کی آواز بازگشت اپنے دیس کی سرحد کو پار کر کے بدیس میں بھی پہنچی اور وہاں بھی نادیدہ رشتہ پیدا کر لیے۔ آج دنیا کے کونے کونے میں گاندھی جی کے جلائے ہوئے دیئے جگمگا رہے ہیں اور ہر قوم و ملت کے لوگ صد سالہ جشن کی تیاری میں مصروف ہیں۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر مصلح اور پیغامبر کی بات اس کی زندگی میں مان ہی لی جائے اور یہ تو خیر ناممکن ہے کہ سبھی مان لیں۔ آج تک کسی ایک بات پر دنیا متفق نہیں ہو پائی اور ہونا بھی نہیں چاہیے، ورنہ تحقیق اور ترقی کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ لیکن بات میں اتنا وزن اور آواز میں اتنا خلوص تو ہونا ہی چاہیے کہ مخالف اور موافق دونوں چرچا کرنے پر مجبور ہوں۔ مصلح اور صاحبِ پیغام کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دے۔ گاندھی جی میں صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔

میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو کوئی بھی بات آنکھیں بند کر کے مان لیتے ہیں۔ میں تصدیق اور انکار دونوں ہی سروں کو چھونے کے پہلے، تشکیک کی صبر آزما اور دشوار گزار راہوں سے ضرور گزرتا ہوں۔ گاندھی جی کی ذات اور ان کا فلسفۂ حیات اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مثلاً سیکھ لینے کے بعد بھی میں نے چرخا کبھی نہیں کاتا، پرارتھنا سبھاؤں کی افادیت کا قائل ہوتے ہوئے بھی ان کی طرف دل کبھی نہیں کھنچا، لیکن میں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ گاندھی جی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ لائقِ اعتنا نہیں ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، لیکن گاندھی جی سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ اب سے کوئی تیس برس پہلے میں نے ان کے فلسفے سے شاعرانہ بحث کرتے ہوئے جہاں یہ اعتراف کیا تھا کہ "یہ فلسفہ ہے قندِ مکرر لیے ہوئے"، وہاں اس کا بھی اظہار کیا تھا کہ ع "یہ سب کے بس کی بات نہیں، اے مہاتما!" اور لفظِ "سب" میں شاعر کی ذات بھی شامل تھی۔

گاندھی جی نے اپنی خود نوشت سوانح حیات کا نام "تلاشِ حق" رکھا۔ انھوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انھوں نے مکمل اور مطلق حق و صداقت

مہاتما گاندھی کے بچپن کی ایک تصویر

جانسبرگ میں بیرسٹر کی حیثیت سے

جنوبی افریقہ میں بحیثیت
ایک ستیہ گرہی

ہر لمحہ مشغول

رہبر کارِ راہ پر

کو پالیا ہے، لیکن انھوں نے یہ ضرور کہا کہ وہ حقیقت کی تلاش کر رہے ہیں۔ یہ تلاش اور جستجو آخر وقت تک جاری رہی۔ حقیقت کوئی جامد شے نہیں ہے کہ ایک بار دیکھ لے اور ایک بار ڈھونڈھ کے پھر کبھی اور ڈھونڈھنے یا پرکھنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ حقیقت سیال اور پہلو دار تجربہ ہے جس کی پہلو داری ہمیشہ تلاش کے نئے گوشے نکالتی رہتی ہے اور چونکہ حقیقت ایک بے کار تصور نہیں، خیال محض نہیں اس لیے اس کو پانے کے لیے اس کی ماہیت کی نئی بازیافت کے لیے، اس کو نئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کوششیں بھی ہمیشہ جاری رہیں گی۔ یہ صورتِ حال صرف مادّی دنیا میں نہیں بلکہ روحانی دنیا میں بھی ــــ اگر کوئی قائل ہو تو ــــ پائی جاتی ہے۔

اس تلاش کے سلسلے میں گاندھی جی نے بہت سے تجربے کیے۔ یہ تجربے ان تجربوں سے مختلف ہیں جو ٹالسٹائے، سری آروبندو گھوش یا کارل مارکس نے کیے ہیں، لیکن غور کیجیے تو اِن میں بہت سی مشابہتیں ہیں، ایسی مشابہتیں جن کی کڑیاں صدی در صدی کا چکر دے کر ہمیں "ست جگ" تک پہنچا سکتی ہیں اِن میں کسی "گوتم بدھ"، کسی "بھگوان مہاویر"، کسی "امیر خسرو"، کسی "نظام الدین اولیا"، کسی "سقراط" کی جھلک دکھائی دے سکتی ہے۔ سچائی کی شاہراہِ اعظم پر ہزاروں چھوٹی چھوٹی شاہراہیں آکر مل جاتی ہیں۔

گاندھی کا پیغام "اہنسا" تھا۔ امن اور عدم تشدد کی بات نئی نہیں تھی۔ اکثر مصلحین کے لبوں پر اِن لفظوں کی موجیں مچلتی رہی ہیں، لیکن جس انداز سے، جن لفظوں میں، جس نفسیاتی لمحے میں یہ بات باپو کے منھ سے نکلی اُس نے اسے عالمی اور انقلابی معنویت دے دی۔ میں نے اپنی مذکورہ نظم میں یہ بھی کہا تھا کہ

اُن کے بول ہیں "عیسیٰ کے منھ کے بول ہیں، گوتم کے دل کی بات" گاندھی جی کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے صدیوں پرانے مگر امر حقیقت کو پھر سے زندہ کر دیا۔ ربّانی پیغام پہنچانے والوں کے لیے بھی یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ نیا پیغام ہی پہنچائیں، ربّانی پیغام عموماً ابدی پیغام ہوتے ہیں، لیکن گاندھی جی نے ربّانی پیغامبر ہونے کا دعویٰ ہی کب کیا، جو ہم اُن سے اس قسم کے مطالبے کریں۔ پرانے پیغامات کی نئی تشریح و تعبیر، موجودہ حالات پر اُن کا تطابق یہ بھی ضروری کام ہے، اہم کام ہے۔ گاندھی جی کے فلسفۂ اہنسا کا سرچشمہ "بھگوت گیتا" کی تعلیمات ہیں، لیکن گاندھی جی نے اسے ایسے طریقے پر پیش کیا کہ جن لوگوں پر "بھگوت گیتا" کے رموز و اسرار کے دروازے نہیں کھلے ہیں وہ بھی اس پیامِ امن سے یگانگت محسوس کرتے ہیں۔

ہماری اخلاقی زندگی میں مذہب کو بڑا دخل رہا ہے، دراصل ہمارے بیشتر اخلاقی پیمانے مذہبی ہیں۔ انگریزوں نے مذہب کو کاروبارِ سلطنت میں بھی ایک ایسے حربے کے طور پر استعمال کیا جس کا کام ملک کی وحدت کے تصور کو ختم کرنا تھا۔ ہندستان میں بھی اور بیرونِ ہند بھی کبھی کبھی مذہب کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے لیکن اسے صرف چند مفاد پرستوں نے وقتی حربہ بنایا اور پھر ہماری مضبوط جغرافیائی، اخلاقی اور سماجی وحدت اس وقتی بدمزگی اور کشیدگی پر غالب آگئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری طویل سیاسی تاریخ فرقہ وارانہ فسادات کے ذکر سے خالی ہے لیکن انگریزی سامراج نے ہماری تاریخ اور تہذیب کا ایسا کریہہ تصور اُبھارنا شروع کیا کہ افتراق پسند طاقتیں زور پکڑتی گئیں۔ گاندھی، نہرو، پٹیل، آزاد، عبدالغفار خاں، سبھاش چندر بوس سب نے کیا کیا جتن نہ کیے کہ ملکی وحدت برقرار رہے، لیکن سامراج یہاں سے جانے سے پہلے ہماری ملکی وحدت پر سب سے کاری ضرب لگا گیا۔ گاندھی جی نے مذہب کے نام پر اس تخریب کاری کا خاتمہ کرنے کے لیے مذہب کو اعلیٰ اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہا۔ جب یہ اعلیٰ اخلاقی مقاصد سیاست کے سانچے میں ڈھالے گئے تو سیاسی اصولوں نے بھی اخلاقی اہمیت اختیار کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ صرف سیاسی مقصد ہی نہیں بلکہ ذریعۂ حصولِ مقصد بھی اہم بن گیا۔

جب گاندھی جی نے سیاست میں قدم رکھے تو انھیں تشدد پسندوں اور دہشت انگیزوں کے ایک طبقے کے خیالات سے بھی برسرپیکار ہونا پڑا۔ اِن لوگوں کا اُس دور کے نوجوانوں کی ایک ٹولی پر خاصا اثر تھا۔ بعض صوبوں مثلاً بنگال وغیرہ میں اِن کے ماننے والے بہت تھے۔ اس کے علاوہ اشتراکی اور انتہائی نقطہ ہائے خیال کے لوگ تھے جو دہشت پسندی کو تراج سمجھتے تھے لیکن اصولی طور پر اس بات کے قائل تھے کہ اگر مقاصد نیک ہوں تو اُن کے حصول کے لیے جو ذریعہ بھی مفید ہو اُس کا استعمال جائز ہوگا۔ گاندھی جی نے مقاصد اور ذرائعِ حصول کی بحث چھیڑ دی۔ اگر اچھے مقاصد کے لیے بھی بُرے ذرائع استعمال کیے جائیں تو خیر شر سے بدل جاتا ہے۔ اِس طرح انھوں نے اپنے سیاسی تجربات کو بھی اپنی تلاشِ حق کا وسیلہ بنا لیا۔

سیاست میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو "گاندھی وادی" کہا جاتا تھا۔ یہ سیال گروہ تھا۔ مثلاً ترلوک سنگھ جو بعد میں پی، ایس، پی کے چیرمین ہوئے، مدتوں ضلع لکھنؤ میں گاندھی وادیوں کی قیادت کرتے رہے ہیں۔ سردار پٹیل اور ونوبا بھی [illegible] کا شمار اہم گاندھی وادیوں میں ہوتا تھا۔ جواہر لال نہرو کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے قائد تھے، وہ کبھی کبھی گاندھی جی سے اختلاف بھی کر لیا کرتے تھے، لیکن یہ حیرت ناک بات تھی کہ گاندھی جی نہرو ہی کو اپنا جانشین سمجھتے تھے۔ گاندھی جی کی رائے کی اصابت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن غالباً گاندھی جی کو اس کا بھی احساس تھا کہ ان کی شخصیت کے روحانی پہلو کی پوری نمائندگی جواہر لال نہرو جیسے آزاد خیال اور ترقی پسند مفکر سے نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انفرادی ستیہ گرہ تحریک کے زمانے میں انھوں نے جب یہ اعلان کیا کہ میں پہلا ستیہ گرہی اس کو منتخب کروں گا جو ہر طرح انفرادی ستیہ گرہ میں اولیت کا اہل ہو تو لوگ سمجھتے تھے کہ یہ ضرور جواہر لال نہرو یا سردار پٹیل ہوں گے۔ لیکن جب انھوں نے یہ اعلان کیا کہ پہلے ستیہ گرہی ونوبا بھاوے ہوں گے تو سب محو حیرت رہ گئے۔ بیشتر لوگ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ ونوبا بھاوے کون ہیں؟ واقعات نے ثابت کر دیا کہ گاندھی جی کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ واقعتاً ان کی تحریک کی اخلاقی قیادت ونوبا بھاوے ہی نے کی اور کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس سے الگ ہو کر سروودے تحریک کو چلا رہے ہیں اور اپنے ساتھ مشہور سوشلسٹ جے پرکاش نرائن کو بھی شامل کر لیا ہے!

ایک آخری بات اور — گاندھی جی کوئی زاہد خشک نہیں تھے۔ ان جیسے باغ و بہار سیاست داں کم ہی دیکھے گئے ہیں۔ مسکرانا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن ہنسی اور قہقہے بھی ان کے مستقل رفیق کار تھے۔ زندگی اور سیاست کا سارا بوجھ کاندھوں پر سنبھالے یوں ہنستے کھیلتے جاتے تھے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ انھیں دنیا کی کوئی فکر بھی ہے۔ ان کا تبسم اور ان کا قہقہہ دونوں ہی متعدی تھے، ہنستے تو اس بے ساختگی اور خلوص اور شدت سے ہنستے کہ سارا مجمع ہنسنے پر مجبور ہو جاتا۔ ان میں "لیڈرانہ" خشونت اور زاہدانہ یبوست کا نشان بھی نہیں تھا۔ ۳۰ جنوری کی بھیانک شام کو ہم واقعتاً روشنی، حرارت اور مسرت کی ایک بڑی نعمت سے محروم ہو گئے، لیکن جب تک جوان یادوں کے دیے روشن ہیں، اس محرومی کا ذکر بھی ناگوار گزرتا ہے۔

★

یادیں

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۳)

ہوئی ہے۔ بلاشبہ انتقالِ اختیارات کے لیے ایک موافق فضا تیار ہوئی لیکن گاندھی جی کے علاوہ اور کون تھا جو اس بدلتی ہوئی فضا سے فائدہ اٹھاتا۔

اگر عوام گاندھی جی پر نکتہ چینی کرتے ہیں یا ان کی کم قدری کرتے ہیں تو انھیں ایسا کرنے دیجیے۔ دنیا کا یہی طریقہ ہے۔ تمام بڑے آدمیوں کے ساتھ یہی پیش آتا ہے۔

اس طرح کی عظیم شخصیت کی بہترین عزت افزائی کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ عوام کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں فراہم کی جانی چاہئیں۔ اگر ہم گاندھی جی کے فلسفے کو گاؤں گاؤں پہنچائیں تو ہر گاؤں کا باشندہ یہ مطالبہ کر سکتا ہے "میں بھوکا ہوں، پہلے مجھے کھانے کو دیجیے۔ میں ننگا ہوں پہلے میری پوشش کا بندوبست کیجیے۔ میرے بچے اسکول کی سہولتوں سے محروم ہیں۔ پہلے ان کا بندوبست کیجیے۔ میں بیمار ہوں میرے پاس نہ ڈاکٹر ہے نہ دوا۔ میری خبر گیری کیجیے۔" لہٰذا میں کہتا ہوں کہ گاندھی جی کی صد سالہ سال گرہ منانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ عوام کو بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

★

گاندھی جی

یحییٰ اعظمی

سویا ہوا تھا دیس اِسے کس نے جگایا   بھارت کو اہنسا کا سبق کس نے سکھایا
کس حق کے پرستار نے، بھارت کے رشی نے   دُنیا کو پیام امن و محبت کا سُنایا
بھارت میں لڑی کس نے اہنسا کی لڑائی   اک معجزہ دُنیا کو نیا کس نے دکھایا
کس قوم کے رہ بر نے غلامی سے وطن کو   اخلاق سے، ایثار سے آزاد کرایا
کس نے یہ بلا دُور کی اس دیس کے سر سے   مدت سے تھا چھایا ہوا انگریز کا سایا

دی جس نے غریبوں کے لیے جان، وہ گاندھی
اس دیس پہ جو ہوگیا قربان، وہ گاندھی

تھا دہر میں جو امن و محبت کا بھکاری   در در جو پھرا بن کے اہنسا کا پجاری
وہ شخصیت ہند کہ تھی قوم کو پیاری   وہ ہستی ملت کہ تھی غم خوار ہماری
وہ جس کے اہنسا کی بہت ضرب تھی کاری   ایوانِ حکومت پہ تھا اک زلزلہ طاری
لاٹھی لیے تنہا تھا رہِ حق میں صف آرا   نہ فوج، نہ لشکر، نہ سپاہی، نہ سواری
اک ڈھانچہ تھا ہڈی کا مگر عزم و یقیں سے   چٹانوں پہ، کہساروں پہ، طوفانوں پہ بھاری
وہ تارکِ لذات رشی جس نے وطن میں   تا عمر غریبوں کی طرح زیست گزاری
وہ انجمن آرائے دعا جس کے قدم نے   کٹیا تھی غریبوں کی، اچھوتوں کی سنواری
کس کے دمِ جاں بخش نے نشأۃ اسے بخشی   وہ قوم کہ تھی پستی و افلاس کی ماری
تا عمر رہا گام زنِ راہِ صداقت   ہمت نہ کبھی گردشِ ایام سے ہاری
وہ مژدہ وہ موسم گل جس کے نفس سے   اُجڑے ہوئے گلشن میں چلی بادِ بہاری

گل ہوگئی افسوس، وہ شمع وطن افروز
اے کاش! حیات آج ہو اُس کی سبق آموز

کچھ اَمٹ یادیں

صالحہ عابد حسین

اونچے پہاڑوں کی سربفلک چوٹیوں کو قریب سے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان کو کافی فاصلے ہی سے اچھی طرح دیکھا جاسکتا ہے بعض شخصیتیں بھی ایسی عظیم ہوتی ہیں جن کے رتبے اور کارناموں کو پوری طرح پہچاننے کے لیے وقت کے فاصلے کی ضرورت ہوتی ہے ہمارے سب سے بڑے رہنما، محسن، ہندوستان کی آزادی کے دیوتا مہاتما گاندھی کی شخصیت بھی ایسی ہے جو زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ اور زیادہ عظیم ہوتی جاتی ہے۔ افسوس ہمارے حال پر کہ ہم ان کی بڑائی کو پوری طرح پہچان نہ پائے اور ہماری قوم اور ملک نے جیسی چاہیے تھی ان کی پیروی نہ کی۔ شاید اس کی یہی وجہ ہو کہ ہم نے ان کو بہت زیادہ قریب سے دیکھا ہے اس لیے ان کی عظمت اور ان کی تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ نہ پائے۔ یا پھر دو سو سال کی غلامی کا زہر جو رگ ریشے میں سرایت کر چکا تھا وہ ابھی پوری طرح خارج نہیں ہو سکا ہے لیکن مہاتما گاندھی کے کام ان مٹ، ان کا پیام امر اور ان کی سیرت ایسی دل کش ہے جو کبھی بھلائی نہیں جاسکتی۔

دنیا میں جتنی عظیم ہستیاں گزری ہیں، جہاں تک اُن کے حالات معلوم ہو سکے ہیں یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ سیدھے سادے عام قسم کے نیک دل شریف انسان تھے۔ ہاں ان میں کچھ ایسی صفات ضرور ہوتی تھیں جو لوگوں کے دلوں کو موہ لیا کرتی ہیں۔ حق کی تلاش، انسانی ہمدردی اور سچائی کی راہ پر چلنے کا گہرا جذبہ، ان صفات میں سب سے نمایاں اور سب میں مشترک دکھائی دیتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی زندگی، شخصیت، کام اور پیام میں بھی آپ کو یہ تینوں صفات سب سے نمایاں نظر آئیں گی۔ ساتھ ہی ان کی سیدھی سادی معصوم سی شخصیت میں اس بلا کی کشش، اُن کی بھولے بھولے انداز کی باتوں میں ایسا درد و اثر اور اُن کی آنکھوں میں پریم کی — عالم گیر پریم کی — کچھ ایسی جوت تھی جو ہر کسی کا دل موہ لیتی تھی۔

گاندھی جی نے کیا کچھ کہا اور کیا ہے اس پر سیکڑوں کتابیں، ہزاروں مضمون لکھے جا چکے ہیں اور صدیوں تک لکھے جاتے رہیں گے۔ جس شخص نے تقریباً ساٹھ سال تک اپنے وقت کا ہر لمحہ خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دیا ہو اور سچائی کو پانے اور ستیہ کو پھیلانے میں ساری زندگی بتائی ہو اُس کے کاموں کو ناپنا اس کی باتوں کو تولنا کیا آسان کام ہے؟

میں اس وقت کچھ یادوں کے وہ نقش کاغذ پر اتارنا چاہتی ہوں جو اس عظیم ہستی سے متعلق دل کے آئینے پر ثبت ہیں۔ ان میں کچھ کو میں نے آنکھ سے دیکھا ہے، کچھ کے بارے میں ایسے لوگوں سے سُنا ہے گویا میں خود ہی دیکھ رہی تھی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بارے میں آج کے زمانے کے لوگ کم ہی یہ بات جانتے ہیں کہ اس کے قائم کرنے اور اس کی بقا میں گاندھی جی کا کتنا بڑا حصہ تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب ترک موالات کی تحریک تد رپہ تھی اور ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آزادی حاصل کرنے کا جذبہ بہت شدت سے اُبھر آیا تھا، اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں (جس کو بدیسی حکومت کی امداد ملتی تھی جس طرح اور ساری یونیورسٹیوں کو ملتی تھی) مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی وغیرہ کے ساتھ مہاتما گاندھی بھی وہاں تشریف لے گئے تاکہ اُسے آمادہ کریں کہ وہ بدیسی حکومت سے مدد لینا بند کر دے۔ اس وقت کے ارباب اقتدار کو وہ اس پر تو آمادہ

نہ کر سکے مگر اسی یونیورسٹی سے سرفروش مجاہدوں کی ایک جماعت نکل آئی جنھوں نے بدیسی اثرات سے آزاد ایک ادارے کی بنیاد ڈالی جس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا۔ وہاں گاندھی جی نے کسی جلسے میں فرمایا تھا: "ہندوستان کو اگر پانچ فقیر مل جائیں تو اس کا بیڑا پار ہو جائے۔" جامعہ ملیہ کی شروع کی پچیس سال کی زندگی میں مہاتما گاندھی کو کتنے ہی ایسے فقیر نظر آئے جنھوں نے اپنا سب کچھ جامعہ کی اور اس کے ذریعے یا اس کے ساتھ ساتھ، قوم اور دیس کی خدمت میں نچھاور کر دیا۔ بڑے سے بڑا لالچ اور کٹھن سے کٹھن وقت بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکا۔ انھوں نے ہر طرح کے دکھ جھیلے مگر قوم کی خدمت اور دیس کی وفاداری اور جاں نثاری سے منہ نہیں موڑا۔ اسی لیے گاندھی جی کو اس ادارے سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ جامعہ کو اپنا گھر کہا کرتے تھے اور جامعہ والوں کو اپنے خاندان کے افراد کی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو آزادی کی سچی لگن رکھنے والا، اور ہندو مسلم اتحاد کا مرکز بھی سمجھتے تھے اور نشان بھی۔ اس کی بقا کی، انھیں، خود جامعہ والوں سے کم فکر نہ تھی۔ جب کبھی جامعہ پر کوئی سخت وقت پڑا ــــ اور کب کب نہیں پڑا ــــ گاندھی جی ہمیشہ اس کا سہارا بنے۔ انھوں نے اس کے کارکنوں کا حوصلہ بڑھایا، مصیبتوں میں ساتھ دیا، کٹھنائیوں اور مفلسی میں مالی وسائل فراہم کیے۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ کی زندگی میں بڑا سخت وقت آیا تھا جب اس کی زندگی ہی معرضِ بحث تھی۔ چند نوجوان جاں باز مجاہدوں نے اس وقت اپنی زندگی جامعہ کے لیے وقف کرنے کا اعلان کر کے اس کی بے جان رگوں میں زندگی کی روح پھونک دی اور گاندھی جی نے کسی دل والے سے پچیس ہزار کی خطیر رقم دلوا کر اس کو زندہ رہنے کا وسیلہ فراہم کر دیا ــــ یہ بیش بہا رقم اس وقت اُس سے کہیں زیادہ اہم تھی جتنی آج کے زمانے میں پچیس لاکھ بھی نہیں ہو سکتی۔

جامعہ کی تعلیم، یہاں کے رہن سہن، یہاں کی بے تعصب، ذہنی طور پر صحت مند اور بے ریا فضا انھیں بہت پسند تھی اور سادگی اور جفاکشی جو خود ان کی زندگی کا بڑا اہم جز تھی ــــ وہ بھی انھیں شاید اور ہر تعلیمی ادارے سے زیادہ یہاں نظر آتی تھی۔ دیوداس جی مہاتما جی کے چھوٹے صاحبزادے ایک عرصے تک یہاں آ کر رہے تھے۔ گاندھی جی نے اپنے پوتے رسک لال کو یہاں داخل کرایا تھا کہ وہ یہاں رہ کر تعلیم و تربیت پائے، اور خاص کر اسلام کی صحیح تعلیم کو سمجھ سکے اور صحیح معلومات حاصل کر سکے۔ اس لڑکے کا کچھ عرصے بعد جامعہ ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد گاندھی جی یہاں تشریف لائے تو دل پر کتنا سخت اثر ہوگا؟ مگر بڑے انسانوں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ رضائے الٰہی پر راضی رہتے اور صبر و شکر کے ساتھ ہر غم کو سہارتے ہیں۔ یہی نہیں ان کے دل میں اور زیادہ نرمی اور گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سخت صدمے کی حالت میں گاندھی جی نے کہا تو یہ کہا:

"جامعہ کا ہر بچہ میرا بچہ ہے۔" اور

"اب تو جامعہ پر میرا حق اور زیادہ ہو گیا ہے۔"

جامعہ کے لوگوں نے جامعہ اور قوم و دیس کی خدمت میں جس طرح جانیں کھپائیں، ایثار، تیاگ اور تپسیا کی جو کٹھن زندگی بتائی اس میں گاندھی جی کی شخصیت اور سیرت کا کتنا اثر ہوگا یہ کون بتا سکتا ہے؟ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی دل کی آنکھ کے سامنے ایک سادگی کا مرقع، ایثار، تیاگ اور قربانی کا جیتا جاگتا مجسمہ رہتا تھا۔

جامعہ کے بچوں تک کو گاندھی جی سے صرف عقیدت ہی نہیں بڑا پیار بھی تھا۔ ۱۹۴۴ء میں جامعہ کے یوم تاسیس (سالگرہ) پر بچوں نے ایک ڈراما کھیلا "جامعہ کی ابتدائی زندگی"۔ اس ڈرامے میں جامعہ کے قیام اور ابتدائی زندگی کی کہانی دکھائی گئی تھی جس میں مہاتما گاندھی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری وغیرہ کے کردار بھی تھے۔ سب سے مشکل کام گاندھی جی کا کردار نبھانا تھا مگر یہ مشکل کام جامعہ کے ایک نو عمر طالب علم محمد اقبال نے اس خوبی سے ادا کیا کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔ جب وہ سر منڈائے، گاندھی جی کا سا حلیہ بنائے، ان ہی کی سی دھوتی پہنے، عینک لگائے، لکڑی لیے اسٹیج پر آیا تو پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بات کرنے کے انداز تک کی اس خوبی سے نقل کی گئی تھی کہ سب واہ واہ کر اٹھے۔

یاد نہیں رہا کہ ۱۹۴۶ء تھا یا ۱۹۴۷ء، جب اوکھلا اسٹیشن کے قریب کستوربا بالکا آشرم میں جلسہ ہوا جس میں گاندھی جی تشریف لائے تھے۔ جامعہ کے لوگ بھی مدعو تھے۔ بہت سے استاد حضرات، بہت سے

بچے اور کچھ خواتین جامعہ، سب اس جلسے میں شرکت کرنے کے لیے پہنچے۔
جلسہ بڑی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اور جلسہ ختم ہوتے ہی لوگوں نے مہاتما جی کو گھیر لیا۔ جامعہ کے لوگوں کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ کتنے ہی قریبی تعلقات ہوں مگر بڑے آدمیوں سے پبلک جلسوں میں گھس پل کر نہیں ملتے تھے۔ مہاتما جی لوگوں سے ملتے جلتے رہے اور جامعہ کے استاد چپکے سے نکل کر اپنی بستی چلے آئے۔ مگر بچوں کا دل کیسے مانتا کہ اپنے باپو سے ملے بغیر چلے جائیں۔ کچھ بچے مجمع میں گھس پل کر گاندھی جی تک پہنچے۔ گاندھی جی مخصوص شفقت بھرے انداز سے بچوں سے باتیں کرنے لگے۔ سفید کھدر کی ٹوپی لگائے کھدر ہی کی سفید اچکن پہنے ایک چھوٹے سے بچے نے بڑے لاڈ، بڑی اپنائیت اور کچھ شکایت کے انداز سے کہا: "باپو آپ ہمارے ہاں نہیں آتے؟" باپو کا چہرہ دم بھر کو گمبھیر ہوا ہوگا پھر ایک دم مسکرا پڑے "چلو بھئی ابھی چلتا ہوں ـــــ لے چلو مجھے"۔ اور بچوں کے جھرمٹ میں، دو کا ہاتھ پکڑے گاندھی جی جامعہ کی طرف چل پڑے۔ رات کا وقت، بالکا آشرم سے لگ بھگ ایک میل کا فاصلہ، مگر اس کی انھیں کیا پروا تھی۔ کچھ بڑی عمر کے لڑکے گھبرائے کہ جامعہ میں کسی کو پتہ بھی نہیں ہے کہ گاندھی جی آ رہے ہیں، کیسے ان کا استقبال ہوگا؟

یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ الجامعہ (موجودہ صدر جمہوریہ ہند) تک کے پاس کار نہ تھی اور سبھی لوگ بے تکلف میلوں پیدل گھوما کرتے تھے احساس کمتری کا تو ذکر ہی کیا ہے ان کو اس طرح پیدل چلنے میں وہ فخر اور شان محسوس ہوتی جو آج موٹر میں گھومنے والے جامعی بھی نہیں محسوس کر سکتے۔ خیر تو میں بتا رہی تھی کچھ بڑی عمر کے لڑکے گھبرائے کہ کیسے باپو کا سواگت ہوگا ـــــ مگر بچوں کو اس کی فکر نہ تھی۔ وہ تو ان کا ہاتھ تھامے انھیں اپنے ـــــ اور ان کے ـــــ گھر لا رہے تھے اور خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ گاندھی جی سے آگے بڑھنا بے ادبی تھا مگر بڑے لڑکے راستہ کاٹ کر بھاگتے ہوئے جامعہ کی مرکزی عمارت میں پہنچے۔ وہاں مقیم اساتذہ کو صورتِ حال بتائی، جلدی جلدی مدرسۂ ثانوی کے لان میں دری بچھائی اور گاؤ تکیہ رکھ دیا۔ بجلی تو تھی نہیں لالٹینوں وغیرہ کی روشنی کی۔ دو ایک لڑکے ڈاکٹر ذاکر حسین و ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ کے پاس دوڑے گئے۔ ہم سب لوگ جوش اور محبت میں کھانا وانا چھوڑ جلدی جلدی جامعہ کی طرف لپکے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گاندھی جی دری اور چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیے کے سہارے شمعِ محفل بنے بیٹھے ہیں چہرے پر وہ مسکراہٹ ہے جو بچی مسرت کے وقت نظر آتی ہے۔ اور پروانوں کی طرح ان کے ہر طرف بچوں کا ہجوم ہے۔ یہ لوگ بھی اس شمع نور کے پروانوں میں شریک ہو گئے۔ اِن کو دیکھ کر گاندھی جی ہنسے "دیکھو یہ بچے مجھے پکڑ لائے ـــــ آج تو میں انھیں کا مہمان ہوں"۔ بچے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے اور گاندھی جی بڑے پیار سے جواب دے رہے تھے۔ یکایک ایک بچے نے پوچھا: "باپو آج کل دیس میں بڑے جھگڑے فساد ہو رہے ہیں ـــــ ہم لوگوں کو اس وقت کیا کرنا چاہیے؟" یہ سوال سن کر گاندھی جی بہت متاثر ہوئے بولے: "مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے یہ پتے کی بات پوچھی"۔ اس کے بعد دیر تک لڑکوں کو ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت اور ایکتا کی ضرورت سمجھاتے رہے۔ مجھے گاندھی جی کے بالکل صحیح الفاظ تو یاد نہیں لیکن انھوں نے کہا وہی تھا جو اکثر کہا کرتے تھے کہ ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہاں کے سب لوگ، جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی سب شامل ہیں، سچی دوستی اور گہری محبت کے ساتھ بالکل ایک بن کر نہ رہیں۔ تم میں سے ہر ایک کا یہ فرض ہے ـــــ آج بھی اور آئندہ بھی ـــــ کہ اپنے بس بھر ایکتا اور اتحاد کے لیے کام کرے ـــــ نفرت، دشمنی اور بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دے اور سب کے ساتھ بھائیوں کی طرح مل جل کر رہے اور مظلوم کی حمایت کے لیے اگر اپنی جان بھی دینی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے۔ یہ در اصل ان کا محبوب موضوع تھا جن پر ان کی متعدد تقریریں اور بیانات وغیرہ کتابوں اور رسالوں میں ملتے ہیں۔

دس بجے رات تک گاندھی جی ان بچوں میں بالکل ایک بن کر ہنستے بولتے رہے، نصیحتیں کرتے رہے، ان کی باتیں سنتے اور خوش ہوتے رہے۔ بچوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا ـــــ اس وقت وہ یہ تو نہ جانتے تھے کہ ہندوستان کیا دنیا کے سب سے بڑے آدمی کی میزبانی کا شرف انھیں حاصل ہوا ہے، ہاں یہ احساس تھا کہ ہم اپنے باپو کو لے کر آئے ہیں۔ بعد پھر اس سال پورے سیشن گاندھی جی کی یاد بچوں کا موضوعِ سخن بنی رہی۔
آخری بار گاندھی جی جامعہ میں آزادی کے بعد تشریف لائے۔ کاش یہ آنا آزادی کے لیے منائے گئے جشن میں ہوتا جب ہم سب لیے

سرد اور رہنما کے ساتھ مل کر آزادی کی خوشیاں مناتے۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے اور وہ ہمیں آئندہ کے لئے راستہ بتاتے۔ مگر افسوس کہ یہ آمد اس وقت ہوئی جب جامعہ چاروں طرف سے خطروں میں گھری تھی اور جامعہ اور جامعہ والوں کی زندگی اور موت کا سوال درپیش تھا۔ دلی میں چاروں طرف فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی، سارے پاکستان میں اور ہندوستان میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی، اور اس وقت ہندوستان کا نجات دہندہ امن کا دیوتا، آزادی کا علمبردار، جس کا دل خون ہو رہا تھا، دلی پہنچا — دلی — جو ہندوستان کا دل ہے — آج اس دل کی اور اس طرح پورے دیس کی اور انسانیت کی حفاظت کا بار اس نحیف و نزار بوڑھے انسان کے کندھوں پر آ پڑا تھا جس کے سینے میں بہت بڑا بہت مضبوط دل تھا، دماغ میں آہنی عزم اور مقصد کی سچی لگن تھی۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی دلی پہنچے تو لوگوں سے فوراً ہی جامعہ والوں کی خبر دریافت کی اور اگلے دن بے خبر جامعہ نگر آن پہنچے۔

جامعہ میں اس وقت آس پاس کے گاؤں کے لٹے اور مصیبت زدہ کئی سو مرد عورت اور بچے پناہ گزیں تھے۔ وہ لوگ اور خود جامعہ والے، ان کے بال بچے سب جامعہ کی مرکزی عمارتوں میں رکھے گئے تھے کہ ایک جگہ کی حفاظت نسبتاً آسان ہوتی ہے۔ ایک قسم کی فوجی تنظیم سی کر دی گئی تھی۔ لوگوں کی ڈیوٹیاں بٹی ہوئی تھیں۔ نوجوان اور صاحب عزم لوگوں نے پہرہ دینے اور کمزوروں کی حفاظت کا کام اپنے ذمے لیا تھا، سارا کام بڑے ڈسپلن کے ساتھ ہو رہا تھا اور اس چھوٹی سی ٹولی کے سردار اور رہنما ڈاکٹر ذاکر حسین تھے جو موت اور خوف سے بے نیاز سب کی حفاظت اور سیوا کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے بے تکلف جامعہ کے اندر اور شہر میں گھوما کرتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے حکم سے بڑے نازک وقت پر کچھ فوجی سپاہی حفاظت کے لیے پہنچ چکے تھے۔

دس ستمبر کو لوگوں نے دیکھا کچھ موٹریں چلی آ رہی ہیں۔ الٰہی خیر۔ جانے دوست یا دشمن؟ مگر ایک موٹر میں اپنے سب سے بڑے دوست اور محبوب سردار کا چہرہ دیکھ کر ٹوٹے دلوں کی ڈھارس بندھی، بہادروں کا عزم اور بڑھا۔ مگر یہ چہرہ جو ہمیشہ اپنے ان "عزیزوں" کو دیکھ کر دلی مسرت سے دمک اٹھتا تھا اس وقت گمبھیر اور اداس تھا۔ دل کا درد آنکھوں سے ٹپک رہا تھا۔ ان کے ساتھ اور کئی لوگ اور اخباروں کے نمائندے وغیرہ تھے۔ مگر جامعہ والوں کو اور کسی سے کیا مطلب! ڈاکٹر ذاکر حسین نے بڑھ کر استقبال کیا۔ ان کے ساتھ گاندھی جی آگے بڑھے۔ ایک طرف جامعہ کے مستعد کارکنوں نے مصیبت زدہ پناہ گزینوں کو قرینے سے بٹھا دیا تھا، دوسری طرف جامعہ کی برقعہ پوش عورتیں کھڑی امید کے اس مینارے کو دیکھ رہی تھیں۔ ان مصیبت زدہ دیہاتی لوگوں کو دیکھ کر گاندھی جی کے دل کا درد اور زیادہ بڑھ گیا۔ ان کی درخواست پر ایک بوڑھے دیہاتی نے تفصیل سے اپنی اور اپنے گاؤں والوں کی بپتا سنائی جس کے آخری جملے کچھ اس طرح کے تھے "حضور ہمارا سب کچھ لٹ گیا۔ پہلے سب کچھ تھا اب کچھ نہیں رہا۔ ایک ایک کے پاس سو سو بھینسیں تھیں، روپیہ تھا، گھر بار تھا — کسی کی بچی مری، کسی کی ماں، کسی کا بھائی —" اور یہ کہتے کہتے اس کی آواز گلے میں پھنس گئی اور لوگ بھی رونے لگے۔ گاندھی جی کا دل تو پہلے ہی سے خون رو رہا تھا۔ اور وہ تو آئے ہی سر سے کفن باندھ کر تھے کہ یا نفرت و عداوت کی اس آگ کو بجھائیں گے یا اپنی جان دیدیں گے — مگر دعوے کرنا ان کی عادت نہ تھی۔ پھر بھی انھوں نے لوگوں کو سمجھایا، دلاسا دیا۔ ان کا یہ کہنا "میں یہاں دلی آیا ہوں تو کچھ کروں گا — یا پھر اپنی جان دیدوں گا — آپ خدا سے اپنا دھیان لگایئے — ڈریئے نہیں — بھاگیے نہیں —" ان چند جملوں ہی نے ٹوٹے دلوں پر مرہم رکھا، خوف اور دہشت کو دور کیا۔ مگر اس وقت کون جانتا تھا کہ یہ اس مرد خدا کا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا نہیں ہوتا — جو سچ مچ اپنی انمول جان اس عظیم مقصد کے لیے قربان کر دے گا۔

جامعہ کی عورتوں کو ایک طرف کھڑا دیکھ کر گاندھی جی ان سے بھی مخاطب ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسے حالات میں عورت کی پریشانی حد سے زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں کہ اپنی عزت اور اپنے پیاروں کی جان اسے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عورت کا حوصلہ بندھا رہے تو مرد کو اس سے بڑا سہارا ملتا ہے۔ وہ نراس اور بزدل نہیں ہو سکتا۔ پہلے تو گاندھی جی نے کہا: "ارے تم لوگ مجھ سے پردہ کرتی ہو — میں تمہارے باپ کے برابر ہوں —" پھر ان کی ڈھارس بندھائی۔ "دیکھو ایک دن سب کو مرنا ہے، لوگ مرتے ہی رہتے ہیں۔ مرنے سے ڈرنا کیا — یہاں سے بھاگنا نہیں، مرنا ہی ہے تو بہادری سے، ہنستے ہوئے

مرنا ـــــ ویسے فکر نہ کرو ـــــ میں آیا ہوں تو کچھ کروں گا ـــــ سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ خدا پر بھروسہ رکھو وغیرہ وغیرہ۔

گاندھی جی واپس جانے لگے تو سارا مجمع اور زیادہ قریب آگیا جیسے ان کی موجودگی امید بلکہ یقین کا ستون تھی جس کا سہارا ٹوٹنے کا ڈر ہو۔ گاندھی جی موٹر میں بیٹھے، مجمع بہت تھا، کسی نے زور سے موٹر کا پٹ بند کر دیا ـــــ گاندھی جی کا ہاتھ وہاں رکھا ہوا تھا، انگلیاں پس گئیں مگر درد و تکلیف کا جو احساس بھی ہوا ہو چہرے پر اس وقت بھی شفقت بھری مسکراہٹ اور درگزر کا سچا احساس تھا۔

یہ جواہر لال نہرو کی کوشش، گاندھی جی کی جان کی بازی لگانے کا عزم اور سب سے بڑھ کر اس خدا کی مدد تھی (جس پر سب سے بڑھ کر خود گاندھی جی کو بھروسہ تھا) کہ جامعہ اور جامعہ والے نہ صرف اس خون خرابے کی خوفناک فضا سے بلکہ ساتھ ہی نفرت اور تعصب، تنگ نظری اور خوف کی بیماریوں سے بھی محفوظ رہے۔ اور پھر سبھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کو اس لعنت سے بچانے کے لیے گاندھی جی نے مرن برت رکھا جس نے فساد کی آگ پر چھینٹے ڈالے دلی اور ہندوستان میں پھر سے امن و امان قائم ہونے لگا جس سے گاندھی جی کو دلی مسرت تھی۔

۲ فروری کو گاندھی جی نے پھر جامعہ آنے کا وعدہ کیا تھا اور جامعہ والے اس مبارک دن کا انتظار اور انتظام کر رہے تھے کہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو یہ خبر ان کے دل و دماغ کو ہلا گئی کہ ان کے محترم، محبوب چاہنے والے ہمدرد، غم گسار، سرپرست نے شہادت پائی ـــــ اس عظیم مقصد کے لیے اپنی جان نچھاور کر دی جو ان کی زندگی کا آدرش تھا یعنی ہندو مسلم ایکتا۔

افسوس جس مقصد کے لیے گاندھی جی نے اپنی جان دی تھی وہ اب تک پوری طرح حاصل نہ ہو سکا۔ کیا گاندھی جی کا اتحاد کا خواب پورا نہ ہوگا؟ کیا ان کا یہ جاں بخش پیام بے کار جائے گا؟ کیا گاندھی جی نے جس متحد، پر امن ہندوستان کا سپنا دیکھا تھا اس کی تعبیر بدامنی، بدگمانی، بے اعتمادی اور روز روز کا خون خرابا ہے؟

آیئے اس مبارک تاریخ پر جس دن ہم اپنے پیارے باپو کی شادیں سالگرہ منا رہے ہیں، سنجیدگی سے یہ سوچیں کہ جس مقصد کے لیے انھوں نے جان دی اس کی طرف ہمارا کیا فرض ہے؟ آیئے آج ہم یہ عہد کریں ـــــ ہم سب ـــــ ہم میں سے ہر ایک کہ دیس کی آزادی اور اتحاد کو قائم اور باقی رکھنے اور ہندوستان کا سر دنیا میں اونچا رکھنے کے لیے ہم تن من سے زندگی بھر کوشش کرتے رہیں گے!!

★

ہم سب کو خواہ ہم ہندو ہوں یا مسلمان۔ پارسی ہوں یا سکھ ہوں یا عیسائی۔ ہندستانی کی حیثیت سے آپس میں بھائی چارہ کے ساتھ رہنا چاہیے اور ہمارا یہ عزم ہونا چاہیے کہ ہم ایک ہی ماں کے لڑکوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی ایک رہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ایک ہی درخت کی بے شمار پتیاں ہوتی ہیں۔

ـــــ مہاتما گاندھی

امرجوت

ذکیہ سلطانہ نیّر

اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی اَبد کی جوت ہے شاید
اسی تاریک چادر کی تہوں میں
عدم کے خواب سے تاریخ جاگی
اسی تاریک چادر میں تمدن مسکرایا، کھلکھلایا، جگمگایا
یہی تاریک چادر رخا درِ تہذیب کا مشرق بنی آخر
یہی تاریک چادر اوڑھ کر حیوانیت نے روپ دھارن کر لیے لاکھوں
اسی تاریک چادر میں سمٹ کر گم ہوئی ہستی
یہی مشرق یہی مغرب
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید

اندھیرے کی اسی دیوارِ چیں کو
کبھی سقراط کی حکمت نے ڈھایا
کبھی عیسیٰ کے خونِ گرم تازہ نے کیا رنگیں
کبھی گوتم کی موسیقی کے سایوں نے اسے گھیرا
کبھی ضربِ محمدؐ نے کیا ٹکڑے
حسین ابنِ علی کے خونِ ناحق بٹ کے تھپیڑوں سے کبھی کانپی، کبھی لرزی
فضا میں ایک چنگاری سی تڑپی
اور اس کے بعد، اس کے بعد!
چھائی پھر وہی منحوس تاریکی، وہی منحوس تاریکی
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی اَبد کی جوت ہے شاید

اندھیرے کی جبینِ آہنی سے
یہ کیسی جوت پھوٹی، مسکرائی، جگمگائی
یہ کس کی مسکراہٹ سے بنی انسانیت گلشن
یہ کس نے ہند کی تاریک دُنیا کو کیا روشن
کہ جس سے دُنیا ستاروں سے بنی دلہن
ضمیرِ زندگی میں کروٹیں لینے لگی اک مستقل دھڑکن

ورق تاریخ نے تیزی سے اُلٹے
تغیّر کے سازِ دبرگِ تعمیرِ جہاں آیا
بنی آدم کی دُنیا کو سجانے
دلِ سقراط و عیسیٰ جھوم اُٹھے
جبینِ بُدھ سے نکلی اک نئی جوت
اندھیرے ہی سے پھوٹا اک نیا سوت
اندھیرا اپنی ہستی کھو رہا ہے
اندھیرا نور میں حل ہو رہا ہے
نئے دیپک کی جوتی مسکرائی
جہاں کو کر دیا روشن
جہاں کو، مانوتا کو، زندگی کو، قلبِ دجاں کو کر دیا روشن
سیہ خانے میں اپنا جال لے آئے نئے خاکے
نئی دُنیا بنانے کی تمنّا کے نئے خاکے
کہ پھر ظالم اندھیرا جنگ جو، حاسد اندھیرا
لیے تاریکیوں کے جال آیا
نگارِ امن کے دیپک پہ ٹوٹا
کبھی کرنوں کبھی دیپک کو لوٹا
زمیں سے آسماں تک موجِ خوں ہے
ابھی تک آدمی صیدِ زبوں ہے
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید

اگر سقراط کا دیپک ہے روشن
سراجِ ابنِ مریم گر ابد تک بجھ نہیں سکتا
کوئی جھونکا اگر شمعِ شہیدِ کربلا کو چھو نہیں سکتا
تو اے تاریک دُنیا! تو اے مایوس انساں!
بجھا سکتی نہیں ہے کوئی آندھی
یوں ہی روشن رہے گی شمعِ گاندھی

گاندھی جی کے سیاسی نظریے

محمد ہاشم قدوائی

گاندھی جی محض ایک سیاسی لیڈر نہ تھے بلکہ بہت بڑے معلم اخلاق اور سیاسی مفکر بھی تھے۔ ان کا شمار دنیائے عظیم سیاسی مفکروں کی صف میں ہے۔ وہ کتابی نظریوں کے معلم نہ تھے بلکہ عملی آدمی تھے۔ اس لیے ان کی سیاسی فکر یا سیاسی فلسفے میں اس قسم کی مجرد یا نظری سیاسی بحثیں نہیں ملتیں جو دوسرے سیاسی مفکرین کے ہاں ملتی ہیں۔

ان کے ذہن میں ایک نئے سماجی نظام کا خاکہ تھا جسے انھوں نے تفصیل کے ساتھ نہیں پیش کیا لیکن ان کی تحریروں میں اس کے بنیادی خد و خال مل جاتے ہیں۔ ۱۱ر فروری ۱۹۳۹ء کے ھریجن میں انھوں نے یہ لکھا کہ میں قصداً اہنسا یا عدم تشدد کی بنیاد پر قائم کردہ سماج میں حکومت کی نوعیت کے موضوع پر بحث کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ جب عدم تشدد کے اصول پر سماج بنے گا تو لامحالہ اس کا ڈھانچہ موجودہ سماج سے بالکل مختلف ہوگا۔ میں اس وقت نہیں کہہ سکتا کہ وہ حکومت کس قسم کی ہوگی۔

اگر وہ ہمارے ملک کی دستور ساز اسمبلی کی کارروائیوں میں حصہ لیتے تو غالباً وہ اس کی تفصیل پیش کرتے۔

ان کے سماجی نظام میں آج کی مرکزی اور طاقتور مملکت کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ مملکت (STATE) کے مخالف تھے اور اس بارہ میں وہ ٹالسٹائے کے ہم خیال تھے۔ وہ اسٹیٹ کے اس لیے مخالف تھے کہ ان کے نزدیک یہ تشدد کی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ ان کے خیال میں اس کا وجود تمام تر تشدد پر ہے اور یہ تشدد کو منظم طریقے سے کام میں لاتی ہے۔ یہ افراد کو اپنے احکام کی تعمیل کرنے پر قانون، پولیس، فوج، عدالتوں اور جیلوں کے زور سے مجبور کرتی ہے۔ بغیر طاقت کے یہ اپنے فیصلے نہیں منوا سکتی۔ موجودہ مملکت، طاقت و قوت کے لحاظ سے عہد قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ کی مملکت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اس لیے کہ ساری قوت اس میں مجتمع اور مرتکز ہوتی ہے۔

مملکت کی قوت اور طاقت فرد کی آزادی اور شخصیت کے لیے سم قاتل ہے اور وہ اسے بالکل ختم کر دیتی ہے۔ فرد روحانی ترقی اس وقت کر سکتا ہے جب اسے پوری آزادی حاصل ہو لیکن مملکت کا اختیار و اقتدار اس کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ مملکت کے اختیارات جتنے زیادہ وسیع ہوں گے اتنی ہی زیادہ انسان یا فرد کی انفرادیت ختم ہوگی۔ فرد کی روح ہوتی ہے لیکن مملکت ایک بے روح مشین ہے جو اپنا وجود ظلم و تشدد کی وجہ سے قائم کیے ہوئے ہے۔

اس بات میں وہ نہ صرف ٹالسٹائے بلکہ پرادھان (PROUDHAN) باکونن (BAKUKIN) اور کروپٹکن (KROPTKIN) کے ہم خیال تھے۔ لیکن گاندھی جی مملکت کو اخلاقی یا روحانی بنیاد پر فرد کا مخالف یا دشمن قرار دیتے تھے نہ کہ سیاسی یا معاشی بنا پر۔ ان کے نزدیک فرد سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہر وہ چیز جو اس کی نشو و نما یا اس کی آزادیٔ عمل میں مخل ہو ختم ہونا چاہیے۔ مملکت کی طاقت چند افراد کے ہاتھ میں آ جاتی ہے اور وہ دوسرے افراد کو آزادیٔ عمل سے محروم کر دیتے ہیں۔

گاندھی جی کے معیاری یا مثالی سماج میں جو عدم تشدد کی بنیاد پر قائم ہوگا مملکت بالکل ہی فضول اور غیر ضروری ہو جاتی ہے۔

ینگ انڈیا کے ایک مضمون میں اس بارہ میں انھوں نے اس خیال کو اس طرح ظاہر کیا کہ میرے نزدیک سیاسی اقتدار اور قوت بذات خود مقصد نہیں بلکہ اس کا ذریعہ ہے کہ لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی حالت بہتر بنا سکیں

سیاسی اقتدار یا قوت کے معنی یہی ہیں کہ قومی زندگی کو قومی نمائندوں کے ذریعہ منضبط کیا جائے۔ اگر قومی زندگی اتنی مکمل ہو کہ خود ہی سے منضبط ہو جائے تو پھر کسی حکومت یا اقتدار اعلیٰ کی ضرورت نہیں۔ ایسی صورت حال میں ہر شخص خود حاکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے کسی فعل سے اس کے ساتھیوں یا پڑوسیوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچتی لہذا معیاری یا مثالی مملکت یا سوسائٹی وہ ہوئی جس میں نہ تو سیاسی اقتدار ہو اور نہ کوئی مملکت۔

بہ الفاظ دیگر جو افراد اہنسا کے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزارتے ہیں ان میں ضبط نفس کا مادہ اتنا زیادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر انھیں کسی خارجی دباؤ کی ضرورت نہیں رہتی اور وہ خود ہی اپنے فرائض کو پورا کرتے ہیں۔ ایسے سماج میں مملکت کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ اپنے خیالات، اعمال و افعال میں آدمی اس وقت عدم تشدد پر عامل ہو سکتا ہے جب وہ برہم چریہ کے اصول پر بھی عامل ہو یعنی اپنے شہوانی جذبات کو بھی پورے طور سے کنٹرول میں رکھے اور اپنی ضرورتوں کو اس قدر محدود کر دے کہ اس کے پاس اپنی کوئی چیز نہ ہو۔ جب ایسے افراد ہوں گے جو اپنی خواہشات اور جذبات کو پورے طور سے فنا کر چکے ہوں تو پھر ان کے لیے کسی مملکت کی ضرورت نہیں رہتی۔

اس طرح سے گاندھی جی کے مثالی یا معیاری سماج کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ اس میں "اسٹیٹ" (STATE) نہ ہوگی بلکہ وہ ملک گاؤں اور دیہاتوں پر مشتمل ہوگا جس میں افراد آزادی سے ایک دوسرے سے اشتراک عمل کر کے زندگی بسر کریں گے۔ ہر گاؤں خود ایک جمہوریت ہوگا اور اپنے سارے معاملات خود طے کرے گا اور اپنی تمام بنیادی ضروریات پوری کرے گا۔ اس نظام میں اوپر سے احکام نافذ نہیں کیے جائیں گے۔ فرد اس پنچایت کا مرکز ہوگا۔ اپنی جمہوریت کی بقا و تحفظ کے لیے فرد ہر قسم کی قربانی دے گا اس طرح ہر فرد کے تحفظ کے لیے گاؤں کی جمہوریت سرگرم عمل رہے گی۔ اس سماجی نظام کی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں فرد پورے طور سے آزاد ہوگا۔ قدم قدم پر پابندیوں میں اس کو جکڑا نہیں جائے گا۔ یہ گاؤں آزاد اور خود کفیل ہوں گے۔ وہ سب مل کر اپنے کو ایک کمزور قسم کے وفاق یا مرکزی نظام میں منسلک کریں گے لیکن اس اتحاد کی بنیاد آزاد تعاون پر ہوگی نہ کہ طاقت و قوت کی بنا پر۔ اس وفاق یا فیڈریشن کی نہ تو پولیس ہوگی اور نہ فوج۔ اس سماج میں نہ تو بڑی آبادیوں والے شہر ہوں گے اور نہ عدالتیں ہوں گی، نہ جیل، نہ بھاری بھاری صنعتیں ہوں گی، نہ بڑے بڑے کارخانے اور نہ مشینی آلات۔ اس سماج میں لوگوں کی زندگی بہت سادہ ہوگی اور تہذیب و تمدن خالصتاً دیہاتی ہوگا۔ اس میں شہری تہذیب و تمدن کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ معاشی نظام لامرکزیت کی بنیادوں پر ہوگا۔ چوں کہ سب شہری عدم تشدد کے اصولوں پر چلیں گے اس لیے ہر شہری خود حاکم ہوگا اور دوسروں کے متعلق اس پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں انھیں خوش اسلوبی سے انجام دے گا۔

سماجی نظام کا یہ خاکہ گاندھی جی کے اس بنیادی عقیدہ پر مبنی ہے کہ انسان ایک روحانی ذی روح ہے اور اس کی جبلت کا تقاضہ ہے کہ اسے پوری آزادی حاصل ہو اسی صورت میں وہ روحانی ترقی کر سکتا ہے۔ انفرادی آزادی کے معنی ہیں ضبط نفس اور اپنی خواہشات پر مکمل کنٹرول۔ اس کو اندرونی سوراج سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور یہ تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب مملکت نہ ہو۔ یہی آزادی اور جمہوریت اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب غیر متشدد سماج میں مملکت نہ ہو۔

لیکن گاندھی جی چوں کہ عملی آدمی تھے لہذا ان کا خیال تھا کہ اس دنیا میں مثالی یا معیاری سماج کا قیام ممکن نہیں کیوں کہ ہر شخص بدقسمتی سے اخلاقی اعتبار سے مکمل نہیں اور اسی لیے ایسے سماج کا قیام موجودہ حالات میں ممکن نہیں۔

انسان بذات خود اچھا ہے اور اچھائیوں کا مجموعہ ہے لیکن اس میں بہت سی کمزوریاں و خامیاں بھی ہیں اس لیے مملکت کی ضرورت باقی رہتی ہے اور بغیر اس کے کام نہیں چل سکتا۔ اس باب میں گاندھی جی نے افلاطون کی تقلید کی۔ جس طرح افلاطون اس نتیجے پر پہنچا کہ مثالی مملکت کا قیام ممکن نہیں اسی طرح گاندھی جی بھی حالات کو دیکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ کلیتہً عدم تشدد پر مبنی سماج کا قیام ممکن نہیں لیکن ایسا سماج ضرور بنایا جا سکتا ہے جس میں عدم تشدد کے اصولوں کا غلبہ ہو۔ ان کے خیال میں عدم تشدد کے اصولوں پر مبنی جمہوریت کا قیام اس دنیا میں اور اس زمانے میں ممکن ہے۔ اس قسم کے سماج میں مملکت کا وجود ہوگا لیکن اس کا دائرۂ اختیار بہت کم ہوگا۔ وہ تھورو (THOREON) کے اس خیال سے سو فیصدی متفق تھے کہ وہی حکومت سب سے اچھی حکومت ہے جو سب سے کم حکومت کرے یعنی جس کے اختیارات کم سے کم ہوں۔ اس طرح سے انھوں نے اپنے نقطۂ نظر (ANARCHISM) [illegible]

مملکت کے درمیان ایک درمیانی راستہ نکالا یا ان دونوں میں سمجھوتہ کیا۔ اب "عدم تشدد کے اصولوں پر مبنی جمہوریت" ان کا مقصد قرار پایا۔ اس سماج میں پارلیمنٹ کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکے اور لوگوں کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ حکومت یا مملکت کا مقابلہ کریں، اگر وہ اسے اپنی آزادی پر حملہ کرتے ہوئے دیکھیں۔ اس سماج میں لوگوں میں اپنی آزادی برقرار رکھنے کا جذبہ ہوگا اور ہر چیز کو وہ اپنے کنٹرول میں رکھیں گے۔

حکومت جرائم کے استیصال کی کوشش کرے گی مگر ڈنڈے کے زور سے نہیں بلکہ لوگوں کو سمجھا بجھا کر۔ اس کی مسلح پولیس بھی ہوگی لیکن یہ موجودہ پولیس سے بالکل مختلف ہوگی۔ یہ اہنسا کے پیرو ہوں گے اور اپنے کو لوگوں کا خادم سمجھیں گے۔ لوگ ان سے پوری طرح تعاون کریں گے اور لوگوں کی مدد سے جرائم میں کمی ہوگی۔ پولیس، طاقت کا استعمال کم سے کم کرے گی۔ اس سماج میں جو جیل خانے ہوں گے وہ موجودہ جیل خانوں سے قطعی مختلف ہوں گے۔ یہ در اصل مجرموں کے لیے اصلاح خانے ہوں گے جس طرح سے اسپتالوں یا شفاخانوں میں جا کر مریض صحت یاب ہوتے ہیں اسی طرح سے اس سماج کے جیلوں میں جا کر مجرم یا اخلاقی مریض صحت یاب ہو کر نکلیں گے اور وہ سماج کے فرض شناس ممبر اور اخلاقی اعتبار سے بہت بلند ہوں گے۔

حکومت کو جو بھی اختیار حاصل ہوگا وہ تمام تر افراد کے تعاون کی وجہ سے۔ اس سماج میں اصل مرکز فرد ہے اور وہ خود منزل ہے۔ مملکت محض ایک ذریعہ یا وسیلہ ہے جس سے فرد اپنی شخصیت کی پوری طرح سے نشو و نما اور اس کی تعمیر کر سکے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب حکومت فرد کی خدمت کرے نہ کہ اس پر حاکم بن بیٹھے۔ ایک حد تک فرد کو ضرور اپنے اوپر اور اپنی آزادی پر پابندی لگانا پڑے گی تب ہی سماجی زندگی ممکن ہو سکے گی۔ عدم تشدد کے ماننے والے شہریوں کے لیے یہ کچھ بھی دشوار نہیں اس لیے کہ وہ اپنے جذبات اور خواہشات کو پوری طرح سے دبا لیتے ہیں اور وہ ہر بات میں دھرم کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔

فرد اور سماج میں بسا اوقات جو کشمکش دیکھنے میں آتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مملکت اپنی طاقت کا استعمال کر کے افراد کو دباتی ہے۔ بعض افراد خود غرضی یا لالچ کی بنا پر دوسروں کی نقصان رسانی کرتے ہیں، دھوکا دیتے ہیں اور اپنے کو فائدہ پہنچاتے ہیں لیکن جب سماج میں عدم تشدد کے اصولوں کو ماننے والے موجود ہوں گے، ہر بات میں وہ حق و صداقت اور محبت کے اصولوں پر عمل پیرا ہوں گے اور ان کے دلوں میں دوسروں سے نفرت کا جذبہ نہ ہوگا تو پھر انفرادی آزادی اور سماجی فرائض میں کوئی تصادم نہ رہے گا۔ افراد دوسروں کی خدمت کو اپنا سب سے بڑا کام سمجھیں گے۔ اپنی بھلائی اسی میں سمجھیں گے کہ دوسروں کی بھلائی کی جائے۔ انفرادی آزادی کے یہ معنی ہوں گے کہ دوسروں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی جائے اور وہ فرائض ادا کیے جائیں جو ہر فرد کو سماج کے لیے انجام دینا چاہیے۔

آج کی دنیا میں انفرادی آزادی اور سماجی فرائض کی ادائیگی میں جو تصادم نظر آتا ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ حقوق پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، حالاں کہ سچا حق یہی ہے کہ انسان اپنا فرض ادا کرے، دوسرے کی خدمت کرے، اس کے لیے وہ اپنی ساری زندگی وقف کر دے بلکہ اس کے لیے اپنی جان تک دے دے۔

چوں کہ مملکت کی بنیاد ہی تشدد پر ہے اس لیے اس کے ذریعہ صداقت، اہنسا اور محبت کی بنیادوں پر فرد کی نشو و نما ہو ہی نہیں سکتی۔ چناں چہ مثالی سماج میں اس کا وجود ہونا ہی نہ چاہیے۔ چوں کہ مثالی سماج کا قیام بحالات موجودہ ممکن نہیں اس لیے اس کا دائرۂ اختیار جتنا بھی کم ہو سکے کم کیا جائے۔ اس نقطۂ نگاہ سے مملکت کا خاص مقصد اچھائی اور بھلائی کرنا ہو تاکہ افراد صالح بن سکیں لیکن شاعرانہ تخیل میں اسے یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ یہ قفس نہیں بلکہ آشیانہ ہے جس میں رہنے والے کی حفاظت ہوتی ہے، قید نہیں ہوتی۔ عدم تشدد کے اصولوں پر قائم کی ہوئی مملکت اپنے شہریوں کو اہنسا، سچائی، محبت، تعاون اور ایثار کی تعلیم دے گی اور اس کے شہری کبھی ناجائز ہتھکنڈوں کو نہیں اپنائیں گے۔ گاندھی جی کے اس سماج میں لالچ، خود غرضی، نفرت اور اقتدار کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس سماج کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے لامرکزی ہوگی۔ گاندھی جی موجودہ مرکزیت کے شدید مخالف تھے موجودہ مملکت میں تشدد اس لیے پایا جاتا ہے کہ وہ بہت زیادہ مرکزیت پسند ہے اور ساری طاقت مٹھی بھر افراد کے ہاتھوں میں آ جاتی ہے جو اپنے مفاد کے لیے دوسروں کو محکوم بنا کر رکھتے ہیں۔ دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ پیچیدگیاں

اور دقتیں بڑھ جاتی ہیں۔ عام افراد کو اس کا موقعہ نہیں ملتا کہ وہ آزادی سے پھل کر سکیں اور وہ اپنے معاملات کو خود حل نہیں کر سکتے۔ انسان کی صحیح نشو و نما اسی وقت ممکن ہے کہ جب پیداوار اور سیاسی اقتدار چند لوگوں میں مجتمع نہ ہو۔ گاندھی جی کے خیال میں انسان اسی وقت مطمئن رہ سکتا ہے اور ہنسی خوشی زندگی بسر کر سکتا ہے جب اس کو ذہنی، روحانی اور اخلاقی ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔ یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب پیداوار اور سیاسی اقتدار ایک جگہ نہ اکٹھا ہوں بلکہ اس میں لامرکزیت ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسی جمہوریت قائم ہو کہ جس میں فرد کو سیاسی اور معاشی آزادی حاصل ہو یعنی اس کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ حکومت میں حصہ لے سکے اور معاشی نظام ایسا ہو کہ صرف چند افراد کے ہاتھ میں ذرائع پیداوار نہ ہوں۔ یہ موجودہ صنعتی نظام کے ذریعے، جس میں بہت بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں ہوں، حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ ضرورت بھر کی اشیا، گاؤں میں پیدا کی جائیں اور وہیں سے دوسرے حصوں میں بھیجی جائیں۔ لامرکزی معاشی نظام سے سرمایہ داری کے مقاصد دور ہو جائیں گے اور ملک کو بھاری صنعتوں والے نظام سے نجات مل جائے گی۔ انسان مشینوں کی غلامی سے نجات پا جائے گا اور سرمایہ داروں اور مل مالکوں کے منافع پسندی کی ذہنیت سے بھی۔

ہر گاؤں کو اس بات کی زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل رہے گی کہ وہ اپنے معاملات پنچایت کے ذریعے سے خود طے کرے۔ مرکزی یا وفاقی حکومت کے اختیارات بہت کم ہوں گے۔ سیاسی نظام میں لامرکزیت کے لیے ضروری ہے کہ مرکزی مجلس قانون ساز یا پارلیمنٹ کا انتخاب بالواسطہ (INDIRECT) ہو کیوں کہ براہ راست انتخاب سے منتخبہ پارلیمنٹ بہت زیادہ با اختیار ہو جاتی ہے۔

مغربی سیاسی مفکرین، جن میں لاسکی اور کیلے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، لامرکزیت کے شدید حامی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ اختیار دوسری انجمنوں کو حاصل ہونا چاہیے۔ سیاسی اقتدار تمام مملکت کو نہیں حاصل ہونا چاہیے۔ پروفیسر سی۔ ایم۔ جوڈ کا خیال ہے کہ مملکت کے فرائض دوسری انجمنوں کے سپرد کر دینا چاہیے۔ تبھی افراد کو بھی آزادی حاصل ہو سکے گی اور سماجی معاملات میں تبھی وہ پوری دل چسپی لے سکیں گے۔ ان مفکرین کے نزدیک مملکت کے بے پناہ اختیارات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فرد کی آزادی سلب ہو گئی ہے اور جمہور کو اب آزادی اظہارِ خیال بھی حاصل نہیں۔

معاشی اعتبار سے لامرکزیت تبھی ہو سکتی ہے کہ جب بڑی صنعتوں کی جگہ گھریلو صنعتوں کو فروغ حاصل ہو۔ اہنسا کے اصولوں پر قائم کردہ سماج میں بڑی صنعتوں اور بڑے کارخانوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ ظلم و ستم بڑی حد تک موجودہ معاشی نظام کی وجہ سے ہے جس کی بدولت مٹھی بھر سرمایہ دار ملک کی دولت کے مالک بن بیٹھے ہیں اور کروڑوں محنت کش عوام کی محنت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام سے سامراجیت اور نوآبادی نظام پھیلتا ہے اور مختلف ملکوں میں رقابت شروع ہو جاتی ہے اور بالآخر خوں ریز جنگیں چھڑ جاتی ہیں۔ کروڑوں بلکہ اربوں روپیہ اسلحہ جات کی تیاری میں صرف ہوتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم بھاری صنعتوں اور کارخانوں کے بغیر موجودہ سماج میں رہ سکتے ہیں؟ اگر گھریلو صنعتوں کو فروغ حاصل ہوگا تو پھر جہازوں، ریلوے انجنوں اور بھاری مشینوں کے بننے کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اس لیے لامحالہ موجودہ مشینی سماج کے بجائے دیہی سماج معرضِ وجود میں آئے گا۔ گاندھی جی کے خیال میں ریلوں اور جہازوں کے بغیر بھی لوگ خوشی سے اس دنیا میں رہ سکتے ہیں۔ انڈین ہوم رول یا "ہند سوراج" میں اس کا خاکہ انھوں نے پیش کیا تھا۔ وہ بنیادی طور سے اس کے مخالف تھے کہ وقت اور فاصلے کو کم کیا جائے۔ اس کو وہ ایک قسم کا ضبط سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں اس سے تمام تر مادیت اور حیوانی جذبہ کو ترقی ہوتی ہے۔ جب ریل اور جہاز نہ ہوں گے تو غیر ممالک سے تجارت بہت کم ہو جائے گی۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہر ملک والے اپنی بنیادی ضروریات خود پوری کریں اور سودیشی چیزوں کا استعمال کریں اور اپنی ضرورتوں کو کم کریں۔ جب لوگوں کی ضروریات کم ہوں گی تو لامحالہ بہت سی چیزوں کی مانگ یا ضرورت سرے سے رہے گی ہی نہیں اور اس وجہ سے ان کا بننا بھی بہت کم ہو جائے گا۔

اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بین الملکی تصادم اور اختلاف بہت ہی کم ہو جائے گا اور اس طرح سے دنیا میں امن قائم ہو جائے گا۔ اہنسا کے اصولوں پر قائم شدہ سماج سے دوسرے سماجوں کو کسی قسم کا بھی خطرہ نہ ہوگا۔ لیکن گاندھی جی کا خیال تھا کہ عملاً یہ ممکن نہیں کہ ریلوے، جہاز اور فولاد بالکل

ختم کر دیے جائیں لہٰذا وہ اس کی اجازت دیتے ہیں کہ ریل، جہاز، بجلی اور فولاد سازی میں استعمال ہوں لیکن اس کا لحاظ رکھا جائے کہ موجودہ صنعتی نظام نہ قائم ہونے پائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب گھریلو صنعتوں کو اول نمبر پر رکھا جائے اور بڑی یا بھاری صنعتوں کو ان کے تابع رکھا جائے اور ان کو تمام تر ثانوی حیثیت دی جائے۔

گاندھی جی کے نزدیک سب پیشے برابر تھے۔ کسی بھی پیشے کے اختیار کرنے میں کسی کو ذلت نہ محسوس ہونا چاہیے اور نہ کسی پیشے کو حقیر یا ذلیل سمجھنا چاہیے اس لیے ان کے سماج میں موجودہ ذات پات کی کوئی گنجائش نہیں، معاشی عدم مساوات کو اس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے کہ مختلف پیشوں کے کرنے والوں کی اجرت جس قدر بھی ہو یکساں اور برابر ہو تاکہ یہ نہ ہونے پائے کہ چند افراد بہت زیادہ امیر اور دولت مند ہو جائیں۔

اہنسا کے اصولوں پر قائم کردہ سماج کا ایک اہم اصول یہ ہو کہ لوگوں کی ضرورتیں کم سے کم ہوں اور کم سے کم چیزوں کو وہ اپنے پاس رکھیں۔ کسی شخص کو وہ چیز ایک منٹ کے لیے بھی اپنے پاس نہ رکھنی چاہیے جس کی ضرورت اس کو نہ ہو۔ گاندھی جی خود اپنے پاس کم سے کم چیزیں رکھتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ دوسرے بھی یہی کریں لہٰذا چیزوں کو جمع کرنے یا اکٹھا کرنے کا ان کے یہاں کوئی سوال ہی نہ تھا۔ ان کے نزدیک مہذب آدمی وہ ہے جس کی ضرورتیں روز بروز گھٹتی رہیں۔

دوسرا اہم اصول امانت یا TRUSTEESHIP کا ہے۔ اگر لوگ اس پر عمل کرنا شروع کر دیں کہ صرف ان چیزوں کو اپنے پاس رکھیں جن کی واقعی ان کو ضرورت ہے اور باقی چیزیں اپنے پاس نہ رکھیں تو امیر و غریب کا تفرقہ بہت بڑی حد تک مٹ جائے۔ امیروں کی دولت لینے کے لیے گاندھی جی تشدد کا استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ قانون کے بل پر یا ڈنڈے کے زور سے سرمایہ داروں کی دولت چھینی جائے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ دولت والے یہ سمجھیں کہ یہ دولت ان کو دوسروں کی محنت کی بدولت حاصل ہوئی ہے اور ان کی نہیں ہے۔ انھیں اپنے کو اس کا مالک نہیں بلکہ امین سمجھنا چاہیے۔ وہ دولت کے صرف اتنے ہی حصے کو اپنے کام میں لائیں جس کی واقعی انھیں ضرورت ہے۔ بقیہ کو وہ عام لوگوں کے لیے وقف سمجھیں۔

گاندھی جی جسمانی محنت پر بہت زور دیتے تھے۔ ان کے خیال میں بڑے سے بڑے سائنسداں کو بھی روزانہ کچھ محنت کا کام کرنا چاہیے۔ بڑے سے بڑا دماغی کام جسمانی محنت کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ جسمانی محنت سے دماغی اور ذہنی صلاحیتیں بڑھتی ہیں۔ جس طرح ورزش کرنے سے دماغی صلاحیت بڑھتی ہے اسی طرح سے جسمانی محنت کرنے سے بھی یہ صلاحیت بڑھے گی۔ محنت کش عوام اور سفید پوشوں میں جو تفریق قائم ہو گئی ہے وہ اس سے دور ہو جائے گی۔

گاندھی جی کے اس نظام کے خاکے میں سیاسی اور معاشی لامرکزیت، امانت اور کم سے کم رکھنے کے اصولوں کو خاص اہمیت حاصل ہے اور سب سے زیادہ اس کی کہ اس دنیا میں حق نہیں بلکہ فرض سب سے زیادہ اہم ہے۔ ڈاکٹر جولین ہکسلے نے UNESCO کے حقوق انسانی کے مذاکرہ (HUMAN SYMPOSIUM) کے لیے ان سے پیغام مانگا تو انھوں نے یہ پیغام دیا کہ میں نے اپنی ناخواندہ اور عقل مند ماں سے یہ سیکھا کہ فرض ہی سے سارے حق حاصل ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کا حق ہمیں اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہم دنیا کے شہری کے فرائض ادا کریں۔

★

ہندو مسلم اتحاد

ہم سب ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں، سکھوں اور عیسائیوں کو صلح و آشتی کے ساتھ بحیثیت ہندوستانی کے رہنا چاہیے اور یہ عزم کر لینا چاہیے کہ ہم سب ایک ہی ماں کے بچوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی ایک درخت کی بے شمار پتیوں کی طرح ایک رہیں ——— مہاتما گاندھی

آخون ۱۰۹۰ اشک

گاندھی جی کی روح سے

مہدی پرتاپ گڑھی

وضع کرکے نئے آدابِ جنوں کل تو نے
اک نئی قوتِ تسخیر کا در باز کیا
راستہ اپنا تشدد سے کیا تو نے الگ
اور دُنیا میں اہنسا کو سرافراز کیا

تو کہ اک عمر رہا دشتِ بلا میں لیکن
تھا زمانے کے لیے امن و محبت کا نقیب
تو ہراساں نہ ہوا جور و ستم سے ہرگز
اور چمکا دیا اس دیش کی دھرتی کا نصیب

تیری ہمت تھی جو اک غاصبِ دوراں کے لیے
بن گئی صحنِ گلستاں سے نکلنے کا پیام
قوتِ افرنگ کی مٹی میں ملا کر تو نے
دے دیا ستیہ اور اہنسا کو زمانے میں مقام

ایک آہنگ پہ اُٹھے جو ترے دیوانے
ظلم اور جور کی زنجیرِ گراں کاٹ گئے
سرفرو شانِ وطن تیری قیادت پاکر
چہرۂ ہستی کو اک رنگ نیا بخش چلے

تو نے آنے نہ دیا حُسنِ صداقت پہ حرف
تو نے انساں کو اندھیرے میں بھٹکنے نہ دیا
برتری اور بلندی کے مٹا کر جھگڑے
بے یک جہتی کو ہر شخص پہ انعام کیا

تیری ادنیٰ سی نگاہوں کی فسوں سازی نے
کتنے ہی لال و جواہر کو سرافراز کیا
ناز کرتی ہے تری ذات پہ گوتم کی زمیں
تیری حکمت نے نئے دور کا آغاز کیا

امنِ عالم کا طلب گار اگر ہے انساں
تیری تعلیم پہ سر اُس کو جھکانا ہوگا
نفرت و بغض کی لعنت کو مٹا کر یکسر
راستہ زیست کا ہموار بنانا ہوگا

جنگ تو کل بھی نہ تھی مسئلۂ وقت کا حل
آج بھی جبر و تشدد نہیں اس غم کا علاج
جستجو ہے اگر انساں کو سکونِ دل کی
سیکھنا ہوگا اُسے ستیہ و اہنسا کا مزاج

گاندھی جی ——— ایک تاثر

٭ مرزا جعفر حسین

کہا جاتا ہے کہ پہلا اور آخری عیسائی صلیب پر شہید ہو گیا۔ یہ مقولہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بارے میں مشہور ہے لیکن حقیقت امر یہ کہ دنیا کے ہر عظیم المرتبت مفکر، جلیل القدر مصلح اور ہر گراں قدر رہبر انسانیت کے سلسلے میں یہ مثل صادق آتی ہے۔ گاندھی جی کی بھی ایسی ہی ایک بزرگ و برگزیدہ ذات تھی جس نے دنیا میں آکے اپنا مقصد حاصل کر لیا اور اپنی ایسی دوسری مثال چھوڑے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انھوں نے ہندوستان کو غلامی کی ذلت سے نجات دلائی اور ہندوستانیوں کو ایک باوقار قوم بنایا۔ غلامی کے دور میں ہم کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین پر رینگتے تھے، ہم میں اتنی سکت نہ تھی کہ اُٹھ سکتے۔ گاندھی جی نے ہم کو اس قابل بنایا کہ ہم آسمان کے نیچے سر اُٹھا کر چلنے لگے اور بین الاقوامی برادری میں اپنی ممتاز جگہ حاصل کر سکے۔ یہ سب کچھ اُس سوجھ بوجھ، تفکر و تعقل اور اُس تدبر و سیاست کی بدولت ظہور پذیر ہوا جو گاندھی کے کردار کا جوہر تھے۔ انگریزوں کی بے پناہ طاقت کے مقابلے میں عدم تشدد کا روحانی حربہ ہی کارآمد ہو سکتا تھا۔ گاندھی جی نے اس حربہ کا بہتر سے بہتر طریقے پر استعمال کیا اور ہندوستانیوں نے اپنے مسلم الثبوت لیڈر کی رہنمائی میں وفاداری اور استقلال کا عدیم المثال مظاہرہ کر کے آزادی کا مقصد حاصل کیا۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ صرف عدم تشدد کا حربہ اور اس کا صحیح استعمال، بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ہماری جنگِ آزادی کی مدت ایک صدی کی چوتھائی کے برابر قرار پاتی ہے، حصولِ مقصد کے لیے کافی نہیں ہو سکتا تھا۔ یقیناً گاندھی جی کی ذات میں کچھ ایسے جوہر بھی تھے جو دوسرے لیڈروں میں نہیں ملتے اور جن کو گاندھی جی کے کردار اور اُن کے اخلاقیات سے لگاؤ تھا۔ یہی اوصاف ہماری کامیابی کے ضامن ہوئے، جن کی بدولت ہم نے کامرانی حاصل کی۔

گاندھی جی کے سیاسیات پر نہ صرف موجودہ دور میں تبصرے ہوئے ہیں بلکہ آنے والے زمانے میں بھی تذکرے ہوتے رہیں گے لیکن ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ہم اُس نحیف الجثہ شخصیت کو بھی پیش نظر رکھیں جس کی مٹھی بھر ہڈیوں میں پہاڑوں ایسا عزم و استقلال سمایا ہوا تھا اور جس کے چہرے اور بشرے پر انسانیت و شرافت کھیلا کرتی تھی۔ اُن کی چوڑی پیشانی میں انسانی ہمدردی کا سمندر لہریں مارتا تھا اور اُن کے تبسم آمیز ہونٹوں پر بشاشت اور فراخدلی پچھاور رہتی تھی۔ آنکھوں میں اس بلا کا جذب تھا کہ جس سے بھی نظر ملا کے بات کرتے تھے اُس کا دل موہ لیتے تھے۔ اُن کے الفاظ، سُننے والے کے کلیجے میں اُتر جاتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اُن کے سیاسی حریف اُن کی بے پناہ قوت تسخیر سے اتنا مرعوب رہتے تھے کہ اُن سے بات کرنا ہی ٹال جایا کرتے تھے۔ اور وہ بات کرنے کا انداز جو اُن کو حاصل تھا اُن کی ذات تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر ہر لفظ سچائی میں ڈوبا ہوا، ہر کلمہ صداقت کا آئینہ دار، ہر جملہ شستہ و رستہ اور ہر کلام اچھی طرح سوچا سمجھا ہوا ہوتا تھا۔ دماغی توازن کی صحت کا یہ عالم تھا کہ ایک وقت میں کئی کئی کام کرتے رہتے تھے۔ ہر حس کا علٰحدہ علٰحدہ استعمال کرتے لیکن ہر کام اپنے وقوع اور محل سے ٹھیک انجام پاتا تھا۔ انھوں نے اپنے ذہن، دماغ، مزاج، طرزِ گفتگو اور اپنے ہر قول و فعل کو اتنے اچھے اسلوب سے مکمل بنا لیا تھا کہ غلطی تو درکنار سہو و نسیان کی گنجائش بھی نہ تھی۔ پھر بھی ایک ناتجربہ کار غلام قوم کی قیادت کرنے میں اگر کسی پیچیدہ منزل میں خامی آجاتی تھی تو وہ اس کو اپنی بھاری بھرکم غلطی تسلیم کر لینے میں

ھی باک نہیں کرتے تھے اور اُس کی مکافات اپنے عدم تشددانہ اُصول
ے تحت خود اپنی ذات پر وارد کرلیتے تھے۔ یہ بھی ایک ایسی منزل تھی
ہاں تمام دوسرے لیڈروں کے مقابلے میں ان کی ذات مقتدر و ارفع
ر آتی ہے۔

گاندھی جی نے ہندوستانی سیاسیات ہی کا رُخ نہیں بدلا بلکہ ہندوستانی
ہنیت میں وہ انقلاب پیدا کر دیا تھا جس نے ہمارے ملک کے تمام دھارو
رُخ دوسری سمت موڑ دیا۔ توپوں اور بندوقوں کا مقابلہ کرنے کے لیے
ہوں نے چرخہ اور کھادی کا کلچر ایجاد کیا جس نے انگریزوں کے دانت
ھٹے کر دیئے۔ یہ کلچر صرف کھادی بنانے اور پہننے تک محدود نہیں تھا
لہ ایک ایسے نظام زندگی پر مشتمل تھا جس کی بنیاد انسانیت اور صداقت
رکھی گئی تھی اور اس نظام کو عملی شکل میں ہندوستانیوں کے سامنے پیش
رنے کے لیے انھوں نے سیوا گرام کا نقشہ تیار کیا اور ایک ایسی عمارت
ائی جو اپنی آپ مثال تھی۔ یہ سودیشی کی جلوہ گاہ تھی، آدمیت وہاں رونق
روز تھی، صدر محفل گاندھی جی تھے۔ سیوا گرام کا سارا رہن سہن اور وہاں
نظام زندگی گاندھی جی کے معاشرتی اصولوں پر منضبط تھا۔ ہر قوم،
بیلہ، جماعت، ملک و ملت کے آدمی کو وہاں یکساں حقوق حاصل تھے۔
ل چال میں خالص ہندوستانی زبان رائج تھی جس کو ہر شخص سمجھ سکتا تھا۔
ہاں کا ہر باسی سختی کے ساتھ ڈسپلن کا پابند تھا۔ غذاؤں میں بھی گاندھی جی
ے وضع کیے ہوئے قوانین نافذ تھے۔ مرچ، مسالہ، تمباکو، سگریٹ یہاں تک کہ
پار کا بھی استعمال ممنوع تھا۔ کھانے پینے کی چیز جو انسان کے جسم و مزاج
ں شدت، حدت، تحریک یا تموج پیدا کرے اُس کا استعمال جائز نہیں تھا
ر ایسی تمام چیزیں جو جائز تھیں اس طرح استعمال ہوتی تھیں کہ انسان کا
سم اُن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکے۔ مختصر یہ کہ اگر ایک
طرف صحت مند زندگی کا مقصد پیش نظر تھا تو دوسری طرف مادی دنیا
ے گنہ گار بندوں کو فرشتہ خصلت بنانے کی بھرپور تمنا پوری کی جاتی تھی۔

سیوا گرام کے رہنے والے باہمی طور پر ایک دوسرے کے رفیق اور
سب اپنے لیڈر کے مطیع تھے۔ قوانین اور ضابطے نافذ کرنے میں گاندھی جی
کسی کمزوری یا سہل انکاری کے قائل نہ تھے۔ اس طرز عمل کا غالباً یہ
تجربہ تھا کہ سیوا گرام کے در و دیوار ہر شخص کے ہر فعل و قول و عمل کی غمازی
کرتے تھے۔ ناممکن تھا کہ کوئی ناپسندیدہ واقعہ ہو جائے یا کوئی غلط و نامناسب
بات کسی گوشے میں کہہ دی جائے اور گاندھی جی کو اُس کی خبر نہ ہو۔ اُن کا باخبر
ہونا بھی ویسا ہی ضروری تھا جیسا کہ اُن کا ہر واقعے کو یاد رکھنا۔ اس
سلسلے میں ایک تجربہ یاد آرہا ہے جو میرے لئے بصیرت افروز ثابت ہوا اور اس کا تذکرہ
دلچسپ بھی ہے۔ اس زمانے میں جب گاندھی جی قید و بند سے آزاد ہوتے تھے میں ہر سال
سیوا گرام جاتا اور اُن کے قدموں پر گلہائے عقیدت نچھاور کرتا تھا۔ ایک مرتبہ
سیوا گرام سے واپسی میں کچھ تاخیر ہو گئی اور کھانے کا وقت آ گیا تو انھوں
نے فرمایا "بھائی! آؤ کھانا کھا لو۔" میں نے اس غیر معمولی عزت افزائی
کا احترام کرتے ہوئے کھانے میں شرکت تو کر لی لیکن کوئی چیز میرے
کام و دہن کے لیے سازگار نہ تھی، خود اُن کا کھانا میرے لیے دیدنی بھی
نہ تھا چشیدنی ہونا تو درکنار۔ کسی نہ کسی طرح کھانا کھا کے اور گاندھی جی
سے رخصت لے کر کچھ دور آگے بڑھا تھا کہ رانی امرت کنور سے ملاقات
ہو گئی۔ اُن کا اس روز مزاج ناساز تھا اور وہ عام دستر خوان پر شرکت
نہیں کر سکی تھیں۔ مجھ سے انھوں نے کھانے کے بارے میں سوال کیا تو میں نے
بے تکلفی کے ساتھ اور مزاحاً وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو کہنا نہ چاہیے تھا۔
انھوں نے مجھے یہ کہہ کر منہ کا مزا ٹھیک کر لیجئے ایک سنگترہ مرحمت
فرمایا۔ میں اُسے کھاتا ہوا باہر آیا اور سیوا گرام سے نکل کر جیب کی ڈبیا
سے پان کھایا۔ دوسرے سال جب حاضری کا موقع ملا تو کچھ تاخیر سے
پہنچنا ہوا۔ کھانے کا وقت آیا اور میں نے تہذیب و ادب کا لحاظ
کرتے ہوئے رخصت چاہی۔ مجھے سال گزشتہ کا واقعہ یاد نہیں تھا مگر
گاندھی جی کو سب کچھ یاد رہا۔ انھوں نے فرمایا "جاؤ! بھائی جاؤ!
سیٹھ جمنا لال کے گسٹ ہاؤس میں کھانا کھاؤ، میرا کھانا تم کو نہیں بھائے گا
تمہارا منہ کھراب ہو، مورا کھانا کھراب ہو جاؤ۔" انھوں نے انتہائی خلوص،
سادگی اور محبت سے یہ بات کہی تھی۔ میں بہرحال بے انتہا شرمندہ ہو کر
رہ گیا۔ اُن کو اپنے ہر عقیدت مند سے قلبی تعلق رہتا تھا اور وہ اپنے
اصولوں پر ہر ایک کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ مختصر یہ کہ اس موقعے پر
مجھے بہت ندامت اُٹھانا پڑی اور اسی کے ساتھ سیوا گرام کے ڈسپلن کا بھی
قائل ہونا پڑا۔

سیاسی مباحثوں میں حسن تکلم کے بجائے تفکر و تعقل کی کار فرمائی

رہتی ہے۔ اس لیے ایسے مواقع کو نظر انداز کر کے ان کی خالص سوشل ملاقاتوں کو یاد کیا جائے تو گاندھی جی کا مسکراتا ہوا چہرہ فوراً ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ تبسم آفرینی میں شیرینی اور سنجیدہ مزاجی بھی شامل رہتی تھی۔ سیدھی سادی گفتگو میں بسا اوقات وہ ایسے جملے کہہ دیتے تھے جن کو سن کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے اور اُن کی غیر معمولی بصیرت کو دیکھ کر جو غیب دانی تک پہنچ جاتی تھی، ان کی بلند شخصیت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ وہ شام کبھی نہ بھولے گی جب ہم لوگ ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری (موجودہ گورنر اڑیسہ) کی کوٹھی واقعہ راج پور روڈ دہلی میں بڑی بے تکلفانہ صحبت گرمائے ہوئے تھے۔ حاضرین میں مولانا رضا انصاری فرنگی محلی، سید سجاد ظہیر، مجاز مرحوم، سندھ کے وزیر اعلیٰ محمد علی اللہ بخش وغیرہ ہم کے ایسے لوگ موجود تھے۔ کچھ رند مشرب تھے اور کچھ تقدس مآب، کچھ ادیب تھے اور کچھ سیاست داں، مختلف النوع محفل تھی۔ مجاز دھوم مچائے تھے اور اپنے کلام سے ہم سب کو محظوظ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب نے کہا کہ آپ لوگ بہت شور مچا رہے ہیں اگر گاندھی جی آگئے تو کیا ہوگا۔ گاندھی جی دلی جاتے تھے تو حتی الامکان بیگم شوکت اللہ کو جو ڈاکٹر انصاری کی صاحبزادی ہیں، دیکھنے ضرور جاتے تھے۔ اس موقع پر وہ دو روز سے دلی میں موجود تھے اور تیسرے روز واپسی کی خبر تھی۔ یہ تذکرہ ہو ہی رہا تھا کہ ایک موٹر کوٹھی میں داخل ہوئی اور گاندھی جی اپنی لکڑی ٹیکتے گاڑی سے اُتر آئے۔ ہم سب کو ایک ایک کرکے پوچھا، غور سے دیکھا اور فرمایا: "اچھا بھائی سب اپنے ہیں" اور فوراً ہی ہم سب کو مخاطب کرکے کہا: "تم جوان نہ جانے کیا کر رہے تھے، میں بوڑھا آگیا، بھائی گالی نہ دینا میں جلدی چلا جاؤں گا۔" ہم سب نے احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اُن کی تشریف آوری کو سر آنکھوں پر سراہا۔ وہ ہم سے فرداً فرداً کچھ نہ کچھ باتیں کرنے لگے۔ ابھی اثنا میں بیگم شوکت مع اپنے صاحبزادوں کے تشریف لے آئیں۔ صاحب سلامت اور مزاج پرسی کے بعد گاندھی جی دونوں بچوں کو داہنے اور بائیں لے کر اُن سے ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگے۔ ہم سب پاس ادب سے خاموش رہے۔ پھر ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب سے فرمایا کہ "بھائی شوکت میں اب جاؤں۔" انھوں نے کہا: "تشریف لے جائیے گا!" جواب دیا کہ

"بھائی تمہارے گھر نہ کھانا کھانے آیا ہوں نہ سونے آیا ہوں، اپنے بچوں کو دیکھنے آیا تھا، دیکھ لیا اب جاؤں، جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر کھڑے ہوگئے۔ گاڑی تک ہم سب نے پہنچایا۔ مجھ سے مڑ کر پوچھا کہ "مرزا جی تم کب سے آئے ہو؟" میں نے عرض کیا کہ مہاتما جی دو روز ہوئے۔ برجستہ کہا کہ مجھ سے ملنے اب تک نہ آئے۔ میں نے انھیں کی عدیم الفرصتی کا ذکر کرکے معذرت چاہی اور دوسرے روز حاضر خدمت ہونے کا وعدہ کیا۔ اس مختصر صحبت اور چند جملوں والے مکالمے میں جو انھوں نے ہم سب سے فرداً فرداً یا سب کو بہ یک وقت مخاطب کرکے فرمایا وہ سادگی، خلوص اور پیار تھا جس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی اور جس کی یاد ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی۔

جس طرح گاندھی جی کی باتوں میں پُرخلوص کشش تھی اسی طرح ان کی خاموشی میں بھی جاذبیت تھی۔ اُن کی خدمت میں حاضر رہنا اور شرف زیارت حاصل کرتے رہنا ہی انبساط روح کا باعث ہوتا تھا۔ یوں تو وہ مہاتما تھے، سیاسی رہنما تھے، روحانی پیشوا بھی مانے جاتے تھے لیکن ان کی شخصیت میں اتنی زبردست قوت تسخیر تھی جو کسی دوسرے دنیاوی یا روحانی ہیرو کو اُس دور میں نصیب نہیں ہوئی۔ دور ہی سے ان کی ایک جھلک دیکھ لینے کے لیے لوگ بے قرار رہتے تھے۔ جس راستے سے وہ گزرتے تھے مشتاقانِ دید کا سمندر لہریں مارنے لگتا تھا۔ قریب سے ملاقات کرنا بھی زیادہ دشوار نہ تھا۔ البتہ اُن کی بے پناہ مصروفیت کے باعث پہلے سے وقت مقرر کروانا پڑتا تھا۔ ملاقات کرنے والوں کو چند منٹ ملا کرتے تھے جو آرزوئے دید کو پورا کرنے کے لیے کبھی کافی نہیں ہوتے تھے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی خدمت میں گھنٹوں حاضر رہنے کا موقع مل جاتا تب بھی ذوقِ حضوری کو آسودگی نہیں ہوتی تھی۔ اس قسم کا صرف ایک تجربہ مجھے حاصل ہوا تھا جبکہ ملک میں پہلی قومی انترم حکومت بن چکی تھی، برطانوی وفد دلی آچکا تھا، سیاسیات تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ گاندھی جی بھی موجود تھے اور بھنگی کالونی میں فروکش تھے۔ میں نے حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہی اور مجھے تین بجے سہ پہر کا وقت دیا گیا۔ میری خوش قسمتی سے اُس روز اس وقت کوئی دوسری ملاقات مقرر نہیں تھی۔ میں تخمیناً دو

گھنٹے تک حاضر خدمت رہا۔ وہ چرخہ کاتا کیے اور میں سیاسی اور غیر سیاسی معاملات پر ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ ذوق حضوری ان باتوں میں طول دینے کا باعث بنتا رہا۔ یہاں تک کہ ۵ بجے مجھے ان کے دوسرے پروگرام کی یاد دلائی گئی تب میں بادل ناخواستہ رخصت ہوا لیکن گاندھی جی کے پاس میرے اس دو گھنٹے حاضر رہنے کی خبر نے پبلک میں ہلچل مچا دی۔ میں اسی دن رات کی گاڑی سے لکھنؤ واپس ہو رہا تھا جب تک گاڑی چھوٹ نہیں لی مجھے سکون نہیں مل سکا۔ ہندوستان نیز بیرونی ممالک کے نامہ نگار مجھے گھیرے رہے، طرح طرح کی جرح کرتے رہے مگر میرے پاس جواب میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو اُن کی تشفی کا باعث ہوتی۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ میں اپنی طویل ملاقات کا مقصد صیغۂ راز میں رکھ رہا ہوں۔ اُن میں سے کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ گاندھی جی سے غیر سیاسی ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔

اُن کی شخصیت کو یاد کیا جائے تو ہماری نظروں میں انسانیت، شرافت، تدبر، سیاست، فراست، صداقت، راست بازی، بلند کرداری اور اسی قبیل کے تمام اوصاف حسنہ کے جوہر بیک وقت جگمگانے لگتے ہیں۔ کہنا پڑتا ہے کہ دیدہ ور بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ آسمان ہزاروں برس چکر لگاتا ہے، وقت سیکڑوں بار کروٹیں بدل لیتا ہے تب ہی ایک ایسا انسان پیدا ہوتا ہے جس کو بجا طور پر پیغمبر انقلاب تسلیم کرنا پڑتا ہے، وہ زمانے کا دھارا موڑ دیتا ہے، ظلم کی کلائی مروڑ کے رکھ دیتا ہے، حق و صداقت و انصاف کی شمعیں محفل عالم میں روشن کرتا ہے جبر و استبداد کا قلعہ ڈھا کر آزادی و کامرانی کی بنیادیں استوار کرتا ہے۔ ایسی ہی ایک جلیل القدر ہستی گاندھی جی کی تھی جو ہندوستان کے ایسے فلاکت زدہ غلام ملک کو آزاد کرانے کا مقصد لے کر اس دنیا میں آئے تھے اور اس مقصد کو حاصل کر لینے کے بعد ہم سے جدا ہو گئے۔ ان کی زندگی کامیاب و کامران تھی، اُن کے جینے میں ایک مقدس مدعا شریک حال رہا اور ان کی موت بھی ایک متبرک مقصد کے لیے ہوئی۔ وہ ہادی الطریق بن کر آئے تھے اور درجۂ شہادت پر فائز ہو کر چلے گئے۔ احسان شناسی کا تقاضہ تو یہ تھا کہ حصول آزادی کے بعد جب ہم نے فخر سے سر اونچا کیا تھا تو گاندھی جی کے سمجھائے ہوئے راستے پر گامزن رہتے اور اُن کے بتائے ہوئے اصولوں پر صدق دل سے عمل کرتے لیکن غیر ملکی حکمرانوں کی حکمت عملی کے باعث تنگ نظری، عصبیت، فرقہ واریت اور خود غرضی کے جراثیم ہم میں اتنے زیادہ سرایت کر گئے تھے کہ ہم صحیح معنوں میں گاندھی جی کی تقلید کرنے والے اور اُن کے جانشین نہ بن سکے۔ یہ سچ ہے کہ ہم دوسرے گاندھی نہیں بن سکتے تھے لیکن حصول آزادی کے بعد ہم اس کے اہل کیوں نہیں ہو سکے کہ صحیح معنوں میں ان کے ماننے والے اور پیرو شمار کیے جا سکیں؟ ہم کو اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیے اور اپنے دل سے اس کا جواب حاصل کرنا چاہیے!

★

اہنسا

میرا مذہب صداقت اور عدم تشدد پر مبنی ہے۔ صداقت میرا خدا ہے، عدم تشدد اسے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔
جہاں "اہنسا" کے قانون کا بول بالا ہے، وہاں نہ کوئی حسد ہونا چاہیے، نہ کوئی نامناسب خواہش اور نہ کوئی جرم۔

میرا یقین ہے کہ عدم تشدد، تشدد کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر ہے اور عفو سزا سے زیادہ شجاعانہ ہے۔ لیکن درگزر کرنا اس وقت عفو میں شمار کیا جا سکتا ہے جب سزا دینے کی طاقت حاصل ہو۔ اگر کوئی مجبور و لاچار شخص درگزر کرنا چاہے تو اس کے کوئی معنی نہیں ——— مہاتما گاندھی

گاندھی جی

شہریار پرواز

اب بھی جاری ہے فیضِ عام ترا

ثبت ہے ہر اُفق پہ نام ترا — ہر ترنم میں ہے کلام ترا
اوج پیار گاں ہے بام ترا — تیری عظمت ہے خود مقام ترا
جو ترے ذکر سے گریزاں تھے — نام لیتے ہیں صبح و شام ترا
امن ہے اب عقیدۂ عالم — ابدی ہو گیا نظام ترا
جب تلک آفتاب دَور میں ہے — ہاں! چھلکتا رہے گا جام ترا
حرم و دیر اور کلیسا میں — ذکر رہتا ہے صبح و شام ترا
شیخ ہو برہمن کہ پیرِ مغاں — ابھی سمجھے نہیں مقام ترا
ہند قائم ہے امنِ عالم کا — اب بھی جاری ہے فیضِ عام ترا
حق پہ دُنیا نثار کر ڈالو — کتنا سادہ سا ہے نظام ترا
گوشے گوشے میں نقشِ پا ہیں ترے — ذرّے ذرّے پہ ہے خرام ترا

بس یہی ہے وظیفۂ پرواز
نام لیتا ہے صبح و شام ترا

اُتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

سرکاری ملازمین کے مہنگائی بھتے میں اضافہ • • • بھومی اور بھون کر صرف ملتوی ہوا ہے • • • چھوٹی بچت اسکیم کی رفتار ترقی • • • ربیع کے دوران چھوٹی بچت مہم کی کامیابی • • • گنڈک نہر پر تیزی سے کام جاری رکھنے کی ہدایت • • • خاندانی منصوبہ بندی کو کامیاب بنانے پر گورنر کا زور • • • بعض ضلاع میں خاندانی منصوبہ بندی کے حوصلہ افزا نتائج • • • جلد تیار ہونے والے گنے کے مقابلے میں اتر پردیش کی پچھی کامیابی • • • نئی ایجادوں کے حوصلہ افزا نتائج • • • خون کا رضاکارانہ عطیہ • • • متفرقات

حکومت اتر پردیش نے اپنے ملازمین کے مہنگائی بھتے کی شرح میں اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اضافہ یکم اگست ۱۹۶۸ء سے ۵۰۹ روپے تک تنخواہ پانے والے ملازمین کو ملے گا۔

اس اضافے سے ریاستی حکومت کے تقریباً ۵ لاکھ ملازمین مستفید ہوں گے اور اس کی وجہ سے ۴ کروڑ روپے سالانہ کا مزید صرفہ ہوگا۔

گزشتہ تین برسوں میں پانچ موقعوں پر مہنگائی بھتے میں ایسا ہی اضافہ کیا جا چکا ہے پچھلی مرتبہ دو بار یعنی یکم اپریل ۱۹۶۷ء اور یکم جون ۱۹۶۷ء کو مرکزی اور ریاستی حکومت کے ملازمین کے مہنگائی بھتے میں مساوات لانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔

ریاستی حکومت نے یکم اگست ۱۹۶۸ء سے ریاست کے سرکاری ملازمین کے مہنگائی بھتے میں مندرجہ ذیل اضافہ کیا ہے۔

تنخواہ کی حد	موجودہ مہنگائی بھتہ	اضافہ شدہ مہنگائی بھتہ
۱۰۹ روپے ماہانہ تک	۴۴ روپے	۵۰ روپے
۱۱۰ روپے سے ۱۴۹ روپے تک	۶۲ روپے	۶۹ روپے
۱۵۰ روپے سے ۲۰۹ روپے تک	۷۷ روپے	۸۵ روپے
۲۱۰ روپے سے ۲۹۹ روپے تک	۹۲ روپے	۱۰۲ روپے
۳۰۰ روپے سے ۳۴۹ روپے تک	۱۰۰ روپے	۱۱۰ روپے
۳۵۰ روپے سے ۴۶۸ روپے تک	۵۴۹ روپے تنخواہ سے کم کا فرق	۵۶۰ روپے تنخواہ سے کم کا فرق
۴۶۹ روپے سے ۴۹۹ روپے تک	۸۰ روپے	۱۱ روپے
۵۰۰ روپے سے ۵۰۹ روپے تک	۸۰ روپے	۵۹۰ روپے تنخواہ سے کم کا فرق

بھومی اور بھون کر ادھینیم ۱۹۶۲ء کو ابھی منسوخ نہیں کیا گیا ہے اور اس کے خاتمے کی جو بات کہی گئی ہے اس کا دراصل مطلب یہ ہے کہ اس کی وصول یابی کو محض ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں محکمہ لوکل سیلف گورنمنٹ نے ایک پریس نوٹ جاری کیا ہے۔

صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے پریس نوٹ میں کہا گیا ہے

”حکومت نے حال ہی میں بھومی اور بھون کر کے سلسلے میں ایک پریس نوٹ جاری کیا تھا اور دوسرے دن گورنر کی فیض آباد میں تقریر میں بھی صورت حال کو واضح کر دیا گیا تھا۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں بعض حلقوں میں کچھ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اس پریس نوٹ میں کہا گیا تھا کہ حکومت نے یکم اپریل ۱۹۶۷ء سے اس ٹیکس کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سابقہ وزارت نے ۴ مئی ۱۹۶۷ء کو یہ فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے کے مطابق بھومی اور بھون کر ادھینیم ۱۹۶۲ء کو منسوخ کرنے کے لیے ایک بل کا مسودہ بھی تیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس قانون کی منسوخی کے لیے مجالس قانون ساز کی متوقع منظوری کے پیش نظر عاملہ کے احکام جاری کر دیے گئے جن کے مطابق یکم اپریل ۱۹۶۷ء سے آئندہ مدت تک کے لیے ٹیکس کی وصول یابی ملتوی کر دی گئی۔ بھومی اور بھون کر ادھینیم ۱۹۶۲ء کو منسوخ کرنے کے لیے ۱۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک بل پیش کیا گیا جس کے تحت بہرحال ۲۱ مارچ ۱۹۶۷ء تک کے ٹیکس کا بقایا وصول کرنے کا حق محفوظ رکھا گیا۔ لیجسلیٹو اسمبلی نے غور و خوض کے بعد ۲۲ دسمبر ۱۹۶۷ء کو اس بل پر اپنی منظوری دے دی۔ اس کے بعد یہ بل ۱۷ فروری ۱۹۶۸ء کو لیجسلیٹو کونسل میں بھیج دیا گیا۔

لیکن قبل اس کے کہ لیجسلیٹو کونسل میں یہ بل پیش ہوتا وزارت ختم ہوگئی اور صدر راج نافذ ہوگیا۔ ایسی صورت میں مذکورہ بل دستور کے آرٹیکل ۱۹۶ کی دفعہ (۵) کے ماتحت ساقط ہوگیا۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ مجوزہ اور بیوں کرا دھینیم سنہ ۱۹۶۲ء ابھی برقرار ہے اور جسے ٹیکس کا خاتمہ کہا گیا ہے وہ دراصل عاملہ کے احکام کے تحت ٹیکس کی وصولیابی کا التوا ہے۔

اس طرح یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ پریس نوٹ اور گورنر کے بیان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ گورنر نے ٹیکس کی وصولی کے التوا سے متعلق عاملہ کے احکام کو منسوخ نہیں کیا ہے اور اس سلسلے میں قطعی فیصلہ عوامی حکومت پر چھوڑ دیا ہے۔

اترپردیش میں گزشتہ جولائی کے آخر تک چھوٹی بچت کی مختلف اسکیموں کے تحت ۴۶۲۲۳۲۲۹ روپے کی رقم جمع کی گئی۔ یہ رقم مالیاتی سال رواں کے مقررہ نشانے کا ۶۹٫۱۹ فی صدی ہے۔

اس سلسلے میں میرٹھ ڈویژن نے ۲٫۲۸ کروڑ روپیہ جمع کرکے پہلا مقام حاصل کیا جو مقررہ نشانے ۳٫۴ کروڑ روپے کا ۶۶٫۹۸ فی صد ہے۔ اتراکھنڈ ڈویژن نے مقررہ نشانے کا ۴۳ فی صدی جمع کرکے دوسرا مقام حاصل کیا۔

مختلف اسکیموں کے ماتحت جن اضلاع میں مقررہ نشانوں کا ۵۰ فی صدی سے زیادہ پورا کرلیا گیا ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

دہرہ دون ۶۲٫۲ فی صدی، سہارن پور ۷۱ فی صدی، مظفر نگر ۶۹ فی صدی، پرتاپ گڑھ ۶۸٫۲۷ فی صدی، میرٹھ ۶۱٫۸۷ فی صدی، بلند شہر ۵۵٫۷۰ فی صدی، پتھورا گڑھ ۵۱٫۵۰ فی صدی اور چمولی ۵۰٫۷۰ فیصدی۔

چھوٹی بچت اسکیموں میں زیادہ روپیہ جمع کرنے کے مقصد سے کے پیش نظر ریاستی حکومت نے پہلی بار اس سال تین مہمیں شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پہلی ربیع مہم مئی جون کے دوران چلائی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں ڈاک کھاتوں کی تعداد جو پچھلے سال ۷۳۰۰۰ تھی گزشتہ جون تک بڑھ کر ایک لاکھ ہوگئی۔ اسی طرح اجتماعی میعادی کھاتوں کی تعداد ۱۲۰۰۰ سے بڑھ کر ۳۰۰۰۰ ہوگئی۔ اس کے علاوہ طویل مدت کے تمسکات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ خریف مہم اکتوبر۔ نومبر اور تیسری مہم مالیاتی سال رواں کے آخری دو ماہ کے دوران شروع کی جائے گی۔

ریاستی حکومت نے ربیع کی چھوٹی بچت مہم کے دوران گزشتہ مئی اور جون کے مہینوں میں چھوٹی بچت کے مختلف تمسکات میں ۱٫۲۰ کروڑ روپے سے زیادہ جمع کیا۔ مہم کے دوران مجموعی طور پر جو رقم جمع ہوئی وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔

اس مہم کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں نئے معاشی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں دیہی عوام کے رضاکارانہ تعاون سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی بچت کی افادیت کو محسوس کرنے لگے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ربیع کی چھوٹی بچت مہم کے دوران میں انھوں نے زیادہ رقمیں جمع کی ہیں۔

زیر نظر مدت کے دوران طویل مدت کے تمسکات میں بڑی بڑی رقمیں لگائی گئی ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

قومی بچت سرٹیفکیٹوں اور دفاعی سرٹیفکیٹوں میں ۸۲ لاکھ روپیہ، اجتماعی میعادی کھاتوں میں ۴۷ لاکھ روپیہ اور پانچ سالہ مقررہ مدت بچت میں ۲٫۵ لاکھ روپیہ۔

اس کے علاوہ زیر نظر مدت میں تقریباً ایک لاکھ پوسٹل سیونگس بینک کھاتے اور تیس ہزار اجتماعی میعادی کھاتے کھولے گئے جب کہ گزشتہ سال اسی مدت کے دوران یہ تعداد و شمار بالترتیب ۷۳۰۰۰ اور ۱۳۰۰۰ تھے۔

گنڈک کنٹرول بورڈ کی ہنگامی کمیٹی کے جلسے میں محکمہ آب پاشی و بجلی کے سکریٹری نے گنڈک نہر پروجیکٹ پر تیزی اور مستعدی کے ساتھ کام جاری رکھنے پر زور دیا۔

گنڈک پراجیکٹ سے جو سنہ ۱۹۷۲-۷۳ء تک مکمل ہو جائے گا آئندہ سال دو لاکھ ایکڑ اور اس سے اگلے سال دیوریا اور گورکھپور اضلاع میں مزید دو لاکھ ایکڑ اراضی کو آب پاشی کی سہولتیں فراہم ہوں گی۔ اس طرح اترپردیش میں نہر سے کل ۱۲٫۷۰ لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہو سکے گی۔

پراجیکٹ کے کام کو تیزی و مستعدی سے آگے بڑھانے کے لیے مالی سال رواں میں تین کروڑ روپے کی فاضل رقم منظور کی گئی۔ سال کے شروع میں اس کام کے لیے ۴٫۵۵ کروڑ روپیہ الاٹ کیا گیا تھا۔ اس طرح اس سال اس پراجیکٹ پر ۷٫۵۵ کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔

سکریٹری موصوف نے اس امر پر زور دیا کہ کام کی تکمیل کے

سلسلے میں مالی امور پر سخت نگرانی کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ ٹھیکے دینے اور سامان مہیا کرنے کے سلسلے میں انجینیر حضرات بیچ میں کرتے رہیں۔ سامان مرکزی خرید ادارے کی معرفت خریدا جائے۔ اس طرح سامان معیاری اور مناسب داموں پر مل سکے گا۔

▼ گورنر اتر پردیش شری بی۔ گوپال ریڈی نے حال ہی میں خاندانی منصوبہ بندی مہم پندرھواڑہ کے سلسلے میں ایک پیغام میں کہا ہے کہ آج ہم تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے سنگین مسئلے سے دوچار ہیں۔ اس مسئلے کی وجہ سے عام شخص کی اقتصادی حالت بہتر نہیں ہو سکی ہے حالانکہ گذشتہ پنج سالہ منصوبوں کی بدولت عام طور پر ترقی ہوئی ہے۔

انھوں نے کہا کہ موجودہ سنگین صورت حال میں اگر ملک، طبقہ اور ہر خاندان کو خوش حال بنانا ہے تو چھوٹے کنبے کے اصول کو اپنانا ہوگا۔ خاندانی منصوبہ بندی پروگرام ہر شہری کے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ خاندان کی صحت اور خوش حالی بچوں کی پیدائش کے درمیانی وقفے پر منحصر ہے۔

گورنر نے امید ظاہر کی کہ ہر شہری اور سیاسی، سماجی اور مذہبی ادارے اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں مکمل اشتراک کریں گے۔

▼ خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق ریاستی کمیٹی نے آج اتر پردیش میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا۔

کمیٹی نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اس سال نس بندی اور لوپ لگانے کے کاموں میں گذشتہ سال کی بہ نسبت بالترتیب ۷۶ فی صدی اور ۲۳ فی صدی اضافہ ہوا۔ اول تین مہینوں میں نس بندی میں چمولی اور لوپ لگانے میں پیلی بھیت اور لکھنؤ اضلاع نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ کمیٹی نے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ اتر پردیش میں تمام فرقوں نے (ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی وغیرہ) اپنی زندگی میں خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے اور پروگرام میں جوش و خروش کے ساتھ شریک کار ہیں۔ تاہم کمیٹی نے یہ محسوس کیا کہ دوسری ریاستوں کے مقابلے میں رفتار ترقی تسلی بخش نہیں ہے اور انتظامی مشینری کو زیادہ مستعد بنانے کی ضرورت ہے تاکہ عوام میں یہ پروگرام مقبول ہو سکے اور بہتر نتائج برآمد ہو سکیں۔

پروگرام کی رفتار کو تیز تر کرنے کے خیال سے کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ کمشنروں، ضلع افسروں، مہاپالیکا نگرادھیکاریوں، سول سرجنوں اور ہیلتھ افسروں کی ایک کانفرنس بلائی جائے تاکہ پروگرام کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے۔

کمیٹی کو بتایا گیا کہ الہ آباد اور کانپور اضلاع کو حکومت ہند کی اسکیم کے تحت لایا گیا ہے۔ ان اضلاع میں صوتی و بصری سامان، گاڑیاں، نشری سامان اور عملہ کی فاضل سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے ترقی کی رفتار دوگنی ہو جائے گی۔

دواؤں اور دیگر آلات کی اصل ضرورت کا جائزہ لینے کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کمیٹی کی رپورٹ موصول ہونے تک دواؤں اور آپریشن کے سامان کے لیے دیہی کلنکوں میں چار سے بڑھا کر چھ روپیہ فی کیس کر دیا جائے گا۔

اتر پردیش نے جلد تیار ہونے والے گنے کے سنہ ۶۷-۱۹۶۶ء کے کل ہند مقابلے میں لگاتار چھٹی مرتبہ اول پوزیشن حاصل کی ہے۔ رام پور کے شری گورپریت سنگھ نے ۱۸۷٫۳۵ میٹرک ٹن فی ہیکٹر گنا پیدا کر کے اول جگہ حاصل کی۔ دوسری اور تیسری جگہیں بھی اتر پردیش کے شری اتم سنگھ (ضلع رامپور) اور شری کا سے سنگھ (ضلع نینی تال) نے حاصل کیں جنھوں نے بالترتیب ۱۷۳٫۶۰ اور ۱۶۱٫۸۹ میٹرک ٹن فی ہیکٹر گنا پیدا کیا۔

دتون گنا کے مقابلے میں بھی شری جگ موہن لعل اور شری گھنشیام نے بالترتیب ۱۳۲٫۷۵ اور ۱۲۴٫۶۷ میٹرک ٹن فی ہیکٹر گنا پیدا کر کے دوسری اور تیسری جگہیں حاصل کیں۔

گنا مقابلے ۵۷-۱۹۵۶ء میں قومی پیمانے پر شروع کیے گئے تھے۔ اتر پردیش اس سے قبل جلد تیار ہونے والے گنے کے پیداواری مقابلوں میں سنہ ۵۷-۱۹۵۶ء — ۵۹-۱۹۵۸ء — سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء — سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء اور سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں اول آ چکا تھا اور دتون گنا مقابلے میں سنہ ۶۲-۱۹۶۱ء سے سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء تک لگاتار سر فہرست رہا۔

اتر پردیش کے سالانہ گنا مقابلوں میں ضلع گورکھپور نے ۲۴۷٫۳۷ میٹرک ٹن گنا پیدا کر کے ریکارڈ قائم کیا۔

اتر پردیش کے گورنر شری بی۔ گوپال ریڈی نے ریاست کے ۲۲ موجدوں کو حال ہی میں راج بھون میں ۲۲ ہزار روپے کے انعامات تقسیم کیے۔ ان انعامات کا اعلان ایجادوں کو فروغ دینے کے مرکزی بورڈ کی جانب سے کیا گیا ہے۔

بورڈ کو رنے جو سنہ ۱۹۶۰ء میں قائم کیا گیا تھا، اب تک ۱۹ر۱ لاکھ روپے کے انعامات ۲۰۵ موجدوں کو دیے ہیں۔ اس کے علاوہ ایجاد کو فروغ دینے کے سلسلے میں ۲۷۱ افراد کو ۶۳ر۴ لاکھ روپے کی مالی امداد دی گئی۔ ایجادوں کے سلسلے میں سنہ ۱۹۶۵ء سے ان انعامات کا اعلان سال میں دو بار یوم جمہوریت اور یوم آزادی کے موقع پر کیا جاتا ہے۔

حال میں امپوشٹ بلڈ بنک لکھنؤ کو ۲۱ اشخاص نے رضاکارانہ طور پر خون کا عطیہ دیا۔ ان میں چار خواتین بھی تھیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ شریمتی اندر باجپئی زوجہ ڈاکٹر پی۔ سی باجپئی آف میڈیکل کالج لکھنؤ، شریمتی مکھا رائے، شریمتی دیوکی اور شریمتی ادم کھنہ زوجہ ڈاکٹر این۔ ایم کھنہ کلانیرڈ۔ خون کا عطیہ دینے والے باقی افراد میں شری آر۔ ڈی سشنکر، شری ڈی سالوال، شری سندر لعل گپتا، شری سی۔ بی پانڈے، شری راجندر کمار، شری کالکا پرشاد اور شری ایس۔ این بنرجی (محکمہ ہریجن وسماجی فلاح) اور شری سی۔ ایس نیگی، شری این۔ سی پنت، شری کاجے۔ بی شرما، شری بی۔ کے دویدی، شری جی۔ سی جوشی، شری ایم۔ ایل بھاٹیہ، شری بی۔ سی نگم، شری ایس۔ بی سریواستو، شری ایس۔ پی پانڈے اور شری کرشن آنند (محکمہ اقتصادیات و امداد وشمار) شامل ہیں۔

متفرقات

جنرل سائنس کی تعلیم کے لیے امداد۔ ریاستی حکومت نے مالی سال رواں میں لوکل باڈیز اور پرائیوٹ اداروں کے تحت جاری سینئر بیسک اسکولوں میں جنرل سائنس کا نصاب شروع کرنے کے لیے ۴۸۸۷ کی رقم منظور کی ہے۔ یہ رقم ۱۲۰ سینئر بیسک اسکولوں کو جنرل سائنس کی تعلیم دینے کے لیے بطور مالی امداد دی جائے گی۔

ایک سو سینیئر بیسک اسکول امدادی فہرست میں شامل۔ ریاستی حکومت نے سو غیر سرکاری سینیئر بیسک اسکولوں کو سنہ ۶۹-۱۹۶۸ء کے دوران امدادی اداروں کی فہرست میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ریاستی حکومت نے ان اسکولوں کو مالی امداد دینے کے لیے مالیاتی سال رواں کے دوران ساڑھے چار لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے۔

نظم خوانی کا مقابلہ۔ اتر پردیش کے بچوں کے فلاح اور تحقیق سے متعلق بیورو نے لکھنؤ میں گزشتہ نظم خوانی کا ایک مقابلہ حال ہی میں منعقد کیا تھا جس میں تین اداروں اور تین بچوں کو اول تین انعامات دیے گئے۔ اداروں اور بچوں کے نام جو پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر آئے مندرجہ ذیل ہیں:

ادارے۔ بال شکشا نکیتن، سرودے بال نکنج اور دیانند ودیالیہ۔

بچے۔ کماری شیلا سنگھ، اجیندر کمار رستوگی اور دیش چندر شرما۔

تلسی اسمارک کو ۲۵۰۰۰ روپے کا عطیہ۔ گورنر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نے اجودھیا میں زیر تعمیر تلسی اسمارک کو ۲۵۰۰۰ روپے کی رقم بطور عطیہ دی ہے۔ گورنر نے یہ عطیہ عظیم شاعر تلسی داس کو خراج عقیدت کے طور پر دیا ہے۔

گورنر نے حال ہی میں اجودھیا کے دورے کے موقع پر جو انھوں نے تلسی اسمارک کی جائے وقوع دیکھنے کے لیے کیا تھا، اس عطیہ کا اعلان کیا۔ یہ رقم تلسی اسمارک لائبریری کے لیے کتابوں اور فرنیچر وغیرہ کی خریداری پر صرف کی جائے گی۔

اسکول میگزین ضبط۔ ریاستی حکومت نے شری رام سہائے ودیالیہ ہائر سیکنڈری اسکول میرٹھ کی سالانہ میگزین رام سہائے پتریکا سنہ ۶۸-۱۹۶۷ء کو ضبط کر لیا ہے۔ اس میگزین کے ادارتی بورڈ میں اسکول کے ٹیچر اور طلباء شامل ہیں اسے ادارے کے پرنسپل نے شائع کیا ہے۔ اس میگزین کے صفحہ ۳۹ پر ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کے ذریعے ہندستان کے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ نفرت اور دشمنی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مذکورہ میگزین کا ہر نسخہ، اس کی نقل، دوبارہ طباعت، ترجمہ یا مذکورہ مقالے کے حصے حکومت کے حق میں ضبط کر لیے گئے ہیں۔

★

حقوق انسانی کا بین اقوامی سال

شمارہ ۵۰، ۱ اشک

نومبر ۱۹۶۸ عیسوی

۵۰ پیسے

نیا دور
جلد ۲۳ | نمبر ۸
کارتک ۱۸۹۰ شاک
نومبر ۱۹۶۸ عیسوی
چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
مہیش پرشاد
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ، لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

عنوانات

اپنی بات

ایک موقع پر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا تھا: "بڑے آدمی شمع کی طرح ہوتے ہیں جو دوسروں کو روشنی دیتی رہتی ہے اور خود پگھلتی رہتی ہے۔ نہرو نے اپنے آپ کو ملک کی خدمت میں گھلا دیا۔" پنڈت جواہر لال نہرو کی ذات اور ان کی خدمات کا اعتراف شایان شان الفاظ میں ممکن نہیں۔ ہندستان کے اس نامور فرزند نے اس گھر میں جنم لیا تھا جو دولت و ثروت اور عزت و شہرت کے لیے مثال میں پیش کیا جاتا تھا ان کے لیے یہ بالکل ممکن تھا کہ وہ اس رئیسانہ زندگی کو اپناتے اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے لیکن

"دل وحشی کو رہ خار بھی کیا یاد آئی"

چنانچہ جواہر لال جی نے امیرانہ زندگی کو خیرباد کہا اور "جراتِ شوق" نے انھیں سیاسیات کی پُرخار وادی میں پہنچا دیا۔ یہ جراتِ شوق ان میں اگر ایک طرف اپنے پدرِ نامدار پنڈت موتی لال نہرو کے باعث پیدا ہوئی تھی تو دوسری طرف ہیرو یونیورسٹی میں دورانِ تعلیم کے ایک چھوٹے سے واقعہ نے اس کے لیے مہمیز کا کام کیا تھا۔ ایک نامور وکیل ہونے کے ناتے موتی لال نہرو کی مصروفیتیں ایسی نہ تھیں کہ وہ کسی اور جانب توجہ کر سکتے۔ لیکن ان کے جذبۂ حب الوطنی نے ان کو سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا اور مہاتما گاندھی جی کی صحبت میں ہندستان کی جنگ آزادی میں وہ بے انہماک سے حصہ لینے لگے۔ ان کے اس انہماک سے ان کا سارا گھر متاثر ہوا اور سیاسی رنگ میں رنگ گیا۔ اُدھر ہیرو کے زمانۂ قیام میں جواہر لال نہرو کو اچھی اور خوش اطوار کے لیے گیری بالڈی کے متعلق ٹریولین کی لکھی ہوئی ایک کتاب انعام میں ملی۔ گیری بالڈی کی زندگی کے واقعات اور مظلوموں کی مدد نیز غلامی کی ذلت سے اٹلی والوں کو نجات دلانے کے لیے اس کی جد و جہد نے نہرو کو بے حد متاثر کیا اور وہ فلاکت زدہ ہندستانیوں کو ان کی مصیبت سے نجات دلانے کا جذبہ لے کر وطن واپس آئے۔ یہاں پہنچ کر وہ گاندھی جی کی قیادت میں آزادیِ وطن کی تحریک میں پورے جوش و خروش سے حصہ لینے لگے۔ یہ بات جواہر لال ہی کے حصے میں آئی کہ انھیں ملک کی جنگ آزادی میں پیش از پیش حصہ لینے اور ہندستان کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرانے کا بھی موقع ملا اور پھر آزادی کے بعد ملک کی سیاسی اور اقتصادی آزادی کو مستحکم بنانے اور اقوامِ عالم میں ہندستان کو ایک ممتاز درجہ دلانے میں بھی ان کا اہم ترین کردار رہا۔ نہرو نے ملک کی آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد اس کے لیے اتنا کچھ کیا اور اس کو اتنا کچھ دیا کہ ان کا نام ہندستان کی تاریخ کے صفحات سے کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ ان کے پیشِ نظر صرف ہندستان کی بھلائی نہ تھی بلکہ وہ ساری دنیا کی بھلائی چاہتے تھے۔ حق گوئی و صداقت پسندی، غیر جانب دارانہ، بےباکانہ و آزادانہ اظہارِ رائے، کمزور ملکوں کا ہمیشہ ساتھ دینا اور طاقت ور ملکوں کی ہاں میں ہاں نہ ملانا، ابنائے وطن کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کے رہنے والوں سے محبت کرنا ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیتیں ہیں جن کے باعث وہ دنیا کے ممتاز ترین رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے اور آج بھی ان کا نام اسی احترام سے لیا جاتا ہے۔ جس طرح ہندستان انھیں کبھی بھلا نہیں سکتا اسی طرح دنیا کے لیے بھی وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ چودہ نومبر اسی عظیم المرتبت رہنما، جنگ آزادی ہند کے مجاہد اور صحیح معنی میں ایک عظیم انسان کی پیدائش کا دن ہے ——— نہرو جینتی ——— اس روز ہم یہ عہد کریں کہ ان کی زندگی سے سبق لیں گے اور ان کے آدرشوں پر چل کر ملک میں اتحاد و یگانگت پیدا کریں گے اور اسے ترقی دے کر خوش حال اور خود کفیل بنائیں گے۔ پارلیمانی طرز کی جمہوریت، غیر فرقہ وارانہ ریاست، منصوبہ بند ترقی، بین الاقوامی معاملات میں سوجھ بوجھ اور تدبر، اقوامِ عالم کے درمیان دوستی اور مفاہمت اور دنیا میں امن یہ تھے نہرو جی کے آدرش جن پر عمل کر کے ہم نہ صرف ہندستان کو ترقی دے سکتے ہیں بلکہ "دنیا کو انسانوں کے لیے ایک صحت مند رہائش گاہ بھی بنا سکتے ہیں۔"

فروری ۱۹۶۹ء میں ہندستان کے عظیم شاعر اور انشا پرداز مرزا غالب کا جشن صد سالہ منایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر فیلڈ و ڈ کا ایک خصوصی نمبر "غالب نمبر" ہوگا، شایع کیا جانا طے پایا ہے۔ ایجنٹ حضرات ابھی سے آرڈر بھیج کر اپنی کاپیاں محفوظ کرا لیں ورنہ عین وقت پر فرمائشات کی تکمیل ہمارے لیے ممکن نہ ہو سکے گی۔

ایڈیٹر

نہرو ___ ایک اصول پرست انسان

ڈاکٹر رادھا کرشنن

عام طور پر تاریخ انسان کو بناتی ہے اور پھر انسان تاریخ بناتا ہے۔
جواہر لال نہرو پر ان کی زندگی کے ابتدائی برسوں میں جو اثرات پڑے انھوں نے ان کی زندگی کے نظریے اور سانچے کے ڈھلنے میں بہت کچھ کیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جب وہ ہیرو میں تھے تو انھیں خوش اطواری کے لیے ایک کتاب بطور انعام ملی تھی۔ یہ کتاب تھی گیری بالڈی کے متعلق جو ٹریویلین نے لکھی تھی۔ تب نہرو نے محسوس کیا کہ گیری بالڈی کیا انقلابی تھا اور اس کی شخصیت کتنی عظیم اور پرکشش تھی، کس طرح اس نے مظلوموں کے لیے جدوجہد کی اور کیسے اٹلی کو آزاد اور متحد کیا۔ انھوں نے سوچا کہ میں بھی کچھ ایسا ہی کیوں نہ کروں۔ گیری بالڈی کے سوانح حیات نے ان کے تخیل کے لیے مہمیز کا کام کیا اور ان میں یہ احساس شوق پیدا کیا کہ ہندستان کے غریبوں، بھوکوں اور کنگالوں کو ان کی مصیبت سے نجات دلائی جائے۔

جب وہ اس نظریے کے ساتھ ہندستان واپس آئے تو انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ایسی سیاسی تحریکیں کون سی ہیں جنھیں اس ملک کے آزاد کرانے میں دل چسپی ہے۔ ایسی تحریکیں تو کئی تھیں لیکن ان کے لیے گاندھی جی کی ہستی بہت پرکشش تھی۔ انھوں نے سوچا کہ یہ ہے وہ انسان جس کے پیش نظر ملک کو آزاد کرانے کا عظیم کام ہے اور جس نے وہ شریفانہ طریقے بھی وضع کر لیے ہیں جن کے ذریعے یہ آزادی مل سکتی ہے۔ نہرو کے خیال میں یہ وہ انسان تھا جو زمانہ دراز سے دکھ سہتے ہوئے اور ستائے ہوئے قدیم ملک کی نمائندگی کرتا تھا جو اس ملک کی عظمت، حوصلے اور اس کی حالیہ پستی کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ دونوں باتیں گاندھی جی میں سموئی ہوئی تھیں۔ نہرو فوراً ان کے وفادار پیرو اور پرجوش شاگرد بن گئے۔ جب وہ پہلے پہل میدان میں آئے تو ایک جلد باز اور غصیلے نوجوان تھے۔ لیکن گاندھی جی نے انھیں سادھ لیا۔ انھیں اپنے طریقوں پر لے آئے۔ پھر تو نہرو نے بڑی طویل مدتیں جیل میں کاٹیں، کوئی بات انھیں گاندھی جی سے الگ نہ کر سکی۔ خود گاندھی جی نے کہا: "ہم میں ذہنی اختلافات ہیں مگر ہمارے دل ایک ہیں۔"

زمانہ قبل تاریخ سے تیاگ اس ملک کا وطیرہ رہا ہے۔ جن بڑے آدمیوں کا ہم احترام کرتے ہیں، عزت کرتے ہیں وہ بادشاہ نہیں، بڑے بڑے کارخانوں کے مالک نہیں اور نہ وہ فوجی سورما ہیں۔ وہ لوگ تو ہمارے سادھو سنت ہیں جنھوں نے تیاگ دیا اور اپنے لیے زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی روا نہ رکھیں۔ اگر آج کی دنیا میں کچھ سلیقہ مندی ہے، اگر کچھ آن باقی رہ گئی ہے، اگر سچائی کے لیے کچھ عزت ہے اور اگر ہم ایسے لوگوں سے آج بھی عقیدت رکھتے ہیں تو وہ اس لیے ہے کہ انھوں نے اس ملک میں کچھ کارنامے دکھائے اور دنیا کو جھنجھوڑ دینے والے ان مہان لوگوں نے کچھ حاصل کر کے دکھایا۔ پس نہرو نے گاندھی جی کی رہنمائی میں سخت جدوجہد کا کام کیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ گاندھی جی کے تیاگ کا طریقہ سامراجوں کو ہلا سکتا ہے، ظالموں کو لرزہ براندام کر سکتا ہے اور آزادی دلا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ حاصل کر لینا ہی آخری منزل نہیں ہے۔ انھوں نے ملک پر نظر ڈالی۔ ملک تو قدرت کی فیاضیوں سے مالا مال ہے مگر یہاں بسنے والے انسان غریب ہیں۔ آخر یہ کروڑوں آدمی بھوکے ننگے کیوں ہیں، یہ اتنے کنگال کیوں ہیں؟ انھوں نے محسوس کیا کہ مجھے لاکھوں لوگوں کی حالت بہتر بنانا ہے۔ اگر آزادی کو واقعی آزادی ہونا ہے تو وہ ایسی آزادی ہونی چاہیے جو افراد کو حقیقی آزادی دے۔ یعنی سیاسی برابری کے ساتھ ساتھ معاشی اور سماجی آزادی۔ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ سائنس کا طریقہ ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے ہم اپنے ملک کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے [illegible] نے کہا کہ سائنس پر زیادہ توجہ دی جائے۔ اور ان کے سامنے جو بھی مسئلے آئے انھوں نے ان کے حل کے لیے سائنس کے طریقے استعمال کیے۔ یہ تھا ان کے کام کرنے کا طریقہ

ماخوذ از جواہر لال نہرو۔ رادھا کرشنن کی نظر میں (دہلی پبلیکیشنز ڈویژن)

سائنس محض زیبائش کے لیے نہیں ہے۔ وہ کوئی بیرونی چیز بھی نہیں ہے بلکہ جوہر طبع میں اور انداز فکر میں سائنس کو داخل کرتا ہے۔ ملک اتنی طویل مصیبت کیوں برداشت کرے۔ اس کی صرف ایک وجہ ہے۔ یعنی لوگوں کے ذہنوں کی نفسیاتی رکاوٹیں ہم ذات پات کے بندھنوں، مذہبی تعصب اور بہت سے دیگر سماجی عدم مساوات کا شکار ہیں۔ ہم نے اپنے آدمیوں کو طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر رکھا ہے اور ان سب باتوں کی ہم کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ اگر ہمیں ان سے چھٹکارا پانا ہے تو ہمیں اپنے سماجی تعلقات میں سائنس کی اسپرٹ کو داخل کرنا ہوگا۔ اپنے ذہنی عادات میں سائنس کی اسپرٹ کو لانا ہوگا۔ اسی لیے نہرو یہ کہتے تھے کہ میں سائنس کا معتقد ہوں۔ سائنس صرف حقیقت کی تلاش ہی نہیں ہے، وہ انسان کو بہتر بھی بناتی ہے، اسی لیے نہرو سائنس اور ٹکنالوجی پر اتنا زور دیتے تھے۔

کیا آج ہماری حالت بالکل درست ہے؟ کیا ہم نے اپنا مقصد پالیا ہے؟ کیا ہم اپنی موجودہ حالت سے مطمئن ہو سکتے ہیں؟ غذا کی کمی کو دیکھئے مختلف میدانوں میں جو سنکٹ آئے ہوئے ہیں انھیں دیکھیے، ان سیاسی اختلافات کو دیکھیے جو ہماری عوامی زندگی کو تباہ کر رہے ہیں۔ ان طریقوں کو دیکھیے جن کی وجہ سے ہمیں اپنے ملک کے مقابلے میں اپنے فائدے کی زیادہ فکر ہے۔ اگر نکمے پن، بدانتظامی اور بے ایمانی کی جڑ اکھاڑ پھینکنا ہے تو پھر نہ صرف اپنے ماحول کے سدھار بلکہ اپنے سدھار کے لیے بھی ذہن کو سائنسی سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ اسی لیے نہرو سائنس اور روحانیت کو بروئے کار لانے پر زور دیتے تھے۔ روحانیت سے مراد ہے ہماری زندگی کی ایک دوسری حد جو محض مادی حد سے آگے ہے۔ انھوں نے ہمیں یہ سب کرنے کو کہا۔ اگر ہم باقی دنیا پر نظر ڈالیں تو آج بھی ہم پیچھے ہیں۔ یہ تو ان سماجی مجبوریوں کی وجہ ہے جو ہم نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں۔ دنیا کے عظیم ترقی یافتہ ملک ذات پات یا فرقے اور طبقے کی بات نہیں کرتے پھرتے۔ وہ ایک ہی رہتے ہیں۔ جاپانی ہوں یا چینی یا کوئی اور ہوں۔ وہ یہ نہیں پوچھتے پھرتے کہ آپ کا مذہب کیا ہے۔ گاندھی جی کا گیت ایشور اللہ تیرے نام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ہم پرماتما کو کیا نام دیتے ہیں۔ جب تک ہم سچے دھرم پر قائم ہیں حق تعالیٰ کو کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔ جہاں تک عوام کی خدمت کا تعلق ہے، مذہب سے اس میں کیا فرق پڑتا ہے۔ جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کے اصول کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی اور ہمیں یہ سکھایا کہ ہمارے اپنے دماغوں کے اندر جو رکاوٹیں ہیں ان سے ہوشیار رہیں کیوں کہ یہ ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔

اس کے بعد وہ اپنے آپ کو دنیا کا ایک شہری محسوس کرتے تھے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مقامات پر سب قومیں مل رہی ہیں اور ساتھ کام کر رہی ہیں اور نہرو نے ناطرف دار رہنے کی پالیسی اختیار کی۔ یہ ناطرف داری اثباتی ہے، یہ تعصب کو ختم کرتی ہے، لوگوں کو اپنے ساتھ لاتی ہے اور انھیں اس قابل بناتی ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھیں۔ ناطرف داری کے صحیح معنی یہی ہیں۔ نہرو نے پنچ شیل کو رواج دیا۔ اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ عوامی معاملوں میں بھی ضبط نفس کی ضرورت ہے۔ وہ بانڈونگ کانفرنس میں شامل ہوئے۔ بلگریڈ کی کانفرنس میں شمولیت کی اور جہاں تک انڈوچائنا کے معاہدوں کا تعلق ہے انھوں نے ان میں نمایاں حصہ لیا۔ تمام معاملوں میں انھوں نے محسوس کیا کہ انسانیت تمام قوموں سے بالاتر ہے۔ ہماری نسل کے لیے جو کام ہے وہ محض اپنی قوم کے بنانے کا نہیں ہے، تمام دنیا کے بنانے کا سوال ہے۔ یہ کسی ایک سانچے میں ڈھل کر نہیں بن سکتی۔ کوئی قوم یہ یقین نہیں کر سکتی کہ اسے اپنے تصور کے مطابق تمام دنیا کو ڈھالنے کا حق ہے۔ ہر قوم کا اپنا جوہر ہے، اپنی روایات ہیں۔ انھیں مٹانا نہیں ہے، انھیں محفوظ رکھنا ہے اور دنیا کی رنگا رنگی اور اسے مالامال بنانے کے لیے بروئے کار لانا ہے۔ ہمیں ابھی اپنے آپ کو اس منزل تک پہنچنے والا راہرو اور کام میں حصہ دار سمجھنا چاہیے۔ ہمیں ہر فرد کو مدد دینا چاہیے کہ وہ پُرم تک پہنچے۔ نہرو نے اپنی کتاب تلاش ہند میں دو سنسکرت کے شلوکوں کے حوالے دیے ہیں اور انھیں دنیا کے نئے نظام کا بنیادی اصول قرار دیا ہے۔ ایک یہ تھا — کہ اپنے کنبہ کو فرقہ کے لیے چھوڑ دو، فرقہ کو قوم کے لیے چھوڑ دو، قوم کو دنیا کے لیے چھوڑ دو اور دنیا کو بھی اپنی پوتر آتما کے لیے چھوڑ دو۔ شخصی آزادی انفرادی جیسے کی پاکیزگی ہے۔ اگر آپ نے اپنی روح کو کھو دیا تو پھر اگر ساری دنیا کو پا بھی لیا تو کیا؟ اپنی آتما کی پراپتی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے جس کے لیے سب کچھ کھلا چھوڑ دینا چاہیے۔

دوسرا سنسکرت کا شلوک جس کا انھوں نے ترجمہ بھی کیا ہے اور جو گاندھی جی اکثر پڑھا کرتے تھے، اس کا مطلب یہ ہے — میں دنیوی راج نہیں چاہتا، میں مکتی (نجات) یا سورگ (جنت) بھی نہیں چاہتا، میں ان لوگوں کا دکھ کم کرنا چاہتا ہوں جو مصیبت میں پڑے ہیں۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔ سماجی برابری اور انفرادی آزادی ہی کسی پاکیزہ عالم گیر نظام کے بنیادی اصول ہو سکتے ہیں۔ سچائی اور محبت یہ اصول ہیں۔ (ستیہ اور اہنسا)۔ نہرو ایک با اصول انسان تھے۔ انھوں نے ہمیں یہ باتیں سکھائیں اور اپنی زندگی میں بھی ان پر عمل کیا۔ ہمارے لیے یہ بڑی بات تھی کہ ہم میں ایک ایسی آتما موجود تھی جو ہمیں نسلاً بعد نسلٍ حوصلہ دلاتی رہے گی۔

نہرو

ظفر صہبائی

ترے خیال کی شمعیں جلائیں گے ہم لوگ
یہ تیرے خواب تھے، مزدور ہوں نگارِ حیات

ترے ہی خوابوں کی محفل سجائیں گے ہم لوگ
لہو سے بن کے نکھرتی ہے ہر بہارِ حیات

اندھیرے ارض و سما کے مٹائیں گے ہم لوگ
ہیں جو کہ عرصۂ عالم میں پاس دارِ حیات

ترے اصولوں کو مشعل بنائیں گے ہم لوگ
جو مشکلوں میں جیے بن کے غم گسارِ حیات

ترے خیال کا جادہ لیے نگاہوں میں
کچھ اپنی جد و جہد کا انھیں ثمر تو ملے

سفر کریں گے ہم اب زندگی کی راہوں میں
ملے گی دادِ ہنر، ناقدِ ہنر تو ملے

ترا خیال تھا انسان ایک ہوں، نہرو
یہ تیرے خواب حقیقت بنائیں گے ہم لوگ

خوشی و غم کے سب ارمان ایک ہوں، نہرو
ترے خیال کی دنیا بسائیں گے ہم لوگ

ہماری فکر کے عنوان ایک ہوں، نہرو
ترے اصولوں کی مشعل جلائیں گے ہم لوگ

ہمارے جینے کے سامان ایک ہوں، نہرو
تری ہی راہ سے منزل پہ جائیں گے ہم لوگ

زمانے بھر میں کہیں دشمنی کی بات نہ ہو
بلا سے راہ جو دشوار ہو تو کیا غم ہے

سحر کا ذکر ہو تیرہ شبی کی بات نہ ہو
ہمارے ساتھ تمھارا ہی عزم محکم ہے

الہلال کے سواد حروف

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد

الہلال کا اجرا نہ صرف اردو صحافت کی تاریخ میں ایک عہد آفریں واقعہ تھا بلکہ خود مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی اور سیاسی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محض ایک "خوبصورت صبح" کا کارنامہ نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے وہ تمام افکار و عوامل کارفرما تھے جو ۱۸۹۹ء کے اواخر سے لے کر ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کے درمیانی وقفے میں مولانا کے ذہن و دماغ پر اثر انداز ہوئے تھے۔ کم و بیش یہ تیرہ سال کی پوری مدت صحافتی ذمے داریوں کی مشق کی مدت تھی جس میں مولانا نے اپنے فکر و فن کو مختلف اخبارات و رسائل سے منسلک رہ کر جلا بخشی تھی۔ نیرنگ عالم، المصباح، مخزن، احسن الاخبار، خدنگ نظر، تحفہ محمدیہ، لسان الصدق، الندوہ، وکیل اور دارالسلطنت ایسے اخبارات و رسائل تھے جن سے متعلق رہ کر مولانا نے نہ صرف اخبار اور اس کی ادارت سے متعلقہ امور کا تجربہ حاصل کیا تھا بلکہ خود اپنی فنی اور فکری تشکیل کو پختہ اور مکمل کیا تھا۔ اور اسی ساری محنت و مشق کا نتیجہ تھا کہ الہلال بہت ہی تھوڑی مدت میں دعوت دین کے احیاء اور درس قرآن اور سنت کی تجدید کا ترجمان بن گیا اور اس نے مسلمانوں کے سیاسی اور غیر سیاسی معتقدات اور اعمال میں اتباع شریعت کی جو تلقین کی اس کی مثال اردو ادب کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ وکیل امرتسر سے متعلق رہ کر ان کا یہ احساس پختہ ہو گیا تھا کہ قومی خدمت اور قوم کو تعلیم دینے کا سب سے بہتر ذریعہ اخبار ہی ہو سکتا ہے۔ وکیل کی سنجیدگی اور متانت اور قومی معاملات میں اس کے صاحب نظر ہونے کی اہمیت اس وقت کے تمام اردو اخبارات میں سب سے زیادہ تسلیم کی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ اس اخبار کے مالک شیخ غلام محمد مولانا کے سیاسی خیالات سے متفق نہ تھے اس لئے مولانا دل برداشتہ ہو کر امرتسر سے بھوپال چلے آئے اور انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ:

"جو مقاصد اب پیش نظر ہیں وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک ایک طاقتور اور وسیع اہتمام و انتظام کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نہ نکالا جائے اور ذاتی پریس نہ ہو۔"[1]

جب ۱۹۰۸ء میں مولانا نے مصر، عراق، شام، ترکی اور فرانس کا سفر کیا تو اخبار اور پریس کی اہمیت کا اندازہ انھیں اور بھی شدت کے ساتھ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ محمد عبدہٗ، جمال الدین افغانی کے ساتھ پیرس سے العروۃ الوثقیٰ نکال کر یورپ کے سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچا چکے تھے اور مصر کے سرکاری اخبار الوقائع المصریہ کے مدیر کی حیثیت سے اپنے اخبار کو اصلاح معاشرہ کا موثر ترین حربہ بنا چکے تھے۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:

"واپسی کے بعد میں کچھ دنوں تک غور کرتا رہا کہ مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا اور کیا پروگرام بنانا چاہئے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمیں اپنے خیالات کو پبلک تک پہنچا کر اپنی موافقت کے لئے رائے عامہ پیدا کرنا چاہئے۔ اس لئے ایک اخبار جاری کرنا ضروری تھا ... اسی ارادہ سے میں نے الہلال پریس قائم کیا۔"[2]

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی صفحہ ۳۲۴ [2] ہماری آزادی صفحہ ۲۱-۲۰

یہ تقریباً وہی سبق تھا جو پریس اور صحافت سے متعلق جمال الدین افغانی نے شیخ محمد عبدہٗ کو دے کر انھیں صحافت کی طرف متوجہ کیا تھا[1]۔

مولانا کے ارادوں نے عملی صورت ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو اختیار کی جب الہلال کا پہلا شمارہ شایع ہو کر منظر عام پر آیا:

"۱۹۰۶ء کی موسم سرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں میری چشم بیداری نے ایک خواب دیکھا... کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہو گئے۔ امیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا۔ اور یاس و قنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ و عزم پر غالب آ گیا۔ لیکن الحمد للہ کہ ارادے کا استحکام اور توفیق الٰہی کا اعتماد ہر حال میں طمانیت بخش تھا۔ یہاں تک کہ آج اس خواب عزیز کی تعبیر عالم وجود میں پیش نظر ہے[2]۔"

الہلال کا پہلا شمارہ مظہر الحق نے الہلال الکٹریکل پرنٹنگ ورکس ایمکلا وڈ اسٹریٹ کلکتہ سے شایع کیا تھا، سرورق پر لا تھنوا ولا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مومنین اور مدیر مسئول و محرر خصوصی کی حیثیت سے احمد المکنی بابی الکلام الدھلوی کا نام درج تھا۔ سالانہ قیمت ۸ روپئے تھی مگر طلبا سے ۴ روپئے ۱۲ آنے لی جاتی تھی جو عوام کا ششماہی چندہ تھی۔ مگر ۹ اکتوبر کے شمارہ سے طلبا کے لئے یہ رعایت ختم کر دی گئی وجہ بقول مولانا یہ تھی کہ:

"لوگ دفتر کی اس مال و دولت کی قربانی سے بیجا فائدہ اٹھانے میں تامل نہیں کرتے اور اس رعایت کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اپنے لڑکے یا چھوٹے بھائی بھانجے کے نام اخبار جاری کرائے کیونکہ وہ طالب علم ہے[3]۔"

الہلال اپنی ظاہری شکل و صورت میں مصری اخبارات سے بہت زیادہ مشابہ تھا جہاں ٹائپ سے چھپنے والے مصور پرچے اس زمانے میں عموماً شایع ہو رہے تھے۔ انھیں میں جرجی زیدان کا الہلال بھی شامل تھا۔ دونوں اخبارات کے ناموں کی مماثلت کی بنا پر بعض حضرات کا یہ خیال کہ ہندستانی الہلال مصری الہلال کا چربہ تھا اسی حد تک درست ہے جہاں تک ظاہری شکل و صورت کا اطلاق ہوتا ہے۔ ورنہ طرز فکر کے اعتبار سے یہ مصر کے اخبار سے قطعی مختلف تھا۔ اس کی سب سے واضح وجہ یہ ہے کہ جرجی زیدان کے زاویہ نظر کا انحصار زیادہ تر مستشرقین یورپ کی تحقیقات سے ماخوذ و مقتبس ہے، برخلاف اس کے مولانا کی فکری صلاحیت تاریخ اسلام کی تحقیق و تفتیش سے مستفیض ہوئی ہے۔

داخلی اور معنوی اعتبار سے قطع نظر ظاہری اور خارجی لحاظ سے بھی مولانا نے الہلال کو اردو رسائل میں ممتاز بنانے کی امکانی جدوجہد کی۔ اور انھوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ "انگریزی پریس کا نمونہ پیش نظر رکھ کر اردو زبان میں رسالہ جاری کیا ہے[4]۔" مولانا کے سامنے دراصل انگریزی پریس کا نمونہ براہ راست نہ تھا بلکہ ان کے پیش نظر مصری اور ترکی اخبارات تھے جو بڑی حد تک یوروپی صحافت سے متاثر تھے۔ ترکی کے اندر انیسویں صدی کے اواخر ہی سے اخبارات کا مذاق عام ہو چکا تھا۔ اور قہوہ خانوں کے اندر کثرت کے ساتھ اخبارات موجود رہنے لگے تھے۔ مولانا شبلی نے اپنے سفرنامے میں ان اخبارات کا تذکرہ کیا ہے اور سب سے زیادہ معروف ہفتہ وار اخبار معارف کی تعریف کی ہے جس میں "ہمیشہ اعلیٰ درجہ کے مضامین لکھے جاتے ہیں ... (جو) زیادہ تر نیچرل سائنس اور آلات جدیدہ کے متعلق ہوتے ہیں[5]۔"

مصر میں بھی تقریباً یہی صورت حال تھی، مولانا شبلی نے لکھا ہے:

"انگریزی گورنمنٹ کی بدولت یہاں کے اخباروں کو آزادی حاصل ہے، اس لئے یہ اخبارات ہر قسم کے ملکی معاملات پر نہایت آزادی کے ساتھ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں... ماہوار رسالے بھی متعدد ہیں۔ ان میں 'مقتطف' اور 'الہلال' زیادہ کامیاب ہیں[6]۔"

مولانا شبلی نے ان ممالک کا سفر ۱۸۹۲ء میں کیا تھا مگر ۱۹۰۸ء کے دستوری انقلاب کے بعد ترکی میں بھی صحافت کسی قدر آزاد ہو چکی تھی اور وہاں کے اخبارات و رسائل بھی اپنی ترتیب و تہذیب میں مصری

---

[1] مجلہ علوم اسلامیہ ۱۹۶۲ء صفحہ ۰۷ [2] الہلال ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء [3] الہلال ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء [4] الہلال ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء
[5] سفرنامہ روم مصر و شام صفحہ ۰۰ [6] سفرنامہ روم مصر و شام صفحہ ۲۹۔

نمونے پر چل رہے تھے، لیکن چونکہ ہندستان کے قارئین انگریزی کے مقابلے میں عربی اور ترکی صحافت سے ناواقف تھے اس لئے مولانا نے ان کا نام لینے کے بجائے انگریزی صحافت کا نام لیا ہے جسے عام ہندستانی معیاری تصور کرتا تھا۔

رسالہ کی صوری آرائش اور زیبائش کے سلسلے میں مولانا نے اس کے ٹائپ اور اس کی تصویروں پر بار بار زور دیا ہے۔ ٹائپ سے مولانا کی دلچسپی پرانی تھی۔ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے اردو ٹائپ کا ایک KEY BOARD خود بنایا تھا اور اس کی مزید اصلاح کے سلسلے میں مرزا ہادی رسوا سے مدد لی تھی مگر یہ نا تمام تھا اور "جب بعض الفاظ کے جوڑ ملائے گئے تو ٹھیک نہ اترے، حروف کی صورت بھی پرخیں کیریکٹر پہ قائم نہ رہی[1]" پتھر کی چھپائی مولانا کے خیال میں پریس کی نشوونما اور ترقی کے لیے مضر تھی۔ چنانچہ ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء کے الہلال میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے لکھا:

"نہیں معلوم کس ظالم نے اول اول پتھر کی چھپائی کی اردو میں بنیاد ڈالی ؎ ہرکہ آمد براں مزید ے کرد لیکن خواہ کوئی ہو اس میں شک نہیں اس نے ہر ایک طرح سے قابل نشوونما ترقی پریس کو ایک صدی پیچھے ڈال دیا اور کم از کم اچھے اخبارات کے نکلنے کا قطعی سدباب ہو گیا[2]"

اور اسی لیے انھوں نے الہلال کو ٹائپ میں نکالنے کا اہتمام کیا۔ چنانچہ پہلے شمارہ کے ابتدائی دو صفحات ترکی ٹائپ اور بقیہ صفحات دوسرے ٹائپ میں طبع کرائے گئے۔ وہ مسلسل اس بات کے لئے کوشاں رہے کہ زیادہ سے زیادہ بہتر ٹائپ فراہم کی جائے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں ترکی کارخانہ احمد احسان کو تین مختلف نمبروں کے ٹائپ کے لئے آرڈر بھیجے جانے کا حوالہ ملتا ہے "جس کا ٹائپ بدرجہا خوشنما اور دخانی فونڈری میں ڈھلنے کی وجہ سے چھپنے میں بالکل... خوشخط لکھے ہوئے حروف سے اشبہ ہے[3]"

مولانا نے نصرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بیروت کے کارخانے خلیل سرکین کے حروف کے لئے بھی آرڈر بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا" جو ایک مشہور شامی ادیب اور ماہر فن خلیل یازجی کا اصلاح کردہ ٹائپ اور ایک دوسرا سواد رکھتا ہے[4]"

ان کارخانوں کے ٹائپ آئے یا نہیں، اس کا پتہ لگانا ایک دشوار امر ہے لیکن بعد کے شماروں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حروف میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی حالانکہ ۲۴ جون ۱۹۲۶ء کے شمارہ میں مولانا نے اپنے قارئین کو یہ بشارت دی کہ "مصر اور جرمنی کا ٹائپ بھی آگیا ہے، امید ہے کہ مزید حسن و زیبائش کا باعث ہو گا[5]"

شروع میں اس جدید ٹائپ پر مولانا کے عام کمپوزیٹر سہولت کے ساتھ کام نہ کر سکے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"عین وقت پر کمپوزیٹر کام کرنے سے عاجز ثابت ہوئے اور جس قدر کمپوز کیا وہ بالکل غلط اور بے قاعدہ تھا، مجبوراً دوسرے ٹائپ میں از سرِ نو کمپوز کرایا گیا... البتہ چونکہ ترکی ٹائپ کا اعلان ہو گیا تھا اس لئے ابتدا میں دو صفحے بشکل نمونے کے خیال سے کمپوز کرائے گئے ہیں[6]"

ان تمام اہتمامات سے اندازہ ہوتا ہے کہ الہلال کو صوری اعتبار سے معیاری بنانے کے سلسلے میں مولانا نے سنجیدگی کے ساتھ جدوجہد کی اور اردو کے جس ٹائپ میں الہلال طبع ہوا وہ کلکتہ اور الہ آباد کے تمام اردو ٹائپوں سے مجموعی طور پر بدرجہا بہتر اور خوشنما تھا۔ اس وقت تمام ہندستان میں اردو ٹائپ کی سب سے بڑی فونڈری بیپٹسٹ مشن کلکتہ کی تھی جس میں ایشیاٹک سوسائٹی کی کتابیں چھاپی جاتی تھیں، مگر تقابل سے اندازہ ہوتا ہے کہ الہلال کا ٹائپ سواد خط کے لحاظ سے گو چنداں مختلف نہ تھا مگر اپنی ترکیب، اتصال اور مجموعی زیبائش میں اس سے بہتر تھا۔

ٹائپ ہی کے ساتھ ساتھ مولانا نے تصویروں کی اشاعت پر بھی خصوصی توجہ دی اور اس بات کی کوشش کی کہ حتی الامکان اصلی فوٹو حاصل کر کے

---

[1] مرزا ادیب کے تنقیدی مراسلات صفحہ ۱۹۲ [2] الہلال ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء [3] الہلال ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء [4] الہلال ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء [5] الہلال ۲۴ جون ۱۹۲۶ء
[6] الہلال ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء۔

ان کے بلاک تیار کرائے جائیں۔ ۱۴ ر اگست ۱۹۱۲ء کے شذرات میں انھوں نے لکھا:

"ہم نے اول تو تصویروں کے بلاک بنانے کا انتظام جس کارخانے کے سپرد کیا ہے وہ تمام ہندستان میں اوّل درجے کا کارخانہ ہے اور یہ کہنا ضروری نہیں کہ کلکتے سے بہتر ان چیزوں کا انتظام اور کہیں نہیں ہو سکتا، پھر اخبار کے لئے پین کی ڈبل کراؤن مشینیں الگ اور مخصوص رکھی ہے۔ اور اس فن کے جاننے والے جانتے ہیں کہ چھپائی کے نازک کاموں کے لئے اس کارخانہ اور اس سائز کی مشین مشہور ہے۔ ہم نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور خاص ہاف ٹون کی چھپائی کی ٹیڈل مشین بھی خریدی اور بعض تصویروں کو اخبار سے الگ چھاپنے کا انتظام کیا۔"[1]

مولانا نے جب ۲۰ ر اگست ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں پورے صفحے پر غازی انور بک کی تصویر شایع کی تو یکم ستمبر ۱۹۱۲ء کے شذرات میں انھوں نے اس امر کی طرف دوبارہ اشارہ کیا:

"تصویر امید ہے کہ ناظرین کو پسند خاطر ہوئی ہو تاہم ہمارے پیش نظر جو نمونے ہیں اس کے اعتبار سے خود ہم تو اسے شایع کرکے زیادہ خوش نہیں، اگر اخبار کی اشاعت کی طرف سے تھوڑا سا بھی اطمینان میسر آجائے تو پھر البتہ ہر نمبر کے دو صفحے پریس کی صناعی نمونوں کے لئے مخصوص کردیں اور وہ یورپ کے باتصویر رسالوں سے کسی بات میں کم نہ ہوں۔"[2]

ابتدائی شماروں میں زیادہ تر تصویریں طرابلس اور ناموران غزوۂ طرابلس سے متعلق تھیں۔ ان میں سے کچھ کے نقوش واضح تھے اور کچھ کے مدھم۔ چنانچہ جب الہلال کے قارئین نے مولانا کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو انھوں نے لکھا:

"الہلال پریس میں تصاویر اور چھپائی کا جو انتظام کیا گیا ہے وہ انگریزی رسائل کے پریسوں سے کسی بات میں کم نہیں ہے، لیکن اگر سرے سے تصویر کی اصلی کاپی ہی خراب ہو تو پریس اس کے لئے کیا کر سکتا ہے... امثالین ذرائع کی تصاویر تو ہزاروں لنڈن نیوز ایجنسی، اسفیر، گرافک وغیرہ میں چھپ چکی ہیں لیکن جو تصویریں عثمانی ذرائع سے ملتی ہیں وہ عموماً نہایت بے سروسامانی کی حالت میں کھنچی ہوئی ہوتی ہیں۔"[3]

ان بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے ظاہری اعتبار سے الہلال کو دیدہ زیب اور جاذب نظر بنانے کی حتی المقدور سعی کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کا اخبار اپنے معاصر اخبارات، خصوصیت کے ساتھ البشیر، مشرق، مسلم گزٹ، ہندوستان، پیسہ اخبار، زمیندار، علی گڑھ گزٹ، مساوات، ہمدرد وغیرہ سبھی سے بہتر بن گیا۔

الہلال کے لئے یہ تمام اہتمامات جو مولانا نے کئے وہ یقیناً کثیر مصارف کے متقاضی رہے ہونگے۔ اخبارات و رسائل سالانہ چندہ کے علاوہ اپنے اخراجات کا ایک بڑا حصہ اشتہارات کے ذریعے پورا کرتے ہیں لیکن اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں جب کہ خریداروں کی تعداد نسبتاً کم ہوتی ہے مولانا نے اشتہارات حاصل کرنے کی کوئی جد و جہد نہ کی اور رسالے کے داخلی صفحات کو اشتہارات سے بچائے رکھا۔ ابتدائی چند شماروں میں ایک مختصر سا مقامی اشتہار البتہ شامل ہے۔ اور وہ یہ ہے:

"عربی فارسی اور اردو ٹائپ کی اعلیٰ ترین چھپائی کے لئے دار الطباعۃ الہندیہ مستعد ہے۔"

اس کے علاوہ کوئی دوسرا اشتہار بہت دنوں تک نظر نہیں آتا۔ البتہ ۲۵ ر اگست ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں ایک سمن بغرض انفصال مقدمہ شایع ہوا ہے جو منصرم کے دستخط سے عدالت منصفی دیوریا ضلع گورکھپور اجلاس محمد شمس الحسن صاحب سے جاری ہوا تھا جس میں مدعی نرائن داس اور مدعا علیہ بجرام ولد رام چندر متوفی "ساکن حال شہر کلکتہ محلہ کال گھاٹ ملک بنگال" ہے۔ مقدمے کے سلسلے میں ایک دوسرا اشتہار ۷ ر اور ۱۳ ر جنوری ۱۹۱۳ء کے مشترکہ شمارہ میں قاضی عبد العزیز نائب تحصیل دار کوئٹہ بلوچستان کی عدالت سے ۳۷ روپیہ ۲ ر آنہ کے ایک دعوی کے متعلق شایع ہوا ہے جس میں مدعا علیہ روپوش تھا۔ یہ شاید آخری سمن ہے جو الہلال کے صفحات

---

[1] الہلال ۱۴ ر اگست ۱۹۱۲ء [2] الہلال یکم ستمبر ۱۹۱۲ء [3] الہلال ۲۹ ر ستمبر ۱۹۱۲ء۔

میں شایع ہوا۔ البتہ بعد کے شماروں، البلاغہ اور آخری دور کے الہلال کے کور پر اشتہامات کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی گئی ہے۔

الہلال کے سلسلے میں مولانا نے عطیات قبول کرنے سے بھی گریز کیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کے لئے ایک دھبہ اور سرتاسر عار ہے۔ وہ اخبار نویسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی ایک جماعت سمجھتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیئے۔ چاندی اور سونے کا سایہ بھی اس کے لئے سم قاتل ہے۔ انھوں نے لکھا:

"جو اخبار نویس رئیسوں کی فیاضیوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی اعانت اور قومی عطیہ اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نور ایمان کو بیچیں بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر اور قلندروں کی کشتی کی جگہ قلمدان لے کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور "ہر گلی کوچہ کام ایڈیٹر کا" کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں۔"[1]

عطیہ مانگنا تو درکنار، عطیات قبول کرنے سے بھی مولانا نے گریز کیا۔ چنانچہ جب قوم کے ایک مشہور صاحب ریاست اور قومی خدمات میں سربرآوردہ بزرگ نے الہلال کا پہلا نمبر دیکھ کر ایک چیک روانہ کیا تو مولانا نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بڑی سختی کے ساتھ تشذرات میں لکھا:

"ہم خاک نشینان بوریائے مذلت مسند نشینان عز وجاہ کے بدل وعطا کے مستحق نہیں .... ہم اس بازار میں سود اسے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے ہیں، صلہ وتحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت ودشنام کے طلب گار ہیں، عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش واضطراب کے کانٹے ڈھونڈھتے ہیں دنیا کے زر وسیم کو قربان کرنے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے آئے ہیں۔"[2]

سچی بات تو یہ ہے کہ مولانا نے الہلال کا اجرا محض ایک تجارتی کاروبار اور دوکاندارانہ شغل کے لئے نہیں کیا تھا، بلکہ وہ ایک ایسا ذریعہ تلاش کر رہے تھے جو عوام سے رابطہ پیدا کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہو اور جس کے توسط سے وہ اپنے افکار و خیالات کی نشر و اشاعت کر سکیں۔ جس طرح جمال الدین افغانی، اور شیخ محمد عبدہٗ نے العروۃ الوثقیٰ کے ذریعے یورپ کے سیاسی حلقوں میں اپنے خیالات کی چنگاریاں بکھیر دی تھیں اسی طرح مولانا بھی اپنے نظریات کی ترویج و اشاعت اسی وسیلے سے کرنا چاہتے تھے۔ پریس اور مطبوعات کی اہمیت کا انھیں خاطر خواہ اندازہ تھا، ان کے نزدیک نہ صرف علم وادب کی ترقی کے لئے بلکہ قومی اور اجتماعی زندگی کی نشو ونما کے لئے بھی پریس کا وجود ضروری تھا۔ سرسید، افغانی اور عبدہٗ بھی پریس کی اثر پذیری اور وسعت سے اچھی طرح واقف تھے۔ ابوالکلام کی اولین تحریروں میں بھی ایک کا موضوع اخبار نویسی ہی تھا، خود الہلال میں بھی ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

"جہاں تک پریس اور صحافت (جرنلزم) کا تعلق ہے دنیا اس قدر آگے نکل چکی ہے کہ اب دس برس پیشتر کی صحافت صدیوں کی پرانی چیز معلوم ہوتی ہے، قومی زندگی کی تعمیر کے لئے ایک بنیاد کی اینٹ زبان ہے، زبان کی ترقی کے لئے پہلی چیز اس کی ادبیات ہیں، ادبیات کی نشو ونما بغیر اعلیٰ درجہ کے رسائل و مطبوعات کے ممکن نہیں۔"[3]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اندیشۂ سود و زیاں سے بالاتر ہو کر ایک سوچے سمجھے ہوئے مشن کے تحت صحافت کی وادی میں قدم رکھا تھا، ایک یوسف مقصود تھا جس کی بازیافت کے لئے انھوں نے الہلال کے صفحات کو کبھی اپنے چشم خونیں کے آنسوؤں سے رنگا اور کبھی اس کے سواد حروف کے اندر اپنے دل وجگر کے ٹکڑے بچھا دئے۔ انھوں نے لکھا:

"اگر یہ میرے تمام کام محض ایک تجارتی کاروبار اور ایک دوکاندارانہ شغل ہیں جن سے قومی خدمت اور ملت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر سنبھل سکوں وہ میری عمر کا خاتمہ کر دے اور میرے تمام کاموں کو ایک دن بلکہ ایک لمحہ کے لیے بھی کامیابی کی لذت چکھنے نہ دے۔"

★

---

[1] الہلال ۲۰ر جولائی ۱۹۱۲ء [2] الہلال ۲۴ر جون ۱۹۲۷ء [3] الہلال ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء۔

گاندھی جی کی یاد میں

روش صدیقی

دیر و حرم کی باتیں کوئی کیا سنتا مے خانوں میں
اپنے لہو سے رنگ بھرا ہے تو نے ان پیمانوں میں

حرفِ محبت جادو تیرا، تیری شکتی پیت کی ریت
تو نے بسائی پیار کی بستی نفرت کے ویرانوں میں

اہلِ حرم کے دل کو تو نے بت خانوں کا سوز دیا
شمعِ یقیں کعبے سے لے کر روشن کی بت خانوں میں

عشق و وفا کی آگ میں جل کر تو نے پایا حسن کا بھید
شمعِ ازل کا پروانہ، خود شمع بنا پروانوں میں

ارضِ وطن کے معماروں نے کتنے محل تعمیر کیے
تیری کٹی کا نور بھی ہوتا کاش نئے ایوانوں میں

تیرا ذوقِ جنوں بھی ہوتا کاش خردمندوں کے پاس
تیرے دل کا درد بھی ہوتا کاش ترے فرزانوں میں

اپنوں کا جو حال ہوا ہے اُس کو کاش سمجھ سکتے
لے کر تیرے پیار کی دولت ہم پہنچے بیگانوں میں

تیرے نام کی اوٹ میں خوش ہیں کھوٹ کپٹ کے بیوپاری
مایا کے انبار لگے ہیں جن کے ظلمت خانوں میں

حسن شناسِ عشق و جنوں ہیں ہم تو روزِ ازل سے روش
دھوم مچائی ویرانوں میں جشن کیے طوفانوں میں

نظم اور اُس کے لوازمات

زرینہ ثانی

نظم کا عمل تخلیق اس وقت سے شروع ہو جاتا ہے جب شاعر کسی خاص جذبے یا خاص احساس کو بنیاد قرار دے کر نظم لکھنے کا تصور کرتا ہے۔ اسی بنیادی خیال کو وہ شاعرانہ صداقت اور جمالیاتی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نظم کے پیکر میں پیش کرتا ہے۔ شاعر کو اپنے خیالات یا محسوسات کو نظم میں پیش کرنے کے لیے فن کارانہ چابک دستی، تخیل کی بلندی، الفاظ پر دسترس اور شاعرانہ وجدان کی ضرورت ہے۔ ورنہ اس کا خیال صحیح طور سے نظم نہ ہو سکے گا اور نظم کے بنیادی تصور سے جو خیال یا اثر وہ قاری کے ذہن پر مرتسم کرنا چاہتا ہے نہ کر سکے گا۔

زمانۂ قدیم کے فنون لطیفہ کے واقف کار جانتے ہیں کہ ابتدا میں علوم مذہبی کو بھی شاعری کی شکل میں پیش کیا گیا۔ اوستا، وید، توریت، زبور، انجیل اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ انسان نے مافوق الفطرت عناصر پر قابو پانے کے لیے مختلف قسم کے منتر اور ٹوٹکے سیکھے جو شاعری ہی کی ایک شکل ہے۔ قدیم یونانی سکما نے اپنے افکار اور نظریات کو شاعری ہی کے پیراہن میں پیش کیا۔ تہذیب و تمدن کے اصول شعری پیرائے میں مدون کیے گئے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدا ہی سے شعر و شاعری حیات انسانی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں بلکہ سماج کا اہم عنصر بن گئی ہے۔ اور شعری سرمایہ بہ نسبت نثر کے زیادہ اپیل رکھتا ہے۔ اس کی وجہ بعض لوگوں کے نزدیک نظمیہ کارنامے کی وہ اصل روح ہے جو قاری پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نظمیہ میں لفظوں کی ترتیب سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے وہی اثر اندازی میں معاون ہوتا ہے۔ لیکن شعر یا نظم کا اثر صرف معنی یا روح یا صرف الفاظ یا ہیئت کا مرہون منت نہیں بلکہ دونوں کے صحیح توازن کی وجہ سے نظم تاثر آفریں ہوتی ہے۔ اس لیے نظم کی کامیابی کے لیے اسلوب و ہیئت اور موضوع و مواد دونوں میں کشش ہونی چاہیے کیونکہ نظم خیال و الفاظ دونوں سے مرکب ہوتی ہے۔

ملٹن نے عمدہ نظم کے لیے سادگی، نازک خیالی اور اثر کا ہونا لازمی قرار دیا ہے۔ حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری لکھتے وقت اسی کا تتبع کیا۔ انھوں نے بھی اچھے شعر کے لیے جوش، اصلیت اور سادگی کو ضروری عناصر بتایا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی نے شعر کے لیے اصلیت، سادگی، بلندی اور باریکی وغیرہ اوصاف کا ہونا لازمی قرار دیا ہے۔ اصلیت سے مراد یہ ہے کہ خیال میں پیچیدگی نہ ہو۔ جو خیال نظم میں پیش کیا گیا ہو وہ عقل و اعتقاد کی رو سے ممکن ہو۔ یا کم از کم شاعر اسے کسی ضرورت کے تحت جائز قرار دے۔ مثلاً شکسپیر کے میکبتھ (MACBETH) میں چڑیلوں اور ڈائنوں کا ذکر ہے۔ ٹمپیسٹ (TEMPEST) میں جادو کا کھیل اور پریوں کا رقص ہے۔ اسی طرح مڈسمر نائٹس ڈریم (MID SUMMER NIGHTS DREAM) میں جن اور پریوں کا تذکرہ ہے۔ ملٹن کی شہرۂ آفاق نظم "پیراڈائز لاسٹ" (PARADISE LOST) میں بھی ایسے ہی ناقابل یقین عناصر کی نمود ہے۔ اس قسم کی نظموں میں شاعر امکان کو ممکن تصور کر لیتا ہے۔ اس لیے ہم اعتراض نہیں کر سکتے۔ نظم میں سادگی سے مراد پیچیدگی اور الجھاؤ سے گریز ہے۔ نظم کی بلندی شریفانہ جذبے اور انسانی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ نظم میں باریکی پیدا کرنے کے لیے شاعر کو کائنات اور نفسیات انسانی کے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔ اور

ترتیب جذبات کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے۔ نظم کے خیال کے علاوہ اس کے اسلوب میں بھی سادگی کا ہونا ضروری ہے۔ بے جا الجھاؤ اور پیچیدگی سے قاری کا ذہن بھٹکنے لگتا ہے۔ اور نظم نگار جو اثر اس پر ڈالنا چاہتا ہے اس کے لیے وہ زمین ہموار نہیں کر سکتا۔ سادگی کے علاوہ اختصار، زور، مناسبت الفاظ اور جدت ادا سے بھی نظم کی عظمت دوچند ہو جاتی ہے۔ نظم میں سادگی پیدا کرنے کے لیے سلیس اور مانوس الفاظ استعمال کیے جائیں، الفاظ کی ترتیب قواعد زبان اور اصول بیان کے مطابق ہو۔ تعقید کا عیب نہ ہو۔ بعید از فہم تشبیہہ و استعارے سے گریز کیا جائے۔ اسی طرح کسی غیر معروف واقعے سے تلمیح نہ اخذ کی جائے۔ حشو و زوائد سے اجتناب کیا جائے۔ خیالات کی ادائیگی کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو ذہن میں قوت انتقال پیدا کریں اور ذہن نظم سے متعلق دوسرے خیالات کی طرف بھی منتقل ہو سکے۔ نظم میں زور پیدا کرنے کے لیے تخیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ مناسبت الفاظ کے لیے ضروری ہے کہ الفاظ خیالات سے ہم آہنگ ہوں۔ پیرایہ بیان پرانا اور فرسودہ نہ ہو۔ یہ وہ لوازمات ہیں جن سے نظم میں حسن و جمال اور بلندی عظمت آتی ہے۔

نظم کی ہیئت و اثر کے لیے موزونیت اور موسیقیت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ موزونیت کی وجہ سے نظم میں تسلسل اور ترنم پیدا ہوتا ہے۔ ابتدا میں بعض لوگوں نے نظم کے لیے موزونیت ہی کو کافی سمجھا۔ ان کے نظریے کے مطابق نظم میں عروض ہی سب کچھ تھا۔ انھیں اس سے سروکار نہ تھا کہ یہ موزونیت رکھنے والے الفاظ کسی حسن کے احساس سے وابستہ ہیں یا نہیں۔ لیکن اس نظریے کو باطل قرار دے دیا گیا کیونکہ بہت سا ہم قافیہ اور فن عروض کے لحاظ سے موزوں مواد ایسا پیش کیا گیا جو بے معنی تھا اور اس کا مستحق نہ تھا کہ اسے نظم یا ادب میں شمار کیا جائے۔ اس طرح عروض کی اہمیت کم ہو گئی اور احساس حسن کے اظہار کو نظم کی تخلیق کا خاص اور اہم عنصر قرار دیا گیا۔ گویا عروض اور قافیے کی حیثیت محض تزئین و آرائش ہو گئی۔ لیکن یہ بھی ایک غلط نظریہ ہے۔ اسے اپنا کر ہم نظم اور نثر میں تمیز نہیں کر سکتے۔ لہٰذا نظم کے لیے عروض، احساس حسن اور اس کا تاثر دونوں ہی اہم ہیں۔

وزن اور ترنم کا ذوق فطرت انسانی میں ودیعت کردہ ہے۔ اس ذوق کی نشانیاں کائنات میں بھی ملتی ہیں۔ ذرے ذرے میں ایک ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ لہروں کا ایک ساتھ چلنا، آبشاروں کا مسلسل ترنم، ہواؤں کے جھونکوں کا ایک خاص لَے میں چلنا، کھیتوں کا لہلہانا، سب کائناتی ہم آہنگی اور موسیقی کی شہادت دیتے ہیں۔ اسی ذوق کی وجہ سے ابتدا میں شاعری کے لیے علم عروض کی کوئی خاص ضرورت نہ محسوس ہوئی بلکہ شاعر اسی فطری ذوق کو کام میں لاتا رہا البتہ علم و فن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ جب وزن اور موسیقی کے اصول مرتب کیے گئے تو نظم بھی اسی ذیل میں آ گئی۔ شاعر اپنے احساس حسن اور تجربے کو مخصوص فنی طریقے سے نظم میں پیش کرتے رہے۔ لیکن وزن ہی کو سب کچھ سمجھ لینا بہت بڑی غلطی ہے؛ وزن صرف موسیقی برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ وزن کے ساتھ ساتھ نظم کی کامیابی کے لیے تناسب آہنگ کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ موسیقی کی ابتدا شاعری سے قبل ہو چکی تھی۔ جب الفاظ کو موسیقی میں ضم کیا گیا تو شاعری کی ابتدا ہوئی۔ اس طرح شاعری کے لیے الفاظ و آہنگ اتنے ہی ضروری ہیں، جتنا ترنم و توازن۔ اس لیے نظم میں الفاظ کے انتخاب کے وقت حسن انتخاب اور شعور لسانی سے کام لینا ضروری ہے۔ وزن اور موسیقی کے سلسلے میں قافیے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اور نظم کی ہیئت کو متعین کرنے میں معاون و مدد بھی۔ لیکن بقول سید احتشام حسین:

> "قافیہ مقصود بالذات کسی حالت میں نہیں ہے۔ اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ وزن کے مکمل ہونے کا احساس دلائے اور دوسرے ہم قافیہ اشعار کے ساتھ کسی معنوی نہیں صوری ربط کا پتہ دے اور ایک کھٹکے کی طرح ذہن میں نغمہ کی کیفیت کو بیدار کرے"[1]

نظم میں موزونیت ایک اہم جز ہے۔ یہاں مصرعے کی موزونیت اور نظم کی موزونیت کا فرق واضح کر دینا ضروری ہے:

> مصرعے کی موزونیت یہ ہے کہ وہ کسی عروضی وزن کے مطابق ہو اور نظم کی موزونیت یہ ہے کہ اس کے مصرعوں میں باہم تناسب اور وزن ہو"[2]

یعنی نظم میں مختلف مصرعے اس طرح ہم آہنگ ہوں کہ جو بنیادی تصور تخلیق کے وقت شاعر کے ذہن میں تھا وہ رفتہ رفتہ واضح ہوتا جائے۔ اس مقصد کے لیے شاعر کو حشو و زوائد سے احتراز کرنا ضروری ہے ورنہ اس کا تصور لفاظی کے دام میں گم ہو کر رہ جائے گا۔

نظم کو زندگی سے گہرا ربط ہے۔ وہ حیات انسانی کی تنقید ہے۔ نظم نگار

---

[1] تنقیدی جائزے ص۱۱۱ [2] ہماری شاعری ص۷۱

اپنے خیالات کو صحیح طور سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ قوم کا مصلح بھی نوع انسان کا ہمدرد اور انسان کی عظمت کا نقیب ہے۔ وہ اپنی نظموں کے ذریعے قوم کے اخلاق سنوار سکتا ہے۔ حب الوطنی کا صور پھونک سکتا ہے اور لوگوں کے دلوں کو اپنی نظموں سے منور کر سکتا ہے۔ حالی۔ اقبال، چکبست، اکبر وغیرہ کی نظمیں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

نظم میں ہیئت اور اسلوب کے لیے نظم نگار کو مشق اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن خیالات اور معنی اس کی اپنی شخصیت میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس لیے نظم نگار کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں خلوص اور دیانت داری سے کام لے۔ اگر نظم نگار کی شخصیت اعلیٰ اور ارفع ہے تو اس کے خیالات میں بھی توانائی اور زندگی کی جھلک ملے گی اور اگر اس کی اپنی شخصیت پست ہے تو خواہ وہ اپنی نظموں کے لیے ایسے موضوعات منتخب کرے جو اعلیٰ اقدار کے حامل ہیں، تب بھی وہ کامیاب نظم کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شعر ہو یا نظم فن کار کی اپنی شخصیت کی تابع ہوتی ہے۔ وہ جس خیال یا جذبے کی ترجمانی کرے گا اس پر اس کی اپنی شخصیت کی چھاپ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نظم میں نظم نگار کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور نظم نگاری میں فرد کی ذات کا اظہار اہم ہے۔ ویسے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ نظم میں خارجیت کا غلبہ ہوتا ہے، لیکن یہی خارجیت ہے جو داخلیت کی طرف مراجعت کرتی ہے یعنی شاعر نظم میں جس بنیادی تصور کو پیش کرتا ہے اس کے حقائق کا تجزیہ کرتا ہے اور پھر جہاں تک ہو سکتا ہے اپنے تجزیے کے نتائج اور اس کے تصور کے حقیقی اجزا کو نظم میں پیش کرتا ہے۔ اس طرح اس بنیادی تصور سے اس کا اپنا رابطہ پیدا ہو جاتا ہے اور تجزیے سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ لہٰذا نظم کی خارجیت میں داخلیت ضم ہو جاتی ہے۔ نظم نگار چونکہ نظم میں اپنے حاصل شدہ تجربات بیان کرتا ہے اس لیے نظم میں اس کے اپنے ذاتی احساسات اور جذبات بھی شامل ہوتے ہیں اور اس سے اس کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ پس نظم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ نظم نگار کا مشاہدۂ کائنات گہرا ہو اور تخیل رسا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے اپنے نظریات کو خوبصورتی، صداقت اور شعریت کے ساتھ بیان کرنے کی قدرت بھی ہو۔

نظم کے لیے تخیل کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی تخیل سے نظم نگار نظمیہ کا اعلیٰ مقصد حاصل کر سکتا ہے۔

"حال پر قناعت نہ کرنا اور ایک بہتر مستقبل کے حصول کی آرزو میں لگے رہنا اسی کو تخیل کہتے ہیں۔ اور یہی شاعری کی جان ہے[1]"

بعض ناقدین نے نظم کا مقصد حصول مسرت اور حسن قرار دیا ہے لیکن اگر نظم کسی اعلیٰ مقصد یا رجحان کی حامل ہے اور جمالیاتی ذوق کو تسکین دیتی ہے تو وہ عظیم الشان کہلانے کی مستحق ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نظم لفظوں کا ایک فن ہے اور اس میں فنون لطیفہ کی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ یہ جمالیاتی احساس سے متعلق ہے۔ لیکن انسانیت کی فلاح کو بھی نظم کے فریضۂ عمل میں شامل ہونا چاہیے۔ اس کا مواد اور موضوع ایسا ہو جو انسان کے جمالیاتی ذوق کو تسکین دینے کے ساتھ ساتھ انسانیت کی عظمت میں اضافہ کرے اور صالح اقدار کی ضامن ہو۔ نظم نگار اپنے ماحول اور معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے۔ اس کی نظم اسی ماحول و معاشرے سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس لیے نظم میں صداقت لانے کے لیے اسے اپنے اطراف کے میلانات اور رجحانات کا جائزہ لینا چاہیے اور اپنا مقصد اس طرح پیش کرنا چاہیے جو عوام میں مقبول ہو سکے۔ کیوں کہ شاعری "ساحری یا جزو پیغمبری ہے"۔ جس طرح پیغمبروں کے سامنے زندگی کے مختلف مسائل ہوتے ہیں اور ان کا وہ اپنے تخیل کی مدد سے ایسا حل پیش کرتا ہے جس سے عوامی زندگی کی فلاح وابستہ ہے، اسی طرح شاعر کا بھی فرض فلاح انسانی ہے۔ شاعر کی نگاہ گہری اور تخیل دوررس ہونا چاہیے تاکہ وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی دیکھ سکے جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہیں اور ان سے مفید نتائج برآمد کر سکے تاکہ وہ نظمیہ کا اعلیٰ مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

★

---

[1] شعر و غزل ص ۳۶

غزل

جمیل مظہری

ہے فضول یہ کوششِ چارہ گری، تمھیں اپنے ہی نازِ وفا کی قسم
یہ دعا کا ہے وقت دوا نہ کرو، تمھیں حرمتِ لفظِ دوا کی قسم

تری اک نظر سے نجات مری کہ سحر سے قبل نہ ہو رات مری
تجھے قسمتِ شمعِ سحر کی قسم، تجھے رحمتِ بادِ صبا کی قسم

ہوا تیرے کرم سے یہ حالِ زبوں کہ جوشِ عمل ہے نہ ہوشِ جنوں
مرے دل میں نہیں کوئی قطرۂ خوں، تری شوخیِ رنگِ حنا کی قسم

جو نصیب کو میرے بگاڑ چکے تو بنانے کی فکر کبھی نہ کرو
کل اُلجھ کے جو زلفوں سے ٹوٹ گیا اُسی شانۂ عقدہ کشا کی قسم

میں نثارِ عطا، میں فدائے کرم، ترے قہر میں بھی ہے ادائے کرم
ہوئی جس پہ عنایتِ برقِ غضب، اُسی خرمنِ حرص و ہوا کی قسم

نہ غریب سے چھین یہ لطفِ خلش کہ یہی ہے متاعِ جمیلِ حزیں
کبھی کر نہ ارادۂ ترکِ جفا، تجھے معنیِ لفظِ وفا کی قسم

مونچھیں

ادارہ

میں اب تک اس غلط فہمی میں تھا کہ یہ مونچھیں جو آج تک بھگ تین بیسی ساٹھ برس سے دم کے ساتھ چلی آرہی ہیں، میری اپنی جائداد ہیں، اور نائی کو چھوڑ کر جسے صرف اتنی چھوٹ ملی ہے کہ ہر دوسرے تیسرے دن بھی اپنی راشے سے نہیں، میری مرضی کے مطابق ان کی نوک پلک ٹھیک کر دے، اور کسی کو ان کی کتر بیونت، کاٹ چھانٹ میں دخل دینے، مین میکھ نکالنے کا حق نہیں۔ ان کا اَن داتا ہوں تو میں، پالن ہار ہوں تو میں، اور میرے اس پیدائشی حق میں کوئی ساجھی نہیں، یہ میری ہیں اور صرف میری ہیں۔

چنانچہ میں ان مونچھوں کی شکست ریخت میں اپنی من مانی کرتا رہا، اور کسی بڑے سے بڑے افلاطون خاں کو کبھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی، اب ایک خدائی فوجدار، دخل در معقولات، مان نہ مان میں تیرا مہمان قسم کا گروہ نکلا ہے، جو اور تو اور، ان مونچھوں پر بھی اپنا عمل دخل جتاتا ہے۔

جب سے میں برت رہا ہوں ان مونچھوں پر کئی دور بیتے ہیں۔ برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن جو اوپر کے ہونٹ پر ریشمی رواں چمکا اور مسیں بھیگیں تب شبھ گھڑی نیک ساعت دیکھ کر کنبے برادری کی بیویوں کو بلا دا دیا گیا۔ سورج ڈھلنے سے پہلے کورے کونڈوں میں گرم گرم بھر کے چوکیوں پر جمایا گیا، مہمانوں میں سب سے بڑی بوڑھی سہاگن نانی دادی نے نیاز دے کر پہلی جلیبی کھائی، پھر باقی بیویاں جھپٹ پڑیں اور دم کے دم میں کونڈے صاف کر کے مبارک سلامت کہتی رخصت ہو گئیں۔

اس رسم نے گویا اعلان کر دیا کہ صاحبزادے تام خدا جوان ہو گئے۔

چڑھتا خون، مونچھوں کی فصل دن دونی رات چوگنی بڑھنے لگی، اور میں سوچتا رہا کہ انھیں کس سانچے میں ڈھالوں، اور چہرے کا کینڈا دیکھتے ہوئے کس فیشن کی پالوں۔ پڑوس میں ڈولی کا اڈا تھا، مونچھوں کے فرق سے اپنی اور ایک کہار کے چہرے کی کاٹ ملتی جلتی پائی۔ دس پندرہ دن کی لگاتار اٹھنی میں اپنی مونچھوں کا روپ بھی وہی بن گیا، میری اور للتو کہار کی مونچھیں جڑواں بہنیں دکھائی دینے لگیں وہی کڑوے تیل سے چکنائے، چمکیلے بال، وہی نوکیں چھلے دار۔

کچھ دن بعد ایکا ایکی ان سے جی بھر گیا۔ جانتے ہیں اب کیا کیا میں نے؟ ان چھلوں کو ریورس گیئر میں ڈال دیا۔ انگلیوں کے پور سے سن پڑ گئے تب کہیں ان کے بل نکلے، نئے نمونے کی تلاش میں تھا جو سامنے ایک اسکول ماسٹر کی مونچھیں پسند آئیں۔ ماسٹر صاحب پڑھاتے کم تھے، کاسمیٹک کی ٹپٹ دی ہوئی چوہیا کی دُم مونچھوں کا رعب زیادہ جماتے تھے۔ یہ وضع نبھ نہ سکی۔ کاسمیٹک کی بو سے بار بار چھینکوں کی ڈاک بیٹھنے لگی، آچھیں! آچھیں! کی باڑھ چلنے لگی، اور زکام نے ناک میں دم کر دیا، ناچار انھیں سلام کرنا پڑا۔ اب جو فیشن میں نے بدلا اس سے مونچھوں کی شکل مڈل بریکٹ جیسی بنتی تھی۔ اس کے لیے دونوں نوکیں اٹھا کر کلوں پر چپکانا، اوپر سے پٹی باندھنا پڑی۔ یہ تو کسی نے جانا نہیں کہ پٹی تلے کیا بھید تھا، ہونٹ پر بل تو ڑ نکلا سمجھ کر کسی نے ملہم باندھنے کی صلاح دی تو کسی نے آپریشن کرانے کی۔ پٹی بندھتی رہی، کھلی تو نئے ڈھنگ کی مونچھیں تیار تھیں، نہایت شاندار بڑے رعب داب کی قیصر ولیم کی مونچھوں سے ٹکر لینے والی۔

ارے صاحب ایک قانون داں دوست سے ملاقات ہونے پر یہ خطرناک نکتہ کھلا کہ گھڑی توکوں کی یہ آنی دار مونچھیں انسانی کمزوری کے کسی نازک لمحے میں ضرر شدید کا سبب اور جرم قابل دست اندازی پولیس بن سکتی تھیں، اور میں بیٹھے بٹھائے تعزیرات کی دفعہ فلاں کے رو سے پہلے حوالات، پھر ترقی پاکر جیل خانہ بھیجا جاسکتا تھا۔

سوچا۔ بات ٹلتی ہوئی تھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک دم استرہ پھیر دیا۔ یہ عمل مدتوں جاری رہا۔ شامت جو آئے دفعتاً من میں اچنگ اٹھی کہ مونچھیں پھر سے پالی جائیں۔ اس فیصلے کا اعلان کرنا کیا تھا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا تھا۔ نہیں نہیں کرکے دس بارہ ساتھی جھٹ ہی تو گئے، سب ایک آواز ہوکر کہا "بسنت کی کچھ خبر ہے جناب کو؟ آپ ہم پنچوں میں بیٹھے ہیں، اب آپ اپنے بس میں نہیں، پرائے بس میں ہیں، جگ بھاتا پہننا تو پڑتا ہی ہے، اب من بھاتا کھانے پر بھی ہم پنچوں کی مہر ہوگی تب نوالہ توڑنا ہوگا۔" "آپ کو پنچ بنایا کس نے؟" میں نے پوچھا۔ جواب ملا "بناتا کون، ہمیں خود بننا نہیں آتا۔" ان میں سے ایک نے فرمایا: "بارہ برس سے منڈتی والی مونچھیں اب ٹائم بار ہوچکیں۔ آپ نے رکھ لیں تو ہم پنچوں کی آنکھ میں پھانس کی طرح کھٹکیں گی۔ اور بھی سنیے آپ نے مونچھیں پال لیں تو بہتر جگہ اپنا حلیہ بدلوانا پڑے گا۔ پچاس جگہ بیان حلفی دینا ہوگا کہ آپ وہی ہیں جو بارہ برس سے ہیں۔ پھر محلے بھر کے جانے پہچانے کتے آپ کو اجنبی جان کر بھونکیں گے۔ کوئی کوئی محتاط لوگ آپ پر جاسوس ہونے کا شبہ کریں گے۔ بچے آپ کو دیکھ کر بھاگنے لگیں گے۔" اس پر سب نے مل کر ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملائی اور نہ سہی مجھ میں ایک بڑی کمزوری ہے، وہ یہ کہ میں ایک امن پسند شہری ہوں، ان پنچوں کی دھونس میں آگیا، مگر رہ رہ کے سوچتا ہوں کہ آخر یہ مونچھیں ہیں کس کی، میری یا ان پنچوں کی۔

آنے کو تو پنچوں کی دھونس میں آگیا مگر اپنی بے بسی پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ سوچا تھانے میں رپٹ کردوں اور مونچھوں میں خواہ مخواہ دخل در معقولات کے ارتکاب یا اور کسی دفعہ کے تحت نقص کراکے ان پنچوں کی ٹنڈیاں کھسوا دوں۔ کچہریوں کے کیڑے ایک منشی جی سے مشورہ کیا، انھوں نے حق المحنت کے پیشگی دو چہرے شاہی ہتیا کے بتایا کہ "مداخلت بے جا کا معاملہ ہوتا تو آپ کا کیس سو فیصد ہرا تھا مگر دخل در معقولات کے بارے میں قانون ساکت ہے۔ آپ پنچوں کا بال بیکا نہ کرسکیں گے۔" پھر بڑی اپنایت سے شہری تعلقات کا رشتہ جتا کر فرمایا: "اس مشورے کی فیس نہ لوں گا۔ آپ ہمارے صاحب سے مل لیں۔ وہ مخالف کو زیر کردینے کے بادشاہ ہیں، ایسے ایسے قانونی گر اور نایاب ہتھکنڈے انھیں ازبر ہیں کہ ایک نہ ایک داؤں پہ رکھ کے حریف کو یوں چاروں شانے چت کردیں گے کہ پریوی کونسل تک آپ کا بول بالا رہے گا اور آپ خم ٹھونک کے اپنی من مانی مونچھیں پالنے میں آزاد ہوں گے۔"

منشی جی کی بات کچھ جچی نہیں۔ "صاحب" کے چنگل میں پھنس کر جیب ہلکی ہونے کا مزید خطرہ تھا۔

انتقام کی آگ بھڑکتی رہی، اور میں مونچھوں کے غم میں جھلستا رہا۔ جوئندہ یابندہ۔ اب کے ایک بڑے مقدمہ باز، بلکہ یوں کہیے کہ مقدمہ ساز سے اپنا دکھڑا رونے کا موقع ملا۔ ساری داستان گہری آنکھ سے سن کر بے ساختہ فرمایا: "پنچوں کے فیصلے پر خاموش بیٹھنے میں تمادی عارض ہونے کا اندیشہ ہے۔ فوراً احتجاج کیجیے۔" احتجاج! اگرچہ خاصا بھاری بھرکم لفظ ہے، مگر ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔ اسے برتنے اور عمل میں لانے کی حد تک میں بالکل کورا ہوں۔ وضاحت چاہی، طریقہ پوچھا۔ کہنے لگے "اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے، رفع حاجت کے لیے ہلڑ مچانے کو احتجاج کہتے ہیں۔ دو گز کالے کپڑے کی دھجی بازو پر باندھیے، اور گلی گلی، کوچے کوچے 'مونچھیں زندہ باد' کے نعرے لگاتے پھریے۔ اپنا مہرہ دونہ رکھنا ہو تو دو چار روپے کا منہ نہ دیکھیے، آس پاس کے دس بارہ مادر پدر آزاد لونڈوں کو چکھ دے کے اپنا ہم نوا بنائیے۔ اور سمجھ لیجیے کہ بازی جیت لی۔"

تجویز بظاہر سولہ آنے کارگر تھی مگر امن عامہ میں خلل ڈالنے، یا دماغی توازن کھو بیٹھنے کی پاداش میں اپنی پیدائشی آزادی سے ہاتھ دھونے کی ہمت نہ ہوئی۔ آدمی تھے جہاندیدہ، تیور دیکھ کے تاڑ گئے کہ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ بولے "اچھا، احتجاج کی کڑیاں آپ نہیں جھیل سکتے، جانے دیجیے، دوسرا آستانہ نہایت مجرب نسخہ بتاتا ہوں۔

بھوک ہڑتال: سورج نکلنے سے پہلے ڈٹ کے ناشتہ کرنا، اور پنچوں کی چوپال کے سامنے چوراہے پر آلتی پالتی مار کے چپ چاپ بیٹھ جانا۔ دن چڑھتے چڑھتے شہر میں بات پھیل جائے گی، اپنے پرائے ہمدردی کرنے لگیں گے۔ فاقہ شکنی کے لیے پنچوں پر دباؤ پڑے گا۔ در شام ہوتے ہوتے آپ پھر سے مونچھیں پالنے کا پروانہ لے کر، ہار پھول سے لدے ہوئے گھر آ جائیں گے۔"

میں نے کہا: "یہ بھی تو سن لیجیے میں بھوک کا کچا، ہاضمے کا اچھا ہوں، دوپہر تک بیٹھک نہ سنبھال سکوں گا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کھانا دیر سے ملنے پر جوں کی کہن سال ماں کے لیے طلاق ہونٹوں تک آ کے لوٹی ہے۔" اپنے مشورے کی یوں توہین ہوتے دیکھ کر جھلا گئے۔ اور بولے "یہ نہیں، وہ نہیں تو مونچھیں جائیں جہنم میں۔ تمھیں اتنا کچ پیندیا جانتا تو اپنا اشرفی تولے کا قیمتی وقت کبھی نہ ضائع کرتا۔"

الغرض، دن سرکتے گئے، اور گتھی نہ سلجھی۔ اب طرفہ ماجرا سنیے، ایک دن جیسے القا ہوا، دیوانِ حافظ نکالا، اور دل میں کہا کہ لاؤ ان رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مشورہ کر دیکھوں۔ شاید کہ ہمیں مبقیہ برآرد پڑ یال۔ بڑے خشوع خضوع سے فاتحے کا ہفت خواں سر کیا، اور "شاخِ نبات" کے ہزاروں واسطے دے کر، فال طلب کی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ میں لرزش تھی جو دیوان کھلا۔ اور صفحے کی پہلی ہی سطر میں 'مردے از غیب بروں آید و کارے بکند' کی خوش خبری دیتا ہوا یہ مصرع نکلا۔

مردے از غیب کے انتظار نے دماغ میں قیامت کی ہلچل ڈال دی، یعنی جو کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا: "وہ آیا" کہہ کے لپکا، ڈاکیہ تھا، بیرنگ خط لایا تھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ پھر زنجیر کھڑکی۔ اس بار حلال خور تھا، دوپہر کی روٹی لینے آیا تھا۔ اسی طرح کئی بار مردے از غیب کے سلسلے میں گھن چکر بنا رہا، قریب تھا کہ صبر کا پیالہ چھلک جائے اور حافظ جی کا دیوان دریا برد کر دوں جو دروازے پر کسی نے دستک دی۔ منہ سے کچھ اول فول نکلنے کو تھا جو سنائی دیا "دہائی میاں کی۔" باہر آیا، میرا اسامی کاشتکار کریما کبڑا تھا۔ "کیا ہے کریم بخش؟" "دہائی ہے میاں کی۔ بگیہ بھر گوبھی کی پود لگائی تھی۔ گاؤں کا مکھیا کنوئیں پر لٹھ باندھے بیٹھا ہے، پانی روک رکھا ہے، پودے مرجھا کے زمین ناپنے لگے ہیں۔ چل کے پانی دلوا دیجیے۔" مکھیا شورہ پشت تھا، فوجداری کی نوبت آئی تو اپنا دامن بھی الجھنے کا ڈر تھا۔ جانا پڑا۔ قضیہ رفع دفع ہوا تو اور کئی کام نکل آئے اور حافظ جی کا مردے از غیب ذہن سے اتر گیا۔

شہر میں کہاں تو مونچھوں کو ترس گیا تھا یا اب گاؤں کی فضا میں ادھر کریما کبڑے کا کھیت شاداب ہوا، ادھر میری مونچھیں چمکیں۔ پانی کو دیکھ کر جیسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے، ویسے ہی پنچوں کو نہ دیکھ کر مجھے بھی نئے سرے سے مونچھیں پالنے کی ہوک اٹھی۔ اور اس بار نئے ماڈل کی مونچھیں یعنی نتھنوں کے عین نیچے اوپر کے ہونٹ کے بیچوں بیچ اتھلا سا جو گڑھا ہوتا ہے اسے چھوڑ کر نائی سے ادھر ادھر دو خط لگوا دیے۔ نہ پوچھیے اس دن کی بے پایاں مسرت جب آئینے میں ہونٹ کا گڑھا بالوں سے بھرپور پایا۔

گھر آیا۔ رات تھی۔ اطمینان کی نیند سویا۔ سویرے منہ ہاتھ دھو کے بنا سنورا اور بازار سے گزرتے ہوئے یہ مژدہ سنا کہ پرانے پنچوں کی ٹولی ٹوٹ گئی۔ دو ایک سے بھینٹ ہونے پر جھینپے جھینپے کترا کے نکل گئے۔

ایک گلی میں کئی لونڈے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ ایک نے ہاتھ روک کے غور سے مجھے دیکھا اور پکار کے اپنے ساتھی سے کہا: "ابے چھدا، دیکھ مونچھ منڈے آ گئے" — چھدا بولا "اندھا ہے بے۔ تو نے نہیں دیکھا۔ ان کی مونچھ نے بچہ دیا ہے۔" اس پر سب نے قہقہہ لگایا۔ اور میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ "منہ پھٹ لونڈے ہیں، پنچ تو نہیں۔"

اب ایک سوال جواب طلب ہے کہ "کارے بکند" کریما کبڑا تھا یا گوبھی کے روپ میں "مردے از غیب" نے جنم لیا تھا؟

★

فکرِ تازہ

محوی صدیقی

مجبور ہیں نگاہِ محبت اثر سے ہم
ہر شے کو دیکھتے ہیں تمہاری نظر سے ہم

دل بیٹھ بیٹھ جاتا ہے بڑھتے نہیں قدم
اُٹھنا بھی چاہتے ہیں اگر ان کے در سے ہم

شایانِ آرزو ہے وہی جانِ آرزو
سمجھے یہ راز چشمِ حقیقت نگر سے ہم

اب یہ پتہ چلا کہ وطن کیوں عزیز ہے
مدت کے بعد گھر کو جو آئے سفر سے ہم

ہم سے نہ پوچھ، اپنے ہی حسنِ نظر سے پوچھ
تیری نظر کو دیکھتے ہیں کس نظر سے ہم

شاید اسی سے زندگیِ جاوداں ملے
کچھ کام لیں جو زندگیِ مختصر سے ہم

اُف! یہ ہجومِ جلوہ شبستانِ ناز میں
گزریں کدھر سے اور نہ گزریں کدھر سے ہم

اک طرفہ زندگی ہے محبت کی زندگی
اکثر رہے دوچار شکست و ظفر سے ہم

کم بخت پڑ ہی جاتی ہے رُخ پر نگاہِ شوق
بیچ حضور جاتے ہیں اس رہ گزر سے ہم

روشن ہے زندگی کبھی، تاریک ہے کبھی
اُلجھے ہوئے ہیں دامنِ شام و سحر سے ہم

محوی! کہاں وہ نعمتِ کونین میں مزہ
اکثر جو پاتے رہتے ہیں اک شعرِ تر سے ہم

غزل

ساحل مانکپوری

آنکھ ظالم کی ہرن ہو جیسے
ساغرِ توبہ شکن ہو جیسے

اُس ستمگر سے ملاقات کی فکر
کوئی مضمون کٹھن ہو جیسے

مسکراہٹ لبِ رنگیں پہ ترے
موسمِ گل کی دُلہن ہو جیسے

خشک یوں شاخِ نشیمن ہے مری
کسی مفلس کا بدن ہو جیسے

سرو قد اور یہ زلفِ پُرخم
دعوتِ دار و رسن ہو جیسے

گردشِ جام بھی اُس محفل میں
گردشِ چرخِ کہن ہو جیسے

لب پہ ہلکی سے تبسم کی جھلک
صبح کی پہلی کرن ہو جیسے

اُن کے عارض کی لطافت توبہ
شوخ پھولوں پہ پھبن ہو جیسے

چاندنی آہ شبِ فرقت کی
کسی بیوہ کا کفن ہو جیسے

مصحفِ رُخ پہ نمودِ خطِ سبز
حاشیہ گردِ متن ہو جیسے

مجھ سا گلبانگ چمن میں اپنے
یوں ہے اب خارِ چمن ہو جیسے

دولتِ بوسۂ ردِ سیمیں
کسی کنجوس کا دھن ہو جیسے

برہمی ہائے نظامِ گیتی،
اُن کے ماتھے کی شکن ہو جیسے

بے نقاب رُخِ روشن، ساحل
اس طرح چاند گہن ہو جیسے

شاد عارفی

سیّد نجم الدین نقوی

ہم "قدرِ نعمت بعد زوال" کے شدت سے قائل ہیں۔ قائل ہی نہیں بلکہ اس پر عامل بھی شاد عارفی مرحوم کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ وہ جب تک زندہ رہے پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا رہے۔ ذہنی سکون اُن کے لیے عنقا ہوگیا تھا۔ ایسا ہونا لازمی تھا۔ جب انسان آئے دن مادّی وسائل کے فقدان کا شکار ہوتا رہے تو پھر ذہنی سکون کس طرح میسر آسکتا ہے۔ شاد کی کی زندگی میں اُن کی کما حقہٗ قدر نہ ہوئی اور اب اُن پر مضامین، نظمیں اور کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔

سوداؔ کی زندگی کا ایک دور وہ تھا جب اودھ سے طلبی پر چار مصرعے لکھ کر شانِ استغنا دکھائی تھی۔ مگر یہ بھی دیکھا گیا کہ عرصۂ حیات تنگ ہوا اور قوت لایموت کے لالے پڑے تو بادلِ ناخواستہ دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ میرؔ کے لیے دہلی کے کوچے "اوراق مصوّر" رہے ہوں مگر انھیں بھی دو خشک روٹیوں اور ایک جرعۂ آب کے لیے دہلی کے خرابے کو چھوڑنا ہی پڑا۔

لیکن شاد عارفی مرحوم کی وطن دوستی شاید میرؔ و میرزا دونوں پر سبقت لے گئی تھی جیسا کہ اُن کی پوری زندگی سے ظاہر ہوتا ہے۔ ع "منتظر رہے پاکستان اور میں نہ جاؤں گا" پڑھیے اور شاد کے جذبۂ وطن کی قدر کیجیے۔ حُبِّ وطن کا وسیع ترین مفہوم اور محدود ترین انداز دونوں شاد کے یہاں ملتے ہیں۔ سارے ہندوستان بالخصوص رام پور سے محبت اُن کے کلام میں جگہ جگہ پر ملتی ہے۔ شاد کا مقابلہ وہ آتش نوا شاعر اور صاحب طبل و علم محقق اور نقاد کیا کریں گے جو زندگی بھر حُبِّ وطن کے گیت گاتے رہے، حکومت سے مراعات و خطابات حاصل کرتے رہے اور بالآخر وطن چھوڑ کر چلتے بنے۔ شاد کے حب وطن کے وسیع ترین مفہوم اور محدود ترین انداز کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

کھلا گیا جبینِ وفا تیرا حادثہ[1] کچھ اور تو ہوا نہ ہوا تیرا حادثہ
ہم شاعرانِ ہند پہ بہتان ہوگیا

جب تک نہ رہبرانِ وطن دیں مجھے نکال مجھ کو نہیں ہے ترکِ وطن کا کوئی خیال
حالانکہ الجھنوں سے پریشان ہوگیا

(سفینہ چاہیے۔ صفحہ ۶۳)

تمہاری[2] فرزانگی سے کچھ کم نہیں ہے دیوانہ پن ہمارا
تمہیں مبارک تمہاری ہجرت، ہمیں مبارک وطن ہمارا

نہ ہو، نہیں ہے اس انجمن میں اگر کوئی ہم سخن ہمارا
مگر یقیں ہے کہ اور چمکے گا اور چمکے گا فن ہمارا

جو گلستانوں کی شاہراہوں پہ اپنے بستر بچھا نہ پائے
وہی وہاں جا کے کہہ رہے ہیں نہیں ہے کوئی چمن ہمارا

بقول اقبال پہلے پہلے یہاں لگائے تھے جس نے ڈیرے
وہ کارواں آج بھی بسا ہے کنارِ گنگ و جمن ہمارا

بعیدِ اخلاق و آدمیت ہے رہنماؤں سے بدگمانی
کمالِ سادہ دلی تو یہ ہے کہ ساتھ دے راہزن ہمارا

صدائے ناقوس بتکدہ پر گرفت کا مشورہ نہ دیجے
عبادت و بندگی کے مانع نہیں ہے جب برہمن ہمارا

---

[1] جوش ملیح آبادی کے ترک وطن کرکے پاکستان جانے پر شاد نے ایک نظم کہی تھی۔ یہ دو آخری بند اسی مثلث کے ہیں۔ [2] ترک وطن کرنے والوں سے خطاب۔

یہ دوسری بات ہے کہ ہجرت نہ کرکے در در کی خاک چھاننے
چنے نہ بیچے گا "جوش" کی طرح ذوقِ شعر و سخن ہمارا

وطن کی اس سرزمیں کو لے شاد کون سے دل سے چھوڑ دیں ہم
وطن کی جس سرزمیں پہ گزرا ہے دورِ دار و رسن ہمارا

(نثر و غزل دستہ صفحہ ۳۵۲)

"... یعنی میرے پاکستانی دوست مجھے پے در پے بُلا رہے ہیں کہ آؤ ادھر تمہارے حق میں رادی عیش ہی عیش لکھتا ہے مگر اس عیش کے مقابلے میں یہاں کی تکلیف اور زحمت آخر دم تک برداشت کرنا پسند کرتا ہوں۔"

(ایک تنہا شاعر صفحہ ۲۸۴ خط بنام مدیر انشا کراچی)

سو روپے[1] اک رات کے لیتا ہے مزدورِ ادب
اور کہتا ہے کہ ہوں سرکارِ اُردو کا غلام

رائے کا اظہار اور حالات کو سمجھے بغیر
چھپ نہیں سکتی "دہانِ شعر" میں زریں لگام

دھان کی کھیلوں کے بورے ہیں اگر فہم و شعور
آپ کو محسوس ہوتا ہے تو یہ کس کا قصور

جا نہیں سکتی جہاں کوتاہ بینوں کی نگاہ
سطح سے اس درجہ اونچا اُٹھ چکا ہے رام پور

(سفینہ چاہیئے صفحہ ۱۵۱)

معلوم نہیں یہ کہنے میں مجھے معاف کیا جائے گا یا نہیں کہ شاد مرحوم اپنے وطن رامپور میں "عاشقِ ناکام" کی طرح زندہ رہے اور اسی طرح جان بھی دیدی۔ کبھی پرانی کھنڈسار کو زینت بخشتے رہے تو کبھی نالے پار میں فروکش ہوئے، کبھی بیرلین میں تو کبھی مزار شاہ ولی اللہ صاحب کے قریب۔ اور ایک دن اس جوار میں جانِ آفریں کو اُس کی امانت سپرد کر دی۔

امانت کا لفظ میں نے بالارادہ استعمال کیا ہے۔ اگر امانتِ الٰہی سے مراد زندگی محض ہے جو عناصر کے ترتیب سے ظہور پذیر ہوتی ہے، اور اُن کے منتشر ہونے پر معدوم ہو جاتی ہے تو پھر زندگی ایک نعمت سہی مگر نعمتِ غیر مترقبہ نہیں قرار دی جا سکتی۔ روح و تن کا اتصال ہر ذی روح میں ملتا ہے۔ انسان ہوں یا بہائم سب کے سب ایک مدتِ معینہ تک سانس لے کر فنا ہو جاتے ہیں مگر جس شے نے انسان کو مجد و شرف بخشا ہے وہ اُس کی خودداری اور احساس و اثباتِ انا ہے۔ اور اسی کو امانتِ الٰہی کہا گیا ہے۔ میر کا شعر ہے ؎

سرکسو سے فرو نہیں ہوتا حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

شاد مرحوم سے کبھی کالج کے مشاعروں میں تو کبھی ایک دو ایسی صحبتوں میں، جنھیں "رئیس کی محفل"، کہہ سکتے ہیں، ملنے اور باتیں کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان تمام مواقع پر میں نے محسوس کیا کہ مرحوم ہمیشہ اپنے کو لیے دیئے رہتے تھے اور بات آنے پر خاموش رہنا کفر جانتے تھے۔ اُسی کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہوا کہ کبھی کبھی مرحوم ضرورت سے زیادہ خشن ہو جاتے تھے جس سے بعض طبائع گرانی محسوس کرتی تھیں۔ شاد مرحوم میں ایک طرح کا چڑچڑا پن بھی پیدا ہو گیا تھا جو اُن کے حالات کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا۔ جب کسی فنکار کی اعلیٰ صلاحیتوں کو محض اس لیے مسلسل نظر انداز کیا جاتا ہے کہ وہ دنیاوی وجاہت سے محروم ہے تو اُس کے مزاج میں ردعمل کے طور پر اس قسم کی کیفیات کا پیدا ہو جانا ایک فطری امر ہو جاتا ہے۔ شاد ہی نہیں ہر صاحبِ کمال اور حساس انسان کے لیے یہ ماحول سخت جان گسل اور زہرہ گداز ہوتا آیا ہے پھر شاد مرحوم تو حد سے زیادہ حساس اور بات بات پر بگڑنے والے بزرگ تھے اُن کی اس مزاجی کیفیت پر معیشت کی تنگی نے "سونے پر سہاگہ" کا کام کیا تھا۔

شاد مرحوم جس دور میں پیدا ہوئے تھے بالخصوص جس عہد میں اُن کی شاعری کا ارتقا ہوا وہ عہد سخت آزمائشی تھا اور آج بھی ہے۔ اس عہد میں زندگی کی دوڑ شاعرِ محض ہو کر نہیں جیتی جا سکتی۔ اس لیے کہ ؏ ہزار شیوہ دراین کاروبارِ دلداریست اور شاد اس فنِ ہزار شیوگی سے بہت دور تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑنے والا اور بد آموزی عدد کا شکار اس دور میں کیسے پنپ سکتا تھا۔ شاد کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ رام پور کے ریاستی عہد میں

---

[1] نوٹ مرتب سفینہ چاہیئے۔ صفحہ ۱۵۱: "کئی سال ہوئے نمائش کے مشاعرے میں ایک "بیرونی" شاعر نے رام پور کے شاعروں کے خلاف کوئی قطعہ پڑھ دیا تھا جس کے جواب میں فوراً ہی شاد صاحب نے تین قطعے لکھ ڈالے (س - ا) "۔ تو میں میرے ہیں۔ (نقوی)

اُنھیں متعدد ملازمتیں ملیں مگر ان کی نازک مزاجی ملازمت کی پابندیوں اور اعلیٰ اہل کاروں کے نازِ بے جا کو برداشت نہ کرسکی اور مرحوم کو خانہ نشین ہونا پڑا اور نتیجۃً طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہوکر اس دنیا کو خیرباد کہنا پڑا۔ ملاحظہ ہو:

خط بنام آل احمد سرورؔ مورخہ ۱۲ر اگست ۶۳ء (جستہ جستہ)

"اس لیے کبھی سرکاری ملازمت تو مل ہی نہ سکی ہاں کارخانوں میں اکاؤنٹنٹ، کہیں سپروائزر، کہیں سائٹ انچارج، کہیں وے مین کی خدمات انجام دیتا رہا۔۔۔۔۔ اس زمانے میں ریاست کے اندر بطور "حفظ ما تقدم" مجلس قانون ساز بنی۔۔۔۔۔ اس کونسل کے سکریٹری میرزا ناصر مسعود دہلوی مقرر ہوئے۔ وہ اور اُن کی بیوی مجھے رسائل کے ذریعے ادبی حیثیت سے پہچانتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے آتے ہی ایک ہفت روزہ اخبار "اقبال" نیم سرکاری برائے نام (مگر درپردہ کُل سرکاری) جاری کیا اور مجھے میرے غریب خانے پر آکر اس کا اڈیٹر مقرر فرمادیا۔۔۔۔ چونکہ ایڈیٹر ہفت روزہ اخبار کا تھا اس لیے تنخواہ مبلغ پچاس روپیہ بہت قلیل تھی کہ اُسی دوران اسٹیٹ پریس میں نئی اسکیم کے تحت ایک انگلش ہندی اور ایک اردو پروف ریڈر کی دو اسامیاں نکلیں موصوف (ناصر مسعود) نے۔۔۔۔ کرنل عطاء الرحمٰن سے کہہ کر انگلش ہندی پروف ریڈر اور سرکاری گزٹ کا مُدیر مقرر کیا جہاں میں ریاست "مرج" ہونے تک رہا۔ اس کے بعد۔۔۔۔۔ مجھے رام پور کے سائبیریا یعنی اُس کی تحصیل سوار میں ناظر بنا کر ڈگریڈ کرکے بھیج دیا جہاں میں جاتے ہی ملیریا میں مبتلا ہوا اور آٹھ مہینے ایڑیاں رگڑتا رہا۔ بدلی کی درخواست پر کلکٹر کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ نے تین سو روپئے رشوت طلب کیے جو میں ادا نہ کرسکا (اس لیے کہ میں رشوت لینا کفر سمجھتا تھا) غرضکہ بیماری سے تنگ آکر مستعفی ہوگیا۔"

(ایک تھا شاعر۔ صفحہ ۲۴۴ تا ۲۴۶)

خط بنام جون ایلیا (مدیر انشا)

ملازمت کے سلسلے میں خوشامدیوں کی ترقی اور بدنیتوں کی گردنوں میں طوقِ زرّیں دیکھ کر عشقیہ شاعری سے طنز کی طرف آتا چلا گیا۔

(ایک تھا شاعر۔ صفحہ ۲۸۰)

شادؔ کی طبیعت میں ایک خاص انداز کا احساس برتری تھا جسے علمائے نفسیات نے احساس کمتری کا ردّ عمل یا اُس کی بدلی ہوئی شکل قرار دیا ہے۔ وہ اپنے ہم عصر اکابرینِ ادب و انشا پر اس لیے طنز کم کرتے تھے کہ اُن کے یہاں شادؔ کو طنز کے نشانے ملتے تھے بلکہ یہ طنز زیادہ اس لیے ہوتا تھا کہ ان اکابرینِ فن شعر و ادب، نقد و تبصرہ اور تحقیق تفحص کی شہرت شادؔ کو ناگوار ہوتی تھی جیسا کہ "ایک تھا شاعر" میں شادؔ کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔

شعر کی زبان ہو یا نقد و نظر کی، دونوں جگہ شادؔ کے یہاں نہ صرف انتقامی جذبے کی کارفرمائی نظر آتی ہے بلکہ کہیں کہیں لہجے کی ایسی سطحیت بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے جو طبعِ سلیم پر گراں گزرتی ہے اور جو شادؔ جیسے شاعر کو زیب نہیں دیتی۔ اس سلسلے میں قارئین کرام ایک تھا شاعر' سفینہ چاہیئے اور نثر و غزل دستہ کی جانب رجوع کرسکتے ہیں۔

"ایک تھا شاعر" اور دوسری کتابوں میں شادؔ کے طنزیہ کلام کے جو نمونے ملتے ہیں اُن کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی اور سماجی مسائل پر شادؔ کو عالمانہ بصیرت حاصل نہیں تھی۔ اشتراکیت سے ایک طرح کا جذباتی لگاؤ اور سرمایہ داری سے نفرت شادؔ کی پریشاں حالی کا ردِ عمل معلوم ہوتی ہے نہ کہ فلسفیانہ اور دانشورانہ بصیرت کا نتیجہ۔ اگر زمانے نے شادؔ کو پُرسکون زندگی، خوشگوار ماحول اور سازگار مادی وسائل مہیا کیے ہوتے اور اُس وقت بھی سماجیات و سیاسیات پر شادؔ کی وہی رائے ہوتی جس کا اظہار اُن کے کلام، مضامین اور خطوط میں ملتا ہے تو یقیناً اُن کو ان مسائل کا بے لاگ نقاد کہا جا سکتا تھا۔

شادؔ کے طنز میں سوداؔ کا رنگ ملتا ہے۔ اُنھیں سوداؔ پسند بھی تھے۔ اور وہ سوداؔ کی میرزائیت میں افغانیت کے متلاشی بھی تھے جیسا کہ مدیر انشا کراچی کے نام ان کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔

"اب غزلیں سنو۔ سنو اور برداشت کرو تاکہ 'سر دھنو' کی نوبت نہ آئے۔ عجیب بات ہے کہ اس مرتبہ لڑائی کے بعد گھونسہ یاد آرہا ہے ورنہ پہلے تو ہمیشہ ترکی بہ ترکی کلّہ بہ کلّہ کا جواب دیتا رہا ہوں میرا پورا یقین ہے کہ میرزا سوداؔ میں میرزا ہونے کے باوجود کوئی افغان رگ ضرور تھی جو خلافِ مزاج بات پر پھڑک اُٹھتی تھی اور وہ اپنے مزاج داں قلم دوات یا قلمدانِ سخن، طلب کرکے فی البدیہہ ہجو یا طنز کہنے کے لیے اما ک کھاکر

بیٹھ جاتے تھے اور پھر ظاہر ہے وہ کیا کیا 'گل افشانیٔ گفتار' کا مظاہرہ کرتے اور ادبی حدود دھیلا نگ جاتے تھے۔ سو میں بھی کبھی مزاج کے خلاف کسی واقعے سے متاثر ہو کر جو منہ میں آئے وہ کہنے سے نہیں چوکتا مگر ادب کا دامن تھامے رہتا ہوں یعنی دل کے ساتھ پاسبان عقل کا قائل ہوں اور کبھی تنہا چھوڑنے کے موقعے پر اسے تنہا نہیں چھوڑتا۔"

(ایک تھا شاعر۔ صفحہ ۴۸۲، ۴۸۳)

یہیں سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شاؔد کے یہاں ذاتیاتی طنز اور اُس میں شدت کے عناصر اگر ایک طرف شاؔد کی فطرت کا تقاضہ ہیں تو دوسری جانب سوؔدا کی پیروی کا نتیجہ۔ اور شاؔد کی طنزیات کا یہی پہلو اُن کے اس رنگ کا طرۂ امتیاز ہے۔ کلیات سوؔدا پر ایک طائرانہ نظر ڈال جائیے، اُس کی ہجویات اور طنزیات کے شاہکار ذاتیات پر مشتمل ہیں۔ میرزا فاخر مکین ہوں یا حکیم غوث یا دوسرے کردار سب کے سب ادارے نہیں بلکہ افراد ہیں۔ سوؔدا کی ہجویات کے محرک زیادہ تر انفرادی اور ذاتی رنجشیں ہوا کرتی تھیں اور جب کبھی اس طرح کا محرک پیدا ہوتا "غنچہ" کو قلمدان لانے کا حکم دیا جاتا۔ غریب شاؔد مرحوم غلام رکھنے پر تو قادر نہ تھے البتہ اُن کا فن بہ خدمت انجام دیتا تھا۔ بخشش کا خانہ نہ سوؔدا کے یہاں تھا نہ شاؔد کے یہاں۔ یہ ایک ایسی قدرِ مشترک ہے جو شاؔد کو سوؔدا کا ہم پلہ بناتی ہے۔

فارسی کا ایک شعر ہے ؎

طبع بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گزشت

زندگی بسر کرنے کی یہ دونوں شرطیں بہت سخت ہیں۔ نہ سارے عالم سے زندگی بھر بنا کر رکھا جاتا ہے نہ کسی کو اتنی مقدرت ہو سکتی ہے کہ ساری دنیا سے بے نیازی برت سکے۔ پہلی شرط بسیط ہو کر پہلے درجے کی منافقت ہو جاتی ہے جو شاؔد کی فطرت کے منافی تھی اور دوسری شرط تو بجز اولیائے کرام انسان کے بس کی بات نہیں۔ اگر شاؔد کے دوستوں، رفیقوں اور ہمدردوں نے اُن کے ایسے خطوط کی اشاعت سے پرہیز کیا ہوتا جن میں اُن حالات و مصائب کا تذکرہ ہے جو یاروں سے دشتی ہی میں نہیں ساری دنیا میں عشق فراموش کر دیتے ہیں تو شاؔد کے ساتھ بہتر انصاف کیا ہوتا۔ میری حقیر رائے میں یہ خطوط نہ اشاعت کی غرض سے لکھے گئے تھے نہ ان کی اشاعت سے کسی بلند مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور نہ شاؔد مرحوم کی روح ان کی اشاعت سے خوش ہوتی ہوگی۔

ان خطوط سے شاؔد مرحوم کی خودداری اور انانیت کا قصرِ بلند جس کی تعمیر، تزئین اور حفاظت میں اُنھوں نے اپنی زندگی تج دی نہ صرف متزلزل بلکہ منہدم ہو گیا ہے۔

کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔

★

شان سے ہم نے ہندستان کو آزاد کیا، شان سے ہمیں آگے بڑھنا ہے، شان سے ہمیں یہ جو ہندستان کی آزادی کی مشعل ہے، اس کو لے کر چلنا ہے اور جب ہمارے ہاتھ کمزور ہو جائیں تو اوروں کو دینا ہے تاکہ نوجوان ہاتھ اس کو اٹھائیں اور ہم اپنا کام پورا کر کے خاک میں مل جائیں۔ ——— جواہر لال نہرو

سکون و امن کے پیغامبر کی آمد آمد ہے

والی آسی

دعائے شب میں، اے لوگو! اثر کی آمد آمد ہے
فضائیں رقص فرما ہیں سحر کی آمد آمد ہے

سجائی جا رہی ہے محفل ہستی نئے سر سے
زمین ہند پر اک خوش نظر کی آمد آمد ہے

نہ رو، اے مادرِ ہندوستاں! اپنی بلائیں لے
ترے نورِ نظر، لختِ جگر کی آمد آمد ہے

مبارک ہو کہ زنجیرِ غلامی کاٹ دی جس نے
اسی گاندھی، اسی "فرخ سیر" کی آمد آمد ہے

جو تھے بے راہ رو اُن کو لگایا راہ پر جس نے
اک ایسے رہ نما و راہ بر کی آمد آمد ہے

وہ جس کو مرہمِ زخمِ دلِ انسان کہتے ہیں
اک ایسے چارہ ساز و چارہ گر کی آمد آمد ہے

اہنسا جس کا مسلک ہے، اہنسا جس کا مذہب ہے
اسی صاحب نظر کی دیدہ ور کی آمد آمد ہے

فرنگی قصرِ باطل جس کی ہیبت سے لرز اُٹھا
اسی حق آشنا و حق نگر کی آمد آمد ہے

چمن کے گوشے گوشے میں صبا جا کر پکار آئی
سکون و امن کے پیغامبر کی آمد آمد ہے

میری دھرتی

رضا امروہوی

میری دھرتی کا ہر ذرّہ
رفعت کا مہ پارہ ہے
لعل و جواہر کا مخزن ہے
رنگوں کا گہوارہ ہے

بوٹا، بوٹا سونا سا ہے
پتّا، پتّا چاندی سا
غنچہ، غنچہ دل کش، دل کش
خوش بو کا فوّارہ ہے

کلیوں میں ہے تابانی سی
پھولوں میں کہکشاں کا رنگ
سبزہ، سبزہ مخمل جیسا
شبنم، شبنم تارہ ہے

نکھری صبحیں، اُجلی شامیں
رنگیں راتیں، رُت بانکی
گوشہ، گوشہ، عالم، عالم
جنّت کا نظّارہ ہے

حسن اخوت محفل محفل
مہر و محبت چار طرف
سارا بھارت دیش ہمارا
پیار کا گویا دھارا ہے

دھرتی، دھرتی، پربت، پربت
ساگر، ساگر، مسکائیں
قدم، قدم پہ ہے ہریالی
نظر، نظر اُجیارا ہے

جادہ، جادہ، تاج و اجنتا
اس دھرتی کا کیا کہنا
کل بھی فن کا گہوارہ تھی
آج بھی فن کا گہوارہ ہے
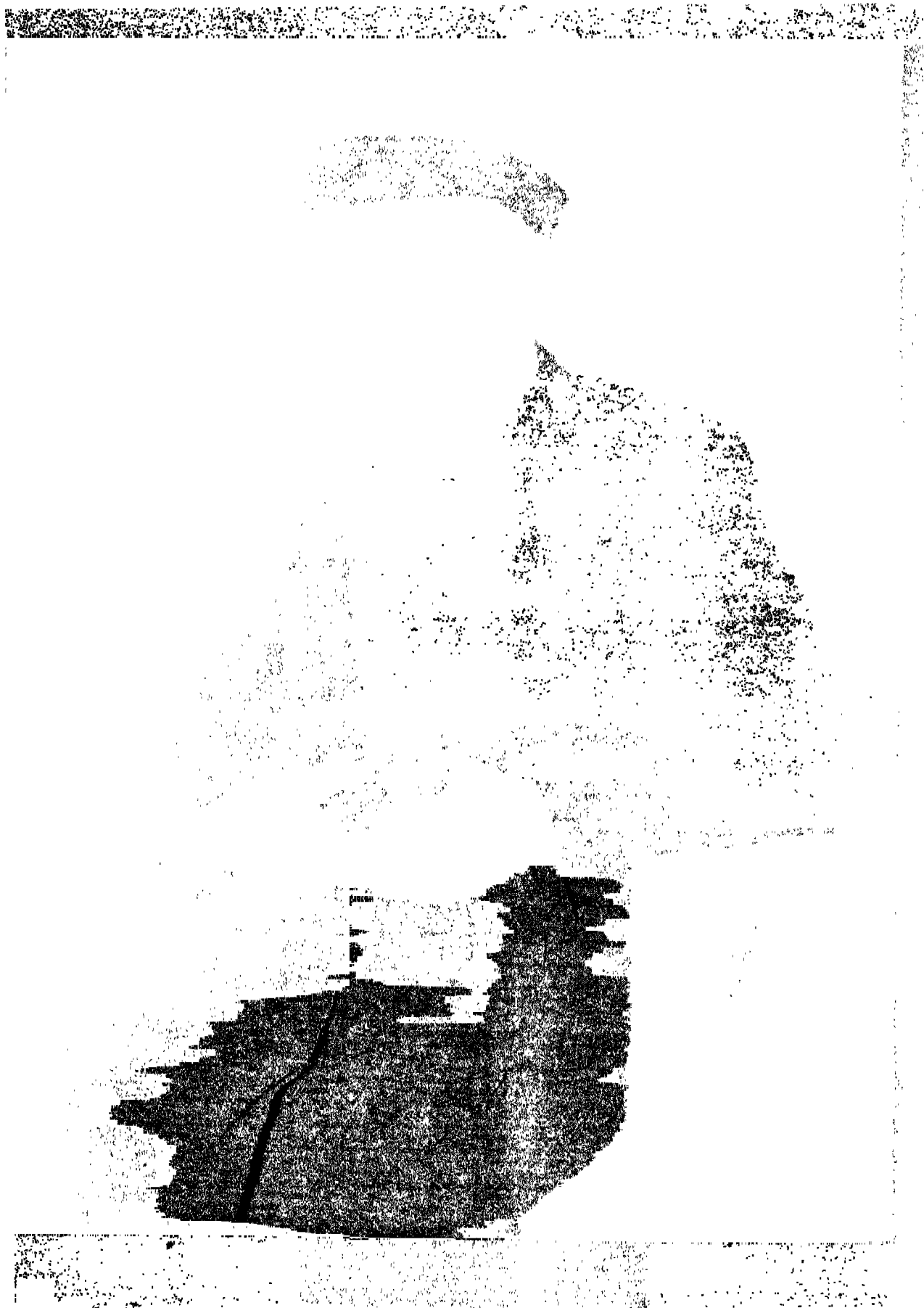
دد معان بھون لکھنؤ کے تلک ہال میں ۲ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو گاندھی جینتی شان دار طریقے پر منائی گئی

گاندھی صد سالہ جشن کے آغاز کے سلسلے میں الموڑہ میں ایک کھادی اُدیوگ نمائش ہوئی
گورنر ڈاکٹر بی، گوپال ریڈی نے ۶ر اکتوبر کو اس نمائش کا افتتاح کیا

ڈاکٹر بی، گوپال ریڈی گورنر اُتر پردیش ۱۲ر اکتوبر کو کوسانی کے پی، ڈبلیو، ڈی کے انسپکشن ہاؤس کو اناشکتی آشرم کے حوالے کر رہے ہیں

گورنر اُتر پردیش سومیشور میں ٹرپنٹائن پلانٹ کا افتتاح کر رہے ہیں

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے حال ہی میں خشک سالی کی صورت حال دیکھنے کے لیے الٰہ آباد کا دورہ کیا
تصویر میں وزیر اعظم آنند بھون میں گورنر، پردیش کے افسران اعلیٰ اور لیڈروں سے بات چیت کر رہی ہیں

غالب صد سالہ جشن کمیٹی کی جانب سے ۲۵ ستمبر کو قیصر باغ بارہ دری میں قومی یک جہتی سیمینار ہوا۔ مرکزی نائب وزیر قانون جناب ویس سلیم سیمینار کا افتتاح کر رہے ہیں

حکیم اجمل خاں اور اُن کا ذوقِ شاعری

ثمر بسوانی

حکیم اجمل خاں مرحوم کو ایک عظیم المرتبت طبیب کی حیثیت سے سب نے جانا اور پہچانا ہے اور ان کی طبابت کے قصے اور مسیحائی کے کرشمے عوام کو از بر ہیں لیکن چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو ان کے ذوقِ شاعری اور ادبی فن کاری سے واقفیت رکھتے ہوں گے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص متعدد کمالات کا مالک ہوتا ہے اور ان کمالات میں وہ ایک جز زیادہ نمایاں ہوتے ہیں وہ باقی کمالات پر حاوی ہو جاتے ہیں، تو اس کے دوسرے کمالات زمانے کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حکیم اجمل خاں کی مسیحائی اس قدر معجز نما تھی اور ان کی سیاسی زندگی اس درجہ تابناک تھی کہ ان دونوں کمالات نے سارے زمانے کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے فنون جس پر انھیں قدرت کاملہ حاصل تھی وہ اس روشنی میں ماند پڑ گئے اور دنیا ان سے روشناس نہ ہو سکی۔ اسی میں ان کا فن شاعری بھی شامل ہے۔
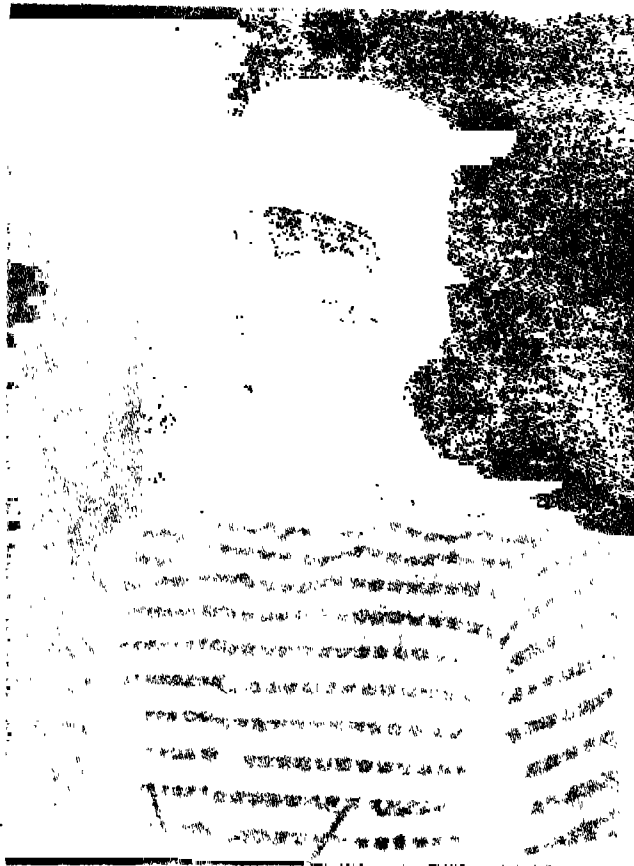
حکیم حافظ اجمل خاں کی شخصیت ایک قدآور شخصیت ہے وہ مسیح الملک بھی تھے اور طبیب حاذق بھی، ماہر علوم مشرقیہ بھی تھے اور جدید تہذیب کی افادیت کے قائل بھی۔ اگر ایک طرف وہ محبِ وطن سیاسی رہ نما اور قوم کے سچے دردمند تھے تو دوسری جانب انسانیت کے علم بردار اور غریبوں اور بیواؤں کی دل کی پکار تھے اور اسی کے دوش بدوش قدرت نے انھیں ملکہ شاعری بھی ودیعت فرمایا تھا جس میں وہ ایک ممتاز اور منفرد رنگ کے مالک ہیں۔ لارڈ ہارڈنگ جو اس وقت کا وائسرائے تھا انھیں خصوصیات کی بنا پر انھیں ہندستان کا مقناطیس کہا کرتا تھا۔

حکیم اجمل خاں ۱۱ر شوال ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸ء) کو پیدا ہوئے۔ یہ دہلی کے مشہور خاندان شریفی کے چشم و چراغ تھے۔ سلسلۂ نسب ترکستان کے مشہور صوفی بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار سے ملتا ہے۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ وہی بزرگ تھے جن کی دعاؤں کے طفیل تیمور ایک معمولی آدمی سے بادشاہ بن گیا تھا۔ بابر چونکہ تیموریہ خاندان سے تعلق رکھتا

حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب دہلوی

تھا اس بنا پر وہ اس خاندان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ چنانچہ بابر نے تزک بابری میں اس خاندان کا ذکر بڑے احترام اور کمال عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔

انھوں نے انتہائی کم عمری میں قرآن شریف حفظ کیا۔ بعد ازاں مختلف استادوں سے جن میں مولوی عبدالحق دہلوی، مولوی عبدالرشید رام پوری، مرزا عبداللہ بیگ، مولانا طیب، خلیفہ محمد امیر پنجہ کش، مولوی رضی الدین، حکیم رضا خاں اور دیگر ارباب کمال شامل تھے، نیز اپنے بھائیوں اور والد محترم سے بھی استفادہ کیا جس کا مثبت نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں ہی انھوں نے منطق طبیعات، ادب، فلسفہ، صرف و نحو، حدیث، تفسیر، فقہ اور طب میں کامل دستگاہ حاصل کر لی۔ اس کے بعد ان کی علم و حکمت، سیاست و فراست اور شان و شوکت سے بھرپور زندگی کا آغاز ہوا اور اپنی گوناگوں خصوصیات نیز غیر معمولی صلاحیتوں کی بدولت زمانے میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے رہے۔ لیکن ہستی فانی تھی، روح کب تک قفس عنصری کی اسیر رہتی بالآخر ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو قطرہ اپنی دریا نسبی پر ناز کرتا ہوا دریا سے ہم آغوش ہو گیا اور جسد خاکی کو خواجہ حسن رسول نما کے مزار کے قریب دفن کر دیا گیا۔

حکیم اجمل خاں ایک خوش گو شاعر تھے اور شیدا تخلص فرماتے تھے۔ شاعری میں وہ کس کے شاگرد تھے یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ حیات اجمل کی عبارت کچھ کہتی ہے، اسلم جیراج پوری اور فرحت شاہجہاں پوری کے خیالات کچھ اور ہیں، ڈاکٹر شفا گوالیاری نے بالکل خاموشی اختیار کی ہے تو اور دیگر حضرات نے انھیں خود رو شاعر تسلیم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بچپن سے انھیں شعر و شاعری کا شوق تھا لیکن گرد و پیش کے ماحول اور ارباب کمال کی صحبت نے سونے میں سہاگہ کا کام کیا جس سے وہ ایک کامیاب شاعر بن گئے اور زندگی بھر اس کے دل دادہ رہے۔ وہ کبھی شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر نہیں آئے، نہ انھوں نے کبھی مشاعروں میں حصہ لیا، نہ اپنی کوئی شعری تخلیق برائے اشاعت کسی اخبار یا رسالے کو بھیجی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد کے اخبارات و رسائل میں ان کا کلام دیکھنے ہی میں نہیں آتا۔ تاہم شریف منزل کی صحبتوں میں وہ اکثر شریک ہوا کرتے تھے اور احباب کے بیہم اصرار سے کچھ نہ کچھ ضرور سنا دیا کرتے تھے لیکن وہ بھی بہت مختصر۔ اس کی ایک وجہ ان کی کم گوئی بھی تھی کیونکہ انھیں ملی و ملکی معاملات اور اپنے ذاتی کاموں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ کبھی سکون سے فکر شعر کرتے۔ البتہ جب کبھی خوش قسمتی سے فرصت کے دو چار لمحے نصیب ہو جاتے تو ایک آدھ شعر نظم کر لیا کرتے تھے یا کبھی حالت سفر میں کچھ دو کچھ طبع آزمائی کر لیتے تھے۔ بہرکیف جو کچھ بھی ہے وہ منفرد و منتخب اور ان کی اعلیٰ فنکارانہ صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔

مرحوم اپنے ہم عصروں میں ایک خاص مقام رکھتے تھے اور عربی، فارسی اور اردو میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ لہٰذا تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام دیوان شیدا کے نام سے قاضی عبدالغفار کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں جرمنی میں شایع ہوا تھا۔ یہ خوبصورت جلد، حسین ٹائپ اور چاروں طرف سرخ حاشیے سے آراستہ نیز ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے خواجہ عبدالمجید صاحب شیخ الجامعہ اور اساتذۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے نام معنون کیا گیا ہے۔ مجموعے میں اردو اور فارسی غزلیات شامل ہیں۔ اساتذۂ قدیم کے دستور کے مطابق حروف تہجی کے حساب سے ترتیب قایم کی گئی ہے۔ ان میں چند حروف چھوٹ بھی گئے ہیں جن میں مرحوم نے یا تو غزلیں کہی نہیں ہیں یا دیوان میں شامل ہونے سے رہ گئیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمایئے:

مے الفت سے تیری دل ہوا مست زمیرا — الٰہی حمد میں بے خود رواں ہو اب قلم میرا

ہوگی خبر جو ہم نے سنی بیش و کم غلط — کھاؤ نہ بار بار خدا کی قسم غلط

مریض عشق کی جز مرگ دنیا میں دوا کیوں ہو — اگر جاں ہو عزیز اپنی تو جاناں پر فدا کیوں ہو

بزم میں غیر کے پہلو سے تم اٹھو تو ذرا — محشر دل میں مرے حشر بپا اور سہی

جب یہ سمجھوں گا کہ میری زیست ہے ممنون مرگ — موت میری زندگی کا آسرا ہو جائے گی

بیداد کا یہ تیری اثر ہے کہ ہجر میں — نالے بھی نکلے چاک گریباں کیے ہوئے

پھر داغ ہجر تازہ کروں گا بہار میں — مدت گزر گئی ہے چراغاں کیے ہوئے

جانے لگا ہے دل کی طرف ان کا ہاتھ آہ — نالے شب فراق کے کچھ کام کر گئے

حکیم اجمل خاں کا ذوق شاعری نہایت ستھرا، پاکیزہ اور تفکر سے بھرپور تھا۔ ان کے یہاں زندگی کے تقاضوں کی ترجمانی بھی ملتی ہے اور تغزل کے دوش بدوش حکیمانہ جذبات کی عکاسی بھی خوب ہے۔ اگر ان کے اشعار میں ایک طرف حب الوطنی اخلاق و اتحاد اور حقائق و معارف کی شمعیں روشن ہیں تو دوسری جانب رومانی خیالات اور حسن و عشق کی تجلیاں بھی جلوہ گر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا کلام برگزیدگی اور بزرگی کا آئینہ دار ہی نہیں ہے بلکہ تذکرۂ لب و رخسار کا بھی حسین شاہکار ہے ؎

وہ خواب ناز میں تھے مرا دیدۂ نیاز — دیکھا کیا اور ان کی بلائیں لیا کیا

مل جاؤ تم تو شب کو بڑھائیں گے تا ابد — مانگیں گے یہ دعا کہ الٰہی سحر نہ ہو

سبک ہونے نہ پائے گا مرا دل بار ارماں سے — کروں گا جب میں عرض مدعا ہم گراں ہوگا

حکیم اجمل خاں کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی، فن پر مکمل عبور تھا اور فکر پر بلا شرکت غیرے قابض تھے۔ وہ جس عالم میں جہاں جو کیفیت پیدا کرنا چاہتے آسانی سے پیدا کر دیتے تھے اور فکر کے آبشار کو جدھر موڑ دیتے ادھر دھارا بہنے لگتا تھا۔ دیکھیے سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف قافیوں میں کیسے اچھے شعر نکالے ہیں ؎

کبھی صیاد کا ہے ڈر کبھی خوف خزاں اس کو گلستاں میں دل بلبل پہ غم یوں بھی ہے اور یوں بھی

نصب برطرف مسجد ہو یا ہو کوئی بت خانہ وہ دلدار ہر جا تا قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

گداز دل سے پروانہ ہوا خاک جیا بھی سوز میں تو کیا جیا خاک

بھرا رہتا ہوں میں ہر لحظہ بس جام شراب مجھ کو بدنام کرے گی یوں ہی جام شراب

اسی طرح عام فہم زبان میں بلند خیالات کا اظہار بھی خوب ہے ؎

دل ہو میرا ترا تصور ہو ذکر ہو تیرا اور زباں میری

آخر لبوں تک آ ہی گئی آرزوئے دل کھو بیٹھے آج ہاتھ سے ہم آبروئے دل

خطا مجھ سے اے چارہ گر ہو گئی اے میرے دل کی خبر ہو گئی

نگہ اس نے کی ضبط جاتا رہا اٹھا درد اور چشم تر ہو گئی

اب کہاں ہیں میکدے میں شب کی بزم آرائیاں اک سبو باقی رہا ہے وہ بھی کچھ ٹوٹا ہوا

شاعر کے لیے قوت احساس شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملٹن (MILTEN) کے نزدیک جس فن کار میں جتنی شدید قوت احساس ہوگی اس کا کلام اسی قدر حقیقت سے قریب ہوگا۔ حکیم اجمل خاں کو قوت احساس کے ساتھ ساتھ شدید قوت ادراک بھی حاصل تھی۔ وہ روزمرہ کے مشاہدات اور اپنی زندگی کے معمولات تک کا جائزہ لیا کرتے تھے اور اس سے ایک نتیجہ اخذ کرتے تھے ؎

آشکارا یہ ہوا گور غریباں میں ہمیں موت نے سب کے لیے ایک ہی گھر رکھا تھا

دنیا بس اس سے اور زیادہ نہیں ہے کچھ کچھ روز ہیں گزارنے اور کچھ گزر گئے

ہر سرو سر بلند کو ہونا ہے سرنگوں اس دہر میں عروج سبب ہے زوال کا

شاعری شاعر کے افکار و اعمال کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ بات جس قدر حکیم اجمل خاں کے لیے میزان صداقت پر کھری اترتی ہے شاید کسی دوسرے کے لیے نہیں۔ حکیم اجمل خاں ابتدا سے ہی ملک کے جاں نثار، ہندو مسلم اتحاد کے حامی اور آزادی کی جد و جہد میں گاندھی جی کے پورے شریک کار تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے ظلم و ستم بھی دیکھے تھے اور جور و استبداد بھی۔ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کا پاس ہونا اور اس کے خلاف گاندھی جی کا اس مشہور حلف نامے کو شائع کرنا جسے ستیہ گرہ کے اصول کی بنیاد سمجھنا چاہیے، اور پھر سیف الدین کچلو اور ستیہ پال کا اس کے رد عمل میں فوج سے ٹکر لینا اور بعد ازاں جلیانوالہ باغ کے اندوہناک اور انسانیت سوز المیہ کا پیش آنا، یہ سب ایسے ناقابل فراموش واقعات تھے جن کا اجمل خاں کے دل و دماغ اور فکر و شعور پر اثر پڑنا قدرتی بات تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں غیر ملکی حکومت سے انتہائی نفرت اور بیزاری پیدا ہو گئی جو ان کے اشعار میں کہیں طنز کی صورت میں نمودار ہوئی تو کہیں واقعات کی شکل میں ظاہر ہوئی ؎

گوش گلشن تک دسترس جب تک نہ ہو بلبل شوریدہ کی فریاد کیا

جس سے تھم سکتا نہ ہو جوش شباب اس ستمگر کی کریں فریاد کیا

آئی ہے بہت شان سے گو فصل بہاری پیغام مگر مرگ عنادل کے لیے ہے

یاد رکھنا ہم دم جور و ستم یہ میری بات جڑ نہیں سکتا کبھی انساں کا دل ٹوٹا ہوا

مختصر یہ کہ حکیم اجمل خاں ایک خوش فکر، حقیقت پسند اور باشعور شاعر تھے۔ وہ منظر عام پر نہیں آئے لیکن شاعرانہ کمالات میں وہ اپنے ہم عصروں سے دو قدم آگے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا انداز بیان نہایت سلجھا ہوا روایتی انداز سے کسی قدر مختلف اور تعمیر پسند ہے۔ زبان ٹکسالی اور اردوئے معلیٰ کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ روزمرہ، محاورہ، تشبیہات، استعارات، شستگی اور شائستگی ان کے کلام کا جوہر ہیں۔ کاش ان کی توجہ مکمل طور پر شاعری کی طرف ہوتی تو ان سے بھی زیادہ قیمتی جواہر پارے وجود میں آتے تاہم جو بھی شعری سرمایہ ہم تک پہنچا ہے وہ شاہکار سے کم نہیں۔ ان کے ادبی جواہر پاروں ہی کو لے لیا جائے تو وہ ان کے نام کو باقی رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

★

ہم آہنگی

خضر ہی نی

فطرت کے ہر اک جانب رنگین اشارے ہیں — اک سمت ہیں گل بوٹے اک سمت ستارے ہیں
گلشن میں بہاروں نے سب رنگ نکھارے ہیں — عشرت گہِ عالم کے انداز سنوارے ہیں
کچھ فرش کی تصویریں کچھ عرش کی تنویریں
بنتی ہیں اسی عنواں ہر جہد سے تقدیریں

فطرت ہی گلستاں کی تنظیم جماتی ہے — بکھرے ہوئے دانوں کو کھیتوں میں اگاتی ہے
شبنم کے اشاروں پر غنچوں کو کھلاتی ہے — ذروں کو ضیا دے کر اک فرش بچھاتی ہے
یا ایک ہی جلوے کی رنگین ہیں تصویریں
بنتی ہیں اسی عنواں ہر جہد سے تقدیریں

آگاہی فطرت کے اطوار سکھاتے ہیں — قطرے ہی سمندر کو ذی شان بناتے ہیں
یہ ظرف کے سازوں پر کچھ گیت جگاتے ہیں — موجوں میں اداؤں کا انداز سجاتے ہیں
یہ جذبۂ الفت کی کہلاتی ہیں تاثیریں
بنتی ہیں اسی عنواں ہر جہد سے تقدیریں

تصویرِ ہم آہنگی نظروں میں بساتے ہیں — اندازِ جہاں بانی پندار سکھاتے ہیں
منزل کو ارادے ہی خود کھینچ کے لاتے ہیں — مضبوط چٹانوں کو اک آن میں ڈھاتے ہیں
مضبوط ارادوں پر قربان ہیں تدبیریں
بنتی ہیں اسی عنواں ہر جہد سے تقدیریں

لفظوں کو قبا کس نے؟ تنظیم نے پہنائی — تنظیم سکھاتی ہے آداب خود آگاہی
ڈھالی ہے چٹانوں کو اک شوق کی دانائی — تمثیل کی خاطر ہی اک ذہن میں بات آئی
ملتی ہیں اسی باعث کچھ عقل سے جاگیریں
بنتی ہیں اسی عنواں ہر جہد سے تقدیریں

جب تیل نکلتا ہی ہو جاتی ہے کھل[1] پیدا — بل جل ہی کے ہوتا ہے اک رسی میں بل پیدا
یک جہتی ہی کرتی ہے بس جوشِ عمل پیدا — ایسی کوئی مشکل ہے جس کا نہیں حل پیدا
تاریخ میں ملتی ہیں اس قول کی تفسیریں
بنتی ہیں اسی عنواں ہر جہد سے تقدیریں

[1] کھلی

جمالِ حیات

اعجاز فاطمہ

خدمتِ ملک اک عبادت ہے
یہ عبادت بڑی سعادت ہے
اور یہ جذبۂ عدیم المثیل
نعمت و راحت و مسرت ہے
یہ مسرت اگر ہر اک کو ملے
تو بھی اک بے نظیر خدمت ہے
خدمتوں کے حسین جلوؤں میں
حسن ایثار ہے، محبت ہے
اور محبت کی بارگاہوں میں
رفعتِ شوق کیا ہے عظمت ہے
اور عظمت کے آستانے پر
سرنگوں جذبۂ عقیدت ہے
اس عقیدت کے جو قریب نہیں
ملک سے اس کو کیا عقیدت ہے
یہ عقیدت بھی اے وطن والو!
درحقیقت حسیں عبادت ہے
یہ عبادت ہے اپنی خدمت بھی
اپنی خدمت میں نور و نکہت ہے
نور و نکہت تو ہی جمالِ حیات
اور جمالِ حیات دولت ہے
دولتِ زیست کے سجانے کو
صرف بے پایاں کیف راحت ہے
اور راحت کا نام ہیں بچے
یہ فسانہ نہیں، حقیقت ہے
تین یا دو ہی، بچے ہیں سب کچھ
گویا راحت کی یہ علامت ہے
زیست کی شادمانیوں کی قسم! — "ضبطِ تولید" کی ضرورت ہے
اس ضرورت میں ہے بقائے وطن — اس سے زیادہ نہیں ہے امن و امن

بھٹکتی روح

اخلاق حسین عارف

وہ سیاہ گھنگھریالے بالوں والی دل ربا، جس کے گرد آلود چہرہ پر اب بھی نوبہاراں خوشۂ انگور کی سی شگفتگی کھیل رہی تھی۔ اس کی مدھ بھری آنکھیں، جیسے شفاف جھیل کی سطح پر دو کھلے ہوئے کنول، جن سے وہ ہر آنے جانے والے راہ گیر کا غائر مطالعہ کرتی۔ اس کا لباس بیتے ہوئے دنوں کے وقار کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ مگر اب اس درجہ بوسیدہ ہو چلا تھا کہ اس کے گل بوٹے بھی مدھم پڑ چکے تھے، وہ تھکے قدموں سے جو پاٹی سی فیس پر ٹہلتے ٹہلتے کبھی میرین ڈرائیو والی سڑک پر مڑ جاتی اور پھر واپس لوٹ کر ہینگنگ گارڈن کی سمت چل پڑتی۔

ڈیوٹی پر تعینات پولیس کی نظریں بچاتے ہوئے وہ بہت محتاط قسم کی گداگری میں مصروف تھی۔ اس قدر کثیف دکثتہ کپڑوں اور گرد آلود چہرہ کے باوجود وہ اپنے متناسب اعضائے بدن کے باعث اتنی جاذب نظر تھی کہ ہر من چلا اس پر اک نگہ غلط انداز ڈالے بغیر نہ رہتا۔ پہلے گہرا جائزہ، پھر عموماً خوش پوش لوگوں کو وہ اپنے تیر نظر کا نشانہ بناتی۔

"کچھ مدد کیجیے..... بہت مصیبت زدہ ہوں!!"

پریم پرکاش ٹھیک سی، گلزار ایرانی ریستوراں کے سائبان میں کھڑا دیر سے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھار لمحہ بھر کے لیے اس کی نظریں سناٹے بھرتی ہوئی موٹروں، دومنزلہ بسوں یا ساحل سمندر سے لگی ہوئی کشتیوں کی طرف جاتیں، ورنہ اس کی ماحصل نظر صرف وہ سیاہ گھنگھریالے بالوں والی بھکارن تھی۔

جیسے ہی وہ برآمدے سے نیچے اتر کر دو ایک قدم چلا، اس نے دیکھا کہ وہ ایک شانِ تغافل سے اس کی طرف بڑھی قریب پہنچ کر پہلے اس نے محتاط نظریں ادھر ادھر دوڑائیں پھر اطمینان کر کے نحیف آواز میں کہا:

"کچھ مدد کیجیے..... میں بہت دکھی ہوں..... زمانے کی ستائی ہوئی"

بےزار ہو کر اس نے اسے جھڑک دینا چاہا ــــ مگر وہ ایسا نہ کر سکا ــــ پیراسائٹ..... مادر بھومی کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ جیسے الفاظ اس کے دماغ میں گونجے تو، مگر کچھ اپنے آدرشوں کے پیش نظر اور کچھ اس کی مے خانہ بدوش آنکھوں کے باعث، جو اس کے دل میں کھب گئی تھیں وہ چپ رہا..... اور جیب سے پرس نکال کر ایک روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا ــــ بے دلی سے اس نے روپیہ لے کر مٹھی میں دبوچ لیا اور چل دی۔

ٹھیک اسی وقت سامنے چوڑی سڑک پر کوئی "لفڑا" شروع ہو گیا جہاں ذرا دیر میں خاصی بھیڑ لگ گئی۔ متجسس پرکاش بھی فوراً ہجوم کو چیر کر اندر گھسنے میں مصروف ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اس جیب تک پہنچا جس میں پرس رکھا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ پرس ندارد ہے۔ اپنا شک رفع کرنے کی غرض سے اس نے باری باری تمام جیبوں کو ٹٹول ڈالا مگر اسے نہ پا کر مایوسی اور جھنجھلاہٹ میں مجمع سے باہر نکل کر بڑبڑایا...

..... بلنڈر..... بھاری غلطی......!

اس کے دماغ میں بیک وقت بہت سے خیالات آئے اور گڈمڈ ہو گئے۔ کچھ لوگوں کے چہروں پر اس کی مشکوک نظریں پڑیں۔ معاً اس کی نگاہیں اس سست رفتار بھکارن پر بھی پڑیں جو اب تیز تیز قدموں سے سڑک پار کر رہی تھی اور اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی ــــ

ــــ وہ اس کے تعاقب میں جھپٹا۔

وہ سڑک پر کھڑی موٹروں کے درمیان سے بہ سرعت گزر رہی تھی۔ پرکاش بھی بڑی ہوشیاری سے موٹروں کی آڑ لے کر اس کا تعاقب کرتا رہا۔ اور نسوانی عورت کی برق رفتاری قابل تعریف تھی۔ اس نے سامنے گزرتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی کو اشارے سے روکا اور جھٹ اس میں سوار ہو کر چل دی۔ پرکاش نے بھی دوسری ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کا پیچھا کیا۔

سامنے بھاگتی ہوئی ٹیکسی کئی سڑکوں اور موڑوں سے گزر کر بھرے بازار کے ایک عالی شان لیڈیز اسٹور کے سامنے رکی اور وہ ... طرح بڑی تیزی سے کار سے نکل کر اسٹور میں داخل ہوئی اور کاؤنٹر پر موجود شاپ اسسٹنٹ سے کچھ کہتے ہوئے اس انداز سے اس نے پرکاش کی طرف جو اسٹور کی جانب بڑھ رہا تھا، دیکھا گویا اشارہ کر رہی ہو کہ یہ شخص میرا پیچھا کر رہا ہے اور پھرتی کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو کر نظروں سے غائب ہو گئی۔

پرکاش بھی اسی وقت اسٹور میں داخل ہوا۔ شاپ اسسٹنٹ نے اُسے اپنی جانب مخاطب کیا:

"یس پلیز...... بولو سیٹھ، کیا حکم......!!"

"جی ..... میں ۔ میں اس بائی جی (ممبئی میں یہ لفظ بُرے معنوں میں مستعمل نہیں ہے) کے ساتھ ہوں جو ابھی اوپر کے مالے پہ گئی ہے۔"

شاپ اسسٹنٹ کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی پرکاش بڑبڑایا "میں انتظار کروں گا" اور وہ سامنے والے خالی صوفے پر بیٹھ گیا۔ خیالات کی ایک مشین تھی جو اس کے دماغ میں چل رہی تھی۔ کبھی وہ اس پر لطف "حادثے" پر آپ ہی آپ مسکرا دیتا اور کبھی ایک نامعلوم اندیشے سے ایک دم گمبھیر ہو جاتا۔ اس کو اپنی کھوئی ہوئی رقم پر افسوس سے زیادہ اس ڈرامائی واقعے کی تہہ تک پہنچنے اور یہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ دراصل یہ بھکارن ہے بھی یا نہیں اور اگر نہیں تو پھر کون ہے!

اس طرح کے غیر معمولی حالات سے لطف اندوز ہونے کا مزاج اس کو اپنے کروڑپتی باپ سیٹھ بالک رام ٹھیکیدار سی آنجہانی سے ورثے میں ملا تھا۔ انتظار کرتے کرتے اکتا کر کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا کہ وہ بلا کسی رو رعایت کے اسے قانون کے حوالے کر دے گا۔ ...... مگر ذرا پنجوں میں آئے ہوئے شکار سے تفریح کے بعد، بالکل اس طرح جیسے بلی ننھی منی چُہیا کو لقمۂ تر بنانے سے پہلے اس سے خوب کھیل لیتی ہے......! ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ قانون کے حوالے کرنا تو اپنے بس کی بات ہے۔ پھر عجلت کاہے کی؟ بلا سے اس میں اپنا کچھ وقت ہی تو ضائع کرنا پڑے گا۔

وہ اسی طرح سوچتا رہا۔ اس کو وہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ گزر گیا اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ پونے چھ بج رہے تھے۔ یکایک لفٹ کی گھنٹی کی آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی، اس نے دیکھا وہ اس سے اُتر کر باہر آ رہی ہے۔ اگر پرکاش کے ذہن پر اس کی دو کھلے ہوئے کنول جیسی آنکھیں نقش نہ ہوتیں تو اس ہیئت میں اسے پہچاننا مشکل تھا کیونکہ اس نے تو جیسے کایا کلپ کرا لی تھی۔ گرد سے اَٹی ہوئی گیہواں رنگت شہابی ہو گئی تھی، بے جان سفیدی مائل ہونٹ چہک کر گلابی ہو چکے تھے، کانوں میں رنگ بدلتے ہوئے ہیرے کے لانبے لانبے بندے دیکھنے والوں کا دل لبھا رہے تھے، گلے میں پڑا ہوا موتیوں کا خوبصورت ہار ذوق انتخاب کا غماز تھا، بال انتہائی خوب صورتی سے طرز جدید کے مطابق سنوارے گئے تھے، زرکار بنارسی ساڑی اور سنہرے کام کی پیروں میں سلیپر —— اس وضع میں وہ نوبہار نازنین بڑی دل فریب لگ رہی تھی۔

یہ بناؤ سنگار کس کے لیے ہے ——! اس نے سوچا۔ مگر اس وقت سب کی موجودگی میں اس نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا مگر جب وہ فٹ پاتھ پر آ گئی تو پرکاش تیز قدم بڑھاتا ہوا اس طرح اس کے سامنے آ گیا کہ وہ اس سے ٹکرا سی گئی۔ اس کے منہ سے سیٹی نما ہلکی سی چیخ نکلی تھی اور وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ پرکاش کو پہچان کر اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا:

"اوہ ..... اچھا آپ!"

اگر اس نے اپنی صنف کی آڑ لے کر شور و غل کرنے اور اپنی پھنسی ہوئی گردن پرکاش کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی ہوتی تو اس کے لیے یہ موقع بہت موزوں تھا مگر اس نے اس قسم کی کوئی بات نہ کی۔ اس کی

خاموشی گویا زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ قسمت کے فیصلے سے آگاہ وہ اس پر صابر و شاکر ہے۔

"سب خرچ کر دیا یا اس میں کچھ بچا یا بھی ؟" پرکاش نے ترس کھا کر پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے ایک آہ سرد کھینچی اور پھر ایک طویل خاموشی۔

"کچھ تو بولو — مہارانی ؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"بتاتی ہوں — ذرا دم تو لینے دو!"

پاس کھڑے ہوئے موقع شناس ٹیکسی والے نے اس فیشن ایبل جوڑے کو فٹ پاتھ پر محو گفتگو دیکھ کر فائدہ اٹھانا چاہا اور نزدیک آ کر بڑے ادب سے بولا :

"آئیے سیٹھ صاحب ! کدھر چلنا ہوگا !"

اس کے دریافت کرنے پر پرکاش نے سوچا کہ واقعی اس قسم کی بدمزہ گفتگو فٹ پاتھ پر کرنے کی بجائے ٹیکسی میں کیوں نہ بیٹھ کر کی جائے اس لیے اس نے اس غزالہ کو ٹیکسی میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور پچھلی سیٹ پر خود بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"کدھر چلوں صاحب !" ڈرائیور نے سوال کیا۔

پرکاش نے چہرے پر سنجیدگی کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا :

"پولیس اسٹیشن !"

"نہیں۔ نہیں" کہتے ہوئے اس نے اس کے ہونٹوں پر اپنا تھرتھراتا ہوا شہابی ہاتھ رکھ دیا۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہاں چلوں ؟"

"پولیس اسٹیشن کے علاوہ — جہاں چاہے چلو۔"

"بہتر ہے، پھر کوٹھی چلو !"

"ہاں وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"اور یہ میرے نہانے کا بھی وقت ہے۔ پھر شام کی تفریح کے لیے مزید روپے بھی تو لینے ہیں۔ تم نے تو جیب کی ساری رقم صاف کر دی ہوگی !"

یہ کہتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ "والکیشور — !"

جب ٹیکسی والکیشور کی طرف مڑی تو پرکاش نے سوال کیا :

"اچھا رانی جی ! یہ تو بتائیے کہ یہ ہاتھ کی صفائی آپ نے کہاں، کب اور کیوں دکھلائی ؟"

"اتنے سارے سوالات ایک ساتھ ؟"

"آپ ایک ایک کر کے جواب دیجیے !"

"مجھے آپ اس شہر میں اجنبی معلوم ہوئے، مگر لباس، وضع اور قطع سے کافی مالدار.... چونکہ سخاوت کے معاملے میں آپ صفر ثابت ہوئے اس لیے مجھے جھنجھلاہٹ ہوئی — ضرورت ایجاد کی ماں ہے — جب آپ بھیڑ میں گھسے تو میں بچتی کتراتی عقب سے آپ کے بالکل قریب تھی۔ موقع پا کر میں نے اپنا کام کر لیا۔ بعد میں میں نے یہ ضرور فیصلہ کر لیا تھا کہ اڑائی ہوئی رقم جلد ہی ادا کر دوں گی۔"

"ادہ ! —" وہ مسکرایا "گویا تمہیں میرا نام اور پتہ بھی معلوم تھا۔"

"پرس میں آپ کا کارڈ جو موجود تھا...... اب رہ گیا، کیوں — اس کا جواب کوٹھی پر دوں گی۔"

"آج تک کتنے شکار کر چکی ہو ؟"

"یقین کرو تو پہلا اور آخری — جو شکار ہو کر بھی تڑپ تڑپ کر مجھے ذبح کیا چاہتا ہے !"

"سو فی صدی جھوٹ —"

"دو سو فی صدی سچ" بے تکلف ماحول میں اس کی شگفتگی ہولے ہولے واپس آ چلی تھی۔ "صرف اتنی گزارش ہے کہ نو بجے رات تک آزاد رہنے دو پھر جو مرضی ہو کرنا، چاہے پولیس میں دے دینا..... چاہے گرجتے جھاگ اچھالتے سا ساگر میں ڈبو دینا۔"

والکیشور پہنچ کر ڈرائیور سے پرکاش نے "تھیکرسی ہاؤس" چلنے کو کہا۔ کمپاؤنڈ میں داخل ہونے کے لیے عالی شان کوٹھی کے بڑے آہنی پھاٹک کو باوردی چوکیدار نے کھولا۔ ٹیکسی روشوں کے درمیان سرخ بجری کٹی ہوئی پتلی سڑک سے گزر کر پورٹیکو میں رکی تو ایک ملازم نے لپک کر دروازہ کھولا۔ پرکاش نے مہمان کو ساتھ لیے اندر جاتے وقت ملازم کو کرایہ ادا کرنے کی ہدایت کی۔ پرکاش خود مختار اور آزاد تھا مگر یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی عورت کو کوٹھی میں ساتھ لایا تھا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے اپنے خاص ملازم کو بلایا :

"بھاتو — !"

"سرکار!!"

"غسل کا سامان!"

"ریڈی سر"

"کپڑے!"

"اپ ٹو ڈیٹ"

"ویری گڈ — اچھا دیکھو!"

"جی!"

"یہاں بیٹھیں گی" ذرا آڑے ہو کر آنکھ کے اشارے سے سمجھاتے ہوئے "ان کا سب طرح سے خیال رکھنا۔ آل!"

"بہت اچھا" کہہ کر بھاتو نے بہت سی میگزینیں اور رسالے اٹھا کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ ذرا دیر میں گرم گرم کافی اور بہت سے نمکین اور پیسٹری اس کے سامنے لگا دی گئی اور وہ بڑے اطمینان سے کافی پیتی ہوئی رسائل سے دل بہلانے لگی۔

پرکاش جب کپڑے بدل کر چلنے کے لیے آمادہ ہوا تو وہ اس سے بولی:

"یاد ہے! مجھے آپ کے 'کیوں' کا جواب دینا ہے۔"

"ہاں یاد ہے۔"

"تو سنیے — واقعہ یہ ہے کہ میں جاگیردار شہرت گڈھ کے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں اور میری شادی اس سے زیادہ نامی گرامی راجہ صاحب سرونی سے ہوئی تھی۔ میرے پتا ہیرے جواہرات کی چمک دمک کے مقابلے میں شخصی کردار کو معمولی سی اہمیت بھی نہ دیتے تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ مجھے اپنے سن سے کہیں زیادہ اوباش شوہر کی گھناؤنی زندگی سے جلد ہی نفرت ہو گئی اور قریب تین سال کی لستم پستم ازدواجی زندگی کے بعد ایک وقت ایسا آ گیا کہ مجھے ان سے علاحدگی اختیار کرنا پڑی اور میں نے اپنے بچپن کے ساتھی اور کلاس فیلو ارجن کو جیون ساتھی بنا لیا جو سنگاپور میں پائلٹ تھا اور بمبئی برابر آتا رہتا تھا — مگر میں قسمت کی ہیٹی شروع ہی سے واقع ہوئی تھی۔ میرے پریم کی جوت پانچ سال کے بعد بجھ گئی — ارجن ایک ہوائی حادثے میں چل بسا۔

راجہ صاحب کے محل کے دروازے میں نے اپنے اوپر خود بند کر دیے تھے۔ میکے پلٹ کر جانا اور اپنی ہار تسلیم کر لینا میں نے گوارا نہ کیا۔ اس تمام عرصے میں مجھ پر کیا کچھ گزری یہ ایک دردناک کہانی ہے جس سے شام کے واقعے کا کوئی ربط نہیں۔ اسے یہیں چھوڑتی ہوں۔ مختصر یہ سمجھ لیجیے کہ میرے بطن سے ایک لڑکی ہے جو راجہ صاحب نے مجھ سے چھین لی تھی۔ اس کی شکل بھی آج تک انھوں نے مجھے نہیں دیکھنے دی۔ اس طویل مدت میں سیکڑوں بار اپنی پیاری بچی سے ملنے کے لیے میں نے انھیں لکھا مگر اس کٹھور دل نے گوارہ نہ کیا کہ مجھے اس سے ملنے کی اجازت دیتا — مگر اس بار جانے ایشور نے ان کے دل میں کہاں سے دیا ڈال دی کہ انھوں نے میرے خط کا جواب بھی دیا اور ایک تار بھی سنگاپور کے پتے پر بھیجا جس میں بلا تاخیر مقررہ دن اور وقت پر پہنچنے کی تاکید کی...... وہ شبھ دن آج ہی کا ہے وقت نو بجے کا۔"

"اتنی لمبی خاموشی کے بعد پتھر میں جونک لگ ہی گئی" پرکاش نے لقمہ دیا۔

"اس کے لیے میں ان کی شکرگزار ہوں۔ یہ رہا راجہ صاحب کا خط اور تار......" اور اس نے خط اور تار نکال کر پرکاش کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پڑھ کر اطمینان کر لو۔" پھر ذرا مسکرا کر "مگر دیکھنا کہیں یہ جعلی تو نہیں؟"

ذرا وقفے کے بعد وہ پھر بولی: "بمبئی تک میں کیونکر پہنچی یہ بھی ایک دردبھری داستان ہے جسے دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ البتہ اپنی بیٹی اور خاص کر راجہ صاحب پر یہ ظاہر ہونا کہ میری مالی حالت اتنی خراب ہو گئی ہے اور بمبئی آ کر میں پیٹ بھرنے کے لیے گداگری کر رہی ہوں، مجھے کسی طرح منظور نہ تھا اور نہ میری خودداری نے گوارا کیا کہ اس ذلت کے ساتھ میں ان لوگوں کے سامنے جاؤں جہاں میں کبھی رانی صاحبہ کہلاتی تھی۔ اسی لیے ......" اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی اور جذبات سے بے قابو ہو کر سسکیاں بھرنے لگی۔ پرکاش خاموش سب کچھ سنتا رہا۔ جب اس کا غم ہلکا ہوا تو وہ بولی:

"دنیا میں ایسی عورتیں بہت ہیں جو مفلس شوہروں کو چھوڑ کر دولت مندوں کا ساتھ دینے لگتی ہیں تاکہ وہ بیش قیمت لباس اور زیورات پہنیں

اپنے ہم جنسوں میں سرفراز ہوں اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں۔ کیا مجھے برا لگتا تھا کہ ایک راجہ کے پرشکوہ محل سے نکل کر ایک پائلٹ کے یہاں چلی جاؤں جو ہر وقت ہتھیلی پر جان لیے رہتا ہے! ـــــ حالات کے پیش نظر میرے بارے میں نتیجہ نکالنا اور دل کا کام ہے، میرا نہیں۔" ایک لمحہ ٹھہر کر وہ پھر گویا ہوئی :

"کیا میں ایسا نہیں کر سکتی تھی کہ راجہ صاحب کے ساتھ اس گھناؤنے ماحول میں رہ کر اسی رنگ میں رنگ جاتی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی؟ ـــــ مگر میں تو پاک اور سچے پریم کی بھوکی تھی جو وشواس گھات سے پاک ہو ـــــ اور وہ میں نے بھاری قیمت ادا کر کے حاصل کیا۔"

مونوگرام اور شاندار نام و پتہ چھپا ہوا خط مستارک کے اسے واپس کرتے ہوئے پرکاش نے سوچا ـــــ پرندے آزادی کی فضا میں اڑتے پھرتے ہیں، پھول آزاد ہوا میں کھل کر خوشبو بکھیرتے ہیں۔ فطرت کا تقاضہ ہے کہ ہر جاندار اپنی مرضی کا مالک ہو لیکن سماج نے عورت کو اس نعمت سے محروم اور اس کے تنگ نظر قوانین نے اس کی آزادی کو سلب کر رکھا ہے۔ اور اگر ان خود ساختہ قوانین کے خلاف کوئی آواز بلند کرے تو وہ بری اور گردن زدنی سمجھی جاتی ہے۔"

انتہائی کٹھنوں کے باوجود اس کی تعلیم و تربیت جس نہج پر ہوئی تھی اس نے اسے آزادئ نسواں کا حامی بنا دیا تھا۔ پرکاش کے دردمند دل سے یہ آواز نکلی کہ ایسے کھوکھلے سماج کے دعویدار یہ نہیں دیکھتے کہ خطا کار کون ہے اور بے خطا کون! وہ اپنی کوتاہ بینیوں سے صرف اعمال کے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور فتویٰ کردار کے خلاف صادر کر دیتے ہیں۔ اسے اس کی دردناک کہانی حقیقت پر مبنی معلوم ہوئی جسے سن کر اسے یقین ہو چلا کہ اس کی تربیت ایک جری ماں کے خون اور آنسوؤں سے مل کر ہوئی ہے۔

اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور جھنجھلاہٹ سے پیروں کو قالین پر زور سے پٹکا گویا وہ اپنے تکدر کو دماغ سے جھٹک کر روند ڈالنا چاہتا ہو۔ پھر اچانک وہ اس سے مخاطب ہوا:

"اور تم نے اب تک اپنا شبھ نام تو بتایا نہیں۔"

"قسمت کی ہیٹی کو شالی کہتے ہیں ـــــ شالی ورن ـــــ دھوا اور زمانے کی ستائی ہوئی..... تمھاری قیدی!"

"اچھا چلیے قیدی صاحبہ..... جیل سے نکل کر ذرا آزاد فضا میں چلیے اور اس وقت کا کھانا میرے ساتھ نوش فرمائیے۔" پھر بھانو سے بولا: "دیکھ بھانو! اگرین ہوٹل فون کر دے کہ اسپیشل ٹیبل پر دو ڈنر تیار رہیں۔"

"بہت اچھا سرکار۔"

"اور ہاں دیکھ، بڑی والی گیرج سے میری کیڈی لاک فوراً نکلوا لے۔"

"ابھی شوفر سے بولتا ہوں۔"

"نہیں گاڑی میں خود لے جاؤں گا۔"

"بہت اچھا۔"

یہ کیسے ممکن تھا کہ ڈنر کا وقت ہو اور مڈل و پولس کا الائٹ طبقہ گرین میں موجود نہ ہو؟ جب دونوں کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں داخل ہوئے تو بہت سی نگاہوں نے ایسے معنی خیز انداز سے شالی کو دیکھا جیسے وہ اپنے حافظے پر زور ڈال کر کسی بھولی بسری شخصیت کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ شالی نے بھی ان کے درمیان سے بہ عجلت گزرتے ہوئے پرکاش کو کنائے سے بتایا کہ کچھ ان میں سے خواتین اس کی پچھلی زندگی میں اس کی ہم جلیس رہ چکی ہیں۔

ڈنر ٹیبل پر بیٹھ کر مینو کارڈ سے کھانوں کے انتخاب کی ذمہ داری شالی کی تھی جس کو اس نے ستھرے مذاق کے ساتھ انجام دیا۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد پرکاش نے گھڑی دکھا کر کہا: "اب نو بجنے رہے ہیں۔ کیا وہاں جاؤ گی نہیں؟"

"ضرور۔ ضرور۔ فوراً ـــــ مگر آپ بھی ساتھ چلیے، کیوں کہ میں ابھی آپ کی حراست میں ہوں۔"

"اگر واقعی تمھیں میری ضرورت ہے تو مجھے چلنے میں عذر نہیں۔"

"آپ کو مجھے اپنے ساتھ رکھنے میں بڑی مسرت ہوگی۔"

"تو بس چلیے!"

موٹر میں بیٹھ کر پرکاش نے گاڑی اسٹارٹ کر دی جو فراٹے بھرتی ہوئی آن کی آن میں راجہ سردنی کی کوٹھی کے پورٹیکو میں کھڑی ہو گئی۔ ایک باوردی اردلی نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور پیچھے ہٹ کر دونوں کو فرشی سلام کرتے ہوئے بولا:

"کیا نام بولوں حضور!"

"سابق رانی صاحبہ سروفی" پرکاش بول اٹھا۔

دونوں کوٹھی کے برآمدے سے گیلری میں داخل ہی ہوئے تھے کہ باوردی اسٹیورٹ نے ڈرائنگ روم کے دروازے کا پردہ اٹھا کر انھیں خوش آمدید کہا۔

"حضور راجہ صاحب، رانی صاحبہ کا انتظار فرما ہی رہے تھے — اندر تشریف لائیے!"

جیسے ہی دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچے، اندر کے دروازے سے جس کا پردہ ایک خادم اٹھائے ہوئے تھا، راجہ صاحب سروفی اپنے جھری زدہ چہرے پر اک شاطرانہ مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے داخل ہوئے۔

"ویل سید شالی! یو لک ونڈرفل.... ریئلی ونڈرفل۔"

"تھینک یو ... — آپ سے ملیے، میرے کرم فرما سٹیھ پریم پرکاش تھیکرسی، ملٹی ملینر، بینکر، پیدمل اونر — آپ، راجہ صاحب سروفی۔"

"ہاؤ ڈو یو ڈو — تشریف رکھیے۔ تشریف رکھیے۔"

بیٹھتے ہی شالی نے سوال کیا "کیا میری بندو کو میرے آنے کی اطلاع ہو چکی ہے؟"

راجہ صاحب کا تامل بتا رہا تھا کہ سوال کا براہ راست جواب وہ ٹالنا چاہتے ہیں کیوں کہ وہ بولے:

"بندو کا کمرہ تو تم جانتی ہی ہو، اس میں میری رہبری کی کیا ضرورت، تم خود اسے جا کر دیکھ سکتی ہو!"

"بہت خوب" کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بے تابانہ محل کے اندرونی حصے میں جھپٹی۔ دبی ہوئی مسرت اور شادمانی اس کے رگ و پے میں برقی رو کے مانند توانائی پیدا کرنے لگی تھی۔ وہ تیز تیز قدم سرشار بندو کے کمرے کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ ادھر راجہ صاحب اپنی نشست سے اٹھ کر ٹہلنے لگے اور پرکاش سگار سلگا کر کش لیتے ہوئے لائف میگزین کی ورق گردانی کرنے لگا۔

ابھی مشکل سے چند لمحے گزرے ہوں گے کہ محل سے ایک دل دوز نسوانی چیخ سنائی دی۔ راجہ صاحب چلتے چلتے اپنی جگہ ٹھٹک گئے۔ پرکاش میگزین فرش پر پھینک کر کھڑا ہو گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے راجہ صاحب کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جس پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ راجہ صاحب گومگو کے عالم میں اسی جگہ کھڑے رہے۔ پرکاش کو فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ معاً اس کا ہاتھ بلٹ کی طرف گیا جہاں بھرا ہوا آٹومیٹک ریوالور لگا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اندر کے دروازے کا پردہ اٹھا کر محل کے اندرونی حصے کی طرف لپکا جدھر سے وہ جگر خراش آواز آئی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ کمرے کے سامنے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا شالی کمرے میں گر کر بے ہوش پڑی ہے۔ پاس ہی عود و عنبر کی سلگتی ہوئی خوشبوؤں کے درمیان ایک کفن پوش لڑکی جس کا صرف منہ کھلا ہوا ہے لیٹی ہے۔ اس کے تیکھے نقوش شالی کے نقش ثانی کا پتہ دے رہے تھے۔ پرکاش کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہی اس کی وہ لڑکی ہے جس سے ملنے کے لیے وہ حد درجہ بے قرار تھی — پرکاش تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور جھک کر شالی کو اپنی باہوں پر اٹھا کے باہر کی طرف مڑا۔ ڈرائنگ روم سے راجہ صاحب کہیں کھسک چکے تھے۔ اس نے شالی کو کار کی سیٹ پر لٹا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ راستے میں اس نے سوچا کہ پہلے اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس چلے مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور سیدھا تھیکرسی ہاؤس آ گیا۔ شالی کو مسہری پر لٹا کر وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں نیم وا کیں اور نحیف آواز میں پوچھا "میں کہاں ہوں؟"

"گھبراؤ نہیں — تم تھیکرسی ہاؤس میں ہو — میں ہوں پرکاش — تم بے ہوش ہو گئی تھیں اسی لیے میں تمھیں اس ناخوشگوار جگہ سے دور یہاں لے آیا۔"

ہلکی ہلکی سسکیاں —

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔"

"ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

"نا"

تھوڑی دیر بعد —

اپنی کوشش سے شالی اٹھ کر بیٹھ گئی اور بڑے غمزدہ لہجے میں بولی:

"دیکھا پرکاش! اس نے میرے ساتھ کیا دشواش گھات کیا؟ — جب

میری بند ہو گئی تب مجھے اس کے دیدار نصیب ہوئے!" اتنا کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

پرکاش اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا: "گھبراؤ نہیں ایشور اس کا بدلہ اس سے بہت جلد لے گا۔ اس کی عدالت میں دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔"

تھوڑی دیر تک وہ اس کے دل بہلانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ اسے قدرے سکون ہو گیا ہے تو اس نے اسے ایک گلاس موسمی کا عرق پلایا اور سکون سے سو جانے کی ہدایت کر کے کمرے کے باہر چلا گیا۔

وہ رات اس نے بڑی بے چینی میں گزاری۔ صبح سویرے ہی وہ اس کے کمرے میں پہنچا۔ شالی ابھی بستر ہی میں تھی۔ پرکاش کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پرکاش اس کے پاس ہی مسہری پر بیٹھ گیا اور مزاج پرسی کے بعد بڑی نرمی سے بولا:

"شالی ــــ!"

"ہاں"

اس نے پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

"ایک بات کہوں ــــ؟"

وہ سوالیہ نشان بن کر حیرت زدہ اسے گھورتی رہی منہ سے کچھ نہ بولی۔

"گو یہ اس کا وقت نہیں ہے ــــ مگر میں اپنا فیصلہ تمھیں سنا دینا چاہتا ہوں۔" ذرا وقفے کے بعد پرکاش کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے:

"پچھلے چند گھنٹوں سے تم میری قیدی ہو ــــ اور اب جیون بھر کی ساتھی، بولو تمھیں منظور ہے؟!" پرکاش کے اس جملے میں کشش تا بندگی تھی ــــ! اس کی بھٹکتی روح کو جیسے اک سکون ایک ٹھہراؤ مل گیا۔

غم اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے دوراہے پر کھڑی وہ لفظوں میں تو کچھ جواب نہ دے سکی مگر اس کی چوڑی چھاتی میں اپنا منہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔

★

بڑائی اس میں نہیں ہے کہ ہم اور قوموں کو دبا لیں۔ عظمت اسی میں ہے کہ ہم اپنے ملک کو اونچا کریں، دوسری قوموں سے دوستی کریں۔ اس راستے پر ہم چلیں گے۔ ہمیں آپس میں مل کر آگے بڑھنا ہے ــ کیونکہ ہم سب ہم سفر ہیں۔ ایک یاترا پر ہمیں جانا ہے اور اگر ہم راستے ہی میں ایک دوسرے سے لڑیں گے تو آگے کیسے بڑھ سکتے ہیں۔

ــــــ جواہر لال نہرو

غزل

ڈاکٹر اسما سعیدی

نہ بن گئی ہے یونہی جزوِ زندگی اپنی
مآلِ ضبط و تحمل ہے یہ خودی اپنی

رہا نہ اپنی خوشی کا کوئی تصور بھی
نہیں ہے تم سے الگ کوئی بھی خوشی اپنی

گزر رہی ہے کچھ اس طرح بے تعلق سی
کہ زندگی نہ رہی جیسے زندگی اپنی

سمجھ رہے ہو جسے نغمہ ہائے شعر و نشاط
ہے آہِ سرد، نہیں ہے یہ نغمگی اپنی

نہاں ہیں اس میں کسی کے دیے ہوئے سوغم
بہت عزیز ہے ہم کو فسردگی اپنی

سمجھ سکے ہیں بہت دن میں یہ حقیقت ہم
فریبِ جہل ہے، ظلمت ہے آگہی اپنی

ہزاروں غم میں بھی رکھتی ہے مطمئن دل کو
بڑے ہی کام کی نکلی یہ بے خودی اپنی

رہا ہے کون سا باقی مقامِ بربادی
دکھائے دیکھیے کیا کیا یہ بے حسی اپنی

نہ راہ زن ہے، نہ پیچ و خمِ رہ منزل
سبب ہے اپنی تباہی کا گم رہی اپنی

★

غزل

جاوید وششٹ

گناہ گارِ نظارہ ہوں میں، غلط کیا ہے
مگر وہ جلوۂ رنگیں، جو خود تقاضا ہے؟

وہ خندہ زن ہیں شبستانِ بے وفائی ہیں
رہِ وفا میں کوئی منتظر سا بیٹھا ہے!

پھیلتی ہوئی محرومِ پیرہن روحیں
گلی گلی میں تمھارے ستم کا چرچا ہے

گری ہے نوکِ مژہ سے جو رات بھر شبنم
تو برگِ لالہ و گل پر بھی آبلہ پا ہے

بھرا نہ کاسۂ سائل، نصیب سائل کا
سخی تو ابرِ کرم ہو، سخی تو دریا ہے

ہوا ہے خونِ تمنا تو اس کی فکر نہیں
سنا ہے زیرِ فلک بھی کوئی مسیحا ہے

شکستِ حسنِ نظر سے بچے نہ اہلِ نظر
وہ سامنے تھے، یہ کہتے رہے کہ پردا ہے

وہ ہم سے دور تھے، پھر بھی نہ دور تھے اتنے
یہ کیسا قرب کہ اس میں تو فاصلہ سا ہے

برس کے جیسے گھٹا کھل گئی، دھنک نکلی
چھلکتی آنکھ سے یہ کون مسکرایا ہے

ہماری کون سنے گا بھلا زمانے میں
زمانہ ان کی طرف ہے، زمانہ ان کا ہے

ملا ہے ترکِ تعلق سے کب سکوں دل کو
جو تار ٹوٹا ہے سو بار تھرتھرایا ہے

سنبھل کے خواہشِ دنیا سے کھیلنا جاوید
کبھی یہ پھول کی پتی، کبھی یہ کانٹا ہے

مقدّس ہردوار

ضمیر حسن کاظمی

ہردوار کا مقدس شہر اتر پردیش کے ضلع سہارنپور میں ایسے مقام پر واقع ہے جہاں گنگا کی زرخیز وادی فلک بوس ہمالہ کے قدم چھوتی ہے۔ اس جگہ گنگا بڑے آب و تاب کے ساتھ پہاڑوں کی پُرپیچ منزلیں طے کرتی ہوئی میدانی علاقے میں داخل ہوتی ہے۔ شمالی ہند کے کانپور، الٰہ آباد، وارانسی، پٹنہ اور کلکتہ ایسے اہم شہروں کی رونق اور اس کے لاکھوں مربع میل علاقوں کی سرسبزی و شادابی کا انحصار اسی دریا پر ہے۔

ہردوار کو لوگ مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ وشنو جی کے پیرو اس کو ہری دوار کہتے ہیں شیو جی کے بھگت ہرادوار اور دوسرے لوگ اُسے گنگا دوار یا مایا پوری وغیرہ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں لیکن عرفِ عام میں اس قدیم اور پُرفضا بستی کو ہردوار ہی کہا جاتا ہے جس کے لفظی معنی ہیں بھگوان کا دوار یعنی خدا تک پہنچنے کا دروازہ۔

ہندستان کی قدیم روایتوں میں ہردوار کے شمال میں واقع برف پوش پہاڑوں کو حکومت سماوی اور اس کے گردونواح کے علاقوں کو حکومت ارضی بتایا گیا ہے۔ شاید اسی سبب سے عہدِ عتیق میں لوگ ہردوار کو سورگ دوار یعنی باب جنت کہتے تھے۔

ہردوار کی تاریخ ماضی کی تاریکیوں میں گُم ہے لیکن اس کی جھلک تک کے قدیم صحیفوں اور تذکروں میں دکھائی دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور سنت کپل ہردوار کو عبادت و ریاضت کے لیے موزوں مقام سمجھ کر یہاں اقامت گزیں ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد سوئے اتفاق سے اُدھر راجہ سگر کے لڑکے اپنے قربانی کے گھوڑے کی تلاش میں آنکلے۔ راجہ اندر نے اُسی گھوڑے کو چُرا کر سنت کپل کی کٹی کے قریب باندھ دیا تھا۔ ان لوگوں نے سنت کپل کو چور سمجھ کر اُن پر حملہ کرنے کی نیت کی۔ اُن کے بد ارادے کا احساس ہوتے ہی سنت نے اپنی روحانی طاقت سے ان لوگوں کو جلا کر خاک کر دیا۔ مدت دراز کے بعد راجہ سگر کی نسل کے بھاگیرت نامی شہزادے نے وشنو جی کی ہدایت پر اپنے آباو اجداد کی نجات کے لیے گنگا کو ہمالہ کی گود سے نیچے اُتارنے کے لیے تپسیہ شروع کی۔ لیکن گنگا جی نے کہا کہ اگر مجھے زمین پر اُترنے کے لیے مجبور کیا گیا تو میں اس زور و شور کے ساتھ اُتروں گی کہ پاتال میں سما جاؤں گی۔ تب ان لوگوں نے شیو جی کی منت سماجت کی کہ گنگا جی کا زور آپ ہی کم کر سکتے ہیں۔ شیو جی ان لوگوں کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ جب دریا کا پانی انتہائی تیزی سے نیچے گرنا شروع ہوا تو شیو جی نے اس کا زور کم کرنے کے لیے اسے اپنی جٹاؤں میں دھارن کر لیا۔

ایک دوسری روایت کے مطابق سنت لوماش نے راجہ یدھشٹر کو بتایا کہ شیو جی نے گنگا کو اپنی جٹاؤں میں اس لئے دھارن کر لیا تھا کہ لوگ اس کے غیظ و غضب سے محفوظ رہ سکیں۔ لہٰذا ہم لوگوں کو اس مقدس دریا کے سامنے انتہائی خلوص اور احترام کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے۔

شیو جی اور گنگا دیوی کی روایت کچھ ایسی مقبول ہوئی کہ سنگ تراشوں نے نزولِ گنگا کو مختلف شکلوں میں پیش کیا ہے جس کے نمونے مہابلی پرم کے مندر (مدراس کے قریب) اور ملک کے متعدد مندروں میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس روایت کو تازہ کرنے کے لیے ہردوار میونسپل بورڈ نے ریلوے

اسٹیشن کے قریب شیوجی کا گنگا دھر کا ایک مجسمہ نصب کرایا ہے جس کے سر سے پانی کا فوارہ اُڑا کرتا ہے۔

گنگا کا بلوریں پانی ہردوار شہر کے قریب اور اس کے درمیان سے متعدد چشموں کی شکل میں ہو کر بہتا ہے اور اس مقام کی قدرتی خوبصورتی کو دوبالا کرتا ہے۔ شہر اور چاندی پہاڑ کے درمیان بہنے والی ایک میل چوڑی دھارا کے کنارے خوبصورت گھاٹوں اور خوشنما مندروں کا نظارہ بڑا دل کش معلوم ہوتا ہے۔ گنگا کے کنارے استادہ عمارتوں، گنبدوں اور بلند میناروں کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد اگر آپ کشتی کے ذریعے آگے بڑھیں تو "ابرگنگا کینال" کا عظیم الشان بند دکھائی دے گا جو فنِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

غالباً ہردوار کا سب سے زیادہ موثر اور دل کش منظر آرتی کی رسم کی ادائگی کے وقت دیکھنے میں آتا ہے جبکہ دریا کی سطح لاتعداد چراغوں سے جگمگا اٹھتی ہے۔ شام کو غروب آفتاب کے بعد جب تاریکی اپنا دامن پھیلانے لگتی ہے تو یکایک تمام فضا دور دراز سے آئے ہوئے یاتریوں کے "گنگا مائی کی جے" کے نعروں سے گونج اٹھتی ہے۔ اس وقت دریا میں پتوں، لکڑی کی کھپاچوں اور ناریل کے کھوپروں سے بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں رکھے ہوئے چراغوں کا نظارہ بڑا ہی دلچسپ ہوتا ہے۔

ہمالہ کے دو سمان نامی کتاب میں مس گورڈن کنگ نے اس رسم کو نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں "لالہ رُخ کے زمانے کی طرح آج بھی ہندو مائیں اور سہاگنیں بانس، ناریل، مٹی کے برتن یا کسی اور چیز کی چھوٹی سی ناؤ بنا کر اس میں دیپ مالا روشن کرتی ہیں۔ پھر اسے دریا میں تیرا دیتی ہیں۔ اگر ناؤ میں رکھے ہوئے چراغ بغیر بجھے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو یہ فالِ نیک سمجھا جاتا ہے لیکن اگر ہوا کے تیز جھونکوں یا لہروں کے سبب سے چراغ گل ہو جائیں تو اس عورت کا دل [illegible] اٹھتا ہے کیونکہ اس شگون بد سے اس کو اپنے بیٹے یا شوہر کا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے۔"

یہاں اشنان کے لیے ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ آتے ہیں۔ زمانہ قدیم سے ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہردوار کے متبرک پانی خصوصاً "برہماکنڈ" یا "ہر کی پیڑی" کے نیچے واقع ہے، غوطہ لگانے سے تمام گناہ دھل جاتے ہیں اور عقیدت مند تناسخ کے چکر سے آزاد ہو کر جنت میں داخل ہونے کا مستحق ہو جاتا ہے۔

ہر بارہویں سال یا ہر چھٹے سال جب بالترتیب کمبھ یا اردھ (نصف) کمبھ کا میلا ہوتا ہے تو عقیدت مند کثیر تعداد میں جوق در جوق ہردوار کا رُخ کرتے ہیں اور دور و نزدیک سے آتے ہوئے لاکھوں یاتری یہاں جمع ہو کر گنگا میں اشنان کرتے ہیں۔

کمبھ میلے کے عالم وجود میں آنے کے متعلق بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ پُران کی ایک روایت کے مطابق وہ کمبھ یعنی گھڑا جس میں امرت یعنی آب حیات بند تھا، دیوتاؤں اور راکشسوں کی متحدہ کوششوں سے سمندر سے برآمد ہوا تھا چونکہ دیوتاؤں نے اس گھڑے کو اپنے قبضے میں کر لیا اور راکشسوں کو امرت میں حصہ دینے سے انکار کر دیا اس لیے دونوں کے درمیان گھڑے کو حاصل کرنے کے لیے زبردست کش مکش شروع ہو گئی اور اس کش مکش میں امرت کی چند بوندیں چھلک کر ہردوار، ناسک، الہ آباد اور اجین میں گریں اور وہاں کی ندیوں کے پانی میں مل گئیں۔ اسی کی یاد میں ان مقامات پر باری باری کمبھ میلہ ہوتا ہے۔

کمبھ کی سائنٹفک وضاحت سیاروں کی چال سے وابستہ ہے۔ علم نجوم میں آسمان بارہ حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصے کو راشی کہتے ہیں۔ کمبھ بھی ایک راشی ہے۔ ہر تیسرے سال سیارہ مشتری کمبھ راشی میں داخل ہوتا ہے اور آفتاب میکھ راشی میں۔ اس متبرک موقعے کو کمبھ کہتے ہیں اور اس وقت مذکورہ بالا چاروں میں سے کسی ایک مقام پر کمبھ میلہ ہوتا ہے۔ ہر مقام کی باری بارہ سال کے بعد آتی ہے۔

ہردوار میں کمبھ میلہ اگرچہ زمانہ قدیم سے ہوتا آیا ہے لیکن تاریخ میں پہلی بار اس کا تذکرہ چینی سیاح ہوین سانگ کے مشہور سفرنامے میں ملتا ہے۔ اس سیاح نے تقریباً ۱۳ سو سال قبل اس مقدس مقام کی سیر کی تھی۔

تیرتھ استھان ہونے کے ساتھ ساتھ ہردوار اپنے مسحور کن مناظر، پرسکون فضا اور ہرے بھرے بلند و بالا پہاڑوں کی قربت کے سبب سیاحوں کے لیے ایک دل کش تفریح گاہ بھی ہے۔

ہردوار کے گھاٹوں کا نظارہ بڑا دل آویز ہے۔ سب سے مشہور اور متبرک مقام "ہر کی پیڑی" ہے جہاں وشنو جی کے قدموں کے نشان ایک

پتھر پر ثبت ہیں۔ اس مقام کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے نیچے "برہما کنڈ" ہے جو مخصوص اوصاف کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس میں کمبھ سے گرا ہوا امرت ملا ہوا ہے۔ اس کو برہما کنڈ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ برہما نے ہمالیہ کی بلندی سے اترتے وقت اسی مقام پر گنگا کا استقبال کیا تھا۔ اشنان کرنے کے علاوہ یاتری اس گھاٹ کا پانی اپنے ساتھ تبرکاً لے جاتے ہیں۔ مخصوص موقعوں پر اس گھاٹ پر یاتریوں کا اتنا زبردست ہجوم ہوتا ہے کہ اگر پولیس، اسکاؤٹ اور رضاکار معقول انتظامات نہ کریں تو بڑے حادثات رونما ہو سکتے ہیں۔

برہما کنڈ اور گنگا کی بڑی دھار کے درمیان ایک چھوٹا سا جزیرہ یا چبوترہ ہے۔ اس وسیع چبوترے پر ہندستان کے عظیم رہنما نیتاجی سبھاش چندر بوس کا قد آدم مجسمہ نصب ہے اور ایک خوشنما گھنٹہ گھر بھی بنا ہوا ہے۔ یہ جگہ اشنان کے علاوہ تفریح گاہ کا بھی کام دیتی ہے۔ یہاں پر سیاح چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مقام پر گنگا بڑے آن بان سے بہتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پشت پر واقع بلند و بالا پہاڑیاں جھک جھک کر گنگا دیوی کو نذرانۂ عقیدت پیش کر رہی ہیں۔

برہما کنڈ کے درمیان اور ہر کی پیڑی کے قریب مختلف دیوی دیوتاؤں کے مندر ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم گنگا دیوی کا مندر ہے۔ اشنان کے بعد یاتری گنگا دیوی کا آشیرواد لینے کے لیے اس مندر میں آتے ہیں۔ اس کے بعد یاتری شری رام چندر، شری بدری ناتھ اور شری لکشمی نارائن کے مندروں میں جا کر اپنے فلاح و بہبود اور نجات کے لیے دعا مانگتے ہیں۔

ہر کی پیڑی کے قریب ہی سروناتھ جی کا مندر ہے جس کے قریب ہی بودھی درخت کے نیچے گوتم بودھ کا ایک مجسمہ نصب ہے جسے تپسیہ کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس کے نزدیک ایک بلوریں چشمہ ہے جس کو بھیم گوڈا تالاب کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مشہور پانڈو جری سری بھیم کے گھوڑے کی ٹھوکر سے نمودار ہوا تھا۔

ہردوار شہر کے بالمقابل سرسبز و شاداب چاندی پہاڑ کی چوٹی پر ایک خوبصورت مندر ہے جو یاتریوں اور سیاحوں دونوں ہی کا ملجا و ماویٰ ہے۔ مذہبی پس منظر کے ساتھ ساتھ ہردوار کی آب و ہوا حسن و عشق کے لیے بھی سازگار رہی ہے۔ بہت سی رومانی داستانیں اس شہر سے وابستہ ہیں۔ یہاں تک کہ مہارشی بھردواج بھی اسی مقام پر ایک دوشیزہ کے دامِ الفت میں گرفتار ہو گئے تھے اور اس ازدواجی رشتے نے فنونِ جنگ میں یکتائے روزگار استاد دُروناچاریہ کو جنم دیا جنھوں نے مہا بھارت میں لافانی شہرت حاصل کی۔

ہردوار سے تقریباً ۲ کلومیٹر جنوب میں قدیم شہر "مایا پوری" ہے جس کا ذکر ہوین سانگ نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔ یہ مقام راجہ وینا کا دارالسلطنت تھا۔ کننگھم کا خیال ہے کہ یہ ہردوار کی سب سے پرانی بستی ہے۔ مایا پوری کے تین پرانے مندروں میں سب سے زیادہ مشہور مایا دیوی کا مندر ہے۔ مندر کے اندر تین سروں، چار ہاتھوں، ایک چکر اور ترسول کے ساتھ تراشی ہوئی مایا دیوی کی مورتی نصب ہے۔

مایا پوری سے ایک میل جنوب میں صاف ستھرا شہر کنکھل ہے جس کے خوبصورت مکانات اور چمکتی ہوئی سڑکیں قابلِ دید ہیں۔ یہاں دکشیشور کا مشہور مندر ہے۔ یہ مندر ایک دردناک واقعے کی یادگار ہے جو شیو جی کے خسر دکشیشور کی قربانی سے متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاربتی جی کے والد دکشیشور نے اپنے 'مہا یگیہ' میں پاربتی جی کے ساتھ بڑی بے رُخی کا برتاؤ کیا کیونکہ وہ وہاں بغیر بلائے ہوئے پہنچ گئی تھیں۔ یگیہ کے دیگر شرکا نے ان کے شوہر شیو جی کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے۔ پاربتی جی کو ان باتوں سے اتنا صدمہ پہنچا کہ انھوں نے اپنے کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔ اس حادثہ کے سبب شیو جی اس درجہ غضبناک ہوئے کہ دکشیشور کی گردن قلم کر کے یگیہ کو بھنگ کر دیا۔ لیکن بعد میں دوسرے دیوتاؤں کی منت و

سماجت سے دلمشیور کو حیات نو بخش دی۔ اس واقعہ کا ذکر شاعر اعظم کالی داس کی مشہور تخلیق کمار سنبھو میں پایا جاتا ہے۔

کنکھل میں کئی مشہور درس گاہیں بھی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف گرو کل کانگڑی ہے جس کا مقصد ہندستان کی قدیم علوم کو زندہ کرنا اور اس کو موجودہ دور کی ضروریات کے مطابق بنانا ہے۔

ہردوار سے ۱۴ میل کے فاصلے پر "رشی کیش" ہے جہاں بدری ناتھ، کیدار ناتھ، گنگوتری اور یمنوتری ایسی عظیم زیارت گاہوں کو راستہ جاتا ہے۔ اس مقام پر گنگا ایسے والہانہ شان و انداز سے بہتی ہے کہ اس کی صحیح منظر کشی قلم کی طاقت کے باہر ہے۔ ساتھ ہی گیروا بستر والے سادھوؤں اور سنیاسیوں کی آمد و رفت یہاں کی قدرتی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہے۔ یہاں آنے والے یاتری بھرت جی اور ست نارائن جی کے مندر کی بھی زیارت کرتے ہیں۔ اس پُر فضا مقام میں سوامی شیوآنند سرسوتی کی قائم کی ہوئی مشہور 'ڈیوائن لائف سوسائٹی' اور 'فارسٹ یونیورسٹی' بھی ہیں۔ یہاں دریا میں تیرتی ہوئی لاتعداد رنگین مچھلیاں گھاٹوں پر اس وقت جمع ہو جاتی ہیں جب لوگ ان کو چارہ پھینکتے ہیں۔ یہ بڑا دلچسپ منظر ہوتا ہے۔ مچھلیوں کا اتنا ہجوم دیکھ کر مچھلی خوروں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے لیکن شکار کی پابندی کے سبب وہ کفِ افسوس مل کر رہ جاتے ہیں۔

ایک اور قابل دید مقام لکشمن جھولا ہے۔ رشی کیش سے تین میل کے فاصلے پر لکشمن جھولا مناظر قدرت اور گنگا پر معلق پل کے لیے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دریا کو پار کرنے کے لیے رام چندر جی کے بھائی لکشمن جی نے سب سے پہلے یہاں رسوں کا پل بنایا تھا جس کی جگہ اب فولاد کا ایک خوشنما پل بنا ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ ہردوار اور اس کے گرد و نواح کے علاقے جہاں قابل تعظیم و تکریم ہیں وہاں وہ اپنے پُرفضا مقامات اور روح پرور مناظر قدرت سے بھرپور ہونے کے باعث بھی یاتریوں اور سیاحوں دونوں کے لیے یکساں کشش رکھتے ہیں۔

دور جدید میں ہردوار اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی ایک اور اہمیت سامنے آتی ہے جس کی طرف غیر ملکی اقتدار کے زمانے میں کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی۔ اور وہ ہے ان علاقوں کی صنعتی اہمیت۔ قومی حکومت نے ان علاقوں کی صنعتی اہمیت کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ صنعتی اور ترقیاتی کارخانوں کے قیام کے لیے یہ مقامات بے حد موزوں اور کارآمد ہیں چنانچہ رشی کیش کے نزدیک اینٹی بایوٹک دواؤں کا بھاری کارخانہ اور خود ہردوار کے قریب بجلی کے بڑے اوزار اور ساز و سامان کا کارخانہ قائم ہو چکا ہے۔ ان کارخانوں میں تیار ہونے والی دوائیں اور ساز و سامان نہ صرف ملک کی ضروریات کو بڑی حد تک پورا کر رہی ہیں بلکہ بیرونی زر مبادلہ بچانے میں بھی کافی مدد دے رہی ہیں۔ اس طرح یہ مقدس اور متبرک مقامات اگر ایک طرف عقیدت مندوں کی روحانی اور سیاحوں کی جمالیاتی آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں تو دوسری طرف ملک کی اقتصادی خوش حالی میں ایک اہم رول ادا کر رہے ہیں۔

★

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

تیز تر صنعت کاری سے ہی فی کس آمدنی میں اضافہ ممکن ہے — گورنر بی. گوپال ریڈی • • • صنعتی جمود کرنے پر گورنر کا زور • • • اتر پردیش کے چوتھے منصوبے میں زراعت کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے • • • دیہی علاقوں میں قومی بچت کے لیے انعامات • • • خاندانی منصوبہ بندی کی اہم سفارشیں • • • زراعتی صنعت کار پوریشن کا پانچ لاکھ روپے کا منافع • • • زراعت اور چھوٹی صنعتوں کے لیے بجلی پر سے دو حصوں والا ذیلی محصول ختم ہو گیا • • • پہاڑی علاقوں کے طلبا کے لیے ۱۳۶۸ نئے وظائف • • • سائیکل کے پرزے بکری ٹیکس سے مستثنیٰ • • • سرکاری ملازمین کو فلاحی سرگرمیوں کے لیے مالی امداد کے قواعد • • • بکری ٹیکس پر نظر ثانی کا بندوبست • • • ہردوا گنج میں ۵۰ میگا واٹ بجلی پیدا کرنے کی دوسری مشین • • • متفرقات

گورنر اتر پردیش ڈاکٹر بی. گوپال ریڈی نے حال ہی میں دوھان بھون لکھنؤ میں ہونے والی صنعت کاروں کی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ صنعت کاری کی رفتار تیز تر کر کے ہی ریاست میں روز بروز گرتی ہوئی فی کس آمدنی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ اتر پردیش میں بڑے اور چھوٹے صنعتی واحدوں کی مجموعی تعداد اس وقت تقریباً ۱۷۰۰۰ ہے۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں ۶۰۰ کروڑ روپئے کی مالیت کی صنعتی پیداوار ہوئی تھی۔ اس دوران میں صنعتی پیداوار میں کمی ہوئی ہے لیکن چوتھے پنج سالہ منصوبے کے آغاز تک امید ہے کہ ہم ۱۹۶۵ء کی پیداوار کی سطح تک پہنچ جائیں گے۔ اس منصوبے میں ہم ۸ سے ۱۰ فیصدی تک ترقی کی شرح میں اضافہ کرنے کے کوشاں ہیں۔

ہماری روایتی صنعتوں، خاص طور سے کپڑے اور شکر کی صنعتوں کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے اور جب تک ان کو بچانے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی جائے گی ان کے زوال کو روکنا مشکل ہو گا۔ سرمایے کی کمی کی وجہ سے جدید طرز پر ان کو ترقی دینا ممکن نہیں ہو سکا۔ چنانچہ ریاستی حکومت نے اپنے وسائل کے مطابق چوتھے منصوبے میں ان کی ترقی کے لیے کچھ سرمایے کا بندوبست کیا ہے۔

اتر پردیش کی صنعتی پسماندگی کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ پہلے دو منصوبوں میں کوئی بھی مرکزی صنعتی پروجیکٹ اتر پردیش کے لیے منظور نہیں کیا گیا۔ تیسرے منصوبے میں بھی مرکزی پروجیکٹوں پر مجموعی طور پر جو ۱۴۴۴ کروڑ روپیہ لگایا گیا تھا اس میں سے اتر پردیش کو صرف ۲۷ کروڑ روپیہ ملا۔ اس طرح اول تین منصوبوں کے دوران میں اتر پردیش کو اس رقم کا محض ۸ء۳ فیصد ملا جو ملک میں مجموعی طور پر مرکزی پروجیکٹوں پر لگائی گئی تھی۔ ہم صنعتوں کے قیام کے لیے مرکز کو زمین، پانی اور بجلی دینے کو تیار ہیں اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ پانچ برسوں میں مرکزی حکومت اتر پردیش میں صنعتی شعبے میں کم سے کم چار سو کروڑ روپے کا سرمایہ لگائے گی۔ ہم دیگر امور کے ساتھ ساتھ وارانسی میں ایک ٹریکٹر کارخانہ، ہردوار میں ایک [illegible] فورج فیکٹری"، بندیل کھنڈ یا مشرقی اضلاع میں ایک مشین ٹول فیکٹری، گونڈہ یا بہرائچ کے نزدیک ایک نیوز پرنٹ پلانٹ، نینی میں بھارت الیکٹرانکس کا ایک واحدہ اور دوسرے کارخانے قائم کرنے کے سلسلے میں گفت و شنید کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حکومت ہند سے ہم نے یہ درخواست کی ہے کہ وہ اپنی لائیسنس دینے کی پالیسی میں کچھ ایسی تبدیلیاں کرے جس کے نتیجے میں سرمایہ فراہم کرنے والے بڑے بڑے کل ہند مالیاتی ادارے یہاں کی صنعتوں کے فروغ کے لیے زیادہ سرمایہ فراہم کر سکیں۔

گورنر ڈاکٹر بی. گوپال ریڈی نے آج یہاں اس امر پر زور دیا کہ صنعتی جمود کو ختم کرنے کے لئے بلا تاخیر موثر اقدامات کیے جائیں جیسا کہ زراعت کے شعبے میں کیا گیا ہے تاکہ ریاست کی معاشی ترقی ہو سکے۔

گورنر صاحب ترقیاتی محکموں کے سینیر افسروں کے ایک جلسے کو خطاب

کر رہے تھے جس میں منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیرمین ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ گیڈگل اور اتر پردیش اور بہار کے لیے منصوبہ بندی کمیشن کے مشیر شری مینن بھی موجود تھے۔

تنگ نظری کو ترک کرنے اور ایک مثبت رویہ اپنانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے گورنر نے کہا کہ نظم و نسق کو صنعتوں کی تیز رفتار ترقی کے لیے ہر ممکن کام کرنا اور صنعت کاری میں جو دشواری بھی حائل ہو اس کو دور کرنا چاہئے۔

انھوں نے زراعتی پیداوار کمشنر کے مانند ایک صنعتی پیداوار کمشنر کی تقرری کا بھی مشورہ دیا جو دفتری تاخیر کے بغیر تیزی سے فیصلے کرے اور جو رکاوٹیں پیش آئیں انھیں دور کرے۔ اس کو ہر طرح صنعتی ترقی کے لیے ذمے دار قرار دیا جائے۔ وہ سکریٹریوں کے برعکس جو تمام مسائل پر اپنے محکموں کے نقطۂ نظر سے غور و خوض کرتے ہیں، تمام متعلقہ امور کا مجموعی طور سے جائزہ لے گا۔

سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے گورنر نے کہا کہ صنعتی زمرے میں رفتار ترقی کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیا جانا چاہیے تاکہ ہمیں کوتاہیوں اور مشکلات کا علم ہو سکے اور ہم انھیں دور کر سکیں۔

چوتھے پنج سالہ منصوبے کی اہمیت پر بھی گورنر نے زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہماری بقا کا انحصار منصوبے کی کامیابی پر ہے۔ لہٰذا ہر افسر کو اپنے آپ سے برابر یہ سوال کرتے رہنا چاہیے کہ وہ منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے فرائض کو بہ حسن و خوبی انجام دے رہا ہے یا نہیں؟۔

ڈاکٹر ریڈی نے کہا کہ نظم و نسق کو اپنے منصوبوں اور ان کے طریقۂ عملدرآمد کے بارے میں خارجی اعتراضات کا خیر مقدم کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کہاں غلطی کی گئی ہے اور کیسے اس کو درست کیا جا سکتا ہے۔

اتر پردیش کے ۲۰۵۰ کروڑ روپے کے چوتھے پنج سالہ منصوبے میں زراعت کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے کیوں کہ اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ زراعت کے زمرے میں مسلسل ترقی کے بغیر ریاست کی ہمہ گیر ترقی اور فی کس آمدنی میں اضافہ ممکن نہیں ہے۔

چوتھے منصوبے کی مدت میں آب پاشی سے متعلق ریاستی اور نجی پروجیکٹوں کے ذریعے مزید ۲۱٫۶۵ لاکھ ایکڑ آراضی کے لیے آب پاشی کی سہولتیں فراہم کرنے کی تجویز ہے۔

صنعتی اور زراعتی ترقی کے سلسلے میں بجلی بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔ چنانچہ چوتھے منصوبے کے دوران بجلی کی پیداواری صلاحیت ۱۴۲۷ میگاواٹ سے بڑھا کر ۲۲۴۵ میگاواٹ کرنے کی تجویز ہے۔ بجلی کے زیادہ سے زیادہ اور سستے استعمال کے لیے چوتھے منصوبے کے دوران بجلی کی ترسیل و تقسیم کے نظام کو بہتر بنانے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ ریاست میں پہلی بار ۴۰۰ کے۔ وی سسٹم شروع کیا جائے گا۔

امید کی جاتی ہے کہ ریاست میں نئے صنعتی واحدے قائم کرنے کے سلسلے میں مرکزی حکومت ۴۰۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کرے گی اور نجی زمرے کی بھی توسیع کی جائے گی۔ اس کے علاوہ ریاستی حکومت نے درمیانی چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی توسیع کے لیے بہت سی اسکیمیں وضع کی ہیں۔

مشرقی اضلاع، بندیلکھنڈ ڈویژن اور پہاڑی اضلاع کے لیے خصوصی بندوبست کیا گیا ہے۔ اسی طرح سماج کے کمزور اور پس ماندہ طبقوں کی ترقی کے لیے خاص انتظامات کیے گئے ہیں۔

چوتھے پنج سالہ منصوبے کو کامیابی سے بروئے کار لانے کا انحصار مالی وسائل کی فراہمی پر ہے۔ ریاستی حکومت اس مقصد کے پیش نظر نئے ٹیکس نافذ کرنے، لاٹری شروع کرنے، چھوٹی بچت اسکیموں کی حوصلہ افزائی کرنے، نئے قرضے جاری کرنے اور اخراجات میں بچت کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔ یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ مرکز گزشتہ تین منصوبوں کی طرح اس بار ریاست سے غفلت نہیں برتے گا اور اتر پردیش کی ترقی کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کرے گا تاکہ اس ریاست کی پس ماندگی ملک کی بحیثیت مجموعی ترقی میں مانع نہ ہو۔

زراعت۔ ریاست کے چوتھے پنج سالہ منصوبے کا خاص مقصد غذائی خود کفالت حاصل کرنا ہے۔ ریاست کی جملہ غذائی ضروریات پوری کرنے کے مقصد کے پیش نظر چوتھے منصوبے کے دوران ریاست کی زرعی پیداواری صلاحیت بڑھا کر ۲۴۴۲٫۶۷ لاکھ ٹن کر دینے کی تجویز ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے چوتھے منصوبے کے دوران گیہوں اور دھان اور پیوندی جوار یا باجرہ اور مکا کی کچھ غیر ملکی قسموں کی کاشت شروع کرنے کی تجویز ہے۔ منصوبے کے تحت ۷۴-۱۹۷۳ تک

کاتب ۔ ۹۰ اشک

۶ ر۱۷ لاکھ ہیکٹر رقبہ غلے کی زیادہ پیداوار والی قسموں کے زیر کاشت لانے کی تجویز ہے جبکہ اس سلسلے میں کل ہند نشانہ ۸ر۲۴۷ لاکھ ہیکٹر ہے۔

آب پاشی۔ زراعتی پروگراموں کی کامیابی کا انحصار چونکہ آب پاشی کی سہولتوں کی یقینی فراہمی پر ہے اس لیے اس ضمن میں ریاست کے چوتھے منصوبے کا مقصد آب پاشی کی موجودہ سہولتوں میں توسیع کرنا ہے تاکہ زیادہ پیداوار والی قسموں کی کاشت کے مجوزہ پروگرام کے لیے خاطر خواہ طور پر آبیاری کی سہولتیں بہم پہنچائی جا سکیں۔ چنانچہ چھوٹے پیمانے پر آب پاشی سے متعلق ریاستی اور نجی اسکیموں کو مجوزہ چوتھے منصوبے میں نمایاں اولیت دی گئی ہے۔

چوتھے منصوبے میں آب پاشی کے ریاستی وسائل کے لیے ۲۸ر۲۰۱ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے جس میں سے ۱۳۵ کروڑ روپیہ آب پاشی کے بڑے اور درمیانی وسائل پر اور ۲۸ر۶۶ کروڑ روپیہ چھوٹے پیمانے کے آب پاشی کے وسائل پر خرچ کیا جائے گا۔

چوتھے منصوبے کے دوران جن خاص زیر تکمیل اسکیموں کو مکمل کیا جائے گا ان میں رام گنگا پروجیکٹ اور گنڈک کینال پروجیکٹ شامل ہیں۔ یہ اسکیمیں جب مکمل ہو جائیں گی تو مزید ۳۳ر۱۰ لاکھ ہیکٹر کے لیے آب پاشی کی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔

چوتھے منصوبے کے دوران جو نئی کثیر المقاصد اسکیمیں شروع کی جائیں گی اُن میں کھارا ہائیڈل اسکیم، شہری باندھ اور لکھوار باندھ شامل ہیں۔

درمیانی درجے کی آب پاشی اسکیموں سے متعلق ۱۱ ایسی اسکیمیں شامل کرنے کے علاوہ جو پہلے سے جاری ہیں، چوتھے منصوبے میں ۱۲ نئی اسکیمیں بھی شروع کی جائیں گی۔

چھوٹے پیمانے کی آب پاشی سے متعلق ریاستی اسکیموں کے تحت ۴۴۰۰ ٹیوب ویل تعمیر کیے جائیں گے جن سے مزید ۸۷ر۵ لاکھ ہیکٹر کے لیے آب پاشی کی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں دوسرے کام بھی شروع کیے جائیں گے جن میں خشک کنووں کی درستی، بند صیوں اور نہروں کی تعمیر، ٹیوب ویلوں سے متعلق توسیعی سروس اور ٹیوب ویلوں سے زیادہ مقدار میں پانی کا نکالنا شامل ہیں۔

آب پاشی کے چھوٹے نجی وسائل سے کسانوں کو پانی بروقت دستیاب ہونا یقینی نہیں ہے۔ لہذا ریاستی حکومت کی تجویز ہے کہ چوتھے منصوبے کے دوران ان وسائل سے مزید ۲۵ر۲۰ لاکھ ہیکٹر کے واسطے آب پاشی کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے اقدام کیے جائیں۔

حکومت اس مقصد کے لیے ۲۵ر۴۶ کروڑ روپے کا بندوبست کرے گی۔ اس کے علاوہ ۰۰ر۱۹۰ کا ادارہ جاتی قرضہ بھی متوقع ہے جس میں قرضے سے مستفید ہونے والوں کو ۴۳ر۱۸۸ کروڑ روپے کی فراہمی خود کرنا ہوگی۔ اس سلسلے میں اُمید کی جاتی ہے کہ ترقی آراضی بینک اور امداد باہمی بینک کسانوں کو قرضے کی خصوصی سہولتیں فراہم کریں گے۔

بجلی۔ بجلی کی زیادہ مقدار میں دستیابی زراعتی اور صنعتی ترقی کی ضامن ہے اور اسی سے کسی منطقے کی معاشی خوش حالی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ چوتھے منصوبے میں ۵۲۲ کروڑ روپے کی لاگت کی بجلی کی اسکیموں کو اولیت دی گئی ہے۔ ریاست کی بجلی کی مجموعی پیداواری صلاحیت ۱۴۲۷ میگاواٹ سے بڑھا کر ۲۴۶ر۳ میگاواٹ کرنے کی تجویز ہے۔ بجلی کی کچھ اہم اسکیمیں حسب ذیل ہیں:

جمنا ہائیڈل پروجیکٹ۔ اس کا مرحلہ اول مکمل ہو چکا ہے اور دوسرا مرحلہ سنہ ۷۴-۱۹۷۳ء تک مکمل ہو جائے گا۔ دوسرے مرحلے کے تحت ۳۶۰ میگاواٹ کے دو بجلی گھر تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔

اوبرا ہائیڈل پروجیکٹ۔ اس پروجیکٹ کے تحت ۳۳-۳۳ میگاواٹ کی تین مشینیں سنہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں بجلی پیدا کرنے لگیں گی۔

رام گنگا ہائیڈل پروجیکٹ۔ یہ ایک کثیر المقاصد پروجیکٹ ہے جس کے تحت ۶۰-۶۰ میگاواٹ کے تین واحدے قائم کرنے کی تجویز ہے۔ ان میں سے دو واحدے سنہ ۷۳-۱۹۷۲ء میں شروع کر دیے گئے اور تیسرا سنہ ۷۴-۱۹۷۳ء میں چالو کیا جائے گا۔

متھری بھلائی ہائیڈل اسکیم۔ اس اسکیم کے مرحلہ اول کے تحت ۳۵-۳۵ ایم۔ ڈبلو کی تین مشینیں سنہ ۷۴-۱۹۷۳ء میں لگائی جائیں گی۔ مرحلہ دوم کے تحت ۳۵-۳۵ ایم۔ ڈبلو کی تین مشینیں لگانے کی تجویز ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ پروجیکٹ پانچویں منصوبے میں مکمل ہو جائے گا۔

ہردوا گنج مرحلہ چہارم۔ اس پروجیکٹ کے تحت ۵۵ میگاواٹ کی دو مشینیں لگائی جائیں گی۔ امید کی جاتی ہے کہ پہلی مشین سنہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں اور دوسری سنہ ۷۱-۱۹۷۰ء میں چالو ہو جائے گی۔

اوبرا تھرمل پروجیکٹ۔ اس پروجیکٹ کے تحت ۵۰-۵۰ میگاواٹ کی پانچ یونٹیں قائم کرنے کی تجویز تھی۔ ان میں سے تین چالو کی جا چکی ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ بقیہ دو یونٹیں سنہ ۷۰-۱۹۶۹ء تک بجلی پیدا کرنا شروع کر دیں گی۔

اوبرا تھرمل کی **توسیعی اسکیم**۔ اس اسکیم کے تحت ۱۰۰-۱۰۰ میگاواٹ کی تین مشینیں لگائی جائیں گی۔ دو یونٹ کے کام سنہ ۷۱-۱۹۷۰ء میں مکمل ہو جائیں گے اور ایک یونٹ کی تعمیر سنہ ۷۲-۱۹۷۱ء میں پائیہ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔

لکھوار پروجیکٹ۔ یہ پروجیکٹ ضلع دہرہ دون میں کلسی سے ۱۴ میل کے فاصلے پر شروع کیا گیا ہے۔ اس پروجیکٹ کے تحت شروع میں ۱۰۰ ایم۔ ڈبلو بجلی پیدا کی جائے گی لیکن بعد ازاں بیاسی میں ایک ذخیرۂ آب کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد پیداواری صلاحیت بڑھ کر ۱۵۰ ایم۔ ڈبلو ہو جائے گی۔ اس پروجیکٹ کے پانچویں منصوبے میں مکمل ہو جانے کی توقع کی جاتی ہے۔

جمنا ہائیڈل پروجیکٹ مرحلہ چہارم (حصہ اول)۔ اس پروجیکٹ کے تحت ایک بجلی گھر تعمیر کیا جائے گا جس میں ۱۰-۱۰ میگاواٹ کی تین مشینیں لگائی جائیں گی۔ اس پروجیکٹ کی تکمیل سنہ ۷۳-۱۹۷۲ء میں متوقع ہے۔

چوتھے منصوبے کے دوران بجلی کی ترسیل و تقسیم کے نظام کو بہتر بنانے پر زیادہ زور دیا جائے گا۔ اس کے نتیجے میں ریاست میں ایک حصے سے دوسرے حصے میں بڑے پیمانے پر بجلی منتقل کی جا سکے گی تاکہ دستیاب بجلی کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جا سکے اور اخراجات میں بھی بچت ہو سکے۔

چوتھے منصوبے کے تحت اہم شہروں میں بجلی کی سپلائی کی صورت حال بہتر بنانے اور ہر سال شہروں میں مختلف زمروں کے تقریباً ایک لاکھ صارفین کو بجلی فراہم کرنے کی تجویز ہے۔ عام پروگرام کے تحت ۲۵ ہزار لاکھ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو اور صارفین کی رقم جمع کرنے سے متعلق اسکیم کے تحت ۲۵۰۰۰ ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی فراہم کرنے کے علاوہ یہ تجویز بھی ہے کہ اس منصوبے کے دوران ۱۰۰۰۰ نئے دیہی صارفین کو بجلی دی جائے زیر نظر مدت میں تین ہزار نئی بستیوں کو بھی بجلی فراہم کی جائے گی۔

صنعتیں۔ امید کی جاتی ہے کہ مرکزی حکومت ملک میں مجموعی طور سے جو ۲۸۰۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کرے گی اس میں سے اتر پردیش میں ۴۰۰ کروڑ روپے کا سرمایہ لگایا جائے گا۔

ڈلا سیمنٹ فیکٹری کی تکمیل و توسیع، الموڑہ میں ایک ڈیڈ برنٹ میگنیسائٹ فیکٹری، ایک پاور ٹلر پروجیکٹ اور آپٹیکل انسٹرومنٹس فیکٹری کے قیام پر ۲۰ کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔

امید کی جاتی ہے کہ دور دراز علاقوں میں بجلی پہنچ جانے سے بڑے پیمانے پر دیہی صنعت کاری عمل میں آئے گی۔ اس زمرے میں ۱۰ کروڑ روپیہ لگانے کی تجویز ہے۔

منصوبے کی مدت میں دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے زمرے میں اسکیموں کو کامیابی سے بروئے کار لانے کے لیے ۲۳ء۱۶ کروڑ روپے کی رقم کا بندوبست کیا گیا ہے۔

چوتھے منصوبے میں نقل و حمل، تعلیم، صحت کی ترقی اور تعمیر مکانات اور پانی کی فراہمی کی سہولتوں وغیرہ کے لیے بھی سرمایے کا بندوبست کیا گیا۔

خصوصی مسائل والے علاقے۔ ریاست میں خاص طور پر تین پسماندہ علاقے ہیں۔ ان میں ۱۵ مشرقی اضلاع، بندیلکھنڈ کے چار اضلاع اور آٹھ پہاڑی اضلاع (دہرہ دون اور نینی تال کے میدانی علاقوں کو چھوڑ کر) شامل ہیں۔

چوتھے پنج سالہ منصوبے کے اہم ترین مقاصد میں سے ایک مقصد ریاست کے مختلف علاقوں کے درمیان معاشی ڈھانچے کی نابرابری کو دور کرنا ہے۔

سرمایہ کاری۔ اتر پردیش کے ۹۶۵ کروڑ روپے کے چوتھے پنج سالہ منصوبے کی عارضی سرمایہ کاری کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ریاستی زمرہ ۔۔ ۱۲۵۰ کروڑ روپیہ، عوامی زمرہ میں مرکزی سرمایہ

کاری ۸۰۰ کروڑ روپیہ، نجی زمرہ ۹۰۰ کروڑ روپیہ۔

اتر پردیش کو آبادی اور پسماندگی کی بنیاد پر مرکز سے لازمی طور پر ۶۰۰ کروڑ روپیہ ملنا چاہیے۔ یہ رقم چوتھے منصوبے کے تخمینوں میں شامل کر لی گئی ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اتر پردیش میں پہلے، دوسرے اور تیسرے منصوبے کے لیے مرکزی امداد کی فی کس رقم بالترتیب ۱۴ روپیہ، ۱۸ روپیہ اور ۲۶ روپیہ متعین کی گئی تھی جب کہ کل ہند اوسط بالترتیب ۲۵ روپیہ، ۲۷ روپیہ اور ۵۸ روپیہ تھا۔ تین سالانہ منصوبوں کے دوران بھی ریاست کے لیے فی کس مرکزی امداد کل ہند اوسط سے کم تھی۔

ظاہر ہے کہ جب تک مرکزی امداد میں کافی اضافہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ۶ فی صد سالانہ کی خاطر خواہ شرح ترقی حاصل نہ ہو سکے گی۔ یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ اگر اتر پردیش جیسی وسیع آبادی والی ریاست ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئی تو مجموعی طور سے ملک خاطر خواہ ترقی نہ کر سکے گا۔

حکومت اتر پردیش نے فیصلہ کیا ہے کہ دیہی علاقوں میں قومی بچت کو فروغ دینے کے لیے ہر ضلع میں ۵۰۰۰ روپے، ۲۰۰۰ روپے اور ۱۰۰۰ روپے کے تین انعامات دیے جائیں۔ اب تک ہر ضلع میں گاؤں سبھاؤں کو ۲۰۰۰ روپیہ اور ۱۰۰۰ روپے کے صرف دو ہی انعامات دیے جاتے تھے۔

حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ بلاک کی سطح پر انعامات کی تعداد اور رقم میں بھی اضافہ کیا جانا چاہیے۔ اس فیصلے کے مطابق ریاست میں بلاکوں کو ۲۵۰۰۰ روپے، ۲۰۰۰۰ روپے اور ۱۵۰۰۰ روپے کے تین انعامات دیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ضلع میں بہترین بلاک کو بھی ۱۰۰۰۰ روپے کا انعام دیا جائے گا۔ اب تک بلاکوں کو ۱۵۰۰۰ روپے اور ۱۰۰۰۰ روپے کے دو انعامات دیے جاتے تھے۔

حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ گاؤں سبھائیں اور بلاک انعامات کی رقم کو ڈویژن کے کمشنر کی منظوری سے کسی ایسی اسکیم میں صرف کر سکتے ہیں جو عوام کے مفاد کے لیے ہو۔

▼ علاج، صحت اور خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق خدمات پر مربوط

کنٹرول، بچوں کی تعداد میں کمی، غیر سرکاری افراد کا تعاون، ڈاکٹروں کے لیے مقررہ نشانے، فیلڈ کارکنوں کی تقرری جن میں دیہی علاقوں کا تجربہ رکھنے والے زیادہ ہوں، ترغیب دینے کے لیے انعامات کا بندوبست نشر و اشاعت سے متعلق مجالس کی تشکیل وغیرہ وہ اہم سفارشیں ہیں جو نظم و نسق سے متعلق سینیر افسروں اور تکنیکی افسروں کے سیمینار میں کی گئیں۔ یہ مذاکرات حال ہی میں دھان بھون لکھنؤ میں ریاست میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کے سلسلے میں رہنمائی کے لیے منعقد ہوا تھا۔

سیمینار نے ضلع کی سطح پر علاج و صحت اور خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق خدمات پر مربوط کنٹرول کی سفارش کی۔ اس کے علاوہ پی۔ ایم۔ ایس اور پی۔ ایچ۔ ایس کو مربوط کرنے کی بھی سفارش کی گئی۔ اس سلسلے میں ایک چیف میڈیکل افسر کی تقرری کی تجویز پیش کی گئی، جو علاج، حفظان صحت کی احتیاطی تدابیر اور خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق خدمات کا ذمے دار ہو۔ یہ سفارش بھی کی گئی کہ ضلع خاندانی منصوبہ بندی افسر میڈیکل لائن کا آدمی ہونا چاہیے جس کو ضلع کے دیہی اور شہری علاقوں میں پروگرام کے لیے ذمے دار قرار دیا جائے۔

تمام ڈاکٹروں اور اسپتال کے عملے کے لیے خصوصی ماہانہ نشانے مقرر کیے جائیں تاکہ وہ اپنے مریضوں کو اس طرف راغب کر سکیں۔ ہر ابتدائی صحت مرکز میں ایک ڈاکٹر اور ایک کمپاؤنڈر ہونا چاہیے۔ سیمینار نے پرائیویٹ ڈاکٹروں کا تعاون حاصل کرنے کی بھی سفارش کی۔

سیمینار نے اس امر پر زور دیا کہ تمام دستیاب وسائل نشر و اشاعت کے لیے استعمال کیے جانا چاہئیں۔ یہ سفارش بھی کی گئی کہ ایسے افراد کے تجربات سے عوام کو روشناس کیا جائے جو خاندانی منصوبہ بندی کو قبول کر کے مطمئن ہیں۔

حکومت ہند کے صحت و خاندانی منصوبہ بندی کے سکریٹری شری گووند نارائن نے سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ خاندانی منصوبہ بندی پروگرام معاشی منصوبے کا ایک اہم اور نمایاں جزو ہونا چاہیے ورنہ عوام اپنی کوششوں سے مستفید نہ ہو سکیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اگر آبادی میں موجودہ شرح سے اضافہ ہوتا رہا تو ہندستان میں انتہائی تیز رفتار ترقیاتی پروگرام بھی عوام کا معیار زندگی بلند کرنا تو درکنار موجودہ معیار زندگی کو بھی برقرار نہ رکھ سکے گا۔

انھوں نے کہا کہ اتر پردیش نے منصوبے کے گزشتہ ۱۵ برسوں میں زراعت، آب پاشی اور بجلی کے شعبوں میں زبردست ترقی کی ہے لیکن یہاں کے عوام اس کے نتائج کو

محسوس نہیں کرسکے ۔ انھوں نے کہا کہ اس المیہ کی وجہ آبادی میں مسلسل اضافہ ہے۔

انھوں نے کہا کہ خاندانی منصوبہ بندی ایک رضاکارانہ پروگرام ہے اور اس میں کسی جبر یا زبردستی کا دخل نہیں ہونا چاہیے ۔ عوام کو خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں ضروری معلومات بہم پہنچا کر اور انھیں اس کو اپنانے کے لیے راغب کرکے ان کی رہ نمائی کی جائے تاکہ وہ اس سلسلے میں خود فیصلہ کرسکیں ۔

مرکزی صحت سکریٹری نے کہا کہ ضلع مجسٹریٹوں کو اس پروگرام کے سلسلے میں رہ نمائی کرنے کا اہم رول ادا کرنا پڑتا ہے تاہم اس پروگرام کو لامرکزی بنایا جانا چاہیے ۔ ضلع خاندانی منصوبہ بندی افسروں کو اجازت ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے روزمرہ فرائض کو بہ حسن و خوبی انجام دینے کے لیے جو طریقہ چاہیں اختیار کریں۔ سول سرجن اور ضلع صحت افسران بھی انھیں اپنے وسیع تجربات سے مستفید کریں۔

شری گووند نارائن نے کہا کہ چوتھے منصوبے کے دوران مرکزی حکومت خاندانی منصوبہ بندی پروگرام سے متعلق تمام متواتر اور غیر متواتر اخراجات برداشت کرے گی ۔ اسپتالوں میں مزید شعبے، آپریشن کے کمرے اور کوارٹر تعمیر کرنے اور ساز و سامان خریدنے کے لیے مالی امداد دی جائے گی ۔

یوپی ریاستی زراعتی صنعت کارپوریشن کو اپنے پہلے سال کی کارکردگی کے چار ماہ کے مختصر عرصے میں ۵۰،۱۸۴ روپے کا منافع ہوا ۔

کارپوریشن کی کارکردگی کا جائزہ مجلس عاملہ کی پہلی سالانہ میٹنگ میں لیا گیا ۔ اس میٹنگ میں بورڈ آف ڈائرکٹرز کی رپورٹ اور کارپوریشن کے جانچ پڑتال کیے ہوئے حسابات منظور کیے گئے ۔

رپورٹ میں اس امر کا انکشاف کیا گیا کہ ۲۵ر۱ لاکھ روپیہ بطور منافع حصہ داروں کو تقسیم کیا گیا ہے اور دس ہزار روپیہ جنرل ریزرو میں رکھا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ ۲۶۴۳۰۰ روپیہ انکم ٹیکس کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اور ۸۰۸۵۰ روپیہ آئندہ سال کے حساب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

ریاستی حکومت نے زراعتی مقاصد اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے استعمال کی جانے والی بجلی پر سے دو حصوں والا ذیلی محصول اور مقررہ رقم کی ادائگی کا طریقہ ختم کرنے اور کم سے کم چارج کے ساتھ یونٹ ریٹ کا طریقہ کار شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔

جہاں تک زراعتی مقاصد کا تعلق ہے دو حصوں والا ذیلی محصول اور فی ہارس پاور ۸ روپیہ ماہانہ کا مقررہ چارج ختم کر دیا گیا ہے اور اس کے بجائے کم سے کم چارج کے علاوہ یونٹ شرح کے مطابق بجلی محصول کا پرانا طریقہ نافذ کر دیا گیا ہے ۔ چنانچہ زراعتی مقاصد کے لیے ۱۵ پیسہ فی یونٹ کی شرح مقرر کی گئی ہے ۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ فی ہارس پاور مقررہ چارج جو یکم جولائی ۱۹۶۸ء سے پہلے ۹۰ روپیہ سالانہ تھا اب ۱۲۰ روپیہ کر دیا جائے لیکن ۳۰ روپیہ کا یہ اضافہ بتدریج کیا جائے گا یعنی یکم جولائی ۱۹۶۸ء سے یہ اضافہ شدہ مقررہ چارج ۱۰۰ روپیہ فی ہارس پاور سالانہ، جولائی ۱۹۶۹ء سے ۱۱۰ روپیہ اور جولائی ۱۹۷۰ء سے ۱۲۰ روپیہ ہوگا۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے سلسلے میں بھی دو حصوں والا ذیلی محصول اور مقررہ رقم کی ادائگی کا طریقہ ختم کر دیا گیا ہے اور زراعت کی طرح چھوٹے پیمانے کی صنعتوں پر بھی ہر سال فی ہارس پاور ۱۲۰ روپیہ کا کم سے کم مقررہ چارج یکم جولائی ۱۹۶۸ء سے نافذ ہوگا۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں پر مندرجہ ذیل یونٹ شرح کا اطلاق ہوگا ۔

ہر ہارس پاور پر ہر ماہ پہلے ۱۱۰ یونٹوں پر ۱۸ پیسہ فی یونٹ ۔

ہر ہارس پاور پر ہر ماہ بعد کے ۱۱۰ یونٹوں پر ۱۲ پیسے فی یونٹ اور بقیہ استعمال کیے ہوئے یونٹوں پر ۸ پیسے فی یونٹ ۔

ریاستی بجلی بورڈ سے کہا گیا ہے کہ وہ خاص موسم میں چلنے والی صنعتوں اور ۱۵ ہارس پاور سے کم بجلی استعمال کرنے والے چھوٹے صنعتی واحدوں کے مسائل پر بھی غور کرے تاکہ ان کی دقتیں بھی دور کی جاسکیں ۔

ریاستی حکومت نے دیہی علاقوں کے ذہین طلبا کو وظیفے دینے کے لیے پانچ لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے ۔ اس سلسلے میں اس سال ۱۳۶۸ نئے وظیفے دیے جائیں گے ۔

ان وظائف میں سے ۱۸ گریجویٹ وظیفے محکمہ تعلیم کے ریجنل ڈپٹی ڈائرکٹران منظور کریں گے اور ۱۲۰ ہائی اسکول وظائف اترپردیش کے محکمہ جاتی امتحانات کے رجسٹرار کی جانب سے منعقدہ ہائی اسکول وظیفہ امتحان کے نتیجے پر دیے جائیں گے۔ مختلف منطقوں کے لیے جونیر ہائی اسکول ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ وظائف کی تفصیل حسب ذیل ہے :

میرٹھ ۱۲۰، بریلی ۱۳۲، الہ آباد ۱۹۴، وارانسی ۱۳۷، لکھنؤ ۲۰۶، آگرہ ۱۰۷، گورکھپور ۲۶۳ اور نینی تال ۲۴۔

حکومت اتر پردیش نے فیصلہ کیا ہے کہ سائیکل کے ان پرزوں پر جو ریاست میں بائیسکل تیار کرنے میں کام آتے ہیں واحد مرحلہ پر، فی صد کی شرح سے وصول کیا جانے والا بکری ٹیکس قطعی معاف کر دیا جائے۔

یہ اقدام بکری ٹیکس کی اعلیٰ طاقتی کمیٹی کے فیصلے کے مطابق کیا گیا ہے تاکہ ریاست میں سائیکل صنعت کو بڑھاوا مل سکے اور ریاست کی یہ صنعت دوسری ریاستوں سے مقابلہ کر سکے۔

یہ استثنا سیلس ٹیکس ایکٹ ۱۹۴۸ء کے تحت منظور کیا گیا ہے اور تین برس تک جاری رہے گا۔ امید ہے کہ اس عرصے میں یہ صنعت اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے گی۔

اتر پردیش میں تقریباً ۵۴ ہزار سائیکلیں ہر سال تیار ہوتی ہیں۔ لیکن اس رعایت کی وجہ سے امید کی جاتی ہے کہ اتر پردیش میں ہر سال دو لاکھ سائیکلیں تیار کی جانے لگیں گی۔

حکومت اتر پردیش نے سرکاری ملازمین کے مختلف کلبوں اور انجمنوں کی تشکیل کے لیے مالی امداد سے متعلق قواعد مزید نرم کر دیے ہیں۔ نئے فیاضانہ شرائط نے پہلے کے قواعد کو منسوخ کر دیا ہے جو اس سلسلے میں عملاً زیادہ مفید نہیں ثابت ہوئے تھے اور جن کے نتیجے میں بیشتر دفتروں میں اب تک ایسے کلبوں اور انجمنوں کی تشکیل عمل میں نہیں آ سکی تھی۔

چیف ویلفیر آفیسر نے ایک گشتی چٹھی میں محکموں کے تمام اعلیٰ افسروں، کمشنروں، ضلع مجسٹریٹوں، ڈسٹرکٹ اور سیشن ججوں اور دفتروں کے اعلیٰ افسروں پر زور دیا ہے کہ وہ ملازمین سے کلبوں اور انجمنوں کی تشکیل کرنے اور اس مقصد کے لیے مقررہ قواعد کے تحت مالی امداد حاصل کرنے کے لیے کہیں۔

کلبوں اور انجمنوں کو جن میں موجودہ کلب اور انجمنیں بھی شامل ہیں۔ کھیل کود کے سامان اور کتابوں وغیرہ کی خریداری کے لیے صرف ایک بار ابتدائی مالی امداد دی جائے گی۔ اس غیر مکرر مالی امداد کی شرح ایسے کلبوں اور انجمنوں کے لیے ۱۰ روپیہ فی کس ہوگی جن کے ممبروں کی تعداد ۲۰ سے کم ہے اور ایسے کلبوں اور انجمنوں کے لیے جن کے ممبروں کی تعداد ۲۰ اور ۵۰ کے درمیان ہے مالی امداد کی رقم ۲۰۰ روپیہ ہوگی۔ ساتھ ہی ہر فاضل ممبر پر دس روپے کی مزید امداد ملے گی۔

اجتماعی ہال کی تعمیر کے لیے بھی تعمیراتی لاگت کے برابر رقم اس شرط پر منظور کی جا سکتی ہے کہ محکمے کا افسر اعلیٰ اس کے لیے زمین پیش کرے اور اس کی تعمیر محکمہ تعمیرات عامہ کی نگرانی میں مکمل کی جائے۔ ایسی عمارتیں حکومت کی ملکیت سمجھی جائیں گی۔

حکومت ہر کلب یا انجمن کو فی ممبر ۵۰ پیسہ ماہانہ تک مکرر مالی امداد اس شرط پر دے گی کہ اس کے ممبران بھی مکرر مالی امداد کے برابر رقم فیس یا ماہانہ چندے کے طور پر جمع کریں۔ لیکن کسی کلب یا انجمن کو ۱۰۰۰ روپیہ سالانہ سے زیادہ متواتر مالی امداد نہیں دی جائے گی۔

ریاست میں پولیس کے محکمے کو چھوڑ کر تمام سرکاری محکموں اور دفتروں کے ملازمین پر نئے قواعد کا اطلاق ہوگا۔ ورک چارجڈ ملازمین اور ایسے ملازمین جن کو ہنگامی فنڈ سے تنخواہ دی جاتی ہے اس مالی امداد کے مستحق نہیں ہوں گے۔

ریاستی حکومت نے مزید دو افسروں کی تقرری کی ہے جن کے صدر مقامات الہ آباد اور بریلی میں ہوں گے۔ یہ تقرری اس خیال کے پیش نظر کی گئی ہے کہ بکری ٹیکس کے معاملات پر نظر ثانی کے بڑھتے ہوئے کام پر قابو پایا جا سکے۔ نتیجے کے طور پر موجودہ ڈویژن افسروں کے دائرہ اختیار میں تبدیلی کرنا ضروری ہو گیا۔ نظر ثانی کا کام کرنے والے افسروں اور ان کے دائرہ اختیار کے علاقے حسب ذیل ہیں:

جج (ڈویژن) لکھنؤ — لکھنؤ، سیتاپور اور کانپور۔ ایڈیشنل جج (ڈویژن) میرٹھ — آگرہ، علی گڑھ، متھرا، جھانسی، اٹاوہ اور بلند شہر۔ ایڈیشنل جج (ڈویژن) میرٹھ — میرٹھ، مظفر نگر اور سہارنپور رینج (بجنور سرکل کے علاوہ)۔ ایڈیشنل جج (ڈویژن) وارانسی — وارانسی اور فیض آباد رینج کے گورکھپور، دیوریا اور بستی سرکل۔ ایڈیشنل جج (ڈویژن) الہ آباد — الہ آباد اور فیض آباد رینج کے فیض آباد، گونڈہ اور بہرائچ سرکل۔ اور ایڈیشنل جج (ڈویژن) بریلی — بریلی، مرادآباد اور نینی تال اور سہارنپور رینج کا بجنور سرکل۔

ہردوا گنج تھرمل بجلی گھر میں ۵۰ ایم۔ ڈبلو کے دوسرے جنریٹنگ سیٹ کو آزمائش کے طور پر چلانے کے لیے تیزی سے تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ اس کے بعد اس بجلی گھر کو چالو کیا جائے گا اور اس کے صنعتی اغراض کے لیے بجلی حاصل کی جائے گی۔

یاد ہوگا کہ گورنر ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی نے گزشتہ ۲۲ اپریل کو ۵۰ میگا واٹ کا پہلا جنریٹنگ سیٹ چالو کیا تھا۔

پچاس پچاس میگا واٹ کی یہ دو مشینیں ہردوا گنج بجلی گھر کے توسیعی پراجیکٹ کے تیسرے مرحلے میں روسی تعاون سے لگائی جا رہی ہیں۔

ہردوا گنج میں تھرمل بجلی گھر ۱۹۴۲ء میں ۲۰ میگا واٹ کی پیداواری صلاحیت کے ساتھ قائم کیا گیا تھا۔ یہ بجلی گھر علی گڑھ سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ توسیعی پراجیکٹ کے پہلے مرحلے کے تحت ۱۹۶۲ء میں ۳۰۔۳۰ میگا واٹ کی دو مشینیں چالو کی گئی تھیں۔ توسیعی پراجیکٹ مرحلہ دوم کے تحت ۱۹۶۴ء میں ۳۰ میگا واٹ کی ایک اور مشین چالو کی گئی۔

اس تھرمل بجلی گھر کی موجودہ پیداواری صلاحیت ۱۶۰ میگا واٹ ہے۔

ریاست کے تھرمل بجلی گھروں میں یہ سب سے بڑا ہے۔

متفرقات

نائب تحصیلداری کے امیدواروں کا انتخاب۔ ریاستی پبلک سروس کمیشن نے گزشتہ دسمبر میں نائب تحصیلداری کی آسامیوں کے لیے جو مقابلے کا امتحان منعقد کیا تھا اس کے نتیجے کی بنیاد پر مندرجہ ذیل امیدواروں کو براہ راست بھرتی کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔ ان کی تقرری بہرحال اچھا طرز عمل، اچھی صحت اور گھوڑ سواری وغیرہ کے ضروری سرٹیفکٹ پیش کرنے پر کی جائے گی۔

عام امیدوار — شری للو سنگھ، شری نیم سنگھ یادو، شری کرشن کمار ولد شری رامیشور دیال، شری جلیس احمد صدیقی ولد شری محمد انیس، شری کیدار ناتھ لال اور شری ونوتے کمار۔

اقوام مندرجہ فہرست کے امیدوار — شری پریم راج اور شری بدری دشال۔

لڑکیوں کے لیے مزید ۱۰۰ ووکیشنل درجے۔ ریاستی حکومت نے اس سال اکتوبر سے مزید ۱۰۰ ووکیشنل درجے کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ درجے دیہی علاقوں میں ضلع پریشدوں کے زیر انتظام لڑکیوں کے پرائمری اسکولوں میں کھولے جائیں گے۔ ریاستی حکومت نے اس مقصد کے لیے مالیاتی سال رواں کے دوران ۵۵۹۹۵ روپے کی رقم منظور کی ہے۔

پانی سپلائی اسکیم کے لیے وارانسی میونسپل کارپوریشن کو قرضہ۔ ریاستی حکومت نے میونسپل کارپوریشن وارانسی کو پانی کی سپلائی کی اسکیم کو مکمل کرنے اور اس کو ترقی دینے کے واسطے مالیاتی سال رواں کے لیے ۳۲۶ و ۳ لاکھ روپیہ منظور کیا ہے۔ اس اسکیم پر تخمیناً ۱۸۱ و ۱۲ لاکھ روپے کی لاگت آئے گی۔ یہ قرضہ سوا چھ فیصدی سالانہ سود کی شرح سے ۳۰ مساوی سالانہ قسطوں میں واجب الادا ہوگا۔ قرضے کی ادائگی قرضے کی آخری قسط ملنے کے ایک سال بعد سے شروع ہوگی۔

کتاب ضبط۔ ریاستی حکومت نے شری ہرنام داس سابق ہرنام سنگھ آریہ مسافر۔ سبھا سد آریہ سماج۔ گورکھپور کی لکھی ہوئی ہندی کتاب سکھ پنت کی الٹی چال ضبط کر لی ہے۔

یہ کتاب ساجدی پریس۔ گورکھپور میں طبع کی گئی ہے اور ہرنام داس آریہ مسافر، گورکھپور نے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں ایسا مواد موجود ہے جس کا مقصد ہندستان کے ایک طبقے کے جذبات کو قصداً ٹھیس پہنچانا ہے۔

اس کتاب کا ہر نسخہ بحق سرکار ضبط کر لیا گیا ہے نیز اس کی طباعت ثانی، ترجمے اور اقتباسات کی طباعت و اشاعت بھی ممنوع قرار دی گئی۔

★

ددھان بھون لکھنو میں: ۱۰ ر اکتوبر کو قومی بچت کے ریاستی مشاورتی بورڈ کا ایک جلسہ ہوا
تصویر میں گورنر ڈاکٹر بی، گوپال ریڈی جلسے کو خطاب کر رہے ہیں

ریلوے کی جانب سے ۱۶ ر ستمبر ۱۹۶۶ء سے خاندانی منصوبہ بندی پندرہواڑہ منایا گیا۔ شمالی ریلوے کے
ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ نے چارباغ ریلوے اسٹیشن لکھنؤ پر وارانسی مسافر گاڑی کو رخصت کر کے اس پندرہواڑے کا افتتاح کیا

Regd. no. L—3
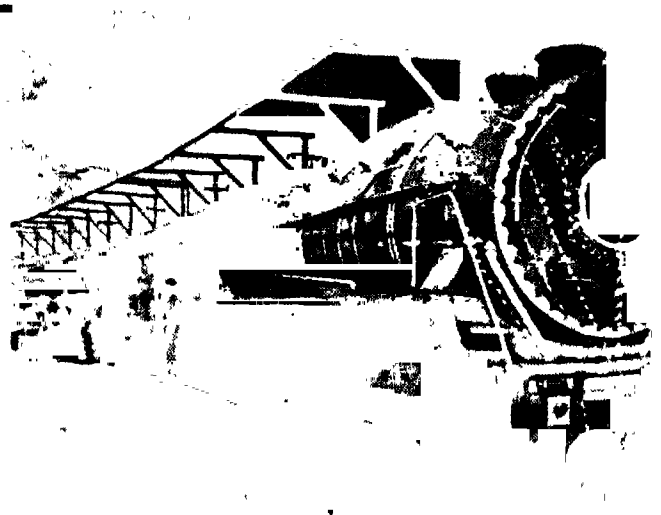
وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اپنی الہ آباد کی حالیہ آمد کے دوران الہ آباد کے قریب
کانتی پور گاؤں میں ایک بڑے جلسۂ عام کو خطاب کر رہی ہیں

۱۹۶۸

حقوق انسانی کا بین اقوامی سال

اگرہاینز ۱۸۹۰ شاک

دسمبر ۱۹۶۸ عیسوی

۵۰ پیسے

عنوانات

جلد ۲۳ نمبر ۹
اگرہائن ۱۸۹۰ شک
دسمبر ۱۹۶۸ عیسوی
چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے
ایڈیٹر
خورشید احمد
پبلشر
مہیش پرشاد
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش
پرنٹر
اشوک ور
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اسٹیشنری۔ یو۔پی
مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

سچائی کیا ہے

" زندگی کی بنیاد سچائی پر قائم ہے۔ اس کی پرستش کے لیے ہمیں یہ جنم ملا ہے۔ ہماری ہر ایک حرکت اس کے لیے ہے۔ ہماری زندگی کا ہر لمحہ اس کے لیے وقف ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر کسی دوسرے اصول کا عمل نہیں ہوسکتا۔ عام طور پر ہم اس کا مطلب سچ بولنا ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے وسیع معنی ہیں۔ قول، فعل اور عمل میں سچائی ہی سچائی ہو۔ جس نے اس کو مکمل طور پر سمجھ لیا ہے، اس کے لیے اس دنیا میں کوئی سمجھنے لائق چیز نہیں رہتی۔ کیوں کہ مکمل علم اس میں سمایا ہوا ہے۔ اس میں جو نہ سمائے، وہ علم نہیں۔

.... سچائی کی کھوج کے ساتھ ریاضت ہوتی ہے۔ یعنی خود دکھ اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے لیے جان تک نثار کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے اس میں مطلب برآری کا کوئی دخل نہیں رہتا۔ ایسی بے غرض تلاش جاری رکھتے ہوئے کوئی غلط راستے پر نہیں رہتا۔ تھوڑا سا اِدھر اُدھر ہوتے ہی ٹھوکر لگتی ہے اور پھر سیدھے راستے پر چلنے لگتا ہے۔ اس لیے سچائی کی پرستش بھگتی ہے۔ اور بھگتی تو سر کا سودا ہے۔ یعنی وہ ست چت آنند کا راستہ ہے۔

.... اس محدود سچائی کے علاوہ ایک اور لامحدود سچائی ہے۔ اس کا کوئی آر پار نہیں۔ سب جگہ موجود ہے۔ لیکن اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ لامحدود طاقت خود خدا ہے۔ یعنی خدا ہی سچ ہے۔ دوسری سب چیزیں جھوٹ ہیں۔

جو سچائی کو جانتا ہے، دل سے، زبان سے اور جسم سے سچائی پر عمل کرتا ہے، وہ ایشور کو پہچانتا ہے۔ وہ تینوں حالتوں کو جاننے والا ہوتا ہے۔ اسے اس زندگی میں نجات مل جاتی ہے .....

سچ کہنا اور کرنا میری عادت سی بن گئی ہے۔ لیکن جس لامحدود سچائی کو میں عام نظر سے دیکھتا ہوں اس پر عمل کرنے کا دعویٰ میں نہیں کرسکتا۔ میں نادانی کی حالت میں بھی زیادتی کرسکتا ہوں۔ اس میں جھوٹ کی جھلک ہے اور یہ سچائی کی کسوٹی پر نہیں چڑھ سکتی۔ جس کی زندگی سچائی کی زندگی ہے، وہ چمکتے ہوئے خالص ہیرے کی طرح ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ سچائی پر عمل کرنے والے کو کبھی کوئی دھوکا نہیں دے سکتا۔ کیوں کہ اس کے سامنے جھوٹ بولنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دنیا میں سچائی کا عہد سب سے مشکل ہے .....

میرے سامنے جو کوئی جھوٹ بولتا ہے، تب مجھے اس پر غصہ آنے کی بجائے خود اپنے پر زیادہ غصہ آتا ہے۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ ابھی میرے اندر — دل کی گہرائی میں — جھوٹ کی بو ہے۔

——— مہاتما گاندھی

غالب کے بارہ اشعار

اختر علی تلہری

مرحوم نظم طباطبائی اپنے عہد کے ایک جید فاضل، ایک مستند ادیب ایک مشہور ماہر فن شاعر، ایک نکتہ رس سخن فہم شخص تھے۔ انھوں نے اردو دیوان غالب کی شرح لکھ کر اُن کے مشکل سے سمجھ میں آنے والے اشعار کے مفاہیم و مطالب کی تہ تک پہنچنے کے راستے نکالے تاہم مشکلاتِ اشعارِ غالب کے حل کی منزلیں اُن کے لئے بھی خاصی صبر آزما ثابت ہوئی ہیں اور فضل و کمال کے باوجود اُن کے قدم بھی حل مطالب و توضیح معانی میں صحیح جادے سے ہٹ کر آڑے ترچھے پڑے ہیں۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

۱۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دوسرے مصرعے کی ترکیب "دل جگر تشنۂ فریاد" کو اُنھوں نے غلط زاویے سے دیکھ لیا اور شعر مندرجۂ بالا کے مطلب کو عجیب و غریب تاویلوں کے طلسم میں اُلجھا دیا۔ بعد میں آنے والے بہت سے دوسرے شارحین غالب نے بھی اُنھیں کے نقش قدم پر چل کر حقیقت کی منزل کو گم کر دیا۔ جناب طباطبائی ارشاد فرماتے ہیں:

"حاصل یہ ہے کہ دل جگر تشنۂ فریاد ہوا تو مجھے دیدۂ تر یاد آیا کہ یہ پیاس اُسی سے بجھے گی یعنی رونا بھی فریاد کرنا ہے۔ رونے سے دل و جگر کی خواہش فریاد پوری ہو جائے گی یا دلِ تشنہ جگر کی پیاس اشک فریاد سے بجھے گی۔"

نظم طباطبائی مرحوم "دل جگر تشنۂ فریاد" کی فارسی ترکیب میں اُلجھ گئے۔ کبھی "دل جگر" کو مرکب عطفی سمجھ لیا اور اُدھر تفریق کی کہ "دل جگر" میں حرفِ عطف "واؤ" یا "اور" کو کس نحوی مصلحت سے حذف کر دیا۔ اردو محاورے کے استعمال کے دامن میں بھی پناہ نہیں ملتی کیوں کہ پھر "آیا" صیغۂ واحد کے استعمال کی معقول توجیہ کیا ہو گی۔ غالبًا اسی نحوی الجھن سے اُنھوں نے پریشان ہو کر اس بظاہر ژولیدہ ترکیب کی دوسری توجیہ بھی کر دی جو پہلی توجیہ سے زیادہ مستحکم ہے یعنی "دل جگر تشنہ" کو "دلِ تشنہ جگر" قرار دے لیا۔ اس تاویل میں بھی وہ پہلی تاویل سے قوی تر بھی تحکم کی خاصی آمیزش ہے۔ دور تک استعارہ در استعارہ قسم کے اسلوبِ نگارش کی پناہ لینا پڑتی ہے جس کی کوئی ضرورت نہیں ـــ غالبًا اسی وجہ سے آسی الدنی مرحوم نے اپنی مکمل شرح دیوانِ غالب میں اس تاویل سے قطع نظر کی اور پہلی ہی تاویل پر اکتفا فرمائی اور صرف اتنا لکھنا کافی سمجھا کہ میرے دل اور جگر کو پھر فریاد کی تشنگی پیدا ہوئی اور اس تقریب سے پھر دیدۂ تر یاد آ گیا کہ یہ تشنگی رونے ہی سے بجھے گی۔

"آیا" دوسرے مصرعے کا فارسی کے محاورے کا ترجمہ ہے۔ اردو میں ہوا اُس کے بجائے بولیں گے۔" "آیا" اس مقام پر یقینًا اردو محاورے کے لحاظ سے برمحل نہیں ہے مگر غالب نے یہ پابندی اپنے اوپر عائد ہی نہیں کی ہے لیکن اُنھوں نے "دل جگر تشنۂ فریاد" کی جو مجمل تشریح فرمائی ہے وہ غالب فہمی کے قطعًا منافی ہے۔

کاش کہ ان شارحین کرام نے جہار عجم میں "جگر تشنہ" کو دیکھ لیا ہوتا تو پھر ان اعذار باردہ کی سرے سے ضرورت ہی نہ ہوتی۔ صاحب جہار عجم نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "جگر تشنہ" کے معنی فارسی میں "بہت پیاسے" کے ہیں۔ اب شعر کا مطلب صاف ہے کسی خواہ مخواہ کے

تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی میرا دل بہت زیادہ فریاد کا پیاسا ہے۔ خواہش مند ہے۔ ظاہر ہے کہ جب میں فریاد کا بہت زیادہ خواہش مند ہوں تو دیدۂ تر کا اس کے لئے یاد آنا لازمی ہے کیوں کہ گریہ وزاری اس قسم کی فریاد کے لوازم میں سے ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کی بظاہر ترکیبیں دلچسپ بعض اوقات بڑے بڑے مسامحوں میں مبتلا کر دیتی ہیں اور بڑوں بڑوں کو مبتلا کر دیتی ہیں۔

۲۔ نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار

علامہ نظم طباطبائی مرحوم ترکیب "ضروری الاظہار" کے بارے میں افادہ فرماتے ہیں:
"ضروری الاظہار بھی عجیب ترکیب ہے۔ لفظ ضروری اس معنی پر عربی ہی نہیں۔ ایسے الفاظ پر ہندی ہونے کا حکم ہے اور ترکیب عربی میں لانا منع ہے۔ اور اہل ادب احتراز کرتے ہیں۔"
صاحب نور اللغات نے بھی "ضروری الاظہار" کی ترکیب کو غلط قرار دیا ہے۔ انھوں نے نور اللغات میں غالباً نظم طباطبائی کی تقلید کرتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "ضروری الاظہار" عربی قاعدے سے یہ ترکیب غلط ہے۔"
اول تو یہی بات کہ "اہل ادب ایسی ترکیبوں سے احتراز کرتے ہیں" بہت بڑا دعویٰ ہے۔ قرینِ احتیاط تو یہ ہوتا کہ جناب طباطبائی طیب اللہ رمسہٗ "احتیاط کرتے ہیں" کے بجائے "احتیاط کرنا چاہیے" لکھتے۔ بہت سے معتبر و مستند ایرانی اساتذہ اس قبیل کی ترکیبیں استعمال کر گئے ہیں۔
علی خراسانی فرماتے ہیں ؎

در قتل گاہ عشق انا الدوست میزنم
این گفتگو ز دار و رسن سعی شود فزوں

دوست فارسی ہے۔ اس پر عربی کا الف لام داخل کیا گیا اور پھر "انا" مبتدا کی اسے خبر بنایا گیا۔
عالی ارشاد فرماتے ہیں ؎

گل گلزار انا الیار گلشن زدہ است — بر سر دار خیال سر منصور کنیم

"یار" فارسی ہے۔ اس پر عربی کا الف لام داخل کیا گیا اور پھر اسے "انا" مبتدا کی خبر بنایا گیا۔ "انا الدوست" و "انا الیار" سے بھی عجیب تر تصرف سنیے۔
واله ہروی صاحب فرماتے ہیں ؎

تا مہر تو گشت نور افشاں
ذوالخورشیدین شد خراساں

"خورشید" فارسی لفظ ہے۔ اس کا تثنیہ بقاعدۂ عربی "خورشیدین" پھر اس پر عربی کے الف لام کا اضافہ۔ اسی پر اکتفا نہیں۔ اسے مضاف الیہ عربی کے لفظ "ذو" کا بنا دیا گیا۔ "زلفیں" "زلف" کا تثنیہ تو فارسی میں اسی طرح عام ہے جیسے "حور" حقیقتاً جمع ہے مگر بالعموم واحد کے معنی میں مستعمل ہے۔
شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ سب مثالیں فارسی سے دی گئی ہیں اور یہاں سوال اردو کا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قاعدہ فارسی اور اردو میں مشترک ہے۔ اساتذۂ مذکورہ بالا نے یہ تصرف دیدہ و دانستہ کیا ہے اور شاید اس مصلحت کی وجہ سے کہ عوام یہ نہ سمجھ لیں کہ نحویوں کے بنائے ہوئے یہ قاعدے بالکل ہی منجمد ہو چکے ہیں۔ ان میں تغیر و تبدل کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔
اس بحث سے میں ان ترکیبوں کے جواز اور عدم جواز کے پہلو نہیں تلاش کر رہا ہوں۔ بلکہ اس کا منشا صرف اتنا ہے کہ اس خصوص میں ہمیں بہت زیادہ متشدد ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعض مواقع پر مقتضائے حال ہی یہ ہوتا ہے کہ انھیں برتا جائے البتہ اس کی اجازت ہر کس و ناکس کو نہیں دی جا سکتی۔ مگر اس مقام پر غالب کو تو استاذانہ تصرف کی توجیہ کی بھی آڑ لینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ذیل کی سطروں سے اس کی اچھی طرح وضاحت ہو جائے گی۔ یہ ایک ثابت حقیقت ہے کہ "ضروری" اس معنی میں عربی کا لفظ ہے۔ منقول اصطلاحی ہونے سے اس کی حیثیت نہیں بدلتی۔ منقول اور منقول عنہ میں رشتہ کا فقدان نہیں ہو جاتا۔
بہر حال عربی میں یہ لفظ موجود ہے۔ ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔
علامہ تفتازانی علوم عربیہ کے مشہور و مستند عالم تھے ۔۔۔ مطول اور مختصر المعانی معانی و بیان و بدیع میں ان کی مشہور نصابی کتابیں ہیں۔ انھوں نے منطق کے مشہور رسالہ شمسیہ کی شرح سعدیہ کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں متعدد مقامات پر لفظ ضروری کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک مثال درج کی جاتی ہے۔
"یکفی فی مجرد بیان الحاجة تقسیم العلم

الی الضروری والنظری۔"

علامہ تفتازانی کے ایک جلیل القدر معاصر سید شریف نے قطبی کے حاشیہ میر قطبی میں لفظ "ضروری" خاص طور سے استعمال فرمایا ہے۔ ایک مثال کافی ہوگی۔

"قولہ یقسم العلم اولاً الی التصور والتصدیق و لم یبین ان فی کل منھما ضروریاً ونظریاً یمکن اکتسابہ من الضروری لجاز ان یکون التصورات مثلاً باسرھا ضروریۃ۔"

علامہ تفتازانی و سید شریف سے پہلے بھی یہ لفظ مستعمل تھی۔ شرح مواقف میں بھی سید شریف لکھتے ہیں:

"قال امام الرازی فی المحصل العلوم کلھا ضروریۃ لانھا اما ضروریۃ ابتداءً او لازمۃ لزوماً ضروریاً۔"

اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر لفظ "ضروری" کا استعمال منطقی اصطلاح سے ہٹ کر اسی معنی میں ہوا ہے جس میں غالب کے یہاں ہے۔

"ان استاد الجائز الی الواجب امر ضروری۔"

ممکن کا واجب کی طرف اسناد ضروری امر ہے۔

مثال بالا سے جناب علامہ طباطبائی مرحوم کے اس احتیاطی جملہ "لفظ ضروری اس معنی پر عربی ہی نہیں" کا تار و پود بالکل بکھر جاتا ہے۔

محقق یزدی کی شرح تہذیب میں بھی "ضروری" کا استعمال بکثرت موجود ہے۔ علامہ بہاری کے مشہور و متداول متن سلم العلوم میں اس کی شرح حمد اللہ میں لفظ ضروری کا استعمال متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ سطور بالا سے واضح ہو جاتا ہے کہ سلف سے خلف تک یہ لفظ مستعمل رہا ہے اور کثرت سے مستعمل رہا ہے تو پھر اگر غالب نے "ضروری الاظہار" کسی شعر میں استعمال کر دیا تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں کی۔ المنجد میں بھی لفظ ضروری اسی مفہوم میں مندرج ہے۔

۳۔ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

شعر مندرجۂ بالا کا مطلب واضح ہے۔ غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے خدا کی عبادت کی۔ اس کی پرستش کی لیکن مجھے اس سے کوئی فیض نہیں پہنچا، کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تو پھر کیا یہ خدائی نمرود کی خدائی تھی ظاہر ہے کہ نمرود کی خدائی سے جو ایک دروغ بے فروغ کا مظاہرہ تھا کسی کو کوئی فائدہ کیونکر پہنچ سکتا ہے۔ اس عنوان ادا میں شاعرانہ قسم کی ذرا تیز شوخی پائی جاتی ہے جس سے مذہبی تقشف کی جبین بہت ممکن ہے کہ شکن آلود ہو جائے لیکن شعر و سخن کی دنیا میں اس کا سکہ بڑی حد تک رائج ہے۔ وہ شاعرانہ شوخی کے بھیس ہی میں سہی۔ حقیقتہً شاعر کی دنیا خانقاہی دنیا نہیں ہے۔ اس کے رسم و رواج ہی اور ہیں۔

مولانا حالی مرحوم نے یادگار غالب میں اس شعر کے معنی یہ لکھے ہیں یعنی میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوا نقصان کے فائدہ نہ پہنچا۔ یہ مطلب PROSAIC خشک نثری انداز رکھنے والا بن جاتا ہے مگر اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔ شعر مذکورہ بالا کے لفظوں سے یہ مطلب بہرحال نکالا جا سکتا ہے۔ جناب نظم طباطبائی مرحوم نے "وہ" کا مشار الیہ غرور حسن کو قرار دیا ہے۔ یعنی غرور حسن کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس کی پرستش میرے لیے بھلائی کا سامان نہ بن سکی۔ معلوم نہیں علامہ نظم طباطبائی نے "غرور" کے اضافہ کو کس بنا پر مستحسن سمجھا حالانکہ اس کے بغیر بھی اُن کا مطلب حاصل ہو جاتا۔ جناب طباطبائی مرحوم پر حضرت آسی نے جو اعتراض کیا ہے وہ خواہ مخواہ کا اعتراض ہے۔ قلب ماہیت کا یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ "تھی" تانیث "خدائی" کی تانیث کی وجہ سے ہے۔ یہ جملہ بالکل زبان کے مطابق ہے "کیا حسن نمرود کی خدائی تھی۔" مجھے اس جملے میں کوئی سقم نظر نہیں آتا۔

۴۔ نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نہ میں گل نغمہ یعنی گلبانگ ہوں نہ ساز کا پردہ ہوں بلکہ اپنی شکست کی آواز ہوں یعنی از سرتا پا درد ہوں، مجسم کرب ہوں۔ مجھے سرور و طرب سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اگر میں گلبانگ ہوتا تو سرور و طرب کا نشان ہوتا۔ اگر ساز کا پردہ ہوتا تو مجھ سے نغمے پھوٹتے۔

اسی خیال کو فارسی میں غالب ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں ؎

دیگر ز ساز بیخودی ما صدا مجوے   آوازے از شکستن تار خودیم ما

اب ہمارے ساز بیخودی سے کسی نغمہ کی جستجو نہ کرو۔ اپنے ساز کے ٹوٹنے

سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ ہم ہیں ——— میں ہوں اپنی شکست کی آواز

۵۔ میں اور صد ہزار نوا ہائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

شعر بالا میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ مطلب صاف ہے البتہ ایک "نشنیدن" فارسی مصدر کا استعمال ذرا بحث طلب ہے۔ اگرچہ مرزا کے اسلوب نظم میں فارسی کی خالص ترکیبوں اور الفاظ کو خاص دخل ہے اور اس لحاظ سے "نشنیدن" کے استعمال پر ناک بھوں چڑھانا بے محل ہی ہے۔ لیکن جناب یاس (یگانہ) مرحوم نے "نشنیدن" کے استعمال پر استہزائیہ لہجہ میں نکتہ چینی کی ہے۔ اُن کا ارشاد ہے: "سبحان اللہ۔ سبحان اللہ 'نشنیدن کہ کیا کہوں' کی ایک ہی کہی۔ اردو کی پھوٹی ہوئی قسمت جہاں تک ناز کرے کم ہے۔"

اب یہ اپنا اپنا ذوق ہے۔ مجھے تو "نشنیدن" اس مقام پر نہایت ہی برمحل اور مقتضائے حال کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ اگر "نشنیدن" کی جگہ کوئی دوسری لفظ مثلاً "نہ سننا" رکھ دی جائے تو شعر کا چہرہ بالکل ہی بدنما اور بدقوارہ بن جائے گا۔ جناب آسی الدنی مرحوم نے اس مقام پر جو کچھ لکھا ہے اس کے مرکزی خیال سے متفق ہوتے ہوئے بھی اُنھوں نے جن گوشوں تک اُس کو پھیلایا ہے، اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ یاس (یگانہ) کے مندرجہ ذیل شعر میں جو خود بہت ہی معمولی قسم کا ہے اور اُن کے اصلی رنگ کا نمائندہ بھی نہیں ہے ؎

آنکھ کا مارا مرے نزدیک آزاری نہیں   اور سچ پوچھو تو اچھی کوئی بیماری نہیں

لفظ "آزاری" پر انگلی رکھنا اور یہ کہنا کہ "خدا جانے یہ آزاری کہاں کا لفظ ہے" درست نہیں ہے۔ "آزاری" بیمار کے معنی میں "آزار" سے بنا ہے اس میں یائے نسبتی لگادی گئی ہے۔ اگرچہ یہ لفظ آج کل عام استعمال میں نہیں ہے مگر محض اس بات سے اُسے غلط تو قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۶۔ غلطیہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں

عام آدمی نالہ کو "رسا" یعنی اثر کرنے والا، تاثیر رکھنے والا کہتے ہیں اور اسے نظم کرتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے۔ یہاں کوئی نالہ رسا ہی نہیں ہوتا۔ غالب کے مندرجہ بالا شعر میں "غلطیہائے مضامین" کا ٹکڑا قابل نظر ہے۔ صحیح لفظ "غلط" ہے۔ "غلطی" باضافۂ یا غالباً اردو کا تصرف ہے اور اس لیے اُس کی جمع بقاعدہ فارسی بنانا اور پھر اُسے بقاعدہ فارسی "مضامین" کی طرف مضاف کرنا عام نحوی قاعدے سے انحراف ہے۔ اس بحث سے یہاں قطع نظر کی جاتی ہے کہ اس قسم کے تجاوزات عجمی اساتذہ کے یہاں دستیاب ہوتے ہیں لیکن غالب اُن کے نقش قدم پر چلنا اپنے کثیر ابداعات کے باوجود پسند نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں فارسی کا ایک قطعہ یاد آرہا ہے:

وائے بر شاعرانِ نا دیدہ   غلطی را بجود پسندیدہ
سرو را قد یار می گویند   سرو چوبیست نا تراشیدہ

فارسی کے قطعۂ مندرجہ بالا میں لفظ "غلطی" موجود ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ قطعہ کسی ہندی نژاد شاعر کا زائیدۂ فکر تو نہیں ہے جو اپنے ماحول میں لفظ غلطی کے عام استعمال سے "لسانی مسامحہ" کا شکار ہو گیا۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ بہت سے ایسے اشعار ہیں جن کے بارے میں برابر اختلاف رہا ہے کہ یہ کس کی فکر رسا کا نتیجہ ہیں۔ اسی قبیلہ کے یہ دو شعر ہیں:

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا   نظارہ زجنبیدنِ مژگاں گلہ دارد
دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار   گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

میں ایک عرصے تک یہی سمجھتا رہا کہ یہ عشرتی کے باغِ سخن کے سدا بہار پھول ہیں۔ مگر جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ "خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم"۔ غالب کی تحقیق اس معاملہ میں دوسری ہے۔ غالب نے مرزا علاء الدین علائی کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں انھوں نے تحریر کیا ہے:

"پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے ؎

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے ؎

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کرکے غزل بنالی ہے۔ اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر

کسی اور کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے غلط کر دیا ہو۔ مقطع بے شک مولانا مغربی کا ہے اور وہ شعر جو میں نے تم کو لکھا ہے اور یہ شعر جواب لکھتا ہوں ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

یہ دونوں شعر قدسی کے ہیں۔ مغربی قدما اور عرفا میں ہے جیسا عراقی۔ اُن کا کلام حقائق و دقائق تصوف سے لبریز۔ قدسی شاہجہانی شعراء میں صائب و کلیم کا ہم عصر و ہم چشم۔ ان کا کلام شور انگیز۔ ان بزرگوں کی طرز و روش میں زمین و آسمان کا فرق۔"

یہ خط بہت طویل ہے۔ اس کے حاشیے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے کہ "حیرت ہے کہ غالب کو اس پر اصرار ہے۔ یہ مشہور غزل تو حسرتی کی ہے۔"

(خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد۔ صفحہ ۳۴۲)

اس سے پہلے والے خط میں غالب نے انھیں علائی کو لکھا ہے:

"در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا
نظارہ زجنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

یہ زمین قدسی علیہ الرحمہ کے حصے میں آگئی ہے۔ میں اس میں کیونکر تخم ریزی کروں اور اگر بے حیائی سے ہاتھ پاؤں ہلاؤں تو اُس شعر کا جواب کہاں ہے۔

ہرگز نتواں گفت دریں قافیہ شعرے
بیجاست برادر اگر از من گلہ دارد"

(خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد۔ صفحہ ۳۴۲)

اس سے پہلے بھی ایک خط میں غالب نے یہی لکھا ہے کہ یہ غزل قدسی کی ہے۔ غالب کے مذکورہ بالا خطوط سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ ان اشعار کو قدسی کا نتیجۂ فکر سمجھتے ہیں اور یہ خیال کہ یہ مغربی کے اشعار ہیں ان کی نگاہ میں صحیح نہیں ہے۔ غالب کی اس رائے میں تو پورا وزن ہے کہ محوّلہ بالا اشعار مغربی کے نہیں ہیں کیونکہ یہ رنگ ہی مغربی کا نہیں ہے۔ لیکن پھر یہ شعر ہیں کس کے؟ قدسی کے؟ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے اس بیان کے بعد کہ "یہ شعر حسرتی کے ہیں" غالب کی اس رائے کا تسلیم کر لینا کہ یہ اشعار قدسی کے ہیں آسان نہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جناب امجد نجمی نے اپنے مضمون "توارد۔ تصرف یا سرقہ" مطبوعہ آجکل دہلی شمارہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء میں مندرجۂ ذیل شعر کو ؎

در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا نظارہ زجنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

نظیری کا قرار دیا ہے۔ لیکن کلیاتِ نظیری میں یہ شعر نہیں ملتا شعر کا کیا ذکر؟ یہ زمین ہی اس میں نہیں ہے۔ اسی نوعیت کی ایک اور لطیف غلطی کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

علامہ شبلی نے شعر العجم حصہ سوم میں میرزا صائب اصفہانی کا ذکر کیا ہے اور اُن کے کلام پر رائے زنی کرتے ہوئے مندرجۂ ذیل شعر کو ؎

کہ گزشت ست ازیں بادیہ دیگر کامروز
نبض رہ می طپد و سینۂ صحرا گرم ست

میرزا صائب کے نتائج فکر میں محسوب کیا ہے۔ لیکن کلیات صائب کے تتبع و استقراء کے باوجود یہ شعر اس میں کہیں نہیں ملا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمین میں صائب کی کوئی غزل ہی نہیں ہے۔ مذکورہ بالا شعر مجھے اس شکل میں یاد پڑتا ہے ؎

کہ گزر کرد ازیں راہ بشوخی وحشی نبض جادہ تپد و سینۂ صحرا گرم ست

اس شعر کو بعض خوش ذوق حضرات سے یوں بھی سنا ہے ؎

کہ گزر کرد ازیں بادیہ وحشی امروز نبض جادہ تپد و سینۂ صحرا گرم ست

ان دونوں شکلوں میں وحشی مشترک ہے۔ اس سے میرا قیاس یہی ہے کہ مذکورہ بالا شعر مشہور شاعر وحشی کا ہے۔ مگر اتفاق کہ مجھے اس وقت تک وحشی کا دیوان دستیاب نہیں ہو سکا جس سے یقینی طور پر یہ پتا چل سکتا کہ یہ شعر مشہور شاعر وحشی یزدی کا ہے۔ علامہ شبلی اُن کے درج کردہ شعر کے پہلے مصرعہ میں "دیگر" کا کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔ اُس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ برائے بیت کی رہتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ "وحشی امروز" کا ٹکڑا اچھا ہے۔ لیکن "بشوخی" کے ٹکڑے سے دوسرا مصرعہ بہت زیادہ سنور اور نکھر جاتا ہے اور اُس میں ملاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

جناب آسی الدنی شعر مندرجۂ بالا کی تشریح حسب ذیل عنوان سے فرماتے ہیں:

"مے و نغمہ کو پُرانے آدمی کہتے ہیں کہ اندوہ رُبا اور غم غلط ہے اور آج کل کے زمانے میں اس میں یہ صفت باقی نہیں رہی ہے کہ اندوہ و غم اس سے کم ہو جائے سو ان لوگوں سے اس بنا پر جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ شراب اور نغمہ میں پہلے یہ خاصیت ہو گی جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں۔ اگرچہ آج نہیں ہے۔"

میری ناقص رائے میں جناب آسی اُلدنی نے شعر کی مندرجۂ بالا تشریح کر کے شعر سے شعریت کی روح سلب کر لی۔ غالب یہ کہہ رہے ہیں کہ جو لوگ مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں وہ اگلے وقتوں کے سادہ لوح اشخاص ہیں۔ اُن سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ "مے و نغمہ" حقیقتہً روح کو پاکیزہ بنانے والی' اُس میں رفعتیں پیدا کرنے والی چیزیں ہیں۔ اگلے زمانے کے بھولے بھالے لوگ "مے و نغمہ" کی اس پاک و پاکیزہ خصوصیت کو نہیں سمجھ سکتے۔

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ساغرِ شراب کو ایک قسم کی سلطنت سمجھئے اور سلطنت کا قاعدہ ہے کہ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچتی ہے۔ البتہ خاتمِ جمشید کی دوسری حیثیت ہے۔ اُس کے نگینہ پر جمشید کا نام کھدا ہوا ہے۔ وہ دوسرے کی ملکیت میں نہیں جا سکتی۔ جب یہ صورت ہے تو پھر جامِ مے مجھ تک کیوں نہیں پہنچتا۔

۹۔ سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

میرے دل کے داغ سے اور اُس کی تپش وحدت سے میرے نالوں کی گرمی اور سوزش کا پتہ چل سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رات کے چلنے والے یعنی چور کا نقشِ قدم دیکھ کر ہی اُس کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ چونکہ میرا نالہ بھی شب گیر ہے — شب گیر یعنی رات ہی میں وہ نالہ قالبِ ظہور اختیار کرتا ہے' اس واسطے اُس کے نقشِ قدم ہی سے یعنی دل کے داغ سے اُس کا سُراغ لگانا چاہئے۔

۱۰۔ ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلاں اُٹھائیے

سڑکوں کے پتھر پر جنونِ عشق کا پروانہ یا فرمان لکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دیوانہ ہو کر بھی خوشامد اور منت کی ضرورت ہے — کس قدر قیامت کی بات ہے کہ اس عالمِ دیوانگی میں بھی منت اور خوشامد کے بغیر کام نہیں نکلتا۔

۱۱۔ قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

قمری کا رنگ خاکی ہوتا ہے۔ شاعر اس سے یہ سمجھتا ہے کہ وہ مٹھی بھر راکھ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سرو کے عشق میں جل رہی ہے۔ اُس نے اُس کی یہ حالت کر دی اور اُس کو یہ رنگ دے دیا۔ اسی سے وہ پہچانی جاتی ہے۔ بلبل گلاب کے عشق میں مقید ہو کر رنگ کا قفس بن گئی ہے یعنی صرف رنگ ہی رنگ رہ گئی ہے۔ اُس کی جوہری حیثیت عشق نے فنا کر دی اور اُس کی صرف عرضی حیثیت باقی رہ گئی ہے۔ بہرحال اُسے اس پتے سے پہچانا جا سکتا ہے لیکن نالہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے اب تو ہی بتا جلے ہوئے جگر کا نشان کیا ہے۔ میں اگر اُس کو ڈھونڈوں تو کس طرح ڈھونڈوں' مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا جلا ہے کہ اُس کا کسی صورت میں اور کسی رنگ سے سراغ نہیں مل سکتا۔

جناب نظم نے نالہ کے ساتھ خطاب کو بے لطف کہا ہے لیکن اسے ہر صورت اور ہر حالت میں بے لطف نہیں کہا جا سکتا۔ کہیں یہ خطاب لطیف ہو سکتا ہے اور کہیں غیر لطیف۔ یہ صرف شاعر کے حسن استعمال پر موقوف ہے۔ آسی صاحب کو اگر فیضی کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

اے درد بسینہ ام خیر کن   اے نالہ ترا دشش جگر کن

تو کچھ بے محل نہیں ہوا۔ فیضی کے مذکورۂ بالا شعر میں درد اور نالہ سے مخاطبت لطف سے خالی نہیں۔ غالب کے شعر میں مخاطبت نسبتہً لطیف نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ پورا شعر ہی لطفِ تغزل سے معرّیٰ ہے۔ ایسی صورت میں نالہ کو مخاطب کرنا اثر آفرینی سے محروم نہ رہے تو کیا ہو۔

۱۲۔ شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بے درد نظرگاہِ حیا ہے

شبنم کے قطرے لالہ کے پھول پر جو نظر آ رہے ہیں' اس میں ایک رمز ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ قطرے درحقیقت گلِ لالہ کا عرقِ ندامت ہیں۔ گلِ لالہ کو اس بات پر شرم آ رہی ہے کہ اُس کے دل میں داغ تو موجود ہے مگر اُس میں درد نہیں' سوز نہیں ہے۔ ایسا دل جس میں داغ تو دکھائی دے مگر عشق کی تپش کا اس میں کوئی نشان نہ ہو' اس کو حیا کی نظرگاہ یعنی جس پر نظر جم جائے' یوں ہی جانا چاہیے۔

★

اُجالے اور اندھیرے میں

(مشہور انگریزی شاعر الفرڈ لیمبورن کے ایک سانٹ کا ترجمہ)

بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

مطلعِ بے ابر تھا جب سربسر حسن و جمال
موسمِ سرما میں نازل نور کا تڑکا ہوا
آسماں پورب کی جانب صورتِ دُرِّ یتیم
تھا سپیدے میں سحر کے سربسر ڈوبا ہوا

تھی روِش تک سبز کی زرّیں جس میں خنداں تھا گلاب
اس کے روئے ناز گستر کی تھی رنگت قرمزی
تھی مرے دل کے نہاں خانے میں جانے کس لیے
کروٹیں سی کر رہی اِک دہشتِ بے نام کی

نور کے تڑکے تھا سرمستی کا عالم ہی عجیب
اس میں شرکت کے شرف سے میں مگر محروم تھا
جس طرح محوِ فغاں ہے بے ستاروں کی یہ رات
مائلِ آہ و بکا میرا دلِ مغموم تھا

آسماں پر اب تو لیکن ہے مسلّط تیرگی
چل رہی ہیں زہر ریں جو ہوائیں بے پناہ
پتّیاں اُڑ اُڑ کے اُن کی زد سے ہیں محوِ فرار
بارشِ پیہم سے آتا ہے نظر مطلع سیاہ

حُسن و رعنائی کی اس دُنیائے تازہ کار میں
میرے دل پر جیسے رکھا تھا کوئی بارِ گراں
اُن کی تابانی کا عالم ہے نکھر کر سامنے
آگئیں تھیں میرے جینے میں جو سب تاریکیاں

کھڑکیاں آراستہ جو نقرئی شیشے سے ہیں
جھانکتا اُن میں نہیں اب چاند یا تارا کوئی
پھر بھی میں اپنے خیالاتِ مسلسل سے ہوں مست
اور اطمینان سے رہتا ہوں صحبت میں تری

آہ! تیرے اعتمادِ پُر حلاوت کے بغیر
نور کے تڑکے سے پیدا تیرگی تھی رات کی
اب مگر تیری عقیدت کا عیاں ہے معجزہ
ہو رہی ہے تیرگی سے آشکارا روشنی

طلسم خیال سکندری

ایم حبیب خاں

طلسم خیال سکندری منشی احمد حسین قمر کی تصنیف ہے۔ اس کے مطالعے سے ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی منزل سے گزر رہے ہیں جس کے مناظر اور ماحول ان منزلوں سے جن کو ہم طے کر چکے ہیں، نمایاں یکسانیت رکھتے ہیں۔ ہوش ربا کے سدا بہار مرغزار کی طرح طلسم خیال بھی ایک وادی ہے مگر اس کا سبزہ زار تخیل پژمردہ ہے۔ نیویارک کے اسکائی سکریپر بھی رہائش گاہیں ہیں اور ہندوستان کی پست عمارتیں بھی۔ دونوں کا بنیادی مقصد تعمیر تقریباً ایک ہی ہے۔ مگر فرق ظاہر ہے۔ یہاں ہم کو وہ بلندی اور خوبصورتی نہیں ملتی جس کے ہم متلاشی ہیں۔ ایک تکرار پائی جاتی ہے۔ جیسے پناہ گزینوں کے لیے جلدی جلدی ایک ہی شکل کے ہزاروں مکان بنا دیے جائیں۔ ضرورت کے لحاظ سے وہ اہم اور مفید ہو سکتے ہیں مگر ان میں کوئی جمالیاتی پہلو نہیں ہوتا۔ ہر طرف ایک پریشان کرنے والی یکسانیت ملتی ہے۔ کچھ اسی قسم کا فرق ہوش ربا اور خیال سکندری میں ہے۔

اس سے پہلے میں لکھ چکا ہوں کہ طلسم ہفت پیکر ایک بے ربط اور فرسودہ داستان ہے مگر خیال سکندری اس فرسودگی میں کچھ آگے ہی ہے۔ اگرچہ قمر کہیں کہیں تھوڑے بہت ابھرے ہیں مگر مکمل طور پر اس داستان کو ایک ناکامیابی ہی قرار دیا جا سکتا ہے! اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ۲۹۲۵ صفحوں کی عظیم داستان (جلد اول ۸۹۴ صفحات، دوم ۹۷۲ اور سوم ۱۰۶۹) صرف ایک سال میں مکمل ہو گئی۔ ضخامت میں یہ کچھ طلسم ہفت پیکر سے زیادہ ہے بلکہ داستان کے لحاظ سے بھی بلند ہے۔

طلسم ہوش ربا کا اثر انداز ہونا تو لازمی تھا مگر اس طلسم میں ہم کو بوستان خیال کا بھی ایک مبہم سا پرتو نظر آتا ہے۔ اس داستان میں نئے کرداروں میں بھی کوئی نہیں ابھرتا۔ نقراط ثانی جو خدائی کا دعویٰ رکھتا ہے بادشاہ طلسم ہونے کے باوجود کچھ نہیں۔ ایک دو دفعہ لوح طلسمی کو ضرور بچا کر لے جاتا ہے ویسے لشکر اسلام کے لیے بالکل بے ضرر ساحر ہے۔ افراسیاب کے بلند ہونے کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ سکندر ثانی لاچین کی طرز پر سابق بادشاہ طلسم ہے جس کو نقراط نے قید کر دیا تھا۔ لاچین کی مانند سکندر ثانی اپنے مخالف سے ٹکر لینے کا اہل نہیں بلکہ جا بجا نقراط کے ہاتھوں شکست اٹھاتا ہے۔ جمشید زریں ترکش سکندر کا بھائی ہے۔ اس کو کوکب کا عکس سمجھ لیجیے۔

شاہزادیوں میں شعلہ جوالہ [illegible] ہمائے [illegible] سمع پوش کے نام پیش پیش ہیں۔ یوں تو نور الدہر کی معشوقیں لا[illegible] ہیں۔ جو حسین ساحرہ آتی ہے وہ عام طور پر طلسم کشا پر عاشق ہو جاتی ہے۔ نجم اختر شناس اور حکیم ارسطوئے ثانی بھی نور الدہر کے معتقدین میں سے ہیں۔

اس کتاب کا اشتہار قمر طلسم ہفت پیکر میں شائع کر چکے تھے۔ اب وجہ تصنیف [illegible] ہوئے لکھتے ہیں کہ

"حوالہ اس طلسم کا ہفت پیکر میں دے چکا ہوں۔ اتفاقاً ایک روز منشی پراگ نرائن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ کیا سبب ہے کہ آپ قلم نہیں اٹھاتے۔ طلسم خیال سکندری

کیوں نہیں تحریر کرائے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ پانچ مہینے
ھفت پیکر کو تمام کیے ہوئے گزر رہے۔ گو خیال سکندری
کو ۱۹۰۰ء میں شروع کیا گیا اور اسی سن میں تکمیل بھی ہو گئی۔"

جلد اول میں سب سے پہلے سکندر اعظم کی داستان بیان
کی گئی ہے۔ قمر نے قصے کو اس طرح پیش کیا ہے کہ سکندر دارا کا
خراج گذار تھا۔ ایک دفعہ خراج ادا نہ کرنے کے باعث دارا نے
فوج کشی کی۔ سکندر کی سپاہ قلیل تھی۔ اس نے فرار ہو جانے کا ارادہ
کیا مگر ارسطو کے کہنے سے مقابلے کے خیال سے صف آراستہ
ہوا۔ یہاں پہ فاختہ اور تیتر کا SYMBOL رکھا گیا ہے۔
سکندر فاختہ اور دارا تیتر۔ فاختہ جیت جاتی ہے اور سکندر کی ہمت
دوگنا ہو جاتی ہے۔ لڑائی کا آغاز ہوا۔ کئی دن تک میدان داری
ہوتی رہی۔ جنگ مغلوبہ نہ ہونے پائی تھی کہ دارا کو اس کے دو نمک حرام
ترکی غلاموں نے قتل کر ڈالا۔ یہاں پر بڑی زبردست سہو زمانی
(ANACHRONISM) ہے۔ سکندر دوربین کے ذریعے
دارا کے لشکر کا معائنہ کرتا ہے۔ اس زمانے میں دوربین کہاں سے
آئی یہ تو ایک جدید ایجاد ہے۔ داستان گو کو اس کی کوئی پروا
نہیں۔ اس کے یہاں یونان اور خوارزم جو ایک دوسرے سے
ہزاروں میل دور ہیں اتنے قریب آجاتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے
شہزادے ایک ہی جنگل میں شکار کھیلتے نظر آتے ہیں۔ اس قسم کا
ذکر ہمیں طلسم نارنج میں ملتا ہے۔ یہی خامی ہمیں شیکسپیر کے
ڈراموں میں بھی نظر آتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شیکسپیر
کی طرح داستان گو بھی ان باتوں کا ذرا کم ہی خیال رکھتا ہے۔ اس کے
بعد دارا کی لڑکی روشنک سے سکندر کی شادی ہو جاتی ہے۔ ایک
اژدہا سکندر سے مدد مانگتا ہے۔ اس کے دشمن بچھو کو بارود سے فنا
کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک اور ANACHRONISM ہے۔ اس کے
بعد سکندر کو دریا کا سفر درپیش ہوتا ہے کئی مہینے بعد ایک مقام پر
پہنچا ارسطو سے کہا استاد اس مقام پر ایسی چیز بنا دو کہ دور سے
دیکھنے والا دیکھے اور جہاز کو بچا لے جائے۔ ارسطو نے کہا اے شہریار
اس مقام پر پانی چرخ مارتا ہے۔ طبقہ زمین کا پھٹا ہوا ہے۔ کوئی شے
یہاں نہیں بن سکتی۔ سکندر نے مجبور ہو کر اژدہے کو بلایا۔ وہ سمندر میں کھڑا ہوا۔
اس کے حلق میں سیسہ ڈالا گیا اور وہ ایک میل بن گیا اسی کا نام سد سکندری رکھا گیا
کئی ہزار برس اس بات کو گذر رہے۔ اس قصے کا تاریخ سے دور کا بھی تعلق
نہیں۔ کوئی واقعہ ایسا نہیں جو قابل قبول ہو۔ تاریخ یا فسانہ یونان سے
ہندستان تک پہنچنے میں بالکل مسخ ہو چکا ہے۔

اصل داستان جہاں گیر کی مہم سے شروع ہوتی ہے۔ ایک
ساحرہ عجائب نگار ایک آندھی کے ذریعے تمام لشکر اسلام کو تتر بتر کر دیتی
ہے۔ ھفت پیکر کی جلد اول میں اسی قسم کی آندھی سے قصے کا آغاز
کیا گیا تھا۔ نورالدہر اصل فاتح طلسم اس ساحرہ کو قتل کرتے ہیں۔
قصر سکندری یا قصر عشرت میں بقراط ثانی ہمراہ بارہ ہزار شاہزادیوں کے
رہتا ہے۔ چیدہ چیدہ شاہزادیاں لشکر اسلام کے خلاف روانہ کی جاتی
ہیں مگر سب مختلف شاہزادوں کی آغوش کی زینت بن کر بقراط کی
مخالفت پر تل جاتی ہیں۔ شروع میں ایک داستان، جس میں لندھور
اور مالک وغیرہ سحر میں مبتلا ہو کر لشکر اسلام کی مخالفت کرنے لگتے
ہیں اور ابراہیم مع غضنفر کے شب خون مار کر ان کو بری طرح تنگ
کرتے ہیں، دل چسپ ہے۔ لوح محفوظ نورالدہر کو مل جاتی ہے۔
ضمنی داستانیں بے حد ہیں۔ اور وہ داستان جس میں صاحبقران طلسم چمن زار فتح
کرتے ہیں خیال سکندری کی متعدد داستانوں سے مرتبہ رکھتی ہے۔

کتاب کے آخر میں بوستان خیال کا اثر بہت قوی ہو جاتا ہے
گنبد گیتی نما کی سیر ہے۔ اس قسم کے بے معنی جلسوں کا ذکر جہاں دوست
دشمن سب یک جا ہوتے ہیں بوستان خیال میں ہی پائے جاتے
ہیں حکیم ارسطوئے ثانی بھی بوستان خیال کے حکیموں کا چربہ
ہیں۔ ایک جگہ نورالدہر ایک شہر میں داخل ہو کر ایک بوڑھی عورت
عاقلۂ بالغہ کے گھر میں آرام کرتے ہوئے ایک کہانی سنتے ہیں جو دراصل
مہم کے لیے ایک کلید ہے۔ بالکل ایسا ہی واقعہ شاہزادہ معزالدین کے
ساتھ حسن انتظار میں پیش آتا ہے۔ باغ ہمیشہ بہار کا ذکر اور نورالدہر
ایک شاہ صاحب کے چیلوں میں شامل ہو کر بھیک مانگتے ہیں۔ یہ
سب بوستان خیال کے رنگ ہیں۔

جلد دوم میں زیادہ تر ہوش ربا کی نقل مد نظر رکھی گئی ہے۔

جلد اول میں تو پھر بھی داستان گو نے بوستان خیال کے رنگ کو طلسمی طرز میں تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی اور جدت دکھائی تھی مگر یہاں وہ دوبارہ ہوش ربا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

طلسم ظاہر کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب لشکر اسلام باری باری سے طلسم باطن میں داخل ہو رہا ہے۔ صاحبقراں مع علم شاہ کے جن کو کسی ساحرہ نے انگشتر جمشیدی عنایت کی ہے تاکہ سحر اثر نہ کرے، دزہ طلسم کو فتح کرتے ہوئے قلعۂ طلسمی میں داخل ہوتے ہیں جس کی فوراً شکست ریخت شروع ہو جاتی ہے۔ شاہزادیاں حسب معمول عاشق ہوتی رہتی ہیں۔ نور الدہر سکندر ثانی بادشاہ سابق کو رہا کرتے ہیں اور ایرج سے جن کو یاقوت جنی مددگار ملا ہے، برابر مقابلہ رہتا ہے۔ ایرج باوجود طلسم کے فاتح نہ ہونے کے اپنی آتش مزاجی کی وجہ سے اس فکر میں رہتے ہیں کہ لوح حاصل کر لیں۔ حکیم اشفاق حکمت پسند بھی نور الدہر کے شریک ہوتے ہیں۔ یہاں بھی بوستان خیال کا اثر غالب ہے۔ عیاز بچیوں سے بھی ایک داستان میں مقابلہ پڑتا ہے مگر بہت جلدی زیر ہو جاتی ہیں اور ان کی ملکہ صہبائے خمار افزا کی عمرو سے شادی ہو جاتی ہے۔

دریائے غراب کے بوسیدہ پل پر جو پہلوانوں کی جنگ دکھائی ہے وہ بدت ہے اور اچھی لکھی ہے۔ خروج فرزیل بن فرامرز کی داستان بڑے زور شور سے شروع ہوتی ہے مگر اس قدر اچانک طور پر فرزیل کو ختم کیا جاتا ہے کہ سب لطف ضائع ہو جاتا ہے۔

جس طرح ہوش ربا میں افراسیاب نے زمہریر کو بلا کر شراب پلا کر بے ہوش کیا تھا اور اس کا جسم چیر کر لوح رکھ دی تھی اسی طرح بقراط ثانی ہفت جوش کو بلا کر دھوکے سے لوح طلسم اس کے جسم میں پوشیدہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی جان سے خوف زدہ ہو کر دریائے قلزم میں پناہ لیتا ہے۔ ہوش ربا میں دریا کا نام دریائے نیل تھا۔ تیسری جلد میں قصے میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے کیونکہ ہفت جوش نور الدہر کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف زمہریر اسد غازی سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ جلد دوم کے آخر میں اپنی تصنیف کردہ تاریخ میں قمر لکھتے ہیں ؎

غم دہر نے یوں پریشاں کیا شگوفہ کھلایا نئے رنگ کا

قمر خود تسلیم کرتے ہیں کہ "یہاں تک کہ طلسم ہفت پیکر کو معشوقان طناز نے فتح کرایا۔" ان طلسمات میں اب زور بازو کا کوئی کام نہ تھا اور کیوں نہ ہو آخر قمر بھی تو ایک ایسی سوسائٹی کے نمائندے تھے جو فقط ماہ و شراب و ساقی کے قائل تھے۔

طلسم خیال سکندری باوجود اس کے کہ عیوب سے خالی نہیں لیکن اتنی ضخیم داستان جو ۲۹۲۵ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے اس میں جابجا خوبیاں بھی نظر آتی ہیں۔ چند عمدہ نمونے ملاحظہ ہوں:

"زمین شق ہوئی۔ پانی پیدا ہونے لگا۔ اس قدر فوارے چلے کہ دریا ہو گیا۔ دم بھر میں ایسا دریا تیار ہوا کہ پختہ گھاٹ بنے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ شوالے کنارے کنارے سیڑھیاں خشتی۔ برہمن وغیرہ اشنان کر رہے ہیں۔ پوتھیوں کا جاپ ہر ہر کی صدا بلند ہے۔ جو آتا ہے نہا کر چلا جاتا ہے۔ کوئی دھوتیاں نچوڑ رہا ہے۔"[1]

دریا کا یہ منظر نہایت دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سحر اچھا ہے، عبارت بھی رنگین اور موثر ہے۔

خواجہ عمرو نے بلک بلک کر جو دعائیں مانگی ہیں ذرا اس کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

"اے رحیم و کریم ان ظالموں کی بدعت سے بچا لے۔ میرے تیرے کوہ سراندیپ پہ وعدہ ہو چکا ہے۔ تو بھی سچا ہے تیرا وعدہ بھی سچا ہے۔ مگر اس وقت ملک الموت کا سامنا ہے، میں ان کے نام سے ڈرتا ہوں۔ میں نے ان کو اپنے گھر میں کبھی نہیں آنے دیا۔ علاوہ اس کے میں ایک مرد معصوم دم نکلتے ہی بہشت میں جاؤں گا۔ تو نے جو جواہرات کے مکان بنائے ہیں ان سب کو زنبیل میں رکھ لوں گا۔ تجھ کو پھر مشکل پڑے گی۔"[2]

یہ عبارت خواجہ عمرو کے کردار پر بہترین تبصرہ ہے۔ اس میں

---

[1] طلسم خیال سکندری۔ جلد دوم۔ ص ۴۰۸۔ [2] طلسم خیال سکندری۔ جلد دوم۔ ص ۴۵۳

سادگی بھی ہے اور کشش بھی۔

ذیل کی عبارت میں باغ و بہار کی نقل نمایاں نظر آتی ہے:

"مگر سامنے ایک کوہ ہے۔ اس پر ایک چراغ روشن ہے لاکھ ہوا کا زور ہوتا ہے مگر وہ چراغ گل نہیں ہوتا۔ روشنی دم بدم بڑھتی جاتی ہے۔ نورالدہر کے پیچھے شب رنگ تھا۔ فرمایا کہ اے شب رنگ یہ چراغ خالی از علت نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا ل کا گذر ہے۔"[1]

عبارت کی سادگی، دل کشی اور انداز ہمیں میر امن کی یاد دلاتا ہے۔ قمر بالکل میر امن کی طرز [illegible] محو ہو جاتے ہیں کہ بعض جگہ دونوں مصنفوں کے طرز کا امتیاز کر [illegible] جاتا ہے۔

جلد سوم میں قصہ آہستہ آہستہ آگے کھسکتا رہتا ہے۔ بفت جوش نورالدہر کا شریک ہو کر لوح دینے کی غرض سے آتا ہے۔ مگر ایرج دھوکے سے لوح لے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوح فوراً ہی چھن جاتی ہے اور کافی ردوکد کے بعد طلسم کشا یعنی نورالدہر کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ بقراط ثانی [illegible] جگہ بھی جم کر نہیں لڑتا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ حکیم آغا مصری کے شعبدے بوستان خیال کے رنگ میں ہیں۔ خود حکیم کی پالیسی بھی عجیب ہے۔ وہ بقراط کا بھی شریک ہے اور صاحبقراں کو کئی دفعہ شعبدوں میں مبتلا کر دیتا ہے مگر ساتھ ساتھ لشکر اسلام سے توجہ کا خواہاں ہے۔ آخر میں بقراط ثانی ملکہ مرداریدکے پاس قلعہ مروارید نگار میں پناہ لیتا ہے اور وہیں جنگ مغلوبہ میں نورالدہر کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے۔ اس داستان میں ایک اہم نقص یہ ہے کہ مروارید کے انجام کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح طلسم ہفت پیکر میں قمر معرالغرائب کو حذف کر گئے تھے۔

خواجہ پھرتے پھراتے ایک ویرانے میں آئے کہ یکایک کراہنے کی آواز کان میں آئی۔ او [illegible] کی جانب چل دیے۔ جب قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک بیمار پڑا کراہ رہا [illegible] خواجہ کو رحم آیا اور بے اختیار اس سے یوں گویا ہوئے:

"او بیمار تو کون ہے کہ جو یہاں پڑا ہے؟ اس نے کہا میں سوداگر ہوں۔ جب یہ عارضہ ہوا تو لاکھوں روپے صرف کیے۔ نوکر چاکر موجود رہے۔ جب روپیہ صرف ہو گیا تو سب نے جدائی کی۔ اب میں یہاں حیران و پریشان ہوں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

عمرو نے کمر سے کچھ پیسے نکالے قریب آ کر چاہا دوں ـــ شاید پیسے کھوٹے تھے، مگر نہیں ـــ اس قسم کی سخاوت خواجہ عمرو سے بعید نہ تھی مگر یہ جملہ بڑا انسانی پہلو ظاہر کرتا ہے۔ انسان کیسا ہی لالچی اور خود غرض کیوں نہ ہو کبھی نہ کبھی اپنی طرز ادا کو چھوڑ کر نیک کام کی طرف متوجہ ہو ہی جاتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کم و بیش ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔ اس واقعہ سے خواجہ عمرو کا کردار اور زیادہ مسلم اور قوی ہو جاتا ہے۔

بہرحال طلسم خیال سکندری ایک غیر دلچسپ داستان ہے۔ اس کی نامقبولیت کا راز ان دو اہم نقائص میں پنہاں ہے۔ اول یہ کہ اس میں کوئی جدت نہیں، نری نقالی ہے جس میں بوستان خیال تو کبھی کچھ نبھ جاتی ہے مگر ہوش ربا کی تکرار طبع قاری پر بار گزرتی ہے۔ دوئم یہ کہ مخالفین کو گرایا گیا ہے۔ داستان میں کوئی کشمکش نہیں۔ ایک یک طرفہ قصہ ہے۔ البتہ یہ غنیمت ہے کہ طلسم ہفت پیکر کی طرح اس میں کوئی اشتہار بازی نہیں۔ زعفران زار کا ذکر ضرور ہے مگر بے حد کم اور مناسب الفاظ میں۔ ممکن ہے کہ قمر کو اس بات کا یقین نہ ہو کہ وہ زعفران زار کو تصنیف کرنے کی تکلیف گوارا کر سکیں گے جب ان کے دو طلسم قطعی طور پر ناکامیاب ثابت ہو چکے ہیں۔ ان عیوب کے باوجود اس داستان میں پیچیدگی بہت کم ہے۔ تخیل کی بلندی اور عبارت کی رنگینی نے اکثر جگہوں پر داستان میں حسن پیدا کر دیا ہے۔ قمر کا اپنا ایک انداز ہے۔ ان کے یہاں جاہ کی سی ثقالت اور ہیر پھیر نہیں بلکہ سادگی اور سلاست ہے۔ ان کو قدم قدم پر قاری کی دلچسپیوں کا خیال رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس داستان میں خامیوں کے خوبیاں بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

★

---

[1] طلسم خیال سکندری۔ جلد دوم۔ ص ۵۳

فضا ابن فیضی

رفیقو! عشرِ جنوں کو نہ شرم سار کرو — جیو تو لالہ رُخانِ زمیں سے پیار کرو

مرے سبو کی تم اک موج ہو، یہ عجلت کیوں — گزرتی صدیو! رُکو! میرا انتظار کرو

یہ کیا کہ مُنہ سے نکلتے ہی بات، کھو جائے — سخن ورو! زرا لہجے کو باوقار کرو

ترس ترس کے رہے کشتِ دل نگاراں کیوں؟ — گزر ہماری طرف بھی سحاب دار کرو

کوئی نہیں جو یہ اسرارِ زندگی سمجھے — یہاں پہ کس کو نگہ دارِ زلف و دار کرو

اُتر سکو گے نہ اس موجِ خوں میں تم لوگو! — مرے حوالے یہ آشوبِ روزگار کرو

پھرے ہو دشت میں عریاں بدن خزاں کی طرح — جنوں کو نذر کوئی خرقۂ بہار کرو

کہاں بھٹکتے ہو، سوداگرانِ فکر و نظر! — مری سُنو تو کوئی اور کار و بار کرو

میں اپنے ساز کی ٹوٹی ہوئی سی اک لَے ہوں — مری ہنسی کو بھی فریاد میں شمار کرو

سفیرِ سلطنتِ گُل رُخاں ہیں یہ فن کار — نثار ان پہ زرِ تاجِ شہریار کرو

فضاؔ میں جب تمھیں جانوں امامِ خوش سُخناں
غزل کو غنچۂ بندِ قبا سے یار کرو

★

آسمان کیا ہے؟

محمد اسحاق صدیقی

"یہ زمین کی آہیں ہیں جو صبح کہرے کی شکل میں دکھائی پڑتی ہیں اور یہ آسمان کے آنسو ہیں جنھیں ہم قطراتِ شبنم کہتے ہیں۔" یہ جملہ پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی شعر کا ترجمہ پڑھ رہے ہوں اور یہ خیال ہوتا ہے کہ جس کسی شاعر کا بھی یہ شعر ہو تخیل بڑی اچھی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نہ کسی شعر کا ترجمہ ہے نہ کسی شاعر کی تخیل نہ کسی ادیب کے ذہن کی پیداوار۔ اصل میں یہ عقیدہ ہے ایک ملک کے ایک بڑے قبیلے کا اور اس کے ساتھ وصل و فراق کی ایک داستان بھی وابستہ ہے۔ اس داستان کا فلک کج رفتار اور دو چاہنے والوں میں ہمیشہ تفرقہ ڈالنے والا آسمان، اس داستان میں فراق کا مارا ہوا شوہر ہے اور زمین، ہجر کی ماری ہوئی بیوی۔

یہ ساری داستان، مذہبی عقیدہ ہے نیوزی لینڈ کے ماوری قبیلے کے افراد کا۔ اس عقیدے کے ماننے والوں کے مطابق آسمان ایک دیوتا ہے اور زمین دیوی۔ دونوں میاں بیوی ہیں اور سارے دیوی دیوتا ان کی اولاد ہیں۔ شروع میں زمین و آسمان ملے ہوئے تھے، لیکن ہوا کے دیوتا نے انھیں زبردستی جدا کر دیا۔ زمین و آسمان کو اس جدائی کا بڑا غم ہے۔ چناں چہ کہرا جو صبح کو نظر آتا ہے زمین کی آہیں ہیں اور شبنم آسمان کے آنسو۔ مگر یہ تصور صرف ماوری قبیلے کے لیے مخصوص نہیں۔ اسی سے ملتا جلتا تصور قدیم ہندوستان، مصر اور عرب میں بھی پایا جاتا تھا۔

بعض ملکوں کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ زمین پر انسان رہتے ہیں اور آسمان پر دیوتا۔ اور جب بعض قوموں میں بہت سے دیوی دیوتاؤں کی جگہ ایک خدا نے لے لی تو یہ خیال پیدا ہوا کہ خدا آسمان پر رہتا ہے۔ افریقہ کی بعض قومیں آج بھی آسمان ہی کو خدا مانتی ہیں۔ ان میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ چاند سورج آسمان کی آنکھیں ہیں، جو دن رات انسان کے اعمال کی نگرانی کرتی ہیں اور جب خدا کسی سے ناراض ہو جاتا ہے تو اسے بجلی گرا کر ہلاک کر دیتا ہے۔

آسمان نیلا کیوں نظر آتا ہے

ہم جسے آسمان کہتے ہیں اس میں دو چیزیں شامل ہیں، زمین کی فضا اور اس کے باہر کا خلا۔ فضا سے مراد ہوا کی وہ چادر ہے جو زمین کے گرد اس طرح لپٹی ہوئی ہے جیسے نارنگی کے گرد اس کا چھلکا۔ اسے ہوائی کرہ بھی کہتے ہیں۔ جہاں زمین کی ہوا ختم ہوتی ہے وہاں سے خلا شروع ہوتا ہے۔ خلا سے مراد بے ہوا کی وہ جگہ ہے جو چاند سورج، سیاروں اور ستاروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ خلا کی کوئی انتہا نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی رنگ۔ آسمان جو ہمیں نیلا نظر آتا ہے، زمین کی فضا کا نچلا حصہ ہے اور چاند، سورج، ستارے جو ہمیں آسمان پر چمکتے نظر آتے ہیں، وہ فضا سے باہر اور ہم سے بہت دور ہیں۔

ہوا [illegible] کی روشنی کی وجہ سے نیلی نظر آتی ہے۔ جب سورج کی کرنیں زمین کی طرف آتی ہیں تو ان میں سے بعض ہوا کے ننھے ننھے ذروں پر پڑتی ہیں۔ یہ ذرے ان کے سب رنگوں کو جذب کر لیتے ہیں اور نیلے رنگ کو منعکس کرتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں آسمان نیلا [illegible] ہے۔ یہ نیلا آسمان صرف ۱۱ میل کی بلندی تک پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ۱۲ میل کی بلندی کے بعد ہوا اس قدر کم ہو جاتی ہے کہ اس کا منعکس کیا ہوا رنگ ہمیں نظر نہیں آتا اور خلا کی تاریکی اس پر غالب آجاتی ہے۔

اگر آپ خلا میں جا کر زمین کو دیکھیں تو وہ آپ کو ہلکے نیلے رنگ کا ایک حسین گولا نظر آئے گی۔ یہ نیلا رنگ زمین کی فضا کا ہوگا۔ خلا میں جانے کے بعد دن رات کا فرق مٹ جاتا ہے کیوں کہ ان دونوں کا تعلق ہماری زمین سے ہے۔ خلا میں چاند، سورج، سیارے اور ستارے ایک ساتھ چمکتے نظر آئیں گے (ان کا نکلنا اور ڈوبنا بند ہو جائے گا، کیوں کہ نکلنے اور ڈوبنے کا تعلق زمین کی محوری گردش سے ہے) اور زمین کے مقابلے میں کہیں چمکدار، کیوں کہ جب اُن کی روشنی ہوا کے غلاف سے گزر کر ہماری آنکھوں تک پہنچتی ہے تو ہوا کی وجہ سے ماند پڑ جاتی ہے۔ ہوا کی حرکت کی وجہ سے ستارے جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ خلا میں جانے کے بعد اُن کا جھلملانا بند ہو جائے گا اور ہم وہاں جا کر اُن مدھم روشنی والے ستاروں کو بھی دیکھ سکیں گے جنھیں زمین پر بغیر دوربین کی مدد کے نہیں دیکھ سکتے۔

اگر آپ گلاس میں پانی بھر کر مٹی گھول دیں تو ذرا دیر بعد مٹی تہہ میں بیٹھ جائے گی لیکن مٹی کے تھوڑے بہت ذرے پانی کے اوپری حصے میں ناچتے رہیں گے۔ بالکل اسی طرح زمین کی سطح کے قریب ہوا بہت گھنی ہے لیکن جیسے جیسے آپ زمین کی سطح سے بلند ہوتے جائیے ہوا کے ذروں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جاتا ہے اور اُن کی تعداد گھٹتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ہوا بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ جہاں سے زمین کی ہوا ختم ہوتی ہے وہاں سے خلا شروع ہوتا ہے۔

خلا کہاں سے شروع ہوتا ہے

اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ وزن کے لحاظ سے ہوا کا تین چوتھائی حصہ زمین سے صرف پانچ میل کی بلندی تک پایا جاتا ہے۔ زمین سے پانچ میل اوپر جانے کے بعد ہوا اتنی کم ہو جاتی ہے کہ اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے والے اپنے ساتھ آکسیجن[1] گیس خاص طرح کی بوتلوں میں لے جاتے ہیں۔ پرند زمین سے زیادہ سے زیادہ چھ میل کی بلندی تک اُڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ زندگی کی حد ہے جس کے اوپر ہوا کی کمی کی وجہ سے کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جانداروں کے لیے خلا چھ میل اوپر جانے کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔

سطح زمین سے ۲۵ میل اوپر جانے کے بعد ہوا اتنی کم ہو جاتی ہے کہ ہوائی جہاز اڑ نہیں سکتے۔ اسی لیے خلا کے سفر میں بجائے ہوائی جہاز کے راکٹ استعمال کیے جاتے ہیں جنھیں اڑنے کے لیے ہوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ روس و امریکا کے جن خلائی مسافروں نے زمین کے گرد چکر لگائے تھے اُن کا زمین سے کم سے کم فاصلہ ۱۰۰ میل تھا۔ گویا خلائی سفر کے لیے خلا ۱۰۰ میل کی بلندی سے شروع ہو جاتا ہے لیکن ہوا کے ذرے زمین سے ۶۰۰ میل کی بلندی تک پائے جاتے ہیں۔

ہوا کی پرتیں

زمین کی ہوا کو کئی پرتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جن کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ پہلی پرت کو ٹراپو اسفیر (TROPO SPHERE) کہتے ہیں۔ یہ ہوا کی سب سے نیچے والی پرت ہے۔ اس کی دبازت ہر جگہ یکساں نہیں ہے۔ قطب شمالی و قطب جنوبی پر یہ ۵ میل اور خط استوا پر ۱۲ میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے۔ وزن کے لحاظ سے ہوا کا ۸۰ فی صد حصہ فضا کی اسی پرت میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے موسموں کا تعلق اسی حصے سے ہے۔ بجلی، بادل، برف، اولے، آندھی، طوفان سب یہیں پیدا ہوتے ہیں۔

ہوابازوں کو تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ ٹراپو اسفیر میں جتنا اوپر جائیے اُتنی ہی سردی بڑھتی ہے۔ ہر ۳۰۰ فٹ کی بلندی پر درجۂ حرارت ایک فارن ہائٹ گرتا ہے۔ یہاں تک کہ ۶۷ فارن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی گرمی سے پہلے زمین کی سطح گرم ہوتی ہے اور پھر یہی گرمی اُس سے ملی ہوئی ہوا کی پرت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ نیچے کی ہوا سب سے زیادہ گرم ہوتی ہے اور اوپر کی بتدریج کم گرم ہوتی ہے

ٹراپو اسفیر کی بعد والی پرت کو ٹراپو پاز (TROPO PAUSE) کہتے ہیں۔ یہ ایک باریک پرت ہے جس کا درجۂ حرارت ہمیشہ وہی رہتا ہے جو پہلی پرت کے اوپر والے حصے میں پایا جاتا ہے، اور یہ بہت کم ہوتا ہے۔ اسی لیے یہاں منجمد کرنے والی سردی ہوتی ہے اور تیز

---

[1] ایک گیس جو سانس لینے کے لیے بے حد ضروری ہے اور جس کے بغیر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔

ہوائیں چلتی ہیں۔

تیسری پرت کو اسٹریٹو اسفیر (STRATO SPHERE) کہتے ہیں جو تقریباً ۲۰ میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے۔ اس کے نچلے حصے میں تیز ہوائیں چلتی ہیں لیکن جیسے جیسے اوپر جائیے ہوا کی حرکت کم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے اور ہم ایک نہایت پرسکون مقام پر پہنچ جاتے ہیں، جہاں ہوا ایک رفتار سے چلتی ہے۔ یہاں کا درجۂ حرارت منفی[1] ۷۰ فارن ہائٹ ہوتا[2] ہے۔

چوتھی پرت کیمو اسفیر (CHEMO SPHERE) ہے جو ۵۰ میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے۔ فضا کے اس حصے میں زمین سے تقریباً ۲۰ میل کی بلندی پر ہوا گرم ہونے لگتی ہے۔ اس کی وجہ اوزون (OZONE) گیس کی ایک پرت ہے جو آکسیجن کے ذروں پر سورج کی ماورائے بنفشی شعاعوں[3] کے عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ اوزون ایک زہریلی گیس ہوتی ہے لیکن اگر فضا میں اس کی پرت نہ ہوتی تو شاید زمین پر کوئی بھی جاندار زندہ نہ رہ سکتا. کیوں کہ یہ پرت سورج سے آنے والی تقریباً کل ماورائے بنفشی شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے۔ تب بھی ان کا کچھ حصہ زمین تک پہنچ جاتا ہے اور یہ اچھا ہی ہے کیوں کہ سورج کی ان کرنوں کی وجہ سے بہت سے بیکٹیریا[4] (BACTERIA) مر جاتے ہیں اور ہمارے جسم میں وٹامن ڈی کی کمی پوری ہوتی ہے۔ اگر یہ کرنیں زمین تک نہ آئیں تو ہم لوگ ریکیٹس (RICKETS) یعنی سوکھے کے روگ میں مبتلا ہو جاتے۔ انھیں کرنوں کی وجہ سے جب آپ دیر تک دھوپ میں بیٹھتے ہیں تو کھال جھلس جاتی ہے۔ اوزون والی پرت کا درجۂ حرارت ۵۰ فارن ہائٹ ہے۔ جہاں سے یہ پرت ختم ہوتی ہے وہاں سے درجۂ حرارت تیزی سے گرنے لگتا ہے۔ کیمو اسفیر کے اوپر درجۂ حرارت منفی ۱۰۴ فارن ہائٹ ہے۔

پانچویں پرت کو آئنو اسفیر (IONO SPHERE) کہتے ہیں۔ ہوا کی یہ پرت ۵۰ میل کی بلندی سے شروع ہوتی ہے اور ۶۰۰ میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے۔ اس حصے میں ہوا کے برقائے ہوئے ذرے (IONIZED PARTICLES) پائے جاتے ہیں۔ یہ سورج کی ماورائے بنفشی اور کائناتی شعاعوں[5] (COSMIC RAYS) کے اثر سے ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں اور جب موقع ملتا ہے تو پھر جڑ جاتے ہیں۔ ان کے ٹوٹنے سے گرمی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے ہوا کی یہ پرت بتدریج گرم ہوتی جاتی ہے۔ ستر میل کی بلندی پر اس کا درجۂ حرارت ۲۰۰ فارن ہائٹ اور ۲۵۰ میل کی بلندی پر ۴۰۰۰ فارن ہائٹ تک ہو سکتا ہے۔

آئنو اسفیر سے ہمیں ریڈیو سننے میں مدد ملتی ہے، کیوں کہ یہ پرت ریڈیائی لہروں کو منعکس کرتی ہے —— بالکل اسی طرح جیسے نیچے دیوار سے گیند مارتے ہیں اور وہ ٹکرا کر واپس آتا ہے۔ ریڈیائی لہریں آئنو اسفیر سے ٹکرا کر زمین کی طرف آتی ہیں اور زمین سے ٹکرا کر پھر آئنو اسفیر کی طرف جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ساری زمین پر پھیل جاتی ہیں۔ برقائے ہوئے ذروں کی کمی زیادتی کے لحاظ سے آئنو اسفیر کی چار پرتیں مانی گئی ہیں جنھیں ڈی (D)، ای (E) اور ایف (F) پرتیں کہتے ہیں۔

آئنو اسفیر سورج کے داغوں سے متاثر ہوتا ہے۔ سورج کی سطح سے برقائے ہوئے ذرے دھاروں کی صورت میں زمین کی طرف آتے ہیں۔ زمین کی مقناطیسی قوت انھیں قطب شمالی و قطب جنوبی کی طرف موڑ دیتی ہے۔ اسی لیے وہاں کی ہوا کے ذرے برقا جاتے ہیں۔ ان

---

[1] منفی کے معنی ہیں صفر سے نیچے۔ ۳۲ درجہ فارن ہائٹ پر پانی برف بن جاتا ہے۔ [2] سورج کی روشنی میں سات رنگ کی کرنیں ہوتی ہیں جو تین پہلو والے ٹھوس شیشے سے دیکھنے پر صاف نظر آتی ہیں۔ بنفشی سے اوپر اور سرخ سے نیچے جو کرنیں ہوتی ہیں وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتیں۔ انھیں ماورائے بنفشی (ULTRA VIOLET) اور زیر احمر (INFRA RED) شعاعیں کہتے ہیں۔ ان کی زیادہ مقدار جانداروں کے لیے خطرناک ہے لیکن ہوا کی چھلنی سے گزرتے ہوئے یہ کمزور ہو جاتی ہیں۔ [4] خورد بینی جراثیم [5] یہ کرنیں روشنی کی رفتار سے (جو ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے) سورج اور ستاروں کی طرف سے آتی ہیں۔ زمین پر ان کی بارش ہوتی رہتی ہے اور جب یہ ہوا کے ذروں سے ٹکراتی ہیں تو ان کے بے شمار ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ جب یہ کرنیں جاندار کے جسم سے ٹکراتی ہیں تو وہاں کے خلیے (CELLS) مر جاتے ہیں۔ ان کی زیادتی سے انسان کی صحت کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

درجۂ حرارت

فارن ہائٹ

۴۵۰۰

ایکسو اسفیر

ماورائے بنفشی کرنیں

۴۰۰۰

قطبی روشنی

آئنو اسفیر

ایف - ۲ پرت

ایف - ۱ پرت

شہاب ثاقب جل کر خاک ہوجاتے ہیں

ای - ۲ پرت

۲۰۰۰

ای - ۱ پرت

-۱۰۴

میسو اسفیر

اوزون کی پرت

ماورائے بنفشی کرنیں جذب ہوجاتی ہیں

۵۰

-۶۰

اسٹریٹو اسفیر

ٹراپوپاز

۶۸

ٹراپو اسفیر

زمین کی فضا کی پرتیں اور اُن کی خصوصیات

برف اٹھے ہوئے ذروں کی وجہ سے قطبین پر وہ رنگین روشنی نظر آتی ہے جیسے آرورا پولارس (AURORA POLARIS) یعنی قطبی روشنی کہتے ہیں۔ یہ روشنی زمین سے ۵۰ میل سے لے کر ۶۰۰ میل کی بلندی تک نظر آتی ہے جو آئنو اسفیر کی حد ہے۔

ہوا کی چھٹی پرت ایکسو اسفیر (EXOSPHERE) ہے، جس کی حد بندی کے بارے میں سائنس دانوں میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ فضا کا یہ حصہ ۲۴۰ میل کی بلندی سے شروع ہوتا ہے۔ اور ۴۰۰ میل کی بلندی تک پایا جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ ۶۰۰ میل کی بلندی سے شروع ہوتا ہے اور ۶۰۰۰ میل کی بلندی تک پایا جاتا ہے۔ بہرحال ہم اسے اپنی دنیا کی چھت کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد خلا شروع ہو جاتا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ فضا کے اس حصے میں ہوا کے جو ذرے پائے جاتے ہیں وہ سورج کی ماورائے بنفشی شعاعوں اور کائناتی شعاعوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ان ذروں کے ٹوٹنے سے دن میں ۴۵۰۰ درجہ فارن ہائٹ تک گرمی پیدا ہوتی ہے لیکن رات کو اس حصے کا درجۂ حرارت صفر سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ یہاں ہوا کے جو ذرے پائے جاتے ہیں وہ ادھر اُدھر بھاگتے پھرتے ہیں۔ اُسی طرح جیسے آپ پانی کے ٹیوب کو دبا کر ہوا میں پانی کی دھار چھوڑیں۔ اسی لئے ہوا کی اس پرت کو فاؤنٹین لے یر (FOUNTAIN LAYER) یعنی "فوارہ پرت" بھی کہتے ہیں۔ ان میں سے ہوا کے کچھ ذرے تو نیچے گر پڑتے ہیں، کچھ چاند کی طرح زمین کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں اور کچھ (ہائیڈروجن اور ہیلیم گیس کے ایٹم جو سب سے ہلکے ہوتے ہیں) زمین کی کشش سے آزاد ہو کر خلا میں غائب ہو جاتے ہیں۔

ہوا زمین پر اُس کی کشش کی وجہ سے قائم ہے۔ اگر زمین میں یہ قوت نہ ہوتی تو ہوا خلا میں غائب ہو جاتی لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ زمین آہستہ آہستہ اپنی ہوا کھو رہی ہے کیوں کہ جیسے جیسے زمین کی سطح سے بلند ہوتے جایئے اُس کی کشش کم ہوتی جاتی ہے۔ اسی لئے فضا کے اوپر والے حصے میں ہوا کے جو ذرے پائے جاتے ہیں وہ آہستہ آہستہ خلا میں فرار ہوتے رہتے ہیں۔

★

مذہب کے ذریعہ ہی انسان اپنے پیدا کرنے والے سے اپنا تعلق پیدا کرتا ہے۔ مذہب انسان کو انسان کی ہمدردی سکھاتا ہے۔ کیا اسلام فقط مسلمانوں کو مسلمان سے ہمدردی کرنا سکھاتا ہے۔ کیا پیغمبر صاحب کا تسکین دینے والا پیغام صرف مسلمانوں تک ہی محدود تھا اور ہندوؤں و غیر مسلمانوں کے خلاف؟ .... مجھے اسلام کی رواداری کا ثبوت ہر جگہ ملا ہے ——— مہاتما گاندھی

رباعیات

جگر بریلوی

اچھا جو کرے سلوک اچھا ہے وہی
جو وقت پہ کام آئے اپنا ہے وہی
پانی کے خم و سبو ہیں گھر گھر یوں تو
سب کی جو بجھائے پیاس دریا ہے وہی

یارب جو مٹوں تو پھر ابھرنے کے لیے
پیمانِ وفا کو تازہ کرنے کے لیے
اس زیست میں عشق سے طبیعت بھر جائے
مر جاؤں تو پھر جنم ہو مرنے کے لیے

کیا کہیے، عجب رنگِ دوراں دیکھا
ارزاں کو گراں، گراں کو ارزاں دیکھا
نا اہل تو سر بلند و شاداں دیکھے
اربابِ کمال کو پریشاں دیکھا

تسلیم، مذاق کا تغیر، تسلیم!
تسلیم کہ اب وہ سخن ور نہ فہیم
کیوں رنگِ قدیم کے نہ قائل ہوں ہم
جب ساری حقیقتیں ہیں ازلی و قدیم

دلدادۂ زلف دردِ دل دار کہو
یا تم مجھے ایک رندِ مے خوار کہو
میں ہوں ازلی حقیقتوں کا قائل
کہتے ہو قدامت کا پرستار، کہو

وارفتہ ہوا ہوں جیسے کوئی مے نوش
چھٹی ہر کسی سے روح اتنا ہے ہوش
مٹتا جاتا ہے زیست کا بھی احساس
سر سجدے میں رکھ کے ہو گیا ہوں خاموش

خواہش ہوئی جب خوشی کی، آلام ملے
چاہی جو شراب، زہر کے جام ملے
آئے کیوں دل کے بھولے پن پر نہ ہنسی
پیری میں یہ حسرت ہے کہ آرام ملے

قطعات

نہیب غوری

ابھی تو آیا ہے مدت کے بعد تو، اے دوست
ابھی سے فکرِ جدائی رُلا رہی ہے مجھے
وہ رات، جو ترے غم میں ابھی نہیں گزری
وہ رات آج بہت یاد آ رہی ہے مجھے

نہ جانے پھر تجھے کب دیکھ پائیں گی آنکھیں
رُلا رہی ہے مجھے وصل کی گھڑی، اے دوست
یہ رات، یہ ترے پاکیزہ گیسوؤں کی نسیم
یہ رات بھی ترے غم میں گزر گئی، اے دوست

میرے غم کی ابھی تعبیر نہ ہو گا ترا غم
جبر اتنا بھی نہ کر دل پہ کہ تو جی نہ سکے
زندگی پر مری، اے دوست! بہا لے آنسو
کیا خبر پھر تو مری موت پہ رو بھی نہ سکے

پیچھے ہٹاتی نیّر و ماہ و نجوم کو
جانے کہاں نظر کی اُداسی چلی گئی
خونِ نابِ آرزو بھی تھا، زہرابِ شوق بھی
اک رُوح اس جہان سے پیاسی چلی گئی

اُجالا کر دے جو ظلمت کدوں میں
اگر وہ زندگی کا راگ دے دے
مجھے بھی ذوقِ نظارہ ہے لیکن
مجھے اے جلوۂ طور آگ دے دے

اے جانِ صد حیات! مری زندگی کو دیکھ
تجھ سے بھی کوئی غم کی تلافی نہ ہو سکی
اک عمر دردِ ہجر سے تڑپا کیے، مگر
اک موت میرے واسطے کافی نہ ہو سکی

سوائے یک دلِ محروم و برباد
تری محفل سے کیا لے جا رہا ہوں
جو کچھ اے زندگی پایا تھا تجھ سے
وہ سب کچھ میں تجھے لوٹا رہا ہوں

لطیفہ جب کسی لفظ میں تین حرف برابر متحرک ہوتے ہیں تو بیچ کے حرف کو ساکن کر لیتے ہیں جیسے تسکین اوسط کہتے ہیں جیسے "ازل" ان رباعیوں میں — جگر

گھنٹی کیوں بار بار بجتی ہے

خواجہ احمد عباس

برس میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں۔ ہر برس میں باون ہفتے ہوتے ہیں ہر ہفتے میں سات دن ہوتے ہیں۔ پیر۔ منگل۔ بدھ۔ جمعرات۔ جمعہ۔ ہفتہ۔ اتوار۔

مگر میرے لئے سب دن برابر ہیں۔

کسی کا دن اذان اور نماز سے شروع ہوتا ہے کسی کا دن پوجا پاٹھ سے شروع ہوتا ہے۔ کوئی صبح سویرے سب سے پہلے سورج دیوتا کے درشن کرتا ہے۔ کوئی سویرے اُٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت کرتا ہے۔ کوئی اور کام کرنے سے پہلے جہ تج میں صبح کے "مارننگ" کے لیے جاتا ہے۔ کوئی گھر والی تلسی کے پودے کو نمسکار کرکے اُس میں پانی دیتی ہے۔ کسان منہ اندھیرے اُٹھ کر سب سے پہلے اپنے گائے، بیل، بھینسوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں پھر کاندھے پر ہل اُٹھا کر کھیتوں کی طرف چل دیتے ہیں۔ مگر میرا ہر دن کسی اور ڈھنگ سے ہی شروع ہوتا ہے۔

مجھے سوتے سے جگانے کے لیے الارم ٹائم پیس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے دروازے کی بجلی کی گھنٹی وہی کام دیتی ہے سوائے اس کے کہ یہ گھنٹی ٹائم پیس کے الارم سے دس گنا شور مچا سکتی ہے۔ ٹھیک سات بجے یہ گھنٹی بجنا شروع ہو جاتی ہے۔ سرکاری دفتر دس بجے صبح کھلتے ہیں۔ کالج نو بجے۔ سکول آٹھ بجے۔ لیکن میرے دروازے کی گھنٹی سات بجے سے مجھے یاد دلانا شروع کرتی ہے کہ ایک نیا دن شروع ہو گیا ہے اور میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آج کتنے اور کیسے کیسے "فلم زدہ" میرے پاس آئیں گے اور اپنی دکھ بھری داستان مجھے سنائیں گے اور فلم اسٹوڈیوز کے تیند دروازوں اور ان کی حفاظت کرنے والے چوکیداروں کی شکایت کریں گے، پھر امید کریں گے کہ کسی طلسمی "کھل سم سم" سے میں زندگی کے سب بند دروازوں کو اُن کے لیے کھول دوں گا۔

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

آج سوموار کا دن ہے۔ اتوار کی رات کو کسی فلم کا آخری شو دیکھا تھا، دیر میں سونا ہوا۔ دیر تک خواب میں فلم کے سین دکھائی دیتے رہے۔ ہیرو ہیروئن کے پیچھے گانا گاتا ہوا کشمیر کے شالیمار باغ میں دوڑتا رہا۔ ولین اپنی مونچھوں پر ہنس کر مجھے ڈراتا رہا۔ پھر آنکھ کھل گئی اور کئی گھنٹے تک میں سو نہیں سکا۔ اپنے فلم کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں فلم کیوں بناتا ہوں؟ ڈسٹری بیوٹر اُن کو خریدنے کے تیار نہیں ہیں۔ انھیں رنگین فلم چاہیے، سٹار چاہئیں۔ اور میری فلمیں کالی سفید ہوتی ہیں اُن میں "نئے چہرے" ہوتے ہیں۔ فلم دیکھنے والوں کی بڑی تعداد میری فلموں کو پسند نہیں کرتی۔ ان کو کمل کمار چاہیے، کپل کپور چاہیے اور ... چاہیے، ار ادھنا کماری چاہیے، چھم چھم ... چاہیے۔ ... کا میوزک چاہیے۔ جیمز بانڈ کی کہانی چاہیے۔ ... کے ڈانس چاہئیں۔ اور تو اور فلم کریٹک بھی میری فلمیں پسند نہیں کرتے۔ ان کو کلاکار چاہیے، ہر ... چاہیے، فرانس کا ... چاہیے، اٹلی کا ... چاہیے، جاپان کا ... چاہیے، ... کا ... چاہیے جب اور میرا نام صرف خواجہ احمد عباس ہے! جب کوئی بھی میری فلموں کو پسند نہیں کرتا پھر بھی یہ فلمیں میں کیوں بناتا ہوں؟ کیا صرف اس لیے کہ میں خود اُن کو پسند کرتا ہوں؟ ... یہی سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ اور ایسا محسوس ہوا کہ آنکھ لگی ہی تھی کہ کہیں آگ لگ گئی اور فائر بریگیڈ کا انجن [illegible]

میں ہڑبڑا کر اُٹھا تو معلوم ہوا کہ دروازے کی گھنٹی بج رہی ہے۔

"میں عباس صاحب سے ملنا چاہتا ہوں"

[illegible] کوئی نوکر نہیں ہے۔ دروازہ خود کھولنا پڑتا ہے۔ بغیر [illegible] کے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے ایک لمبا سا آدمی آؤٹ آف فوکس کھڑا ہوا ہے۔ اس آؤٹ آف فوکس آدمی نے کہا: "میں عباس صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا: "تو ملیے۔" اور اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

اُس نے شاید میرا مطلب نہیں سمجھا۔ برآمدے میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُس نے پوچھا: "صاحب اُٹھ گئے ہیں نا؟"

میں نے کہا: "اُٹھ گئے ہیں۔ مگر ابھی باتھ روم نہیں گئے۔"

اُس نے کہا: "کوئی حرج نہیں۔ تم اُن کو میرا کارڈ دے دو۔"

یہ کہہ کر اُس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا اور مجھے دیا۔ میں نے کارڈ کو پڑھنے کی کوشش کی مگر کارڈ پر جو چھپا ہوا تھا وہ بھی آؤٹ آف فوکس دکھائی دیا۔ میں اندر گیا اور عینک لگا کر کارڈ کو پڑھا۔ لال سبز نیلے پیلے رنگوں میں چھپا ہوا تھا:

ہردے کمار

نئے ایکٹر

۳ گھاسلیٹ واڑی۔ بمبئی نمبر ۱۷

اب میں عینک لگا کر واپس آیا تو دیکھا ایک پہلوان نما نوجوان پیلی سلک کا بشرٹ، نیلی ٹیری لین کی پتلون، لمبے لمبے نکیلے پیلے جوتے پہنے بیٹھا ہے۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کر کارڈ کو پھر سے پڑھتے ہوئے پوچھا:

"یہ پنج رنگی کارڈ کیوں چھپوایا ہے آپ نے؟"

جواب ملا: "اس لیے کہ میں ٹیکنی کلر ہیرو بننا چاہتا ہوں۔۔۔ مگر تمہیں اس سے کیا؟ تم صاحب کو کارڈ دو۔" اُس نے میری طرف اس طرح دیکھا گویا بدتمیز نوکر ہے جو برابر کی کرسی پر بیٹھ کر سوال جواب کرتا ہے۔ شاید فلم والوں کے نوکر ایسے ہی منہ چڑھے ہوتے ہیں!

میں نے کہا: "تھوڑی دیر کے لیے مجھے ہی عباس صاحب سمجھ لیجیے۔"

اُس نے تعجب سے مجھے دیکھا، میرے میلے کچیلے کرتے پاجامے کو دیکھا، میرے کرتے کے گریبان کو دیکھا جس پر سے بٹن اُکھڑ گئی تھی، اور کسی قدر بوکھلا کر بولا: "معاف کیجیے گا۔ میں آپ کو عباس صاحب کا آدمی سمجھا تھا۔"

میں نے کہا: "عباس صاحب کو بھی ایک آدمی ہی سمجھ لیجیے۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

نئے چہرے

"خدمت تو میں آپ کی کرنا چاہتا ہوں۔" اُس نے جیب سے تصویروں کا ایک پیکٹ نکالتے ہوئے کہا: "ذرا یہ تصویریں تو دیکھیے۔"

میں نے تصویروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا: "تصویریں تو میں نے دیکھیں مگر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"ایکٹنگ کرنا چاہتا ہوں۔" بڑا سادہ سا جملہ تھا۔

"ایکٹنگ کرنا چاہتے ہیں یا فلم سٹار بننا چاہتے ہیں؟"

"جی یہی سمجھ لیجیے کہ فلم سٹار بننا چاہتا ہوں۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ اپنی فلموں میں نئے چہروں کو لیتے ہیں۔" یہ جملہ بھی ہر روز میں کم سے کم چار بار سُنتا ہوں۔

"سُنا ہے؟" میں نے پوچھا "یا آپ جانتے ہیں؟"

"جی سُنا بھی ہے اور ایک اخبار میں بھی پڑھا تھا۔"

میں نے سوال کیا: "میری کوئی فلم دیکھی ہے؟"

"جی۔ آپ کی ــــــ فلم" اب وہ کسی قدر سوچ میں پڑ گئے۔

"جی۔ بات یہ ہے کہ میں اب تک ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا تھا وہاں فلمیں دیر میں پہنچتی ہیں۔"

"پھر بھی پہنچتی تو ہیں؟" میں نے مزا لیتے ہوئے جرح کی۔ "یا صرف میری فلمیں نہیں پہنچتیں؟"

"جی۔ ویسے تو میں نے آپ کی کئی فلمیں دیکھی ہیں" اُس نے خوبصورت سا جھوٹ بولتے ہوئے کہا: "مگر اس وقت نام نہیں یاد آ رہا۔"

"میری فلم 'ہم ہندوستانی' تو دیکھی ہوگی آپ نے؟"

"جی ہاں۔ خوب یاد آیا۔" اُس نے ایک اور جھوٹ بولتے ہوئے کہا: "واہ واہ۔ کیا عمدہ فلم تھی۔"

"اور میری ایک اور فلم 'لاکھوں میں ایک' بھی دیکھی ہوگی؟" میں نے ایک اور فلم کا نام لیتے ہوئے پوچھا

"جی ہاں۔ وہ بھی دیکھی ہے مگر بہت برس ہو گئے۔"

"مگر وہ تو میں نے پچھلے سال ہی بنائی ہے؟"

[illegible]

اب وہ بالکل ہی گڑبڑا گیا۔ "تبھی تو وہ کوئی اور فلم دیکھی ہوگی؟"
پھر میں نے پوچھا: "میری بوبے بائی ناٹ کے بارے میں کیا رائے ہے؟"
"یہ تو بہت بڑھیا فلم ہے صاحب۔ نام بھی بڑا خوبصورت ہے۔"
"اور آپ کا جھوٹ بھی خوبصورت ہے۔ میں نے ان میں سے کوئی فلم نہیں بنائی۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے آپ نے میری کوئی فلم نہیں دیکھی۔"
اور وہ شرمندہ ہو کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور مجھے آواز دے کر اُسے واپس بلانا پڑتا ہے۔ "آپ کچھ بھولے جا رہے ہیں۔" اور میں اُس کی تصویروں کا پیکٹ اُسے دے دیتا ہوں اور ایک ہٹ فلم ڈائرکٹر جو میرے پڑوس میں رہتے ہیں اُن کا پتہ بھی بتا دیتا ہوں۔

گرم چائے اور ٹھنڈی سانس

میں نے گرم گرم چائے کا ایک گھونٹ ہی پیا تھا کہ گھنٹی پھر ایک بار بجتی ہے۔ میں آواز دیتا ہوں۔ "دروازہ کھلا ہے۔ آجائیے۔" دروازہ کھلا رکھ کر میں بار بار اُٹھنے کی تکلیف سے بچ جاتا ہوں۔
یہ ایک خوش شکل نوجوان ہے۔ کپڑے بھی ڈھنگ کے پہنے ہوئے ہے۔ چیخ چیخ کر اعلان نہیں کرتے کہ "میں ٹیکنی کلر ہیرو ہوں۔"
"فرمائیے" میں کرسی پیش کرتے ہوئے کہتا ہوں۔
جواب ملتا ہے ایک ٹھنڈی سانس۔
میں پھر کہتا ہوں۔ "کہئے کیا کام ہے؟"
پھر ٹھنڈی سانس لے کر وہ نوجوان چل پڑتا ہے۔ "کیا بتائیں صاحب قسمت آزمائی کے لئے در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ہر روز کم سے کم آدھے درجن سٹوڈیوز کے چکر لگاتا ہوں۔ پچاس ساٹھ پروڈیوسروں ڈائرکٹروں سے مل چکا ہوں۔ سب کہتے ہیں تصویریں چھوڑ جائیے۔ پتہ لکھوا دیجئے ضرورت ہوگی تو بلا لیا جائے گا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ بہانہ ہے، دھوکا ہے...... سب اپنوں کو چانس دیتے ہیں ہمیں کوئی نہیں دیتا۔" اور پھر وہی ٹھنڈی سانس۔
میں نے پوچھا: "کیا بمبئی میں صرف آپ ہی فلموں میں چانس تلاش کر رہے ہیں؟"
نوجوان نے کہا: "ممکن ہے دس بیس اور بھی ہوں؟"
میں نے کہا: "آپ کا اندازہ غلط ہے۔ کم سے کم دو ہزار نوجوان۔ جو آپ کی طرح اچھی شکل وصورت کے ہیں، اچھے گھرانوں سے آئے ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ فلم سٹار بننے کے لیے بمبئی کے سٹوڈیوز کے چکر لگا رہے ہیں۔ [illegible] سے دو تین تو روز مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ بڑے پروڈیوسروں ڈائرکٹروں [illegible] تو روزانہ آٹھ دس آتے ہیں۔ ان سب میں سے صرف دو تین کو [illegible]"
اب نوجوان نے ٹھنڈی سانس لینے کے بجائے گرم [illegible]
"اچھا صاحب۔ آپ بھی چانس مت دیجئے۔ ہمارا بھی بھگوان [illegible]"
میں نے کہا: "بھگوان تو سب کا ہے اور کسی کا نہیں ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ نے کہاں تک پڑھا ہے؟"
جواب ملا: "بی۔ اے تک..... امتحان نہیں دیا۔"
میں نے کہا: "تو آپ پونہ فلم انسٹی ٹیوٹ میں نام لکھوائیے۔ [illegible] نام چھپنا چاہیں تو میں....."
بات کاٹ کر اُس نے کہا: "دلیپ کمار نے کس انسٹی ٹیوٹ میں [illegible] تھا؟ راج کپور کہاں کا گریجویٹ ہے؟ کیا دیو آنند کے پاس کوئی ڈپلومہ ہے؟"
میں نے کہا کہ اُن کے زمانے میں ایسے انسٹی ٹیوٹ نہیں تھے [illegible] کے دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند سب انسٹی ٹیوٹ سے آئے [illegible] اسٹیج سے۔
اسٹیج کے ذکر پر وہ بولا: "کالج کے ڈراموں میں میں نے بھی [illegible] جو دیکھتا تھا کہتا تھا بمبئی جاؤ۔ فوراً چانس مل جائے گا۔"
میں نے کہا: "بمبئی میں بہت سے ڈرامہ گروپ ہیں۔ [illegible] نیشنل تھیٹر ہے۔ تھیٹر گروپ ہے..."
"جی نہیں میں اسٹیج پر کام کرنا نہیں چاہتا۔ چلیے آپ چاہیں [illegible] سکتے ہیں۔ ہم نے تو سنا تھا آپ..."
میں نے جملہ پورا کر دیا: "نئے چہروں کو چانس [illegible]"
"جی ہاں" اُس نے کہا "مگر آپ بھی اوروں کی [illegible]"
میں نے سمجھایا کہ میں دو تین برس میں ایک فلم بناتا ہوں [illegible] مشکل ہے۔ دو تین ہزار نوجوان امیدواروں کے [illegible]
اُس نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "دو تین ہزار کی بات کون کرتا [illegible] میں تو اکیلا آپ سے چانس مانگ رہا ہوں۔"
اور غرض وہ بھی چلا گیا۔

فلمی کہانی لکھوالو!

ایک بار پھر گھنٹی بجی۔ یہ صاحب شکل سے ہیرو نہیں دکھائی دیتے تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ جوتا ٹوٹا ہوا۔ پتلون پر استری مہینوں سے نہیں ہوئی تھی۔ کہنے لگے: "سٹوری لکھتا ہوں۔ آپ کم سے کم سُن لیجیے۔۔۔"

میں نے کہا: "معاف کیجیے۔ میں خود سٹوری رائٹر ہوں اس لیے دوسروں کی کہانیاں نہیں سُنتا۔ ورنہ بعد میں غلط فہمی کا ڈر ہے۔ ممکن ہے کوئی الزام لگائے کہ میں نے اُس کا پلاٹ چُرا لیا ہے۔"

کہنے لگے: "ہاں یہ ڈر تو ہے۔"

میں نے کہا میں تو صرف ایک ساتھی اور دوست کی حیثیت سے مشورہ دے سکتا ہوں۔

کہنے لگے کہ بتایئے پھر کس کو سُناؤں؟

میں نے پوچھا کہ آپ کے کوئی ناول شائع ہوئے ہوں گے؟

جواب ملا نہیں صاحب میں تو فلمی کہانیاں لکھتا ہوں۔

میں نے پھر سوال کیا کہ کسی رسالے میں آپ کے افسانے تو چھپے ہوں گے۔

پھر جواب ملا کہ آپ ناول افسانوں کی کیا بات کر رہے ہیں۔ میں تو صرف فلمی کہانیاں لکھتا ہوں۔

میں نے کہا فلمی کہانیاں اکثر چھپے ہوئے ناولوں یا افسانوں سے لی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور گلشن نندہ کا نام لیا۔

وہ سمجھے میں ان کا امتحان لے رہا ہوں۔ بولے: "صاحب میں تو ناول وغیرہ پڑھتا ہی نہیں۔ بس فلمی کہانیاں لکھتا ہوں۔"

"فلم تو دیکھتے ہوں گے آپ؟"

"وہ بھی بہت کم۔" انھوں نے جواب دیا۔ تین برس ہوئے ایک فلم دیکھا تھا۔ دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا اس سے اچھی کہانی تو میں خود لکھ سکتا ہوں۔ جب سے بس کہانیاں لکھتا ہوں۔ کم سے کم پچیس کہانیاں لکھی ہیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے اپنا پلندہ نکالا۔ وہ دو دو تین تین صفحوں پر کہانیاں لکھی ہوئی تھیں۔

"کس قسم کی کہانیاں لکھتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

میں نے کہا تاکہ فلمی کہانیاں لکھتا ہوں۔"

"فلمی کہانیاں بھی تو کئی قسم کی ہوتی ہیں۔۔۔" میں نے کہا۔

"میں ہر قسم کی فلمی کہانی لکھتا ہوں۔ سوشل۔ مائتھولوجیکل۔ ہسٹوریکل۔ جاسوسی۔ ایکشن تھرلر۔ آپ کیسی کہانیاں بناتے ہیں؟"

"آپ کو تو معلوم ہوگا" میں نے کہا: "میں جیسی کہانیاں لکھتا ہوں ویسی ہی بناتا ہوں۔"

"بات یہ ہے کہ میں فلمیں کم ہی دیکھتا ہوں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ اس طرف کوئی اور بھی پروڈیوسر رہتا ہے؟"

میں نے جلدی سے اُن کو تین چار پروڈیوسرز کے نام بتا دیے جو جوہو ہی میں رہتے ہیں۔

اور وہ اپنا پلندہ بغل میں دبا کر چل دیے اور اگرچہ وہ خاموشی سے چلے جا رہے تھے مگر میرے کانوں میں آواز گونج رہی تھی۔ "فلمی کہانی لکھوالو!"

گھنٹی بار بار بجتی ہے!

گھنٹی پھر بجتی ہے۔

"میں میوزک ڈائرکٹر بننا چاہتا ہوں۔ آپ ایک بار چانس دے کر دیکھئے تو۔۔۔"

"آپ نے کس میوزک کالج میں تعلیم پائی ہے؟"

"ارے صاحب سنگیت کا اور کالج کا کیا تعلق؟"

"تو پھر کس اُستاد سے سنگیت کو سیکھا ہے؟"

"جی کوئی اُستاد نہیں۔ میں تو پیدائشی سنگیت کار ہوں۔ ایک دن میں دس دس دُھنیں تیار کر لیتا ہوں۔"

"باجہ کون سا بجاتے ہیں آپ؟"

"گراموفون۔"

پھر گھنٹی بجتی ہے۔

"میں فلموں کے لیے گیت لکھنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کی نظمیں کہاں شائع ہوئی ہیں؟"

"کہیں نہیں۔ میں تو فلمی گیت لکھتا ہوں۔"

"آپ نے شاعری پڑھی تو ہوگی۔"

"جی ہاں۔"

"بچن کی کویتا کے بارے میں کیا خیال ہے؟" (بقیہ صفحہ ۳۵ پر)

رفاہ عام کلب لکھنؤ میں ۱۱ رنومبر ۱۹۶۲ء کو جشن میلا رام وفا منایا گیا۔ تصویر میں گورنر ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں

حاجی وارث علی شاہؒ کے عرس کے موقع پر گورنر اتر پردیش دیوی میں حاجی صاحب کے مزار پر

جشن وفا کے موقع پر انجمن آرزو، لکھنؤ کی جانب سے میلا رام صاحب وفا کو سکریٹری انجمن تحفہ پیش کر رہے ہیں

نر پردیش ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو سنٹرل اسپورٹس سٹیڈیم لکھنؤ میں
پا آر کے بگڑ میموریل باسکٹ بال کا افتتاح کرتے ہوئے

اُنیسویں اولمپک کھیل ۱۹۶۸ء کے موقع پر ہندستان کے
محکمۂ ڈاک کی جانب سے جو خصوصی ٹکٹ جاری کیے گئے تھے
اُن میں ایک روپے کا ٹکٹ بھی تھا

یوم اطفال کے موقع پر ۱۴ر نومبر ۱۹۶۰ء کو سنٹرل سٹیڈیم میں بچوں کی
ایک عظیم الشان ریلی ہوئی تصویر میں شری سی۔ بی۔ گپتا غبارے اڑا کر
ریلی کا افتتاح کر رہے ہیں

محکمۂ سماجی فلاح کی جانب سے لال باغ گرلس انٹر کالج میں "نیو کے تھرو" نامی ڈراما اسٹیج کیا گیا۔ گورنر (دائیں) ڈراما دیکھ رہے ہیں۔ (بائیں) ڈرامے کا ایک منظر

مادام کیوری وہ نامور خاتون ہیں جنھوں نے ریڈیم کی دریافت کی
اور جنھیں دو بار نوبل انعام ملا۔ یہ یادگار ٹکٹ انھیں کے اعزاز
میں محکمۂ ڈاک نے شایع کیا

بنارس کی نرملا دیوی (اڑن) جو ٹھمری گانے کے لیے مشہور ہیں پریس کلب لکھنؤ میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی ہیں

وزیر داخلہ حکومت ہند شری وائی ۔ بی ۔ چوہان ۳۰ ر اکتوبر کو دھان بھون لکھنؤ کے تلک ہال میں یو ۔ پی ۔ کے ممبران پارلیمنٹ کی مشاورتی کمیٹی کو خطاب کرتے ہوئے

لال بارہ دری لکھنؤ میں ۲۵ ر اکتوبر کو ایٹمک انرجی نمائش کا افتتاح کرنے کے بعد گورنر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی تھمبو راکٹ اسٹیشن میں بنے تیار کیے ہوئے رُدھنی راکٹ کا ماڈل دیکھ رہے ہیں

یو ۔ پی ۔ کونسل برائے فلاح اطفال کے رفیل کی ۱۳ر نومبر ۱۹۶۱ء کو گورنمنٹ ہاؤس میں قرعہ اندازی ۔ پہلا انعام : ایک اسٹینڈرڈ ہرالڈ کار ۔ دوسرا انعام : ایک ریفریجریٹر ۔ تیسرا انعام : ایک ریڈیو گرام ۔ اس کے علاوہ اکیاون اور انعامات بھی دیے گئے ۔

حقائق و معارف

افقر موہانی

تو جو انسان ہے اوصافِ بشر پیدا کر
ذرۂ خاک سے خوشِ آب گہر پیدا کر

دل کے داغوں سے شبِ غم میں سحر پیدا کر
وقت وہ آیا ہے خود شمس و قمر پیدا کر

ہر طرف جلوۂ جاناں نظر آئے تجھ کو
اپنی ہستی کو مٹا کر وہ نظر پیدا کر

منتِ غیر سے کیوں لعل و گہر کی ہو طلب
چشمِ خوں بار سے خود لعل و گہر پیدا کر

تجھ کو بھی یار کا جلوہ نظر آئے گا ضرور
پہلے موسیٰ کی طرح ذوقِ نظر پیدا کر

نا مکمل ہے ترے حسن کی تصویر ابھی
ہر ادا میں کششِ جذب و اثر پیدا کر

حسرتِ سجدۂ بے آستاں گر ہے دل میں
نقش سے سجدوں کے خود یار کا در پیدا کر

صرف پھولوں سے نہیں ہوتی گلستاں کی بہار
بات تو جب ہے کہ ہر گل میں ثمر پیدا کر

ہم نے مانا نہیں گنجائشِ دشمن دل میں
وسعتِ قلب سے اخلاقِ بشر پیدا کر

پاک بازانِ محبت کی یہی ہے تعلیم
حسنِ جاناں کے لیے حسنِ نظر پیدا کر

ہے بری قیدِ تعین سے درِ یار، افقرؔ
لائقِ سجدۂ بے آستاں سر پیدا کر

غزل

سیفؔ بجنوری

ملا نہ دیر و حرم میں کہیں نشاں ان کا
حدِ نگاہ سے باہر ہے آستاں ان کا

خبر تو لیجیے اپنے ستم کے ماروں کی
مٹا نہ دے غمِ دنیا کہیں نشاں ان کا

کیے ہیں راہِ وفا میں وہیں وہیں سجدے
ملا ہے نقشِ کفِ پا جہاں جہاں ان کا

بسے ہوئے ہیں وہ ایسے مری نگاہوں میں
کبھی کبھی مجھے خود پر ہوا گماں ان کا

تمہارے درد نے بخشیں جو لذتیں دل کو
ادائے شکر کرے کس طرح زباں ان کا

گزر رہی ہیں یونہی انتظار کی گھڑیاں
جہاں ہوئی کوئی آہٹ ہوا گماں ان کا

ہٹے نہ راہِ وفا سے وفا کے دیوانے
ہزار بار لیا تم نے امتحاں ان کا

جنھوں نے جوشِ وفا میں بگاڑ لی ہستی
زمانہ آج بھی لیتا ہے امتحاں ان کا

ہزار دیر و حرم سدِ راہ ہوئے لے سیفؔ
تلاش کر ہی لیا دل نے آستاں ان کا

غیب داں

احمد جمال پاشا

غیب کا حال خدا جانے مگر ہم ان کے بارے میں اتنا ضرور جانتے ہیں کہ علم غیب، رمل، جفر، نجوم، ہیئت، قیافہ، مخطوطہ شناسی، نقشہ نویسی، آثار قدیمہ اور سراغرسی پر بے تحاشہ کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی انھوں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے اور انھیں باقاعدہ علم کے طور پر سیکھا بھی ہے بس یوں سمجھ لیجیے کہ ان کے پاس "میجک پروفیسر" تک کی ڈگری موجود ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ اپنی ساری ڈگریاں طاق پر رکھے، کوئی کام دھام کرنے کے بجائے کمرہ بند کیے کھچڑی پکاتے اور کیمیا بناتے رہتے ہیں۔ بقیہ وقت خفیہ دفینے تلاش کرتے، خزانوں کے نقشے بناتے اور ان پر غور کرتے رہتے ہیں۔

غیب داں صاحب باپ دادا کی بنائی ہوئی جائیداد کا کرایہ کھاتے اور تن تنہا اپنی کمرہ نما حویلی میں رہتے ہیں۔ آپ بھی کہیں گے کہ "بھلا یہ کمرہ نما حویلی کس کو کہتے ہیں؟" تو میں عرض کروں گا کہ "بندہ پرور! کمرہ نما حویلی، اس حویلی کو کہتے ہیں جس کو خزانے کی تلاش میں رفتہ رفتہ کھدوا لیا گیا ہو اور جس میں بعد میں سوائے کمرے اور اس کے احاطے کے کچھ نہ رہ گیا ہو۔" تو جناب من اس میں قبلہ غیب داں صاحب قلعہ بند رہتے ہیں اور کسی سے ملنا جلنا اس لیے پسند نہیں کرتے کہ بات چیت کے دوران ان کے منھ سے کہیں کوئی راز کی بات نہ نکل جائے اور نتیجے کے طور پر کوئی خزانہ ان کے بجائے کسی اور کو نہ مل جائے۔ کسی کی آمد و رفت بھی یہ اس لیے پسند نہیں کرتے کہ کوئی استاد ان کا کوئی نقشہ یا نسخہ نہ اڑا لے جائے ـــ غرض بے شمار خزانوں کے حاصل ہو جانے اور کیمیا بنا لینے کی موہوم امید کے باعث ہمیشہ ان کی جان پتے پر رہتی ہے اور یہ کبھی کسی حال میں بھی کسی دوسرے کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتے اور نہ کسی کو کبھی اپنا کوئی ہوا دیتے ہیں۔

یہ خاکسار دنیا میں ان کا واحد دوست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے نہ ان کے کیمیا کے نسخوں میں کوئی دلچسپی ہے اور نہ ان کے خزانوں کے نقشوں سے۔ نہ میں انھیں کبھی سمجھاتا یا ہفت کرتا ہوں اور نہ کبھی ان کی کوئی بات کاٹتا ہوں۔ اور نہ کبھی ان کی کوئی بات کبھی کسی کو بتاتا ہوں۔ اسی وجہ سے یہ مجھے اپنی ہر راز کی بات بتا دیتے ہیں۔ مثلاً ان کا کوئی پڑوسی یہ معمہ نہیں حل کر سکتا کہ ان کے کمرے میں لوبان اور اگر اتنی بڑی تعداد میں کیوں رکھی رہتی ہے۔ کہ دیکھنے میں ان کا کمرہ کسی لوبان، اگربتی مینوفیکچرنگ کمپنی کا شو روم معلوم ہوتا ہے۔ ان کے حویلی نما احاطے میں سیکڑوں سفید مرغ کیوں پلے ہوئے ہیں؟ جن کی بانگوں سے اس حویلی پر پولٹری فارم کا دھوکا ہوتا ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ہر عمل کے دوران یہ لوبان اور اگر سلگاتے ہیں اور خزانے کا پتہ معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ سفید مرغ چھوڑا جاتا ہے اور اگر وہ خزانے کی جانب یا خزانے کے اوپر جا کر بانگ نہ دے تو پھر مجبوراً انھیں اپنے پیٹ میں اسے بانگ دلوانا پڑتی ہے۔

اکثر غیب داں صاحب بغل میں چٹائی اور مرغ دبائے، پوٹلی لیے جھولا لٹکائے شہر کے غیر آباد، ویران اور سنسان حصوں، تاریخی عمارتوں یا ان کے کھنڈرات کی جانب جاتے، ان کے گرد چکر کاٹتے یا دھونی رمائے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد چراغ جلے گھر آ کر کسی نہ کسی عمل کے سلسلے میں چلہ کشی شروع کر دیتے ہیں۔ جس کے لیے غیب داں صاحب اپنے گرد ایک حصار بناتے ہیں جس کے چاروں طرف آگ سلگاتے ہیں اور اس کے اندر یہ اپنا جھولا اور ڈنڈا لے کر چٹائی پر بیٹھ کر لمبی لمبی دعائیں اور

وظیفے پڑھتے ہیں جنتر منتر پڑھتے ہیں۔ بیچ بیچ میں آگ پر لوبان اور دوسری خوشبوئیں چھڑکتے رہتے ہیں۔ کبھی پڑھتے پڑھتے اس امید میں سو جاتے ہیں کہ شاید وہ جگہ نظر آ جائے جہاں خزانہ دفن ہو کبھی خزانے کے نقشے پر ہاتھ رکھ کر سو جاتے ہیں اور سوتے سے اٹھتے ہی دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاتھ کا انگوٹھا کس جگہ پر تھا۔ اس مقام پر نشان بنا دیتے ہیں اور پھر ہاتھ منہ دھو ناشتہ کر اس جگہ کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔

غرض وہ ان صاحب مجھ سے ملتے ہی رسمی سلام دعا کے بعد شروع ہو جاتے ہیں۔

"لال کھٹور کو جانتے ہو ؟"

"نہیں۔ !"

"ارے بھئی! تعجب ہے کہ تم لال کھٹور تک کو نہیں جانتے جس کے بارے میں مشہور ہے ؎

اونچے نیچے لال کھٹور
جس میں گڑے چھپن کروڑ"

پھر خود ہی بولے ــــ "یہ کالے پہاڑوں کا شمالی مشرقی حصہ ہے جہاں لوکوکا جھونپولا کرتا ہے۔ اس علاقے میں دنیا کا یہ عظیم ترین خزانہ کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا ہے۔ دو ہزار اژدگر زبانیں نکالے اس خزانے کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اب یہ مایا ملنی آسان تھوڑی ہے لیکن اگر اس سارے علاقے کو کھدوا دیا جائے تو میں ایسا عمل پڑھ سکتا ہوں کہ یہ سب اژدگر اپنی اپنی جگہ بندھ جائیں گے اور سنکھوں کا خزانہ باآسانی نکال لیا جائے گا۔"

"سنکھوں کا ؟"

"بھئی ان کروڑوں کا تو سیکڑوں برس پہلے تھا جب یہاں رانی لال کھٹور کی حکومت تھی اب تو یہ اربوں کی حد پار کر کے سنکھوں سے بھی زیادہ کا ہو گیا۔ میں چھیانوے بار خواب میں یہ خزانہ دیکھ چکا ہوں مجھے اس کی ایک ایک تفصیل زبانی یاد ہے۔"

عرض کیا ــــ "مگر اس کو نکالا کیسے جا سکتا ہے ؟"

بولے ــــ "بس یہی مجبوری تو میرے بھی پاؤں پکڑ لیتی ہے۔" اس کے بعد میرے کان میں اپنا منہ ڈالتے ہوئے انتہائی رازداری کے ساتھ سرگوشی کرتے ہوئے بولے "یہ جو حضرت گنج کی سڑک اور اس کے دونوں طرف کی عمارتیں ہیں اور یہ جو امین آباد کا چوراہا ہے، ان دونوں جگہوں پر انگریزوں سے چھپانے کے لیے شاہی خزانہ اودھ کے سپر خزانہ نے دفن کروا دیا تھا۔ یہ خزانہ اونٹوں اور ہاتھیوں پر لدوا کر چھتر منزل کے سامنے گومتی کے نیچے آب دوز تہ خانوں سے منتقل کیا گیا تھا۔ پورے دس سال تک دن رات شاہی فوج کی نگرانی میں یہ خزانہ منتقل ہوتا رہا تھا۔ اسی میں وہ جڑاؤ زمرد کا تخت سلیمانی بھی دفن ہے جسے پریاں لے کر اڑتی تھیں بادشاہ سلامت نے سلطنت دیدی مگر انگریز سے تخت سلیمانی کو مس تک کروانا گوارا نہ کیا۔ اور خود اپنے دست مبارک سے اس خزانے کی کنجیاں حسین آباد کے تالاب میں پھینک دیں۔ انگریز سر پٹک کر رہ گئے بڑے بڑے تیراک تالاب میں اتارے مگر کنجیاں پھر نہ کسی کے ہاتھ لگیں۔"

عرض کیا۔ "آپ اسے نکال کر اپنے مصرف میں کیوں نہیں لے آتے ؟"

بولے ــــ "اول تو پورا حضرت گنج اور امین آباد کھودنے کون دیگا۔ پھر اگر کھود بھی لیا تو خزانہ گورنمنٹ کا ہو جائے گا۔"

"حکومت کا حق تو ضروری ہے !"

"مگر میں تو اپنی تہذیب و محنت میں دنیا میں کسی کے بھی حق کا قائل نہیں۔"

میں نے کہا۔ "اور بھی تو خزانے ہیں ؟"

یہ سن کر انھوں نے صندوق کا تالا کھولا اور اس میں سے بوسیدہ نقشوں کے بنڈل نکال کر میرے سامنے پھیلاتے ہوئے بولے "پچھلے زمانے میں ہر خزانے کے اوپر ایک عبادت گاہ بنا دی جاتی تھی۔ جتنا بڑا خزانہ ہوتا تھا اتنی ہی عظیم عمارت اس پر تعمیر کروائی جاتی۔ چنانچہ اس طرح کی ایک بھی عمارت ایسی نہیں جس کے نیچے اس کے بنوانے والے کا بیش بہا خزانہ دفن ہو۔"

خزانوں کے بارے میں ان کا یہ نظریہ سن کر میں سکتے میں آ گیا اور یقین نہ کرتے ہوئے پوچھا:

"آپ کا مطلب روحانی خزانوں سے ہے ؟"

زور دیتے ہوئے بولے:

"نہیں ! جواہرات اور سونے چاندی کے خزانوں سے۔"

پھر کہنے لگے ــــ "بھئی کیا بتاؤں، ہر بار کیمیا بنانے میں بس ایک

آپ کی کمر ہو جاتی ہے۔ ایک بار بھی اگر آرزو پوری ہوگئی تو سونا بن جائے گا جس سے میں شہر بھر کی تمام ایسی پرانی عمارتیں اور کھنڈر خرید لوں گا جن کو کھدوا کر راتوں رات خزانے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً وکٹوریہ پارک کے سامنے چوک میں نابے کے پاس جو زمین خالی پڑی ہے آج بھی کوڑیوں کے مول مل سکتی ہے۔ اسی میں سے آصف الدولہ والی بھول بھلیاں کی سرنگ گزرتی ہے جس میں اعتماد الدولہ کا خزانہ دفن ہے۔ یہ دیکھیے اس کا نقشہ۔ کب سے یہ خزانہ میرا منتظر ہے۔" اس کے بعد ٹھنڈی سانس بھر کر بولے:
"اگر چوک کی سڑک کی مرمت کا مجھے صرف ٹھیکہ مل جائے تو میں اسے کھدوا کر ہمارا راجا نیا گاؤں کا خزانہ نکلوا سکتا ہوں۔"

عرض کیا۔ "سچ ہے! اگر آپ کا بس چلے تو پورا لکھنؤ کھدوا ڈالیں اور پھر شہر اور آپ کی حویلی کا ایک سا نقشہ ہو جائے۔"

آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولے:
"میاں کیا کہہ رہے ہو ۔۔۔؟ ایک خزانہ بھی ہاتھ لگ گیا تو سارا شہر بالکل جدید طرز پر ایسا شاندار بنوا دوں گا کہ پیرس اور نیویارک اس کے آگے شرما جائیں گے۔ اور یہ حویلی تو ہفت عجائبات عالم میں شمار ہوگی! ہفت عجائبات عالم میں!!"

غیب داں صاحب جب بھی کسی پرانی عمارت کے نیلام کے بارے میں سنتے تو کلیجہ تھام کر رہ جاتے اور ہمیشہ کوشش کرتے کہ نیلام رک جائے یا بولی ان کے نام پر چھوٹ جائے۔ مگر ایک حد کے آگے بے چارے بولی بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ پھر بھی وہ کئی پرانے مکان خرید کر کھدوا چکے تھے مگر ہر بار ناکامی کی صورت میں بتاتے کہ "میاں دولت تو چلتی پھرتی مایا ہے۔ میرے علم کے مطابق تھی اور ٹھیک اسی مکان میں، جب میں نے عمل شروع کیا تو میرے حصار کے گرد دبلے آکر بیٹھ گئے جو بڑھتے بڑھتے شیر ببر ہو گئے اور رات بھر دہاڑنے کے بعد صبح صبح سیاہ سانپ بن کر لوٹنے لگے اور لوٹتے لوٹتے چونٹیوں کی شکل میں اصلیت میں آکر میرے قدموں پر لوٹنے کے بعد پری کی شکل میں اٹھ کھڑی ہوئیں اور مجھے اپنے ساتھ لے جا کر خزانے کی سیر کرائی۔ پورے پورے تہ خانے اشرفیوں اور جواہرات کی دیگوں سے بھرے جگمگا رہے تھے۔ ہر دیگ پر ایک بار سیاہ بیٹھا دولت کے نشے میں جھوم رہا تھا۔ اور تو اور خود میرے پائیں باغ والے کنوئیں میں مایا ہے مگر وہ بہلوٹھی کا لڑکا۔ شتر مرغ کا انڈا اور ایک درجن بارہ سنگھے مانگتی ہے۔ سر شام کھن کھن کی آوازیں شروع ہو جاتی ہیں اور چھن چھن کرتی مایا اولاد مانگنے آتی ہے۔ وہ تو کہیے شادی بیاہ نہیں کیا ورنہ کیا معلوم لالچ آ جاتی۔"

اس کے بعد خاموش اور اداس ہو گئے اور خزانوں کے نقشے دکھانے لگے۔ شاید ہی کوئی ایسا راجا، نواب یا بادشاہ گذرا ہو جس کے خزانے کا نقشہ ان کے پاس نہ ہو۔

ایک دن جو میں غیب داں صاحب کے پاس پہنچا تو حویلی نما کمرے کے بجائے پھونس کا چھپر پڑا ہوا تھا۔ خزانے کی تلاش میں کمرہ کنوئیں میں تبدیل ہو چکا تھا اور وہ حویلی کی چہار دیواری کھدوا کر آخری بار مقدر آزمانے کی ضروری تیاریوں میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے
"بھئی غضب ہو گیا۔ جس کوٹھی میں تم رہتے ہو اس کے نیچے شجاع الدولہ لکھنوی کا اتنا زبردست خزانہ دفن ہے اور تم تنگ دستی میں زندگی گزار رہے ہو؟"

میں نے اطمینان سے جواب دیا: "مجھے خزانہ نہیں دال روٹی چاہیے جو مل جاتی ہے۔ اور کوئی ہوس نہیں۔" انھوں نے لاکھ لاکھ سمجھایا، پوچھا: "کتنے میں بیچو گے؟" مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا اور سر پر پیر رکھ کر بھاگا کہ کہیں یہ میرا مکان بھی نہ کھدوا دیں۔ غیب داں صاحب اب بھی ملتے اور مکان کھدوانے پر زور دیتے ہیں۔ مگر اب وہ اتنے ٹوٹ چکے ہیں کہ اپنی جائداد اور خیالی خزانوں کے بلیے بیچ بیچ کر کمیا بناتے اور خزانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔

★

غزل

غلام مرتضیٰ راہی

بقیدِ ہوش ہوں، لیکن کہاں ہوں
کہ تا حدِّ یقیں وہم و گماں ہوں

عبث ہے حاشیہ آرائی مجھ پر
بجائے خود مکمل داستاں ہوں

بروئے کار ہیں غم کے عناصر
وہ پانی ہوں کہ [illegible] رواں ہوں

مری تصویر کا اک اور رُخ ہے
کہ میں قطرہ ہوں لیکن بے کراں ہوں

مجھے کیا واسطہ شیشہ گری سے
میں اپنی ہی طبیعت پر گراں ہوں

مری وسعت کا اندازہ بھی کیا ہو
وہ چرچا ہوں کہ اپنے درمیاں ہوں

کہاں جا کر میں اپنا سر چھپاتا
غنیمت ہے، مکاں تا لامکاں ہوں

عبث راہیؔ بھٹکتے پھر رہے ہو
مجھے دیکھو! غبارِ کارواں ہوں

غزل

سید ابراہیم خلیل

راس مجھ کو آگئیں تنہائیاں ۔۔۔ دیکھ کر تیری حجاب آرائیاں
آج تک سمجھا نہیں کوئی تجھے ۔۔۔ لاکھ سب نے کیں خیال آرائیاں
تو ہی تو ہے دل میں، تیری یاد ہے ۔۔۔ میں ہی بس ہوں اور مری تنہائیاں
شامِ فرقت ہی ست کچھ بڑھنے لگیں ۔۔۔ اس دلِ مضطر کی وحشت زائیاں
ہیں دلیلِ کامرانی عشق میں ۔۔۔ پے بہ پے عشاق کی پسپائیاں
بن گئیں وجہ مباہات و شہرت ۔۔۔ عاشقی میں سب مری رسوائیاں
حسنِ فطرت فصلِ گل میں ہر طرف ۔۔۔ لے رہا ہے ناز سے انگڑائیاں
کھول کر دیکھے ذرا آنکھیں کوئی ۔۔۔ فصلِ گل میں باغ کی رعنائیاں
زرشِ گل پر اک بتِ طناز کی ۔۔۔ دیدنی ہیں انجمن آرائیاں
عشق ہی کو خود حجاب آنے لگا ۔۔۔ دیکھ کر اس شوخ کی رعنائیاں
کشش بہت پر ایک آدم زاد کی ۔۔۔ چل رہی ہیں آج کل دارائیاں
بڑھ گیا میرا تجسس اور بھی ۔۔۔ دیکھ کر تیری حجاب آرائیاں
تیرے لہجے میں ہیں وہ شیرینیاں ۔۔۔ جیسے بجتی ہوں کہیں شہنائیاں
عشق کی دنیا میں لاکھوں وسعتیں ۔۔۔ عشق میں لا انتہا گہرائیاں
مجھ کو آئینے میں فطرت کے خلیل ۔۔۔ حسن کی آئیں نظر پرچھائیاں

آپ کے اشعار میں ہم نے خلیلؔ
خوب پائیں فکر کی گہرائیاں

"ٹرین سے سفر کرنے کے لئے لوگ ٹکٹ خریدنا
فضول سمجھتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ قومی حکومت میں پیسے
خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ۔ کیا یہ آج کشور کا وہی بہار
ہے جس کو میں نے جانا اور جہاں میں رہ چکا ہوں .....؟"

ـــــــــ مہاتما گاندھی

اپنے ماضی کو نہ بھولئے ـــــ اس کی روایات کو باقی رکھئے

نارتھ ایسٹرن ریلوے گورکھپور

بکرم پال اشک

پنڈت رتن ناتھ سرشار اردو کے ایک صاحب طرز ادیب، اعلیٰ درجے کے شاعر، بے مثل مترجم اور بلند پایہ صحافی تھے۔ ان کے شہرۂ آفاق ناول فسانۂ آزاد کا شمار اردو کے اعلیٰ ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔

سرشار کی زندگی کا بیشتر حصہ عدم توجہی کا شکار رہا ہے۔ ان کے کارناموں پر گردشِ دوراں کی گرد اٹی ہوئی ہے اور اس کی تہیں در تہہ جمتی جا رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سرشار پر کام کرنے والے پنڈت بشن نارائن در اور پنڈت برج نارائن چکبست کے مقالات ہی پر اکتفا کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اس سے آگے بڑھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اور اگر کوئی کوشش کی بھی گئی تو اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔

یوں تو سرشار کی پوری زندگی پردۂ خفا میں رہی ہے، مگر حیدرآباد روانہ ہونے سے قبل کے عہد اور کامنی، کڑم دھم، طوفان بے تمیزی، بچھڑی ہوئی دلہن وغیرہ ناولوں کے زمانۂ تصنیف پر اب تک کوئی نمایاں روشنی نہیں پڑی۔ خصوصاً خمکدۂ سرشار والا دور تو کھل کر سامنے آیا ہی نہیں۔

ابھی حال ہی میں مجھے سرشار کی ادارت میں شائع ہونے والے اس پندرہ روزہ رسالہ خمکدۂ سرشار کا پہلا شمارہ دستیاب ہوا ہے جس کی پشت پر ستمبر ۱۸۹۴ء درج ہے۔ اس کے مطالعے سے سرشار کی ادبی زندگی کے تیسرے دور پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

یہ رسالہ $\frac{20 \times 30}{16}$ کے سائز پر ہے۔ جو کل ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سرورق اور پشت زرد رنگ کے ہیں۔ اور چاروں طرف سیاہ رنگ کا خوش نما بارڈر لگا ہے۔ سرورق کی عبارت اردو میں ہے اور پشت کی انگریزی میں۔

سرورق کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خمکدۂ سرشار جوبلی پرنٹنگ ورکس نظیرآباد لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ مطبع کے مہتمم اور مالک ڈاکٹر سی۔ سی گھوش تھے۔

اس رسالے میں سرشار کے ہلکے ناول شائع ہوتے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے تمام ناول مثلاً طوفان بے تمیزی، کڑم دھم، بچھڑی ہوئی دلہن اور پی کہاں وغیرہ اس رسالے کی زینت ہوئے۔ جنھیں بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

خمکدۂ سرشار کی اشاعت کا یہ سلسلہ سرشار کے حیدرآباد روانہ ہونے سے قبل ۱۸۹۵ء تک برقرار رہا۔ بعد ازاں منقطع ہو گیا۔

سرورق کی عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

کڑم دھم

ناول

جو

خمکدۂ سرشار

نامی میگزین کا پہلا درجہ ہے۔

مصنفہ پنڈت۔ رتن ناتھ سرشار لکھنوی۔

(مصنف) ۱۔ فسانۂ آزاد، ۲۔ جام سرشار، ۳۔ سیر کہسار، ۴۔ فسانۂ جدید، ۵۔ کامنی، ۶۔ ھشو، ۷۔ شمس الضحیٰ، ۸۔ مثنوی تحفۂ سرشار، ۹۔ شاخ نبات (مترجم)، ۱۰۔ الف لیلیٰ، ۱۱۔ خدائی فوجدار، ۱۲۔ اعمال نامۂ روس، ۱۳۔ مراسلات ڈفرینا، ۱۴۔ تاریخ ھند، (ہنٹر صاحب)

اس کے سرورق پر ایک جز معروف شاعر پنڈت نرنجن ناتھ صاحب حسّاق دہلوی کا مندرجہ ذیل قطعہ بھی درج ہے :

" اخلاق وادب سے پُر ہے مضموں تیرا
ہو کیوں نہ ہر اہل ہند مفتوں تیرا
تو کان جواہر سخن ہے لاریب
ہے نام رتن ناتھ بھی موزوں تیرا

(از پنڈت نرنجن ناتھ صاحب حسّاق دہلوی)

جوبلی پرنٹنگ ورکس میں باہتمام ڈاکٹر سی ۔ سی ۔ گھوش نظیر آباد لکھنؤ میں طبع ہوا ۔"

سرورق پر دو نوٹ بھی دیے گئے ہیں ۔ ایک نوٹ بارڈر کے نیچے اور دوسرا اندر کی طرف دائیں جانب ہے ۔ نیچے کے نوٹ میں لکھا ہے :

" کل حقوق محفوظ بحق جوبلی پرنٹنگ ورکس ہیں ۔ کوئی صاحب چھپوانے کا قصد نہ کریں ۔"

داہیں ہاتھ کے نوٹ کی عبارت مندرجۂ ذیل ہے :

" جو صاحب ہمکدۂ سرشار کے خریدار نہیں ہیں ان سے فی جلد قیمت آٹھ آنے ۔ محصول ایک آنہ ۔"

سرورق پر سرشار کی جن تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے ان میں نمبر ۲ پر ایک تصنیف فسانۂ جدید بھی ہے جس سے مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے کہ آیا یہ سرشار کا کوئی نیا ناول تھا یا ان کے کسی ناول کا دوسرا نام ! بات دراصل یہ ہے کہ اس زمانے میں ایک ناول کے دو دو نام رکھے جانے کا چلن تھا ۔ مثلاً فسانۂ آزاد کا نام پہلے ناول آزاد فرخ نہاد اور سیر کہسار کا نام فسانۂ لطیف تھا ۔ اسی طرح اودھ اخبار میں فسانۂ جدید کے زیر عنوان ایک اور ناول بالاقساط شائع ہوتا رہا جو بعد ازاں جام سرشار کے نام سے مطبع نول کشور ہی سے شائع ہوا ۔ لہذا فسانۂ جدید کو سرشار کی کوئی جدا گانہ تصنیف تصور نہیں کرنا چاہیے ۔ بلکہ یہ جام سرشار ہی کا دوسرا نام تھا ۔

اب پشت کی انگریزی عبارت کا ترجمہ پیش خدمت ہے ۔

جلد ۱ شمارہ ۔ ۱

کرام دھم

یعنی

بیٹ آن دی ڈرم

ناولوں کے سیریز کا پہلا شمارہ ۔

موسوم بہ

ہمکدۂ سرشار

از

پنڈت رتن ناتھ

سابق مدیر اعلیٰ روزنامہ اودھ اخبار مصنف فسانۂ آزاد ۔ جام سرشار سیر کہسار ۔ فسانۂ جدید ۔ شمس الضحیٰ ۔ تحفۂ سرشار ۔ کامنی ۔ ھشو وغیرہ وغیرہ ۔

لکھنؤ

ناشر ۔ سی ۔ سی ۔ گھوش ۔ اینڈ کمپنی
جوبلی پرنٹنگ ورکس نظیر آباد لکھنؤ

۱۸۹۴ء

قیمت ۸ آنے   محصول ڈاک ایک آنہ

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

اس کی پشت کے مطالعہ سے ایک بڑی دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے ۔ یہاں سابق مدیر اعلیٰ کو LATE EDITOR IN CHIEF لکھا ہے ، جب کہ انگریزی میں " لیٹ " کے معنی مرحوم کے ہوتے ہیں ۔ لفظ سابق کے لیے انگریزی میں لفظ " EX " استعمال کیا جاتا ہے ۔

سرورق کی دوسری پشت پر سرشار ہی کے ایک مزاحیہ ناول ھشو کا اشتہار ہے جس کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ناول ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا اور اس کے پہلے ایڈیشن کی تقریباً پانچ ہزار جلدیں فروخت ہو چکی تھیں ۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کی زیر ادارت شائع ہونے والے اس پندرہ روزہ رسالے میں صرف ناول ہی شائع کیے جاتے تھے کبھی کبھار تراجم بھی دیے جاتے تھے ۔ علاوہ ازیں اس میں شعرا کے گلدستوں پر تبصرے بھی کیے جاتے تھے اور نمونے کے طور پر اشعار بھی دیے جاتے تھے ۔

زیر نظر رسالے کے آخری دو صفحات میں ہمکدۂ سرشار کے زیر عنوان جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اسے " اعلان " اداریہ " اشتہار " کچھ بھی کہا جا سکتا ہے یا پھر

رسالے کے قواعد و ضوابط بھی متصور کیے جا سکتے ہیں۔

بہر حال چوں کہ اس کے مطالعے سے مذکورہ رسالے کی پالیسی پر کسی حد تک روشنی پڑتی ہے اس لیے اسے اداریہ ہی تصور کیا جانا چاہیے۔ اگرچہ اسے ڈاکٹر سی۔ سی۔ گھوش کے نام سے شائع کیا گیا ہے مگر اندازِ تحریر بتاتا ہے کہ یہ سرشار ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوگا۔ اس میں لکھا ہے:

"ماہ ستمبر سے ہر پندرھویں روز یعنی مہینے میں دو سو صفحوں کا ایک ناول تصنیف پنڈت رتن صاحب سرشار لکھنوی شائع ہوتا رہے گا جس کی اول جلد موسومہ کڑم دھم نذرِ ناظرین ہوتی ہے! اور ساتھ ہی اردو شاعری کے گلدستوں پر اکثر ریویو اور ان کے چیدہ چیدہ اشعار نذرِ شائقین کیے جائیں گے۔ مہینے میں دو سو صفحوں کے ناول پیش کش ہوں گے اور ۴۰ صفحوں کے قریب گلدستوں کا ست ہوگا۔ یعنی گلدستوں کے اشعار درج ہوں گے اور ان پر رائے زنی کی جائے گی۔ پندرھویں دن خمکدۂ سرشار کا ایک طلل گراں شائقین مجموعہ گزین کو مسرور کر دے گا۔ اور بادۂ تفریح سے ایسا چھکا دے گا کہ پھر کسی کو اس شعر کے پڑھنے کی ضرورت نہ ہوگی ؎

لبالب جام خواہم ساقی از مے
چرا خالی لبِ پیمانہ داری

اگر ایک ناول دوسرے ناول سے بڑھ چڑھ کر نہ ہو تو ہمارا ذمہ۔ مصنف نے حتمی وعدہ کیا ہے کہ میں جان لڑا دوں گا۔ ہم کو ان ناولوں کی نسبت زیادہ تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ ساری خدائی معترف ہے کہ پنڈت رتن ناتھ اس فن میں یکتا ہیں۔ گو ہم زبان کی خوبیوں کی داد اچھی طرح نہیں دے سکتے مگر بڑے بڑے زباں داں ان کا نام سن کر اپنے کان پکڑتے ہیں۔ ہاں پلاٹ اور خیالات کی نسبت البتہ ہم رائے زنی کر سکتے ہیں کہ موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ ہم سال میں چوبیس (یا کم و بیش) ناول دیں گے اور قریب ۴۰ صفحے مہینے کے نذر کریں گے جن میں گلدستوں کے اشعار اور ان کا ریویو ہوگا۔

قیمت پیشگی شہر والوں سے	سالانہ	ششماہی	سہ ماہی
	عہ/	سے/	۱۲/
ایضاً مفصل	۱۲/	۳/	۶/

چوبیس نادر ناولوں کو ملاحظہ فرمایئے اور عہ/
یہ حسنِ معنی کی گرانی پر بھی ارزانی ہے

ان ناولوں کے علاوہ کئی سو صفحے کے نایاب خیالات علاحدہ ہوں گے اور اس کے ساتھ چھپیں گے۔

ناظرین خود اقرار کریں گے کہ ایک ایک جلد ان ناولوں کی ایک ایک اشرفی کو گراں نہیں ہے۔ دیکھ ہی لیجیے گا یہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ تسخیرِ قلوب کے لیے نقشِ سلیمانی ہے۔ اور کیوں نہ ہو خامۂ ذی علم و ذی جوہر کی جولانی ہے قلم توڑ دیے ہیں۔ ناول اس کے معنی ہیں کہ کیسا ہی مغموم ہو ظرافت کا بیان پڑھ کر ہنس دے اور ٹریجیڈی کا حال آٹھ آٹھ آنسو رلائے اور دل پر ایسا اثر ہو کہ معلوم ہو کہ سچ مچ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ رزم اور بزم دونوں رنگ چھاتے ہوئے۔

درخواستیں مع زرِ پیشگی جلد بھیجیے۔ اگر کسی دل چسپ ناول کا ترجمہ پیش ہوگا تو وہ بھی اعلیٰ درجے کے مذاق کا ہوگا!"

اس زمانے میں اردو ادب میں پہلی بار ناولٹ نگاری کی جانب توجہ دی گئی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو میں ناولٹ نگاری کی جانب تقریباً ستر اسی برس قبل توجہ دی جا چکی تھی اور جن تجربات کا آج ذکر کیا جا رہا ہے وہ کافی عرصے پہلے منظرِ عام پر آ چکے تھے۔"

خمکدۂ سرشار کا یہ شمارہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول کڑم دھم پر مشتمل ہے۔ اس میں مذکورہ اعلان کے باوجود شعرا کے گلدستوں پر تبصرے اور نمونے کے اشعار شامل نہیں کیے گئے اور نہ نایاب خیالات مندرج ہیں۔

کڑم دھم کا پلاٹ معمولی نوعیت کا ہے۔ سرشار کی طبیعت اور مزاج کے مطابق ناول کا ماحول اور مزاج بیگماتی ضرور ہے مگر نہ زبان میں پہلے کی سی خوبی اور لطف ہے اور نہ اس کے کردار ہی کہیں خوبی جیسا نقش دلوں پر چھوڑتے ہیں۔ ناول میں اگر کوئی کردار ابھرتا ہے تو وہ نوشابہ کا ہے۔ اس کا روایت سے بغاوت کا جذبہ سرشار کے خواتین میں بیداری لانے اور سماجی رسوم کی اندھی تقلید سے فرار کے نظریے کی غمازی ضرور کرتا ہے۔

یہ ناول سرشار کی وفات کے بعد اصلح المطابع لکھنؤ سے بھی شائع ہوا۔ اسے محمد قادر بخش نے محمود اختر بھوپالی کی فرمائش پر شائع کیا تھا۔ بنا دیے

پھر ترمیم و تنسیخ کے ساتھ ڈائل سائز پر شائع ہوا تھا اور ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ نسخۂ اصلح کے سرورق یا پشت کہیں بھی سن اشاعت درج نہیں ہے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ناول سرشار کی وفات کے بعد کب شائع ہوا۔

خمکدۂ سرشار میں یہ ناول ۸۰ صفحات پر ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد منشی محمد محمود صاحب محمد بلگرامی شاگرد حضرت قدر مرحوم کی دو تاریخیں اور مولوی غلام حیدر آرشد بلگرامی کی ایک تاریخ درج ہے۔ نسخۂ اصلح میں یہ تاریخیں درج نہیں ہیں۔

خمکدۂ سرشار میں مندرج تینوں تاریخیں ملاحظہ ہوں۔ سب سے پہلے منشی محمد محمود صاحب محمد بلگرامی کی تاریخیں درج کی جاتی ہیں:

(۱)

عجب ناول لکھا سرشار نے دھوم اس کی ہے ہر سو
کرم دھم نام رکھا ہے نیا ہے جشن نوشابہ
کہاں یہ بات ما ما ز ور گو بے حد نظامی نے
سکندر نامے میں دیکھا پڑا ہے جشن نوشابہ
پہنچ سکتا ہے نقشِ اولیں کب نقشِ ثانی کو
وہ پہلے ہو چکا یہ دوسرا ہے جشن نوشابہ
لکھی ہے محمد نے تاریخ بھی کیا دھوم کی اس کی
کرم دھم ہے دلا برپا ہوا ہے جشن نوشابہ

۱۳۵۸ھ

(۲)

قلم توڑے ہیں اے سرشار وہ ناول لکھا تم نے
اجی واللہ کیا دھومیں ہیں نوشابہ کی شادی میں
کرم دھم سن کے وہ شادی کا ہر سو غلغلہ اٹھا
لگی آنے صدا دھومیں ہیں نوشابہ کی شادی میں
ذرا اب داد دو تاریخ بھی تو محمد کی سن کر
کرم دھم جابجا دھومیں ہیں نوشابہ کی شادی میں

۱۳۵۹ھ

اب مولوی غلام حیدر صاحب آرشد بلگرامی کی تاریخ ملاحظہ فرمایئے:

ہوا عقد اُس کا نواب بہادر سے مبارک ہو
دل آویز دلربا رشکِ قمر جو شاہزادی ہے
زبانِ خلق پر مصرعِ سال آرشد یہ جاری ہے
کرم دھم کی صدائیں ہیں یہ نوشابہ کی شادی ہے

۱۳۵۹ھ

اس کے بعد کے تین صفحات ڈاکٹر سی۔ سی۔ گھوش کے مطبع جوبلی پرنٹنگ ورکس اور دواخانہ کے اشتہارات پر مشتمل ہیں۔ ان کے مطبع میں ٹائپوگرافی اور لیتھوگرافی دونوں کا کام ہوتا تھا۔

خمکدۂ سرشار کے آخری دو صفحات کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سرشار کے مشہور و معروف ناول کامنی کا منظوم اشتہار درج ہے۔ اگرچہ شاعر کا نام درج نہیں ہے مگر یقین ہے کہ اسے سرشار ہی نے نظم کیا ہوگا۔ اشتہار میں واحد متکلم کے صیغہ کا استعمال ہمارے اس یقین کی بنیاد ہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں سرشار کی جدت آفرینی اور موزونیٔ طبع کا احساس ہوتا ہے وہاں لکھنؤ کا رچا ہوا اور گنگا اور گومتی کے نرمل جل سے دُھلا ہوا انداز اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے اور محاورہ بندی، صنائع بدائع غرض کہ تمام لفظی و معنوی محاسن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ذیل میں یہ منظوم اشتہار درج کیا جاتا ہے:

اشتہار ۔ کامنی ۔ ناول

(پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی کا نیا ناول)

ہر روش پر ہے بلبلوں کی پکار — لو مبارک ہو آئی فصلِ بہار
شاہدِ گل ہے خوب جوبن پر — بوئے گل ہے ہوا کے توسن پر
کیوں نہ لپٹے گلوں سے بلبلِ زار — کہ غنیمت ہے وقتِ بوس و کنار
طرب انگیز فصل یہ پا کر — ہے طبیعت مری امنگوں پر
کامنی نام اک لکھا قصہ — فن تو ناول کا ہے مرا حصہ
نام پیارا ہے اور ادا پیاری — دل و جاں سے ہے اک جہاں واری
بول چال اس کی پیاری پیاری ہے — لکھنؤ کی زباں ہماری ہے
کیوں نہ اردو کو لکھنؤ پہ ہو ناز — ہند ایراں ہے لکھنؤ شیراز
جس جگہ رزم کا لکھا ہے بیاں — بن گیا خامہ رستمِ دستاں
شیر نر کی طرح بپھرتا ہے — شاہنامے کو مات کرتا ہے
بزم میں بات وہ نکالی ہے — شعر ہیں یا گلوں کی ڈالی ہے

مثل شمشاد شعر اکڑتے ہیں — منہ سے خامے کے پھول جھڑتے ہیں
ریختے کا بھی رنگ ہے اس میں — ریختی کا بھی ڈھنگ ہے اس میں
ہاں مگر ایک بات یاد رہے — اس میں جو چاہے کوئی ہم کو کہے
نہ کہیں پایئے گا نخش کا نام — کہ بہو بیٹوں کا ہے یہ کلام
اگلے دقتوں کی ریختی حق اور — جان صاحب کا اب نہیں ہے دور
حاسدوں تک کو اس کا ہے اقرار — کہ پیمبر ہے نثر کا سرشار
کیا خداداد ذہن پایا ہے — نثر میں معجزہ دکھایا ہے
دیں گے میرے کلام کی وہ داد — پڑھ چکے ہیں جو قصۂ آزاد
کامنی چھتری کی ہے دختر — پاک باز اور بڑی حیا پرور
نازنیں، گلبدن، پری تمثال — مستِ صہبائے ناز و حسن و جمال
گھر گرہستیوں میں اس کی دھوم ہے آج — ہے بہو بیٹوں کی وہ سرتاج
قدر دانانِ قصہ ہائے شگرف — پھڑک اٹھیں گے سن کے حرف بہ حرف
بس تعلّی کا ختم کر یہ بیاں — اتنی سی جان ڈیڑھ گز کی زباں
مشک وہ ہے جو خود ہی دے خوشبو — اپنے منھ کیوں بنو میاں مٹھو
سن لو مجھ سے یہ اشتہار کا سن — واہ پیاری ہے یہ عروسِ سخن

۱۳۱۱ھ

یہ دلچسپ اور ہر دل عزیز ناول اواخرِ ماہ ستمبر ۱۸۹۳ء تک زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر نذرِ ناظرین ہوگا۔ جس کا لوگوں کو مدت سے اشتیاق علاقہ تمیع سے،

المشتہر ــــ ڈاکٹر سی۔ سی۔ گھوش۔

کٹم دھم کی تاریخوں اور اشتہار کے سن کے موازنے سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ تاریخیں ناول کی اشاعت پر نہیں بلکہ تصنیف پر لکھی گئی تھیں۔ اور یہ ناول سرشار نے تین چار برس قبل یعنی ۱۸۹۰ء کے قریب لکھا تھا، جس کی اشاعت ۱۸۹۳ء میں ممکن ہوئی۔ کٹم دھم کی کتابت یک کالمہ کی گئی ہے۔ ہر صفحے میں دو کالم ہیں۔ دائیں بائیں اور درمیان میں ایک ایک نالی چھوڑی گئی ہے۔

خمکدۂ سرشار کی تیسری پشت پر کٹم دھم کے ساتھ سرشار کے ایک اور ناول بچھڑی ہوئی دلہن کا اشتہار ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خمکدۂ سرشار کا دوسرا شمارہ ہوگا۔

★

گھنٹی کیوں بار بار بجتی ہے

(بسلسلہ صفحہ ۲۴)

"کون بجن؟"

"جگر کی غزلیں تو آپ نے پڑھی ہوں گی؟"

"جی ہاں نام تو سنا ہے۔ مگر وہ تو فلموں میں نہیں چلتے۔"

"کسی مشاعرے کوی سمیلن میں شرکت کی ہے؟"

"نہیں صاحب۔ مگر دو ڈھائی سو گیت لکھے ہیں۔ آپ سنیں تو میں سناؤں ..."

گھنٹی پھر بجتی ہے ... گھنٹی بار بار بجتی ہے۔ ہر روز پانچ چھ بار بجتی ہے۔ ہر مہینے ڈیڑھ دو سو بار بجتی ہے۔ ہر برس دو تین ہزار بار بجتی ہے۔

یہ تو میری گھنٹی ہے ــــ جو ناکام ڈائرکٹر اور پروڈیوسر ہے۔ جو کامیاب ہیں اُن کے گھروں اور سٹوڈیوز کی گھنٹی تو بجتی ہی رہتی ہے۔

ہر بار جب گھنٹی بجتی ہے ایک نوجوان ایک اُمید، ایک آرزو، ایک سپنا لے کر آتا ہے۔ دلیپ کمار بن جاؤں گا، اشنکر جے کشن بن جاؤں گا، محمد رفیع اور مکیش بن جاؤں گا۔ راجندر کرشن اور راندر راج آنند بن جاؤں گا۔

کتنی ہمت ہے ان نوجوانوں میں، کتنی خاک چھانتے ہیں یہ بمبئی کی سڑکوں کی، کتنے ان تھک ہیں یہ ــــ اور کتنے بھولے، کتنے سیدھے سادے، جو یہ نہیں جانتے کہ فلمی دنیا میں کامیاب ہونے کے لیے بھی دماغ کی ضرورت ہے، اُس دماغ کو تعلیم کی ضرورت ہے، ٹریننگ کی ضرورت ہے، تجربہ کی ضرورت ہے، جو کتابیں پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے، کسی اُستاد کی شاگردی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ صرف گھنٹی بجانے سے کامیابی کے سپنے پورے نہیں ہو سکتے ــــ چاہے کتنی ہی بار گھنٹی کیوں نہ بجائی جائے۔

قومی یکجہتی

بشیر قادری

تیری آواز ہے تعمیرِ جہاں کی آواز
امن اک نغمہ ہے لے کے تنِ ہند ترا
پیار اک نغمہ ہے لے گلبدنِ ہند ترا
میں تو دیوانہ ہوں لے انجمنِ ہند ترا

تیری راہوں میں فروزاں ہیں اخوت کے چراغ
بام و در سے ترے آتی ہے وفا کی خوشبو
جیسے گلشن میں پھرے بادِ صبا کی خوشبو
میں تو دیوانہ ہوں اے انجمنِ ہند ترا

تیرا پیغام محبت ترا پیغام اخلاص
زندگی کا تو پجاری ہے محبت کا نقیب
گنگا جمنا سے عبارت ہے تری ہی تہذیب
میں تو دیوانہ ہوں اے انجمنِ ہند ترا

ذہن نے تیرے جلا پائی فضاؤں میں تری
رشکِ فردوسِ بریں ہو ترا باغِ کشمیر
ایک اک گل ہے جہاں کا کہکشاں کی تصویر
میں تو دیوانہ ہوں اے انجمنِ ہند ترا

پہلے اک ذات تلک رنج و الم تھے محدود
ہم کو یکجہتی کا پیغام دیا ہے تو نے
نظمِ عالم میں بڑا کام کیا ہے تو نے
میں تو دیوانہ ہوں اے انجمنِ ہند ترا

وہ ہر ذرہ کہ تارا ہی جہاں جس کا وجود
اپنی طاقت سے ہے تعمیرِ وطن میں مشغول
خار و گل سب تو ہیں تزئینِ چمن میں مشغول
میں تو دیوانہ ہوں اے انجمنِ ہند ترا

تو نے ذہنوں میں جگایا ہے شعورِ قومی
اے وطن میں تری جمہور نوازی کے نثار
ارضِ گوتم میں تری عدل طرازی کے نثار
میں تو دیوانہ ہوں اے انجمنِ ہند ترا

سوال

قاسم صہباجیلی

صہبا! یہ کیا ہوا کہ ترا دل بجھا سا ہے؟
کیوں تیرے لب پہ شورِ تمنا خموش ہے؟
بزمِ طرب اداس ہے، کوئے بتاں اداس
تو کیا خموش ہو گیا دنیا خموش ہے
ہیں تیری جنتوں کی وہ رعنائیاں کہاں
شب جن سے تھی جواں وہ شبستاں کدھر
گلشن بنا تھا جن کے تصور سے تیرا ذ
وہ لالہ ہائے عارضِ تاباں کدھر گ
رنگ آفریں تھا جس سے تخیل بہار کا
وہ لالہ گوں شفق کے کنارے کہاں ہیں آج؟
کیا ہو گئی وہ عارضِ تاباں کی چاندنی؟
وہ کہکشاں، وہ چاند، وہ تارے کہاں ہیں آج؟
تیرے تصورات پہ کیوں چھا گئی خزاں
کیا زلفِ مشک بو میں وہ نکہت نہیں ر
کیا شعلہ ہائے عارضِ گل رنگ بجھ گ
کیوں تیرے سوزِ عشق میں شدت نہیں ر
آتی نہیں ہے حجلۂ دل تک کوئی کرن
صہبا! ترے فلک کے ستاروں کو کیا ہوا؟
ٹھہرا ہے کیوں سفینۂ فکر و نظر ترا؟
بحرِ تخیلات کے دھاروں کو کیا ہوا؟
تیرا سخن دلوں کی گرہ کھولتا نہ
جادو تری زبان کا کیوں بولتا نہیں

(افسانہ)

للیا

ایس۔ ایم۔ وسیم

'میجک شو' کا مینجر متعدد بار چلّا چکا تھا:

"کم اِن۔"

"وائی ڈونٹ یو کم اِن؟"

لیکن وہ تھی کہ اب تک ہال کے پچھلے حصے کے کونے والے کمرے میں، جہاں میجک کا کچھ سامان رکھا تھا، کسی اضطراب کے عالم میں پڑی تھی۔

مینجر نے کئی بار اسی طرح آواز دی اور پھر وہ غصہ کو بُری طرح پی گیا۔ اُسے اس کو مسکرانا تھا ورنہ مجمع پر سکوت چھا چلا تھا اور یہ بہرحال اس کی کامیابی کے باب میں ایک نکتہ ہوتا۔ وہ مسکرا دیا۔ اور اس کی دوسری اسسٹنٹ اسٹیج پر سامان لے کر آ گئی۔

× × ×

ابھی ابھی اس نے آرام کر لینے کی غرض سے جمناسٹک کے کمالات دکھانے والی اس کم سِن بچی اور دوسرے تقریباً ہم عمر دو بھائیوں کو اسٹیج پر بھیج دیا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ وہ چیف میجیشین تھا اور اسی طرح بیچ بیچ میں ایسے پروگرام رکھ کر جن سے اس کا تعلق نہ ہوتا آرام اور لباس تبدیل کرنے کی غرض سے وہ اسٹیج پر سے ہٹ جایا کرتا تھا۔

وہ ہندستان ہی نہیں بلکہ دنیا کا ایک بڑا جادوگر تھا۔ اپنی پھرتی اور حیرت انگیز چالوں سے اس نے شہرۂ آفاق ترقی کی تھی۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں میں وہ گھوم چکا تھا۔ اور دنیا اسے پرکن شا کے نام سے جانتی تھی۔ اس کے کمالات نے اسے شہنشاہ جادوگری کا لقب دلوا دیا تھا۔ ہزاروں من چلے لڑکے اور لڑکیاں اس کی شاگردی قبول کرنے کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ وہ کم سِن بچی اسٹیج پر جیسے ہی آئی مجمع میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شہر کے سب ہی لوگ اس کم سنی کے باوجود اس کے محیرالعقول کمالات سے متاثر تھے۔ اس کے بدن کا لوچ اسے بدن کو کسی بھی شکل میں توڑ مروڑ کر بنا لینے میں مدد دیتا۔ کبھی وہ کیکڑے کی شکل میں اپنے کو بدل لیتی۔ کبھی ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر زور دے کر وہ اپنے سارے بدن کو اس تیزی سے گھماتی جیسے پانی میں کنول گھوم رہا ہو۔ اور کبھی وہ اُلٹی لیٹی ہوئی اپنے سر کو زمین سے ملا دینے کے لئے پیروں کی طرف لے جاتی تو وہ اس کی ایڑیوں سے ٹکرا جاتا۔

جس وقت للیا اپنے کمالات دکھا رہی تھی، اسٹیج کے ایک کونے میں مسز جُڈ کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے بلا کی وحشت برس رہی تھی۔ اس سے قبل وہ کبھی بھی اتنی سنجیدہ نہیں رہتی تھی بلکہ جس وقت اس کی ننھی للیا اپنے کمالات دکھاتی تو مسز جڈ بے ساختگی سے تالی بجاتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ جھینپ بھی جاتی تھی کیونکہ جس وقت وہ تالی بجانے کے لیے ہاتھ اُٹھا رہی ہوتی، جارج پاشا گھور کر اسے دیکھتا تھا اور وہ جھینپی ہوئی سی ہاتھوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتی تھی۔

مسز جڈ کی عمر کوئی ۳۰۔ ۳۵ سال کی تھی۔ اسے قدرت نے بے پناہ حُسن بخشا تھا۔ جس وقت وہ گھبرائی ہوئی سی ہاتھوں کو ڈھیلا چھوڑتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے نیلے پانی میں کھلے ہوئے کنول پر ڈوبتے ہوئے سورج کی حسین شعاعیں عکس ریز ہوں، کنول کی ایک ایک پتی تیز ہوا کے ساتھ رقص کر رہی ہو اور تماشائی محوِ نظارہ ہو کر کہیں کھو سے جاتے ہوں۔ بس یہی حالت ہوتی تھی لوگوں کی جب وہ مسز جُڈ کو گھبرایا ہوا سا پاتے تھے۔

لیکن آج مسز جڈ تالیاں نہیں بجا رہی تھی۔ تھکن کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ رات بھر سوئی بھی نہ ہو۔ اس کو آرام کی ضرورت تھی لیکن پھر بھی وہ دیوار کے سہارے اپنے حسین قیمتی لباس

میں ملبوس کھڑی تھی۔

اُس کی للیا نے اپنا آخری کمال اس خوبی سے دکھلایا کہ لوگ بے اختیار چلا اُٹھے:

"ونڈر فل"

"ونڈر فل"

اور مسز جیڈ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے بے اختیار تالی بجانے کے لیے ہاتھ اُٹھائے لیکن پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ نہ جانے کیوں اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ دفعتاً کسی جذبے کے اثر سے اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے اور اس کے حسین گالوں سے ڈھلکتے ہوئے زمین پر گرے اور ماضی کی آغوش میں سو گئے۔ مسز جیڈ وہاں مزید نہ ٹھہر سکی اور اسٹیج سے ہٹ کر بائیں طرف والے کمرے میں چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے پھر وہی فحش جملے سُنے جو وہ اکثر سُنتی رہتی تھی۔ ایک اسٹیج سے دوسرے اسٹیج پر زبانیں بدل جانے پر بھی ایک ہی مفہوم کے جملے اکثر اس کے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ لیکن وہ تو اب ان کی عادی ہو گئی تھی۔ یہی تو تھا اس کے لئے کہ وہ انھیں سُنے اور بھول جائے

لیکن آج یہ جملے اس کے کانوں سے اُتر کر دل کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ اس کے احساس کو جھنجھوڑ کر انھیں ایک نئی زندگی دینا چاہتے تھے۔

وہ جس وقت تیزی سے اسٹیج کے پچھلے دروازے سے اُتر کر کمرے میں داخل ہونا چاہتی تھی، اس کا پیر پھسل گیا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔ کسی طرح وہ کمرے میں پہنچی اور کنارے پڑی ہوئی بینچ پر لیٹ گئی۔ خون اس کے پیروں سے اب بھی رس رہا تھا حالانکہ اسے کچھ ہوش نہ تھا کہ کیا ہوا کیونکہ جذبات نے اسے تقریباً دیوانہ بنا دیا تھا اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ لیکن جب کچھ وقفے کے بعد اس نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو اسے وہ سامان اب بھی کمرے میں دکھائی دیا جسے میجک شو کے سلسلے میں اسٹیج پر لے جانے کی اس کی ڈیوٹی تھی۔ اس نے پھر سُنا:

"کم اِن"

"وائی ڈونٹ یو کم اِن؟"

اور اس نے چاہا کہ اُٹھ کر وہ سامان اسٹیج پر پہنچا دے لیکن نہ جانے کس جذبے نے اس کے ارادے میں ٹوک لگا دی اور وہ آنکھیں بند کر کے پھر خاموش لیٹ گئی۔ دفعتاً پیروں کی آہٹ پا کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ سلویا تیزی سے آئی اور سامان لے کر چلی گئی۔

سلویا کے چلے جانے کے بعد اس نے کمرے میں آویزاں تصویروں کا جائزہ لینا شروع کیا جن میں سے متعدد تصویریں کالج میں ہونے والے ڈراموں، میجک شو اور ورائٹی شو سے متعلق تھیں۔ اس نے سوچا کہ آج کھینچی جانے والی تصویروں میں سے بھی چند اسی کمرے میں آویزاں ہوں گی اور وہ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اُداس ہو گئی۔

یک بیک اسے وہ فحش جملے پھر یاد آئے اور اس نے دل ہی دل میں افسوس کیا۔ یہ ایک مشہور کالج تھا جس کے متعلق باہر بڑی اچھی رائے تھی۔ سرپرستوں کو کالج کے ماحول اور تمدن پر پورا اعتماد تھا۔ یہ سب سوچتے سوچتے مسز جیڈ کا افسوس اس قدر بڑھا کہ اس کا دل چاہا کہ وہ یہاں سے اُٹھ کر بھاگ جائے۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ اور پھر جب خیالوں کا سلسلہ کچھ ٹوٹا تو اس نے سر میں بھاری پن سا محسوس کیا۔

× × ×

پروگرام اب اختتام پر تھا اور ہال میں خوب زور و شور سے تالیاں بج رہی تھیں۔

اسٹیج پر ایک کونے میں پڑی ہوئی ایک خوبصورت سی چھوٹی زریں کرسی پر للیا اپنے مخصوص انداز میں اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے بیٹھی تھی۔ یکایک وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور اسٹیج کی طرف بڑھی۔ مجمع نے سمجھا کہ للیا پھر اپنے کمالات دکھائے گی۔ اسی لیے یہ تالیاں بج رہی تھیں

لیکن درحقیقت للیا اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی کئی بار ایسا سُن چکی تھی جیسے اس کی ممی اسے زور زور سے پکار رہی تھی:

"للیا"

"ڈیر للیا"

"للیا... للیا... بھاگ آ... تو اسٹیج چھوڑ کر۔ چلی آ مرے پاس... ڈیر للیا"

اور اسی آواز پر للیا یک بیک اپنی جگہ سے اُٹھی تھی اور تالیوں کی پروا کئے بغیر اسٹیج کے پچھلے دروازے سے تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اس کمرے

میں آ گئی تھی جس میں اس کی ممی کسی شدید کرب میں مبتلا تڑپ رہی تھی حالانکہ اسے دیکھ کر اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اسے دیکھ کر تو ایسا لگتا تھا کہ وہ سکون سے خاموش لیٹی ہے لیکن اگر اس کی روح کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا جاتا تو مسز جیڈ کے جذبات میں ہیجان تھا، خیالوں کے اُمنڈتے طوفان تھے اور ان عظیم طوفانوں میں مسز جیڈ بالکل تنہا تھی کوئی نہ تھا۔ اگر کوئی تھا اسے سہارا دینے والا تو وہ للیا تھی جو ابھی زمانے کی تلخیوں سے بے بہرہ تھی... جو اپنے تمام تر بھرتیلے پن اور اسٹیج کے فن سے واقف ہونے کے باوجود ایک معصوم بچی تھی۔ وہ تو محض اشاروں کے بل پر سکھلائے گئے کمالات دکھاتی تھی اور اس کی تمام اُجرت اس کی ممی لے لیتی تھی جس سے اس کا اور اس کی ممی کا خرچ چلتا تھا۔ اسٹیج ہی ان کی دنیا تھی۔ ان کی تہذیب اور تمدن کی نشانی، جس پر آ کر وہ اپنے کو باوقار تصور کرتے تھے اور نیچے بیٹھنے والے تماشائی اسٹیج پر آنے والے افراد کے فن سے خوش ہوتے تھے اور اپنے اپنے مذاق کے مطابق فقرے چست کرتے تھے۔

× × ×

مسز جیڈ ابھی ابھی چند لمحے پہلے ایک عجیب سی غفلت کی نیند سو گئی تھی۔ اور اس عالم میں اس نے ایک خواب دیکھا ——

سنسان راستے سے گزر کر وہ دریا کے موڑ والے پل کے قریب آ چکی تھی۔ پل سے نیچے دریا کا پانی زور و شور سے بہہ رہا تھا... ایک ہلچل تھی۔ ایک شور تھا... یکایک اس نے سُنا کہ کوئی اسے پشت پر سے پکار رہا ہے...

"ٹھہر جا... او اجنبی... زندگی اتنی سستی نہیں..."

مسز جیڈ نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور بغیر پیچھے دیکھے ہوئے اس نے جواب دیا:

"جاؤ... جاؤ —— تم لوگوں کو ہر فرد کمزور دل نظر آتا ہے۔"

لیکن آواز دینے والے نے پھر کچھ نہ کہا بلکہ قریب آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھنجھوڑنے لگا۔ "میری طرف دیکھو... میری طرف دیکھو... میں تمہارا بدنصیب... تمہارا..."

مسز جیڈ نے مڑ کر دیکھا... اور بے اختیار رونے لگی —— کسی معصوم کی طرح۔ اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا —— ذرا لمحوں کے بعد جب اس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا... وہ غائب ہو گیا تھا۔

پھر مسز جیڈ کی آنکھ کھل گئی کیونکہ کوئی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ یہ کوئی اور نہ تھا اس کی اپنی للیا تھی جو اسٹیج پر سے اُٹھ کر چلی آئی تھی حالانکہ دوسرے افراد نے اسے کڑی نگاہوں سے دیکھا بھی تھا۔

مسز جیڈ نے آنکھ کھول کر دیکھا کہ للیا سر جھکائے —— آنکھوں میں آنسو بھرے —— خاموش کھڑی ہے —— پھر اس کی آنکھوں نے دیکھا کہ ایک جواں سال —— خوبصورت —— آدمی للیا کی آنکھوں میں سے جھانکنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مسز جیڈ کی نظروں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا —— سر جھکائے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے —— ارے یہ تو جیڈ تھا جو دوسری جنگ عظیم کے دوران —— ابھی چند سال پہلے —— ایک سہانی رات کو اس کے پاس تھا لیکن دفعتاً اس کی چھٹی منسوخ ہو گئی تھی اور اسے حکم ملا تھا کہ وہ ہیڈ کوارٹر پر حاضر ہو جائے۔ —— وہ چلا گیا —— مسز جیڈ کی رات سہانی سے ویران ہو گئی —— اور پھر اسے ایک دن خبر ملی تھی کہ اس کی مانگ بھی اُجڑ گئی ہے —— اس حادثے کے بعد اس نے زندگی گزارنے کے لیے جادوگری کے کرامات دکھانے والی فرم میں نوکری کر لی تھی۔

اُسے یاد تھا کہ جب وہ ڈیڑھ سال کی للیا کی انگلی پکڑے ہوئے اس فرم میں آئی تھی تو منیجر نے اس سے زیادہ للیا میں دلچسپی لی تھی اور مسز جیڈ باغ باغ ہو گئی تھی —— پھر کچھ دنوں کے بعد للیا کو ٹریننگ دی جانے لگی —— اپنے بدن کو توڑنے مروڑنے کی اور آج للیا اس قابل تھی کہ وہ مجمع سے خراج تحسین لے اور اپنی ممی کو خوش دیکھ سکے۔

یہ سب سوچتے ہوئے اس کی نظر دیوار پر آویزاں ایک تصویر پر گئی جس کے نیچے لکھا تھا:

"کل کی صبح تک پہنچنے کے لیے آج کی رات میں چراغ روشن کرو۔ ذہن کی کشادگی وسیع خزانوں سے بدرجہا بہتر ہے۔"

اور پھر اسے یاد آیا کہ ایک رات وہ اور جیڈ چھٹکی ہوئی چاندنی میں بیٹھے تھے۔

"خاموش کیوں ہو" وہ کہہ رہا تھا۔

"کل کا نقشہ بنا رہی ہوں۔"

"نقشہ کیا یہی نا کہ..." جیڈ نے دھیرے سے اس کے کان میں کچھ

کہہ دیا اور مسز جیڈ شرما گئی، بالکل ایک نئی نویلی دلہن کی طرح۔

× × ×

"کہاں ہے وہ مسز جیڈ جو میرے ٹکڑوں پر پل رہی ہے" یکایک کمرے میں گرجدار آواز سنائی پڑی اور مسز جیڈ کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"کہاں ہے؟..." "کہاں ہے؟..." کی مبہم آوازیں اس کے کانوں میں ایک خوفناک شور کی طرح گونجنے لگیں اور یکایک مسز جیڈ بے ہوش ہو گئی۔

للیا دوڑ کر اپنی ممی سے لپٹ گئی۔

کمرے میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔

"ڈاکٹر"

"پرنسپل کی مدد لیجئے۔ ڈاکٹر بلوا لیجئے" سلویا بولی۔

"ڈاکٹر بلوا لیا جائے اور ہاں سامان تیار کیا جائے کل ہی ہمیں دوسرے متعدد شہروں کے دورے پر نکل چلنا ہے"۔ جارج نے حکم جاری کیا۔

"لیکن مسز جیڈ؟" آصفہ نے سوال کیا۔

"اگر ممکن نہ ہوا انھیں ساتھ لے جانا تو پھر اسپتال بھی کوئی بُری جگہ نہیں"۔ جارج نے فیصلہ دیا۔

"اور للیا؟" کسی نے کہا۔

"للیا ہمارے ساتھ چلے گی"۔ جارج نے دوسرا فیصلہ سنایا۔

"میں... میں ممی کو نہیں چھوڑ سکتی... میں آپکے ہاتھ جوڑتی ہوں"

للیا نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو جوڑ لیا۔

× × ×

کھلی کھڑکی سے باہر آسمان صاف نظر آ رہا تھا۔ سورج نمودار ہونے ہی والا تھا۔ باہر سے آتے ہوئے نرم سرد ہوا کے جھونکوں نے مسز جیڈ کو جیسے ہلکے سے شانہ پکڑ کر جگا دیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر باہر دیکھا اور مسکرا دی۔ یہ اسپتال میں اس کی دوسری صبح تھی۔

تقریباً سات بجے کالج کی پرنسپل اور للیا آئیں۔ للیا دوڑ کر ممی سے لپٹ گئی۔

"اب آپ کیسی ہیں؟" پرنسپل نے سوال کیا۔

"ٹھیک ہوں، مسز جیڈ نے ہنس کر کہا۔

"کوئی سامان چاہئے آپ کو؟" پرنسپل نے ازراہ ہمدردی پوچھا

"شکریہ" اور مسز جیڈ نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

اگلے دن پرنسپل صاحبہ اور للیا پھر اسپتال آئیں لیکن آج مسز جیڈ نے استقبال کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے اور نہ ہی للیا کو مسکرا کر گلے لگایا۔ وہ چادر اوڑھے ہوئے خاموش لیٹی تھی۔

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کل رات ان پر بیہوشی کا پھر شدید دورہ پڑا تھا اور ابھی چند لمحے پہلے تک وہ بیہوش تھیں۔ ہوش آگیا ہے لیکن ان سے آدھ گھنٹے تک بات نہ کرنا مناسب ہے۔

یہ آدھا گھنٹہ پرنسپل صاحبہ نے انتظار میں اور للیا نے آنسوؤں کے ساتھ کاٹا۔ اجازت ملتے ہی للیا بے اختیار دوڑتی ہوئی وارڈ کی طرف بھاگی۔ وہ چاہتی تھی کہ لپٹ جائے اپنی ممی سے کہ نرس نے اسے اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔ مسز جیڈ متوجہ ہو گئیں۔

"بیٹی کس درجے میں پڑھتی ہو؟" نرس نے کہا اور مسز جیڈ نے سنا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ للیا خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

آہستہ آہستہ چل کر پرنسپل فاکس بھی وارڈ میں داخل ہو گئیں اور اب وہ مسز جیڈ کے پلنگ کے بالکل قریب تھیں۔ انھوں نے بھی نرس کا سوال سنا۔

"پرنسپل صاحبہ... میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں... آپکے اخلاق اور ہمدردیوں نے ایک سچے ہمدرد کی کمی کو پورا کر دیا... آپ نے ابھی ابھی نرس کے سوال کو سنا۔ للیا نے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کا جواب میں دینا چاہتی ہوں... للیا کسی درجے میں نہیں پڑھتی... وہ ایک کم سن بچی ہی تھی کہ اس کا ڈیڈی اسے چھوڑ کر اس دنیا سے چلا گیا... میں نے زندہ رہنے کے لیے نوکریاں تلاش کرنا شروع کیں... قسمت مجھے جارج کے دروازے پر لے آئی... مختصر یہ کہ اس نے للیا کو کمالات سکھائے۔ اس سے اس کو شہرت اور دولت ملی... اور للیا کو فن... ایک دن اسٹیج پر کھڑے ہوئے مجھے ماضی کا وہ حسین تصور یاد آیا جس میں گم ہو کر میں نے اپنی للیا کو ایک ذہین ڈاکٹر کی طرح دیکھا تھا... میں نے سوچا اسٹیج پر ہاتھ پیر کی پھرتی سب کچھ ہے اور اگر حقیقت کہوں تو اس کے ساتھ ساتھ حسن بھی لیکن یہ سب کب تک؟ حسن ڈھل جائے گا... طاقت جواب دیدیگی... اور پھر ضعیف العمری کی تنہائیاں ایک بھیانک غار کے اندھیرے کی

طرح اس کے وجود پر چھا جائیں گی .... آپ اسے اپنی نگرانی میں لے لیجیے۔ میری زندگی کی بس آخری تمنا یہی ہے .... نہ جانے مجھے کون سا مرض لگ گیا ہے .... پتہ نہیں کل کیا ہو؟ ..." اور مسز جیڈ نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑے وقفے کے بعد پھر بولیں " اور ہاں! ... اس کے ڈیڈی کے معاوضے کے کاغذات آگئے ہیں۔ یہ سب آپ کے حوالے ہیں۔ سوٹ کیس تو آپ ہی کے پاس ہے۔ میرے سرہانے سے چابی لے لیجیے۔"

× × ×

ایک۔

دو۔

"تین ... پانچ ... سات ... دس ... بارہ ... پندرہ برس کی مکمل تعلیم کے بعد للیا ایک ذہین خوب صورت اور سنجیدہ ڈاکٹر بن گئی تھی۔ اس عرصے میں وہ کبھی بھی ناکامیاب نہیں ہوئی بلکہ کئی بار اسے اگلے درجے میں ترقی دیدی گئی۔

پرنسپل صاحبہ — مدر فاکس — کی ابھی چند دنوں پہلے مدت ملازمت ختم ہوگئی تھی اور وہ للیا کے تمام ضروری کاغذات وطن واپس جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئی تھیں کیونکہ انھوں نے یہ مناسب سمجھا تھا کہ وہ ایم۔ آر۔ سی۔ پی۔ کرلے۔ ہوائی اڈے پر للیا کو اس نے دونوں باہوں میں جکڑ لیا تھا اور للیا بے اختیار رو دی تھی۔

للیا کو بڑی طرح سنجیدہ رہنے کی عادت تھی۔ اکثر لوگ اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔

مائیکل للیا کا کلاس فیلو تھا۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن للیا کے سنجیدہ طور طریقے اسے اس بات کی کب اجازت دیتے تھے کہ وہ للیا سے ہمکلام بھی ہو سکتا۔

مدر فاکس کے چلے جانے کے بعد للیا نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ دنیا میں یکہ و تنہا ہے۔ صوفے پر بیٹھی بیٹھی وہ کسی خیال میں کھو گئی اور دفعتاً نہ جانے کیوں مسکرا دی۔ اس مسکراہٹ میں اداسی تھی — احساسِ تنہائی تھا — ماضی کی یاد تھی اور نہ جانے کیا کیا۔ بس یہ مسکراہٹ ایسی تھی کہ للیا کو دیکھنے والے — کھڑکی کے پیچھے کھڑے ہوئے مائیکل کا جی چاہا کہ وہ کمرے میں داخل ہو جائے اور للیا کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر اسے یقین دلا دے کہ تم بدنصیب نہیں ہو۔ اور یقیناً تم تنہا بھی نہیں ہو۔ احساسِ تنہائی بھول جاؤ۔ میری طرف دیکھو!
لیکن جذبات پر عقل حاوی ہوگئی اور وہ تیزی سے کمپاؤنڈ کے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں اس نے دیکھا کہ للیا اپنے کمرے سے باہر نکلی اور شکستہ خرامی سے چرچ سمیٹری کی طرف بڑھنے لگی۔ مائیکل اس کی نظریں بچا کر عمارت کی آڑ میں ہو گیا۔ للیا دھیرے دھیرے چرچ کمپاؤنڈ میں داخل ہو کر سمیٹری والے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ مائیکل نے اس کا تعاقب کیا۔ للیا نے ایک قبر کے پاس پہنچ کر سر جھکا لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو زمین پر ٹپکنے لگے۔ اس کے ہاتھ میں سفید پھول تھے۔ مائیکل اس کی پشت پر تھا۔

"ممی تم نے مجھے چھوڑ دیا۔ مدر فاکس اپنے وطن چلی گئیں اور میں اس بھری دنیا میں تنہا بالکل تنہا ہوں — میں ڈاکٹر ہو گئی — کاش موت کے فرشتے تمھیں چند لمحوں کی فرصت دے دیتے ... ممی ... ممی ..." اور للیا بے اختیار رونے لگی۔

دفعتاً اس نے دیکھا کہ ایک ہاتھ اور بڑھا اور اس نے قبر پر سفید پھول ڈال دیے۔

"ڈیر للیا ... زندگی کا طویل سفر حادثات میں ہی کٹتا ہے۔ میری طرف دیکھو ... میں نے تم کو ہمیشہ چاہا ہے۔ تمھاری سنجیدگی میرے لیے معمہ رہی ہے۔ آج میرا دل چاہتا ہے کہ تم سے کہوں مسکرا دو۔"
اور مائیکل نے جو اس کے ساتھ اب ٹریننگ کر رہا تھا چلنے کے انداز میں للیا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اور نہ جانے للیا کیوں خاموش رہی۔ کن تاثرات سے مغلوب ہو کر۔

★

غزل

بشیر بدر

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

اک ذہنِ پریشاں میں خوابِ غزلستاں ہے
پتھر کی حفاظت میں شیشے کی جوانی ہے

دل سے جو چھٹے بادل تو آنکھ میں ساون ہے
ٹھہرا ہوا دریا ہے، بہتا ہوا پانی ہے

اس حوصلۂ دل پر، ہم نے بھی کفن پہنا
ہنس کر کوئی پوچھے گا، کیا جان گنوانی ہے

جس سنگ پہ نظریں کیں خورشید حقیقت ہے
جس چاند سے منہ موڑا، پتھر کی کہانی ہے

اے پیہم خردمنداں! دل کی بھی ضرورت ہے
یہ شہرِ غزالاں ہے، یہ ملکِ جوانی ہے

وہ مصرعۂ آوارہ دیوانوں پہ بھاری ہے
جس میں ترے گیسو کی بے ربط کہانی ہے

ہم رنگِ دلِ پُرخوں ہر لالۂ صحرائی
گیسو کی طرح مضطر اب رات کی رانی ہے

وہ حُسن جسے ہم نے رسوا کیا دُنیا میں
نا دیدہ حقیقت ہے، ناگفتہ کہانی ہے

غم وجہِ نگارِ دل، غم وجہِ قرارِ دل
آنسو کبھی شیشہ ہے، آنسو کبھی پانی ہے

ہم خوش بوئے آوارہ، ہم نور پریشاں ہیں
اے بدر مقدر میں آشفتہ روانی ہے

غزل

فاضل امروہوی

مری زندگی سنواری جو شکستِ بال و پر نے
یہ بلندیِ تخیل مجھے دی مری نظر نے

زہے جستجوئے منزل جہاں چھوڑا راہبر نے
وہیں راستہ بتایا مرے عزمِ پُرخطر نے

لہو چپکے چپکے دل کا جو بہایا چشمِ تر نے
اسے عالم آشکارا شبِ غم کیا سحر نے

کبھی آہ بن کے نکلے کبھی اشک بن کے ٹپکے
جو دیے ہیں مجھ کو صدمے ترے حرفِ بے خبر نے

یہاں غم ترا بٹانے چلا آیا دشتِ وحشت
ہیں گواہ زخم سر کے مجھے روکا سنگِ در نے

ترے حسن کی یہ دولت رہا موسمِ بہاراں
وہ خزاں میں گل کھلائے مرے شعر کے اثر نے

جہاں شوقِ تیز گامی ترے امتحاں ہوئے تھے
وہیں میکدے بنائے ہیں غبارِ رہگزر نے

مری رفعتِ تخیل مجھے لے گئی وہاں تک
جو نہ دیکھی تھی ملک نے جو سُنی نہ تھی بشر نے

جو سلا دیے تھے فاضل غمِ زندگی نے فتنے
انھیں پھر جگا دیا ہے کسی شوخ کی نظر نے

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

دودھ کی پیداوار میں اضافے کی اسکیم •• نجی ٹیوب ویلوں کو بجلی کی فراہمی •• پلاسٹک کے سستے پانی کے میٹر تیار کرنے کا پروگرام •• لوہے اور تانبے کی کانوں کی دریافت •• مراجعت وطن کرنے والوں کے بچوں کے لیے ڈاکٹری تعلیم کی سہولتیں •• اس سال بارہ ٹرانس مشن لائنیں چالو •• ہردوا گنج میں ۵۰ میگا واٹ کی دوسری مشین •• چندراول باندھ پر کام پوری رفتار سے جاری •• تعمیر مکانات کے لیے قرضے •• اقوام مندرج فہرست کو مکانات کے لیے مالی امداد •• خاندانی منصوبہ کی خبریں •• مالیات کارپوریشن کے توسط سے قرضوں کی تقسیم •• زراعت سے متعلق خدمات کی کرایے پر فراہمی •• ستارگنج گنے کی پیداوار ۶۶ء میں دوگنی •• متفرقات

حکومت اتر پردیش کے مویشیوں کی بھرپور ترقی سے متعلق پراجیکٹ سے نہ صرف ریاست کے گنجان آبادی والے علاقوں میں دودھ کی ضرورت پوری ہوگی بلکہ دہلی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کو بھی دودھ فراہم کیا جائے گا جہاں دہلی دودھ اسکیم کے تحت دودھ کی فراہمی کا بندوبست ہے۔ اس پراجیکٹ پر عمل درآمد کے نتیجے میں ان علاقوں میں بتدریج اچھی نسل کے دودھ دینے والے مویشی فراہم ہو جائیں گے۔ یہ پراجیکٹ جو مارچ سنہ ۱۹۶۳ء میں میرٹھ، لکھنؤ اور کانپور اضلاع میں شروع کیا گیا تھا، حال ہی میں مرادآباد میں بھی شروع کیا گیا۔ اس کے تحت ان مقامات کے گردو نواح میں دودھ کے بڑے بڑے شیڈ تعمیر کیے جائیں گے جن کے دائرۂ عمل میں تقریباً ۴۲۰۰ مواضعات آ جائیں گے جن میں اچھی نسل کی ۶ء۲ لاکھ گائیں اور ۵ء۴ لاکھ بھینسیں جدید طریقے کے مطابق پالی جائیں گی۔ نیز مویشیوں کے علاج اور قوت بخش چارے کا بھی بندوبست کیا جائے گا۔ دہلی دودھ اسکیم کے تحت ضلع میرٹھ میں دودھ ٹھنڈا کرنے کے نصب شدہ آلات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس اسکیم سے کیا فائدہ پہنچا ہے۔ مقامی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد گوالے اپنا دودھ یہاں جمع کر دیتے ہیں جو بعد میں دہلی بھیج دیا جاتا ہے۔ ان مرکزوں سے دہلی دودھ سپلائی اسکیم کی ضروریات پوری کرنے کے لیے روزانہ اوسطاً ۸۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰ لیٹر دودھ کی سپلائی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے دودھ فروخت کرنے والے اپنا دودھ دہلی لے جاتے ہیں۔ لکھنؤ اور کانپور کے اضلاع میں بھی دودھ کے خطوں کی تیزی سے ترقی ہو رہی ہے اور ڈیری پلانٹوں کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں دودھ فراہم کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ایک سروے کیا جا رہا ہے جس سے پتہ چلا ہے کہ میرٹھ، کانپور اور لکھنؤ کے اضلاع کے پراجیکٹ کے دائرۂ عمل میں آنے والے علاقوں میں گائے کے دودھ کی اوسطاً یومیہ پیداوار ان مقامات پر بڑھ کر بالترتیب ۲۸ء۴۳ کلوگرام، ۶۱ء۱۰ کلوگرام اور ۴۸ء۱۰ کلوگرام تک پہنچ گئی ہے اور بھینس کے دودھ کی پیداوار میں ۰۸ء۶۹ کلوگرام، ۸۶ء۲ کلوگرام اور ۲۸ء۴۲ کلوگرام تک اضافہ ہوا ہے۔

پراجیکٹ علاقوں میں مطلوبہ تعداد میں عمدہ نسل کے سانڈوں کی فراہمی کا بھی انتظام کیا جائے گا تاکہ اعلیٰ درجے کے مویشیوں کی افزائش نسل کی ضرورتیں پوری کی جا سکیں۔

مویشیوں کو بیماریوں سے بچانے اور ان کے لئے علاج کی سہولتیں بہم پہنچانے کے مقصد کے پیش نظر علاج مویشیان کے اسپتالوں اور اسٹاک مین مرکزوں کا ایک جال سا بچھایا جا رہا ہے تاکہ مویشیوں کی ہر دو ہزار کی تعداد پر ایک اسٹاک مین مرکز اور ۵۰۰۰ مویشیوں پر ایک اسپتال کا نشانہ پورا کیا جا سکے۔

مویشیوں کی دودھ کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے پیش نظر پراجیکٹ علاقوں میں چارہ کی پیداوار بڑھانے پر خاص زور دیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے قوت بخش اور زیادہ پیداوار دینے والی قسموں کے بیج ۵۰ فی صد امدادی قیمت پر کسانوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔

× × ×

اتر پردیش میں مالیاتی سال کے دوران ۱۵ ستمبر ۱۹۶۸ء تک ۶۲۱۴ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی فراہم کی گئی۔ ان میں سے ۲۰۵۴ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو ریاستی بجلی بورڈ کے شروع کیے ہوئے بجلی کی فراہمی سے متعلق عام پروگرام کے تحت بجلی دی گئی۔

زیر نظر مدت میں رقم جمع کرنے سے متعلق اسکیم کے تحت ۲۳۸۷ ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سٹیشنوں کو بجلی دی گئی۔ اس اسکیم کے تحت صارفین کو بجلی کی فراہمی کا خرچ جمع کرنا پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۱۰۱ ایسے نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سٹیشنوں کو بھی چالو کیا گیا جنھیں اس سے پہلے اس لیے بجلی نہیں دی جا سکی تھی کہ ان کے مالکوں نے اپنی تنصیبات مکمل نہیں کی تھیں حالانکہ انھیں بجلی دینے کے لیے بجلی بورڈ نے ضروری ذیلی بجلی گھروں اور بجلی کی ترسیلی لائنوں کا بندوبست کر دیا تھا۔

× × ×

پری سیزن انڈسٹریز فیکٹری لکھنؤ نے پلاسٹک کے پانی کے میٹر تیار کرنے کی اسکیم بنائی ہے۔ پانی کے اس میٹر میں ساری اندرونی مشین پلاسٹک کی ہوگی۔ اس سلسلے میں ابتدائی کام شروع ہو گیا ہے اور پانی کے میٹر میں دھات کے بجائے کچھ اہم پرزوں کی جگہ پلاسٹک کے پرزے لگانے میں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ غیر ملکی تعاون سے چلنے والی کچھ فرموں کے تیار کیے ہوئے پانی کے سستے پلاسٹک کے میٹروں کی وجہ سے مذکورہ بالا سرکاری فیکٹری کے تیار کردہ میٹروں کی مانگ کم ہو گئی تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر سرکاری فیکٹری نے پانی کے میٹروں کی لاگت گھٹانے کے لیے پلاسٹک کے پرزوں کے استعمال کے ساتھ ہی اپنے پیداواری طریقوں کو جدید بنانے کی اسکیم بھی مرتب کی ہے۔

پلاسٹک کے پانی میٹر تیار کرنے کے لیے ریاست کے چوتھے پنج سالہ منصوبے میں ۱۵ لاکھ روپے کا ایک پروگرام بھی شامل کیا گیا ہے۔

اس وقت فیکٹری کو ۸۰۰۰ پانی کے میٹر، ۶۰۰ خوردبینیں اور دباؤ ناپنے کے ۱۲۰۰۰ آلات تیار کرنے کا لائسنس حاصل ہے۔

× × ×

جھانسی اور مرزاپور کے اضلاع کے مغربی حصوں میں جنھیں اب تک معدنیات کے نقطۂ نظر سے بیکار سمجھا جاتا تھا، خام لوہا، تانبہ، سیسہ، خام جست وغیرہ کے ذخائر دریافت کیے گئے ہیں۔

یہ ذخائر ریاستی نظامت ارضیات و کان کنی کی جانب سے ان اضلاع کے وسیع علاقے میں ایک سروے کے دوران میں دریافت کیے گئے تھے۔

اب معدنی اعتبار سے یہ اہم مقامات ہو گئے ہیں اور غالباً انھیں ہمالیہ کے معدنی ذخیروں کے علاقے سے بھی زیادہ اہمیت دی جائے گی۔

ضلع جھانسی میں لوہے کی تجارتی کانیں ملنے کا قوی امکان ہے اور جلد ہی وہاں اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر کام شروع کیا جائے گا۔

× × ×

ریاستی حکومت نے دیگر ممالک خاص طور پر برما اور افریقہ کے علاقوں سے ہندوستان واپس آنے والے ہندوستانیوں کے بچوں کو مشترکہ پری میڈیکل ٹیسٹ میں شرکت کرنے کے لیے اترپردیش کے واقعی باشندے ہونے کی شرط سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ ایسے طلبا کے معاملے میں واقعی صورت حال کا تعین متعلقہ ضلع مجسٹریٹ کریں گے۔ اس سلسلے میں ان طلبا کو ضلع مجسٹریٹوں سے سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوں گے جن پر ضلع مجسٹریٹوں کے دستخط ہوں گے اور اُن کی مہر ثبت ہوگی۔ سرٹیفکیٹ میں یہ وضاحت ہوگی کہ وہ کس ملک سے واپس آنے والے ہندوستانی کی اولاد ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ مذکورہ ٹیسٹ کے لیے مخصوص درخواست کے فارم میں ہی ہوگا اور اسی پر پیش کرنا ہوگا۔ یہ سرٹیفکیٹ الگ کاغذ پر قبول نہیں کیا جائے گا۔

یہ حکم ۱۹۶۹ء کے مشترکہ پری میڈیکل ٹیسٹ سے نافذ ہوگا۔

× × ×

اترپردیش میں مالیاتی سال رواں کے دوران ۱۳۲ کے۔ وی کی بارہ ٹرانسمیشن لائنیں مکمل اور چالو کی جائیں گی۔ ان لائنوں پر تخمیناً ۷۸۶ لاکھ روپے کی لاگت آئے گی اور ان کی مجموعی لمبائی ۸۳۰ سرکٹ کلومیٹر ہوگی۔

ان لائنوں سے یو۔ پی گرڈ کے کسی بھی حصے میں بجلی بھیجنے اور منتقل کرنے میں مدد ملے گی۔ یہ ۱۳۲ کے۔ وی کی لائنیں مختلف علاقوں کی بجلی کی مانگ پوری کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ ان کے ذریعہ خاص گرڈ کے ذیلی اسٹیشنوں سے خاص مقام تک بجلی لے جائی جاتی ہے جہاں سے صارفین تک پہنچائی جاتی ہے۔

ان میں سے ہاتھرس — آگرہ، مین پوری — اٹاوہ، مین پوری — اٹاوہ اور سلطانپور — ٹانڈہ لائنیں مکمل ہو گئی ہیں اور انھیں چالو بھی کر دیا گیا ہے۔

شاہجہانپور — بریلی، فیض آباد — گونڈہ، گورکھپور — گیا، وارانسی — جونپور، لکھنؤ — سیتاپور، ہاتھرس — متھرا اور سلطانپور — رائے بریلی لائنوں پر تیزی سے کام کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ ان میں سے بیشتر لائنیں ۱۹۶۸ء کے آخر تک مکمل ہو جائیں گی۔

× × ×

اترپردیش کے چلنے والے سب سے بڑے تھرمل بجلی گھر ہردوا گنج میں حال ہی میں ریاستی بجلی بورڈ کے انجینیئر ممبر شری این۔ کے۔ بنرجی نے

۵۰ میگاواٹ کی دوسری مشین کو بطور آزمائش کامیابی سے چلایا۔ اس مشین کو جلد ہی چالو کیا جائے گا اور اس سے کاروباری اغراض کے لیے بجلی حاصل کی جائے گی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے شری بنرجی نے روسی ماہرین کی تعریف کی جن کے تعاون سے اس مشین کو لگایا گیا ہے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۵۰ میگاواٹ کے پہلے سیٹ کا گورنر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نے گزشتہ ۲۲ اپریل کو افتتاح کیا تھا۔

یہ دونوں مشینیں ہردوا گنج بجلی گھر کے توسیعی پراجیکٹ کے مرحلہ سوم کے تحت روسی تعاون سے لگائی گئی ہیں۔ اس مشین کے چالو ہو جانے پر ہردوا گنج بجلی گھر کی پیداواری صلاحیت ۲۱۰ ایم۔ ڈبلو ہو جائے گی۔

× × ×

ضلع ہمیر پور میں چندراول باندھ کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری ہے۔ خاص باندھ پر مٹی کا کام قریب قریب مکمل ہو گیا ہے اور نہروں کی تعمیر تیزی سے کی جا رہی ہے۔

چندراول باندھ جس کی تخمینی لاگت ایک کروڑ روپیہ ہے، شہر مہوبا سے تقریباً دس میل شمال میں ضلع ہمیر پور میں چندراول ندی پر تعمیر کیا جا رہا ہے، جو کین کی ایک معاون ندی ہے۔

یہ باندھ تین میل پانچ فرلانگ لمبا اور ۵۱ فٹ اونچا ہوگا اور اس میں ۱۲۷۶۰ لاکھ مکعب فٹ پانی جمع کرنے کی گنجائش ہوگی اور اس سے ضلع ہمیر پور میں لمنا نالہ اور چندراول ندی اور دسنی اور چندراول کے درمیان دوآبوں کی ۱۰۶۴۷۰ ایکڑ آراضی کے لیے آب پاشی کی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔ اس پراجیکٹ کے تحت ۵۳ میل لمبی نہریں تعمیر کی جائیں گی۔ ان میں سے نو میل لمبی نہریں مالیاتی سال رواں کے دوران مکمل کی جائیں گی۔

× × ×

ریاستی حکومت نے کم آمدنی اور درمیانی آمدنی والے طبقوں کے لیے بیمہ مکانات اسکیموں کے تحت مکانات کی تعمیر کے لیے لوکل باڈیز ہاؤسنگ بورڈ کے توسط سے قرضے دینے کے بجائے براہِ راست قرضے دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ قرضے کی رقم کسی شخص کو دینے کے بجائے براہِ راست لوکل باڈیز کو دی جائے جو اس قرضے سے صرف اپنی ایجنسی کے ذریعے مکانات کی تعمیر کرائیں۔

ہاؤسنگ بورڈ کم آمدنی اور درمیانی آمدنی والوں کے لیے تعمیر مکانات کی اسکیموں کے تحت اتر پردیش کے ایسے شہروں میں افراد کو قرضے تقسیم کرے گا جہاں یو۔پی آواس ایوم وکاس پریشد ادھنیم ۱۹۶۵ء نافذ ہے۔

مذکورہ بالا ایکٹ کا دائرہ شہروں کے میونسپل کارپوریشنوں کے حدود، یو۔پی نگر پالیکا ادھنیم ۱۹۵۹ء کے تحت اعلان شدہ علاقوں نیز دہرہ دون، سہارن پور، میرٹھ، علی گڑھ، مراد آباد، بریلی، شاہ جہاں پور، جھانسی، فیض آباد اور گورکھپور کے دس شہروں میں نافذ ہے جہاں یو۔پی ٹاؤن امپرومنٹ ایکٹ ۱۹۱۹ء نافذ کیا گیا تھا۔

× × ×

ریاستی حکومت نے دیہی علاقوں میں رہنے والے چھوٹے پیشوں میں لگے ہوئے اقوام مندرجہ فہرست کے افراد کو مالیاتی سال رواں کے دوران تعمیر مکانات کے لیے مالی امداد دینے کے واسطے دو لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے۔ یہ رقم صرف چھوٹے پیشوں مثلاً کھال اتارنے، صفائی کا کام کرنے، کپڑے دھونے اور سور پالنے سے متعلق پیشوں کے افراد کو بھی مالی امداد دینے پر صرف کی جائے گی۔

اس اسکیم کے تحت ایک مکان کی تعمیر کی لاگت ۱۲۰۰ روپے مقرر کی گئی ہے۔ مخصوص حالات میں اور کالی مٹی کے علاقوں، پٹھار اور دور دراز کے مقامات میں لاگت ۱۶۰۰ روپے مقرر کی گئی ہے۔ ہمالہ کے سرحدی علاقوں میں جہاں بہت زیادہ برفباری ہوتی ہے، یہ لاگت ۲۰۰۰ روپے فی مکان کی شرح سے لی جا سکتی ہے۔ حکومت مکان کی لاگت کے ۵۰ فی صد کے برابر رقم دے گی اور بقیہ رقم خود مالی امداد سے مستفید ہونے والے کو نقد روپے، مکان کی تعمیر کے لیے درکار سامان یا محنت کی شکل میں دینا ہوگی۔

دیہی علاقوں کے اقوام مندرجہ فہرست کے جو لوگ چھوٹے پیشوں میں لگے ہوئے ہیں وہ اگر تعمیر مکانات کے لیے مالی امداد حاصل کرنا چاہتے ہوں تو انھیں چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں اپنے ضلع کے ہریجن و سماج فلاح افسر کو اپنی درخواستیں جلد سے جلد بھیج دیں۔

× × ×

لکھنؤ شہر میں خاندانی منصوبہ بندی کے معاملے میں مردوں کے مقابلے میں خواتین زیادہ حساس ہیں جب کہ دیہی علاقوں میں صورت حال

محکمۂ صحت کے حالیہ اعداد و شمار کے مطابق یکم اپریل سے ۳۰ ستمبر تک لکھنؤ شہر کے جن مردوں نے لوپ کا طریقہ اختیار کیا ان کی تعداد ۲۰۲۲ ہے۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۰ مردوں نے نس بندی کرائی۔ اسی مدت میں ضلع کے دیہاتوں میں ۹۶۸ مردوں کی نس بندی کی گئی اور ۶۵۶ لوپ لگائے گئے۔

شہری علاقے میں ریڈ کراس اور ڈفرن اسپتال میں لوپ لگانے اور نس بندی کرنے کی تعداد سب سے زیادہ رہی۔ ضلع کے دیہی علاقوں میں تالاب، موہن لال گنج، گوشائیں گنج، ملیح آباد اور سروجنی نگر کے علاقوں میں اچھا کام ہوا۔

لوپ لگانے اور نس بندی کرنے کے سلسلے میں سال بھر کے لیے جو نشانے مقرر کیے گئے ہیں ان میں گزشتہ ۳۰ ستمبر تک علی الترتیب ۵ ر ۴۲ ۷۰ فی صد کامیابی حاصل کی جا چکی ہے۔

▼ اتر پردیش کے ضلع مجسٹریٹوں اور محکمہ علاج و صحت کے افسروں کا ایک جلسہ حال ہی میں ودھان بھون میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کی رفتار تیز کرنے اور اس پر عمل درآمد میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کے لیے منعقد ہوا۔

محکمۂ صحت کے سکریٹری شری مہیشور پرشاد نے کہا کہ اتر پردیش کی پوزیشن دوسری ریاستوں سے اس لحاظ سے کم تر ہے کہ یہاں ابتدائی صحت مرکزوں کی تعداد کم ہے۔ انھوں نے کہا کہ چوتھے منصوبے میں بڑی تعداد میں ابتدائی صحت مراکز اور ذیلی مراکز کھولے جائیں گے۔ انھوں نے ضلع مجسٹریٹوں سے استدعا کی کہ وہ ان مرکزوں کے لیے جائے وقوع اور عملے کا انتخاب کریں تاکہ سرکاری منظوری حاصل ہوتے ہی کام شروع کیا جا سکے۔ انھوں نے ضلع مجسٹریٹوں کو مطلع کیا کہ حکومت ہند نے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ ابتدائی صحت مراکز قائم کرنے کے سلسلے میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔

صحت سکریٹری نے خاندانی منصوبہ بندی کے پرچار کے کام کی رفتار تیز تر کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ مخالف پروپیگنڈے کی فوراً تردید کی جائے۔ اس کے علاوہ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل پیرا ہونے کے نتیجے میں لوگوں کو جن سہولتوں سے محروم ہونا پڑے گا اس کا بھی بڑے پیمانے پر پرچار کیا جائے۔

جوائنٹ سکریٹری محکمۂ صحت نے ریاست میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ مالیاتی سال رواں کے دوران گزشتہ اکتوبر تک ۸۰۰۰۰ نس بندی آپریشن کیے گئے اور ۴۵۰۰۰ لوپ لگائے گئے جب کہ گزشتہ سال اسی مدت کے دوران یہ تعداد بالترتیب ۳۰۰۰۰ اور ۴۵۰۰۰ تھی۔

انھوں نے کہا کہ ضلع مجسٹریٹوں کو خواتین فیلڈ کارکنوں کا انتخاب کر لینا چاہیے اور حکومت سے منظوری ملتے ہی ان کی تقرری کر دینا چاہیے۔

جوائنٹ سکریٹری نے انکشاف کیا کہ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ مسلم خواتین بھی اس پروگرام میں حصہ لے رہی ہیں۔

▼ ریاستی حکومت نے ۷۰-۱۹۶۹ء کے تعلیمی سال سے محکمۂ تعلیم کے زیر انتظام تربیتی اداروں میں تربیت حاصل کرنے والے ایسے افراد کو وظیفہ کی سہولت سے محروم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو اپنے خاندان کو چھوٹا رکھنے کے اصول پر عمل پیرا نہیں ہیں۔

ایک چھوٹے خاندان سے مراد زیادہ سے زیادہ تین بچوں پر مشتمل کنبہ ہے۔ اس فیصلے کے مطابق ایسے تربیت حاصل کرنے والوں کو جن کے ۷۰-۱۹۶۹ء کے تعلیمی سال کے یکم جولائی سے شروع ہونے سے قبل تین یا تین سے زیادہ بچے ہیں وظیفے دیے جائیں گے لیکن تعلیمی سال شروع ہونے کے بعد اگر ان کے بچوں کی تعداد میں کوئی اضافہ ہوگا تو وہ وظیفہ حاصل کرنے کے اہل نہیں رہیں گے۔ ایسے تربیت پانے والوں کو جن کے یکم جولائی ۱۹۶۹ء کو تین سے کم بچے ہوں گے اس وقت تک وظیفہ ملتا رہے گا جب تک ان کے بچوں کی تعداد تین سے زیادہ نہ ہو جائے۔

▼ ریاستی حکومت خاندانی منصوبہ بندی پروگرام پر عمل درآمد کے سلسلے میں سماج کے با اثر غیر سرکاری افراد کا سرگرم تعاون حاصل کرنے کے پیش نظر ۲ اکتوبر تک ۱،۰۵۰ معاونین کی تقرری کرے گی۔

ہر بلاک ابتدائی صحت مرکز میں ایسے دو معاونین رکھے جائیں گے جو ممتاز حوصلہ مند عوامی کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ خاندانی منصوبہ بندی پروگرام میں یقین بھی رکھتے ہوں۔

ہر معاون کو ۵۰ روپے ماہانہ کی مقررہ رقم دی جائے گی اور ان سے یہ توقع کی جائے گی کہ وہ ہر ماہ لوپ کے لیے کم سے کم چار عورتوں یا نس بندی کے لیے چھ مردوں کو رضامند کریں گے۔

× × ×

حکومت اتر پردیش نے طے کیا ہے کہ آئندہ تمام صنعتی قرضوں کی تقسیم اتر پردیش مالیات کارپوریشن کے توسط سے کی جائے گی۔ اس نئے بندوبست سے صنعتی قرضوں کے مناسب استعمال کی توقع کی جاتی ہے کیونکہ مذکورہ کارپوریشن کی طرف سے تکنیکی جانچ اور مناسب نگرانی کے نتیجے میں ان قرضوں کا بہتر استعمال ہوا ہے۔

قرضوں اور مالی امداد اسکیم کے تحت چھوٹی صنعتوں کے قیام اور توسیع ترقی کے لیے افراد رجسٹرڈ امداد باہمی انجمنوں اور دیگر رجسٹرڈ تنظیموں کو مالی امداد دی جاتی ہے۔ قرضوں اور مالی امداد سے متعلق اسکیم چھوٹی صنعتوں کے فروغ کے سلسلے میں کارآمد ثابت ہوئی ہے اور گزشتہ تین پنج سالہ منصوبوں کے دوران اس کی مقبولیت میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ پہلے منصوبے کے دوران ۱۰۶ لاکھ روپیہ دوسرے منصوبے کے دوران ۶۵ر۱ کروڑ روپیہ اور تیسرے منصوبے کی مدت میں ۱۲ر۴۰۰ کروڑ روپیہ قرضوں کی شکل میں تقسیم کیا گیا۔

ریاست کے مجوزہ چوتھے پنج سالہ منصوبے میں چھوٹی صنعتوں کے ذریعے قرضے اور مالی امداد دینے کے لیے چھ کروڑ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

× × ×

یو۔ پی ریاستی زراعتی صنعت کارپوریشن نے ضلع لکھنؤ کے کسانوں کو زراعت سے متعلق کاموں میں مدد دینے کے لیے کرائے پر جتائی اور گڑائی وغیرہ کی شروعات کی ہے۔ یہ سہولتیں پیشگی رقم کی ادائیگی کی اولیت کی بنیاد پر فراہم کی جائیں گی۔ مختلف کاموں کے لیے کرائے کی شرحیں حسب ذیل ہیں:

زمین کی پہلی توڑائی ۲۵ روپے کھیت کی جتائی ۲۰ روپیہ ڈسک ہیرو سے پہلی ہنگائی ۱۶ روپے اور دوسری ہنگائی ۱۵ روپے اور کلٹی ویٹر سے جتائی ۱۵ روپے فی ایکڑ۔ ساڑھے سات ہارس پاور تھریشر سے گیہوں کی گڑائی ۱۶ روپے پانچ ہارس پاور تھریشر سے گیہوں کی گڑائی ۱۵ روپے اور پمپ سے پانی اٹھانے کے لیے ۲ روپیہ فی گھنٹہ اور ہر مشین کو لے جانے کا صرفہ ۱۵۰ پیسہ فی میل۔ ان سہولتوں کے خواہش مند کسانوں کو پراجیکٹ افسر، زراعتی ورکشاپ تالکٹورہ لکھنؤ سے رجوع کرنا چاہیے۔

× × ×

ضلع نینی تال میں ستارگنج میں کھلے مقام پر واقع سپرنٹنڈ کیمپ نے ۶۸-۱۹۶۷ء کے دوران زراعت اور چھوٹی زراعتی صنعتوں سے ۲۶۹ ۱۴۵۱ روپے کا منافع حاصل کیا۔ ان صنعتوں میں گڑ بنانا، سرسوں کا تیل نکالنا اور مشین سے دھان کی کٹائی شامل ہیں۔ اس کیمپ کی آمدنی میں زبردست اضافے کا سبب یہ ہے کہ زیر نظر سال میں گزشتہ سال کے مقابلے میں قریب قریب دوگنی زراعتی پیداوار ہوئی۔ کیمپ میں ۶۸-۱۹۶۷ء میں ۱۶۸۰۰ کوئنٹل غلہ پیدا ہوا جب کہ ۶۷-۱۹۶۶ء میں ۸۶۰۰ کوئنٹل اناج پیدا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کیمپ میں اس سال زیادہ گنا اور ترکاریاں بھی پیدا ہوئیں۔

متفرقات

مزدوروں کو ۶ لاکھ سے زائد کی مالی امداد۔ اتر پردیش میں گزشتہ جولائی کے دوران بیمہ شدہ صنعتی مزدوروں کو مجموعی طور پر ۶۔۵۱۴۳ روپے کی رقم بیماری اور کام کے دوران چوٹ لگنے کے سلسلے میں ادا کی گئی۔ ریاست کے ۲۸ صنعتی مرکزوں میں ملازمین کی ریاستی بیمہ اسکیم نافذ ہے اور وہاں ۶۶ ۲۱۹۳ فیکٹری مزدوروں کو مفت علاج اور نقد مالی امداد کی سہولتیں حاصل ہیں۔

لازمی سروسوں میں ہڑتال پر پابندی۔ ریاستی حکومت نے اتر پردیش حکومت سے متعلق تمام پبلک سروسوں میں مزید چھ مہینے کے لیے اسٹرائک کرنے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ یہ احکامات یو۔ پی لازمی سروسز ایکٹ ۱۹۶۶ء کی دفعہ ۳ (۱) کے تحت جاری کیے گئے ہیں۔ اسٹرائک کو ممنوع قرار دینے کے یہ احکامات گزشتہ ۲۰ر اپریل ۱۹۶۸ء کو جاری کیے گئے تھے۔

دوکان ایکٹ کا نفاذ۔ حکومت اتر پردیش نے دوکانوں اور کاروباری اداروں سے متعلق ایکٹ ضلع مرزاپور میں چنار سے ملحق علاقے میں بھی ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء سے نافذ کر دیا ہے۔ اس علاقے میں موضع تکور اور چنار ریلوے کیبن (مغرب) سے چنار شہر تک کی سڑک شامل ہے۔

جیپ ڈرائی سیل بیٹریاں سیلس ٹیکس سے مستثنیٰ۔ ریاستی حکومت نے یو۔ پی سیلس ٹیکس ایکٹ کی دفعہ ۴۔ اے۔ کے تحت میسرز جیپ فلیش لائٹ انڈسٹریز لمیٹڈ الہ آباد کی بمرولی (الہ آباد) میں قائم شدہ نئی فیکٹری میں تیار ہونے والی ڈرائی سیل بیٹریوں کو بکری ٹیکس سے تین سال کے لیے مستثنیٰ کر دیا ہے۔

کمبل کے کارخانوں کے لیے کم سے کم اجرت کی شرح۔ حکومت اتر پردیش نے اونی کمبل تیار کرنے والے کارخانوں کو صنعتوں کی فہرست میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے جن میں کم سے کم اجرت کی شرح ضروری کارروائی کے بعد مقرر کی جائے گی۔ مذکورہ فہرست میں یہ بیسواں روزگار ہے جس کو شامل کیا گیا ہے۔

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

تذکرہ

مصنف جناب ابوالکلام آزاد مرحوم، قیمت پندرہ روپے
صفحات ۴۲۲ — کتابت و طباعت دیدہ زیب

زیر نظر تذکرہ ملک کے مشہور فاضل ادیب جناب مالک رام کا ترتیب دیا ہوا ہے اور ساہتیہ اکادمی نئی دلی کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ فاضل مرتب تدوین و ترتیب میں ید طولےٰ رکھتے ہیں۔ ان کی یہ امتیازی خصوصیت تذکرہ کے موجودہ اڈیشن کی ترتیب و تہذیب میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے تذکرہ کا خاصا جامع و مانع "پیش لفظ" بھی لکھا ہے۔ اس سے بعض وہ غلط فہمیاں بھی دفع ہو جاتی ہیں جو تذکرہ کو جناب فضل الدین احمد کے مقدمہ کی عینک سے دیکھ کر پیدا ہو سکتی تھیں۔

تذکرہ کی عبارت بہت زیادہ لغت زدہ ہے اور اس کا سمجھنا اردو کے خاصے پڑھے لکھے اشخاص کے لیے بھی ہفتخوان طے کرنے سے کم نہیں ہے مگر اس کی بھی ذمے داری زیادہ تر جناب فضل الدین احمد صاحب پر عائد ہوتی ہے۔ انھوں نے مولانا آزاد مرحوم کے پیہم اصرار کے باوجود کہ تذکرے کے مسودے جو طباعت کی عجلت میں حوالۂ قلم کیے گئے ہیں نظر ثانی کے لیے ان کے پاس واپس بھیج دیے جائیں، ان پر نظر ثانی کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور انھیں مسودہ ہی کی حالت میں جوش عقیدت کے تحت پریس کے حوالہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ عبارت میں اغلاق و ابہام رہ جائے اور تعقید وغیرہ جیسے ناخوش گوار اسقام کے کانٹے دامن سے الجھتے رہیں اور "ما احسن قول الشاعر" کی جگہ "ما احسن القول الشاعر" نگاہ مطالعہ کے کرب و اذیت کا سامان بنتے رہیں۔ مولانا مرحوم نے "اعتذار" میں ان فروگذاشتوں کی توضیح کر دی ہے۔

جناب فضل الدین احمد صاحب کے مقدمہ میں بعض روایتیں بھی خلاف واقعہ نظر آتی ہیں جو غالباً ان کے قلم سے غیر شعوری طور پر ٹپک پڑی ہیں۔ ایک جگہ انھوں نے تحریر فرمایا ہے — "ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں جو حال سنا ہے اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ اسرار خودی اور رموز بےخودی فی الحقیقت الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں"۔

ڈاکٹر اقبال اپنی جگہ پر خود ایک عظیم مفکر تھے۔ ان کی مثنویوں اسرار خودی اور رموز بےخودی کو الہلال کی صدائے بازگشت قرار دینا ایسی لغزش تھی جس سے ڈاکٹر اقبال کو اذیت محسوس ہونا چاہیے تھی چنانچہ ہوئی اور انھوں نے اس کی شکایت مولانا سلیمان ندوی مرحوم سے کی۔ لیکن حقیقۃً مولانا ابوالکلام مرحوم پر مقدمہ نگار کی اس لغزش قلم کی ذمے داری کسی تعلق کی بنا پر عائد نہیں ہوتی۔ بالخصوص جب کہ یہ ان کی اجازت اور اطلاع کے بغیر لکھا گیا ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے مولانا سلیمان ندوی کے خط کے جواب میں صاف صاف ان امور کی وضاحت کر دی ہے اور علامہ اقبال کی غلط فہمی رفع کر دی ہے۔

خیر کتاب تذکرہ مذہب و مذہبیات سے متعلق ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ان سے لازماً اتفاق کیا جائے مگر اس کا اقرار ناگزیر ہے کہ مولانا کی انفرادی و مخصوص فکر کی چھاپ قریب قریب ہر مقام پر موجود ہے۔ "سبیل شرعیہ" سے مولانا آزاد نے کافی بسط و تفصیل سے بحث کی ہے اور اس سلسلے میں بعض بڑی اچھی دل پذیر باتیں لکھی ہیں۔

چوں کہ مولانا "اصلاح و تذکیر امت" کا فریضہ ادا کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہیں کہیں تذکرہ میں "ادعائی خطابت" کا تیز و تند رنگ آ گیا ہے اور لہجہ میں کہیں درشتی پیدا ہو گئی ہے مگر اس میں بھی ایک طرح کا مزہ ہے۔ کیف ہے۔

آخر میں جناب مالک رام کو اس کی مبارکباد دیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے کتاب تذکرہ پر مفید حواشی کا اضافہ کر کے جو صفحہ ۳۴۱ سے صفحہ ۴۰۲ تک پھیلے ہوئے ہیں اور صفحہ ۴۰۳ سے صفحہ ۴۲۲ تک دوسری معلوماتی فہرستیں بڑھا کر تذکرہ کے موجودہ اڈیشن کو بہت زیادہ معیاری اور ساہتیہ اکادمی کے جانب سے ترتیب دی جانے والی کتابوں میں درجۂ اول کی چیز بنا دیا ہے۔

——— سید اختر علی تلہری

گل صحرا

از: طالب جے پوری قیمت دو روپے صفحات ۱۰۰
ملنے کا پتہ: طالب جے پوری نمبر ۸ ایسلنگز روڈ۔ الہ آباد

گل صحرا جناب طالب جے پوری کی غزلوں اور نظموں کا نہایت دل کش مجموعہ ہے۔ شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب دعوت کام و دہن دیتی ہے اور ایک قابل قدر رفعت کی حیثیت رکھتی ہے۔ بجائے شدت جذبات کے اس کتاب کے اشعار پختگی جذبات اور پاکیزگی جذبات کے نمونے ہیں۔ طالب جے پوری کے کلام میں ایک توازن اور اعتدال ہے جس سے ایک خاموش تاثر پیدا ہوتی ہے۔ یہ مجموعہ رسمی شاعری نہیں ہے بلکہ ایک انسانی دستاویز ہے مجھے اس مجموعے میں خامی یا عیب کہیں نظر نہیں آیا۔ ایک پُر خلوص اور رچی ہوئی شخصیت کا عکس اس مجموعے کے اکثر اشعار میں نظر آتا ہے۔ ایک حسین و لطیف انفرادیت اکثر اشعار میں جھلکتی ہے۔

——— فراق گورکھپوری

ہدیۂ عقیدت

مرتبہ: ڈاکٹر افضال احمد۔ صفحات ۱۴۴

پنڈت میلا رام صاحب وفا کی ۷۰ ویں سال گرہ کے سلسلے میں ۱۷ نومبر ۶۸ء کو بمقام رفاہ عام کلب لکھنؤ میں انجمن یادگار آرزو لکھنوی کی جانب سے جشن منایا گیا۔ یہ مختصر سا مجموعہ اسی موقع پر جناب وفا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جشن وفا کا افتتاح گورنر اترپردیش جناب ڈاکٹر گوپال ریڈی صاحب نے کیا۔ اس موقع پر ایک مشاعرہ کا بھی انتظام کیا گیا تھا جس میں مقامی شعرا کے علاوہ باہر کے شعرا میں جناب جگن ناتھ آزاد بھی شریک تھے۔

پنڈت میلا رام وفا کی ذات یوں بھی محتاج تعارف نہیں لیکن اس مختصر مجموعے میں جو پیغامات اور منظوم و منثری نذرانے عقیدت شامل ہیں ان سے نئی نسل کے لوگوں کو وفا کی شاعری، ادب، صحافت اور سیاست میں مرتبہ اور مقام کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

انجمن یادگار آرزو قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ایک قابل قدر ادیب صحافی کا جشن منا کر ایک قابل تقلید مثال قائم کی ہے۔

——— ادارہ
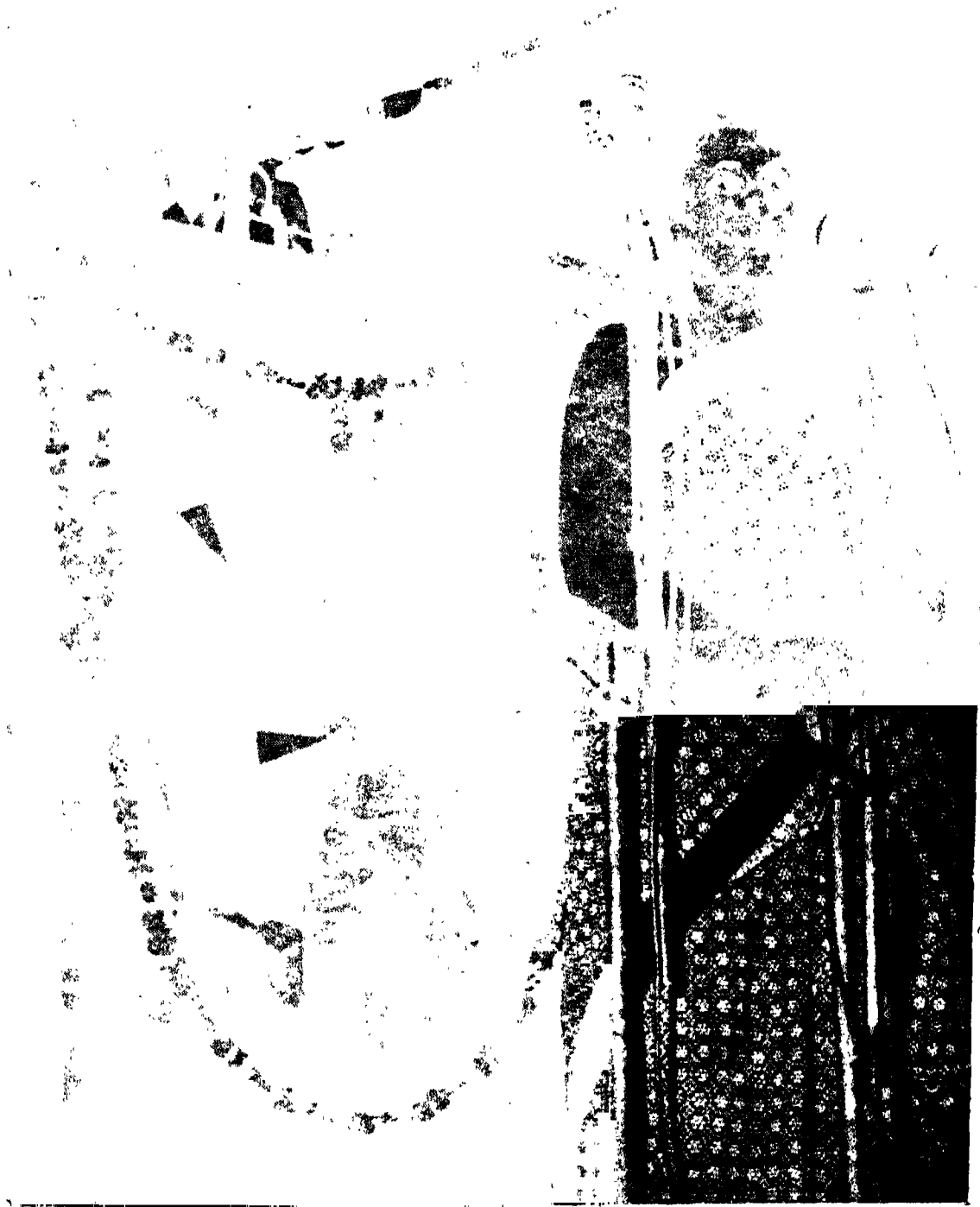
دہلی کے لال قلعے میں ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو آزاد ہند فوج کی پچیسویں سال گرہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی صدارت میں منائی گئی
تصویر میں وزیر اعظم اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے دکھائی دے رہی ہیں

جلد ۲۴ | نمبر ۱۱، ۱۲

ماگھ، پھالگن ۱۸۹۰ شک

فروری، مارچ ۱۹۶۹ عیسوی

چندہ سالانہ: پانچ روپے

فی پرچہ: پچاس پیسے

صرف اس پرچے کی قیمت ایک روپیہ

ایڈیٹر

خورشید احمد

پبلشر

مہیش پرشاد

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر

اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔پی

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ، لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہرحال متفق ہو۔

اس اشاعت کے بعض فرموں میں مہینے کا نام غلط درج ہوگیا ہے۔ اسے فروری مارچ ۱۹۶۹ء اور ماگھ پھاگن ۱۸۹۰ شک پڑھا جائے۔

غالب ــــ اُردو شاعری کا سدا بہار پھول

(ڈاکٹر بی. گوپال ریڈی گورنر اُتر پردیش کا پیغام)

اردو شاعری کے چمن میں بڑے رنگین اور حسین پھول کھلتے رہے ہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، ان پھولوں میں "سدا بہار" اور غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حسین ترین پھول تھے۔ اس پھول کی خوش بو غالب ہی کے عہد میں نہیں، غالبؔ کے بعد بھی پھیلتی رہی اور آج تو وہ سارے زمانے کو معطر کر رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ نے اردو شاعری کو ایک نیا انداز اور نیا موڑ دیا ــــ ایسا موڑ جس نے غالب کے بعد کے اردو شاعروں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔

غالبؔ کے کلام میں اردو شاعری کے روایتی حسن و عشق، ہجر و وصال اور گل و بلبل کی باتوں سے ہٹ کر ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں سماج کو ایک پیغام ملتا ہے۔ اور یہ پیغام ہے وسعت نظر، خودداری، ہمت، ترک رسوم، فراخ دلی اور رواداری کا۔ غالب نے ہمیں یہ بھی سبق دیا ہے کہ انسان بڑی عظیم چیز ہے، اس لیے انسان بننے کی کوشش کرو، حالانکہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ غالبؔ کے چند اشعار، اِدھر اُدھر سے، اس سلسلے میں نمونے کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں:

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم　　الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس　　برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن، اسدؔ　　سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

وفاداری بہ شرطِ استواری عینِ ایماں ہے　　مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غالبؔ کا عشق بھی اردو شاعروں کے عشق سے الگ تھا۔ انھوں نے اپنے عشق میں وضع داری اور خودداری قائم رکھی۔ کہتے ہیں ؎

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا　　تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں　　سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع　　راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں؟

سچ تو یہ ہے کہ غالبؔ کی اسی شاعری نے انھیں ایک بین قومی (INTERNATIONAL) شاعر بنا دیا ہے اور ان کا شمار صرف ہندستان ہی کے نہیں دنیا کے عظیم شاعروں میں کیا جا سکتا ہے۔

نظم کی طرح غالبؔ کی نثر میں بھی ایک انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اُن کے خطوط میں طنز اور مزاح کی جو چاشنی ملتی ہے اور اُن کے خط لکھنے کا جو اسٹائل ہے وہی اُنھیں ایک بڑا ادیب بنانے کے لیے بہت کافی ہے۔ غالبؔ نے اگر شاعری نہ کی ہوتی اور صرف یہ خطوط لکھے ہوتے تب بھی وہ عظیم ہوتے۔ شاعری اور نثر نگاری دونوں نے مل کر تو اُنھیں عظیم تر بنا دیا ہے۔

مرزا غالبؔ نے اردو میں گیارہ اور فارسی میں تیرہ چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے ایک جگہ اپنے فارسی کلام کو "نقشہائے رنگ رنگ" اور اردو کلام کو "بے رنگ" ضرور کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی اردو شاعری کو "رشکِ فارسی" سمجھتے تھے اور بجا طور پر۔ ایک دوسری جگہ وہ کہتے ہیں ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی　　گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

ہندستان اور خاص کر اتر پردیش اس لحاظ سے یقیناً فخر کر سکتا ہے کہ یہ عظیم ہستی اسی پردیش کے شہر آگرہ میں ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں اُنھوں نے لکھنؤ اور بنارس میں بھی قیام کیا اور بنارس کی تعریف میں تو اُنھوں نے ایک مثنوی "چراغِ دیر" بھی لکھی۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کی یاد میں ہندستان اور بعض دوسرے ملکوں میں ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو صد سالہ تقریبات منائی جا رہی ہیں۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ محکمۂ اطلاعات، حکومت اتر پردیش کا اردو ماہنامہ "نیا دور" بھی اس موقع پر ایک غالب نمبر نکال رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ "نیا دور" کا یہ نمبر ہر لحاظ سے بڑا شاندار اور غالبؔ کے شایانِ شان ہوگا۔

بی. گوپال ریڈی

ماگھ/پھاگن ۱۸۹۰ شک

اپنی بات

غالب نمبر پیش خدمت ہے۔ جس وقت ہم نے یہ نمبر شایع کرنے کا ارادہ کیا تھا اس وقت خیال تھا کہ اس کی ضخامت کم و بیش ۱۰۰ صفحات کی ہوگی۔ لیکن رفتہ رفتہ صفحات میں غیر معمولی اضافہ ہو جانے اور بعض دوسری غیر متوقع دشواریوں کے پیش آجانے کی وجہ سے اس کا وقت پر شایع ہونا بے حد دشوار ہو گیا۔ اس لیے یہ طے کیا گیا کہ اسے فروری اور مارچ کا مشترکہ شمارہ قرار دے دیا جائے۔ اس نمبر کی ضخامت کے ۲۰۰ صفحوں تک پہنچ جانے کی وجہ سے جنوری کے شمارے میں غالب نمبر کی اعلان شدہ قیمت پر بھی نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ۵۰ پیسے کے بجائے اب اس کی قیمت ایک روپیہ رکھی گئی ہے جو اس کی ضخامت اس کے دیدہ زیب ٹائٹل، رنگین تصاویر نیز بلند پایہ نظموں اور گراں قدر تحقیقی اور تنقیدی مضامین (جو نیا دور کے لیے مخصوص ہیں) کو دیکھتے ہوئے یقیناً بہت ہی معمولی ہے۔

اس نمبر کے مضامین کی ترتیب کے سلسلے میں بھی ہم یہ عرض کر دینا ضرور سمجھتے ہیں کہ بہت سی نظمیں اور مضامین بڑی تاخیر سے موصول ہوئے اور جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں اس نمبر کے صفحات رفتہ رفتہ اتنے بڑھ گئے کہ بالآخر یہ طے کرنا پڑا کہ جیسے جیسے مضامین وغیرہ کی کتابت مکمل ہوتی جائے، طباعت بھی ساتھ ساتھ ہوتی چلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض مشہور و معروف اور بزرگ تر ادیبوں اور شاعروں کی نظمیں اور مضامین نسبتاً بعد میں درج ہوئے ہیں ورنہ اس سے کوئی اور نتیجہ نکالنا کسی حیثیت سے بھی درست نہ ہوگا۔

اس کا ہمیں افسوس ہے کہ ملک کے بعض ممتاز اہل قلم اور شعرا کی قلمی معاونت اس نمبر کو حاصل نہ ہو سکی جس کی یقیناً بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان میں سے کچھ حضرات کے بارے میں تو ہمیں ذاتی طور سے علم ہے کہ ناگزیر حالات اور واقعی مجبوریوں کی بنا پر ان کا تعاون حاصل نہ ہو سکا اور یقین ہے کہ دیگر حضرات بھی کسی نہ کسی مجبوری ہی کی وجہ سے ہمیں شکر گزاری کا موقع نہ دے سکے ہوں گے۔ ہم کو اس کا بھی افسوس ہے کہ بہت سی نظمیں اور مضامین ایسے وقت موصول ہوئے کہ ان کا اس نمبر میں شامل کیا جانا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا اس لیے مجبوراً انھیں انتہائی معذرت کے ساتھ واپس کرنا پڑا۔

اس نمبر میں کوشش کی گئی ہے کہ اس عظیم شاعر کی شاعری، اس کے فن، اس کے تصور حیات، اس کے اخلاص و محبت، اس کی انسان اور وطن دوستی، اس کے معیار عشق، اس کی "رجائیت و امید پسندی، اس کے غم کو نشاط غم بنا لینے کے سلیقے" اس کی روایت سے بغاوت، اس کے تنقیدی شعور وغیرہ کی ایک جھلک پڑھنے والوں کے سامنے آجائے۔ اس کوشش میں ہمیں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ ناظرین کریں گے۔ ویسے اس احساس کے باوجود کہ ع

لطیف بود حکایت دراز تر گفتیم

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایسے کتنے ہی ضخیم نمبر بھی غالب کی شخصیت، ان کے تصورات و نظریات اور ان کی شاعری کے بنیادی عناصر کو بھرپور اجاگر کرنے سے قاصر نظر آئیں گے۔

آخر میں ہم ان تمام ادیبوں اور شاعروں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنھوں نے اپنے قیمتی لمحات سے کچھ وقت نکال کر اس نمبر کے لیے خصوصی مضامین اور نظمیں عنایت کیں۔ ہم مولانا خیر بہوروی اور جناب نسیم احمد دانش محل کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے تصویریں اور بلاک عنایت فرمائے۔ مرزا غالب آگرے کے جس مکان میں پیدا ہوئے تھے اس کی تصویر اس نمبر میں " غالب اکیڈمی۔ نئی دہلی" کے شکریے کے ساتھ شامل کی جا رہی ہے۔

ایڈیٹر

غالب کی فارسی غزل

سید اختر علی تلہری

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

غالب صرف اردو ہی کے برگزیدہ ترین شعرا میں محسوب نہ تھے بلکہ حقیقت شناس وحقیقت آشنا نگاہوں میں وہ فارسی کے اس سے کہیں زیادہ برتر و بلند تر شاعر تھے۔ اردو کا وہ مجموعۂ شعر جو اب سر آنکھوں پر رکھا جا رہا ہے اور جس کا خاصا بڑا حصہ خاص طور سے اس کا مستحق بھی ہے جسے مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری غالب سے ارادت وعقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے نہ صرف اردو کا بہترین و نفیس ترین صحیفۂ غزل سمجھتے ہیں بلکہ ہندستان میں وید مقدس کے بعد دوسری الہامی کتاب قرار دیتے ہیں اور ان کی نظر میں دنیا کی ہر چیز اس میں موجود ہے خود غالب کی نظر میں شعر وسخن کا بے رنگ مجموعہ ہے۔ انھیں خود اپنے فارسی ہی کے کلام پر ناز تھا وہ اسی کو اپنا اصلی سرمایۂ شعر سمجھتے تھے۔ اسی زبان میں ان کے دعوے کے بموجب ان کے نقاش فکر نے "نقشہائے رنگ رنگ" کے معجز نما نقشے اتارے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ غالب نے اپنی اردو اور فارسی شاعری کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اس سے اتفاق ضروری نہیں ہے مگر جب غور سے ان کی فارسی اور اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ انھوں نے اپنی فارسی اور اردو شاعری کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اس پر مبالغہ کی چھاؤں ذرا بھی نہیں پڑی ہے۔ ان کی اردو شاعری کا کچھ حصہ تو بالکل ہمائی حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ حصہ بالکل بے کیف اور بدمزہ ہے اور شاید اسی حصہ سے متاثر ہو کر ڈاکٹر بجنوری کے برخلاف ڈاکٹر سید عبد اللطیف بلند آہنگی کے ساتھ مبالغہ سے بھرپور یہ دعویٰ کر بیٹھے ہیں کہ غالب کا عظیم شعرا ہی میں شمار نہیں کیا جا سکتا چہ جائے کہ عظیم ترین شعرا میں انھیں محسوب کیا جائے۔ غالب نے ایسے ہی نقادوں کی نکتہ چینیوں سے عاجز ہو کر غالباً یہ شعر کہا ہے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ابتدا میں ضرور ان کی فکر سخن کا توسن تیز خرام و تندگام ادھر ادھر بھٹکتا رہا ہے اور اسے لغزشوں کا شکار رہنا پڑا ہے مگر پھر نامی گرامی اساتذۂ عجم کے تتبع نے جوانی کی مست خرامیوں کی پیدا کردہ اس ہلکی سی کج رفتاری کی اصلاح کر دی۔

غالب نے اپنی فارسی کلیات کی خود نوشتہ تقریظ کے آخر میں لکھا ہے:

"لیکن زیادہ تر اپنی آزادہ روی کی وجہ سے ان لوگوں کے پیچھے چلتا جو حقیقتہً ناواقفان راہ تھے۔ ان کی کج رفتاری کو لغزش مستانہ سمجھتا۔ یہاں تک کہ جو لوگ میخانۂ شاعری کے اصل بادہ گسار تھے انھوں نے جب مجھ میں شعر وسخن کی غیر معمولی صلاحیتیں پائیں تو انھیں مجھ سے دلی ہمدردی پیدا ہوئی میری شعر گوئی کی آوارہ خرامیوں پر انھیں اذیت محسوس ہوئی انھوں نے معلمانہ طور سے میری طرف نظر کی۔ سیدھے راستے کی جانب میری ہدایت کی۔ شیخ علی حزیں نے خندۂ زیر لبی کے ساتھ مجھے میری شعر وسخن کی بے راہ روی کی طرف متوجہ کیا۔ طالب آملی کی زہر نگاہی عرفی شیرازی کی قہر بھری نظر نے میری غلط خرامیاں اور ناروا قدم کی جنبشوں کا مادہ ہی جلا ڈالا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی دعوتوں کی

سرگرمی سے میرے بازو پر تعویذ اور کمر پر توشہ باندھ دیا۔ نظیری لاابالی خرام نے اپنی خاص روش پہ مجھے چلنا سکھایا۔ اس فرشتہ خصلت گروہ کی تعلیم و تربیت کی برکت سے میرے قلم کی رفتار میں خوش خرامی، خوش نفسگی، بلند پروازی کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ ان اوراق میں قطعہ، مثنوی، قصیدہ، غزل اور رباعی کا جتنا حصہ جمع کیا جا سکا ہے وہ دس ہزار چار سو چوبیس بیتوں پر مشتمل ہے۔ ان سب میں تاثیر کی شوخی یا تقریر کی دل پذیری بدرجہ اتم موجود ہے الخ"

غالب کی اس خود نوشتہ تقریظ کے مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ غالب کی فارسی شاعری کن سامی منزلت اساتذۂ عجم کے روحانی تصرفات کے سایہ میں پروان چڑھی ہے۔ انھیں محترم اساتذہ کے تتبع و اتباع نے ان کے فارسی کلام میں غیر معمولی شادابی پیدا کی ہے۔ اسی سے اس میں "خمار چشم ساقی" کی کیف آور رنگینی اور سرمستی کے واضح نشان ملتے ہیں۔ اسی کا یہ مبارک نتیجہ ہے کہ وہ عجم کے نغز و دل آویز زبان و بیان کے رنگ حسن میں شرابور ہو کر ان اساتذہ کے ساتھ بیشتر عنان در عنان چلتے ہیں اور کبھی کبھی آگے بھی نکل جاتے ہیں۔ یہ خصوصی امتیاز اس دور کے ایک ہندی نژاد شاعر کے لیے جبکہ فارسی شعر کے ذوق کے آتش کدہ کی چنگاریاں اس ملک میں قریب قریب بجھ چکی تھیں اعجاز سے کم نہیں ہے۔

ان کے بیشتر قطعات و رباعیات عصری حالات و رجحانات کے ترجمان ہیں۔ ان کے قصائد کا بڑا حصہ بالخصوص ان کی تشبیبیں تمہیدیں نہایت ہی شان دار ہیں۔ ان کی غزلوں کا اسلوب نظم سنجیدہ ہے۔ ان کی تخییل حکیمانہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے ہر صنف سخن سے تفصیلی بحث کی جائے مگر اس کے لیے خاصے وقت کی ضرورت ہے۔ سردست غالب کی غزلوں ہی کے کوزۂ ہائے قند و نبات سے قارئین کرام کے لب دنداں کے شیریں کام کرنے سے تعلق رکھا جائے گا۔

کلیات غالب مطبوعہ لاہور باہتمام شیخ مبارک علی ناشر و تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ میں ان کی فارسی کی جو غزلیں درج کی گئی ہیں ان کی تعداد قریب قریب تین سو تیس ہے۔ ان میں چند مسلسل غزلیں ہیں اور جو مسلسل غزلیں نہیں ہیں ان میں شامل اشعار منفرد حیثیت رکھنے کے باوجود نوعی تضاد نہیں رکھتے۔ بلکہ غزل کے مزاج میں تنوع و گوناگونیِ خیالات کے باوصف مخصوص نوعیت کی دبی دبی لطیف سی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس سے ان کی غزل میں خوش گوار کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل کی حقیقی توانائی کی نفسیات کے وہ محرم راز ہیں۔ اس سلسلے میں یہ گزارش ضروری ہے کہ فارسی اور اردو میں غزل مسلسل کا سلسلہ دور تک دراز نہیں ہوا ہے۔ بعض شاعروں نے دو تین یا چار شعر کے قطعات کا غزل میں پیوند ضرور لگایا ہے، مگر یہ درمیانی قطعات غزل مسلسل کی جگہ نہیں لے سکتے۔ غالب نے فارسی غزل میں اس کی کافی چاشنی پیدا کی ہے اور بہت لطف سے پیدا کی ہے۔ ذیل میں ان کی تین مسلسل غزلوں کے اقتباس دیے جا رہے ہیں۔ ان سے اس کا اندازہ ہو سکے گا کہ غالب کو غزل مسلسل سے خاصا لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مسلسل غزل کا رنگ کہیں پھیکا نہیں پڑتا بلکہ وہ خاصا دل آویز و دل فریب نظر آتا ہے۔

(۱) تابم ز دل برد کافر ادائے — بالا بلندے کوتہ قبائے

میرے دل سے صبر و قرار ایک کافر ادا چھین لے گیا۔ اس کا قد ذرا بلند تھا مگر اس کی قبا بہت ہی چست اور تنگ تھی۔

از خوے ناخوش دوزخ نہیبے — وز روے دل کش مینو لقائے

اپنی بدمزاجی سے وہ "دوزخ نہیب" جہنم کی ڈراونی شان رکھتا تھا۔ اپنے دلکش چہرے کی وجہ سے جنت منظر اور بہشت جمال تھا۔

زردشت کیشے آتش پرستے — برسم گذارے زمزم سرائے

اس کا آئین زردشتی تھا۔ وہ آتش پرست تھا۔ عبادت یا نہاتے یا کھاتے وقت برسم (جھاؤ یا انار وغیرہ کی بالشت بھر کی لکڑیاں) ہاتھ میں لے کر زمزمہ سرائی کرتا تھا۔

چوں مرگ ناگہ بسیار تلخے — چوں جان شیریں اندک وفائے

مرگ مفاجات کی طرح نہایت کڑوا اور تلخ مزاج تھا۔ جان شیریں (عزیز جان) کی طرح اس میں وفا کا مادہ بہت کم تھا۔

در کام بخشی ممسک امیرے — در دلستانی مبرم گدائے

کسی کا مقصد پورا کرنے میں وہ بخیل امیر اور دل لینے میں ضدی فقیر تھا

گستاخ سازے پوزش پسندے — طاقت گدازے صبر آزمائے

گستاخ بنانے والا (اور پھر) معذرت پسند تھا۔ طاقت گداز اور صبر آزما تھا۔

در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے — در مہربانی بستاں سرائے

کینہ ورزی میں تپتے ہوئے جنگل کی مثال اور جب مہربانی پر آتا تو باغ و بہار معلوم ہوتا تھا۔

---

[1] برسم گزار اور زمزم سرا آتش پرست کو کہتے ہیں۔ زمزم (زمزمہ) وہ دعا ہے جو آتش پرست برسم ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں۔ (اختر علی تلہری)

از زلفِ پر خم مشکیں نقابے　　　از تابشِ تن زریں ادا ے

اپنے گیسوئے خم بہ خم کی وجہ سے وہ مشکیں نقاب تھا جسم کی چمک دمک اور حسن کی وجہ سے (گویا) وہ زرکار چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

(۲)　بتے دارم از اہل دل رم گرفتہ　　　بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ

میرا ایسا معشوق ہے جو دل والوں سے گریزاں رہتا ہے۔ ان سے دور بھاگتا ہے شوخی سے دل کو اپنے سے جدا کر دیا ہے۔

ز سفاک گفتن چو گل بر شگفتہ　　　دریں شیوگی خود را مسلم گرفتہ

اگر اسے سفاک و خوں ریز کہا جائے تو وہ پھول کی طرح شگفتہ ہو جاتا ہے! اس انداز خوں ریزی میں وہ اپنے کو منفرد جانتا ہے۔

برخسارہ عرض گلستاں ربودہ　　　بہ ہنگامہ عرضِ جہنم گرفتہ

اپنے رخسارے کی رنگینی کی وجہ سے اس نے چمنستاں کی آبرو لے لی۔ اپنی ہنگامہ آفرینی کی وجہ سے اس نے جہنم کو گرد کر دیا۔

گہے طعنہ بر لحن مطرب سرزدہ　　　گہے خردہ بر نطق ہمدم گرفتہ

کبھی وہ مطرب (گویے) کے لحن و نغمہ پر طعنہ زنی کرتا ہے۔ کبھی اپنے ہم نشین کی گویائی میں کیڑے نکالتا ہے۔

(۳)　بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم　　　قضا بگردشِ رطل گراں بگردانیم

غالب معشوق سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے دوست تو آجا۔ تاکہ آسمان کا یہ قاعدہ کہ وہ محبوب کو اپنے حبیب سے ملنے نہیں دیتا ہم تم دونوں مل کر پلٹ دیں اور قضا و قدر کے حکم کو ساغر بادۂ ناب کی گردش سے الٹ دیں۔

بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم　　　بکوچہ بر سر رہ پاسباں بگردانیم

ایک گوشہ میں بیٹھ جائیں اور دروازے کو بند کر لیں اور چوکی دار سے یہ کہہ دیں کہ وہ کوچہ میں پھرتا رہے۔

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم　　　دگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

اگر داروغہ کی طرف سے گیر و دار ہو تو ہم اس کی مطلق فکر نہ کریں اور اگر بادشاہ کی جانب سے کوئی تحفہ آئے تو ہم اسے واپس کر دیں۔

اگر کلیم شود ہم زباں سخن نکنیم　　　دگر خلیل شود میہماں بگردانیم

اگر حضرت موسیٰ بات کرنا چاہیں تو ہم بات نہ کریں اور اگر حضرت ابراہیم خلیل اللہ مہمان ہوں تو ہم انھیں پلٹا دیں۔

گل افگنیم و گلابے بہ رہگذر پاشیم　　　مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

پھول راستہ میں بکھیریں (گل افشانی کریں) شراب کا دور چلے اور ساغر شراب کو باہم گردش دیں۔

گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم　　　گہے ببوسہ زباں در دہاں بگردانیم

کبھی تملق و خوشامد کے انداز سے راز و نیاز کی باتیں کریں۔ کبھی بوسہ کے لیے زبان کو منھ میں پھرائیں (گردش دیں)

نہیم شرم بیک سو و باہم آویزیم　　　بشوخی کہ رخ اختراں بگردانیم

شرم کو ایک جانب رکھ دیں اور ایک دوسرے سے ایسی گرم جوشی اور شوخی کے ساتھ ہم کنار ہوں کہ ستارے شرم سے منھ پھیر لیں۔

ز جوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم　　　بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم

ہم دونوں ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا سانس لینا بند کر دیں اور اس کو طلوع نہ ہونے دیں اور اس طرح دن کو گرمی کی مصیبت دنیا سے ٹال دیں۔

بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم　　　ز نیمہ رہ رمہ را با شباں بگردانیم

سب کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیں کہ رات ہو گئی یہاں تک کہ ریوڑ کو چرانے والے سمیت آدھے راستے سے شہر کی جانب الٹا پھیر دیں۔

بجنگ باج ستانانِ شاخساری را　　　تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

جو لوگ درختوں سے پھلوں کا خراج (ڈالی) لینے کے لیے آئیں ان کو لڑ کر باغ کے دروازے ہی سے خالی ٹوکری کے ساتھ واپس لوٹ جانے پر مجبور کر دیں۔

بصلح بال فشانانِ صبح گاہی را　　　ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

جو پرندے صبح سویرے آشیانوں سے پیڑوں پر آکر کلیلیں کرتے ہیں انھیں نرمی اور آشتی سے گھونسلوں میں واپس پلٹا دیں۔

غالب کی مسلسل غزلوں سے مذکورۂ بالا تین اقتباسات سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ غزل کی اس صنف میں بھی جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے مرزا کا پایہ بہت اونچا ہے۔ ان کی طبع روشن و وقاد کی ندرت نگاہی اور جدت نگاری کی غیر معمولی خصوصیت یہاں بھی نمایاں ہے۔

بال فشانانِ صبح گاہی۔ باج ستانانِ شاخساری۔ دوزخ ہیبت مینو لقا تفیدہ دشت وغیرہ ترکیبوں کا استعمال ان کی فکر نادرہ کار کی "ابداعی خصوصیت" کا دل پسند مظاہرہ ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ اس قسم کی نغز و نادر ترکیبیں ان کی فارسی غزل وغیرہ میں کثرت سے بکھری پڑی ہیں اور عجب نہیں کہ یہ نتیجہ ہو عرفی شیرازی کے سخن ہائے حکمت آگیں و ندرت پژوہ کے مسلسل مطالعہ کا۔

غالب کی عام غزل کی خصوصیات

غالب کی فارسی غزل میں وہ لوچ وہ سوز وگداز نہیں پایا جاتا جو عام طور سے غزل کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے مگر حقیقتہً یہ خیال زیادہ وزن نہیں رکھتا۔ ظرفِ غزل اتنا تنگ نہیں ہے کہ اس میں وہ دوسرے مضامین نہ سما سکیں جنھیں روایتی لوچ اور سوز وگداز سے کوئی ربط نہیں ہے بلکہ ان سے عشق کے مردانہ جاہ وجلال کی نمائندگی ہوتی ہے، اور نشاطِ محبت کے وہ پہلو نگاہوں کے سامنے آتے ہیں جنھیں گھسی پسی ہوئی شکست خوردہ ذہنیت کے نمائندوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ غزل کا آغاز میں کوئی مفہوم "کلام با زنان" کے قبیل کا رہا ہو لیکن عرصے سے وہ اس پابندی کی قید کو توڑ چکا ہے اور غالباً صحیح یہ ہے کہ غزل کے اس لغوی مفہوم کا کسی غزل گو شاعر نے اپنے کو کبھی پابند نہیں بنایا ان دو چار معزز مستثنیات کے سوا جن کا مزاج مخصوص سانچہ میں ڈھل چکا تھا یہ واقعہ ہے کہ غالب اگرچہ ہمیشہ ہی " رہینِ ستمہائے روزگار " رہے اور گردشِ دوراں نے انھیں برابر پامالِ حوادث بنائے رکھا لیکن انھوں نے اپنی غزل کی پیشانی پر اس کے آثار رونما نہ ہونے دیے۔ اگر کبھی ابنائے زمانہ کی کج ادائی اور بے وفائی کے گلے شکوے بھی زبانِ شعر پر آئے تو اس میں بھی زیادہ تر انھوں نے سرور نشاط کا پہلو نکال لیا ۔ اس خصوص میں ان کی فارسی غزل کے مخصوص لہجے نے ان کی خاص طور پر مدد کی ہے ۔

دیدہ می گرید زباں می نالد و دل می تپد   عقدہا از کارِ غالب سربسر وا کردۂ

آنکھ رو رہی ہے ۔ زبان فریاد کر رہی ہے اور دل تڑپ رہا ہے گویا عشق کی راہ میں جتنی گرہیں ہیں وہ تو نے سب کھول دیں ۔ اس طرح عشق کو اپنی معراج مل گئی ۔

اس غزل کے اور اشعار میں بھی کم وبیش یہی اندازِ نگاہ نظر آتا ہے :

خستگاں را دل بہ پرسشہائے پنہاں بردۂ   با درستاں گر نوازشہائے پیدا کردۂ

اگر تو نے درستوں پر یعنی صحیح وسالم افراد پر ظاہری عنایتوں کی بوچھار کی ہے تو زخمی دلوں کو یعنی ان لوگوں کو جو بظاہر خدا کے معتوب ہیں پوشیدہ مہربانیوں سے مفتون کیا ہے ۔

ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمر است   انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردۂ

شرمندگی وہ عذاب ہے جس کی ذات میں ساتوں جہنم چھپے ہوئے ہیں ۔ اس لیے اگر تو نے گنہگار کے ساتھ رعایت کی اور اس کو بخش دیا تو یہ عین انتقام ہے کیونکہ اس قدر گناہوں کے باوجود اس کو کوئی سزا نہیں دی گئی تو یہ تو اسے سات دوزخوں میں ڈال دینا ہوا۔ گناہ کے باوصف مجرم سے مدارا کرنا بدلہ ہی لینا ہوا کیونکہ اس سے خوددار مجرم کو جو شرمندگی حاصل ہوگی وہ عین انتقام ہے ۔

اب غالب کی غزلوں کے اور اشعار ملاحظہ کیجیے ۔ ان میں بھی زیادہ زندگی ؛ سرمستی کی عشرت مزاجی کا کھلندرا پن ملے گا ۔ درد وسوز کی گھٹی ہوئی غیر صحت مند آہ اور کراہ کے نقشے اس میں نظر نہ آئیں گے ۔

بر طاعتیاں فرخ و بر عشرتیاں سہل   نازم شبِ آدینۂ ماہِ رمضاں را

مجھے ماہ رمضاں کی شب جمعہ پر ناز ہے کیونکہ وہ اطاعت گزاروں کے لیے مبارک ہے، اس میں وہ خوب عبادت کر سکتے ہیں، اور عشرت پسندوں کے لیے بھی اس میں سہولتیں ہیں کیونکہ وہ اچھی طرح دادِ عیش دے سکتے ہیں ۔

حالِ ما از غیر می پرسی و منت می برم   آگہی بارے کہ اگہ نیستی از حالِ ما

تو میرا حال غیر سے دریافت کر رہا ہے اس کا میں احسان مند ہوں کیونکہ اس سے اتنا تو بہرحال معلوم ہی ہو جاتا ہے کہ تو ہمارے حالِ زار سے آگاہ نہیں ہے ۔ (اگر تو ہمارے حال سے واقف ہوتا تو ممکن تھا کہ تجھے ہم پر رحم آ جاتا ۔ اور ہم تیری ہمدردی کے مستحق قرار پاتے)

ازیں بیگانگی ہا می تراود آشنائیہا   حیا می ورزد و در پردہ رسوا می کند ما را

وہ جس عنوان سے اپنی بیگانگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس سے اس کی شناسائی اور واقفیت ٹپکتی ہے ۔ اس لیے وہ جب مجھ سے حیا برتتا ہے، شرماتا ہے تو پردے ہی پردے میں مجھے رسوا کرتا ہے ۔

فدایت دیدہ و دل رسمِ آرائش مپرس از من   خرابِ ذوقِ گلچیں چہ داند باغبانی را

دیدہ و دل تجھ پر نثار ہوں ۔ شیوۂ وآئینِ آرائش مجھ سے نہ دریافت کر ۔ جو گل چینی کے ذوق کا مارا ہوا ہو وہ باغبانی کیا جان سکتا ہے ۔

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم سوخت   منتے بر قدمِ راہروان است مرا

میری رفتار کی گرمی کے اثر سے تمام کانٹے جل گئے اب کسی چلنے والے کو تکلیف نہ ہوگی اس لیے راہ چلنے والے مسافروں کے قدموں پر میرا احسان ہے ۔

غالبؔ کے مذکورۂ بالا شعر کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے پیرو میرزا ثاقبؔ لکھنوی نے اردو میں کہا ہے اور خوب کہا ہے ؎

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو   بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

میرزا ثاقبؔ نے جس پیرایہ میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے وہ مقتضائے حال کے عین مطابق ہے ۔ مرزا غالبؔ کے شعر کا دوسرا مصرعہ "منتے بر قدمِ راہروان است مرا"

مرزائیت کی شان ترکمانی کی ضرور ترجمانی کر رہا ہے مگر وہ مرزا ثاقب کے اس مصرعے کے مقابلے میں نہیں رکھا جا سکتا "دعائیں دیں مجھے بعد آنے والے میری بخت کو"۔ میرزا ثاقب کے مصرعے میں جو لطافت اور شیرینی ہے اس کا جواب غالب کا یہ مصرعہ نہیں ہو سکتا "منتے بر قدم راہروان است مرا"۔ لیکن غالب کے مذکورہ بالا شعر کا پہلا مصرعہ "خارہا از اثر گرمیِ رفتارم سوخت" اس کمی کی تلافی کر دیتا ہے۔ "گرمیِ رفتار" سے راستے کے کانٹوں کا جل جانا نہایت ہی پاکیزہ تخیل ہے۔ "بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے" مصرعہ اپنی جگہ خوب ہے اور "دشت" کو "بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے" کا سبب قرار دینا صنعت حسن تعلیل کی بڑی اچھی مثال ہے مگر "گرمیِ رفتار" سے کانٹوں کے سرے سے جل جانے کا جواب نہیں۔ "افضل المتقدم" سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے تب بھی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا جواز مشکل ہی سے نکل سکے گا۔

بسا اوقات غالب نے ایک ہی خیال کو فارسی میں بھی نظم کیا ہے اور اردو میں بھی اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اس تخیل سے کچھ زیادہ انس ہے۔ فارسی میں ان کا شعر ہے ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

ہم نے نوک خار کو دل کے خون سے آلودہ کر دیا ہے۔ اور اس طرح صحرا کی باغبانی کا قانون ہم نے مدوّن کر ڈالا ہے، بنا ڈالا ہے

اردو میں خود غالب نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

غالب کے اردو شعر کا پلہ ان کے فارسی شعر سے گراں ہے۔ رگ ہر خار کا لخت جگر سے شاخ گل بن جانا تخیل کی رفعت کا شاہد ہے۔ اس سے غالب کے اردو شعر میں بے پناہ ندرت اور تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ انھیں کے فارسی شعر کو جب اس کے مقابلے میں رکھا جاتا ہے تو اس میں وہ حسن، وہ لطافت وہ ملاحت نہیں پائی جاتی جو اردو شعر میں پیدا ہو گئی ہے۔ خیال ایک ہے مگر اسلوب بیان نے ان میں خاصا فرق پیدا کر دیا ہے۔ ایک نادر خیال کی ترجمانی کے باوجود فارسی کا شعر مقابلۃً سپاٹ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اردو کا شعر ہمہ نزہت و ہمہ رنگ ہے۔

مولانا حالی نے غالب کی ایک فارسی غزل کا اسی کی ہم قافیہ نظیری کی غزل سے مقابلہ کیا ہے اور بیشتر انصاف سے کام لیا ہے لیکن کہیں کہیں اپنے محترم استاد کی جنبہ داری بھی کر گئے ہیں۔

نظیری کا ایک شعر ہے ؎

کجا ز عشوۂ آں چشم نیم باز رہیم کہ فتنہ خاستہ از خواب و پائے ما خفتست

نظیری محبوب کی اس حالت کی تصویر کشی کر رہا ہے جبکہ وہ سوتے سے اٹھا ہو اور آنکھیں کچھ کھلی ہوں، کچھ بند اور جی اس سے دو سیٹنے کو نہ چاہتا ہو۔

وہ کہتا ہے کہ فتنہ یعنی معشوق اٹھ کھڑا ہوا ہے اور ہمارا پاؤں سو گیا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی چشم نیم باز کے عشوہ سے کیونکر رہائی ہو گی۔

مرزا غالب کہتے ہیں ؎

دگر ز ایمنیِ راہ قرب کعبہ چہ حظ مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

مرزا غالب مسافر کی اس حسرت ناک حالت کو جب کہ راہ بے خطر اور منزل مقصود قریب ہو مگر نہ مسافر میں، نہ سواری میں آگے قدم بڑھانے کی طاقت ہو یوں بیان کر رہے ہیں کہ مجھے قرب کعبہ کی راہ کے محفوظ ہونے سے کیا فائدہ جبکہ میرے ناقہ میں رفتار کی سکت نہیں رہی ہے اور پاؤں سو گیا ہے۔

مولانا حالی کا فیصلہ یہ ہے کہ ان دونوں شعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ جو عاشقانہ مضامین کو پسند کرتے ہیں وہ ضرور نظیری کے شعر کو پسند کریں گے۔ مگر اس لحاظ سے کہ مرزا کا بیان عاشق اور غیر عاشق سب کے حالات پر حاوی ہے اور ہر شخص جس پر ایسی حالت گزرے اس کا مصداق ہو سکتا ہے، نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے۔" مگر حقیقت یہ ہے کہ نظیری کے دونوں مصرعے سڈول ہیں۔ فصاحت ان پر نثار ہو رہی ہے۔ مرزا غالب کا پہلا مصرعہ "دگر ز ایمنیِ راہ قرب کعبہ چہ حظ" نہایت بوجھل ہے۔ قدم قدم پر ذوق کو ٹھوکر لگتی ہے۔ دوسرے مصرعے کی سلاست و روانی پہلے مصرعے کے بوجھل پن کی کسی قدر تلافی کرتی ہے مگر اس کے بعد بھی نظیری کے شعر کے مقابلے میں اس کو نہیں لایا جا سکتا۔ نظیری کے شعر کا بھی مصداق عام بنایا جا سکتا اور اس کی بھی وہ تاویل کی جا سکتی ہے جس سے نظیری کا شعر صرف مجازی حدود میں محدود نہ رہے۔ حافظ شیرازی کے ایک سے ایک مجازی رنگ و بو کے حامل شعر کو حقیقت و معرفت کا لباس پہنایا جا چکا ہے اور غالباً جائز طور سے پہنایا جا چکا ہے تو یہاں کوئی خاص دقت نہیں ہو سکتی۔

نظیری کی پیش نظر غزل کا مطلع ہے ؎

نظر بہ ظاہر و صیاد در خفا خفتست اجل رسیدہ چہ داند بلا کجا خفتست

اس نے اس حقیقت کو کہ مقدرات کا بسا اوقات ظہور اس عنوان سے ہوتا ہے جس کا سان گمان بھی نہیں ہوتا، اپنے مخصوص رنگ میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نظر

ظاہر و نمایاں چیزوں کی طرف ملتفت ہے لیکن صیاد گھات میں مخفی طور سے لگا ہوا ہے، جس کی موت ہی آگئی ہو وہ نہیں جانتا کہ بلا کہاں سوئی ہوئی ہے۔ نظیری کا، بیان حقیقت فصاحت کے سڈول سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے اور نظیری کے مخصوص نشتروں میں سے ایک نشتر ہے۔ مولانا حالی کا ارشاد سر آنکھوں پر مگر ادب کے ساتھ یہ ضرور عرض کیا جائے گا کہ خواہ مولانا اسے نظیری کے اعلیٰ درجے کے اشعار میں محسوب نہ کریں لیکن ان کی اس رائے سے اتفاق مشکل ہے۔ غنیمت ہے کہ انھوں نے اسے مرزا کے مطلع سے بہرحال بہتر قرار دیا ہے۔ مرزا غالب کا مطلع یہ ہے ؎

بوادی کہ دراں خضر را عصا خفتست بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

ایسی وادی میں جہاں خضر کا عصا سوگیا ہے، میں اپنے سینہ سے راستہ طے کر رہا ہوں اگرچہ پاؤں سوگیا ہے۔

مرزا کا "عصا خفتست" اسی زمانے میں مورد اعتراض ہوا تھا کہ "عصا کے سونے کا" کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔ مرزا غالب نے اس کے جواب میں شیخ سعدی کے اس مصرعہ سے استدلال کیا تھا۔ "دے بجلۂ اول عصائے شیخ بخفت"۔ مگر مرزا غالب کا یہ جواب تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور جائز طور سے تسلیم نہیں کیا گیا تھا کیونکہ شیخ سعدی کے یہاں اس بات کے ثبوت کے لیے کہ انھوں نے "عصا خفتن" کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے کافی سے زیادہ قرائن موجود ہیں مگر غالب کا "عصا خفتست" اس سے محروم ہے۔ بہرحال مرزا غالب کا یہ مطلع نظیری کے مطلع کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس غزل میں غالب کا یہ شعر یقیناً بیت الغزل ہے ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست

ہوا مخالف ہے، رات اندھیری ہے، سمندر طوفاں خیز ہے، کشتی کا لنگر ٹوٹا ہوا ہے اور ملاح سوگیا ہے۔

غالب کا یہ شعر بھی بہت خوب ہے اور اس میں شعریت کر وٹیں لیتی محسوس ہوتی ہے ؎

دلم بسبحہ و سجادہ و ردا لرزد کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتست

میرا دل تسبیح جا نماز و ردا (چادر) کے بارے میں لرز رہا ہے کیونکہ چور تو جاگ رہا ہے اور پارسا سویا ہوا ہے۔

غالب کی شاعری کو دوسرے اساتذہ سے ٹکرانے کی ضرورت نہیں

میری ناقص رائے میں نظیری و عرفی و ظہوری کی شاعری سے غالب کی شاعری کے مقابلے کی ضرورت نہیں اور نہ انھیں باہم ٹکرانے کی حاجت ہے۔

غالب کی فارسی شاعری اپنی ذات کے لحاظ سے لطافتوں اور نفاستوں کی خزینہ دار ہے۔ اسے پڑھ کر ذوق کو طرب و نشاط حاصل ہوتا ہے اور فلسفیانہ انداز نظر کی آمیزش سے اس میں شعری صباحت کے ساتھ حکیمانہ ملاحت بھی پیدا ہوجاتی ہے اور اس سے دماغ بھی اثر پذیر ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار سے اس کا اچھی طرح اندازہ ہوسکے گا:

بادہ اگر بود حرام بذلہ خلاف شرع نیست دل نخمی بخوب ما طعنہ مزن بزشت ما

تیرے مسلک میں شراب اگر حرام ہے تو خیر بذلہ سنجی تو شریعت کے مخالف نہیں ہے۔ تو اگر ہماری اچھی باتوں یعنی میگساری سے خوش نہیں ہے تو خیر لیکن ہماری بذلہ سنجی پر جو ہمارے نزدیک دوسرے درجے کی چیز ہے اس پر تو طعنہ زن نہ ہو۔

سخن کوتہ مرا ہم دل بتقوےٰ مائل است اما زننگ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائیہا

زاہد کے ساتھ ہم پیشہ ہونے سے مجھے شرم آتی ہے۔ اس لیے مجھ میں کافروں کی خو بو ان کے طور طریقے پیدا ہوگئے ہیں ورنہ تقویٰ کی طرف مجھے فطری میلان ہے۔

اس شعر میں "سخن کوتہ" کا ٹکڑا بہت بلیغ اور معنی خیز ہے۔ اس سے اشارہ ہوجاتا ہے اس پورے پس منظر کی طرف جس سے شعر بالا متعلق ہے۔ کچھ متقی لوگ جمع ہیں۔ بحث ہو رہی ہے۔ کوئی بطور نصیحت کہہ رہا ہے کہ تمھاری یہ کافر ماجرائیاں منافی اتقا ہیں۔ اس سے تمھارا مذہب مشتبہ ہوتا ہے۔ دوسرا اس کی تائید کرتا ہے۔ بحث و مباحثہ کو ختم کرنے کے لیے شاعر کہتا ہے کہ اسے بھائی جانے بھی دو بحث کو طول دینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بھی تقویٰ کی طرف رغبت ہے لیکن زاہدوں کا (جو تصنع اور ریا کا مجموعہ ہیں) ہم پیشہ ہونا مجھے منظور نہیں۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

رخصت کرنے میں اور مزہ ہے اور وصل میں اور لطف۔ تو ہزار بار جا اور لاکھ بار آ۔ مولانا حالی نے صحیح لکھا ہے کہ "صد ہزار کے لفظ نے شعر کو زیادہ بلیغ کردیا ہے کیونکہ شاعر باوجودیکہ لذت میں وداع اور وصل دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے مگر پھر بھی اپنے مطلب کی بات کو نہیں بھولا اور جانے کے لیے ہزار بار اور آنے کے لیے صد ہزار بار کا لفظ استعمال کیا ہے۔"

رواج صومعہ ہستی ست زینہار مرو متاع میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

صومعہ میں عبادت کدے میں پندارِ ہستی کا چلن ہے وہاں ہرگز نہ جا اور میخانے کا سرمایہ مستی ہے۔ یہاں ذرا ہوشیاری یعنی عالی ظرفی کے ساتھ آنا چاہیے۔ مستی کی کیفیت

میں سرشار ہونے کے لیے ہوشیار ہو کر آنا اس میں خاصا لطف ہے۔

مردم ز فرطِ ذوق و تسلی نمی شوم　　یارب کجا برم لبِ خنجر ستائے را

غالبؔ کہتے ہیں کہ محبوب کے خنجر نے ایسا مزہ دیا ہے کہ اس کی تعریف کرتے کرتے مر گیا اور پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔ اب خنجر کی تعریف کرنے والے ہونٹوں کو کہاں لے جاؤں ان کا کیا کروں کہ ذوق کو آسودگی حاصل ہو۔

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است　　بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

وہ راز جو سینہ میں دبا ہوا ہے مخفی ہے وہ وعظ نہیں ہے۔ اسے سولی پر کہا جا سکتا ہے منبر پر نہیں کہا جا سکتا۔ اگر وعظ کے قبیل کی چیز ہوتا تو اسے منبر پر کہا جا سکتا تھا۔

بردا آدم از امانت ہر چہ گردوں برنتافت　　ریخت مے بر خاک چوں در جامِ گنجیدن نداشت

بار امانت میں سے جو کچھ آسمان سے نہ اٹھ سکا وہ انسان نے اٹھا لیا گویا جب شراب جام میں نہ سما سکی تو خاک پر گر پڑی۔ غالبؔ کے اس لطیف شعر کا ماخذ حافظ شیرازی کا یہ شعر ہے ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

غالبؔ نے حافظ شیرازی کا پورا شعر اپنے اس مصرعہ میں سمو دیا ہے۔ بردا آدم از امانت ہر چہ گردوں برنتافت۔ اور دوسرے مصرعہ میں ایک لطیف تشبیہ سے اس پورے مضمون میں جان ڈال دی۔ یعنی جب شراب جام میں نہ سما سکی تو خاک پر گر پڑی۔ خاک سے مراد انسان ہے اور جام سے آسمان اور ان دونوں کی مناسبت محل و مقام سے واضح ہے۔

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند　　ہم خزاں ہم بہار در گزر است

خزاں اور بہار دونوں ہی رفتنی ہیں۔ خزاں میں پت جھڑ ہوتا ہے اور بہار میں پھول جھڑتے ہیں۔

جنت نکند چارۂ افسردگیٔ دل　　تعمیر باندازۂ ویرانیٔ ما نیست

جنت ہمارے دل کی افسردگی کا علاج نہیں کر سکتی۔ ہماری ویرانی کے مطابق تعمیر یعنی جنت نہیں ہے۔

اس سے ملتا جلتا غالبؔ کا یہ اردو شعر ہے اور فارسی شعر سے اس کی تازگی زیادہ ہے ؎

باغِ فردوس میں دوزخ کو ملا دے یا رب　　سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مخمورِ مکافات بہ خلد و سقر آویخت　　مشتاقِ عطا شعلہ ز گل باز ندانست

مکافاتِ عمل کے نظریہ پر ایمان رکھنے والا بہشت و جہنم کے قضیوں میں الجھ کر رہ گیا۔ تیرے عطا و کرم کا جو مشتاق تھا وہ شعلے اور گلاب کے پھول میں امتیاز نہیں رکھتا تھا۔ اس کی نجات آسانی سے ہو گئی۔

عرفی شیرازی نے کہا تھا ؎

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحونِ عشق　　روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

تو سمندر (وہ کیڑا جو آگ میں رہتا ہے) بھی ہو اور مچھلی بھی کیونکہ عشق کے جیحون (ایران کے ایک دریا کا نام) میں دریا کی سطح سلسبیل (ایک بہشتی نہر) کا حکم رکھتی ہے اور دریا کی تہ آگ کا حکم رکھتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "در جیحونِ عشق" کے بجائے "در دریائے عشق" کہنا چاہیے تھا اس نے "جیحونِ عشق" میں غرابت نہ پیدا ہوتی لیکن معترض اس پر غور نہیں کرتے کہ دوسرے مصرعہ میں دو جگہ "دریا" کی لفظ آ چکی ہے اب تیسری جگہ بھی اس کا ایک ہی شعر میں آنا پسندیدہ نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ عشق میں جو نشیب و فراز پیش آتے ہیں ان کی تصویر کشی ایک غریب ترکیب "در جیحونِ عشق" کے استعارے سے خوب ہوتی ہے۔ بہر حال اس بحث کی حیثیت جملۂ معترضہ کی تھی اصل گزارش یہ ہے کہ غالبؔ نے عرفی کے دوسرے مصرعہ کو ملٹ دیا اور اس پر حکیمانہ مصرعہ ضم کر کے عرفی کے خیال کو نمایاں ترقی دے دی۔ غالبؔ کا شعر حسب ذیل ہے ؎

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلاست　　قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

بغیر کسی تکلف کے بلا میں مبتلا ہونا بلا کے خوف سے بہتر ہے۔ دریا کا اندرونی حصہ حقیقتاً سلسبیل ہے اور سطحِ دریا آگ ہے۔

مراد میدنِ گل در گماں فگند امروز　　کہ باز بر سرِ شاخِ گل آشیانم سوخت

پھول کے کھلنے سے آج مجھے یہ گمان گزرا کہ پھر شاخِ گل پر میرا آشیانہ جل گیا لیکن انھیں غالبؔ نے اردو میں اس سے ذرا ہٹ کر بڑے ہی شاعرانہ انداز میں کہا ہے۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

فارسی شعر میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ گلاب کے پھول کے کھلنے کا منظر دیکھ کر شاعر کو یہ گمان ہوا کہ شاخِ گل پر میرا جو آشیانہ تھا وہ پھر جل گیا۔ اس میں بڑے ہی پیارے انداز میں گلاب کے پھول کے کھلنے کو شاخِ گل پر آشیانے کے جلنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور آشیانہ کو اپنا قرار دے کر اس میں ایک مخصوص اپنائیت پیدا کر دی اور تغزل کا شوخ رنگ اس میں بھر دیا۔ فارسی شعر کی کائنات یہیں پر ختم ہو جاتی ہے مگر اردو کے شعر میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ کل آشیانہ پر بجلی ضرور گری ہے لیکن پھر اپنے ہم صفیر کو، ساتھی کو بہلا کر پھسلا کر کہتا ہے کہ جس پر کل بجلی گری ہے

کیا ضروری ہے کہ وہ میرا ہی آشیانہ ہو۔ اس لیے مجھ اسیرِ قفس سے روداد چمن کہتے ہوئے مجھے ڈر اور خوف کی ضرورت نہیں ہے۔ اردو شعر میں تشبیہ کی کارفرمائی ذرا بھی نہیں ہے مگر پھر بھی اس میں تجاہلِ عارفانہ کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے اور ہمصفیر کی جس بھولے بھالے اسلوب میں خوشامد کی گئی ہے اور اس واقعہ کے اظہار پر ابھارا گیا ہے اس کا بھی جواب نہیں ہے۔

دل را بوعدۂ ستمے می تواں فریفت ۔۔۔ نازے کہ بر وفائے تو بودش نمانده است

اب تو بس دل کو ظلم وستم کے وعدے ہی سے فریفتہ کیا جا سکتا ہے۔ تیری وفا پر جو اسے ناز تھا وہ اب نہیں رہ گیا ہے۔

با من میا ویز اے پدر فرزند آزر را نگر ۔۔۔ ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

اے پدر مجھ سے جھگڑا نہ کر۔ آزر کے بیٹے کی طرف دیکھ۔ جو شخص نظر والا ہو جاتا ہے وہ بزرگوں کے دین پر بیشتر قائم نہیں رہتا۔

غالب نے اس شعر میں ایک حقیقت کی ترجمانی کی ہے اور بڑے ہی لطف سے کی ہے۔ جو شخص غور و فکر سے کام لیتا ہے اور اس میں حقیقتوں کے دیکھنے اور جانچنے کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے وہ زیادہ تر اپنے آبا و اجداد کے نظریات کا پابند نہیں رہتا۔

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت ۔۔۔ پرسد چرا کہ نرخ مئ لعل فام چیست

غالب نے اگر خرقہ و مصحف کو اکٹھا انہیں فروخت کر ڈالا تو وہ شراب لالہ فام کا نرخ کیوں دریافت کر رہا ہے۔

رضواں بہ شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد ۔۔۔ بیچارہ باز داد و مے مشک بو گرفت

رضواں نے جب شہد اور دودھ غالب کو دیا تو غریب نے اسے واپس کر دیا اور مشک کی خوشبو رکھنے والی شراب کو لے لیا۔

چہ خیزد از سخنے کز درون جاں نبود ۔۔۔ بریدہ باد زبانے کہ خونچکاں نبود

ایسی بات سے کیا نتیجہ نکل سکتا ہے جو دل کی آواز نہ ہو۔ اس زبان کا قطع ہو جانا ہی اچھا ہے جس سے کہ خون برابر نہ ٹپک رہا ہو۔

خارہا در رہ سودا زدگاں خواہد ریخت ۔۔۔ ورنہ در کوہ و بیاباں بچہ کار است بہار

ظاہر ہے کہ وحشیوں کے راستے میں کانٹے بکھرے گی ورنہ پہاڑوں اور جنگلوں میں بہار کا کیا کام۔

ترکیبوں کی ندرت

جیسا سابق میں عرض کیا گیا ہے غالب کے شعر کی ایک خصوصیت ترکیبوں کی ندرت اور تازگی بھی ہے۔ اس خصوص میں انھوں نے عرفی کی روایت کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ خرد آشوب تر۔ بے پروا نگاہ۔ میکدہ آشام۔ رند ہزار شیوہ۔ ساغر زار۔ مطربۂ زہرہ نہاد۔ زلف خیز۔ بت چمن سامان۔ بہار آئین نگاہاں کے قبیل کی ترکیبیں ان کے کلام میں خاصی پائی جاتی ہیں اور زیادہ تر لطف کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ غالب کے کلام کی یہی وہ خصوصیتیں ہیں جنھوں نے ان کے سخن ہائے دل پذیر کو قبول عام کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔

آخر میں ان کے کلام کی حیثیت معین کرنے کے سلسلے میں ایک واقعہ کا تذکرہ کرنا برمحل بھی ہوگا اور لطیف بھی۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے اور وہ مقطع یہ ہے۔

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب ۔۔۔ گر ترقی نہ کنم شیخ علی ام ثانی

مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سنا اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔

ایک صاحب نے جو مومن خاں مرحوم کی تعلیوں سے خوب واقف تھے یہ حکایت سن کر کہا کہ مومن خاں نے یہ اس لیے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر و بلند سمجھتے تھے ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے ان کو مراتب برتر و بالاتر سمجھتے تھے نواب ضیاء الدین خاں کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (یعنی امیر خسرو) سے ہوئی اور ایک ترک ایک یعنی مرزا غالب پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ سید غلام علی خاں وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عرب کی طرف متوجہ ہو جاتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبی یا ابوتمام ہوتا اور انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔" سچ ہے ؂

طوطیاں را نبود ہرزہ جگر گوں منقار

خوردہ خون جگر از رشکِ سخن گفتن ما

★

غالب

(یادگارِ جشنِ صدسالۂ غالب)

روش صدیقی

ثباتِ خرام ہے یہ محملِ وجود و عدم
رواں دواں ہیں نقوشِ جہانِ لوح و قلم
ہے ارتقائے مسلسل، قدامتِ آدم

سکوتِ دشتِ تحیّر کہ صبح و شام کہیں
ندائے قافلۂ فکرِ تیشہ گام کہیں
شکستِ جام بنامِ فروغِ جام کہیں

جہاں سے شورشِ مے خانۂ حیات چلی
وہیں سے غالبِ آشفتہ سر کی بات چلی

شعورِ گم شدگی، رسم و راہ سے آگے
غرورِ خودنگری، مہر و ماہ سے آگے

غبارِ دامنِ ماضی و حال تھا ہرچند
خرابِ کیفِ نشاط و ملال تھا ہرچند
اسیرِ حلقۂ دامِ خیال تھا ہرچند

حدیثِ نرگسِ مستانہ بے خودی اُس کی
ہزار شیوۂ رندانہ سادگی اُس کی
کرامتِ دلِ خوں گشتہ مے کشی اُس کی

وہ خوش نظر تھا، بہ ہر حال سربلند رہا
فلک کو شکوۂ کوتاہیِ کمند رہا

گریزِ شوق ہی تنہا رفیق تھا اُس کا
سنبھل سنبھل کے بہکنا طریق تھا اُس کا

بسائے نرگسِ جادو میں اس نے خواب کچھ اور
بڑھائے طرۂ گیسو میں پیچ و تاب کچھ اور
اُٹھا اُٹھا کے گرائے بھی ہیں حجاب کچھ اور

سکونِ دردِ مسیحا کا وقت آیا ہے
طلوعِ خوابِ زلیخا کا وقت آیا ہے
ظہورِ جنّتِ فردا کا وقت آیا ہے

یہ فیض ہے اسی صورت شناسِ معنی کا
غزل کو حُسن ملا ہے، غزالِ رعنا کا

رُکا ہے وادیِ راحت میں قافلہ غم کا
یہی تو وقت ہے جشنِ شعورِ آدم کا

یہ دشتِ علم، یہ وہم و قیاس کی دیوار
فروغِ چہرۂ اقرار، غازۂ انکار
سکوتِ فکر میں ڈوبا ہے ذہنِ لیل و نہار
چلو کہ شرحِ معمائے کائنات کریں
روش سے غالبِ راز آشنا کی بات کریں

غالب اور "عاشق رسوا و باوقار"

علی عباس حسینی

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ اس کی مختلف روایتیں ہیں جن کی پابندی ازمنۂ قدیم سے اب تک کی جاتی ہے۔ ان روایتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں مذکور عاشق ہمیشہ مغموم و مظلوم، رنجور و مجبور خودداری سے بے نیاز، ذاتی وقار سے عاری، شرافتِ نفس سے بے بہرہ، راندۂ بارگاہِ محبوب آشفتہ حال، تفتیدہ جگر، مجنون و سودائی ہوگا۔ وہ معشوق کے دربان تک کی خوشامد کرے گا اس کی جھڑکیاں، گالیاں ہی نہ برداشت کرے گا، بلکہ اس کی پاپوش بازیاں تک بطیبِ خاطر سہے گا۔ وہ دربار کا گدا اس کے آستانے پر جبیں سائی کرتا رہے گا۔ لڑکے اسے سرِ راہ ڈھیلے ماریں گے، رقیب اس پر پھبتیاں کسیں گے، ہر شخص اسے سڑی دیوانہ کہہ کر اس پر ہنسے گا، مگر وہ بے غیرت و بے حیا اپنے بت کی پرستش سے نہ باز آئے گا، مگر سنگ دلِ صنم کو نہ اس کے حالِ زار پر رحم آئے گا اور نہ اس کی بے نیازی و تعدّی میں ذرّہ بھر فرق آئے گا۔

ہماری زبان کے بڑے سے بڑے غزل گو کو لے لیجیے۔ اس کا عاشق اسی جامہ میں نظر آئے گا۔ خدائے سخن میر تقی میر، جو اپنی زود رنجی اور بد دماغی کے لیے بدنام تھے، بقول محمد حسین آزاد نواب اودھ آصف الدولہ کے اشعار کو انھیں کے منھ پر بدبودار کہہ کر حضوریِ خاص سے پاؤں پٹکتے چلے آتے تھے اور جو ایک دو شاہ اودھ کے احترام میں کوتاہی کر کے بہ زبان انشاؔ "گھمنڈی متکبر" کے خطاب کے مستحق بنے تھے، وہی میر عاشق کے لباس میں بے ننگ و نام بھی دکھائی دیتے ہیں، معشوق کے سامنے حاضر ہوتے ہوئے ڈرتے بھی ہیں اور بار بار نکالے جانے پر بے غیرتی سے اس گلی کا پھیرا بھی لگاتے رہتے ہیں۔

۱۔ فقیرانہ آئے صدا کر چلے ... میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

۲۔ آج پھر تھا بے حمیت میر واں ... کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

ان کے ہم عصر مرزا سوداؔ، جو باوجود اپنی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی کے کسی طرح کی بد تہذیبی و بد کلامی نہ برداشت کر سکتے تھے، اور منھ آنے والے حریف کے خلاف ہجو کے دونگڑے برسا دیا کرتے تھے، وہی سوداؔ جب حضورِ محبوبِ دل نواز آتے ہیں تو وہ اس کی گالیاں سُن کر کسی طرح بد مزہ نہیں ہوتے۔ بس رقیب سے اور اپنے سے سلوکِ معشوق کے تفاوت کو بہ طورِ شکایت بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ؎

باتیں کرو عدو سے، سوداؔ کو گالیاں دو ... قرباں ہوں آپ کی میں اس داد و دہش کا

ممکن ہے کہ آپ سوداؔ کے اس ارشاد کو ان کی افتادِ مزاج پر محمول کر کے طنز محض سمجھیں تو صاف سنیے ؎

باتیں مجھے بھاتی ہیں بہ آمیزشِ دشنام ... ہوں اس لیے اس شوخ کی گفتار کا عاشق

غالبؔ نامور نے بھی اپنے پیش روؤں کی اس روش کو کلیتہً ترک نہیں کیا۔ وہی غالبؔ جو اپنی انا پرستی کے لیے یک گونہ مشہور تھے، وہی جنھوں نے اپنے ایک خط میں ایک شاگرد کو اپنے نام کے ساتھ "نواب" لکھنے کی تاکید کی تھی اور وہی جنھوں نے اینگلو عربک کالج دلی کی ایک موقر اسامی محض اس لیے ٹھکرا دی تھی کہ انٹرویو لینے والا انگریز پرنسپل ان کی پیشوائی کے لیے حاضر نہ ہوا، وہی نواب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ جب معشوق کے محل کا رُخ کرتے ہیں تو کلاہِ تتری کی جگہ کلاہِ قلندری سر پر" اوڑھ لیتے ہیں" اور گدایانہ شان سے گڑگڑاتے اور میرؔ کی طرح صدا لگاتے دکھائی دیتے ہیں ؎

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا ... اور درویش کی صدا کیا ہے

پھر فقیروں کے ڈھنگ سے بھیک مانگنے پر یوں اتر آتے ہیں

زکواۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا ... چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

اور جب اس طرح بار بار صدا دینے پر اس کے دربار میں باریابی کی نوبت آتی

ہے اور ان کی تواضع گالیوں سے کی جاتی ہے تو ان کی زنبیل ایسی دعاؤں سے بھی خالی نظر آتی ہے جو وہ اس شیریں پذیرائی کے جواب میں نذر کر سکیں ؎

واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب   یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

حق تو یہ ہے کہ غالب کے معشوق کا درباں اپنی سخت گیری و زباں درازی میں حد سے بھی زیادہ نمبر لے گیا تھا۔ وہ تو کبھی کبھی ان کے جسم کی گرد بھی جھاڑ دیتا تھا ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے   اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

درباں کی اسی دراز دستی کا ڈر دل میں اس طرح بیٹھ گیا تھا کہ عاشق غالب نے اس کے آستانے پر صدا لگانی چھوڑ دی تھی۔ معشوق نے کہیں سر راہ ملاقات میں ان سے پوچھ لیا کہ بہت دنوں سے تمھاری آواز سنائی نہیں دی، تو اس طرح برملا ٹوکے جانے پر ان کو اقرار کرنا ہی پڑا ؎

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا   میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

اور جب اس نے تادیب درباں سے ڈرنا ایک عاشق کے رویہ کے خلاف ٹھہرایا، تو انھوں نے تفہیم حکم میں ہر طرح کی ذلت و زد و کوب برداشت کرنے کے جواز کی ایک اور صورت ڈھونڈ نکالی ؎

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے   بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

باوجود اس حیلۂ ناخوش گوار کے وہ پھر بھی کوچۂ یار سے نکال دیے جاتے ہیں اور انھیں معشوق سے شکایۃً کہنا ہی پڑتا ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن   بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ان ذلتوں و رسوائیوں کے بعد گوشہ نشینی کی حالت میں بھی ان کے دل میں یہی خواہش ہے کہ اس کا آستاں نہ چھوٹے ؎

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں   سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے

لیکن نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب بزرگوں کی روایت کی پابندی بس ایک حد ہی تک کر سکتے تھے۔ وہ آخر ترک بھی تھے، نواب بھی تھے، خود دار و غیرت مند بھی تھے۔ اس لیے ان کا عاشق، جس میں ان کی شخصیت، ان کا کردار اور ان کا انفرادی رنگ جھلکتا ہے، خود بیں بھی ہے، غیور بھی ہے اور باوقار بھی ہے۔ وہ عشق کرنے کا صرف اپنے ہی کو اہل و سزاوار سمجھتا ہے ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا   عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

اور یہ مرد کون تھا؟ ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق   ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اسی یقین کے باعث کہ ان کے عاشق کے بعد کوئی دوسرا عشق کرنے والا نہ رہ جائے گا فرماتے ہیں ؎

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب   کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

یا اس سے بھی صاف تر الفاظ میں اسی غزل کا یہ شعر ؎

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا   ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

اگر ان اشعار میں بھی روایت کی جھلک دکھائی دیتی ہو تو غالب کے مختصر سے دیوان میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جہاں معشوق کو اس کی بے اعتنائی پر صاف صاف ٹوکا گیا ہے اور اپنی انفرادیت ظاہر کی گئی ہے اور غالب کی شخصیت کی اہمیت جتلائی گئی ہے۔ ان کا عاشق اپنی گرفتاری کو اختیاری بتاتا ہے ؎

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد   ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

ان کا عاشق اپنی طاقت پرواز کے اظہار ہی پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ محبوب سے گفتگو میں تلخ لہجہ بھی اختیار کر لیتا ہے ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی!

اتنا ہی نہیں، بلکہ اس تلخ نوائی میں صاف صاف جھنجھلاہٹ بھی شامل ہو جاتی ہے ؎

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں!

وہ معشوق کے حسن کی تعریف اور کاکل و رخسار کے قصیدے سنتے سنتے تھک جاتا ہے اور وہ یہی چاہتا ہے کہ یہ مدح خوانی کبھی ختم نہ ہو۔ اس کی باوقار شخصیت اس خوشامد طلبی سے عاجز آ کر اسے خاموش رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ اس سکوت کی وجہ یوں بیان کرتا ہے ؎

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے   تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

وہ اکتا چکا ہے، گرفتار معشوق سے صاف صاف کہہ دیتا ہے ؎

تو اور آرائشِ خمِ کاکل   میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

معشوق کے روبرو بھی اس کی جبین پر شکنیں پڑ جاتی ہیں ؎

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

ان کا عاشق اس کا روادار نہیں کہ وہ "پاسِ وضع" ترک کر دے ؎

واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں!

وہ بار بار یاد دلاتا رہتا ہے کہ اس کا عشق منفرد ہے، اور اسی لیے لائقِ صد عزت و احترام ہے ؎

جگر کو مرے عشقِ خوں نابہ مشرب لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

اور اسی لیے وہ اپنے کو لائقِ تبریک و تحسین بھی سمجھتا ہے ؎

علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں مبارک، مبارک، سلامت، سلامت!

اپنے عشق کی قدر و قیمت سے یہی آگہی اس سے یہ کہلا دیتی ہے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

یا اس سے بھی صاف الفاظ میں، ذرا رُخ بدل کر ؎

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

وہ اسی غرورِ عشق کے باعث معشوق کو ٹوک دینے کا حوصلہ رکھتا ہے ؎

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

اس کی خودداری اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ معشوق کے حصول کے یقین کے بعد بھی رقیب کی خوشامد یا خدمت کرے۔ وہ اپنی شیریں کے لیے کوہکن بنا کیوں نہیں گوارا کر سکتا اس کی وجہ سُنیے ؎

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

اس کا بانکپن اس کی تاب نہیں لا سکتا کہ وہ معشوق کو بار بار اس کا وعدہ یاد دلائے اور وہ اس کو جھٹلائے۔ وہ اسی لیے یاد دہانی سے بھی باز رکھنا چاہتا ہے ؎

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

غالب کے عاشق کی یہ انفرادیت عشقِ مجازی ہی تک محدود نہیں۔ وہ معشوقِ حقیقی کی بارگاہ میں بھی اپنے اس رندانہ اندازِ تکلم سے باز نہیں آتا۔ ذرا اس عبدِ جسور کے تیور ملاحظہ ہوں ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس خود بینی و خود سری کا باعث وہ خود شناسی ہے جو یہ کہلا دیتی ہے ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلیدِ تُنک ظرفیِ منصور نہیں

یہی خود شناسی حضرت موسیٰؑ کی تنگیِ ظرف پر ڈھکے پردے طعنہ زنی کھائی دیتی ہے ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

میر تقی میر نے تو طور کا پردہ بھی ہٹا دیا تھا، وہ کلیم اللہ کے گرمیِ دل کی کمی کا باعث بناتے ہیں ؎

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

تصوف کے میدان میں میر کی 'انا' بھی غالب ہی کی طرح بڑی حد تک بے نقاب ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں مقصود ان باکمالوں کا مقابلہ نہیں۔ بلکہ صرف غالب کی انفرادیت کا اظہار۔ چناں چہ "ظرفِ قدح خوار" کے ذکر نے جو بانکپن غالب کے شعر میں پیدا کر دیا ہے، وہ اس نابغہ کی خصوصیت خاص ہے۔

دیکھیے یہ شوخ گفتار عادلِ مطلق کی بارگاہ میں کس جسارت سے فریادی ہے ؎

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

وہ رب الارباب کے ارحم الراحمین ہونے پر یقین واثق رکھتے ہوئے قدرے گستاخی پر اتر آتا ہے۔ اور "ناکردہ گناہوں" کی دادرسی کا طالب ہے ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے!

غالب کی یہی خودداری ہمیں یہ تلقین کرتی ہے ؎

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اور رہا تا بدہم کے زرّیں اقوال کو ایک نصیحت کی صورت میں پیش کرتی ہے ؎

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ!

روایتی شاعری سے اسی طرح کی بغاوت نے، پٹے ہوئے ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی اسی عادت نے اور اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے کچھ الگ ڈھنگ سے سوچنے کے اسی انداز نے غالب کو ان کی حیات میں اس منزلِ عظمت و مقبولیت پر فائز ہونے سے مانع رکھا جس کے وہ حقیقتہً مستحق تھے جب ہی تو وہ دل شکستہ و آزردہ ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ؎

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور!

عصرِ رواں کی غالب پرستی اور اردو زبان کے اس نابغہ کی بین الاقوامی شہرت اس کی شاہد ہے کہ یہ دعا یقیناً مستجاب ہوئی۔

رگِ سنگ

شمیم کرہانی

تیری محنت نہ ہوئی تیرے لیے راحتِ دل
برقِ خرمن ہی تو بن جاتا ہے خونِ دہقاں

ہائے! کیا زود پشیماں تھی زمانے کی روش
کی ترے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

کوئی سمجھا نہیں زنجیر کی جھنکاروں کو
پر جنوں خوش ہے کہ شرمندۂ معنی تو ہوا

نیم کش تیر کی ہوتی ہے خلش کتنی لذیذ
تیرے دل نے اسے جانا، تو جگر نے سمجھا

کوئی شعلہ جو کسی غم کی تپش پا جائے
تو رگِ سنگ سے ٹپکے وہ لہو پھر نہ تھمے

دل کو روتا کہ جگر کے لیے ماتم کرتا
نوحہ گر بھی نہ ملا تجھ کو، کہ مقدور نہ تھا

کیا گلہ، زیست میں دیکھا نہ اگر فن کا عروج
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو رہا گو کہ رہینِ غمِ ناقہمی دہر
اپنے فن سے مگر اک لمحہ بھی غافل نہ رہا

دل میں رکھتے ہیں تجھے اہلِ نظر تیرے بعد
تیری شہرت کی سحر آئی مگر تیرے بعد

فروری/مارچ ۱۹۶۹ء

منظوم ترجمہ دُعاء الصّباح

غالب کی ایک نادر فارسی مثنوی کا مخطوطہ رام پور

امتیاز علی عرشی

تمہید

مرزا غالب مرحوم نے کلیاتِ فارسی کی ترتیب و طباعت کے بعد جس قدر فارسی اشعار لکھے تھے انھیں سبد چین کے نام سے اپنی زندگی میں شایع کر دیا تھا لیکن یہ تتمہ ان کے تمام تازہ شعروں پر حاوی نہ تھا۔ وہ قصیدے، قطعے اور رباعیاں جن کی نقول ان کے پاس محفوظ نہ تھیں، یا بروقت اشاعت کہیں سے دستیاب نہ ہو سکی تھیں اس مجموعے میں بار نہ پا سکیں چنانچہ ایسی متعدد فارسی رباعیاں مکاتیب غالب میں[1] چھپ چکی ہیں جو سبد چین کے پہلے ایڈیشن میں نہیں ملتیں۔

برادرِ مکرم جناب مالک رام صاحب نے مکاتیب غالب کی اشاعت کے بعد سبد چین کا دوسرا ایڈیشن شایع کیا تو اس میں مکاتیب غالب کے حوالے کے ساتھ وہ فارسی اشعار بھی درج کر دیے۔ لیکن اب بھی میرزا صاحب کے فارسی کلام کا کچھ حصہ باقی ہے، جو یا تو ابھی تک شرمندۂ طباعت نہ ہو سکا اور یا اس کی شہرت نہ ہونے پائی۔ موخرالذکر صنف میں ان کی ایک فارسی مثنوی کا شمار ہو سکتا ہے جو انھوں نے اپنے حقیقی بھانجے میرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ کی فرمایش پر لکھی تھی۔ یہ مثنوی دُعاء الصباح کا ترجمہ ہے جو امیر المومنین حضرت علیؓ بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

نسخے کی کیفیت

اس مثنوی کا قلمی نسخہ کتاب خانہ رام پور کے ایک مجموعے میں مجھے دستیاب ہوا جو ۷ × ۴ ½ سائز کے ۲۴ صفحات پر ۱۲۵۴ھ میں امروہہ کے ایک بزرگ محمد علی بن سید برخوردار علی نامی نے نقل کیا تھا۔

اس قلمی نسخے میں اصل دعا کا عربی متن سیاہ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اس کے نیچے منثور فارسی ترجمہ شنگرفی روشنائی سے اور ترجمہ نثر کے نیچے منظوم ترجمہ، متن عربی کی ہم رنگ سیاہ روشنائی سے تحریر ہے۔ عبارت کے چاروں طرف قرمزی دُہری جدول بنے اور متن عربی، ترجمہ نثر اور ترجمہ نظم کو باہم جدا کرنے کے لیے بھی قرمزی لکیریں کھینچی گئی ہیں۔ یہ کتاب مجموعے کے ورق ۵۶ ب سے شروع ہو کر ۶۷ ب پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن کاتب مجموعہ نے ہر رسالے کے اوراق پر جداگانہ ہندسے ڈالے ہیں۔ کاغذ باریک یورپی ہے۔ کہیں کہیں پیوند کاری اور اکثر جگہ کرم خوردگی کے نشانات پائے جاتے ہیں۔

مثنوی کا آغاز مفاتیح النجات مصنفہ محمد باقر بن محمد مومن خراسانی السبزواری کے ایک اقتباس سے ہوتا ہے جس میں اس دعا کی فضیلت اور اس کے نام کا ذکر ہے اور کسی بزرگ کی زبانی یہ نقل کیا گیا ہے کہ میں نے امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلم کا ایک سفینہ دیکھا جس کی تاریخ کتابت ۱۲۵۹ھ

---

[1] مکاتیب غالب میرزا صاحب کے ان غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے جو نوابان رام پور اور ان کے درباریوں کو مختلف اوقات میں میرزا صاحب نے لکھے تھے۔ یہ مجموعہ ایک مفصل دیباچے اور تشریحی حاشیوں کے ساتھ کئی بار شایع ہو چکا ہے۔ (عرشی)

تھی۔ اس میں درج تھا کہ یہ دعا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی ہے۔ تمہید کا عنوان اسناد دعاء الصباح ہے جو شنگرفی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک دعا لکھی ہے، جو دعاء الصباح سے پہلے پڑھی جانا چاہیے۔ اس کا عنوان ہے ہٰذا الاعتصام یقرء سبع مرات اور یہ بھی شنگرفی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد دوسرے ورق کے دوسرے صفحے سے دعاء الصباح شروع ہوتی ہے۔ اس کے آغاز میں دعاء الصباح شنگرفی روشنائی سے ایک دوہرے خط کے نیم شنگرفی نیم دائرے کے اندر لکھا گیا ہے۔ اس صفحہ پر جدولوں کے بالائی گوشوں میں دو شنگرفی چھوٹے چھوٹے دائرے بھی بنائے گئے ہیں

دعاء الصباح ورق ۱۱ ب پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ۱۲ الف و ب پر امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول دعا ایک اور عنوان کے نیچے ترجمۂ نظم و نثر کے ساتھ درج ہے۔ اس کے خاتمے پر کاتب نے لکھا ہے۔

"دعای ماثور منقول از جناب امیر علیہ السلام مع ترجمۂ نثر و نیز ترجمۂ منظوم مرزا اسد اللہ خاں غالب موسوم بہ دعای صباح حسب الایمای مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ بہ مطبع منشی نول کشور رونق طبع یافتہ بود بست و سوم شہر رجب سنہ یکہزار و دو صد و ہشتاد و چہار بندہ حقیر فقیر محمد علی بن سید برخوردار علی امروہوی نقل برداشت"

مندرجہ بالا عبارت کے جن الفاظ کے ذریعہ سنہ ۱۲۸۴ھ ظاہر کیا گیا ہے، یہاں غالباً کاتب نے سال طباعت کتاب نقل کیا تھا لیکن بعد ازاں اس کو تاکر سال کتابت لکھا ہے۔ بہرحال اس سے اتنا یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمۂ منظوم میرزا عباس بیگ صاحب کی فرمائش پر منشی نول کشور کے مطبع لکھنؤ میں میرزا غالب (متوفی سنہ ۱۲۸۵ھ) کی زندگی میں چھپا تھا اور ان کے انتقال سے ایک سال تین مہینے کچھ دن قبل نسخۂ مطبوعہ سے اس کی نقل کی گئی ہے۔

کاتب کے خاتمے کے ظاہری الفاظ سے جو در اصل نسخۂ مطبوعہ کا خاتمہ ہے، یہ ترشح ہوتا ہے کہ دونوں ترجمے میرزا غالب کے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ صرف ترجمۂ منظوم میرزا صاحب کا ہے، نثر کا ترجمہ کسی عربی داں عالم نے کیا ہوگا جس پر لفظی اصلاح ممکن ہے میرزا صاحب نے بھی دے دی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرزا صاحب زبان عربی کے ایسے ادیب نہ تھے کہ دعاء الصباح کی عبارت کا از خود ترجمہ کر لیتے۔ میرے اس خیال کی تائید خاتمہ کی عبارت کو بہ غور پڑھنے سے بھی ہوتی ہے اگر دونوں ترجمے میرزا صاحب کے ہوتے تو عبارت یوں ہونی چاہیے تھی۔ "مع ترجمۂ نثر و ترجمۂ منظوم از مرزا اسد اللہ خاں غالب"۔ یقیناً خاتمہ نگار نے نیز کا اضافہ کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس عبارت میں صرف موخر الذکر فقرہ غالب سے متعلق ہے۔

مثنوی کا رتبہ

بہ لحاظ شعریت میرزا صاحب کی یہ مثنوی کوئی بلند پایہ نظم نہیں معلوم ہوتی۔ غالباً اسی باعث سے میرزا صاحب نے اس کا تذکرہ کسی جگہ نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے شاگرد رشید حالی مرحوم بھی یادگار غالب میں اس کا ذکر نہ کر سکے لیکن جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے، اس میں شبہ نہیں کہ میرزا صاحب نے اصل دعا کے مطلب اور مفہوم کو شعر فارسی میں پورا پورا ادا کر دینے میں کمال کر دکھایا ہے، حتیٰ کہ بہت سے فقروں کا ترجمہ اتنے ہی مختصر الفاظ میں کیا گیا ہے، جتنے مختصر الفاظ اصل عربی کے تھے اور شاید ہی کسی جگہ اصل عربی کا کوئی لفظ میرزا صاحب کے ترجمہ کی گرفت سے بچ نکلا ہو۔ مثلاً دعا کا ایک ٹکڑا ہے:

یا من اَرْقَدَنی فی مِہادِ امنہٖ وامانہٖ
وایقظنی الٰی ما منحنی بہٖ من منّہٖ واحسانہٖ

اس کا ترجمہ میرزا صاحب کی زبان سے اس طرح ادا ہوتا ہے:

ای کہ در گہوارۂ امن و اماں		خواب را در چشم من کردی نہاں
باز چشم من بہ بیداری گشاد		سوے احسان و عطای کو بداد

یا مثلاً دعا کا فقرہ ہے:

واجرِ اللّٰھم بھیبتک من آماقی ذرفات الدّموع
وادب اللّٰھم نزق الخرق منّی بازمّۃ القنوع

میرزا صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں:

دایم از بیم خودت ای کردگار		اشک ہا از گوشۂ چشمم ببار
سبکی نادانیم تادیب کن		از شکیبائی مرا تہذیب کن

لیکن بعض ان مقامات پر جہاں اصل عربی الفاظ زیادہ مطالب بجائے تھے، میرزا صاحب کو ایک یا دو توضیحی شعروں کا اضافہ بھی کرنا پڑا ہے۔ مثلاً دعا کا فقرہ ہے۔

یا من قرب من خطرات الظنون وبعد عن ملاحظۃ العیون

میرزا صاحب فرماتے ہیں:

ای کہ نزدیکی بہ خطرات ظنون دور تر ہستی ز دید ار عیون
یعنی اندیشہ شدن آتش بری ست بر کرانہ از جہات بیکری ست

گوہر او از بیس و بیش است بیش
کردہستی را محاط علم خویش

اسی طرح جہاں میرزا صاحب کو اپنے ذاتی تاثرات کے اظہار کا مناسب موقع ملا ہے، وہاں بھی متعدد شعر بڑھائے ہیں۔ مثلاً دعا کا فقرہ ہے۔

وبابک مفتوح للطُّلب والوغولِ۔

باب تو مفتوح باشد جاوداں بر رخِ خوانندہ و ناخواندگاں

طالبان و ہم طفیلی آشکار بر در بکشادہ ات یا بند بار
ہر کہ می خواہیش، می آید بزود، وانکہ ناخوانیش نیز آید فرود
ایں دبت بر روی کس بستہ نیست خواندہ و ناخواندہ، چو د اینجا یکیست
از کمالِ جود تو این فتح باب تا ہمہ گردند از تو بہرہ یاب
بخشش خود را تو زنجیر دراز بر کشیدی، ای خدائی بے نیاز
خود نی بندی دست بر روی کس جز بر حمت می نہ بینی سوی کس
لطفِ تو عام است و ہرگز نیست خاص دور تر رفتہ از یں در اختصاص
بستہ نبود بر رخ کس بابِ تو ہر کسی رخشاں بود از تابِ تو
ابرِ تو ریزد بہر دامن گہر ہر کسی را فیض تو آید ز در

ممسکی و بخل در تو یافت نیست۔
آنکہ در ہستی بود بی بہرہ کیست

اگرچہ ان اشعار اور اسی قسم کے بعض اور شعروں میں نسبتاً زیادہ لطف پیدا ہوگیا ہے، لیکن یہاں بھی شاعر کی فکر اصل الفاظ کی قید سے مطلقاً آزاد ہو کر پرواز نہیں کرسکی ہے۔ اس لیے میرزا صاحب کی دوسری فارسی مثنویوں کے حمدیہ مناجاتی اشعار جیسی والہانہ کیفیت ان میں نہیں پائی جاتی۔

بہرحال یہ مثنوی اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے ذریعے سے ہمیں ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کے ترجمے کی کوشش کا علم ہوتا ہے۔ چونکہ مطبع نول کشور سے اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہوسکا اور نہ کسی کتاب خانے کی فہرست میں اس کا ذکر نظر سے گزرا، اس لیے میں نے کچھ اس دلچسپی کی بنا پر جو مجھے میرزا صاحب کی شاعری سے ہے اور زیادہ تر مالک رام صاحب کے اصرار پر جو سنہ چین اور تذکرہ وغیرہ کے ذریعے "غالب نوازی" کا ثبوت دے چکے ہیں، اس نظم کو شائع کر دینا مناسب خیال کیا۔

اس میں شک نہیں کہ میرزا صاحب کے ترجمے کی خوبی اسی وقت اچھی طرح منکشف ہوسکتی تھی کہ اس کے ساتھ عربی دعا بھی چھاپی جاتی، لیکن عربی ادب کے ساتھ دلچسپی اس قدر کم ہوچلی ہے کہ مجھے خطرہ ہوا، مبادا ارباب ذوق کی نازک طبیعتوں پر میری یہ جرات بار گزرے، اس لیے صرف ترجمے کی اشاعت پر اکتفا کی گئی۔ اگر حالات نے مساعدت کی اور کبھی اس مثنوی کی طباعت بہ شکل کتاب ممکن نظر آئی تو اسی طرح چھاپی جائے گی جیسے مطبع نول کشور میں میرزا صاحب کی حیات میں چھپی تھی۔

اصلاحِ متن

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ میرزا صاحب کے اس ترجمۂ منظوم کی نقل میں کاتب نے متعدد غلطیاں کی تھیں۔ چونکہ محل و موقع سے ان کے خلاف شہادت بہ سہولت دستیاب ہوتی تھی، اس لیے میں نے زیر نظر متن میں ان کی تصحیح کر کے حاشیے میں اصل کا لفظ لکھ دیا ہے تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو آزادانہ رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔

یہاں مثال کے بہ طور ایک غلطی کا تذکرہ کرتا ہوں۔ قلمی نسخے میں ایک شعر اس طرح لکھا ہے:

ہر کرا خواہی، تو روزی میدہی بیش از انداز مقدارش دہی

ظاہر ہے کہ اگر اس شعر میں دہی کو ردیف قرار دیا جائے تو قافیہ ندارد ہے۔ اور اگر اس کو قافیہ مانیں تو چونکہ لفظاً و معناً قافیہ دونوں مصرعوں میں ایک ہے، اس لیے تکرار قافیہ لازم آتی ہے جو ایک شعر کے اندر واقع ہونے کی وجہ سے ایطائے جلی کی کھلی ہوئی مثال ہوگی۔

میرے عقیدے میں میرزا صاحب سے اس قسم کی غلطی کے سرزد ہونے کا امکان ہی نہیں، اس لیے میں نے اس کو کاتب کی تصحیف پر محمول کیا ہے اور مصرعۂ ثانی کے الفاظ "مقدارش" کو "مقداری" بنایا ہے تاکہ دہی ردیف اور می اور مقداری قافیہ بن جائیں چونکہ خط شکست میں "مقداری" کی ی کو ش پڑھا جاسکتا ہے جس کا تجربہ ہر ادیب کو ہوگا، اس لیے مجھے یقین ہے کہ اس ادبی جرات کو ارباب فن قبول فرمائیں گے اور میرزا صاحب کے مذکورہ شعر کو اس طرح پڑھیں گے۔

ہر کرا خواہی تو روزی می دہی بیش از اندازِ مقداری دہی

دُعاء الصباح

ای خدا ای داوری[1] کو برگشاد　　از درخشیدن زبانِ بامداد

پاره‌های تارِ شب را آفرید　　پرده‌های تارِ ظلمت درکشید

کرد صنعِ چرخِ گردان استوار　　در مقدادیر تزئین آشکار

ای خداوندی که تا بِ آفتاب　　کرد یکجا با فروغ التهاب

چهرهٔ مهرِ درخشان برفروخت　　با همه تابش در آتش زحمت سوخت

ای که دانش را بذاتش رهبری　　گشت از همجنسیِ عالم بری

در جهان همتیش[2] همجنس کیست　　هیچ مخلوقی بدو همجنس نیست

برتر از کیفیت آمد گوهرش　　کیفیتها نیستی گیرد برش

ای که نزدیکی بخطراتِ ظنون　　دور تر هستی ز دیدارِ عیون

یعنی از دیده شدن ذاتش بری است　　برکرانه از جهات پیکری است

گوهر او از پس و پیش است بیش　　کرد هستی را احاطِ علمِ خویش

هر چه در عالم به هستی رو نمود　　پیش از هستی بعلم او کشود

ای که در گهوارهٔ امن و اماں　　خواب را در چشمِ من کردی نهاں

باز چشمِ من به بیداری گشاد　　سوی احسان و عطائی کو بداد

دست او بربست دستِ هر زیاں　　قدرتِ او از بدی دادم اماں

بر فرست ای داورِ هستی! درود　　بر کسی کو سوی تو راهم نمود

در شبِ تاریک تر شد رهنما　　سوی درگاهِ تو ای گیتی خدا!

از سبب‌های تو ای ربّ الامین!　　از شرف گیرندهٔ حبلِ المتین[3]

آن فروزان گوهرِ دیرینه نژاد　　آنکه بر دوشِ بلندی پا نهاد

آنکه آید در نخستین روزگار　　پای او بر جانِ لغزان استوار

نیز بر آلش که از بس طاهر اند　　پاک دین و برگزیده ظاهر اند

نیک کرداران و یزدان برگزیں　　برگزیده گوهرانِ پاک دیں

ای خدا! بکشا مصاریعِ الصباح　　از برای ما بمفتاح الفلاح

یعنی ای داورِ گیتی دادگر!　　برگشا بر ما تو درهای سحر

از کلیدِ لطفت درها باز کن　　بهر ما سامانِ رحمت ساز کن

بهترین پیرایهٔ رشد و سداد　　در برم پوشاں تو ای ربّ العباد

برنشاں در من نیابیع الخشوع　　از دلم کن رواں عین الخضوع

پیشگاهِ عظمت اے بے نیاز!　　کن رواں از چشمِ من آبِ نیاز

دایم از بیمِ خودت ای کردگار　　اشکها از گوشهٔ چشمم ببار

سرکشیِ نادانیم تادیب کن　　از شکیبائی مرا تهذیب کن

گر نباشد از تو آغازِ کرم　　ورنه توفیقِ تو باشد رهبرم

کس نیارد بُردنِ من سوی تو　　در کشاده تر رهی در کوی تو

گر مرا حلمِ تو بسپارد به آز　　برکشد زنجیرهٔ حرصم دراز

کس نیامرزد گناهم[4] اے خدا!　　سرنگوں افتادنِ من در هوا

نصرتِ تو گر مرا نایَد[4] معیں　　گاهِ جنگِ نفس و شیطانِ لعیں

این چنیں خذلاں بحرمانم کشد　　در همه رنج و تعب جانم کشد

خود مرا می بینی اے هستی خدا　　کامدم سویت باُمید و رجا

دستِ بستم با طرافِ الحبال　　چوں گنه افگند دورم از وصال

چوں بدوری در شدم از بارگاه　　زانکه چیره شد بمن دستِ گناه

زشت مرکوبی که نفسِ من بر آں　　از هوا و حرص شد دایم رواں

واه! از تسویلِ نفسِ ذو فنون　　کاں بود از آرزوهای ظنون

آه! ازاں خواهش کزو بخاسته　　آرزوها آردش آراسته

هر زماں گامی بهر سویش برد　　فرشِ خواهشها بهر هر سو گسترد

بر درازی‌ها کشد طولِ امل　　تا بدوری افتد از حسنِ عمل

نیست ناداں، نفسِ فرماں ناپذیر　　کو بود پیشِ خداوندش دلیر

جرأت و گستاخی و عصیاں کند　　سرکشی از طاعتِ یزداں کند

ای خداوندا! من از دستِ رجا　　کوفتم دروازهٔ رحمِ ترا

سوی تو بگریختم با اضطرار　　از دُنُوِّ خواهشِ نااستوار

در پناهِ تو، ای گیتی خدا!　　باز پیوستم سر انگشتِ ولا

درگذار از من[5] تو، ای ربّ الورا　　هر چه کردم از گناه و از خطا

[1] اصل: دادید۔ [2] اصل: هستی اش۔ چونکه میرزا صاحب نے سرور کے نام کے خط میں تصریح کر دی ہے کہ ہر اس لفظ کے جس کے آخر میں ۃ ساکن ماقبل مفتوح ہو وہ عام الفاظ کے ساتھ ت۔ تم۔ تش ملا کر لکھے جاتے ہیں، بنا بریں یہاں بھی تینوں میں ملا کر لکھا گیا ہے۔ [3] اصل: الوطین [4] اصل نیاید۔ [5] اصل: گذار۔ لیکن یہ میرزا صاحب کے املا کے خلاف تھا۔ اس لیے اصلاح کر دی گئی ہے۔

لغزشی کز من بیاید آشکار
درگذار از من تو، ای پروردگار!

عفو کن افتادن من در بلا
باز دار از هر چه زاید زان عنا

زانکه هستی سرور و معبود من
غایتِ هر خواهش و مقصود من

در زمانِ هر کجا گردیده ام
نیز در هنگام آرامیده ام

خود چه سان میرانی ای پروردگار
بے نوائی کامدت با اضطرار

یعنی آن مسکین که آورد ست رُو
با همه صد ناشکیبی، سوی تو

از گناه خود گریزان آمده
وز خطای خود پشیمان آمده

رہ نپردی را که خواهد راهِ تو
قصد او باشد همه درگاهِ تو

سوی درگاهِ تو باشد تیزگام
لیکنی دورش چرا از راهِ کام؟

تشنه را باز میداری چرا؟
آنکه سوی حوضِ تو شد رہ گرا

آب جویان آمده بر چشمه سار
تا لبِ خود تر کند زان آبشار

زینهار این حوضِ تو پُر باد از زلال
پُر بود هنگامِ قحط و خشک سال

بابِ تو مفتوح باشد جاودان
بر رُخِ خوانندهٔ ناخواندگان

طالبان دیم طفیلی آشکار
بر درِ بکشاده ات یابند بار

هر که میخوانیش می آید بزود
وانکه ناخوانیش نیز آید فرود

این درت بر روی کس بربسته نیست
خوانده و ناخوانده، چو اینجا یکیست

در کمالِ جودِ تو این فتحِ باب
تا همه گردند از تو بهره یاب

بخششِ خود را تو زنجیرِ دراز
بر کشیدی، ای خدای بے نیاز

خود نمی بندی درت بر روی کس
جز برحمت می نه بینی سوی کس

لطفِ تو عام است و هرگز نیست خاص
دور تر رفته از این در اختصاص

[1] بسته نبود بر رخِ کس بابِ تو
هر کسی رخشان بود از تابِ تو

ابرِ تو ریزد بہ دامن گهر
هر کسی را فیضِ تو آید ز در

ممسکی و بخل در تو یافت نیست
آنکه در هستی او بی بهره کیست

غایتِ مامول و مسئولم توئی!
آخر مقصود و مامولم توئی!

این زمامِ نفسِ خود را، ای خدا
کرده ام بر بستهٔ بندِ رضا

مرکبِ نفسم که از بس سرکش است
هر زمان سر بر فلک چون آتش است

با رضایت کرده ام فرمان پذیر
تا بود در مجلس فرمان اسیر

هر چه رنجیدش همه گیرد بسر
سر نتابد از قضا و از قدر

هر چه پیش آیدش، گیرنده شود
هر چه بر بنهندش پذیرنده شود

گر همه تلخی بریزندش بکام
در کشد یکسر، چنان کز شهد جام

خواهش خود را نباید بے نشان
خواهشِ تو بیش گیرد جاودان

از گناهم بود پشتم بار گران
رافت و رحمِ تو کردش بے نشان

بی نشانش کرده ام از الطافِ تو
ساختم معدومش از الطافِ تو

وین هوای نفسِ من گمراه کن
از طریقِ راستی بیراه کن

سوی لطف و رافتت بسپردمش
سوی غفاری و عفوت بردمش

ای خدا! بر من بیارای بامداد
با فروغ راستکاری و رشاد

وین سحر را کن تو، ای پروردگار
از برای دین و دنیا پائدار

شام گاهم را بکن بهرم سپر
از فریبِ دشمنان کینه ور

نیز آن شامم هر اکن پائدار
از هوا و زهلکات روزگار

باشدت، بر هر چه می خواهی توان
هر کرا خواهی، دهی ملک جهان

ملک خود را باز بستانی همین
از کسی کش خواهش کردن چنین

هر کرا خواهی تو عزت میدهی
هر کرا خواهی، تو ذلت میدهی

نیکی و خوبی همه در دستِ تست
هر چه باشد هستیش پابستِ تست

بر همه هستی توانائی تراست
دیگری را این توانائی کجاست؟

شب درونِ روز می آری همین
باز روز آری درون شب چنین

تو بر آری زنده را از مرده تن
می بر آری مرده از زنده بدن

خون ز جسم و جسم را از آب و خون
از توانِ خود همی آری برون

بیضه از مرغ و مرغ از بیضه ها
می بر آری تا شود هستی گرا

باز نادانی، خدا را ناشناس
عالمی یزدان ستا و با سپاس

باز از دانا تو نادان آوری
کو بدوری افتد از دانش دری

هر کرا خواهی تو روزی می دهی
بیش از اندازه و مقداری دهی

هر چه خواهد عفوِ تو خود آن کند
چاره آن جرم و آن عصیان کند

برزواید هر چه کردم از گناه
بر کرانم آر از کارِ تباه

لطف او نگزاردم در بند آز
تا نمانم بستهٔ بندِ نیاز

---

[1] اصل: بسته نبود برخ آه-

جز تو معبودی نشد ہستی گرا — ہر تو آریم تسبیح و ثنا
مر ترا دایم ستایش گستریم — در ستایشہا نیالشں آوریم
کیست آں کو داندت حکم و تواں — پس نیابدہیم تو اورا بجاں؟
کیست آں کو انچہ ہستی داندت — پس ز تو ناترسد و ناخواندت؟
از توانِ تست تالیف الفرق — باشد از رحم تو تفلیق الفلق
فرقہ ہائی مختلف یکجا کنی — صبح را از تار شب پیدا کنی
تار شب را ساختی رخشندہ رخت — آب را کردی رواں از سنگ سخت
آب را کردی دو گونہ آشکار — یک بود شور و دگر شیریں گوار
از فشارندہ کہ آں باشد سحاب — خود فرود آوردہ ریزندہ آب
ساختی خورشید و مہ را آشکار — در جہاں مثل چراغ نوربار
بی از آں کز احتمال رنج و درد — ماندگی آید ترا از کار کرد
ای یگانہ! با ہمہ عز و بقا — بندگاں را بیت کردی از فنا
ای خدای پاک ای رب ودود! — از فرازیں بر فرود آورد رود!
بر محمد مصطفیٰ و آلِ او — آں گزیدہ گوہرانِ پاک خو!

بشنو آوازم، پذیرا کن دعا — دشمنانم را مگریں بر ثنا
از کرم امیدمن کن استوار — ای کہ خوانندت پی کشفِ مزار
ای بعسر و یسر ماموِل ہمہ! — وی ز تو انجاح مسئول ہمہ!
حاجتِ خود پیش تو آوردہ ام — ناگزیری بر تو عرضہ کردہ ام
پس بہ ناکامی مگر دانم ز جود — از گزیدہ بخشش خود، ای ودود!
ای دہ شور، ای دہ شور مہرباں! — مہرباں ترا ز ہمہ رحمت کناں!
یا الٰہی قلب من محجوب و تنگ — عقل من مغلوب و نفس من بہ ننگ
حرص من بود است بر من چیرہ دست — کثرت عصیان و طاعت اندک است
معترت آمد ز بانم در ذنوب — چیست تدبیرمن؟ علّام الغیوب؟
ای گنہ آمرز و ستار العیوب! — عفو کن از من بنجشایم ذنوب
ای بہنگام عقوبت سخت گیر — وی بحلم و مغفرت پوزش پذیر!
حاجت من بہر قرآں کن روا! — از برائی حضرت خیر الورا!

ای خدا، از آسماں آور فرود!
بر نبی و آلِ اطہارش درود!

لہ یہاں سے امام زین العابدین علیہ السلام کی مناجات کا ترجمہ شروع ہوتا ہے۔ (عرشی)

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
غالب

منصبِ شیفتگی و عظمتِ عشق

منصبِ شیفتگی

مرزا غالب

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دُنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

عظمتِ عشق

عمر انصاری

عظمتِ عشق کا قائل تو ہوا تیرے بعد
حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا تیرے بعد

درِ زنداں ہے کہ رہتا ہے کھُلا تیرے بعد
ہاتھ ملتا ہے ہر اک اہلِ جفا تیرے بعد

تھا جو اک مملکتِ حُسن کا باغی نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا تیرے بعد

عارض و رُخ پہ یہ بکھرے ہوئے گیسو ہے ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا تیرے بعد

ہائے! وہ زلف میسر نہیں شانہ جس کو
اُف! وہ ناخن کہ ہیں محتاجِ حنا تیرے بعد

دل ہے روٹھا ہوا آپ اپنے ہی ارمانوں سے
نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا تیرے بعد

زندگانی ہے کوئی دُور کی جیسے آواز
ہو گیا چاکِ گریباں سے جدا تیرے بعد

پھر نہ دیکھا کبھی کھُلتے دَرِ میخانۂ عشق
پھر نہ آئی لبِ ساقی پہ صلا تیرے بعد

غیرتِ دل کو جھنجھوڑے ہے کوئی رہ رہ کر
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا تیرے بعد

میزباں جس کا ترا پیار رہا ہو برسوں
کس کے گھر جائے وہ سیلابِ بلا تیرے بعد

ضرب الامثال اور مرزا غالب

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

نثر ہو یا نظم ہر صنف کی تہ سے گزرتے ہوئے نظر جب آخری سطح پر جاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایک کے اجزائے ترکیبی میں آخری سطح زبان و بیان کی آمیزش ہے۔ اس احساس کو خوبصورت و کامیاب بنانے کی ہر دور میں قابل فن کاروں نے کوشش کی۔ غالباً اسی لسانی مہم کا خیال تھا کہ ہمدردی میں مختلف اہل علم نے شاعروں اور نثر نگاروں کو ایسے سہارے بہم پہنچائے جن کے نام ہیں۔ عروض، صنائع بدائع، محاورات وغیرہ۔ فن کاروں نے حسب استعداد ان سے فائدے اٹھائے۔ اچھے فن کاروں نے ایک خاص مذاق و اہتمام کے ساتھ جذبات کو الفاظ کے حسن ترتیب۔ عبارت یا شعر کی شکل میں پیش کرنے کی فکر کی لیکن جو وقتی شہرت کے بھوکے تھے انھوں نے معاشرہ کے سطحی مذاق کو مرکز فکر و فن بنا لیا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے شاعر یا نثر نگار اپنے عہد ہی کے ساتھ ختم ہو گئے۔ مثال کے لیے نثر میں فسانۂ عجائب اور نظم میں امانت لکھنوی کا کلام پیش کیا جا سکتا ہے۔ مصنف فسانۂ عجائب نے عصری مذاق کے لحاظ سے ایک ایسا کارنامہ پیش کیا کہ ہر زبان پر اس کی تعریف آنے لگی۔ اس وقت کے معاشرہ کے رجحانات کو رجب علی بیگ سرور نے ہر طرح آسودہ کرنے کی سعی بلیغ کی۔ رنگین بیانی، مقفٰے مسجع عبارت نثر و اشعار کی بھرمار سے ایک زمانے کو خوش کرنے کی کوشش کی اور اس میں شک نہیں کہ بڑی چابک دستی سے انھوں نے معاشرے کے ادبی و لسانی رجحانات کو پیش کیا۔ مگر اس شہرت کے حاصل کرنے میں مصنف نے یہ نہ سوچا کہ ادب اس بار گراں کا متحمل نہ ہو سکے گا اور مستقبل قریب کا نثری مذاق رنگینیِ بیان اور قافیہ پیمائی سے بوجھل ہو کر شاہ راہ ادب پر کتنی دور چل سکے گا۔

یہی حشر امانت کا ہوا۔ ایک زمانے میں رعایت لفظی کا ایسا غلبہ ہوا کہ روزمرہ کی گفتگو، تحریر و تقریر اور شعر و شاعری بغیر اس صنعت کے بے کیف معلوم ہونے لگیں اور نثر و نظم دونوں اصناف سخن پر اس کا شاہانہ قبضہ ہو گیا۔ امانت نے خاص طور پر اس معرکہ میں نام پیدا کیا۔ ان کے ایسے اشعار بھی پسند کیے جانے لگے جیسے ؎

قبر پر میری لگایا نیم کا اس نے درخت بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

ہم اس سے بے خبر نہیں کہ یہ صنعت عہد قدیم سے اردو میں پسند کی جاتی تھی اور اس سے بھی ہم کو انکار نہیں کہ یہ صنعت شعر کو دل کش بنانے میں کارآمد رہی ہے لیکن امانت یا ان کے لیے دوسرے شعرا کے یہاں بات حد اعتدال سے بڑھ گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے شعراء کا بہ حیثیت غزل گو آج کوئی ذکر بھی نہیں کرتا۔

کہنا یہ ہے کہ ہر دور میں انداز بیان کو دل کش بنانے کے لیے کسی صنعت یا لفظ پر غیر معمولی توجہ ہو جاتی ہے۔ یہی رویہ بعض تحریک و خیال آرائی کے ساتھ بھی ہمیشہ رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جذبات ہر زمانے کے لیے یکساں اہم ہوتے ہیں مگر تقلید یا زمانے کی وقتی پسندیدگی سے اتنا مغلوب ہو جانا کہ جزو کو کل تصور کر لینا کسی تخلیق کا باعث نہیں ہو سکتا۔ رائج الوقت رجحانات سے متاثر نہ ہونا بھی غلط ہے لیکن ایک دور رس و ذہین فن کار اسی دائرے میں اپنے کو محدود رکھنا بھی ادبی گناہ سمجھتا ہے۔ وہ عام پسند اقدار کی طرف توجہ کرتے ہوئے بھی اقدار ضروریات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فن کاروں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ ہر عہد میں زیادہ تر ایسے شاعر یا نثر نگار ملتے ہیں جو

حسب توفیق اپنی فنی استعداد کو عام پسند رجحانات تک محدود رکھنا ہی شاعری یا نثر نگاری کا ماحصل سمجھتے ہیں، ظرف استعداد کے لحاظ سے فن کار کم یا زیادہ علیحدگی اختیار کرتے ہیں۔

اس قسم کی علیحدگی و وابستگی اردو شاعری کے ہر دور میں نظر آتی ہے۔ اس وقت ہماری نظر اردو کے اس دور شاعری پر ہے جس کا دائرہ شاہ نصیر، ذوق، مومن، غالب تک ہے۔ اس زمانے کے ایک محدود مگر اہم رجحان کا جائزہ ہم لینا چاہتے ہیں۔ ہمارا مطلب اشعار میں ضرب الامثال قلم بند کرنے سے ہے۔ یوں تو ہر دور کے ادبی مذاق میں اس رجحان کے نشانات ملتے ہیں مگر اس دور میں ہمیشہ سے زیادہ یہ مذاق نمایاں ہو گیا تھا۔ استاد ذوق کو جس قدر اس رجحان سے شغف تھا شائد اتنا کسی دور میں کسی ایک شاعر کو نہ رہا ہوگا۔ ان کے دیوان میں اس کے واضح نشانات ملتے ہیں۔ مثال کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا — یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر — آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

اس رخ و زلف کے آگے نہ ہوا مہ کو فروغ — آگے کالے کے دیا کس نے ہے جلتے دیکھا

بیٹھ رہ کرکے قناعت کہ یہ شکل مہ نو — چھوڑے آدھی تو نہیں ساری کو جانا اچھا

عاجزی سے رہے، آئے نہ ہوا میں کر زور — موت ہے چیونٹی کی ہو دیں جو اگر پر پیدا

تو کہے غنچہ کو اس لب پہ دھڑی خوب نہیں — چپ! اک منہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو — تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو — زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

لے نگاہ مہر سے دل مت بہ چشم قہر دیکھ — گڑ دیے سے جو مرے تو دے نہ اس کو زہر دیکھ

حساب بھلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا — حساب دوستاں در دل اگر وہ دل ربا سمجھے

مجھے آتا ہے رشک اس رند پہ آشام پر ساقی — نہ جو دع ما کدر جانے نہ جو خذ ما صفا سمجھے

پہنچا ہے شب کمند لگا کر کہاں رقیب — دیکھو حرام زادے کی رسی دراز ہے

رکے اشک اور آہ پہنچی فلک پر — مرا عشق کم خرچ و بالا نشیں ہے

پلائے آنکھ اراہم کو کس کی ساقیا چوری — خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

لاشہ کو دفن کیجیے میرے کہ پھینک دیجے — مردہ بدست زندہ جو چاہیے سو کیجے

یہ نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے — ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

سچ کہا ہے کسی نے یہ اے ذوق — مال موذی نصیب غازی ہے

میں حضوری میں ہوں اس کی پہ کس طرح دام — ہے یہ مشہور مثل مال عرب پیش عرب

ہو چکی دل کی اپنے عشق میں خیر — رہویں دریا میں اور مگر سے بیر

اتنی مثالوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق ایسا مستند و محتاط زباں داں شاعر جب ضرب الامثال سے اتنا لطف لیتا ہے تو یقیناً یہ ادبی روایت ہمہ گیر دل چسپ موضوع سخن رہی ہوگی۔ اس کے علاوہ اس کی شاعرانہ اہمیت بھی تھی۔ صدیوں کے تجربات اور زندگی کے حقائق شعر کی گرمی اور بیان کی صداقت کا باعث تھے۔ باتوں باتوں میں شاعر کا مفہوم ذہن کے لیے آسان تر ہو جاتا تھا لیکن بایں ہمہ یہ نہ تو کوئی تخلیقی کارنامہ تھا نہ شاعرانہ ادراک کا مظہر۔ اسی لیے غالب کی جدت پسند طبیعت نے اس رسمی تقلید کی طرف رخ نہ کیا۔ مگر اس کی لذت و اہمیت کو ایک ایسے اسلوب سے پیش کیا جس میں خلاقی بھی تھی اور جاذبیت بھی۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ انداز بیان جامع بھی تھا اور مانع بھی۔ جاذبیت اس لیے تھی کہ ایسے اشعار میں دنیائے معلومات بھی تھی اور عصری زندگی کی روح بھی۔

ہمارے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ مرزا غالب کے زیر غور اشعار میں ایسے خیالات نظم ہوئے کہ کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ یہ سوچنا غلط ہوگا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جہاں کہیں فارسی یا اردو میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن کی پرچھائیاں غالب کے ان اشعار میں نظر آتی ہیں (جن کو بطور نمونہ نیچے پیش کیا جا رہا ہے) وہ اصل شاعر کے یہاں غالب کے اشعار کے مقابلے میں بے جان و بے اثر نظر آئیں گی۔ غالب نے اپنے انداز بیان سے پرچھائیوں میں بھی جان ڈال دی ہے۔ انھوں نے ایسے اشعار میں اپنی فن کاری سے ایک زمانے کے محسوسات کو زبان عطا کر دی ہے۔ اس کلام کو سن کر ایک بڑا طبقہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہی تو میں نے بھی سوچا تھا' مگر تاب تکلم و جرات رندانہ کی کمی سے احساس صرف ذہن میں کروٹیں لیتا تھا' زبان تک نہ آتا تھا، مرزا غالب نے منہ کی بات چھین لی۔ ایسے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور سوچیے کہ یہ ضرب الامثال کے نعم البدل ہیں یا نہیں:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا ہوا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا

زنار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے　　مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا　　اور درویش کی صدا کیا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے　　کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق　　نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ہزاروں آرزوئیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ان اشعار کو ممکن ہے ضرب الامثال کی حیثیت دینے میں کچھ لوگوں کو تکلف ہو، شاید یہ کہا جائے کہ ضرب المثل کا اختصار ان میں نہیں۔ بغیر دو مصرعوں کے مفہوم واضح نہیں ہوتا اس لیے وہ جامعیت بھی نہیں جو کہاوت یا ضرب المثل میں عموماً ہوتی ہے۔ اس اعتراض یا خلش کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے کے لیے ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اردو زبان جن متعدد زبانوں سے فیض یاب ہوئی ہے ان میں عربی، فارسی ہندی اور آخر میں انگریزی زبانیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان زبانوں میں ضرب الامثال مختلف شکلوں میں ملتے ہیں۔ کبھی نثر میں اور زیادہ تر مصرعہ یا شعر کی صورت میں مثلاً

جلتی چکی دیکھ کر دیا کبیرا روے　　دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوے

بھینس کے آگے بین باجے بھینس کھڑی پگرائے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

عیاں را چہ بیاں، از خرداں خطا و از بزرگاں عطا، جامہ نہ دارم دامن از کجا آرم، کلی حوض باردار بے دقت کی شہنائی۔ غالبؔ سے پہلے بھی اردو شعرا نے اشعار سے ضرب المثل کے ذخیرے میں اضافہ کیا ہے مثلاً میر حسن کہتے ہیں۔

سدا نہ کرتا ہے کوئی پریت　　مثل ہے کہ جوگی ہوے کس کے میت

اس لیے یہ سوچنا کہ شعر کی صورت میں کلام ضرب المثل کے دائرے میں نامانوس ہو جاتا ہے یا جامعیت کم ہو جاتی ہے، روایت و حقیقت کے خلاف ہے۔ ضرب المثل کی ماہیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی خاص شکل نہیں۔ نثر و نظم، مصرعہ و شعر، فقرے اور جملے ہر ایک روپ میں یہ بھیس بدل کرتا ہے لیکن چونکہ علم سینہ سے اس کا تعلق زیادہ رہا ہے اس لیے اس کا ذہنی جھکاو شعریت یا شعر کی طرف زیادہ ہے اور قافیہ و ردیف سے اس کو خاص لگاؤ ہے۔ یہ رجحانِ غالبؔ اسی لیے مناسب اور موزوں بھی تھا کہ اس سہارے سے حافظہ تک باتیں آسانی سے پہنچ جاتی ہیں، سننے والے کو قبول کرنے میں نسبتاً کم زحمت ہوتی ہے۔

ضرب المثل کی ماہیت پر اگر ناقدانہ انداز سے ہم نظر کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کے خمیر میں جذبات سے زیادہ تجربات کی آمیزش ہے۔ انفرادی محسوسات اور ذاتی کیفیات سے عموماً الگ ہو کر وہ باتیں کہی جاتی ہیں جو زندگی کی کشمکش کے نتیجے بن کر ذہن پر ابھرتی ہیں جن میں تلخ باتیں بھی مزے دار ہو جاتی ہیں کیونکہ پس منظر میں ایک ایسی حقیقت ہوتی ہے جس کو عمومیت حاصل ہوتی ہے اور ضرب المثل کو جاذبیت اس لیے بھی حاصل ہوتی ہے کہ ان تجربات کے اظہار میں عام فہم مگر موثر الفاظ کام میں لائے جاتے ہیں۔ اختصار و جامعیت ان کا نچوڑ ہوتا ہے۔ باوجود اس کے ضرب الامثال نصیحت و عبرت کا بہترین سبق ہوتے ہیں مگر اس انداز سے سننے والوں تک پہنچائے جاتے ہیں کہ جو عنصر نصیحت کو تلخ بنا دیتا ہے وہ یہاں محسوس نہیں ہوتا۔ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کو کوئی غیرت دلا رہا ہے یا زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنے کے لیے ناصحانہ انداز میں کچھ سمجھا رہا ہے۔ ضرب الامثال کی دنیا میں بظاہر نہ کسی سے تخاطب ہوتا ہے نہ کسی فرد کی برائی ہوتی ہے۔ ایک صلائے عام سارے زمانے کے لیے ہے جس کو توفیق ہو اس سے فائدہ اٹھائے۔ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس میں تخیل یا فکر کا کوئی نمایاں عنصر نہیں ہوتا۔ مرزا غالبؔ بغیر اس کے لقمہ نہیں اٹھاتے اسی لیے انھوں نے مروجہ ضرب الامثال کو ذوق کی طرح قلم بند کرنے میں کوئی لذت نہ محسوس کی۔ برخلاف اس کے ایسے طور پر ایسے تجربات و حقائق اشعار میں پیش کیے جو انفرادی روداد سے الگ تھلگ آفاقی محسوسات کے ماحصل سمجھے جائیں، جن کا تعلق کسی عاشق سے ہو نہ معشوق سے بلکہ ساری کائنات سے ہو۔ فکری عنصر و بلندی تخیل کو انھوں نے ایسے پُراثر انداز میں پیش کیا کہ یہ اشعار زباں زد ہو گئے۔ زندگی کی مختلف کشمکش میں یہ اشعار اسی طرح لوگ بیان کرتے جیسے وہ کلام جن میں مروجہ ضرب الامثال قلم بند ہوتے تھے۔ اس کا ثبوت ان چند اشعار سے بھی ملتا ہے جو اوپر بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں جس قدر مرزا غالبؔ کے یہ اشعار بطور دلیل یا سند پڑھے جاتے تھے وہ بجائے خود قبول کی سند ہے۔

مرزا غالب نے ان اشعار میں اپنے سوچے سمجھے افکار کو اس حسن و خوبی سے پیش کیا کہ ضرب الامثال کی دنیا میں ایک ذہنی اضافہ محسوس ہوا۔ اب تک اردو کے اس ذخیرے میں عموماً روزمرہ کی زندگی یا معمولی اخلاقی قدروں کو برتنے کے لیے کچھ ہلکے پھلکے اشارے ملتے تھے۔ مابعد الطبیعات یا فلسفیانہ نکات نہ ہونے کے برابر تھے۔ غالب نے ایک مفکر اور ہوشیار فن کار کی طرح اپنے مطالعہ کی روشنی میں ان گہرائیوں سے بھی ضرب الامثال کو روشناس کرایا جس کی مثال اردو شاعری میں نایاب ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس صنف کی بیشتر خصوصیات اشعار میں باقی رہتی ہیں۔ طرز بیان کی سادگی، ذاتی مسائل سے علیحدگی، ہمہ گیر محسوسات کی ترجمانی، ناصحانہ انداز بیان سے گریز، لہجے میں بیباکی، غرض کہ ضروری اجزائے ترکیبی اس قبیل کے اشعار میں برابر نظر آتے ہیں۔ اپنی بات کی وضاحت میں دو چار اشعار یا مصرعے پیش کر دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ مثلاً

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

.. .. — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

.. .. — نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

.. .. — جام جم سے یہ میرا جام سفال اچھا ہے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابند نے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

.. .. — مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار اپنی نوعیت و مقبولیت کی بنا پر ضرب الامثال کا درجہ نہیں رکھتے۔ ہمارے نزدیک مرزا غالب اس معرکے میں بھی منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ اس لیے کہ دوسرے شعرا نے رائج الوقت امثال کو خوبصورتی سے قلم بند کرنے کی زحمت کی، اس ذخیرے میں کوئی ایسا اضافہ نہیں کر سکے جو ذہنی بالیدگی کا سبب بن سکے، برخلاف اس کے غالب نے اپنی خلاقی سے اس ذخیرے کو وہ فروغ عطا کیا کہ دنیا نے یہ یقین کر لیا کہ اردو زبان اگر دوسری زبانوں یا معاشروں سے کچھ لسانی یا ادبی سرمایہ مستعار لے سکتی ہے تو اس کے عوض کچھ قابل قدر خیالات و نظریات دے بھی سکتی ہے۔

★

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

غالب

جشنِ غالبِ آشفتہ سر ہے آج

سالک لکھنوی

دل طالبِ کرم تھا مگر بے خبر ہے آج
خالی صدائے کاسۂ دریوزہ گر ہے آج

آئینہ ہے نہ جوہرِ آئینہ گر ہے آج
کل تک جو معتبر تھا فریبِ نظر ہے آج

تنہا ہوں اپنی راہ میں، یہ بھی یقین ہے
یہ وہم بھی ہے جیسے کوئی ہم سفر ہے آج

ساقی کے ہوتے یہ روشِ ساغر و سبو
حلقہ بگوش گردشِ شام و سحر ہے آج

کیوں ہے مزاج پر یہ بے چارگیِ دل
کاہے کو یہ نوازشِ بے دادگر ہے آج

تہذیبِ علم و فن سے کوئی بہرہ ور نہیں
جس کم نظر کو دیکھو وسیع النظر ہے آج

ہندوستاں چمن ہے، یہ جمہوریت ہے پھول
آزادیِ خیال بہارِ نظر ہے آج

دنیا کے سرد و گرم کا شکوہ کسی سے کیا
اپنے قدم کی خاک ہی بالائے سر ہے آج

سالک ہمارے دور نے چونکا دیا ہمیں
یہ کہہ کے جشنِ غالبِ آشفتہ سر ہے آج

۲۶ جنوری ۱۹۶۹ء

محاوراتِ غالب

گیان چند

اُردو یا کھڑی بولی نے فارسی سے جہاں الفاظ و تراکیب لیں وہاں محاوروں کو بھی بہ کثرت منتقل کیا۔ اردو میں متعدد ایسے محاورے ہیں جنھیں اردو فارسی سے ناواقف لوگ بھی روزانہ استعمال کرتے ہیں اور کسی کو احساس نہیں ہوتا کہ یہ فارسی سے ترجمہ ہیں۔ مثلاً کسی کے دل میں جگہ

نظر چڑھنا، نظر سے گرنا، سراونچا کرنا وغیرہ۔ ہمارے شعرا نے زبان میں وسعت دینے کی خاطر کچھ اور محاوروں کا ترجمہ کیا۔ یہ نسبتاً غریب تھے اس لیے اُردو روزمرہ کا جز و نہ بن سکے۔ مثلاً

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے ۔۔۔ اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

کھِلنے میں ترے منھ کے کلی پھاڑے گریباں ۔۔۔ آگے ترے رخسار کے گُل رگ تر آوے

زندگی کرنا زندگی کردن کا ترجمہ ہے۔ اُردو کا روزمرہ زندگی بسر کرنا یا زندگی گزارنا ہے۔ تر آنا تر آمدن کا ترجمہ ہے جس کے معنی شرمندہ ہونے کے ہیں۔ اپنے انوکھے پن کی وجہ سے اس قسم کے ترجمے بھلے معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ انھیں سمجھنا مشکل نہیں۔ اس کے باوجود یہ زبان کا جزو نہ بن سکے۔

غالب نے بھی اگر ایسا کیا تو نہ بدعت کی نہ اجتہاد لیکن وہ اس خصوص میں اعتدال کی تمام حدوں کو پھلانگ گئے۔ انھوں نے فارسی کے ایسے متعدد محاورے استعمال کیے ہیں جو اُردو شاعری میں عام طور سے نہ دیکھے گئے ہیں نہ سُنے۔ غالب کا ابتدائی قلم زد کلام اجنبی محاوروں کا طلسم ہے۔ یہ محاورے متداول دیوان میں کافی کم ہیں۔ نظری کلام میں سیکڑوں ایسے محاورے ملتے ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے فارسی لغات مثلاً بہارِ عجم، فرہنگِ آنند راج وغیرہ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جو حضرات سہواً انھیں لغوی اور لفظی معنی میں لیتے ہیں وہ شعر کے معنی تک نہیں پہنچ پاتے، اندھیرے میں ٹٹولتے رہ جاتے ہیں اور بسا اوقات گم راہ ہو جاتے ہیں۔

غالب نے فارسی محاوروں کو جیوں کا تیوں باندھا ہے لیکن کہیں کہیں ان کا ترجمہ بھی کر لیا ہے۔ ذیل میں اُن کے قلم زد کلام میں سے تلاش کر کے کچھ ایسے محاورے پیش کیے جاتے ہیں جن کا استعمال اُردو ادب میں عام طور سے نہیں ملتا۔

آں سوے : اس پار یعنی دوسری دُنیا

نہیں شاہ راہ اوہام بجز آں سوے رسیدن ۔۔۔ تری سادگی ہے غافل، دردل بہ پا سالی

سراغ آوارۂ عرضِ دو عالم شورِ محشر ہوں ۔۔۔ پرافشاں ہے غبارِ آں سوے صحرائے عدم میرا

سیر آں سوے تماشا ہے طلب گاروں کا ۔۔۔ خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا

آستیں فشانی : کسی شے کو ترک کر دینا

بہ ہزار اُمیدواری رہی ایک شکِ باری ۔۔۔ نہ ہوا حصولِ زاری بجز آستیں فشانی

آتشیں پا : تیز رو۔ غالب نے مضطرب کے معنی میں باندھا ہے جو صحیح نہیں۔

آتشیں پا ہوں گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ ۔۔۔ موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

اس معنی میں دوسرا محاورہ ہے "آتش زیر پا"، غالباً اسی وجہ سے بعد میں غالب نے مصرع اولیٰ کو بدل دیا ع بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا

آئین باندھنا : آئنہ بندی یعنی آرائش کرنا

وحشتِ دل سے پریشاں ہیں چراغانِ خیال ۔۔۔ باندھوں ہوں آئنہ پر چشم پری سے آئیں

دادِ دیوانگیِ دل کو ترا وحشت گر ۔۔۔ ذرّے سے باندھے ہے خورشیدِ فلک آئیں

آئنہ بر جبہہ باندھنا : فارسی کا محاورہ ہے آئنہ بر پیشانی بستن۔ اسی سے غالب نے یہ محاورہ اخذ کیا ہے۔ خواتینِ ولایت کی رسم ہے کہ بچے کی ولادت کے وقت زچہ کی پیشانی پہ آئنہ باندھ دیتے ہیں۔ اس سے اس محاورے کے معنی ہوئے

کسی بات کا نمودار ہونا۔

حیف، اے ننگِ تمنا کہ پئے عرضِ حیا　　　یک عرق آئنہ، بر جبہۂ سائل باندھا

از پا نشستن : کھڑے سے آہستہ آہستہ بیٹھنا

دل از اضطراب آسودہ، طاعت گاہ داغ آیا
برنگِ شعلہ ہے مُہرِ نماز از پا نشستن ہا

از پا اُفتادن : گر پڑنا، عاجز ہونا

برائے حلِّ مشکل ہوں ز پا افتادۂ حسرت　　　بندھا ہے عقدۂ خاطر سے پیماں خاکساری کا

بازی خوردن : فریب کھانا

بازی خورِ فریب ہے اہلِ نظر کا ذوق　　　ہنگامہ گرم حیرتِ بود و نبود تھا

بالیں توڑنا : ترجمہ ہے بالیں شکستن کا۔ غالب نے فارسی اور اردو دونوں شکلوں میں باندھا ہے۔ معنی ہیں کسی کی قدر سے تعظیم کرنا۔ مثلاً ہم بستر پر لیٹے ہیں کوئی کمرے میں آئے اور ہم سر کو تکیے سے ذرا اوپر اٹھا لیں تو یہ بالیں شکستن ہے۔

رنجِ تعظیمِ مسیحا نہیں اُٹھتا مجھ سے　　　درد ہوتا ہے مرے دل میں جو توڑوں بالیں

کیا کس شوخ نے ناز از سرِ تمکیں نشستن کا
کہ شاخِ گل کا خم، انداز ہے بالیں شکستن کا

پائے چوبیں : لکڑی کے وہ پاؤں جنھیں باندھ کر نٹ اور بازی گر چلتے ہیں یعنی کمزور پاؤں

عذرِ لنگش، آفتِ جولانِ ہوس ہی یارب　　　جل اُٹھے گرمیِ رفتار سے پائے چوبیں

پا بہ دامن کشیدن : ترکِ آمد و شد کرنا۔ غالب نے اس محاورے کو فارسی الفاظ کے علاوہ اردو میں ترجمہ کرکے بھی استعمال کیا ہے۔

ہے دستِ رد بہ سیرِ جہاں، بستنِ نظر　　　پائے ہوس بہ دامنِ مژگاں کشیدہ ہوں

بیچیدگی ہے حاملِ طومارِ انتظار　　　پائے نظر بہ دامنِ شوقِ دریدہ کھینچ

پا در حنا : پاؤں کا مجروح ہونا

برقِ بہار سے ہوں میں پا در حنا ہنوز　　　اے خارِ دشت، دامنِ شوقِ رمیدہ کھینچ

تہ بندی : رنگ ریز کپڑے یا لکڑی یا دیوار پر اصلی رنگ چڑھانے سے پہلے ایک اور رنگ کا استر دیتے ہیں جس سے دو مقصد ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اصلی رنگ چوکھا آئے، دوسرے یہ کہ اصلی رنگ کم خرچ ہو۔ اس استر کو تہ بندی کہتے ہیں۔

وصل میں بختِ سیہ نے سنبلستاں گل کیا　　　رنگِ شب تہ بندیِ دودِ چراغِ خانہ تھا

۲۶ جنوری ۱۹۶۹ء

کرے ہے حُسنِ خوباں پردے میں مشاطگی اپنی
کہ ہے تہ بندیِ خط، سبزۂ خط در تہِ لب ہا

جگر تشنہ : بہت مشتاق

ہر کفِ خاک، جگر تشنۂ صد رنگِ ظہور　　　غنچے کے مے کدے میں مستِ تامل ہی بہار

یہ محاورہ متداول دیوان کے مشہور مطلع میں بھی ملتا ہے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　　دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

کم لوگ اس محاورے کے معنی جانتے ہیں۔ وہ مصرعے کی قرأت یوں کرتے ہیں ع دل جگر، تشنۂ فریاد آیا، اور اس کے معنی لیتے ہیں دل و جگر فریاد کے بھوکے آئے۔ پھر حیران ہوتے ہیں کہ دل اور جگر کے بعد واحد فعل کیوں آیا ہے؟ فریاد آئے، کیوں نہیں

جگر باختگی : جگر باختن کے معنی ہیں خائف ہونا۔

کوہ کو بیم اُس کے ہے جگر باختگی　　　نہ کرے نذرِ صدا، ورنہ، متاعِ تمکیں

چارسو : ایسا بازار جس میں چار طرف راستہ ہو اور اُن پر دکانیں ہوں۔ عام معنی میں مطلق بازار کو بھی کہتے ہیں۔

چارسوئے عشق میں صاحب دکانی مُفت ہے　　　نقدِ داغِ دل اور آتش زبانی مفت ہے

چراغ از چشم جستن : وہ روشنی جو زور کی چوٹ لگنے سے آدمی کی آنکھوں کے آگے کوند جائے۔ غالب نے جس شعر میں یہ محاورہ استعمال کیا ہے اس کی صحیح قرأت اب تک نہ ہوسکی۔ نسخۂ حمیدیہ نیز نسخۂ عرشی (ص ۲۲۱ طبع اول) دونوں میں اس کی جگہ چراغ از جسم جستن لکھا ہے جو بے معنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چراغ از چشم جستن کا محل ہے۔

نزاکت ہے فسونِ دعویِ طاقت شکستن ہا　　　شرارِ سنگ، اندازِ چراغ از چشم جستن ہا

چشم سفید : اندھی آنکھ

اگی اک پنبۂ روزن سے بھی چشمِ سفید آخر　　　حیا کو انتظارِ جلوہ ریزی کے کہیں پایا

خار در پیراہن : ایذا دینا۔ غالب نے یہ محاورہ فارسی کے علاوہ اردو ترجمے کے ساتھ بھی باندھا ہے۔

موج سے پیدا ہوئے پیراہنِ دریا میں خار　　　گریہ وحشت بے قرارِ جلوۂ مہتاب تھا

خار خار : خواہش

فالِ ہستی، خار خارِ وحشتِ اندیشہ ہے　　　شوخیِ سوزن ہے ساماں پیرہن کی فکر میں

شوخیِ فریاد سے ہے پردۂ زنبورِ گل　　　حسرتِ ایجادِ بلبل، خار خارِ نغمہ ہے

مالگہ ۹۰۸۹ اشک

خوابِ صیاد : صیاد کا مکر کا نیم کر نیند کا بہانہ کرنا تاکہ صید آکر پھنس جائے

سنبل و دام کمیں خانۂ خوابِ صیاد نرگس و بام نیہ مستیِ چشمِ بیدار

خارِ ماہی : مچھلی کی ہڈی جسے اردو میں بھی مچھلی کا کانٹا کہتے ہیں۔

نہیں گرداب بجز سرگشتگیٔ ہائے طلب ہرگز حباب بحر کے ہے آبلوں میں خارِ ماہی کا

دست برد : فارسی محاورے دست بر رو گرفتن کے معنی ہیں شرم و حیا کی وجہ سے منہ چھپانا ایک اور محاورہ ہے دست از جاں شستن۔ غالب نے ان دونوں کا امتزاج کر دیا ہے۔

رہا نظارہ وقتِ بے نقابی آب پر لرزاں سرشک آگیں مژہ سے دست از جاں شستہ بر رو تھا

دُمِ گرگ : صبحِ کاذب

صبحِ قیامت ایک دُمِ گرگ تھی اسد جس دشت میں وہ شوخ دو عالم شکار تھا

دامن کشی : خود کو کسی چیز سے دور رکھنا

گر ہو مانعِ دامن کشیِ ذوقِ خود آرائی ہوا ہے نقشبندِ آئینہ سنگِ مزار اپنا

دامن بہ کمر : فارسی محاورہ ہے دامن بر کمر زدن جس کے معنی ہیں خدمت کے لیے مہیا ہونا یا کمر بستہ ہونا۔ غالب نے مجبوریِ شعر سے اسے 'بہ کمر دامن' کر کے باندھا ہے۔

یادِ روزے کہ نفس سلسلۂ یارب تھا نالۂ دل بہ کمر دامنِ قطعِ شب تھا

دست و داماں : توسّل سے

نفس حیرت پرستِ طرزِ ناگیرائیِ مژگاں مگر یک دست و دامانِ نگاہِ واپسیں پایا

دماغِ رسیدہ : سرخوشی کی حالت

دریا بساط دعوتِ سیلاب ہے اسد ساغر بہ بارگاہِ دماغِ رسیدہ کھینچ

دوراں سرسے گردشِ ساغر ہے متصل خم خانۂ جنوں میں دماغِ رسیدہ ہوں

راہِ خوابیدہ : سونا راستہ جس پر کوئی نہ چلے کنایہ ہے راہِ دور و دراز سے۔ غالب نے اس محاورے کو سونا اور سویا ہوا راستے ہی کے معنی میں لیا ہے گو بعض جگہ لمبا راستہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے مثلاً ذیل کی مثالوں میں پہلے شعر میں 'راہِ دور دراز' بہت برجستہ ہے۔

قبلہ و ابروئے بت یک رہِ خوابیدۂ شوق کعبہ و بت کدہ یک محملِ خوابِ سنگیں

رہِ خوابیدہ تھی گردن کشِ یک درسِ آگاہی زمیں کو سیلیِ استاد ہے نقشِ قدم میرا

نہیں ہے باوجودِ ضعف سیرِ بے خودی آساں رہِ خوابیدہ میں افگندنی ہے طرحِ منزل ہا

حیرت اپنی نالۂ بے درد سے غفلت بنی راہِ خوابیدہ کو غوغائے جرس افسانہ تھا

رگِ گردن : غرور و تکبر

بہ زاہداں رگِ گردن ہے رشتۂ زنّار سرِ بہ پائے بُتے نانہادہ رکھتے ہیں

زخم کا پانی چرانا : ترجمہ ہے آب وزدیدنِ زخم کا۔ زخم کو پانی لگ جائے تو کچھ رطوبت اس میں جذب ہو جاتی ہے اور زخم میں پیپ پیدا ہو جاتا ہے۔

زبس خوں گشتۂ رشکِ وفا تھا وہم بسمل کا چرایا زخم ہائے دل نے پانی تیغِ قاتل کا

زیور باندھنا : آرائش کرنا

بسکہ واماندگیِ شوق و تماشا منظور جادے پر زیورِ صد آئینہ منزل باندھا

زیرِ مشق : وہ چمڑا یا وصلی جسے لکھنے کی مشق کرتے وقت کاغذ کے نیچے رکھ لیتے ہیں۔

جوشِ گل کرتا ہے استقبالِ تحریر اسد زیرِ مشقِ شعر ہے نقش از پئے احضارِ باغ

زبانِ سرمہ آلود : خاموش زبان کیونکہ سرمہ کھانے سے آواز جاتی رہتی ہے۔

بہ گمانِ قطعِ زحمت نہ دوچارِ خامشی ہو کہ زبانِ سرمہ آلود نہیں تیغِ اصفہانی

زنگ بستن : زنگ لگنا۔ دراصل اس محاورے کے معنی کچھ اور ہیں۔ کوئی پہلوان یا شاطر جب درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو پاؤں میں گھنگھرو باندھ لیتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ اس فن کو ترک کر چکا۔ غالب نے اس محاورے کو زنگ آلود ہونے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

ہوائے ابر سے کی موسمِ گل میں نمد بافی کہ تھا آئینۂ خور پر تصور زنگ بستن کا

سینے پر الف کھینچنا : ترجمہ ہے الف بر سینہ کشیدن کا۔ ایران میں رسم ہے کہ عاشق اور قلندر اور ماتم گسار سینے پر الف کا نشان کھینچ لیتے ہیں۔ غالب کے شعر میں شدتِ شوق کی علامت ہے۔

سایۂ تیغ کو دیکھ اس کے بہ ذوقِ یک زخم سینۂ سنگ پہ کھینچے ہے الف بالِ شرار

سر کھینچنا : سر کشیدن کا ترجمہ ہے۔ سر بالا کرنا

اس چمن میں ریشہ واری جس نے سر کھینچا اسد تر زبانِ شکرِ لطفِ ساقیِ کوثر ہوا

شکستنِ طرفِ کلاہ : فخر و نمائش میں گوشۂ کلاہ ٹیڑھا کرنا۔

جیبِ نیازِ عشق نشاں دارِ ناز ہے آئینہ ہوں شکستنِ طرفِ کلاہ کا

طاعت گاہ : عبادت اور پرستش کی جگہ

دل از اضطرابِ سودہ، طاعت گاہِ داغ آیا　　برنگِ شعلہ ہے مہرِ نماز از پا نشستن ہا

فضولی : وہ شخص جو لایعنی اور فضول کے کاموں میں مصروف ہو۔

شوق سامانِ فضولی ہے وگرنہ غالب　　ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا

قطرہ زن : تیز دوڑنے والا کنایہ ہے ہرزہ گرد سے

کفِ موجۂ حیا ہوں بہ گزارِ عرضِ مطلب　　کہ سرشک، قطرہ زن ہے بہ پیامِ ل رسانی

ہوں قطرہ زن بہ مرحلۂ یاس روز و شب　　جز تارِ اشک، جادۂ منزل نہیں رہا

کوچہ دینا : کوچہ دادن کا ترجمہ ہے کسی کو چلنے کا راستہ دینا۔ غالب نے کوچہ دادن اور کوچہ دینا دونوں استعمال کیے ہیں۔

جس قدر جگر خوں ہو، کوچہ دادنِ گل ہے　　زخمِ تیغِ قاتل کو طرفہ دل کشا پایا

کوچہ دیتا ہے پریشاں نظری پر صحرا　　رم آہو کو ہے ہر ذرے کی چشمک میں کمیں

کلہ گوشہ : فارسی کا محاورہ ہے "کلہ گوشہ بر آسمان" جس کے معنی ہیں سرفراز ہونا۔ غالب نے ترمیم کرکے "کلہ گوشہ بہ پرواز پر تیر" استعمال کیا ہے۔

عشقِ ترسا بچہ و نازِ شہادت مت پوچھ　　کہ کلہ گوشہ بہ پروازِ پرِ تیر آیا

کعبہ جوئی : کعبے کی طرف کو چلنا

بہ وقتِ کعبہ جوئی ہا جرس کرتا ہو نا قوسی　　کہ صحرا فصلِ گل میں رشک ہو بتخانۂ چیں کا

گل بند : ایک رنگین ریشمی کپڑا

بالِ رعنائیِ دم، موجۂ گل بندِ قضا　　گردشِ کاسۂ سم، چشمِ پری آئنہ دار

گل کرنا : گل کردن کا ترجمہ ہے بہ معنی نمودار ہونا

طبع کی واشد نے رنگِ یک گلستاں گل کیا　　یہ دلِ وابستہ گویا، بیضۂ طاؤس تھا

وصل میں بختِ سیہ نے سنبلستاں گل کیا　　رنگِ شب تہ بندیِ دودِ چراغِ خانہ تھا

موئے دماغ : نامرغوب شخص جو مخلِ صحبت اور دوسروں کی بے دماغی کا موجب ہو۔

کس قدر فکر کو ہے نالِ قلم، موئے دماغ　　کہ ہوا خون نگہ شوق میں نقشِ تمکیں

آتشِ موئے دماغِ شوق ہے تیرا تپاک　　ورنہ ہم کس کے ہیں اے داغِ تمنا آشنا

مژہ برہم زدن : پلک سے پلک ملانا، آنکھیں بند کرنا

کوشش ہمہ بے تابِ تردد شکنی ہے　　صد جنبشِ دل یک مژہ برہم زدنی ہے

ناخنِ دخل : طنز و تعریض

عیادت سے اسد میں بیشتر بیمار رہتا ہوں　　سبب ہے ناخنِ دخلِ عزیزاں سینہ خستن کا

ناخنِ دخلِ عزیزاں یک قلم ہے نقب زن　　پاسبانِ طلسمِ گنجِ تنہائی عبث

ناخن زدن : دو شخصوں کے بیچ لڑائی کرا دینا

مجھ میں اور مجنوں میں وحشت ساز دعویٰ ہے اسد　　برگ برگِ بید ہے ناخن زدن کی فکر میں

نعل در آتش : بے قرار کیونکہ اہلِ افسوں جسے بے قرار کرنا چاہتے ہیں اس کا نام نعل پر لکھ کر آگ میں ڈال دیتے ہیں

دشت تسخیر ہو گر گردِ خرامِ دُلدل　　نعل در آتشِ ہر ذرہ ہے تیغِ کہسار

لذتِ ایجادِ ناز، افسونِ عرضِ ذوقِ قتل　　نعل آتش میں ہے تیغِ یار سے نخچیر کا

وابستہ : غالب نے دلِ وابستہ اور خاطرِ وابستہ استعمال کیا ہے۔ عام طور سے وابستہ کے معنی متعلق کے ہیں۔ لیکن بعض اوقات یہ لفظ بستہ یعنی بند کے معنی میں بھی آتا ہے۔ غالب نے دل اور خاطر کے ساتھ بند کے معنی میں لے کر غمگیں اور ملول مراد لیا ہے

اے آہ میری خاطرِ وابستہ کے سوا　　دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

طبع کی واشد نے رنگِ یک گلستاں گل کیا　　یہ دلِ وابستہ گویا بیضۂ طاؤس تھا

یک دل : موافق و متفق

فکرِ نالہ میں گویا حلقہ ہوں ز سر تا پا　　عضو عضو، جوں زنجیر، یک دلِ صدا پایا

تو یہ غالب کی قند پارسی ہے، جس طرح علامتی شاعری کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک علامتوں کے معنی گرفت میں نہ آ جائیں اسی طرح غالب کے ابتدائی کلام کو تب تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک فارسی محاورں کی شناخت نہ کرلی جائے اور ان کے معنی نہ بوجھ لیے جائیں۔ یہ غالب فہمی کی صرف پہلی منزل ہے۔ مزید غور و خوض بلکہ مراقبے کے بعد ہی فہمِ شعرِ غالب تک رسائی ہو سکتی ہے۔

★

غالبؔ

نازش پرتاب گڈھی

دی تجھ کو مشیّت نے نظر اور زباں اور   اندازِ خیال اور تھا، اندازِ بیاں اور

وہ شوخیِ گفتار کہ مفہوم بدل جائے   وہ گرمیِ افکار کہ فولاد پگھل جائے

ڈالی غمِ ہستی پہ جب اشعار کی چلمن   لفظوں میں سمو دی ہے دلِ زیست کی دھڑکن

یوں کرتا رہا شعلۂ احساس کو تحریر   بنتی گئی ہر سانحۂ عصر کی تصویر

اُٹھا تو یخ دبرف کو شعلے کی لپک دی   ٹھہرا تو دلِ سنگ کو شیشے کی کھنک دی

تہذیبِ غمِ عشق کے انداز نکھارے   خود داریِ انساں کے خد و خال اُبھارے

الفاظ و معانی کو گہر بار کیا ہے   افکار سے اشعار کو تہہ دار کیا ہے

ہر نالۂ غم کو طرب انگیز بنایا   ہر زخمِ جگر کو شرر گُل ریز بنایا

اَن جانے خیالات کی پیغام بری کی   تھکے زمانے میں عجب شیشہ گری کی

اوروں کی طرح تو بھی گرفتارِ بلا تھا   پھر بھی ترا اندازِ سخن سب سے جُدا تھا

ہستی تری ہر رنگ سے ممتاز تھی سب میں   تو آگ کی مانند تھا برفاب ادب میں

ہر کارِ حیات ایک تماشا ترے آگے   بازیچۂ اطفال تھی دُنیا ترے آگے

ہر ساغرِ سرمستیِ ہستی میں ڈھلا تھا   ہر حوصلۂ زیست کے ہم راہ چلا تھا

آئینہ نہ ہوں جس پہ غمِ دہر کے حالات   وہ شخص نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا تری بات

کوئی ترے فرمودہ پہ جتنا ہی کرے غور   اتنا ہی کھلے عقدۂ اسرارِ حیات اور

توفیق بہ اندازۂ ہمت تھی ازل سے   یوں ہے کہ بڑے کام لیے تو نے غزل سے

ایمان کی ہے بات کہ اک تیرے عقب میں
اُردو کو جگہ مل گئی عالم کے ادب میں

غالب کا تصوّرِ زندگی

سید شبیہ الحسن نونہروی

ہر فن کار کی طرح غالبؔ کے یہاں بھی ان کا تصورِ زندگی ان کے نظامِ فن کاری کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے تصورِ زندگی ہی سے ان کے نظریۂ عشق و محبت اور فن کارانہ انفرادیت کا ظہور ہوتا ہے۔ فن کاری کے تقاضوں کو یا عشق کے آداب کو اگر وہ کسی نئے ڈھنگ سے نباہنے کی اہلیت رکھتے ہیں تو اس کی وجہ ان کا وہ مختلف تصورِ زندگی ہے جس کی مثال اردو کے دوسرے غزل گو شعرا کے یہاں نہیں ملتی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے غزل گو شعرا کا اگر سطحی جائزہ بھی لیا جائے تو بڑی آسانی سے یہ اندازہ ممکن ہے کہ زندگی اور اس کے مسائل کبھی روایتی اور کبھی انقلابی ڈھنگ سے فن کاروں کو متاثر کرتے رہے تھے۔ فن کی دنیا میں اس طرح کی اثر اندازی کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن اس عہد کے ہندستان میں معاشی اور تہذیبی زندگی کا اُتار چڑھاؤ اور تقدیر کے بدلتے ہوئے خطوط فن کاروں پر ردِ عمل کے ایک ایسے سلسلے کو پیدا کر رہے تھے جس میں مجموعی طور پر خاصا تنوع اور جاذبِ توجہ جدت تھی۔ ردِ عمل کا یہ سلسلہ مختلف فن کاروں کے یہاں ان کی مخصوص صلاحیتوں، حدود، فکری ذہنی اور سماجی ماحول کی وجہ سے ایک خاص طرح کی مزاجی تربیت کا آغاز کرتا تھا جو بڑھ کر ان کی فن کاری کو ایک سانچے میں ڈھال دیتی تھی۔ حالات کی اسی مزاج پروری نے میر سوزؔ، قائمؔ، خواجہ میر دردؔ، میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، انشاؔ اور بہت سے دوسرے فن کاروں کو ایک خاص رنگ میں ڈبو دیا۔ انھوں نے زندگی کے مخصوص قسم کے ردِ عمل سے ایک خاص طرح کا مزاج حاصل کیا جسے اپنی صلاحیتوں کے مطابق وہ شوخ و شنگ بناتے رہے۔ اپنے فن کارانہ مزاج و شخصیت کو ایک خاص سمت پر لگا دینے کے باوجود اس عہد کے بعض فن کاروں نے جن میں میرؔ خصوصیت سے نمایاں ہیں، زندگی کی بہت سی آفاقی قدروں کو چھو لیا۔ لیکن ان تمام شاعروں کے یہاں باوجود وسعت، عظمت، غیر معمولی گہرائی اور گرفت کے زندگی کے خاص خاص مسائل، ردِ عمل اور زاویے اس قدر چھا جاتے ہیں کہ وہ پورے تصورِ زندگی سے عبارت بن جاتے ہیں حالانکہ حقیقۃً وہ صرف زندگی کے اجزا کی نمائندگی کرتے ہیں، مکمل زندگی اور اس کی تمام وسعتوں کی نہیں۔ ان تمام فن کاروں کے یہاں زندگی کسی نہ کسی جذبہ، رنگ اور اسلوب کی تابع ہو کر نمودار ہوتی ہے اور ان معنوں میں زندگی کی حیثیت ثانوی بن جاتی ہے اور اس پر عائد ہونے والے حالات کو اولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ غالبؔ کے یہاں تصورِ زندگی کی نوعیت اس کے تقریباً برعکس ہے۔ ان کے یہاں بدلتے ہوئے حالات، ردِ عمل کی گردش تغیر پذیر کیفیات خواہ وہ کتنے ہی سخت و تند کیوں نہ ہوں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور نفسِ زندگی کو ہر حال میں تقدم اور اولیت حاصل رہتی ہے۔ غالبؔ کی شاعری میں بھی زندگی کے خاص خاص حالات اور کیفیات کا مخصوص ردِ عمل برابر ملتا ہے مگر ایسے سبھی موقعوں پر ان کی وہ ذہنی مزاحمت بیدار رہتی ہے جو ان کی فن کاری کے مزاج کو زندگی کی کسی مخصوص حالت میں ڈھل کر منجمد ہو جانے سے روکتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر رنگ کو دیکھتے ہیں مگر کسی رنگ میں ہمیشہ کے لیے رنگ نہیں جاتے۔ وہ زندگی کے مختلف دائروں میں قدم رکھتے ہیں مگر کسی مخصوص دائرے میں پھنس کر نہیں رہ جاتے۔ وہ غم کو سہتے ہیں مگر پوری زندگی کو غم سے عبارت نہیں سمجھتے۔ وہ موقع ملنے پر عیش و نشاط کے حوصلے نکالتے ہیں مگر زندگی کی وسعت کو اس میں محدود نہیں سمجھتے۔ وہ گھر کی رونق کے قائل ہیں مگر رونق پر حدود نہیں عائد کرتے ہیں بلکہ رونق کی بنیاد ایک ایسا ہنگامہ سمجھتے ہیں جو کوئی بھی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ ان کے

نزدیک ہنگامہ کے اندر چھپی ہوئی حرکت اور فعالیت زندگی ہے‘ اس میں
نوحۂ غم اور نغمۂ شادی کی کوئی قید نہیں ہے۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

غالب اور دوسرے سودا، غزل گو شعرا کے یہاں تصور زندگی میں
جو فرق دکھائی دیتا ہے اس کا خاص سبب یہ ہے کہ نفس زندگی اور
’زندگی کردن‘ میں بڑا فرق ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص کو
زندگی گزارنے کا موقع جس طرح ملتا ہے‘ زندگی ہمہ تن اسی طرز سے عبارت
بھی بن جائے۔ زندگی کی سچی معنویت کا شعور محض ذاتی حالات کے مطالعہ
سے نہیں پیدا ہوتا ہے اس کے لیے دوسروں کی زندگی‘ پورے سماج کی
زندگی بلکہ ہر غرض سے بالاتر ہو کر جوہر زندگی کے مشاہدہ کی بھی ضرورت
ہوتی ہے۔ بیشتر غزل گو شعرا نے ’کردن زندگی‘ کو ’دانستن زندگی‘ بنا لیا
اگرچہ اس روش پر گرفت کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ زندگی
کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی یہ بھی ایک فطری اور عملی راہ ہے لیکن
اس موقع پر غالب کی ذہنی عظمت کا اعتراف ضروری ہے کہ زندگی کردن
کے سلسلے میں دوسرے فن کاروں ہی کی طرح کے تجربات سے گزرنے کے باوجود
’دانستن زندگی‘ کے موقع پر انھوں نے اپنی راہ الگ نکال لی۔ ولی سے
لے کر غالب بلکہ فانی تک زندگی کا جو تصور ابھرتا ہے وہ مطالعہ کا انتہائی
دلچسپ اور مفید موضوع ہے۔ اس پورے عہد میں ’زندگی کردن‘ کے
مسائل شخصیت اور فن کاری پر حاوی رہے ہیں‘ تفصیل میں جانے کا یہ موقع
نہیں ہے مگر چند منتخب مثالوں کا ذکر اس جگہ ضروری ہے:

(۱) زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے (درد)
(۲) جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے (میر)
(۳) معاش اہل چمن جائے رشک ہے سودا — کہ زندگی کا انھوں نے مزا تمام لیا (سودا)
(۴) وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے (مومن)
(۵) ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی — زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا (فانی)

یہ سارے رد عمل زندگی کردن کی زحمتوں سے متعلق ہیں۔ جس کو غم و الم نے
پناہ نہ دی اس نے زندگی کو سراپا محن سمجھا‘ جسے اہل چمن میں شامل ہونے کا
موقع مل گیا اس نے وہیں قابل رشک زندگی کی نشان دہی کر دی۔ ایسا نہیں
ہے کہ غالب کی زندگی میں اس طرح کے واردات کو داخل ہونے کا موقع
نہ ملا ہو۔ وہ زندگی کردن اور اس کی کش مکش کے سلسلے میں دوسرے فن کاروں
کے شریک غالب نہ سہی شریک حال ضرور ہیں۔ زندگی کی الٹ پھیر نے
دوسروں ہی کی طرح انھیں بھی متاثر کیا۔ خاص طرح کے حالات و تجربات نے
ان کے یہاں بھی انفرادی رد عمل پیدا کیا۔ زندگی کی دشواریوں میں انھیں بھی
مسلسل سراسیمہ رہنا پڑا جس کا اظہار ان کے مختصر سے دیوان کے کسی بھی
صفحے سے ہو سکتا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے
یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا — کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی
کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

یہ اور اسی قبیل کے دوسرے اشعار زندگی کی سختی‘ الجھن اور اسے گزارنے
کی دقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس طرح کے اشعار میں انقلاب کے اوپر
روایت کا اثر بالعموم حاوی رہتا ہے۔ ان میں کبھی کبھی انفرادی جدت نظر آجاتی
ہے مگر کوئی مخصوص نوعی جدت بالعموم نہیں دکھائی دیتی۔ اس لیے کہ یہ
زندگی گزارنے کی وادی ہے جو بڑے بڑے فن کاروں کے نقش قدم سے
بھری پڑی ہے۔ دراصل غالب اور ان کے فلسفۂ زندگی کی انفرادیت کا
آغاز وہاں سے ہوتا ہے کہ جہاں وہ تعینات کو برطرف کر کے آگے بڑھتے
ہیں اور زندگی کردن کو ایک ضمنی مسئلہ قرار دے کر خود زندگی اور اسے برقرار
رکھنے والی قوتوں کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور بہت جلد یہ
محسوس کر لیتے ہیں کہ زندگی کے گوناگوں حالات کا تعلق اس کے ’صفات
افعال‘ سے ہے۔ زندگی کے صفات ذات کچھ اور ہی ہیں۔ واقعی زندگی
تو فقط حرکت‘ سرعت اور رفتار میں مختصر ہونے کے باوجود دائمی تسلسل
و گردش سے عبارت ہے۔ نشاط و غم‘ دل تنگی و خوش حالی‘ انبساط و
گرفتاری زندگی کے متلاطم دریا کی فقط موجیں ہیں۔ دریا کی اصلیت
تو وہ حرکی قوت ہے جو ان موجوں کو مسلسل پیدا کرتی رہتی ہے‘ اسی لیے غالب
موجوں کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں بلکہ زندگی کے اس دریائے بیتابی پر ناز کرتے ہیں
جسے اپنی شخصیت کے اندر بڑی کاوش کے بعد انھوں نے اتار لیا تھا۔

نہ اتنا برش تیغ جفا پر ناز فرماؤ — مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

زندگی کے اس مخصوص تصور کی طرف جو ہمہ وقت تغیر‘ انقلاب‘ حرکت و گردش‘

ہنگامہ اور بے تابی کی دعوت دیتا ہے اور جو فرد، سماج اور کائنات کے متعلق نظریات کی بساط پلٹ دیتا ہے غالب نے خفی اشاروں کے علاوہ غیر مبہم انداز میں بھی اظہار کیا ہے۔ ان اشارات و توضیحات کو غالب کی مجموعی انقلاب آفرینی کی بنیاد سمجھنا چاہیے:

تری فرصت کے مقابل اے عمر برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں
رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے پرتوسے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے
نہ حیرت چشمِ ساقی کی نہ صحبت دورِ ساغر کی مری محفل میں غالب گردشِ افلاک باقی ہے
زندگانی نہیں بیش از نفسِ چند اسدؔ غفلت آرائیِ یاراں پہ ہے خنداں گل و صبح

ان اشعار سے زندگی کی برق خرامی اور سرعت و گردش کی واضح تصویر نمودار ہوتی ہے۔ زندگی کی یہی رفتار اور تغیر آمادگی کائناتی مظاہر میں ایک دائمی اور مسلسل عمل کی علامت بن جاتی ہے جس کی وجہ سے تعمیر و تخریب کا ایک نامتناہی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس پورے سلسلے میں نہ تعمیر کچھ بہت دل خوش کن چیز رہ جاتی ہے اور نہ تخریب میں کوئی آزردگی محسوس ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں تیز رفتار زندگی کا نقش پا بن کر رہ جاتی ہیں۔ غالب کی نظر ہمیشہ زندگی کے دائمی عمل پر رہی اور اسی لیے تعمیر کے نقش و نگار کی درستگی پر انھیں کوئی خاص مسرت نہیں ہوتی تھی۔ زندگی کے مخصوص تصور کی وجہ سے وہ سمجھتے تھے کہ تعمیری عمل سے تخریب کی قوتیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

بعینہ یہی صورت حال اس وقت بھی باقی رہتی تھی جبکہ وہ اپنے کو تخریب و انتشار کی قوتوں کی گرفت میں پاتے تھے۔ انھیں ایسے موقعوں پر اچھی طرح یقین رہتا تھا کہ اگر زندگی میں عملی تغیر جاری ہے اور اس کی گردش برقرار ہے تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

غالب کی پوری شاعری میں ہمیں جس زندگی سے سابقہ پڑتا ہے اس میں جمود اور بے عملی کی کہیں گنجائش نہیں ملتی ہے۔ یہ ایک رواں دواں زندگی ہے جس میں پورا ماحول تیزی کے ساتھ گردش کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے، ایک ایسی زندگی جو فرد، سماج اور تصورات کو مسلسل حرکت میں رکھتی ہے، ایسی شاعری کو پروان چڑھاتی ہے جس میں ہر ساکن تقطیع سے گر جاتا ہے، جو فن کار کے جذبہ کو مسلسل فشار دیتی رہتی ہے، جو شاعر کو ایسے 'خواب خوش' سے بھی لطف اندوز نہیں ہونے دیتی جس میں مکمل سکون ہو۔ اس لیے یہ پر سکون خواب خوش ایک ایسا قرض ہے جس کی ادائیگی زندگی کے متحرک لمحوں میں ناممکن ہے۔

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خواب خوش ولے غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

اردو غزل میں حرکت اور تیزی رفتار کا عنصر بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ بالعموم غزل کی دنیا میں زندگی دھیمی اور بوجھل رفتار سے چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اسی لیے دوسری اہم مسرتیں بخشنے کے باوجود وہ پڑھنے والوں کے ذہن میں اس لیے خاص لطف و مسرت کو نہیں پیدا کر پاتی جو تیز رفتاری کے احساس ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ غالب کے علاوہ اردو کے دوسرے شعرا میں تیز رفتاری اور گردش پیہم کا احساس آتش کے یہاں برابر ملتا ہے۔ وہ غزل گو شعرا میں سب سے زیادہ تیز رفتار ہیں۔ ان کی غزلوں میں گردش و مستی کا ایک سماں دکھائی دیتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رفتار کے معاملے میں وہ کہیں کہیں غالب کو بہت پیچھے چھوڑ دیتے ہیں مگر غالب اور آتش کی رفتار اور تیزی کی نوعیت میں بڑا فرق ہے۔ غالب کے یہاں متحرک زندگی کے متوازی متحرک جذبے اور اندیشے دوڑتے ہیں۔ جب دو متحرک چیزیں متوازات میں چلیں گی تو ظاہر ہے کہ رفتار کا تفاوت گھٹ کر کم محسوس ہو گا۔ آتش کے یہاں غیر متحرک زندگی کے گرد جذبہ اور خیال کی مستی گردش کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کی تیزیِ رفتار زیادہ آسانی سے محسوس ہو سکتی ہے۔ آتش کے یہاں زندگی متحرک نہیں ہے بلکہ تقریباً ماورائی اسباب کی وجہ سے ان میں خود ذوقِ گردش پیدا ہو گیا ہے۔ غالب کے یہاں ذوقِ گردش زندگی کے متحرک تصور کا پیدا کردہ ہے۔ اس کے اسباب ماورائی نہیں ہیں بلکہ اسی عالمِ کون و فساد سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں ہی شاعر شاعری و فن کاری کے لیے ایک تیز رفتار سواری استعمال کرتے ہیں مگر ان سواریوں کی قوتِ متحرکہ علٰحدہ علٰحدہ ہے۔ آتش کا 'اسپِ عمر' شوقِ منزل میں تیز رفتار ہے، وہ منزل پر پہنچ کر رک جائے گا۔ غالب کا رخشِ عمر نہ کوئی منزل رکھتا ہے اور نہ انجام۔ اس کے سوار بدلتے جائیں گے مگر اس کی رفتار قائم رہے گی۔ آتش کا کہنا ہے۔

اڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل میں اسپ عمر مہمیز کہتے ہیں گے کسے تازیانہ کیا
سمندِ عمر کو اللہ رے شوقِ آسائش عنان گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے

اس کے مقابل میں غالب کا بیان ایک مختلف زاویۂ نظر کی نمائندگی کرتا ہے۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے   نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

منزل کے ابہام نے غالب کے رخشِ عمر کو جو تیز رفتار زندگی کا مادی استعارہ ہے ایک مسلسل اور دائمی عمل میں منتقل کر دیا ہے اور ایک ایسے سفر کی ترغیب دیتا ہے جس میں منزل کی نہیں بلکہ فقط گردش کی لذت ہے۔

غالب کے یہاں اگر زندگی کے اس مخصوص تصور کو پیش نظر رکھا جائے تو ان کی شاعری اور فن کاری کا کسی حد تک ایک نئے سیاق و سباق میں جائزہ لینا ممکن ہے۔ ان کی شخصیت کے اوصاف پر اس حرکی نقطۂ نظر سے نئی استدلالی بحث کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ان کے تصور زندگی کا لازمی منطقی نتیجہ ان کی وہ شخصیت ہے جو ان کی عام زندگی اور شاعری میں برابر اپنا اظہار کرتی رہتی ہے۔ ان کی شخصیت میں بھی توقع کے مطابق بے تابی، بے چینی، سعی مسلسل، اندیشہ ہائے دور دراز، ذوق سفر اور گرمی اندیشہ کا وہ جوہر ملتا ہے جو آسانی کے ساتھ زندگی کی برق خرامی کا حریف بن سکتا ہے۔ ان کی شخصیت میں ودیعت ذوق گردش، بے آرامی اور سعیِ پیہم اسی زندگی کی دی ہوئی برکتیں یا زحمتیں ہیں جسے بڑی جستجو کے بعد انھوں نے دریافت کیا تھا۔ حسب ذیل اشعار جن کی تعداد کو کئی گنا کیا جا سکتا ہے، غالب کے تصور زندگی کی طرف معنی خیز اشارے کرتے ہیں:

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں   اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال   تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار   اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش   صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے   زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

نہو گا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا   حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے   میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا   کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

غالب کے اسی مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے ان کے یہاں متحرک علامتیں (MOVING SYMBOLS) افراط سے ملتی ہیں۔ اُن کے یہاں علامتیں پتھر ملی نہیں ہیں بلکہ ان میں بھی زندگی کا بخشا ہوا نہ صرف تنفس بلکہ جولانی بھی ملتی ہے۔ اردو شاعری میں وہ زندہ، متحرک اور بولتی ہوئی علامتوں کے سب سے بڑے خالق ہیں۔ بنیادی طور پر شاعری میں استعمال ہونے والی علامتیں زندگی کی کسی بسیط یا مرکب صورتِ حال کی نمائندگی کرتی ہیں اسی لیے شاعر کے یہاں علامتوں کا استعمال اور ان کی نوعیت اس کے تصورِ زندگی کی مانی ہوئی نمائندہ ہوتی ہیں۔ جامد زندگی کی علامتیں بنیادی طور پر جامد ہوتی ہیں خواہ انھیں فن کاری کے آکسیجن سے کتنا ہی زندہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ متحرک اور نامیاتی زندگی کی علامتیں زندگی کی فطری شادابی سے معمور رہتی ہیں خواہ ان سے غیر نامیاتی مظاہر کی نمائندگی کا کام کیوں نہ لیا جائے۔ غالب کی بیشتر علامتیں کسی مصنوعی عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے فطری حیاتیاتی ترکیب کی وجہ سے اپنے منصب اور کارکردگی کی تکمیل کرتی ہیں۔ ان کی علامتیں نظر فریب کٹھ پتلیاں نہیں ہیں بلکہ کائناتی کردار اور باخبر فنی گائڈ ہیں جو مطالعہ کرنے والوں اور فن کار کے پیش کردہ مسائل زندگی کے درمیان اچھے رابطے کا کام دیتی ہیں اور بالآخر اس میخانۂ نیرنگ تک پہنچا دیتے ہیں جہاں جوشِ گردش، اشاروں، چشمک، اندیشوں، شوق فضول اور جرأت رندانہ کے زندگی سے بھرپور ہنگامے برپا رہتے ہیں:

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے   گردشِ مجنوں بچشمکہائے لیلیٰ آشنا

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے   جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

دیکھ کر تجھ کو چمن بس کہ نمو کرتا ہے   خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک   بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

جاں دادگاں کا حوصلہ فرصت گداز ہے   یاں عرصۂ تپیدنِ بسمل نہیں رہا

اے آبلہ کرم کر یاں رنجہ اک قدم کر   اے نورِ چشمِ وحشت اے یادگارِ صحرا

تو اور آرائشِ خمِ کاکل   میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

ان کے تصور زندگی نے نہ صرف یہ کہ ان کی فن کاری کے اندر ایک مخصوص تڑپ پیدا کی بلکہ ہجر و وصال و عشق و محبوب کے روایتی اور منجمد تصور میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ خود ان کی شخصیت شوق فضول اور جرأت رندانہ سے معمور ہے۔ ایسی صورت میں محبوب بھی ستم ظریف اور ہنگامہ آرا ہونا چاہیے اس لیے کہ خود ان کی طرح وہ بھی زندگی کے حرکی تصور کا آفریدہ ہے۔ ایسے محبوب کے سلسلے میں ہجر و وصال کا مفہوم بھی یقیناً بدل جائے گا۔ اسی لیے غالب کے یہاں وصل ایک فکر مسلسل کا نام ہے اور ہجر عالم تمکین و ضبط کے جمود کا نام ہے۔

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں   معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں   شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی   یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی   سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

غالبؔ کے ذہن میں اگر ہجر و وصال کا وہی روایتی تصور ہوتا تو وہ اس کے لیے ذوقِ نظارہ جمال بھی پیدا کر لیتے اور کاروبارِ شوق کی فرصت بھی نکال لیتے۔ ان اشعار میں وہ غزل گوئی کے ان لوازمِ عشق کی طرف پُر حقارت جملے پھینک رہے ہیں جنھیں مسلسل غزل میں قابلِ فخر سرمایہ کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اسی لیے وہ غزل کے روایتی محبوب سے اپنی لاپروائی اور بے نیازی ظاہر کرنے میں کبھی جھجکتے نہیں ہیں:

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سربسر — کب تک خیالِ طرّۂ لیلیٰ کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

غالبؔ کے یہاں وصل کا وہ مفہوم جس پر ان کے تصورِ زندگی کی پوری چھاپ دکھائی دیتی ہے اور جو غزل کے رائج آداب اور منضبط رسم و قانون کے برخلاف ہے ان کے پورے تصورِ عشق اور کاروبارِ محبت کو سمجھانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس مفہوم کو انھوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ ایک ہی شعر میں ادا کر دیا ہے

ہمارے ذہن میں اس فکر کا نام ہے وصال — کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

خواہش کی معمولی ترغیبات اور غزل کی روایت نباہنے میں انھوں نے اوپری دل سے جو کچھ کہہ ڈالا ہے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے، زندگی ہی ان کے عشق و محبت کا محور ہے، زندگی ہی ان کی محبوب بھی ہے اور ان کی رقیب بھی۔ زندگی ہی ان کے لیے دوزخ بھی ہے اور جنت بھی۔ چمن بھی ہے اور زنداں بھی۔ وہ ہر حال میں زندگی کے پرستار ہیں خواہ وہ ان کے لیے سازگار ہو یا ناساز۔ ان کے نظامِ فکر میں سب سے ہمہ گیر چیز آماجگاہِ تغیرات میں مسلسل سفر کرنے والی زندگی ہے۔ اسی زندگی سے وہ الفت و محبت رکھتے ہیں۔ ان کی فنکاری اسی زندگی کا ہم سفر بننے کا دوسرا نام ہے۔ جذبۂ عشق بھی ان کے یہاں زندگی پر حاوی نہیں ہے بلکہ زندگی کا تابع ہے۔ یہی نقطۂ نظر انھیں اردو کے دوسرے غزل گو شعراء سے بڑی حد تک مختلف بناتا ہے۔ اردو کے بیشتر پُر عظمت شعراء کے یہاں عشق زندگی اور کائنات کا محرک بن کر نمودار ہوتا ہے۔ وہ محض زندگی کے جذباتی عمل کو حرکت میں نہیں لاتا بلکہ کائنات کے طبیعاتی عمل میں بھی فیصلہ کن قوت کی حیثیت سے شریک رہتا ہے۔ غالبؔ نے عشق کو یہ روایتی منصب کبھی نہیں بخشا۔ ان کے نزدیک اس کی حیثیت زیست کا مزا بڑھانے والی ایک قوت سے زیادہ نہیں ہے۔ عشق چاہے دوا ہو یا خود دردِ بے دوا ہو وہ زندگی کی فرع ہے زندگی کا حاکم نہیں ہے۔ وہ زندگی کے لیے خواہ کتنا ہی ضروری ہو مگر اہمیت کے اعتبار سے زندگی کا تابع ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا
نے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں — طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

یہی سبب ہے کہ عشق اپنی شدت اور وسعت کے باوجود انھیں الفتِ ہستی سے کبھی غافل نہیں کر سکا۔ وہ عاشق ہونے کے باوجود اپنے وجود کو بکھرنے نہیں دیتے۔ وہ سراپا رہنِ عشق ہونے کے بعد بھی الفتِ ہستی کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

وہ اپنے وجود کی بنیاد عشق و الفت کے جذبہ کو نہیں بلکہ اسی زندگی کو قرار دیتے ہیں جو مسلسل بے تابیوں، گردشوں اور تغیرات کو ہضم کرتی رہتی ہیں۔ عشق اس زندگی کا ایک پرتو، ایک کارکن اور رفیق ہے۔ وہ زندگی کا بانی نہیں ہے اور اسی لیے خود غالبؔ کا بھی بانی نہیں۔ غالبؔ کیا ہیں اور ان کی بنا کاہے پر ہے۔ غالبؔ کے تصورِ زندگی کی مدد سے خود ہی سمجھ لینا ممکن تھا مگر انھوں نے رفعِ اشتباہ کے لیے خود ہی واضح کر دیا ہے۔

گردبادِ رہِ بے تابی ہوں — صرصرِ شوق ہے بانی میری

صرصرِ شوق حرکی تصورِ زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اس آب و ہوا میں پرورش پا کر نمودار ہونے والا فنکار غالبؔ کی طرح انقلاب، تغیر اور تسلسلِ عمل کی ہمیری کا حق اچھی طرح ادا کر سکتا ہے۔

جس تصورِ زندگی کی مدد سے غالبؔ نے اپنی شخصیت کی تربیت کی ہے اور جس پر اپنے فکر و فن اور اس کے مختلف عناصر و لوازم کی بنیاد رکھی ہے وہ عہدِ جدید تک پہنچتے پہنچتے کافی بالیدہ ہو چکا ہے۔ اردو شعراء کی موجودہ نسل اس تصور کو بغیر خاص طرح کے ذہنی تحفظات کے نہ صرف قبول کر چکی ہے بلکہ فن کی آبیاری میں اس سے کام بھی لے رہی ہے۔ اقبالؔ اور جوشؔ بھی اسی تصورِ زندگی کے مختلف زاویوں سے علم بردار ہیں۔ اسی بنا پر یہ کہنا ممکن ہے کہ عہدِ جدید کے فن کے بنیادی تصورات کا سلسلہ بغیر کسی زحمت کے غالبؔ تک پہنچتا ہے۔ غالبؔ اپنے ماضی سے اتنا مربوط نہیں ہیں جتنا ان کا مستقبل اور اس کے فنکاروں سے مربوط ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا کسی عجیب و غریب دعوے کے مرادف نہیں ہوگا کہ غالبؔ نہ صرف اپنے عہد کے پُرشکوہ شاعر تھے بلکہ اس عہدِ فنکاری کے بانی بھی تھے جس سے موجودہ نسل کے شاعر و نقاد گذر رہے ہیں۔

بہ یادِ غالب

ایم۔ اے حفیظ بنارسی

اللہ اللہ! یہ اعجاز کلامِ غالب   زندگی رقص میں ہے آج بنامِ غالب
ثبت ہے سینۂ ہستی پہ دوامِ غالب   یوم غالب ہے کہیں تو کہیں شامِ غالب
جشن صد سالہ مناتا ہے زمانہ اُس کا
اہلِ عالم کی زباں پر ہے فسانہ اُس کا

جس کی ہر بات میں تھی کیفیتِ قند و نبات   جیتے جی رنج و الم سے نہ ملی جس کو نجات
تھا عیاں جس کی نگاہوں پہ ہر اک رازِ حیات   انجمن ساز تھی جس مردِ خود آگاہ کی ذات
شبِ تاریک کو انوارِ سحر جس نے دیا
پیکرِ شعر کو اک طرزِ دگر جس نے دیا

جس کی رعنائیِ افکار پہ نازاں ہے سخن   جس کی تخئیل سے پیشانیِ گردوں پہ شکن
بوئے گل جس کے چمن زار کی صد نافۂ ختن   جس کا ہر شعر ہے نادیدہ بہاروں کا وطن
جس کی خوش فکری و خوش گوئی ادب کا شہکار
شاعری جس پہ تصدق ہے سخن جس پہ نثار

جس کی رنگینیِ تحریر گلستاں کا شباب   جس کے اندازِ بیاں کا نہیں دنیا میں جواب
جس نے سرکائی رخِ لیلیٔ معنی سے نقاب   جس کے پیمانے میں تھی معرفتِ حق کی شراب
جس کو معلوم تھا جنت کی حقیقت کیا ہے
جو سمجھتا تھا کہ انساں کی عظمت کیا ہے

جس نے گلرنگ کیا علم و ہنر کا داماں   دشت کو دیکھ کے یاد آئے ہمیں جس کا مکاں
جس کی جرأت پہ ہے خود شوخ مزاجی حیراں   جو فرشتوں کے لکھے پر بھی نہ لایا ایماں
جس کے لب پر گلۂ کاتبِ تقدیر بھی تھا
"آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا"

جس نے فطرت کے اشاراتِ جواں کو سمجھا   عشوہ و غمزہ و اندازِ بتاں کو سمجھا
جس نے سرمایۂ جاں سوزِ نہاں کو سمجھا   جس نے بازیچۂ اطفال جہاں کو سمجھا
جس کی تقدیر میں لکھی تھی سخن کی معراج
جس کی دشوار پسندی بھی ہے فن کی معراج

عشق میں جس نے قدم حضرتِ ذیشاں کے لیے   خود جو بدنام ہوا شہرتِ جاناں کے لیے
جو نہ ہندو کے لیے تھا نہ مسلماں کے لیے   مضطرب تھا جو علاجِ غمِ انساں کے لیے
پیش کرتا ہے زمانہ جسے تحسیں کا خراج
اہلِ دل، اہلِ نظر جس کے پرستار ہیں آج

دادِ تحسین و ستائش کا جو خواہاں نہ ہوا   اپنے معیار سے گر کر جو غزل خواں نہ ہوا
جو کسی غیر کا شرمندۂ احساں نہ ہوا   درد جس کا کبھی منت کشِ درماں نہ ہوا
جس نے سیکھا ہی نہیں غم سے ہراساں ہونا
جس کو آتا تھا خزاں میں بھی گل افشاں ہونا!

جس کے اشعار میں ہیں صدق و صفا کی باتیں   حسنِ اخلاص کی تسلیم و رضا کی باتیں
جس نے کیں مہر و محبت کی وفا کی باتیں   پردۂ بادہ و ساغر میں کیں خدا کی باتیں
جس کے دیوان کو حکمت کا خزینہ کہیے
یا زر و لعل و جواہر کا دفینہ کہیے

آرزو نکلی نہ جس کا کوئی ارماں نکلا   جس کے گھر سے نہ کوئی زیست کا ساماں نکلا
جو قتیلِ غمِ دہر و غمِ جاناں نکلا   جس کی محفل سے ہر اک شخص پریشاں نکلا
آج بھی تشنۂ تشریح ہیں جس کے اشعار
گم ہیں الفاظ و معانی کی تہوں میں فنکار

بات کرنے کو جو لب تشنۂ تقریر بھی تھا   مردِ خوددار بھی تھا، عاشقِ دلگیر بھی تھا
صاحبِ لوح و قلم، صاحبِ شمشیر بھی تھا   خود جو استاد تھا اور معتقدِ میر بھی تھا
جس کی فطرت کو وسیع النظری حاصل تھی
خوش دلی، خوش نفسی، خوش نگہی حاصل تھی

محفلِ شعر میں اک حشر اٹھا جس کے بعد   نہ رہی بزمِ سخن کی وہ ادا جس کے بعد
خود پریشان ہے طوفانِ بلا جس کے بعد   شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا جس کے بعد
گیسوئے فکر پریشاں ہے اسے کیا کہیے
ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

جس کے اشعار سے پُرنور ہے ایوانِ غزل   تھا جسے شکوۂ کوتاہیِ دامانِ غزل
معتبر جس کا فسانہ ہے بہ عنوانِ غزل   ہے جو مشہورِ جہاں آج بہ فیضانِ غزل
اُس کا ثانی کوئی شاعر کوئی فنکار نہیں
"ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں"

اس تصویر کی اصل لال قلعہ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کے دوسرے
سامانوں کے ساتھ محفوظ ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے کسی مشہور
مصوّر نے مرزا غالب کی فرمایش پر یہ تصویر تیار کی تھی اور
غالب نے اسے بہادر شاہ ظفر کو پیش کیا تھا ۔ یہ تصویر
غالب چترا دلی (ہندی) مرتبہ مولانا خیر بہوردی میں شامل ہے
اور اس کا بلاک ہمیں موصوف ہی نے عنایت کیا ہے

غالب کی ہمتِ عالی

حبیب احمد صدیقی

مرزا غالب نے اپنے اردو و فارسی کلام میں علوِ ہمت کا اظہار اور تلقین بار بار کی ہے۔ مثلاً

نیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم ۔۔۔ لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا ۔۔۔ یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم ۔۔۔ الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم ۔۔۔ اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم ۔۔۔ گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

از مہرِ جہاں تاب امیدِ نظرم نیست ۔۔۔ ایں قشت پُر از آتشِ سوزاں بسرم ریز

جنت نکند چارۂ افسردگیِ دل ۔۔۔ تعمیر باندازۂ ویرانیِ ما نیست

خوش است آنکہ باخویش جز غم ندارد ۔۔۔ دلے خوشتر است آنکہ ایں ہم ندارد

منت از دل می تواں بر داشت ۔۔۔ شکر ایزد، کہ نالہ بے اثر ست

ہفت دوزخ در نہادِ فرساری مضمر است ۔۔۔ انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردہ

مگر ڈاکٹر عبداللطیف کو ہمتِ عالی کی کارفرمائی کے بجائے غالب کی زندگی میں ایک ہمہ گیر بے اطمینانی ملتی ہے اور یہ بے اطمینانی وہ شانِ ربوبیت لیے ہوئے نہیں ہے جو دل میں ایک تڑپ پیدا کرے کہ "کاش بساطِ زندگی پر پاکیزہ اور ارفع خیالات کی چادر بچھا جائے" بلکہ غالب کی بے اطمینانی انسان کو مردم بیزار بنانے والی ہے۔ اس بے اطمینانی کی تفصیل خود ان کے الفاظ میں سنیے:

"اس کی (یہ بے اطمینانی کی) ایک اور صورت ہے جس میں انسان اپنے ماحول یا افتادِ زندگی سے بے اطمینان ہو جاتا ہے۔ یہ بے اطمینانی کسی حقیقی یا خیالی ناقدری کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو مردم بیزار یا متنفر بنا دیتی ہے۔ اسی قسم کی بے اطمینانی غالب کی روح میں سما گئی تھی.....

غالب کو ہمیشہ دو چیزوں کی شکایت رہی۔ ایک تو اُس کی ادبی کوششوں کی ناقدری اور دوسرے اس کی مالی مشکلات ..... دلی نے اُن کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ دربارِ شاہی نے خیر مقدم کیا اور اپنے بس کے تمام الطاف و اکرام سے اس کو نوازا۔ نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطابات عطا کیے جو شاہی خاندان سے تعلق نہ رکھنے والے شخص کے لیے معراج سمجھے جاتے تھے۔ منصب بھی عطا ہوا جو اگرچہ زیادہ معقول نہ تھا لیکن حاکمِ وقت کی بے چارگی کے لحاظ سے خاصہ تھا..... ایسی ہی قدر و منزلت لکھنؤ اور رام پور میں بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ اہلِ علم قدر دانانِ سخن کی بھی کمی نہ تھی..... پھر بھی غالب کو اطمینان نصیب نہ ہوا..... مالی معاملات میں بھی اس کا یہی انداز تھا۔ حالی کی مستقل شہادت موجود ہے کہ غالب اس حیثیت سے ناموافق حالات میں کبھی گرفتار نہیں ہوا: دوستوں اور مربیوں کی مالی اعانت کی بھی کوئی انتہا نہ تھی لیکن اس کے دل میں قناعت کی لہر تک پیدا نہیں ہوئی۔"

ڈاکٹر صاحب کے افکار کا جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مرزا کے حالاتِ زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے اور دیکھا جائے کہ کیا ان کی بے اطمینانی اتنی ایسے ادنیٰ درجے کی تھی جس کے نتیجے میں وہ مردم بیزار ہو گئے تھے۔

مرزا کے والد عبداللہ بیگ کا انتقال جب ہوا تو وہ بہت ہی کم عمر تھے۔ عبداللہ بیگ راجہ الور کی طرف سے کسی مہم پر گئے تھے جس میں ان کے گولی لگی اور انتقال ہو گیا۔ مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ لاولد تھے انھوں نے مرزا اور ان کے بھائی بہن کی سرپرستی کی مگر ابھی مرزا آٹھ برس ہی کے تھے کہ وہ بھی ایک مہم میں مارے گئے۔ نصر اللہ بیگ نے سونک اور سونسا کے دو پرگنے جاگیر میں حاصل کیے تھے جن کی آمدنی لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کی تھی۔ ان کی وفات پر

انگریزی سرکار نے یہ دونوں پرگنے لے لئے اور ان کے بجائے نصراللہ بیگ کے پس ماندگان کے لیے پنشن مقرر کر دی اور نواب احمد بخش خاں والیِ لوہارو و فیروزپور جھرکہ کو پنشن ادا کرنے کا ذمے دار ٹھہرایا۔ نواب احمد بخش خاں نصراللہ بیگ کے برادر نسبتی تھے۔ نواب صاحب کو اپنی ایک جاگیر کے سلسلے میں انگریزوں کو پچیس ہزار روپے سالانہ دینے پڑتے تھے جو مئی ۱۸۰۶ء میں اس شرط پر معاف کیے گئے کہ آئندہ وہ دس ہزار روپے سالانہ نصراللہ بیگ کے پس ماندگان کو ادا کیا کریں گے اور باقی پندرہ ہزار ایک فوجی دستے پر خرچ کریں گے مگر یہ معاہدہ کسی وجہ سے مہینے بھر میں تبدیل کر دیا گیا جس کی رو سے نصراللہ بیگ کے پس ماندگان کا حصہ صرف تین ہزار رہ گیا۔ اس میں غالب کا حصہ کل ساڑھے سات سو روپے سالانہ ٹھہرا۔ یہ تبدیلی غالباً نواب احمد بخش خاں کے ایما سے ہوئی تھی۔ بعد میں نواب صاحب کی بھتیجی امراؤ بیگم سے غالب کی شادی ہو گئی اور غالب آگرہ سے منتقل ہو کر دہلی آ گئے۔ نواب صاحب جب تک زندہ رہے غالب کے ساتھ سلوک کرتے رہے۔

نواب احمد بخش خاں کے تین لڑکے تھے۔ بڑے لڑکے شمس الدین احمد خاں کی والدہ غیر کفو تھیں۔ دوسری بیگم سے امین الدین احمد خاں اور ضیاءالدین احمد خاں تھے۔ ان سے مرزا کے گہرے تعلقات تھے۔ نواب صاحب نے اس خوف سے کہ ان کے بعد کہیں بھائیوں میں خانہ جنگی نہ ہو، فیروزپور جھرکہ کی جاگیر شمس الدین احمد خاں کو اور لوہارو کی دوسرے دو بھائیوں کو دے دی مرزا کی پنشن شمس الدین احمد خاں کے ذمے رہی۔ جس خانہ جنگی کا نواب صاحب کو ڈر تھا وہ ان کے انتقال کے بعد ہو کر رہی۔ شمس الدین احمد خاں ریاست کی تقسیم سے خوش نہ تھے وہ بڑے بیٹے کی حیثیت سے کل ریاست کے والی بننا چاہتے تھے اور سوتیلے بھائیوں کو صرف گزارے کا مستحق سمجھتے تھے چنانچہ ان کا یہ دعویٰ انگریزی سرکار میں پیش ہوا اور کئی سال کی جد و جہد کے بعد ۱۸۲۳ء میں فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا۔ اس تنازعہ میں مرزا کی ہمدردی امین الدین احمد خاں اور ضیاءالدین احمد خاں کے ساتھ تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمس الدین احمد خاں نے ۱۸۳۱ء میں ان کی پنشن بند کر دی۔ انگریزی ریزیڈنٹ ولیم فریزر کی سفارش پر شمس الدین احمد خاں کے حق میں جو فیصلہ ہو گیا تھا وہ منسوخ ہوا اور نواب احمد بخش خاں کی تقسیم کے مطابق لوہارو ان کے سوتیلے بھائیوں کو واپس ملا جب شمس الدین احمد خاں کے ایما سے ولیم فریزر قتل کر دیا گیا اور شمس الدین احمد خاں کو پھانسی دے دی گئی تو اس کے بعد ۱۸۳۶ء میں مرزا کی پنشن پھر سے جاری ہوئی۔

ظاہر ہے کہ اس طویل مدت میں مرزا کی مالی حالت کس قدر سقیم رہی ہوگی۔ بے شک ان کے عزیزوں اور دوستوں نے کچھ نہ کچھ مدد ضرور کی ہوگی مگر مرزا جو اپنے ننھیال میں اَللّے تَللّے کی زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے تھے ان کی پنشن کا بند ہو جانا ایک سانحہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں ان کی [illegible] سے ظاہر ہے کہ قرض بڑھتے بڑھتے چالیس پچاس ہزار تک پہنچ گیا اور ایک قرض خواہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو اس نے مرزا پر پانچ ہزار کی ڈگری حاصل کر لی اور مرزا کا گھر سے نکلنا تک بند ہو گیا۔ حیرت ہے کہ اس کے باوجود کوئی یہ کہے کہ مالی حیثیت سے غالب کبھی ناموافق حالات میں گرفتار نہیں ہوئے۔

مرزا کی مالی مشکلات کا خاتمہ اسی پر نہیں ہوا۔ ابھی اس سے بھی زیادہ سخت وقت ان پر گزرے گا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے دربار شاہی کے الطاف و اکرام کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیں کہ اس کی کیا حیثیت ہے۔ مرزا کی پیدائش دسمبر ۱۷۹۷ء میں ہوئی تھی اور ان کا قلعہ سے مستقل تعلق ۱۸۵۰ء میں ہوا یعنی اس وقت ہوا جب کہ مرزا جوانی اور ادھیڑ عمر سے گزر کر اور مصائب روزگار اٹھا کر خستہ و درماندہ ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے خطابات تو بڑے بڑے دیے مگر مشاہرہ اتنا بھی نہ مقرر کیا جتنا نواب رام پور نے بعد میں مقرر کیا۔ صرف پچاس روپے ماہانہ پر خاندان تیموریہ کی تاریخ فارسی میں لکھنے کی خدمت مرزا کے سپرد ہوئی اور جب ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہو گیا تو مشاہرے میں اضافے کے بغیر اصلاحِ کلام کی خدمت بھی مرزا کو سونپی گئی۔ ان "الطاف و اکرام" کے اجرا کو ابھی سات سال بھی نہ ہوئے کہ ۱۸۵۷ء میں بادشاہت اور اس کے الطاف و اکرام ختم ہو گئے۔

"غدر" کے بعد جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو وہاں کے مسلمانوں پر وہ وہ مظالم کیے گئے کہ قیامت نظروں میں پھر گئی۔ مرزا نے اپنے خطوط میں کچھ واقعات کا ذکر نہایت دل گرفتگی سے کیا ہے۔ مرزا کی بیگم کے کل زیورات اسی رستخیز کی نذر ہو گئے اور باوجود مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کے پہرے کے کچھ گورے مرزا کو پکڑ لے گئے اور مشکل سے جان بچی۔ ڈاکٹر

عبداللطیف مولانا حالی کی شہادت سے یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غالب مالی حیثیت سے کبھی نا موافق حالات میں گرفتار نہیں ہوئے۔ مگر مولانا کی گرانقدر تصنیف یادگار غالب میں غالب کی "تنگی و عسرت" کا حال موجود ہے اور مولانا حالی ہی غالب کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ

"اس ناداری کے زمانہ میں جس قدر کپڑا۔ اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا"

مرزا کی اس ناداری سے متاثر ہو کر امراؤ بیگم کے چچا زاد بھائی ضیاء الدین احمد خاں نے ان کا پچاس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ مگر جس کی مروت و شرافت نے یہ گوارا نہ کیا ہو کہ اپنے چار پانچ نوکروں سے کہہ دے کہ جاؤ اب کوئی اور گھر ڈھونڈو اس کا گزارا پچاس روپے میں کیا ہوتا۔ ان کے دوستوں نے بھی جن میں ہندو دوست بھی شامل تھے کچھ مدد کی مگر وہ اپنا بچپن اپنے نانا غلام حسین خاں کے یہاں گزار چکے تھے جہاں انھوں نے نوابی ٹھاٹ دیکھے تھے ان کے اخراجات یوں کہاں پورے ہوتے۔ جہاں جہاں سے مل سکا قرض لیا اور جوں توں گزر بسر کی۔

لکھنؤ کے دربار سے مرزا کا کبھی کوئی مستقل تعلق نہیں رہا۔ کلکتہ جاتے ہوئے وہ چند مہینے لکھنؤ میں ٹھہرے تھے۔ وہاں احباب نے چاہا کہ نائب السلطنت آغا میر تک انھیں پہونچائیں۔ مرزا نے دو شرطیں لگائیں ایک یہ کہ آغا میر تعظیم دیں اور دوسری یہ کہ نذر دینے سے معاف رکھا جائے۔ آغا میر نے یہ شرطیں قبول نہیں کیں تو مرزا نے بھی ان کے یہاں جانا پ... کلکتہ سے واپسی کے کچھ عرصے بعد مرزا نے نواب نصیر الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ لکھ کر بھیجا جس پر پانچ ہزار عطیہ منظور ہوا مگر غالب کو اس سے کیا ملا یہ بات شیخ امام بخش ناسخ کی زبانی سنئے۔ وہ کہتے ہیں کہ پانچ ہزار میں سے تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور دو ہزار متوسط کو دے کر کہا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیج دو۔ ۱۸۵۴ء میں واجد علی شاہ نے مرزا کا وظیفہ ضرور مقرر کیا لیکن وہ کوئی ایسا گراں بہا نہ تھا صرف پانسو روپے سالانہ یعنی پونے بیالیس روپے فی ماہ وظیفہ "الطاف و اکرام" کے شمار میں بمشکل ہی آسکتا ہے اور یہ بھی دو سال سے زیادہ نہ چلا۔

والیِ رام پور نواب یوسف علی خاں مرزا کے شاگرد تھے۔ بچپن میں جب بغرضِ تعلیم دہلی آئے تھے تو انھیں مرزا نے فارسی پڑھائی تھی۔ وہ ۱۸۵۵ء میں نواب ہوئے تو مرزا کو توقع ہوئی کہ ان کے پرانے شاگرد ضرور دستگیری کریں گے۔ چنانچہ مرزا نے تاریخ جلوس کا قطعہ بھیجا مگر شاگرد نے اعتنا نہ کیا جب مرزا کے دوست مولوی فضل حق نے سفارش کی تو نواب نے ۱۸۵۷ء میں اپنا کلام اصلاح کے لئے بھیجنا اور کبھی کبھی عطیات دینے شروع کئے اور غدر کے دو سال بعد سو روپے ماہانہ مقرر کر دئے۔ تھوڑے دنوں بعد مرزا کی پنشن بھی جاری ہوگئی اور جتنی پچھلی واجب الادا تھی وہ بھی ملی۔ مگر یہ رقم پوری کی پوری قرض خواہوں کی نذر ہوگئی اور پھر بھی پورا قرضہ ادا نہ ہوا۔ اگر مرزا کی مالی حیثیت کسی زمانے میں اچھی کہی جاسکتی ہے تو وہ یہی زمانہ تھا جو ان کی زندگی کے آخری آٹھ سالوں پر مشتمل ہے مگر اس میں بھی تنگ دستی سے چھٹکارا نہ ہوا۔ وہ ایک خط میں علاء الدین احمد خان کو جو امین الدین احمد خاں کے بیٹے تھے لکھتے ہیں،

"بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر درباری مل کو جا مارا ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ اور چاٹو۔ نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر۔ با ایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے۔ سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا۔ چوکیدار جدا۔ سود جدا۔ مول جدا۔ بی بی جدا، بچے جدا۔ شاگرد پیشہ جدا۔ آمدنی وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا گزارا مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا سوچا کہ کیا کروں کہاں سے گنجائش نکالوں۔ قہر درویش بر جان درویش۔ صبح کی تبرید متروک۔ چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینہ بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید شراب کب تک نہ پیو گے کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے۔ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا۔ قرض مختلط ادا ہو گیا متفرق رہا، خیر ہو صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔..."

یہ حال تھا اس صورت میں جبکہ ایک سو باسٹھ روپے کی مستقل آمدنی تھی اور روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر تھا۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب پنشن کئی سال تک بند رہی یا جب گھر کے خرچ کا انحصار امراؤ بیگم کے پچاس روپے کے وظیفے

پر تھا تو کیا گزرتی ہوگی۔ یہ کہنا کہ غالب مالی حیثیت سے کبھی ناموافق حالات میں گرفتار نہیں ہوئے کتنی بڑی ناانصافی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ناناکا گھر چھوڑنے کے بعد انھیں شاذ ہی آسودگی و فارغ البالی میسّر ہوئی ہو۔ پھر بھی وہ اپنی سیر چشمی و فراخ دلی سے مجبور ہوکر دوسروں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ اپنے مشاہدہ کی بنا پر مولانا حالی لکھتے ہیں،

"سائل ان کے دروازے سے خالی بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے۔ لنگڑے۔ لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد میں نے ایک بار خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسبِ معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا اس لئے انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تو ان کو انعام دے کر رخصت کیا۔"

ان کی بلند حوصلگی کے ثبوت میں ان کا سرکاری نوکری سے انکار کر دینے والا واقعہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ ۱۸۴۲ء میں جبکہ نہ قلعہ سے پچاس روپے ماہانہ ملتے تھے اور نہ اودھ اور رام پور کے وظائف جاری ہوئے تھے مرزا کو دہلی کالج کے فارسی کے مدرسِ اعلیٰ کی جگہ کے لئے بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار ہوکر مقررہ مقام پر پہنچے اور اس انتظار میں پالکی سے نہ اترے کہ کوئی ان کے استقبال کو آئے گا۔ جب انھیں بتایا گیا کہ چونکہ آپ نوکری کے سلسلہ میں آئے ہیں اس لئے استقبال کی توقع بے جا ہے تو وہ یہ کہہ کر چلے آئے کہ سرکاری ملازمت اگر اعزاز میں تخفیف کا باعث ہوتی ہے تو ایسی ملازمت کو میرا سلام ہے۔

آغا میر نائب السلطنت اودھ سے نہ ملنے کا واقعہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ مرزا اپنی پنشن کے سلسلہ میں کلکتہ جارہے تھے۔ جو قلیل پنشن انھیں مل رہی تھی وہ ان کے اخراجات کے لئے بہت ہی کم تھی۔ آغا میر کا اُس زمانے میں طوطی بول رہا تھا۔ اغلب خیال یہی تھا کہ مرزا سے ملاقات کے بعد وہ ان کا وظیفہ مقرر کردیں گے جس سے مرزا کی مالی حالت ایسی ہوجائے گی کہ انھیں قرض سے نجات مل سکے۔ بایں ہمہ مرزا نے اپنی خودداری کو ٹھیس نہ لگنے دی۔ انھوں نے تنگی ترشی سے بسر کرنا منظور کیا مگر ایسی ملاقات پر راضی نہ ہوئے جس میں ان کا استقبال نہ کیا جائے۔

درست ہے کہ مرزا زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ کوئی بھی حوصلہ مند اور ترقی پذیر طبیعت ایک حالت پر مطمئن نہیں ہوسکتی۔ اسے ہر لحظہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی ہے مگر مرزا کی بے اطمینانی کو مردم بیزار بنانے والی بے اطمینانی کہنا ایک بہت بڑی تہمت ہے۔ کیا مردم بیزار لوگ ایسے ہی کثیر الاحباب ہوتے ہیں جیسے مرزا تھے۔ کیا مردم بیزار لوگوں کو اوروں سے ملنے جلنے اور خط و کتابت کرنے میں ایسی ہی مسرّت محسوس ہوتی ہے جیسی مرزا کو ہوتی تھی۔ مولانا حالی کی عینی شہادت ہے کہ،

"مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے وہ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہوجاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لئے ان کے دوست ہر ملّت و مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبّت، غم خواری و یگانگت ٹپکتی ہے۔"

کیا یہ اقتباس ایک مردم بیزار شخص کی تصویر پیش کرتا ہے۔ کیا ان کے دلآویز خطوط جو انھوں نے قلم برداشتہ لکھے تھے، اور جو ان کی شخصیت کو بے نقاب کرتے ہیں، ایک ایسے شخص کو پیش نہیں کرتے جو زندگی کی کلفتوں کے باوجود زندگی کی ہر شے سے لطف اندوز ہونے کا قائل ہے اور ہر اذیت کو خندہ پیشانی سے گوارا کرتا ہے۔ ان کے احباب ان کی پنشن بند ہوجانے سے متفکر ہیں اور از راہ ہمدردی پوچھتے ہیں کہ کب تک پھر سے جاری ہونے کا امکان ہے تو وہ کس بے فکری سے جواب دیتے ہیں،

"میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا۔ آگے خدا رزّاق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔"

لکھنؤ اور دہلی کے اجڑنے پر ان کا دل خون ہوگیا اور وہ خون ان کے قلم سے ان خطوط میں ٹپکتا نظر آتا ہے جو انھوں نے اپنے مخلص دوستوں کو لکھے ہیں۔ میر حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں،

"ہائے لکھنؤ کا حال کچھ کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری۔ اموال کیا ہوئے،

اشخاص کہاں گئے۔ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا۔ قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر کی سرگزشت کیا ہے گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگہی ہوگی۔ امیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔"

دہلی کی تباہی پر علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں،

"وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکور کو جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں ..... امرائے اہلِ اسلام میں اموات گنو تو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار، مہینے کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا۔ نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبّا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا اس کے پاس ایک پیسہ نہیں ٹکے کی آمدنی نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڑے صاحب ساری املاک بیچ کر اور نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کرائے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلبھ گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے ...."

کیا مردم بیزار لوگ دوسروں کی تباہی پر یوں ہی آنسو بہاتے ہیں اور دوستوں اور عزیزوں کو یاد کر کے بے چین ہوتے ہیں سچ یہ ہے کہ نہ غالب مردم بیزار تھے اور ان کی بے اطمینانی مردم بیزار بنانے اور نفرت کرنے والی بے اطمینانی تھی۔ ہاں مرزا کی دلآویز شخصیت کے دامن پر ایک بدنما داغ بھی ہے۔ مفتی صدر الدین آزردہ مرزا کے دوست تھے۔ انھوں نے مرزا کا نام دہلی کالج کے فارسی کے مدرسِ اعلیٰ کی جگہ کے لئے تجویز کیا تھا اور مرزا کا ان کے یہاں آنا جانا تھا۔ ان کے انتقال پر جب مرزا کو معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کی بیوہ اور ان کے بھانجے کا جسے مفتی صاحب نے بیٹے کی طرح پرورش کیا تھا ریاست رام پور سے کچھ وظیفہ مقرر ہونے والا ہے تو مرزا نے نواب صاحب کو مطلع کیا کہ مفتی صاحب کی بیوہ ایک مکان کی جس کا کرایہ ساٹھ روپے ہے مالک ہیں۔ اس اطلاع کا منشا یہ تھا کہ وہ وظیفے کی مستحق نہیں ہیں۔ مرزا کی یہ حرکت ایسی ہے کہ جس کی کوئی تاویل ممکن نہیں اور یہ داغ مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ لیکن بے عیب انسان تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسا صحرا میں آبِ حیات ڈھونڈھنا۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ مرزا کی خوبیاں ان کے عیوب سے بہت زیادہ ہیں۔ اس واقعہ کی بنا پر انھیں مردم بیزار یا دوست آزار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ان کو اس کا گلہ ضرور تھا کہ دنیا نے ان کی قدر نہ کی اور انھوں نے یہ ضرور کہا کہ

"اپنا بیان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازۂ بالیت نہیں پائی۔ آپ ہی کہا آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دعاوی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔"

دیکھنا چاہئے کہ اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ ذکرِ غالب میں جناب مالک رام نے تحریر فرمایا ہے کہ کلکتہ جانے کے لئے مرزا اگست ۱۸۲۶ء میں روانہ ہوئے تھے اور دورانِ سفر لکھنؤ میں پانچ مہینے ٹھہرے تھے۔ مرزا کی تاریخ ولادت ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء ہے۔ اس حساب سے جب وہ لکھنؤ پہنچے تو ان کی عمر انتیس[۲۹] برس سے کم تھی۔ جناب مالک رام نے لکھا ہے کہ لکھنؤ کے کئی وزرا اور اکابر اہلِ علم حضرات ایک مدت سے انھیں لکھنؤ آنے کی دعوت دے رہے تھے یعنی ۲۹ برس کے ہونے سے ایک مدت پہلے ہی مرزا نے شاعری میں وہ کمال حاصل کیا تھا کہ اہلِ علم و صاحبانِ ذوق ان سے ملنے کے مشتاق تھے۔ کلکتہ جاتے وقت مولانا حالی نے مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی بتائی ہے لیکن دہلی سے روانہ ہونے اور کلکتہ پہنچنے کی تاریخیں جو جناب مالک رام نے دی ہیں ان کے پیشِ نظر مرزا کی عمر اتنی نہیں ہوتی۔ دہلی سے روانگی کی تاریخ میں تو جناب مالک رام کو کچھ شک معلوم ہوتا ہے مگر کلکتہ پہنچنے کی تاریخ قطعی وثوق سے ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء لکھی ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ جب مرزا کلکتہ پہنچے تو تیس سال کے تھے اور اس سے ایک مدت پہلے سے اہلِ علم ان کی شاعری کی عظمت تسلیم کر چکے تھے۔ ایسا عظیم شاعر اور باسٹھ روپے آٹھ آنے ماہوار پر زندگی گزارنے پر مجبور ...... لکھنؤ، رام پور اور دہلی کے درباروں نے ایسے یگانۂ روزگار کی سرپرستی کرنے کو حتی الامکان التوا میں رکھا۔ شہرت حاصل کرنے کے تین تین

برس کے بعد کہیں یہ نوبت آئی کہ جولائی ۱۸۵۰ء میں دہلی کے بادشاہ نے پچاس روپے کا وظیفہ مقرر کیا۔ دربار لکھنؤ نے چار سال اور انتظار کیا اور ۱۸۵۴ء میں صرف پانسو روپے سال عطا فرمائے۔ یہ عطیہ دو سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ نواب یوسف علی خاں والی رام پور مرزا کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۵ء میں تخت نشین ہوئے تو غالب نے قطعہ تاریخ جلوس بھیجا مگر نواب نے بے اعتنائی کی بالآخر چار سال بعد سو روپے ماہانہ مقرر کیے۔

رہی مرزا کی نظم و نثر کی داد و تحسین تو اس میں بھی اس فراخ دلی سے اہلِ نظر نے کام نہیں لیا جس کی وہ مستحق تھیں۔ بہت دنوں تک داد کے بجائے بے داد آتی رہی "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے"۔ بیدل کی پیروی ترک کرنے کے بعد جب مرزا نے سلیس و عام فہم طرزِ سخن اختیار کیا تب بھی مفتی صدر الدین آزردہ ایسے صاحب نظر مرزا کی شاعری سے بدظن ہی رہے۔ نواب مصطفےٰ خاں نے جن کے مرزا سے خصوصی تعلقات تھے مرزا پر مومن کو ترجیح دی اور اپنا کلام فارسی مومن کو دکھاتے رہے۔ کلکتہ میں برسرِ شاعرہ ان کے اشعار پر اعتراضات کیے گئے اور قتیل کی سند پیش کر کے انھیں قائل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور قاطع برہان شائع ہونے پر تو فتنۂ قیامت ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جواب میں متعدد رسالے شائع ہوئے ان میں قاطع القاطع سب سے بازی لے گیا اور فحش گوئی سے بھی باز نہ آیا۔ مرزا کا قصور صرف اتنا تھا کہ انھوں نے برہان قاطع کی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔

مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "مرزا کے اعتراضات کی تائید" فرہنگ ناصری سے ہوتی ہے جو ایک...... ایرانی عالم رضا قلی خاں نے مرزا کی وفات کے بعد تصنیف کی۔ جناب امتیاز علی خاں عرشی قاطع برہان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یا انیسویں صدی کے پُرجمود اور تقلیدی ہندوستان میں آزاد لغوی نقد و تبصرہ کا پہلا قدم تھا۔ اس کے ذریعے بہت سے وہ نکتے سامنے آئے تھے جن سے ہمارے بزرگوں کے کان اور آنکھیں قلتِ مطالعہ کے باعث ناآشنا تھیں۔"

یہ درست ہے کہ ان کی زندگی ہی میں مرزا غالب کے بہت سے مداح اور قدر شناس موجود تھے مگر پھر بھی غالب کا یہ کہنا غلط نہ تھا

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج   میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

یہ ناآفریدہ گلشن، خدا کا شکر ہے کہ وجود میں آ گیا اور دنیا نے غالب کا صحیح مقام پہچان لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب اسی علوِ ہمت کے قائل تھے جس کا اظہار ان کے اشعار میں پایا جاتا ہے مگر زمانے کی قدر ناشناسی اور غفلت شعاری نے کبھی کبھی اپنے سطحِ نظر سے نیچے اترنے پر بھی انھیں مجبور کیا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ مرزا غالب ایک بلند ہمت اور سیر چشم انسان تھے۔ ان کی شاعری ان کے کردار کی اولو العزمی کی آئینہ دار ہے۔

★

رشک ـــــ ظہوری اور غالب

(بہ سلسلۂ صفحہ ۹)

مرزا ایک ہی مضمون کو طرح طرح سے نظم کرتے تھے اسی جذبہ کی دوسری طرح ترجمانی ایک دوسرے انداز سے بھی کی ہے۔ ؎

صد ہزار شیوہ طاعت حق گران بنود
یک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

کہنا پڑتا ہے کہ رشک کو الفاظ میں بیان کرنا اور اس جذبہ کی خاطر خواہ عکاسی کرنا صرف ظہوری اور غالب کا حق تھا جس کو یہ دونوں اساتذہ بہتر سے بہتر طریقے پر ادا کرتے رہے۔ ان دونوں شاعروں نے جذبۂ رشک کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس کی بھرپور قدر دانی کی اور اس کو طرح طرح سے نظم کیا۔ ان دونوں اساتذہ نے رشک کو اتنی اہمیت دی کہ وہ فعل غیر مستحسن ہوتے ہوئے بہترین خصوصیات کا حامل بن گیا۔ مرزا نے ظہوری کی تاسی ضرور کی تھی لیکن طبع آزمائی میں ان کی انفرادیت، نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی نے چار چاند لگا دیے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان کا تشنہ شوقِ فن کے درجے تک پہنچ گیا لیکن پھر بھی ظہوری کی تاسی کا برابر احترام کرتے رہے۔ گمانِ غالب ہے کہ ظہوری ہی کو یاد کر کے مرزا نے یہ فریاد کی تھی۔ ؎

آنکہ صورِ نالہ از شور نفس موزون دمید
کاش دیدے این نشید شوق فن خواہد شدن

غالب

جگن ناتھ آزاد

اندازِ شعر جس کا رہا سب سے مختلف
مدت ہوئی اگرچہ وہ شاعر خموش ہے

نغمے سے اُس کے آج بھی دُنیا ہی وجد میں
اُس کا کلام آج بھی فردوسِ گوش ہے

وہ آج بھی ہو زندہ ولی ہو کہ بادہ خوار
اُس کی "صریرِ خامہ نوائے سروش ہے"

اُس کا کلام ریختہ ہے یا ہے فارسی
"دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے"

کیسے کہوں کہ "صحبتِ شب کی جلی ہوئی (ق) اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے"

وہ شمع آج بھی ہے ضیا بارِ ہند میں
چاروں طرف وہ شمعِ تجلّی فروش ہے

محرم تھا ایک تو ہی نوا ہائے راز کا
"یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا"

انساں نہیں ہے وہ ہے فقط سنگ و خشت، جو
قائل نہیں ترے نفسِ جاں گداز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں سہی مگر
عالم کچھ اور ہی تھا ترے سوز و ساز کا

تھا منفرد خیال بھی، تیرا بیان بھی
قصّہ وہ نازِ عشق کا تھا یا نیاز کا

ہاں! آج اس سے مشرق و مغرب ہیں فیض یاب
"سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا"

قاطع برہان

نیّر مسعود

مرزا غالب کی زندگی کا آخری معرکہ ان کی کتاب قاطع برہان کی اشاعت کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس کتاب میں محمد حسین برہان ابن خلف تبریزی کی ضخیم فارسی فرہنگ برہان[1] قاطع کی بعض غلطیوں کی نشان دہی اور تصحیح کی گئی ہے۔ قاطع برہان کے جواب میں برہان قاطع کے حامیوں کی طرف سے کتابیں لکھی گئیں۔ غالب اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے جواب الجواب دیا گیا اور اُدھر سے جواب الجواب کا بھی جواب آیا۔ اس طرح یہ مباحثہ طویل ہوتا گیا۔ اس مباحثے کے سلسلے میں جو کتابیں سامنے آئیں ان کے نام یہ ہیں[2]:

(۱) قاطع برہان (غالب) (۲) درفش کاویانی (غالب۔ یہ قاطع برہان ہی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے) (۳) دافع ہذیان (مولوی نجف علی) (۴) تیغ تیز (غالب) (۵) لطائف غیبی (میاں دادخاں سیاح کے نام سے چھپی لیکن اس کے اصل مصنف غالب ہی سمجھے جاتے ہیں) (۶) سوالات عبد الکریم (۷) ہنگامۂ دل آشوب (۸) محرق قاطع برہان (مولوی سعادت علی) (۹) مؤید برہان (آغا احمد علی جہانگیر نگری) (۱۰) قاطع القاطع (مولوی امین الدین) (۱۱) ساطع برہان (مرزا رحیم بیگ میرٹھی) (۱۲) تیغ تیز تر (آغا احمد علی جہانگیر نگری) (۱۳) شمشیر تیز تر (آغا احمد علی جہانگیر نگری)

ان نثری کتابوں کے علاوہ اس مباحثے نے نظم کا پیکر بھی اختیار کیا۔ غالب نے آغا احمد علی کی مؤید برہان کے جواب میں ایک قطعہ کہا جس کے جواب میں آغا احمد علی کے شاگرد عبد الصمد فدا نے قطعہ کہا۔ فدا کے جواب میں غالب کے دو شاگردوں باقر علی باقر اور فخر الدین حسین سخن (مصنف سروش سخن) نے قطعات کہے اور ان دونوں قطعات کا جواب پھر عبد الصمد فدا نے ایک قطعے کی صورت میں دیا۔ یہ سب فارسی زبان اور ایک ہی زمین میں ہیں[3]۔

بہ ظاہر یہ ایک علمی اور ادبی مباحثہ تھا لیکن قاطع برہان نے اس مباحثے کو معرکہ بنا دیا اور یہ معرکہ اختلاف رائے اور اعتراضات کی حد سے گزر کر طنز و استہزا اور اس سے بھی گزر کر فحش و دشنام طرازی اور بالآخر مقدمہ بازی تک پہنچ گیا۔ اس معرکے کی کتابوں میں زبان اور علم و ادب کے باریک، مفید اور دل چسپ نکات کے ساتھ مضحکات و مغلظات اور نظریاتی اختلاف کے ساتھ ذاتی پرخاش کی آمیزش ملتی ہے۔ اور اس آمیزش کے ذمہ داروں میں سب پر مقدم خود غالب کی شخصیت ہے۔ غالب نے قاطع برہان میں فارسی زبان کے اسرار و غوامض سے اپنی غیر معمولی واقفیت اور دل بستگی کا ثبوت دیا لیکن اسی کے ساتھ جو ادعائی اور معاندانہ انداز بیان انھوں نے اختیار کیا، برہان قاطع کی غلطیوں پر جس طرح چراغ پا ہو ہو کر گرفت کی

---

[1] برہان قاطع ۱۰۶۲ھ میں مکمل ہوئی۔ مولوی سعادت علی کی تصریح کے مطابق اس میں بائیس ہزار تین سو بائیس الفاظ کی شرح کی گئی ہے اور غالب نے ان میں سے دو سو چوراسی الفاظ پر اعتراض کیے ہیں (محرق قاطع برہان ۱۲۷۸ھ) [2] کتابوں کے نام بحوالہ مضمون معرکۂ غالب و حامیان قتیل از خواجہ احمد فاروقی، مشمولہ احوال غالب (ترتیب: مختار الدین آرزو)

[3] یہ قطعے آغا احمد علی کی کتاب شمشیر تیز تر میں شامل ہیں۔ خواجہ حالی نے غالب کے قطعے کے چند اشعار یادگار غالب میں نقل کیے ہیں۔

اور فرہنگ پر بحث کرتے کرتے جس طرح صاحب فرہنگ پر حملہ آور ہونے لگے، اس کو دیکھ کر یہ کہنے میں تامل کی زیادہ گنجائش نہیں رہتی کہ غالب نے خود ہی اس معرکے کی ہیئت مقرر کر دی تھی۔ معرکۂ قاطع برہان کی افادیت کے سہرے کے ساتھ ساتھ اس کی رکاکت کا الزام بھی غالب ہی کے سر ہے۔ ان کے تند اور تحقیری لہجے نے ان کے مقابل قائم ہونے والے محاذ میں بھی جارحانہ انداز پیدا کر دیا اور قاطع برہان کی مخالفت میں جو اشتعال پیدا ہوا اس کا محرک بھی مرزا کا یہی لہجہ تھا۔ خواجہ حالی اس معرکے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرزا نے جو از راہ شوخی طبع محمد صاحب برہان کا جا بجا خاکہ اڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظ نا ملائم بھی غیظ و غضب میں ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں، زیادہ تر اس وجہ سے مخالفت ہوئی مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مرزا صاحب برہان کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی کیوں کہ ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ جو آج کل ایک نہایت کس مپرسی حالت میں ہیں، ان کے لیے کنج خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہ رہا کہ کسی سر برآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔" (یادگار غالب)

اس میں شک نہیں کہ غالب اگر ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی ان کی مخالفت ہوتی، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان کی زیادہ تر مخالفت ایسے الفاظ لکھنے ہی کی وجہ سے ہوئی۔ اور یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ غالب اس طرح صاحب برہان کا جا بجا خاکہ اڑانے، اس کو اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنانے اور اس کی نسبت الفاظ نا ملائم لکھنے میں کہاں تک حق بجانب تھے اور اس سے بھی زیادہ غور طلب یہ سوال ہے کہ آیا اس تجاوز کے پس پشت محض غالب کی شوخی طبع تھی یا ان کے پیش نظر کوئی خاص مقصد تھا۔ اس سوال کا جواب ہمیں حالی ہی کی منقولہ بالا عبارت کے نصف آخر سے ملنے لگتا ہے۔

خواجہ حالی کا خیال ہے کہ غالب کی مخالفت کے پیچھے ان کے حریفوں کی شہرت طلبی کار فرما تھی اور قاطع برہان کی مخالف کتابوں کا اصل محرک ان کے مصنفوں کا شوق خود نمائی تھا۔ یہ خیال خود غالب اور ان کی برہان قاطع پر بھی صادق آتا ہے۔ اردو اور فارسی کے صاحب طرز شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے غالب کو یقیناً بڑی شہرت اور منزلت حاصل تھی[1]۔ لیکن غالب خود کو فارسی لسانیات اور لغت کا بھی مجتہد عالم منوانا چاہتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ قدرت نے فارسی زبان کے جوہر ان کی ذات کے اندر اتار دیے ہیں اور انھیں اپنے فطری ذوق اور طبع سلیم کی بہ دولت فارسی میں وہ درک حاصل ہے جو دوسرے ہندوستانی عالموں کو علمی مزاولت کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان کی طبیعت خود بخود غلط سے اِبا اور صحیح کو قبول کرتی ہے اور اس طرح گویا وہ علمی مسائل میں اسناد و حوالہ جات سے بے نیاز بلکہ خود سند ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو فارسی دانی کے میدان میں غالب خود کو جس شہرت کا مستحق سمجھتے تھے وہ انھیں حاصل نہ تھی۔ قتیل والے معرکے کا انجام غالب کے حسب منشا نہیں ہوا تھا۔ ان کا یہ خیال کہ ان کے سامنے قتیل اور ہندوستان کے دوسرے فارسی داں بے وقعت ہیں، عام طور پر تسلیم نہیں کیا گیا اور اس حیثیت سے غالب اب بھی کنج خمول و گمنامی ہی میں پڑے تھے جس سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا انھوں نے ضروری سمجھا۔ اسی کوشش کا ایک نام قاطع برہان ہے۔ محمد حسین برہان یقیناً دنیائے فارسی کا ایک سر برآوردہ اور ممتاز شخص تھا۔ یہ حیثیت اسے اپنی تالیف برہان قاطع کی بہ دولت حاصل تھی۔ اس برہان قاطع کو رد کرنا اور اس کے مولف کی تحقیر کرنا فوری شہرت کے حصول کا ضامن تھا۔ غالب کے ساتھ ناانصافی نہ ہو گی اگر یہ سمجھا جائے کہ برہان قاطع کی رد لکھ کر وہ شہرت پانا اور اپنی حیثیت منوانا چاہتے تھے۔ قاطع برہان کے آخری چودہ صفحوں میں غالب نے اپنے استاد کی تعلیم اور اپنی " خرد خداداد " کی قوت سے حاصل کیے ہوئے نکات درج کیے ہیں جو برہان قاطع سے غیر متعلق اور قاطع برہان کے رسمی موضوع سے باہر ہیں[2]، اور بظاہر کتاب میں ان کے شمول کا مقصد لوگوں پر یہی ظاہر کرنا ہے کہ " ہم بھی کوئی چیز ہیں "

---

[1] یہ شہرت و منزلت بھی غالب کو اپنے اصل مرتبے کے مقابلے میں کم معلوم ہوتی تھی اور جہاں تک شاعری کا تعلق ہے ان کی یہ ناآسودگی بے جا نہیں تھی۔

[2] دیکھیے آئندہ صفحات۔ غالب کا ایرانی استاد ہرمزد (عبدالصمد) پہلی بار قاطع برہان ہی کے صفحات پر نمودار ہوتا ہے۔ غالب کے فن کے تشکیلی عناصر کی بحث میں ہرمزد سے ان کے استفادے کا ذکر کر کے بعض نتیجے اخذ کیے جاتے ہیں۔ لیکن اب یہ تقریباً طے ہو چکا ہے کہ ہرمزد ایک خیالی کردار اور غالب کی پیکر تراشی کا کرشمہ تھا جس کے ذریعے انھوں نے ہندوستان کے فارسی دانوں پر اپنی فوقیت ظاہر کرنا چاہی تھی۔ (دیکھیے مضمون " ہرمزد ثم عبدالصمد " از قاضی عبدالودود مشمولہ احوال غالب

اپنے لہجے میں غالب نے ایسی کاٹ پیدا کی کہ تشریح لغات اور تصحیح الفاظ کی خشک بحث میں ایک برقی لہر دوڑ گئی، کتاب عام دلچسپی کی چیز بن گئی اور اسی کے ساتھ اس کا امکان ختم ہو گیا کہ یہ کتاب ادبی فضا میں ہلچل پیدا کیے بغیر طاقوں پر چلی جائے۔ چناں چہ کتاب شائع ہوئی اور طوفان آ گیا۔

اور قاطع برھان کو شروع سے آخر تک دیکھیے، صفحہ بہ صفحہ محسوس ہوتا ہے کہ غالب خود وہ طوفان اٹھانے پر تلے ہوئے ہیں جس کا پہلا تند جھونکا ہی قاطع برھان ہے۔ غالب نے عمداً اس کتاب کو ایک ہنگامے کا پیش خیمہ بنانے کی کوشش کی مثلاً انھوں نے کتاب کا نام قاطع برھان رکھا جس کی برش فوراً اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ نام ہی غالب کے مبارز طلبانہ تیوروں کی تصویر ہے۔

انھوں نے برھان قاطع کے تیئیس ہزار سے زیادہ الفاظ کی تشریح میں صرف دو سو چوراسی الفاظ سے اختلاف کیا۔ اس طرح برھان قاطع کی غلطیوں کا تناسب ایک فی صد سے کچھ زیادہ نکلتا تھا۔ یہ تناسب چنداں قابل اعتنا نہیں تھا، لیکن غالب نے شروع ہی میں یہ جتا دیا کہ انھوں نے برھان قاطع کی غلطیوں میں سے صرف ایک فی صد کی نشان دہی کی ہے، اسی کے ساتھ اس پر زور دیا کہ ان کا یہ بیان مبالغے پر مبنی نہیں ہے اور اس طرح انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ ظاہر کرنا چاہا کہ برھان قاطع میں جتنے الفاظ کی تشریح کی گئی ہے ان سے زیادہ غلطیاں کی گئی ہیں یعنی اٹھائیس ہزار سے اوپر!

پھر غالب کو ہندستان کے فارسی دانوں سے الجھنا ضرور تھا اس لیے انھوں نے محمد حسین برہان کو ایرانی ماننے سے انکار کر دیا، "دکنی" اور "دکنی گردن زدنی" کہہ کہہ کر اس کی تضحیک کی اور اس کی غلطیوں کا خاص سبب یہی قرار دیا کہ وہ ہندستان کا باشندہ تھا۔ اس طرح غالب برہان پر کیے جانے والے تمام اعتراضات کی زد میں فارسی دانانِ ہند کو بھی لے آئے۔

اس تعمیم کے علاوہ غالب نے یہ بھی کیا کہ قاطع برھان کے آخر میں لحقات کو شامل کر دیا، اور ان ملحقات میں برہان سے بحث نہیں تھی بلکہ خاص طور پر اور براہ راست فارسی دانانِ ہند سے تصادم تھا۔

مزید یہ کہ خاتمۂ کتاب میں انھوں نے یہ کہہ کر اپنے مخالفین کو للکار بھی دیا کہ میں برھان قاطع کے معتقدوں کی نفرین اور فارسی دانانِ ہند کی پرخاش سے ڈرنے والا نہیں۔

غرض غالب کی کوشش اور خواہش یہی تھی کہ قاطع برھان ایک معرکے کا آغاز کرے۔ ان کو امید بھی تھی کہ ان کی یہ کتاب ایک معرکے کا آغاز کرے گی جس کی طرف واضح اشارہ خاتمۂ کتاب میں موجود ہے ("میں خوش ہوں کہ اس جھگڑے سے میرا علم کم نہ ہوگا ... الخ")

قاطع برھان کی اشاعت نے ان کی کوشش کامیاب، خواہش اور امید پوری کر دی (مگر شاید ان کے اندازے سے زیادہ)۔

برھان قاطع پر غالب کے اعتراضات صحیح اور غلط دونوں طرح کے ہیں، فن لغت نویسی سے متعلق ان کے اصولی اعتراضات بیشتر صحیح ہیں۔ بہر حال یہاں قاطع برھان کا تنقیدی مطالعہ[1] یا اس معرکے کا تعارفی جائزہ[2] مقصود نہیں۔ غالب کی یہ بہت مشہور، بہت دلچسپ اور بہت معلومات افزا کتاب مقفّی فارسی نثر میں ہے۔ ذیل میں اس کے منتخب مقامات کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ فارسی نہ جاننے والے شائقین غالب بھی اس کتاب کی کچھ سیر کر لیں۔

●

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا اسد اللہ الغالب

۱۸۵۷ء کی شورشوں کے دوران میں اس تنہائی و بے نوائی کے عالم میں تھا کہ پہلو میں سائے کے سوا کوئی ساتھی نہ تھا اور نظر کے سامنے دساتیر[3] اور برھان قاطع کے سوا کوئی تحریر نہ تھی، ستم آباد دہلی میں اپنے گھر کے کونے میں بے حس و حرکت پڑا رہتا تھا۔ اگرچہ میں اس ہنگامے میں قید نہیں ہوا لیکن بے گزند بھی نہ رہ سکا۔ میں نے ان واقعات کی سرگزشت قلم بند کرنا شروع کی اور دستنبو کے نام سے ایک کتاب لکھ دی۔ اس کتاب کے مکمل ہو جانے کے بعد سے جب تنہائی کا غم زور کرتا، میں برھان قاطع دیکھنے لگتا۔ چونکہ اس کتاب میں غلط بیانیاں کی گئی ہیں اور یہ لوگوں کو گمراہ کرتی ہے، اور میرا آئین آموزگاری ہے، اس لیے اپنے پیرووں (کے اس کتاب سے گمراہ ہونے) پر میرا دل جل اٹھا (اور) میں

[1] ان پہلوؤں پر قاضی عبدالودود اور [2] ڈاکٹر حکم چند نیر صاحبان لکھ رہے ہیں۔ [3] ساسان پنجم کی طرف منسوب "دساتیر" کے متعلق نئی تحقیق یہ ہے کہ یہ کتاب جعلی ہے اس کے مصنف کی شخصیت فرضی ہے اور پرانی فارسی زبان کے جو نمونے اس میں پیش کیے گئے ہیں وہ بھی مجہول اور غلط ہیں۔ (نیر مسعود)

نے صحیح جادے کو نمایاں کر دیا تاکہ وہ بھٹکنے نہ پائیں۔

جامع لغات (محمد حسین برہان) کو نہ حسن معنی کا خیال ہے نہ جوہر لفظ پر اس کی نظر ہے۔ اس نے ہر لغت[1] کے تیسرے اور چوتھے لفظ تک کی رعایت ملحوظ رکھنے اور بہر صورت لغات کی تعداد بڑھانے پر کمر باندھ لی ہے۔ نہ اس دھن کے پیچھے وہ قاعدۂ استخراج کے برہم ہونے کی پروا کرتا ہے اور نہ اس خواہش کے آگے فرہنگ میں مہملات کے شمول سے شرماتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر مصدر ایک لغت ہے اور (اس مصدر سے) مشتق ہونے والا ہر کلمہ بھی ایک لغت ہے۔ تم بارہا دیکھو گے کہ اس نے ایک مصدر کو اس کے مشتقات کے ساتھ درج کیا اور محض بائے موحدہ زائدہ بڑھا کر از سر نو درج کر دیا۔ زیادہ تر نامانوس الفاظ درج کرتا ہے اور جو کسی نے نہیں لکھا وہ یہ لکھتا ہے۔ جس طرح کمال اسمٰعیل کا لقب "خلاق المعانی" ہے، اسی طرح اگر اس بزرگوار کو "خلاق الالفاظ" کا لقب دے دیا جائے تو عجب نہیں!

میں نے برہان قاطع کی غلطیوں میں سے بہت کم لکھی ہیں۔ یہ تک کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ میں نے اس کی سو غلطیوں میں سے ایک لکھی ہے . . . وہ کوئی صحیفۂ آسمانی تو ہے نہیں کہ اس میں چون و چرا کی گنجائش نہ ہو۔ بہرحال ایک انسان کا کلام ہے جو چاہے اسے میزان نظر پر تول سکتا ہے۔

یہ کتاب قاطع برہان جو میں نے لکھی ہے اس کے مطالعے کی شرط یہ ہے کہ جب اسے پڑھنے کا ارادہ کریں تو برہان قاطع کو بھی اس کے ساتھ رکھیں لیے بھی دیکھتے چلیں اور اسے بھی، لیکن چشم حقیقت نگر سے دیکھیں، چشم غلط بیں سے نہیں۔

میں نے اس تحریر میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ پہلے اصل کی عبارت شروع میں کتاب کا نام برہان قاطع لکھ کر درج کی ہے، اور پھر اپنی عبارت جس کا عنوان برہان قاطع کا الٹا یعنی قاطع برہان قرار دیا ہے۔ اور جہاں تکرر سطح کی وجہ سے برہان قاطع کی اصل عبارت نقل نہیں کی گئی وہاں لفظ "تنبیہہ" لکھا ہے۔ (قطعہ تاریخ)

ساخت چوں گوشمال زین تحریر　　آنکہ برہان قاطعش نام است
شد مسمیٰ بہ "قاطع برہان" در س الفاظ سال اتمام است (۱۲۷۶ھ)

برہان قاطع۔ "آب در جگر داشتن": کنایہ ہے مستی سے۔ اور تونگری بھی مراد لیتے ہیں۔

قاطع برہان۔ کنایے کی درستی میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ اس کے بعد دوسرے لغت کے طور پر "آب در جگر نہ دارد" لا کر اس کے معنی لکھتا ہے "یعنی مفلس ہے"۔ ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ جب "آب در جگر داشتن" بمعنی تمول لکھ دیا تھا تو پھر نون نفی کے ساتھ صیغۂ مضارع کو دوسرا لغت قرار دینے کی کیا ضرورت تھی؟

تنبیہہ: "آبشت"، "آبشت گاہ"، "آبشت گہ"، "آبشتن"، "آبشتن گاہ" "آبشتن گہ" غرض ایک انڈے سے چھ بچے نکالے ہیں اور سب کے سب چمگاڈر کی طرح دھوندھی میں گرفتار! اس نے "آبشتن کو مصدر اور "آبشت" کو اس کا ماضی سمجھا، "آبشت گاہ" اور "آبشت گہ" کو دو جداگانہ لغت اور اسی طرح "آبشتن گاہ" اور "آبشتن گہ" کو دو الگ لغت قرار دیا اور اصل لفظ کی حقیقت سے کوسوں دور جا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ "آبشتن" اور س کو ش میں بدل کر "آبستن" بھی ایک جامد اور غیر منصرف[2] اسم ہے جو عموماً اس چیز کے لیے آتا ہے جو نظروں سے پنہاں ہو اور بالخصوص حاملہ عورت کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور بیت الخلا کو بھی "آبشتن گاہ" اسی لیے کہنے لگے کہ اس کو نظر سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے اور لوگ وہاں تنہا جاتے ہیں۔ سوا ایسے شخص کے جو "کلاہ" اور "کلہ" میں تفرقہ کرتا ہو، کون ہے جو "آبشتن گاہ" اور "آبشتن گہ" یا "آبشت گاہ" اور "آبشت گہ" کو ایک نہ سمجھے گا؟

برہان قاطع: "آدر" بفتح دال، بروزن مادر بمعنی "آذر" جو کہ آگ کو کہتے ہیں۔

قاطع برہان: جب آدر "بفتح دال" کہہ دیا تو "بروزن مادر" کیوں کہا؟ اور اگر کہنا ہی تھا تو (بروزن) چادر کہا ہوتا۔ چادر کو چھوڑنا اور مادر کو لانا بے حیائی ہے اور یہ فقرہ کس قدر دلچسپ ہے کہ "آدر بمعنی آذر جو کہ آگ کو کہتے ہیں"۔ ارباب دانش آئیں اور مجھے سمجھائیں کہ کیا "آدر" اور "آذر" دو الگ الگ لغت اور اسم ہیں؟ "لقاط" (برہان) کے عقیدے کے موافق اس لفظ کی شرح یوں ہونا چاہیے تھی "آدر آگ کو کہتے ہیں اور اسے ذال سے بھی لکھتے ہیں"۔ پھر اس نے اسم "آذر" کی بحث میں ایک الگ فصل قائم کر کے بات کو اندازے سے زیادہ طول دے دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ "آذر" ذال سے ہرگز نہیں ہے اور مہینے اور دن کے نام میں جو "آذر"[3] ذال سے لکھا جاتا ہے وہ سب دراصل دال ہی سے "آدر" ہے۔

---

[1] لغت یعنی لفظ (کسی فرہنگ میں جن الفاظ کی تشریح کی جائے انھیں خاص طور پر لغت کہتے ہیں) [2] یعنی اس لفظ سے دوسرے کلموں کا اشتقاق نہیں ہوتا چنانچہ اس کی شکل میں تبدیلی نہیں ہوتی [3] ایران کے شمسی سال کے نویں مہینے کا نام اور ہر مہینے کے نویں دن کو بھی "آذر" کہتے ہیں۔

میرے قلم کی تراوش سے جگر تشنگان تحقیق سیراب ہوں کہ فارسی میں کوئی دو حروف متحد المخرج[1] بلکہ قریب المخرج[2] بھی نہیں ہیں۔ س ہے تو ث اور ص نہیں ہے، ت ہے اور ط نہیں ہے، الف ہے ع نہیں ہے بلکہ غ ہے ق نہیں ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ جب فارسی میں ز موجود ہے اور ض اور ظ نہیں ہیں تو ذال کیوں ہوگا؟ البتہ ایران کے (پرانے) لکھنے والوں کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ دال کے اوپر ایک نقطہ لگا دیا کرتے تھے۔ بعد والوں کو اس رسم خط سے گمان ہوا کہ فارسی میں ذال موجود ہے۔ چونکہ اس مغالطے کے نتیجے میں دال کا وجود ہی ختم ہوا جا رہا تھا اور صرف ذال رہ جاتا تھا اس لیے اکابر عرب نے ایک قاعدہ قرار دیا اور اسی قاعدے پر دال اور ذال کے تفرقے کی بنا رکھی۔

اور یہ جو میں کہہ رہا ہوں یہ میرا قول نہیں بلکہ میرے استاد کا فرمان ہے۔ وہ "شت" ہرمزد نام ایک پارسی نژاد فرزانہ تھا جو ساسانیوں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ علم و دانش سے اچھی طرح بہرہ اندوز ہونے کے بعد اس نے مذہب اسلام اختیار کر لیا اور اپنا نام عبدالصمد رکھا۔ وہ سن بارہ سو چھبیس (۱۲۲۶ھ) میں بطریق سیاحت ہندستان آیا اور شہر اکبر آباد میں، جہاں میری پیدائش اور تربیت ہوئی، میرے ہی غم خانے میں دو برس تک مقیم رہا۔ میں نے "آئین معنی آفرینی"[3] اور "کیش یگانہ بینی"[4] اس سے حاصل کیا ہے۔ اس کی ذات پر آفرین اور اس کی روح پر "آباد"۔ اسی سلسلے میں یہ بھی بتا دیا جائے کہ پہلوی زبان میں "آباد" دوسرے معنی رکھنے کے علاوہ "آفرین" کے معنی بھی رکھتا ہے۔ اور "شت" ترجمہ ہے "حضرت" کا اور "تیمسار" اس کا مرادف ہے۔

سیرابی نطقم از فیضِ حکیم است رشح کف جم می چکد از مغزِ سفالم

برہان قاطع۔ "آرازش" بروزن آرائش، بمعنی خیر و خیرات کرنا اور راہ خدا میں کسی کو کچھ دینا۔

قاطع برہان۔ خیرات و ایثار کے معنی ہیں "آرزانش" بروزن ہر دانش ہے جیسا کہ وہ خود "الف سے" کی فصل میں لکھتا ہے۔ "آرازش" دکنی[5] کی دوشیزۂ فکر کی اولاد ہے[6]۔

برہان قاطع۔ "آسودہ" بروزن آلودہ، بمعنی بے زحمت، بے مزاحمت، بے مشقت۔ اور خفتہ و خوابیدہ کے معنی میں بھی آیا ہے۔

قاطع برہان۔ قاعدہ یہ ہے کہ نظیر کے لیے ایسا لفظ لاتے ہیں جو (زیر تشریح) لغت کی نسبت آسان تر اور مشہور تر ہو۔ "آسودہ" کے مقابلے میں "آلودہ" مشہور اور آسان تر کہاں ہے؟ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ آسودن کا مفعول اور یہ آلودن کا مفعول ہے۔ بچے گلستان پڑھنے سے پہلے مصدروں اور مشتقات کا علم حاصل کرتے ہیں۔ غرض مشہور مصدروں کو لغت سمجھنا آدمی کا کام نہیں ہے۔ ایک اور جگہ "آشفتہ" کو لغت قرار دیا ہے اور (نظیر کے لیے) اس کا ہم وزن "آلفتہ" لکھا ہے جو ایک غیر مانوس لفظ ہے، نہ عبارتوں میں لکھا جاتا ہے نہ زبانوں سے بولا جاتا ہے۔

برہان قاطع۔ "آفریں" بروزن آتشیں، بمعنی تحسین و ستائش و دعائے نیک۔ اور آفرینندہ (پیدا کرنے والا) کے معنی میں رائج ہے۔

قاطع برہان۔ "آفریں" ایسا لغت نہیں ہے کہ کوئی اسے جانتا نہ ہو اور اس (کا وزن بتانے) کے لیے نظیر لانا پڑے، اور نظیر بھی اس صفت کی کہ یا تو "آفریں" میں ف کو متحرک پڑھیے (آفَریں) یا "آتشیں" میں ت کو ساکن[7] (آتْشیں) اور یہ کہنا کہ "آفرینندہ" کے معنی میں رائج ہے، لفظ و معنی پر ستم کرنا ہے۔ "آفریں" ایک جامد اور غیر متصرف لغت ہے بمعنی تحسین و مرحبا۔ البتہ "آفریں" ایک اور لغت ہے جو مصدر "آفریدن" کے مشتقات میں امر کا صیغہ ہے۔ اور صیغۂ امر کے پہلے جب تک کوئی اسم نہ لگایا جائے اس وقت تک وہ ہرگز فاعل کے معنی نہیں دیتا[8]۔

---

[1] متحد المخرج: یکساں آواز والے، اور "قریب المخرج"[2]: ملتی جلتی آواز والے [3]، [4] "معنی آفرینی": شاعری اور "یگانہ بینی": توحید وجودی (بحوالہٗ قاضی عبدالودود: مضمون "ہرمزد ثم عبدالصمد") [5] مراد محمد حسین برہان (غالب اسے تبریز کے بجائے دکن کا باشندہ قرار دے کر اس کو مستند ماننے سے انکار کرتے ہیں) [6] یعنی جائز اور صحیح الاصل نہیں ہے۔ "دوشیزۂ فکر کی اولاد" میں طنز کا نشتر موجود ہے [7] "آفریں" میں ف ساکن ہے (بروزن دوربیں) اور "آتشیں" میں جو "آتش" سے نکلا ہے، ت متحرک ہے (بروزن سرزمیں)۔ غالب کا اعتراض یہی ہے کہ "آفریں" اور "آتشیں" ہم وزن نہیں ہیں اس لیے "آفریں" کی نظیر "آتشیں" سے نہیں دی جا سکتی۔ [8] غالب کا اعتراض یہ ہے کہ "آفریں" بمعنی تحسین ایک الگ لفظ ہے اور مصدر "آفریدن" (پیدا کرنا) کا صیغۂ امر "آفریں" (پیدا کرنا) الگ لفظ ہے اس لیے ان دونوں لفظوں کو ایک فصل میں درج نہیں کرنا چاہیے تھا۔ دوسرا "آفریں" بمعنی "پیدا کر" ہے اور وہ فاعل یعنی "آفرینندہ" (پیدا کرنے والا) کا مفہوم صرف اس وقت دے گا جب اس کے پہلے کوئی اسم بھی لگا یا جائے جیسے "جہاں آفریں"، "معنی آفریں" وغیرہ۔

قصہ مختصر "آفریں" نہ بروزن آتشیں ہے، نہ بمعنی دعائے نیک اور نہ بمعنی آفرینندہ۔

برہان قاطع۔ "آوازگشتن" بمعنی شہرہ ہونا، مشہور ہونا (اور اس کے بعد دوسری فصل میں "آوازہ گشتن" بھی اسی معنی میں لکھتا ہے۔ غالب)

قاطع برہان۔ "بلند آوازہ گشتن" بمعنی شہرت مسلّم۔ لیکن تنہا "آواز گشتن" یا "آوازہ گشتن" کی معنی "شہرت" شہرت نہیں ہے۔ نہ میں نے سنا نہ کسی نے سنا ہوگا۔

برہان قاطع: "ارتنگ" بروزن فرہنگ۔ مانی نقاش کا نگارخانہ، بت خانۂ چین کا نام بھی ہے۔ اور ایک کتاب کا نام بھی جس میں مانی کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں۔ اور بعض نے اس لغت میں ت کی جگہ ث ("ارژنگ") بھی لکھا ہے۔

قاطع برہان۔ کیا نگارخانۂ مانی کچھ اور ہے اور کتاب جس میں مانی کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں وہ کچھ اور چیز ہے؟ کیا کہنا اس حسن بیان کا۔ پھر ایک اور جگہ اسی لغت کو "ارتنگ" بہ تائے خُبث[1] لکھا ہے، پھر دوسری جگہ "ارجنگ" بہ جیم جنون اور پھر "ارژنگ" بہ زائے ژاژ[2]، پھر "ارسنگ" بہ سین سودا، پھر "ارغنگ" بہ غین جنون بتایا ہے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ "ارتنگ" محض مرقعِ تصویر کو کہتے ہیں مگر چونکہ اس کو مانی سے نسبت دی جاتی ہے اس لیے "ارتنگ مانی" اور "ارتنگ مانوی" بھی کہتے ہیں۔ باقی رہے "ارثنگ" "ارجنگ"، "ارسنگ"، "ارغنگ" ان چاروں لفظوں کا کوئی وجود خارجی نہیں ہے۔ البتہ "ارژنگ" ایک اسم ہے جس کے مختلف زمانوں میں تین مسمیٰ ہوئے ہیں۔ اول ایک دیو جس کو رستم نے ہلاک کیا، دوم ایک پہلوان جس کو طوس نے قتل کیا، سوم ایک نقاش جو مانی اور بہزاد کی طرح اس فن کا مشہور ماہر تھا، جیسا کہ مولانا نظامی گنجوی علیہ الرحمۃ "شیریں خسرو" میں شیریں کی زبان سے فرماتے ہیں:

به قصر دولتم مانی و ارژنگ
طراز سحر می بستند بر سنگ

اور یہ شعر صنعت ذوقافیتین میں ہے۔

برہان قاطع۔ "انجم روز": کنایہ ہے آفتاب عالم تاب سے۔

قاطع برہان۔ "ستارۂ روز" اور "اختر روز" تو ہم نے سنا ہے، مگر آفتاب کا نام "انجم روز" کسی نے نہ سنا ہوگا۔ اور اگر عربی کو فارسی کے ساتھ مخلوط کرنا ہی تھا تو "نجم روز" لکھا ہوتا نہ کہ "انجم روز" اس لیے کہ "انجم" صیغۂ جمع ہے اور آفتاب مفرد۔

برہان قاطع۔ "بت کدہ": بمعنی بت خانہ، اس لیے کہ "کدہ" بمعنی خانہ بھی استعمال ہوا ہے۔

قاطع برہان۔ یا اللہ! "بت کدہ" کون نہیں جانتا؟ اور یہ جو بکا ہے کہ "کدہ بمعنی خانہ بھی استعمال ہوا ہے" تو کیا "کدہ" کے کچھ اور معنی بھی ہیں؟

برہان قاطع۔ "بزلہ": سخنان شیریں ولطیف کو کہتے ہیں۔

قاطع برہان۔ یہ ہیچ مداں تو یہ جانتا ہے کہ اس معنی میں "بذلہ" عربی لفظ ہے جو ذال سے ہے نہ کہ زے سے۔ لیکن چونکہ میں لغات عربی کا محقق نہیں ہوں لہٰذا اس باب میں سکوت اختیار کرتا ہوں۔ دیکھنا ہے ارباب دانش کیا فرماتے ہیں۔

برہان قاطع۔ "بازاج": بروزن تاراج، دودھ پلانے والی عورت اور دائی کو کہتے ہیں۔ عربی میں اسے قابلہ اور مرضعہ کہتے ہیں۔

قاطع برہان۔ ہے ہے! "بازاج" دودھ پلانے والی عورت کو کہاں کہتے ہیں؟ "بازاج" اس عورت کو کہتے ہیں جو حاملہ عورتوں کی خدمت کرتی اور بچہ جناتی ہے۔ عربی میں اس کو "قابلہ" اور ہندستانی میں "دائی جنائی" کہتے ہیں اور دودھ پلانے والی عورت کو عربی میں "مرضعہ" اور ہندستانی میں "دائی دُدھائی" کہتے ہیں اور روزمرۂ اردو میں "انّا" کہتے ہیں، بروزن "حنّا" جو مراد ہے معمار کا۔

تنبیہ۔ "تردامن" کی تشریح نو طرح سے کی ہے "فاسق، فاجر، بدگمان، عاصی، مجرم، گناہگار، آلودۂ معصیت، معیوب، ملوث"۔ یا خدا! کیا ان نو میں سے ایک لفظ کافی نہ ہوتا۔ نہیں نہیں، آٹھ لفظ تو ہم معنی ہیں اور یہ نواں لفظ غریب یعنی "بدگمان" کس لیے بڑھا دیا؟ کہاں تردامنی کہاں بدگمانی!

برہان قاطع: "تیزی": بمعنی عربی۔ اور اس سے "عربی نژاد" یعنی فارسی

---

[1] "بہ تائے خبث، بہ جیم جنون... الخ" یعنی اس ت کے ساتھ جو لفظ "خُبث" میں ہے، اس ج کے ساتھ جو لفظ "جنون" میں ہے۔ نظیر لانے کا یہ طریقہ کسی لفظ کے املا کے تعین اور اس کے کسی خاص حرف کی نشان دہی کے لیے اختیار کیا جاتا تھا تاکہ غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے۔ غالب نے یہاں نظیر کے لیے جتنے الفاظ لائے ہیں (خبث، جنون، ژاژ، سودا، جنون) ان سب میں صاحب برہان کی ہجو پنہاں ہے۔ [2] "ژاژ": بیہودہ بکواس

نداناں" مراد ہوتے ہیں ۔

قاطع برھان ۔ سب سے پہلے تو عبارت کی خوبی ہی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ "عربی نژادانِ فارسی داناں" کس ملک کا طرز تحریر ہے ؟ "شاہانِ دادگر کہتے ہیں یا "شاہانِ دادگران" ؟ جمع کا صیغہ صرف موصوف میں کافی ہے اور صفت میں اس کا اعادہ نا انصافی ہے ۔ معلوم ہو گیا کہ (صاحب برہان) نہ تو بذات خود تبریزی ہے نہ شناسائے حقیقتِ لفظ "تبریزی" ہے ۔ "تیزی" بمعنی "عربی" ہرگز نہیں ہے ۔ ہاں عربی کا مرادف لفظ "تازی" ہے اور "تیزی" اس کا امالہ[1] اور یہ لفظ "تیزی" رعایت قافیہ کی ضرورت کے سوا کبھی سخن وروں کی زبان قلم پر نہیں آتا۔ اور امالے کی صورت میں بھی وہی عربی نژاد کے معنی دیتا ہے، صفتِ فارسی دانی اس سے مستفاد نہیں ہوتی ۔

برھان قاطع ۔ "جکر" : بروزن شکر ۔ گرد و خاک کو کہتے ہیں ۔ "ہند کی علمی زبان میں بھی یہ لفظ یہی معنی رکھتا ہے ۔

قاطع برھان ۔ "ہند کی علمی زبان" تو ہم جانتے نہیں کہ اس کے بارے میں کچھ بات کر سکیں ۔ ہم تو یہی سنتے ہیں کہ گرد اڑانے والی تند ہوا کو عام طور پر اہلِ ہند "جھکڑ" کہتے ہیں ۔ عرفی مدح کشمیر والے قصیدے میں کہتا ہے :

(ہمچنانکہ از شبنم گل گرد فشان است)

آں باد کہ در ہند گر آید "جکر" آید

یہ وہی "جھکڑ" ہے جسے اس نے لہجے کے تغیر کے ساتھ استعمال کیا ہے اور یہ لغت فارسی الاصل ہرگز نہیں ہے ۔

برھان قاطع ۔ "دَب" : بہ فتح اول و سکون ثانی ۔ بمعنی حفاظت کرنا، اور ہندستانی میں گھوڑا کدانے کو کہتے ہیں ۔ اور تے کے ساتھ ("دپ") دائرے کا نام ہے جسے عربی میں "دَف" کہتے ہیں اور "دُف" اس کا معرّب ہے ۔ اور بہ ضم اول ("دُب") عربی میں ریچھ کو کہتے ہیں ۔ اگر کسی نئے نئے پاگل شخص کو ریچھ کا خون دیا جائے تو وہ ٹھیک ہو جاتا ہے ۔

قاطع برھان ۔ پہلے تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ دو حرفی لفظ میں حرف ثانی کو ساکن بتانے سے کیا فائدہ ؟ دوسرا سوال یہ ہے "دب" بمعنی حفاظت کرنا کس گروہ کی بول چال ہے ؟ تیسرے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ گھوڑا کدانے کے معنی میں "دب" کہاں کی ہندی ہے ؟ چوتھے اس عقدۂ دشوار کی کشائش کی آرزو ہے کہ "عربی میں دَف کہتے ہیں اور دُف اس کا معرب ہے" اس فقرے کا کیا مطلب ہے؟ اگر دف (دپ کی) تعریب ہے تو کیوں کہا کہ عربی میں اسے (دف) کہتے ہیں، اور اگر دف اصالتہً عربی لفظ ہے تو یہ کیوں لکھا کہ دف اس (دپ) کا معرّب ہے؟ غرض اس عبارت کے خاتمے کو دیکھ کر، جہاں وہ ریچھ کے خون کی خاصیت بیان کرتا ہے، میرا دل اس "ناقل ناعاقل" کی بے کسی پر کڑھتا ہے ۔ کیا کوئی اس کا غم خوار یا تیمار دار ایسا نہ تھا کہ جب اس بے چارے نے فرہنگ لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور وہی جنون کی ابتدا تھی، اسی وقت ریچھ کا خون اس کے حلق میں انڈیلتا، ناک میں چڑھاتا اور تلووں پر ملتا کہ یہ جنون کے عارضے سے چھٹکارا پاتا اور یوں ہذیان نہ بکتا ۔

برھان قاطع ۔ "سفید" : سپید کا ہم وزن اور ہم معنی، جو سیاہ کے برعکس ہوتا ہے ۔ عربی میں اسے "ابیض" کہتے ہیں ۔

قاطع برھان ۔ ننھا بچہ بھی سفید اور سیاہ بولتا ہے ۔ "سفید" کو لغت قرار دینا، پھر اس کا ہم وزن لفظ "سپید" لانا پھر اسی لفظ "سپید" کو معنی کی تشریح کے لیے استعمال کرنا، پھر بھی چین سے نہ بیٹھنا اور "سیاہ" کو اس کا برعکس لکھنا، اور جب تک اس کی عربی "ابیض" نہ لکھنا اس وقت تک قلم ہاتھ سے نہ رکھنا، دیوانہ بھی تو یہ سب نہ کرے گا! یہ تو کوئی مسخرہ ہی کر سکتا ہے تاکہ اہل محفل ہنسیں اس کی گدّی پر ہاتھ رسید کریں اور گالیاں دیں

تنبیہہ ۔ "ضال" کو میوۂ سرخ رنگ کا نام بتاتا ہے اور وضاحت کرتا ہے کہ عربی میں اسے "ثمرۃ السدر" فارسی میں "کنار" اور ہندی میں "بیر" کہتے ہیں ۔ اور یہ نہیں بتاتا کہ خود "ضال" کس زبان میں کہتے ہیں ۔ غالباً قاف کے دیو کی زبان ہوگی ۔ اس کے رنگ کو سرخ میں محدود کرنا اور اسے عناب سے مشابہ بتانا اس کی عقل پر تہمت ہے ۔

برھان قاطع ۔ "فرامُشت" : بمعنی فراموش یعنی یاد سے اتر جانا ۔ اور جو چیز کوئی ہاتھ میں لیتا ہے اسے بھی "فرامُشت" کہتے ہیں ۔

قاطع برھان ۔ جب جو ہر لفظ کی حقیقت نہیں جانتا تو فرہنگ کیوں لکھتا ہے ؟ ٹاٹ بُنتا، رسّی بٹتا، ایندھن بیچتا، بھاڑ جھونکتا ۔ سب جانتے ہیں کہ "فرامشت"

---

[1] امالہ : کسی لفظ کے الف کو "ی" میں بدل دینا، مثلاً "رکاب" سے "رکیب" "کتاب" سے "کتیب"

زامُشت (مخفف فراموش) کا مزید علیہ ہے، "بمعنی فراموش" جہ معنی دارد؟ اور یہ جو اس لفظ کے سوراخ میں دوسرے معنی گھسیڑ دیے ہیں (ہاتھ میں لی جانے والی چیز) وہ نہ معلوم کس امردباز سے سیکھے ہیں۔ "فرا" مرادفِ "بر" بمعنی "علیٰ" (پر) ایک الگ لفظ ہے اور "مُشت" ایک الگ لفظ۔ (فرامشت ایسا ہی ہے) جیسے "بردست" اور "دردست"۔ وہ اس مرکب لفظ کو ایک مستقل لغت سمجھ بیٹھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے نہ تو "فرا" کے معنی معلوم ہیں، نہ "مُشت" کے۔ اس نے کہیں "فرامشت" لکھا دیکھا ہوگا، چونکہ وہاں پر سہو ونسیان (فراموش) کے معنی کھپتے نہ ہوں گے اس لیے کسی سے پوچھا ہوگا۔ اس نے بتا دیا ہوگا کہ جو چیز ہاتھ پر رکھی جائے اسے "فرامُشت" کہتے ہیں۔ بس اس نے یہ معنی دل پر رکھ لیے اور فرہنگ میں درج کر دیے … اور اس طرح کی ناگوار صورتیں اس کتاب میں اتنی ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتیں۔

برھان قاطع۔ "کالِب"۔ بروزن وبمعنی قالِب۔ اسے "کالبُد" بھی کہتے ہیں۔

قاطع برھان۔ اگر حیرت غالب نہ ہوتی تو میں ہنستے ہنستے بے ہوش ہو جاتا۔ بھلا "کالب" بروزن "قالب" کے بھی کوئی معنی ہیں؟ عربی میں "قالب" اور فارسی میں "کالبُد" بمعنی جسم ہے، اور اس شے کو بھی کہتے ہیں جس کو ہندستانی میں "سانچا" کہتے ہیں۔ یہ "کالب" کہاں کا لغت ہے؟ "کالبد" کا مخفف ہو تو ہو۔ مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ایسا ہی تھا تو تخفیفِ "کالبد" کی طرف اشارہ کرنا چاہیے تھا۔ یہاں پہنچ کر اور "کالب بروزن وبمعنی قالب" دیکھ کر میں نے (برھان قاطع کے) صفحات پلٹے اور "قاف مع الالف" کی فصل دیکھی۔ وہاں "قالب" کا نشان بھی نہ ملا۔ اگر دکنی اس لغت سے واقف تھا تو یہاں پر اسے درج کیوں نہیں کیا؟ اور اگر ناواقف تھا تو "کالب" کی شرح میں اس سے کام کہاں سے لے لیا؟ دراصل چونکہ ہر ملک کے جاہل گنوار قاف کو کاف اور شین کو سین بولتے ہیں اور غالباً دکن میں بھی یہی لہجہ رائج ہے، لہٰذا اس نے بھی قوم کی پیروی کی اور "کالب" ہی کو صحیح تلفظ اور اصل لغت سمجھا۔

برھان قاطع۔ "مدہوش": بروزن سرپوش۔ سرگشتہ وحیران کو کہتے ہیں۔ عربی میں "صاحب دہشت"۔

قاطع برھان۔ میں جانتا ہوں کہ دکنی عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کا گھر اجاڑنے والا ہے۔ حقیقت کسی لفظ کی نہیں جانتا مگر ہر لفظ کے بارے میں بولنا ضرور ہے۔ یہاں اس کے اندازِ تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ "مدہوش" واوِ مجہول کے ساتھ فارسی میں اس کے معنی سرگشتہ اور عربی میں صاحب دہشت ہیں۔ خدائے عادل کی قسم ایسا نہیں ہے۔ "مدہوش" عربی الاصل لغت اور "دہشت" کا مفعول ہے۔ اور عربی میں کوئی صیغۂ مفعول واوِ مجہول کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اہل ایران تصرف کر کے (مدہوش کو) واوِ مجہول کے ساتھ اور مست و بے خود کے مرادف کے طور پر استعمال کرنے لگے ہیں۔ ورنہ یہ لغت نہ تو بروزن سرپوش ہے نہ بمعنی سرگشتہ وحیران۔ "دہشت" کے مفعول کو "صاحب دہشت" کہنا نسبت بعید ہے۔ (صاحب برہان نے) یہ کیوں نہ کہا کہ مدہوش دہشت کا مفعول ہے۔ میں خود کہتا ہوں کہ کیوں نہ کہا اور خود ہی ہنستا ہوں کہ جب جانتا ہی نہ تھا تو کیوں کہتا؟

برھان قاطع۔ "مہلنَد": بروزن فرزند۔ تیغ وشمشیر ہندی کو کہتے ہیں۔

قاطع برھان۔ لغت تو لکھ دیا لیکن یہ توضیح نہیں کی کہ آخر تیغ ہندی کو کس زبان میں "مہلند" کہتے ہیں۔ تیغ ہندی تو سروہی ہے لیکن اسے نہ ہندی میں "مہلند" کہتے ہیں نہ فارسی میں، نہ عربی میں نہ ترکی میں۔ اور ایسے لغات اس کتاب میں بہت ہیں۔

برھان قاطع۔ "نعنا" پودنے کی ایک قسم ہوتی ہے۔ اصل عربی لفظ "نعناع" ہے۔ اہل ایران آخر کے ع کو حذف کر کے "نعنا" بولتے ہیں۔

قاطع برھان۔ پہلے اصل لغت لکھنا چاہیے تھا، پھر بتاتا کہ ایرانیوں نے آخر کے ع کو حذف کر دیا ہے، حالانکہ ایرانیوں نے حذف نہیں کیا۔ اس کج فہم تاریک خیال کو جہاں کہیں کوئی شگوفہ ملا ہے اس نے اس کی گفتگو پر کان لگائے ہیں۔ چونکہ اس لغت ("نعناع") میں آخر کا ع تلفظ میں ٹھیک سے نہیں آتا، اور اس معاملے میں ایرانیوں اور ہندستانیوں کا حال یکساں ہے، لہٰذا اس نے اپنے قیاس سے آخر کے عین کو محذوف قرار دے دیا ہے۔ دوسرا لطیفہ یہ کہ "نعنا" کو "پودنے کی ایک قسم بتاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ "پودنہ" تو ایک مشہور سبزے کا نام ہے اور جس نبات کی عربی "نعناع" ہے اسے "پودینہ" کہتے ہیں۔ گویا "نعناع" کا عین دکنی کے خیال میں ایرانیوں نے حذف کر دیا اور "پودینہ" کی ی خود اس نے حذف کر دی۔ سبحان اللہ! …

تنبیہ: لفظ "نواں" کی شرح دیکھنے سے پتا چلا کہ دکنی کی سرشت میں ہذیان کا جتنا مادہ موجود تھا اس میں سے آدھا تو پوری کتاب میں صرف ہوا اور آدھا اس لفظ کی شرح میں کام آیا ہے۔ خدا را! پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے تاکہ میری کوشش رائگاں نہ جائے۔ لکھتا ہے:

"نواں" : بروزن رواں، بمعنی خراماں، جنباں، حرکت کناں، لرزاں نالاں، زاری کناں، فریاد زناں، نالندہ، جنبندہ، نالیدن، جنبیدن، کوز، خم شدہ، خمیدہ، دوتا گردیدہ، کہنہ، لاغر، ضعیف، آگاہ، ہوشیار، آگاہی نہیا۔

ان بائیس معنوں میں سے "خراماں"، جنباں" "حرکت کناں" "جنبندہ" یہ چاروں ایک دوسرے کے مرادف ہیں۔ "نالاں"، "زاری کناں" "فریاد زناں" اور "نالندہ" یہ چاروں بھی ہم معنی ہیں۔ "کوز" "خم شدہ" "خمیدہ" اور "دوتا گردیدہ" یہ ان آٹھ سے الگ لیکن خود چاروں ہم معنی ہیں۔ آگے بڑھیے اور دیکھیے کہ "نالیدن" اور "جنبیدن" کو بھی ٹھونسے دے رہا ہے۔ کیا مصدر[1] اور فاعل[2] دونوں ایک ہی معنی دیتے ہیں؟ یہی حال "آگاہ" اور "ہوشیار" اور "آگاہی" اور "ہوشیاری" کا ہے۔ عیاذاً باللہ ولاحول ولاقوۃ الّا باللہ! میں کہتا ہوں کہ مصدر سے فاعل اور فاعل سے مصدر کے معنی تو کوئی بھی لینا قبول نہ کرے گا۔ اس میں بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ "نالاں"، "خمیدہ"، "کہنہ"، "لاغر"، "آگاہ" اور "ہوشیار" ان چھ معنوں کو لفظ "نواں" کے ساتھ نہ تو رستی سے باندھا جا سکتا ہے نہ سوئی سے ٹانکا جا سکتا ہے۔ "نواں" کے معنی ہیں خراماں، لیکن ناز و انداز کے ساتھ خراماں جیسے درختوں کی شاخیں ہوا سے ہلتی ہیں۔ چونکہ اس حالت کو عربی میں "تمائل" کہتے ہیں اس لیے اگر (" نواں" کا مطلب) لرزہ بھی کہا جائے تو ٹھیک ہوگا، خواہ یہ لرزہ تمائل کا ترجمہ ہو خواہ خوف و غضب کا نتیجہ۔

برہان قاطع۔ "نوجوان" : ایسے لڑکے کو کہتے ہیں جس کا ابھی خط مو دار نہ ہوا ہو۔

قاطع برہان۔ دکنی پر ہزار آفریں! ایسا لغت لایا ہے کہ اگر اسے نہ لکھتا تو کسی کو معلوم ہی نہ ہو پاتا کہ "نوجوان" کسے کہتے ہیں! لیکن اس کے اعراب لکھنا اور اس کا ہم وزن لفظ بتانا کیوں ٹال گیا؟ ایسے نامانوس لفظ کا تلفظ نہ بتانا تو ستم ہے!

تنبیہہ۔ "نیام" کو غلاف شمشیر بتانے کے بعد لکھتا ہے کہ "عموماً ہر چیز کے وسط کو نیام کہتے ہیں"۔ اور کہتا ہے کہ "تعویذ" کے معنی میں بھی نظر سے گزرا ہے"۔ جو شخص "ہر چیز کے وسط" کو "نیام" کہے وہ زمرۂ بنی آدم سے خارج ہے۔ البتہ لفظ "میان" اسی لفظ "نیام" کی تقلیب[3] ہے اور وسط کے معنی بھی دیتا ہے۔ یعنی "میان" کے معنیِ حقیقی ہیں وسط، اور تقلیب "نیام" کے طور پر "میان" لفظ اتفاقی ہے۔ صاحب برہانِ قاطع نے "میان" کے معنی حقیقی (وسط) کو "نیام" پر بھی چسپاں کر دیا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو میں پوچھتا کہ "کران" کی تقلیب ہے "کنار"[4] اور "کنار" کے معنی حقیقی ہیں آغوش، تو کیا آغوش کے معنی لفظ "کران" سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں؟ اب رہا "نیام" بمعنی تعویذ، یہ تصحیف[5] ہے۔ اصل لفظ "بنام" ہے جس کے مجازی[6] معنی تعویذ کے ہیں۔

تنبیہہ: "ہزار داستان" بمعنی بلبل اور دوسری جگہ "ہزار دستان" بھی اسی معنی میں لکھا ہے، اور اس طرح دوسروں کو گمراہ اور خود کو رسوا کیا ہے۔ بلبل کو "ہزار" کہتے ہیں اور "ہزار دستاں" اور "ہزار آوا"[7] بھی کہتے ہیں۔ "ہزار داستان" بازاریوں، جاہلوں اور بچوں کے سوا کوئی نہیں کہتا۔ "دستاں" کے معنی ہیں سریلی آواز اور "داستان" کے معنی افسانہ۔ بلبل محض آواز نکالتی ہے نہ کہ افسانہ سناتی ہے ظاہر ہے کہ بلبل "ہزار دستاں" ہے، "ہزار داستان" نہیں۔

کیا کہنے دکنی کے! پہلے "ہزار آوا" لکھا جس میں "ہزار" کے بعد الف ہے اور الف کے بعد واو، پھر "ہزار داستان" لکھا جس میں "ہزار" کے بعد دال ہے اور دال کے بعد الف، پھر "ہزار دستاں" لکھا جس میں "ہزار" کے بعد دال ہے اور دال کے بعد سین یعنی وہ حروف تہجی کی تقدیم و تاخیر میں غلطی نہیں کرتا۔ خواہ لغت غلط ہو مگر اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ جو کچھ اس نے بچپن میں پڑھا تھا اسے جوانی میں بھولا نہیں اور الف بے تے کو بخوبی یاد رکھا۔

(منشی پر اصل کتاب "قاطع برہان" ایک طرح سے ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اس

---

[1] مثلاً مصدر "نالیدن" (فریاد کرنا) اور اس کا فاعل "نالندہ" (فریاد کرنے والا) [3] کسی لفظ کے حرفوں کی ترتیب بدل دینا جس کی مثالیں "دریوزہ" اور "دروزیہ"، "درویش" اور "دریوش" وغیرہ ہیں۔ [4] غالب کے اصل فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "چونکہ کران اور کنار بھی ایک دوسرے کی تقلیب ہیں"۔ لیکن سیاق بحث کی مناسبت اور غالب کے اعتراض کو زیادہ واضح کرنے کی غرض سے اس کا ترجمہ ذرا تغیر کے ساتھ کیا گیا ہے (زبیر مسعود) [5] "تصحیف": غلط نویسی نقطوں کی ترتیب کے فرق یا کمی بیشی سے کسی لفظ کو بدل دینا مثلاً "خیبر" کو "خیبر"۔ پرانی تحریروں میں نقطوں کا استعمال بے احتیاطی سے ہوتا تھا اس لیے ان میں تصحیف کا امکان زیادہ رہتا تھا۔ [6] "بنام" وہ کپڑا جو پارسی اپنی مذہبی کتابوں کی تلاوت کے وقت منہ پر باندھتے ہیں (بحوالہ امین الدین: "قاطع القاطع") [7] "آوا": آواز کا مخفف۔

کے بعد" برہان قاطع" پر اعتراضات نہیں ہیں۔ اس بقیہ حصے میں فارسی کے متفرق ادبی اور لسانی مباحث ہیں۔ یہ مباحث مختلف فصلوں میں تقسیم ہیں اور ہر فصل کو غالب نے" فائدہ" کا نام دیا ہے۔ ذیل میں چند مباحث کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے)

اب جو باتیں میں نے اپنے نجستہ استاد (ہرمزد عبدالصمد) سے سُنی ہیں اور جن نکات تک اپنی عقل خداداد کی قوت سے پہنچا ہوں انھیں قید تحریر میں لاتا ہوں اور جو کوئی نئی فصل سامنے آئے گی اس کا عنوان" فائدہ" قرار دوں گا۔ مبدء فیاض سے امید رکھتا ہوں کہ ہر فائدہ اسم با مسمیٰ ہوگا۔

فائدہ: برسات کی ایک رات سراج (الدین) علی خان آرزو کے ذہن میں ایک مصرع موزوں ہوا۔ مصرع نہیں بلکہ نشتر، نشتر بھی نہیں بلکہ سنانِ آبدار

میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

حق یہ ہے کہ اگر اس مصرعے کو فغانی یا نظیری کا زمزمہ کہہ دیا جائے تو کون ہے جو یقین نہ کرے گا۔ خیر (خان آرزو نے اس مصرعے کا) پیش مصرع بہم پہنچایا اور اسی تاریک رات اور بادو باراں کے عالم میں میرزا مظہر جانجاناں کے پاس پہنچے، شعر سنایا، داد پائی اور گھر واپس آگئے۔ دو تین دن بعد جب یہ مطلع شہر میں مشہور ہو چکا تھا، ایک دن اتفاقاً کسی محفل میں خان آرزو کی ملاقات ایک ایرانی سوداگر سے ہوگئی جو حال ہی میں شیراز سے آیا تھا اور خان آرزو کا واقف کار تھا۔ (خان آرزو نے اس سے کہا):

"آغا! میں نے ایک مطلع کہا ہے جو سننے کے قابل ہے۔"

غالباً میرزا (ایرانی) بھی یہ مطلع سن چکا تھا اور اسے یاد رکھے ہوئے تھا۔ اس نے کہا:

"براہ مہربانی سنائیے۔"

خانِ سادہ دل نے بہت شد و مد کے ساتھ پڑھا:

"تند و پر شور و سیہ مست ز کہسار آمد"

میرزا نے یہ سنتے ہی ایک قہقہہ لگایا اور کہا:

"میں سمجھ گیا کہ جناب دوسرے مصرعے میں کیا فرمائیں گے۔"

خان آرزو بھونچکا رہ گئے کہ شعر اس طرح تو نہیں سنا جاتا ہے جھنجھلا کر بولے:

"بھلا کیا کہوں گا؟"

میرزا بولا:

"آپ فرمائیں گے کہ ریچھ آیا!"

خان نے زہر خند کے ساتھ مصرع ثانی پڑھا:

"میکشاں مژدہ کہ آمد و بسیار آمد"

میرزا نے اس مصرعے سے لطف لیا۔ تعریف کی اور کہا:

"پیش مصرع بہت نازیبا ہے۔ اگر اس طرح ہوتا تو بہتر تھا:

"قطرہ افشاں بسوئے شہر ز کہسار آمد"

حالانکہ یہ میرزائے شیرازی خود شاعر نہیں تھا اور اس کو فن شاعری سے کوئی سروکار نہ تھا مگر کیا کہنا لطافت طبع کا کہ تندی، پر شوری اور سیہ مستی کو جو ریچھ اور ابر میں مشترک ہے اس نے پسند نہیں کیا اور فی البدیہہ ایسا مصرع کہہ دیا جو استاد کے مصرعے سے ہر طرح بہتر اور لطیف تر ہے۔

فائدہ: ہندستان کے فارسی داں" بالا" اور" والا" کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔ چونکہ فارسی کے بہت سے الفاظ میں ب کو واو سے اور واو کو ب سے بدل دیا جاتا ہے[1] اس لیے ایک طبقے کا خیال ہے کہ" والا" اور" بالا" بھی دراصل ایک ہی لفظ ہے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں بلکہ یہ دونوں الگ الگ الفاظ ہیں۔" بالا" قد کو بھی کہتے ہیں اور بلند کو بھی، اور یہ لفظ بلندی کی مقدار کو بھی ظاہر کرتا ہے جیسے" نیزہ بالا" یا" بیل بالا"۔ لفظ" والا" میں بھی بلندی کے معنی ملحوظ رہتے ہیں لیکن خدمت، رتبہ، شان، آستان، جاہ، نگاہ (وغیرہ) کی تعریف کے لیے" والا" کا لفظ لاتے ہیں نہ کہ در و دیوار یا سرو چنار کے لیے۔ ہند کے فارسی داں خیال کریں گے کہ" آستان" بھی تو عالم در و دیوار ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب" والا آستان" لکھا جاتا ہے تو" آستان" سے پایہ اور مقام مراد ہوتا ہے نہ کہ وہ دہلیز یا سنگ در جس پر آتے جاتے پیر یا جوتے رکھتے ہیں۔

فائدہ: زبان دری[2] اور زبان سنسکرت میں توافق کی اتنی مثالیں ہیں کہ شمار میں نہیں آسکتیں۔ جو میرے حافظے میں موجود ہیں وہ لکھتا ہوں:-

۱۔" مہ" فارسی میں بڑے کو کہتے ہیں۔ اہل ہند میم کو مفتوح کرکے اور آخر میں الف

(بقیہ صفحہ پر)

---

[1] مثلاً نوشتن، بشتن؛ شوروا، شوربا؛ بادبان، وادیان؛ بازگون، وازگون؛ دو تریدن، بزیدن؛ دیرانہ، ویرانہ۔ [2] "دری": پہلوی زبان کے بعد کی ایرانی زبان جو ساسانی عہد میں رائج تھی۔ اسی زبان نے کچھ تغیر کے ساتھ موجودہ فارسی کی شکل اختیار کرلی۔

غزل مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب

م۔ ندیم

پرانے رسائل اور اخبارات کے مطالعے کے دوران غالب کی ایک غزل[1] اُردو اخبار دہلی میں نظر سے گزری، جو اُن کے کسی دیوان میں اب تک شامل نہیں کی گئی ہے۔ اُردو اخبار کے اسی شمارے میں غالب کی اور بھی غزلیں شائع ہوئی ہیں، جو اُن کے دیوان میں بھی موجود ہیں۔ اس سے یہ شک رفع ہو جاتا ہے کہ یہ غزل کسی دوسرے غالب کی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ غزل مرزا کے رنگ سے ہٹ کر ہے۔

آگے بڑھتا ہوں تو پیچھے وہ ہٹے جاتے ہیں
کثرتِ بوسہ سے اب ہونٹ پھٹے جاتے ہیں

دن تو گرمی کے بڑے ہیں مگر اب روز بروز　　میری راتوں کی درازی سے گھٹے جاتے ہیں
جتنے غم خلق ہوئے تھے وہ مجھے کیوں نہ ملے　　میرا گھاٹا ہے کہ اوروں پہ بٹے جاتے ہیں
فائدہ تیزیٔ پرواز نے کیا مجھ کو دیا　　کہ اس سے تو پرِ پرواز کٹے جاتے ہیں

جنسِ دل بوسے کی اقساط پہ پہنچے غالب
پوچھتا کیا ہے اگر دام بٹے جاتے ہیں

★

[1] مطبوعہ اُردو اخبار دہلی صفحہ ۱۲، نمبر ۱۴، جلد ۲، یکم اپریل ۱۸۴۰ء مطابق ۱۰ محرم الحرام ۱۲۵۶ھ، مطبع بدرالدجیٰ، دہلی، کوچہ نشوال گذر چاندنی چوک، متصل عجائب خانہ، باہتمام خواجہ قمرالدین خاں طبع شد۔ (ندیم)

دیوانِ غالب کا ایک اہم گم شدہ مخطوطہ
نسخۂ بھوپال

ڈاکٹر ابو محمد سحر

غالبؔ کے اردو دیوان کا سب سے قدیم معلوم قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) جو نسخۂ بھوپال کہلاتا ہے، بھوپال میں ۱۹۱۸ء میں دستیاب ہوا تھا۔ چونکہ اس میں غالبؔ کا وہ ابتدائی اردو کلام موجود تھا جس کو انھوں نے اپنے منتخب اور متداول دیوان سے خارج کر دیا تھا، اس لئے اس کے دریافت ہوتے ہی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اس کو متداول دیوان غالبؔ کے اشتراک کے ساتھ ایک خاص ترتیب سے شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن ابھی اس جدید دیوان غالب کی کتابت شروع ہوئی تھی کہ ۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو بھوپال میں اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اس کام کو مفتی محمد انوار الحق، ڈائرکٹر تعلیمات، بھوپال نے اپنے ذمہ لیا اور ان کی ترتیب و تدوین سے ۱۹۲۱ء میں نسخۂ بھوپال، متداول دیوان اور غالبؔ کے کچھ اور مطبوعہ کلام کا وہ مجموعہ شائع ہوا جو دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ کے نام سے مشہور ہے۔

نسخۂ بھوپال کو محفوظ رکھنے کا فخر کتب خانۂ حمیدیہ، بھوپال کو حاصل تھا لیکن افسوس ہے کہ یہی کتب خانہ ریاست بھوپال کے انضمام کے موقع پر یا اس سے کچھ قبل اس کی ملکیت سے محروم ہوگیا۔ ایک مدّت سے اس کا کہیں پتہ نہیں۔ اور اس کو دوبارہ دریافت کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ دیوان غالبؔ نسخۂ عرشی میں اس کا ذکر دیکھ کر راقم الحروف نے مولانا امتیاز علی عرشی سے ایک خط میں اس کے متعلق استفسار کیا تھا جس کے جواب میں انھوں نے اپنے مکتوب گرامی مورخہ ۸ مارچ ۱۹۷۰ء میں رام پور سے تحریر فرمایا تھا۔

"میں نے نسخۂ حمیدیہ کی اصل (یعنی مخطوطۂ دیوان غالبؔ) حمیدیہ لائبریری میں دیکھا تھا۔ یہ واقعہ انجمن اجلاس ناگ پور سے واپسی میں پیش آیا تھا۔ سنہ خود مجھے بھی یاد نہیں رہا ورنہ ضرور عرض کرتا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ وہاں کی لائبریری سے غائب ہوگیا۔ نواب صاحب مرحوم سے میں نے ان کے ایک دوست کے ذریعے معلوم کرایا تھا تو انھوں نے اس نسخے کے اپنے پاس ہونے سے انکار کر دیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ خود میرا علم بھی یہی ہے کہ مرجر کی افراتفری میں کسی نے وہاں سے پار کر دیا۔ اب اللہ جانے کہ وہاں سے کہاں گیا۔ وہاں کے لائبریرین نے لکھا تھا کہ نواب صاحب نے منگا لیا تھا۔ اگر اس کا کہیں پتہ چل جائے تو مجھے ضرور مطلع فرمائیے گا۔ مجھے اس کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ اگر وہ مل جائے تو بہت سے الفاظ کی تعیین کر سکوں گا۔"

اس مخطوطہ کی گمشدگی کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی جا سکتی ہیں بلکہ کی گئی ہیں اور اگر یہ مخطوطہ تلف نہیں ہوگیا ہے تو اس طویل و عریض دنیا میں کسی فرد یا ادارے کے پاس سے کبھی نہ کبھی ضرور برآمد ہوگا لیکن فی الحال اس کی حیثیت ہم بے خودوں کے طاقِ نسیان کے ایک گلدستے سے زیادہ نہیں ہے۔

یوں تو نسخۂ حمیدیہ میں اس مخطوطے کی کیفیت اور کلام کے طبع ہو جانے کے بعد اس کی گمشدگی اردو دنیا کے لئے اتنا بڑا حادثہ نہیں رہی جتنا بڑا حادثہ اس کے بغیر ہو سکتی تھی، شاید اس کی گمشدگی کا سبب بھی یہی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے بعد اس کی حفاظت کا وہ خیال نہیں رکھا گیا جو اس مخطوطے کے لئے ضروری تھا لیکن نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب میں کئی حیثیتوں سے اتنی کوتاہیاں رہ گئیں کہ اب بھی اس مخطوطے کی عدم موجودگی محققینِ کلام غالبؔ کے لئے کچھ کم افسوسناک نہیں ہے تاہم اس سب

کی گم شدگی کی بنا پر یہ غلط فہمی کہ یہ مخطوطہ سرے سے ناپید تھا یا نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے پہلے ہی غائب ہو چکا تھا قطعاً بے بنیاد ہے۔ مفتی انوار الحق نے نسخۂ حمیدیہ کی تمہید میں تو اس کی چشم دید کیفیت بیان ہی کی ہے لیکن ان کے علاوہ کچھ اور اہلِ قلم نے بھی اس کا مشاہدہ و مطالعہ کیا تھا۔ اس مخطوطے کی عدم موجودگی میں ان کی تحریروں اور کام کا تذکرہ خاص اہمیت رکھتا ہے مثلاً اس مخطوطے کے دریافت ہوتے ہی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی زندگی میں سید ہاشمی نے اسے خصوصی طور پر بھوپال آکر دیکھا تھا جس کا بیان انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"اس نایاب کلام کے مل جانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو نہایت خوشی ہوئی اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے خاکسار نے بھوپال جاکر اس قلمی نسخے کی زیارت کی جو ۱۲۳۷ھ میں (جبکہ مرزا غالب کی عمر صرف پچیس برس کی تھی) تحریر کیا گیا تھا۔ لوح اور خاتمۂ کتاب کی عبارت نیز اشعار پر ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ مرزا غالب مرحوم ہی کا کلام ہے اور چونکہ بالکل ابتدائی زمانے میں نقل کرایا گیا تھا لہٰذا گو بعد کی غزلیں اس نسخے میں نہیں درج ہوئیں تاہم وہ ابتدائی کلام تمام و کمال محفوظ رہ گیا جسے مرزا نے دیوان چھپواتے وقت خارج اور تلف کر دیا تھا۔"[1]

ڈاکٹر عبداللطیف نے دیوانِ غالب کی تاریخ وار ترتیب میں اس قلمی نسخے سے پوری مدد لی تھی۔ سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے ان کی ضرورت کے مطابق ڈاکٹر ولی محمد، معتمد ریاست بھوپال، کو ایک خط لکھا تھا اور اس کے ساتھ نسخۂ حمیدیہ کی ایک جلد بھی اس غرض سے بھیجی تھی کہ نسخۂ حمیدیہ کے جو اشعار نسخۂ بھوپال کے حاشیے سے لیے گئے تھے ان پر نشان لگا دیے جائیں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر ولی محمد نے اصل مخطوطہ ڈاکٹر عبداللطیف کو روانہ کر دیا تھا۔[2] ڈاکٹر عبداللطیف نے اپنی کتاب غالب کے دیباچے میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"آخر میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ باب سوم کی تیاری میں جو غزلیات غالب کی تاریخی ترتیب سے بحث کرتا ہے، میں نے دیوانِ غالب کے اس نسخے سے بہت مدد حاصل کی جو ۱۲۳۷ھ، سنہ ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ سرکار بھوپال نے ازراہ فیاضی مجھے یہ نسخہ مستعار عنایت فرمایا تھا میں اس موقع پر سرکار موصوف کا سپاس گزار ہوں۔ نواب سر حیدر نواز جنگ، بہادر کا دلی شکریہ یعنی مجھ پر فرض ہے جن کے حسن توسط سے مجھے یہ نسخہ حیدرآباد میں دستیاب ہوا۔"[3]

اس اقتباس کے پہلے جملے کے اختتام پر حاشیے میں یہ نوٹ دیا ہے:

"یہ نسخہ دیوانِ غالب کی تاریخ وار تدوین میں میرے لئے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ دیوان مذکور اس وقت زیر طبع ہے اور عنقریب شائع ہو جائے گا۔"[4]

چونکہ یہ دیباچہ ۱۹۲۸ء میں لکھا گیا ہے اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف کا مرتبہ دیوانِ غالب ۱۹۲۸ء میں زیر طبع تھا لیکن یہ دیوان شائع نہیں ہوا۔ اس کا صرف ایک حصہ (صفحہ ۱ سے صفحہ ۱۲۶ تک) جو ڈاکٹر عبداللطیف کی تحقیق کے مطابق ۱۲۲۵ھ سے ۱۲۳۷ھ تک کے کلام پر مشتمل ہے، سید تمکین کاظمی کے توسط سے ۱۹۳۵ء میں مولانا امتیاز علی عرشی کو دستیاب ہوا تھا۔[5]

ڈاکٹر عبداللطیف نے اصل کتاب میں بھی کئی جگہ نسخۂ بھوپال کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"نسخۂ حمیدیہ کے مرتب اس بات کے مدعی ہیں کہ یہ نسخہ کئی مرتبہ دہلی بھیجا گیا تھا تاکہ ۱۸۲۱ء کے بعد کا کلام اس میں شامل ہوتا رہے اور ایسے تمام اضافہ شدہ اشعار قلمی نسخے کے حاشیے پر موجود ہیں۔ جو صاحب اصل مسودے پر کام کرنا چاہیں انھیں ان بیانات کی تصدیق ذاتی نقد و نظر سے کرنی ہوگی جیسا کہ راقم الحروف کو کرنا پڑا۔ اس کا اندازہ تاریخ وار دیوانِ غالب کے ضمیمہ ۱ کے ملاحظے سے ہو سکتا ہے۔ اصل نسخے پر کئی جگہ فوجدار محمد غوث خاں کی مہر (۱۲۴۲ھ

---

[1] تبصرہ نسخۂ حمیدیہ از سید ہاشمی، اردو سہ ماہی، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۴۰۴۔ [2] ضمیمہ نمبر ۱، غالب از ڈاکٹر عبداللطیف، مترجمہ سید معین الدین قریشی، مطبوعہ جہانگیر بک ڈپو، دہلی، ص ۱۴۵، ۱۴۶۔ [3][4] ص ۷، ۸، ماخذ میں ہجری سنہ ۱۲۳۷ کے بجائے ۱۳۲۷ درج ہے۔ [5] دیباچۂ نسخۂ عرشی ص ۱۱۴۔ ماخذ میں ڈاکٹر عبداللطیف کے دیوان کے مذکورہ صفحات کا پہلا نمبر ۱ کے بجائے ۱۱ چھپ گیا ہے لیکن پوری عبارت سے اس صفحے کا نمبر ۱ ہی متعین ہوتا

۸ را سمبر ۱۸۳۲ء) لگی ہوئی ہے۔ اسی نام کی ایک ایک مہر جو ذرا بڑی ہے (۴.۵ سمر x ۵ر۳ سمر) اول و آخر ان سادہ صفحات پر موجود ہے، جو اصل نسخے کے کاغذ سے قسم میں مختلف ہیں اور جو بعد کے لگائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اس مہر میں ۱۲۰۱ھ (۴۴-۱۸۰۰) لکھا ہوا ہے۔ لیکن ان دلائل کی بنا پر جو متذکرہ ضمیمہ ۱ میں بیان کئے گئے ہیں، یہ سنہ نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

اب ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس نسخے میں ۱۸۳۲ء تک کا کلام موجود ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ اس زمانے کے سارے کلام پر حاوی ہو۔[۱]

ڈاکٹر عبداللطیف نے صاحب مہر کا نام سہواً فوجدار محمد خاں کے بجائے فوجدار محمد غوث خاں لکھا ہے۔ غوث محمد خاں فوجدار محمد خاں کے باپ کا نام تھا۔ یہ فیصلہ کرنے میں بھی کہ اس نسخے میں ۱۸۳۲ء (۴۸-۱۲۴۷ھ) تک کا کلام موجود تھا ان سے اس بنا پر سہو ہوا ہے کہ انھیں نسخۂ شیرانی (تاریخ کتابت تقریباً ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء) کا علم نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے مہروں کے ناپ اور نسخۂ بھوپال کی ابتدا اور آخر کے صفحات کے کاغذ کے فرق کے متعلق جو اطلاع دی ہے وہ کسی اور تحریر میں نہیں ملتی۔

ڈاکٹر عبداللطیف نے نسخۂ بھوپال پر مسلم ریویو، کلکتہ بابت ۱۹۲۹ء میں انگریزی میں ایک مضمون بھی لکھا تھا جس کا اردو ترجمہ سید محمد صاحب نے مجلہ مکتبۂ حیدرآباد کی جلد ۲ شمارہ ۹ میں شائع کیا تھا۔[۲] ان کا مرتب کیا ہوا تاریخ وار دیوانِ غالب اگر شائع ہوگیا ہوتا تو نسخۂ بھوپال کے تحقیقی مطالعے کا ایک قابلِ قدر نمونہ منظر عام پر آجاتا لیکن بدقسمتی سے اس اہم دیوانِ غالب کی قسمت میں ادھورا رہنا لکھا تھا۔ ایسی صورت میں یہ بھی غنیمت ہوا کہ مولانا امتیاز علی عرشی کو اس کا ایک حصہ مل گیا اور اس میں ڈاکٹر عبداللطیف نے نسخۂ بھوپال کے مطالعے کے جو نتائج پیش کئے تھے ان کو دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کے حواشی اختلاف نسخ میں جگہ مل گئی۔

نسخۂ بھوپال کے مشاہدے اور مطالعے سب سے زیادہ صحیح اور بصیرت افروز نتائج آج جس کتاب میں موجود ہیں وہ دیوانِ غالب اردو نسخۂ عرشی ہے، حالانکہ اس دیوان کی ترتیب میں مولانا امتیاز علی عرشی نے نسخۂ بھوپال کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی ان کے جیسے بلند پایہ محقق کو دیوانِ غالب کی تاریخ وار ترتیب میں دینا چاہیے تھی، کیونکہ انھوں نے ڈاکٹر عبداللطیف کی طرح نہ اس کو عاریتہً حاصل کرنے کی کوشش کی اور نہ اس کی نقل فراہم کی۔ بھوپال آکر انھوں نے اس کا مطالعہ بھی بڑی عجلت اور بے اطمینانی میں کیا۔ پھر بھی انھوں نے اس کے مشاہدے اور نسخۂ حمیدیہ سے اس کے مقابلے کی جو کیفیت نسخۂ عرشی میں محفوظ کر دی ہے وہ اس گم شدہ مخطوطے کی تخئیلی بازیافت اور نسخۂ حمیدیہ کی تصحیح کے لئے آج ہمارا سب سے بڑا سہارا ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی نے اس مخطوطے کو انجمن ترقی اردو کے ناگپور اجلاس سے واپسی میں ملاحظہ فرمایا تھا۔ موصوف لکھتے ہیں۔

> دیوان غالب کے نسخوں میں سب سے پرانا اور اہم مخطوطہ یہی ہے میں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے اجلاس ناگ پور سے واپسی میں خاص اس نسخے کو دیکھنے کے لئے بھوپال میں دو دن قیام کیا تھا۔ اس مختصر مدت میں اس گوہر بے بہا کی حالت بھی دیکھی اور اصل سے مطبوعہ نقل کا مقابلہ بھی کیا۔[۳]

جیسا کہ عرشی صاحب نے راقم الحروف کے نام اس گرامی نامے میں لکھا ہے جس کا اقتباس پہلے پیش کیا جا چکا ہے، ان کو اس واقعے کی تاریخ یاد نہیں رہی۔ لیکن یہ واقعہ جنوری ۱۹۴۴ء کا ہے کیونکہ انجمن ترقی اردو کا ناگ پور اجلاس اسی زمانے میں منعقد ہوا تھا۔[۴] اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ مخطوطہ جنوری ۱۹۴۴ء تک حمیدیہ لائبریری، بھوپال میں موجود تھا۔

عرشی صاحب نے اس مخطوطے کی جو چشم دید حالت قلمبند کی ہے وہ مفتی انوار الحق مرتب نسخۂ حمیدیہ کے اسی قسم کے بیان سے زیادہ مفصل بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ اس لئے اس کا کچھ حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

> "اس مخطوطے کا ناپ ۲۲ x ۲۹ ۸ اور کاغذ عمدہ کشمیری ہے۔ جدولیں رنگین اور طلائی اور باریک لاجوردی ہے، روشنائی سیاہ اور عنوانات شنجرفی ہیں۔

---

[۱] غالب از ڈاکٹر عبداللطیف ص ۲۶۔ [۲] غالب از ڈاکٹر عبداللطیف، حاشیہ ص ۲۵۔ [۳] نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۵،
[۴] ہماری زبان ۱۵ جنوری ۱۹۴۴ء

شروع میں فوجدار محمد خاں بہادر[۱] کی مہر ہے جس میں سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) منقوش ہے۔ ابتدائی سادہ اوراق میں پہلے دو ورقوں پر وہ فارسی غیر منقوط خط نقل کیا گیا ہے جو مرزا صاحب نے مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم کو لکھا تھا[۲]۔ ان دونوں ورقوں کے بعد دو اور انگریزی کاغذ کے ورق ہیں جن میں سے پہلے کے رخ ب میں شمسے کے اندر لکھا ہے:

"دیوان ہذا من تصنیف میرزا نوشاہ دہلوی المتخلص

اسد، از کتب خانۂ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ

میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہ قلمی، خوشخط"

دوسرے ورق کے رخ الف میں شمسے کے اندر فوجدار محمد خان کی بڑی مہر ہے جس میں بخط طغرا "فوجدار محمد خاں بہادر" منقوش ہے۔ اس مہر کا سنہ ۱۲۶۱ھ ہے۔ اصل دیوان کے ورق ۱ الف پر انھیں صاحب کی دو چھوٹی مہریں ثبت ہیں جن میں سنہ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) منقوش ہے۔ یہ مہر کتاب کے اندر بھی کئی جگہ نظر آتی ہے۔

دیوان کا آغاز رنگین اور طلائی لوح کے تحت ہوا ہے اور شروع میں قصائد درج ہیں۔ سب سے پہلا قصیدہ فارسی کا ہے جس کا آغاز ہے۔ بہر ترویج جناب والیِ یوم الحساب۔ یہ قصیدہ ورق ۴ الف پر ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ۴ الف کی آخری سطر سے "قصیدۂ حیدری بہ تمہید بہار منفرت" شروع ہوا ہے جس کا آغاز ہے، ع

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار

اس کا انجام ورق ۹ ب کی سطر ۲ پر ہوا ہے۔ اس کے بعد "ایضاً فی المنقبت" کے عنوان سے دوسرا اردو قصیدہ ملتا ہے جس کا آغاز ہے: ع

توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روئے زمیں

یہ قصیدہ ورق ۹ ب کی سطر ۳ سے شروع ہو کر ورق ۱۱ ب پر ختم ہوا ہے۔ اس کے بعد اسی عنوان سے تیسرا قصیدہ شروع ہوتا ہے جس کا آغاز ہے

ع جو نہ نقدِ داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی

یہ ورق ۱۱ ب کی سطر ۲ سے شروع ہو کر ورق ۱۴ الف پر تمام ہوتا ہے۔

ورق ۱۵ ب سے دوسری رنگین اور طلائی لوح کے تحت غزلیں شروع ہوئی ہیں۔ اس پورے حصے میں دو غزلوں کے درمیان ایک سطر سادہ چھوڑ دی گئی ہے۔ ان سادہ جگہوں میں معمولی خطوں میں جو بظاہر خود غالب کا ہے جگہ جگہ "د" لکھا گیا ہے۔

آخر میں کاتب نسخہ نے شنجرفی روشنائی سے لکھا ہے:

"دیوان من تصنیف مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم، علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر سنہ ۱۲۳۷ھ من الہجرۃ النبویہ بصورت اتمام یافت"

. . . .

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبد العلی نام کے کسی صاحب ذوق کے مطالعے میں بھی رہ چکا ہے[۳]۔ انھوں نے کئی جگہ اپنی پسندیدگیِ اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔

. . . . ورق ۲۹ الف کے حاشیے میں پارے کے اندر لکھا ہے "محمد عبد الصمد مظہر" میرے لئے یہ صاحب بھی انجان ہیں[۴]۔

آخر میں عرشی صاحب نے اس مخطوطے کے بارے میں اپنے چند ضروری تحقیقی نتائج بھی پیش کئے ہیں:

"مفتی صاحب کی رائے میں یہ نسخہ لکھا تو گیا تھا فوجدار محمد خاں بہادر بھوپالی کے لئے[۵]۔ لیکن کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم

---

[۱] "موصوف الذکر نواب غوث محمد خاں بہادر کے بیٹے اور نواب سکندر جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے چھوٹے ماموں تھے۔ انھوں نے ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ (مئی ۱۸۶۵ء) میں انتقال کیا۔" (حاشیہ ماخذ) [۲] "کلیات نثر پنج آہنگ، ۶۲" (حاشیہ ماخذ) [۳] "خاندان ریاست رام پور کے ایک صاحب عبد العلی خاں ابن غلام محمد خاں بہادر تھے۔ یہ نواب عبد اللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ کے بھائی تھے اور صدر الصدور سے مرزا صاحب کے تعلقات ہمیں معلوم ہیں۔" (حاشیہ ماخذ) [۴] "نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۰۰، تا ۱۱" [۵] مفتی انوار الحق نے مخطوطے کی کتابت کے بارے میں اپنا خیال غالباً کے ساتھ ظاہر کیا ہے جس کا لحاظ اس پیرایۂ بیان میں نہیں رکھا گیا۔ (مرتب)

کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا اور ان کی نظر سے گزرا لیکن فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لئے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انھیں کے پاس رہا تھا۔ اس کے بعد عبدالعلی صاحب اور عبدالصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں بہادر کے کتاب خانے میں پہنچا۔ بھوپال پہنچنے کا زمانہ کیا تھا اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ۱۲۴۸ھ والی مہر بتاتی ہے کہ بہرحال اس سال کے بعد ہی اسے وہاں باریابی حاصل ہوئی ہوگی جو دیوانِ غالب کے متداول انتخاب کی تاریخ ترتیب و تالیف ہے"۔[1]

نسخۂ بھوپال کی تمام خصوصیات اس کے نسخۂ مصنف ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کا متن ۱۲۳۷ھ (۲۱-۱۸۲۱ء) میں غالب ہی کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے خود اور دوسروں کی مدد سے اس میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے کرکے اسے نسخۂ شیرانی کے مسودے کے طور پر استعمال کیا کیونکہ نسخۂ شیرانی کا متن جو تقریباً ۱۲۴۲ھ (۲۶-۱۸۲۶ء) میں تیار ہوا نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کے مطابق ہے۔ لیکن یہ کہنا محال ہے کہ اس کے بعد یہ ان کے پاس نہیں رہا یا عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں پہونچا۔ خود مولانا عرشی صاحب نے دوسرے موقعوں پر یہ نتائج نکالے ہیں کہ غالب نے نسخۂ بھوپال میں گلِ رعنا کے بعد تک ترمیمیں کی تھیں اور اس مخطوطے کو انھوں نے متداول دیوان کی ترتیب کے وقت بھی سامنے رکھا تھا۔[2] مولانا عرشی کی پیش کردہ معلومات کے مطابق اس مخطوطے میں عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر کے ناموں کے اندراجات کسی بھی زمانے کے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ دراصل یہ اندراجات بعد کے ہیں اور ان کا تعلق بھی بھوپال سے ہے۔ بھوپال کے عمائد ریاست میں عبدالعلی نام کے دو اصحاب گزرے ہیں۔ ایک عبدالعلی تونگر فرزند شیخ عبدالواحد سکین اکبرآبادی جن کا انتقال ۱۲۹۹ھ میں ہوا[3] اور دوسرے منشی سید عبدالعلی خاں خلف سید امجد علی رضوی جو ۱۳۰۶ھ میں بقید حیات تھے۔[4] مخطوطے پر انھیں دونوں میں سے کسی ایک نے اپنے دستخط کئے ہوں گے۔ عبدالصمد مظہر نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے ملٹری سکریٹری تھے۔[5] یہ بات بھی غیر واضح ہے کہ جب اس مخطوطے پر فوجدار محمد خاں کی ۱۲۴۸ھ کی مہر ثبت تھی تو عرشی صاحب نے اس کے بھوپال پہنچنے کی تاریخ اس سنہ کے بعد کیوں قرار دی ہے۔ ۱۲۴۸ھ کی مہر کی روشنی میں یقین سے بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مخطوطہ اسی سال نواب فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں داخل ہوا تھا۔ چونکہ یہ سال غالب کے متداول دیوان کی ترتیب کا سال ہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ انتخاب کے بعد ہی لیکن اسی سال یہاں سے کسی طرح الگ ہوا ہو۔

عرشی صاحب نے فوجدار محمد خاں کی ۱۲۶۱ھ والی مہر کے بارے میں کوئی رائے نہیں ظاہر کی۔ لیکن ڈاکٹر عبداللطیف کی صراحت کے پیش نظر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ مہر نواب فوجدار محمد خاں کے ذاتی کتب خانے کی باقاعدہ تشکیل یا تشکیل نو کے زمانے سے متعلق تھی۔

★

[1] دیوان غالب نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۸۰۔ [2] دیکھئے دیوان غالب نسخۂ عرشی، اختلاف نسخ، ص ۴۴۸، اور شرح غالب ص ۳۳۶
[3] آثار الشعرا مرتبہ حافظ سید محمد ممتاز علی حافظ، مطبوعہ ۱۳۰۹ھ، ص ۲۵، ۲۶۔ [4] ص ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲۔ [5] اختر اقبال یعنی حصۂ دوم گوہر اقبال مرتبہ نواب سلطان جہاں بیگم، مطبوعہ ۱۹۱۴ء ص ۲۰۱، ۲۴۳

رشک ـــ ظہوری اور غالب

مرزا جعفر حسین

عام طور سے لوگ رشک و حسد کے الفاظ ایک ساتھ بولتے اور اُن جذبات و کیفیات کو جن کا اظہار ان الفاظ کے ذریعے سے ہوتا ہے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً رشک اور حسد دو علٰحدہ علٰحدہ کیفیات ہیں جن کے محرکات بھی متضاد خواہشات ہوتے ہیں۔ ان دونوں جذبات کا حرکات و سکنات پر نظر کرتے ہوئے، بسا اوقات ایک ہی طرح سے اظہار ہوتا ہے لیکن اندرونی احساسات ہر حال میں مختلف ہی ہوتے ہیں۔ حسد بدباطنی کی پیداوار ہے لیکن رشک اپنے دامن میں محبت، خلوص اور پاکیزگی کی وسعتیں سمیٹ لیتا ہے۔ جذبۂ رشک اُس وقت اُبھرتا ہے جب محبت میں باشعور وارفتگی اور شیفتگی کروٹیں بدلنے لگتی ہے۔ منازل عشق جتنے جتنے بلند ہوتے جاتے ہیں اسی تناسب سے رشک میں بھی شدت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ عاشق خود اپنے سے رشک کرنے لگتا ہے اور بہ پکار اُٹھتا ہے کہ "ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے" اور اس طرح گوارا نہیں کرتے کہ "مرتے ہیں مگر اُس کی تمنا نہیں کرتے"۔ یہ کیفیت خود وارد کردہ نہیں ہوتی بلکہ دل کی گہرائیوں سے اُبھرتی ہے، لاکھوں مجبوریوں کو ساتھ لے کر اُبھرتی ہے کیونکہ عاشق پھر خود اپنے اوپر رشک کرنے لگتا ہے اور بے بسی میں ان جذبات کا عامل ہو جاتا ہے کہ "میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ منزل حسد کی نہیں ہو سکتی، رشک ہی کی ہے جس پر صرف ایسے شاعر فائز ہوتے ہیں جنھوں نے انسانی کردار کا عمیق مطالعہ کیا ہو اور جو دقیقہ سنج اور نکتہ رس ہوں۔ ایسے شعرا اپنے کلام میں حسد کا شائبہ بھی نہیں آنے دیتے اور اُن کے یہاں نشست الفاظ اور طرز ادا میں لطافت جھلکتی ہے۔

ہر شاعر عشق کا دم بھرتا ہے اس لیے کہ شاعری بغیر عشق و محبت کے بے معنی اور بے سود ہے۔ اور چونکہ عشق کے ساتھ جذبۂ رشک کا اُبھرنا فطری کیفیت ہے اس لیے ہر شاعر کے یہاں رشک سے متعلق خواہ وہ کتنے ہی پست کیوں نہ ہوں، اشعار ملتے ہیں لیکن اچھوتے اور نادر مضامین غیب ہی سے خیال میں آتے ہیں۔ اس لیے ہر شاعر کے یہاں مضامین رشک میں تنوع، بلندی اور لطافت کی رنگینیاں نہیں ملتی ہیں۔ واردات عشق کا بیان کرنے والا کوئی دوسرا اعظیم شاعر میر تقی میر کے برابر اردو زبان میں پیدا نہیں ہوا۔ میر کے کلام میں جو سوز و گداز، شورش و کیفیت اور سلاست و معنویت ملتی ہے اُس کی مثال اردو کی عشقیہ شاعری میں کہیں اور نہیں پائی جاتی۔ پھر بھی میر کے یہاں جذبۂ رشک ہر پہلو سے اُجاگر نہیں ہوا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رشک کے بلند ترین مدارج کا میر کے یہاں فقدان ہے جس کی غالباً یہ وجہ ہے کہ انھوں نے وادیٔ محبت میں آہ اور کراہ کے ساتھ قدم رکھا تھا۔ وہ لذت غم میں اتنا ڈوب گئے کہ وحدانیت کی طرف راغب ہونا اُن کے دل کو گوارا نہ ہوا اور قنوطیت اُن کی دقیقہ سنجی پر غالب رہی۔

اردو کے دوسرے شعرا نے بھی رشک سے متعلق مضامین کہے ہیں لیکن اول تو اُن کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہے دوسرے اُن سب کا رشک رسمی اور "غیر" "رقیب" اور "عدو" تک محدود ہے۔ ان قیود کی حدود سے اگر کچھ شعر باہر ملیں بھی تو اُن میں لطافتِ بیان اور حسن ادا کا شائبہ نہیں ملتا۔ فارسی شعرا کے کلام میں بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ اُن کے یہاں اردو شعرا کے مقابلے میں جذبۂ رشک کی ترجمانی ضرور زیادہ ہے اور بعض اساتذہ کے یہاں

لطافت کے جوہر بھی نظر آتے ہیں مگر پھر بھی ہر نہج اور ہر نوع میں ظہوری اور غالب کا ایسا کوئی تیسرا اس میدان کا راہرو نظر نہیں آتا۔

فارسی میں نظیری حسن و عشق کی واردات بیان کرنے میں بہترین شاعر تھا۔ حسن و عشق کی داستانیں اُس سے بہتر مؤثر اور لطیف انداز میں کسی نے نہیں سنائی ہیں۔ اُس کے کلام میں لطافت، شدت احساس، اثر، معنویت اور منازل عشق میں بادیہ پیمائی کی تمام لذتیں ملتی ہیں لیکن رشک کے ایسے فطری جذبہ کی اُس کی تخئیل میں بہت کم جگہ ہے اور اگر ہے بھی تو نہ معنویت ہے اور نہ تنوع۔ نظیری کے دیوان کے صفحات پر صفحات اُلٹ ڈالیے دور دور تک اس جذبہ کی ترجمانی نہیں ملے گی اور اگر کچھ اشعار مل بھی جاتے ہیں تو اُن میں زیادہ تعداد ایسے مضامین کی ہے جن میں مسحور کر لینے والی کوئی کشش نہیں ہے۔ نظیری کے یہاں اس طرز تخئیل کی مایوس کن کمی ہم کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اُس کے ایسے جلیل القدر شاعر نے اس طرف کیوں توجہ نہیں کی؟ اس سوال کے متعدد جوابات سمجھ میں آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ رشک کے مضمون کو نظم کرنے کے لیے ایک مخصوص افتاد طبیعت اور دقیقہ سنجی و نازک خیالی کی ضرورت ہے۔ واردات قلبیہ کو نظم کرنا ایک بات ہے مگر انھیں واردات کا کسی مخصوص زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کر کے اور اس میں مضمون آفرینی شامل کر کے شعر کہنا بالکل دوسری بات ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی خاص مضمون کسی مخصوص شاعر کے لیے اتنا پسندیدہ بن سکتا ہے کہ وہ طرح طرح سے اس پر طبع آزمائی کر کے اپنے لیے اُس خیال و رجحان کو مختص کر لیتا ہے۔ اس اصول کے تحت ظہوری اور غالب کو رشک کے سلسلے میں عدیم المثال شاعروں کی صف اول ہی میں جگہ حاصل ہے۔ ایک تیسری بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جس کیفیت کو دوسرے اساتذہ نے منزل تمثیل میں نظم کیا اسی کو ان شعراء نے اپنے مخصوص زاویۂ فکر و نظر کے ماتحت جذبۂ رشک کی واردات بنا کے پیش کیا۔ چنانچہ حافظ کا مشہور شعر ہے ؎

در نمازم خم ابروے تو چوں یاد آمد　　حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد

ظہوری منزل رشک میں کہتا ہے ؎

طاقتی کردہ محراب حرم بر قبلہ دو رشکم　　نمیدانم کجا دیدہ است آن محراب ابرو را

تمثیل اور رشک ایک علٰحدہ بحث ہے۔ اس مقام پر جذبہ رشک کی ترجمانی کرنے کے سلسلے میں ظہوری کے بعض وہ اشعار درج کیے جاتے ہیں جن کا مطالعہ شاعر کے کمال فن کو واضح کرتا ہے:

برائے خلد تاب رشک خواہد تافتن دوزخ　　ازیں زیور کہ ایزد از جمالت دادہ دنیا را

بجوہم کرد رشک غیر سنگین تیغ غیرت را　　بانصاف آشنائی باد یا رب بے مروت را

ایں ہمہ بر خود تند در دِ رشک پیچیدن نداشت　　حلقہا از نالہ در گوش دو اکردیم و رفت

از برائے رشک غیرت در نگہ پیچیدہ بود　　غیرتت باد ا ظہوری غیر نا دیدن نداشت

شرمندۂ فسردہ دلیہائے خویش باش　　رشک ست رشک بر جگر داغدار صبح

سہل باشد رشک بال افشان آزادن باغ　　بخت مرغانیکہ در دامت پر انداز ان کنند

دل را ز تاب رشک شود آب رنگ و بو　　در باغ از اگر سخن رنگ و بو کنند

بوے جانیم در تن گرچہ ہر صبح از صبا آید　　گذر رشکم کہ ہمراہ صبا بویش چرا آید

ماہ رشک شکستہ دارد　　کہ کلہ گوشہ بہ شکست میرس

سخت دشوار ست جان از رشک دادن لالہ را　　گہ ہم در ہجر بیدارم کہ آسان تر کنم

در خلوت تخیل چون ابر دیدہ بارد　　از تاب رشک سوزد نظارۂ حبابم

زنم لافے ز رشک این و آن گردیدہ ام فلغ　　ندارد ہم خود دش باور کہ گوید دیگرے دارم

حلالم خون دل در جام کردن　　حرامم گر ز رشک جم بمیرم

ز برق رشک بسوزد سرائے خوابِ دل　　چراغ مجلس افسانہ نور طہور مکن

تا مسیحا را ز رشک خود بہ بستر افگنم　　چشم دارم پرسشے از نرگس بیمار او

یہ اشعار نمونتاً پیش کیے گئے ہیں۔ ظہوری کے یہاں رشک سے متعلق طرح طرح کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ یہی چند اشعار یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ جذبۂ رشک کی ترجمانی اس نغز گو شاعر نے کس کس طرح کی ہے۔ ایک رنگ و بو ہی کو لے کر رنگ رنگ سے اظہار رشک کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وسعت نظر کی اتنی اور ایسی مثالیں جب دوسروں کے یہاں فارسی میں نہیں ہیں تو اردو اس دقیقہ سنجی کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی۔ البتہ مرزا غالب ہی ایک ایسے نکتہ رس شاعر ہیں جنھوں نے اس میدانِ فکر میں بھی نازک خیالی دقیقہ سنجی اور معنی آفرینی سے اردو کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ 'رقیب' 'عدو' اور 'غیر' کے مقابلے میں رشک کا اظہار پھر بھی سہل ہے۔ یار تیغ بکف غیر کی طرف جائے تو کشتۂ ستم پر غیرت طاری ہو جانا آسان ہے لیکن "بلائے جان ہے ادا تیری اک جہان کے لیے" سوچ کر بلا میں بھی "مبتلائے آفت رشک" رہنا بڑی بلند منزل ہے جہاں ہر ایک نہیں پہنچ سکتا۔ یا اسی طرح "مدعی کا ہم سفر" دیکھ کر یہ جذبہ اُبھرنا کہ

"وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے" صرف مرزا کی جدت آفرینی اور ندرت خیال کے لیے مخصوص ہے۔ اسی طرح 'عدو' کو معشوق سے ہم سخن دیکھ کر ہر عاشق پر جذبۂ رشک طاری ہو سکتا ہے مگر اس جذبہ میں "خوئے بد آموزیٔ عدو" کا زائل ہو جانا تفکر کی وہ سطح ہے جہاں محبت بہت بلند نظر آتی ہے اور عاشق کا کردار اونچا ہو جاتا ہے۔ رقیبوں کا کیا ذکر مرزا نے رشک کو اس بلندی پر محسوس کیا تھا جب معشوق کے "ہاتھ میں تلوار" یا اس کے تن نازک کو "آغوش خم حلقۂ زنار" میں آتے دیکھ کر اُن کا مر جانے کو دل چاہتا تھا یعنی یہ کہ بے جان چیزوں سے معشوق کا لگاؤ بھی عشق حقیقی میں جذبۂ رشک اُبھارتا ہے۔ اس ندرت خیال پر بھی رشک آجانا بے محل نہ ہوگا کہ مرزا اپنے محبوب کا مکان ڈھونڈنے نکلتے ہیں تو اُس کا نام شدت رشک میں نہیں لیتے یا یہ کہ منہ سے نہیں نکلتا اور اُس کے بجائے ہر ایک سے یہ پوچھتے پھرتے ہیں کہ "جاؤں کدھر کو میں"۔ معشوق اگر باغ میں بے حجابیاں کرنے لگتا ہے تو اُن کو نکہت گل سے بھی حیا آنے لگتی ہے۔ اُن کے اس خیال کا جو اُردو میں ادا کیا گیا ہے پوری طاقت و اعتماد کے ساتھ ظہوری کے اس مایۂ ناز شعر سے موازنہ کیا جا سکتا ہے ؎

بوجانیم در تن گرچہ ہر صبح از صبا آید　　کُشد رشکم کہ ہمراہ صبا بوئیش چرا آید

یا اسی طرح معشوق کے تبسم ہائے پنہاں سے متاثر ہو کر یہ کہہ جانا صرف مرزا ہی کے بس کی بات تھی:

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجیے　　یا پردۂ تبسم پنہاں اُٹھائیے

ظاہر ہے کہ ایسے تمام مضامین اور خیالات ایک ایسی فکر بلند کی نشاندہی کرتے ہیں جو مبداءِ فیاض نے مرزا کو مرحمت فرمائی تھی۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا رقیب، عدو اور غیر کے مقابلے میں رشک پیدا ہونا عام بات ہے اور اس کا الفاظ میں ادا کر دینا سہل ہے لیکن مرزا عام بات کو بھی سیدھے سادے طریقے پر کہنے کے قائل نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی دقیقہ سنجی نے جذبۂ رشک کے اظہار میں ندرت شامل کر دی جس کی بدولت اُن کا یہ جذبہ کائنات پر چھا گیا۔ اسی کے ساتھ خیالات میں پاکیزگی اور طرز ادا میں بھی رفعت اور بلندی ملحوظ رہی۔ اُن کی اس فنی عظمت کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے لئے وہی چند اشعار کافی ہیں جو رشک سے متعلق اُن کے اردو دیوان میں موجود ہیں لیکن ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ مرزا کے فن کو اصلی خد و خال میں دیکھنے کے لیے اُن کے فارسی کلام کا مطالعہ ضروری ہے۔ وہ "طوطیٔ ہندوستان" ضرور تھے لیکن "عندلیبے از گلستان عجم" ہونے ہی پر اُن کو ناز تھا۔ حقیقت امر تو یہ ہے کہ اُن کا اردو کلام بھی اسی لیے وقیع اور بلند پایہ ہے کہ انھوں نے فارسی افکار اور تراکیب کو اپنا کر اردو زبان میں اپنے مخصوص طرز پر پیش کیا ہے۔ اُن کا سارا اردو دیوان اسی صنعت گری کا بہترین شاہکار ہے۔ لہٰذا اُن کے فارسی غزلیات سے چند اشعار ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مرزا کو رشک کا مضمون ظہوری ہی کی طرح بحد مرغوب و مطبوع تھا۔ انھوں نے ظہوری کی تاسّی کر کے مضامین رشک میں خامہ فرسائی کی اور ان مضامین میں اپنی عالی ہمتی اور دقت نظر سے تنوع اور رنگینی پیدا کر کے ایسے ایسے اشعار کہے ہیں جن کو ہم پورے اطمینان کے ساتھ ظہوری کے کلام کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ بعض بعض مقامات پر مرزا ہی کا پلہ بھاری نظر آتا ہے:

بداغت شادم اما زین خجالت چون برون آیم　　کہ رشکم در جحیم افگند خلد آرام گاہان را
زجور رشک داوری بردم بدیوان لیک زین غافل　　کہ سعی رشکم از خاطر برد نامش گواہان را
چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را　　رشک نگذارد کہ گویم نام را
با من بخواب نازو من از رشک بدگماں　　تا عرصۂ خیال عدو جلوہ گاہ کیست
رشک آیدم بروشنیٔ دیدہ ہائے خلق　　دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست
ز رشک است اینکہ در عشق آرزوئے مردنم باشد　　تو جان عالمی حیف است گر جاں در تنم باشد
کمم در دست ز رشک است اینکہ غمخواری نمی خواہم　　کہ ترسم ہمدم پیدا و راہر کہ از حالم خبر گیرد
بیرون میا ز خانہ بہ ہنگام نیم روز　　رشک آیدم کہ سایہ بہ پابوس می رود
از رشک کرد آنچہ بہ من روزگار کرد　　در خستگی نشاط مرا دید خوار کرد
چو رہ بقصد نشان بر کمان بجنباند　　تپد ز رشک دلم تا نشان بجنباند
جاں دہم از رشک بشمشیر چہ حاجت　　سر پنجہ بدامن زن و دامن بہ کمر بر
تا خود از بہر نثار کیست می میرم ز رشک　　خضر و چندین کوشش عمر دراز آورد نش
میرم ز رشک گر ہمہ بوئے بمن رسد　　کامیزش شمال و صبا بودہ است شرط
مرد آنکہ در ہجوم تمنا شود ہلاک　　از رشک تشنہ کہ بدریا شود ہلاک
دلم می جوئی و از رشک می میرم کہ در مستی　　چرا زاں گوشۂ ابرو اشارت کامیابستے

متذکرۂ بالا دونوں انتخابات کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ظہوری اور غالب کے یہاں جذبۂ رشک میں بڑی ہم آہنگی ہے اور ان دونوں شعراء نے اس مضمون میں بڑی بڑی جدت آفرینیاں کی ہیں۔ دونوں اساتذہ نے انسانی فطرت کو دقیق نظر سے دیکھا تھا اور انسانی جذبات کی گہرائیوں میں اچھی طرح پیر کر حقیقتوں کو سمجھا تھا۔ نفسیات وحسیات میں پوری مہارت حاصل کر کے اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ انسانی کردار میں رشک کو اہم حیثیت حاصل ہے۔ عاشقی کی منزل ہو یا دنیاوی تعلقات کی، فطری مناظر سے دلچسپی ہو یا قانون قدرت سے، روحانی برتریاں ہوں یا مادّی صلاحیتیں، ہر موقع، ہر محل اور ہر شعبۂ حیات میں کسی نہ کسی نہج اور نوع سے جذبۂ رشک اُبھرتا ہے بشرطیکہ شاعر یا مفکر حساس ہو اور ایک مخصوص طور پر سوچنے کا عادی ہو گیا ہو۔ حقیقی شاعر ایسے حالات کی ترجمانی کرتا ہے اور جو نہ کرے اُس کے یہاں اس بیش بہا جوہر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ غالب کے یہاں اس دولت بے بہا کا کثیر ذخیرہ تھا۔ انھوں نے تمام اصناف سخن میں اور ہر موقع ومحل پر جذبۂ رشک کا مظاہرہ کیا ہے اور ہر مظاہرہ اپنی آپ مثال ہے۔ ایسے نمونے نہ صرف غزلیات بلکہ قصائد میں بھی ملتے ہیں۔ بزرگان دین کی مدح میں ملتے ہیں اور واقعۂ کربلا کے سلسلے میں گریہ وزاری میں بھی جذبۂ رشک اُجاگر ہوتا ہے۔ "گریستن" کی ردیف میں ایک قصیدہ امام حسین علیہ السلام کی مدح میں کہا ہے۔ اس قصیدہ کے دو اشعار ایسے ہیں جن میں جذبۂ رشک کی ترجمانی انتہائی انوکھے لیکن پُردرد انداز میں کی ہے۔ فرماتے ہیں:

رشک آیدم بہ ابر کہ در حدِ دمع اوست　　برخاکِ کربلائے معلّا گریستن
باخاکیان بجنگم وز افلاکیان برشک　　خواہم بر آستانِ تو تنہا گریستن

ایک دوسرے قصیدے میں جو حضرت علیؓ کی منقبت میں ہے، مرزا نے جذبۂ رشک کا اظہار اتنے بلند اور حسین پیرایہ میں کیا ہے جس کی مثال کسی زبان کے ادب میں ملنا بہت مشکل ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

خواہم ز فرطِ خویش کہ در مجمعِ حواس　　مہر ترا بجو ئیش بدزدم خویشتن

"دزدیدن" یعنی چرانا ایک قبیح فعل ہے اور مجمع میں اس فعل قبیح کا ارتکاب مذموم بلکہ بعید مذموم ہے۔ لیکن مرزا نے فعل قبیح کو مستحسن ہی نہیں بنایا بلکہ "مجمع حواس" میں ارتکاب کر کے مستحسن سے زیادہ مستحسن بنا دیا اس لئے کہ جس چیز کے لیے "دزدیدن" کی کارفرمائی ہوئی ہے وہ "مہر ترا" (ممدوح کی محبت) ہے۔

قصائد کے علاوہ مرزا نے ایک ترکیب بند بھی منقبت میں کہا ہے جو نو بندوں پر مشتمل ہے۔ آٹھویں بند میں تشبیب کے اشعار بھی مدحیہ ہیں۔ انھیں میں ایک شعر ایسا ہے جو جذبۂ رشک کی خالص عاشقانہ انداز میں ترجمانی کرتا ہے۔ کہتے ہیں۔ ؎

در رہِ یارم ز رشکِ پائے رہ پیمائے خود　　خون شد در دل ز زخمے کز سرِ خارے رسید

غرض قصائد ہوں یا غزلیات مرزا نے انسانی جذبات کی ہر جگہ بہترین مصوری کی ہے۔ واردات عشقیہ میں رشک کے مضامین نظم کر لینا زیادہ دشوار نہیں تھا لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں میں جہاں شاعرانہ ذہنیت کی جگہ غیر معمولی سنجیدگی کو حاصل ہوتی ہے یا ایسے مقامات پر جہاں جذبات سے بلند ہو کر خالص تفکر اور تعقل کی وادیوں میں بادیہ پیما ہونا پڑتا ہے، رشک کے جذبہ کا نباہنا بیحد مشکل کام ہے۔ اس منزل میں مرزا کا مرتبہ ظہوری کے مقابلے میں کچھ بلند ہی نظر آتا ہے۔

جذبۂ رشک کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس جذبہ میں خالص عاشقانہ شان ہے اور عاشق میں شدت عشق ہی جذبہ کو ابھارنے کی باعث ہوتی ہے کیونکہ ہر عاشق اپنے کو بہترین چاہنے والا سمجھتا ہے۔ پھر بھی اس کو ہر لحظہ غیروں اور رقیبوں کا سامنا رہتا ہے۔ معشوق اپنے کو حسین ترین فرد سمجھتا ہے مگر اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ جانِ جہاں ہے اور اُس کا کوئی مدمقابل نہیں ہے۔ اس لیے اس کے رشک کرنے کا کوئی موقع ومحل پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ مگر مرزا غالب نے معشوق کو خالص انسانی کردار میں دیکھا اور انسانی جذبات کا حامل پایا لہٰذا وہاں بھی جذبۂ رشک ڈھونڈھ کے فراہم کر لیا۔ اس جذبۂ رشک کی معشوق میں ترجمانی جتنی بلند پروازی سے مرزا نے کی ہے وہ صرف انھیں کے لیے مخصوص ہے۔ وہی اس بات کو سوچ سکتے تھے کہ معشوق کو اگر کسی ہستی سے رشک ہو سکتا ہے تو وہ صرف معبود کی ذات ہو سکتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

نخوت نگر کہ می خلد اندر دلش ز رشک　　حرفے کہ در پرستشِ معبود می رود

(بقیہ ص۔۔۔ پر)

مرزا غالب

ابوہاشم سیّد یوشع

سخن گو و سخن ساز تو ہندستان میں بہ کثرت ہوئے اور اب بھی ہیں، لیکن شاعر بہت ہی کم ہوئے۔ جو شخص درحقیقت شاعر ہو اس کے کلام کا مطبوعِ طبائعِ خاص و عام ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ مرزا غالب ان چوٹی کے شعرا میں ہیں جن کا کلام سب سے زیادہ محبوب القلوب ہے۔

آج کل بھی ہندستان میں سخن گوئی و سخن سرائی کا بہت شوق و ذوق ہے۔ ہر کہیں مجالسِ "مشاعرہ" سرگرمی و صرفِ کثیر کے ساتھ منعقد ہوا کرتی ہیں، مقامی اور دور دست مقامات سے آئے ہوئے "شعراء" وہاں اپنا کلام سناتے بلکہ سخن سرائی کرتے اور سننے والے ان کے کلام کی باہمہ بُلہلہ و ہُمہمہ داد دیتے ہیں۔ لیکن اکثر اوقات نہ ان میں فی نفسہٖ و فی المعنی کوئی شاعر ہوتا ہے اور نہ ان کی "شاعری" شاعری ہوتی ہے۔

عربی زبان میں شعر کے معنی ہیں: (۱) نکتہ رسی، دقیقہ شناسی، دقتِ نظر۔ (۲) خردہ بینی، باریک بینی و موشگافی کے ساتھ اشیاء سے متعلق علم، وقوف، معرفت، دانش، فہم، شناسائی، ادراک، آگاہی، اطلاع، احساس، تمیز، شعور۔ (۳) ہر قسم کا علم، ہر قسم کا شعور۔

شاعر، حقیقتہً و معناً، وہ ہے جو ذی شعور و ذی علم، دقیقہ شناس و نکتہ رس، صاحبِ فہم و تمیز، درّاک و عمیق نظر بھی ہو اور اپنے احساسات و جذبات کو بہ وسیلۂ کلامِ موزوں اس خوبی و ہنرمندی، خوش سلیقگی و زیبائی کے ساتھ ادا کرنے کا قریحہ (یعنی شعر کہنے کا ذوق و ادراکِ جبلّی و صلاحیّت و قدرتِ طبیعی) بھی رکھتا ہو تاکہ وہ احساسات و جذبات دوسرے اہلِ شعور کے دل و دماغ میں ہو بہو منتقل ہو جائیں۔ شاعر کو اس لیے بھی شاعر کہتے ہیں کہ ہر چیز پر اس کی نظر گہری پڑتی ہے، گویا وہ پردۂ ظاہری کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے۔ اسی لیے جن باتوں کا وہ ادراک و مشاہدہ کرتا ہے دوسروں کو سجھائی نہیں دیتیں اور جن چیزوں کو وہ سمجھتا ہے دوسرے نہیں سمجھتے۔

اصنافِ شاعری میں غزل سب سے زیادہ عام پسند و دلآویز ہے۔ غالب کا اردو کلام زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزل کے معنی و مفہوم پر بھی یہاں مختصر سی روشنی ڈالی جائے:

غَزَل: (۱) شوخی و بیباکی کے ساتھ جنسِ لطیف یعنی عورتوں سے باتیں کرنا (۲) ایسی باتیں جو جنسِ لطیف سے اظہارِ عشق یا اُس کے حسن و جمال کی خوبی اور اُن کی ستائش سے وابستہ ہوں (۳) ایک صنفِ شعر جس میں بالخصوص شعرائے عرب جنسِ لطیف یا بہ الفاظِ دیگر صنفِ نازک سے عشق بازی، عاشقانہ چھیڑ چھاڑ، اس کے حسن و جمال کی توصیف اور اپنے جذباتِ عشق و محبت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ہندستان میں پہلے پہلے غزل کا موضوع یہی رہا۔ پھر اس میں دوسرے موضوعات بھی داخل کیے گئے مثلاً رموزِ تصوّف، عشقِ الٰہی، خیالاتِ رندانہ، افکارِ سیاسی و معاشرتی وغیرہ۔ اس طرح غزل بہ تدریج ہر قسم کے افکار و خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنی۔ غالب کی غزل سرائی بھی متعدد موضوعات پر مشتمل ہے۔

حسن و جمال، خواہ دلفریبیاں نباتی میں ہو یا حیوانی میں، کوئی مقناطیسی خاصیت اپنے اندر ضرور رکھتا ہے۔ متقدّمین افلاطون کہتے ہیں کہ حُسن روح میں ہے اور ارسطو کے پیرو جسم میں بتاتے ہیں۔ مگر ہمارے فلسفی شاعر مرزا غالب کا نظریہ۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

ایک قولِ فیصل ہے۔ ظاہر ہے کہ حسن انفرادی طور پر نہ تو روح میں ہے اور نہ جسم میں، بلکہ ان دونوں کے امتزاجِ لطیف سے حسن رونما ہوتا

مانگو، بھاگلپور۔

ہے۔ حُسن جمادات و نباتات و حیوانات کے لیے ہی مخصوص نہیں بلکہ شعر و سخن میں جلوہ گر ہو سکتا ہے۔ جس طرح جسم جان کا پیرہن ہے اسی طرح الفاظ خیال کا جسم ہیں۔ حسنِ کلام بھی نہ تنہا خیال میں ہے نہ الفاظ میں، بلکہ یہ اس وقت ہویدا ہوتا ہے جب کہ شاعر یا ادیب اپنے خیال کو با الفاظ مناسب و زیبندہ اس عمدگی سے پیش کرے کہ وہ خیال اشخاص ذی فہم و با سواد کے ذہن میں بجنسہٖ منتقل ہو جائے۔ مثلاً مرزا صاحب کے چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں :

(۱) کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب　　جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا
(۲) ضد کی ہے اور بات مگر خُو بری نہیں　　بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
(۳) دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا　　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
(۴) سُن لے غارت گرِ جنسِ وفا سُن　　شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
(۵) کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی　　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
(۶) میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد　　سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
(۷) ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
(۸) رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
(۹) جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے　　کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اَور!

جس طرح ضمیرِ برگِ گل میں بوئے خوش ہم نہاں و ہم آشکار دماغی صلاحیت کی طلب گار ہے اسی طرح شعر کا حُسن بھی شعارِ لفظی کے اندر ہم پوشیدہ ہم پدیدار شعور و ادراک کا بہ زبانِ حال متقاضی ہے۔ شعر کا حُسن گویا نکہتِ گل ہے اور الفاظ اس کی پتّیاں، اور ہماری متخیلہ اس کی نکہت کو فاش اور ہمارے مشامِ جان کو معطر کرتی ہے۔ جس طرح بندِ قبائے غنچہ جنبشِ نسیم سے وا ہو جاتے ہیں، اسی طرح متخیلہ نقابِ حُسنِ شعر کو بے نقاب کرتی، جس طرح شاخِ گل نفسِ بادِ صبا سے جھومنے لگتی ہے، اسی طرح شعرِ تر کے ادراک سے جان و روانِ انسان اہتزاز میں آتی ہے جس طرح عوام الناس شمیمِ بوئے گل سے فرحت و انبساط حاصل کرتے ہیں، اسی طرح اہلِ شعور شعر کے حُسن سے محظوظ و لذّت گیر ہوتے ہیں۔

ایک ایسی بیت یا ایسی بات، جو لفظی آرائشوں سے سنواری گئی ہو مگر معنی و مفہوم کچھ نہیں رکھتی، ایک ایسی لاش ہے جسے حریر و حریر میں لپیٹا گیا ہے۔ بعض ابیات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اِنشاد سے ترنّم پیدا ہوتا ہے لیکن مطالبِ معنی ان میں کچھ نہیں ہوتے ایسی بیتوں کا تعلق موسیقی سے ہو سکتا ہے لیکن شاعری سے قطعاً نہیں۔ شاعری کا منشا یہ نہیں کہ اس سے صرف سامعہ محظوظ ہو بلکہ اس کا خاص منشا اوّلین وصف یہ ہے کہ مدرکہ و متخیلہ اس سے لذّت گیر ہو۔

صنائعِ مستظرفہ میں مجسّمہ سازی کا پایہ اتنا بلند نہیں جتنا مصوّری کا ہے، اور مصوّری اپنے بلند درجے کے باوجود موسیقی کے درجے کو نہیں پہنچتی شاعری میں، جو سب سے زیادہ بلند پایہ ہے، دوسرے فنونِ لطیفہ یعنی مجسمہ سازی، مصوّری و موسیقی متضمن و متجسّم ہوتے ہیں۔ شاعر ایک ایسا مجسمہ ساز، مصوّر و سرود سرا ہے جو بدونِ سنگ و آلاتِ سنگ تراشی بدونِ موقلم و پردۂ نقاشی، یا ساز و سامان و آہنگِ موسیقی نغمہ آفریں الفاظ کے ذریعے متحرک مجسّمے اور جیتی جاگتی تصویریں منصّۂ خیال پر پیش کرتا ہے۔ شعر ایک سرودِ خیال ہے جو پیرایۂ لسانی زیبِ تن کیے یا برگ و نوائے وزن و توافقِ اصوات جلوہ گر ہوتا ہے، مثلاً غالب کی ایک غزل یہاں پیش کی جاتی ہے جو شاعری، موسیقی، مصوّری غرض سب کچھ اپنے اندر لیے ہوئے ہے:

(۱) مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے　　جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
(۲) ڈھونڈے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال　　صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے
(۳) باہم دِگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب　　نظّارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
(۴) پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا　　جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے
(۵) مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس　　زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
(۶) اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ　　چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
(۷) جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن　　بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

اور یہ دال غزل لوازمِ شاعری و غزل گوئی سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس کا ہر شعر نغمہ آگین و زمزمہ آفریں ہے۔ اس کے مطالعے ہی سے دل میں ایک ترنّم سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ گویا اس کے اندر ایک مضرابِ نہانی کارفرما ہے جو تارِ نفس کو چھیڑتا اور اسے مرتعش و مترنّم کرتا ہے۔ مطالعہ

کرنے والے کو بقولِ مرزا غالب ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ

شورے است نوا ریزی تارِ نفسم را — پیدا نہ ایں جنبشِ مضراب کجا ئی

یعنی (جس طرح ستار سے نغمے نکلتے ہیں اسی طرح) میرے تارِ نفس سے نغمے نکل رہے ہیں۔ پتہ نہیں مضراب جو تار کو چھیڑ رہا ہے کہاں ہے۔

مرزا غالب ایک شاعر پیکر نگار ہیں۔ ان کی مصوری و پیکر نگاری کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

(۱)

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

معشوق کا نگاہ چرانا یعنی عاشق کی آنکھ سے اپنی آنکھ کبھی ملنے نہ دینا اس لیے ہے کہ عاشق کو خبر نہ ہونے پائے کہ وہ خود بھی اس کی طرف مائل ہے۔ مرزا صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کا ایک دفعہ نگاہ چرانا لاکھوں دلی علاقوں کا پتہ دیتا ہے۔ نیز اس کا غصے میں آکر بگڑنا اس کے چہرے کو ایسا نکھار دیتا اور اس میں ایسی خوبی و دلکشی پیدا کر دیتا ہے کہ گویا لاکھو بناؤ سنگار اس نے کیے ہیں۔

(۲)

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

یہ چہرہ نقاب میں پوری طرح چھپا ہوا ہونے کے باوجود خوبصورتی کا وہ عالم ہے کہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کے چہرے پر زلف سے بھی بہت زیادہ نقاب پھبتا ہے۔

(۳)

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

"تماشا کر" یہاں لانا غالب کی مخصوص ترکیبوں میں سے ہے لیکن اگر اس کے بجائے یہ ہوتا "ادھر دیکھ اے محوِ آئینہ داری" یا "ذرا دیکھ لے محوِ آئینہ داری" تو غالب کی شاعرانہ شان میں کوئی فرق نہ آتا۔ شعر بڑی خوبیوں کا ہے لیکن لذیذ نوالہ میں کنکر کی طرح "تماشا کر" کھٹکتا ہے۔ عادتاً تو شاعر نہیں ہوں لیکن طالب علمی میں اور پھر بعد کو بھی ایک مدت تک شعرا کے فارسی و اردو کلام سے بڑی دلچسپی و مزاولت رہی ہے۔

غالب کا اندازِ بیان کچھ ایسا ہے کہ ان کے اشعار بہ آسانی زبان پر چڑھ جاتے اور فی الفور دل میں اثر کر جاتے ہیں۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کس خوبی سے اپنی کیفیتِ حال کا اظہار کیا ہے کہ بیمار ہونے اور حال اچھا نہ ہونے کے باوجود صورتِ محبوب کے دیکھتے ہی ساری کلفتیں (گو عارضی طور پر ہی سہی) دور ہو جاتی ہیں اور چہرے پر ایک رونق آجاتی ہے۔

غالب نے "عمر" پر بھی اپنے خاص انداز میں نظر ڈالی ہے:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

انسان کی عمر یعنی اس کا دنیا میں زندہ رہنا گویا ایک ایسے گھوڑے پر سوار رہنا ہے جس کے نہ لگام ہے نہ رکاب ہیں۔ انسان کو نہ اس پر کچھ قابو ہے نہ اختیار۔ گھوڑا ہے کہ اپنی ہی مرضی سے برابر چلا جا رہا ہے خبر نہیں کہ کب اور کہاں جا کر تھمتا ہے۔ مختصر یہ کہ انسان کو اپنی عمر یعنی اپنی زندگی پر کوئی قابو اور کوئی اختیار نہیں ہے۔

لفظ "وفا" پر بھی مرزا صاحب نے خیال آرائی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

یعنی اس زمانے میں ہر ایک لفظ جو بولا اور لکھا جاتا ہے بامعنی و معنی دار بھی ہوتا ہے۔ مثالاً لفظ "حیا"۔ اس لفظ کے معنی اس وقت پیدا ہوتے اور مثال سامنے ہونے سے سمجھ میں آتے ہیں جب کہ کسی باحیا و حیادار کو دیکھا اور جانا بوجھا ہو۔ لیکن مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ لفظ "وفا" اگرچہ بولا اور لکھا جاتا ہے لیکن کوئی ایسا انسان دیکھنے میں نہ آیا جسے "باوفا و وفادار" کہہ سکیں۔ "شرمندۂ معنی" ہونا سے مراد ہے بامعنی و معنی دار ہونا۔

شاعری مرزا غالب کی فطرت و طبیعت میں بسی ہوئی تھی خود کہتے ہیں:

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب — شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

یعنی ہم شاعری اختیار کرنے پر راضی نہیں تھے مگر خود شعر کی خواہش تھی کہ ہمارا فن اور ہمارا ہنر بن جائے۔ چنانچہ بن گیا۔

ماہ وشانِ ماضی کی طرف بھی مرزا صاحب کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔ فرماتے ہیں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یعنی باغ و بوستاں میں جو خوشنما لالہ و گل دکھائی دیتے ہیں ان پیاری پیاری انسانی صورتوں کے مختصر سے نمونے ہیں جو خاک میں پنہاں ہو گئیں۔ مگر یہ نمونے وہ دلکشی نہیں رکھتے جو ان حسین و جمیل صورتوں میں رہی ہوگی

ناگو بھاگن ۔ ۹۰۸ اشک

اس مطلب کی مزید توضیح کی خاطر حافظِ شیراز کا ایک شعر یہاں درج کیا جاتا ہے:

ہر گلِ نو ز گل رُخے یاد ہمی دہد ولے — گوشِ سخن شنو کجا دیدہ اعتبار کو؟

یعنی ہر نیا پھول جو کھلتا ہے پھول سے رخسار والوں کی یاد کو تازہ کر دیتا ہے لیکن اب ایسے سننے والے کہاں جو اس بات کو سنیں اور سمجھیں اور ایسے دیدہ ور کہاں جو اس سے سبق حاصل کریں۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں — جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

مرزا صاحب کے اس خیال سے میں پوری طرح متفق نہیں ہوں۔ ان سے میرا مودبانہ معروضہ یہ ہے کہ حضور! ذرا غور فرمائیے کہ آپ کے تصور میں جو ماہ وش ہے، اس کی زلفیں جب کسی خوش قسمت کے بازو پر بکھر جائیں، اسے نیند کہاں اسے چین کہاں؟ البتہ راتیں اس کی ہیں۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار — جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

محبوبہ کی نگاہیں اپنی حیا و شرم کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے اپنی مژگاں سے آگے نہیں بڑھتیں۔ کوتاہیِ قسمت ادھر ہے اور کوتاہیِ نگاہ ادھر۔ پھر بھی جانِ دل فروزِ حسن سینہ تو نکے تیر ہیں کہ برابر دل کو چھیدے چلے جا رہے ہیں۔

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

بڑے رنج و افسوس کی بات ہے کہ مرزا غالب جنھوں نے اپنی شاعری سے لاکھوں کروڑوں کے دل خوش کیے ان کی زندگی کا نصف آخر بڑی مشکلوں اور معاشی تکلیفوں میں گزرا۔

★

قاطع برہان (بسلسلہ صفحہ)

بڑھا کر اسی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ جیسے "مہا دیو" بڑا دیوتا، "مہا راجا" بڑا راجا۔ لطف یہ ہے کہ فارسی میں بھی ایک الف ہے جو کثرت کے معنی پیدا کرتا ہے جیسے "خوشا" اور "بدا"۔ میں عجب نہیں کہ "مہا" کا الف بھی اسی قسم کا ہو، یعنی بہت بڑا اور میم پر زبر لہجے کا تغیر ہو۔

۲۔ فارسی میں ایک اور الف ہے جو لفظ کے شروع میں آئے تو نفی کے معنی دیتا ہے، مثلاً "اخواستی" بمعنی غیر ارادی "اجنبان" بمعنی نہ ہلنے والا، "امیر" بمعنی نہ مرنے والا۔ اسی طرح ہندی میں بھی نہ مرنے والے کو "امر" کہتے ہیں اور نہ چلنے والے کو "اچل" کہتے ہیں۔ پارسا کو "سادھو" (شدھو) اور ناپارسا کو "اسدھو" (اشدھو) کہتے ہیں۔

۳۔ "سوم" دونوں زبانوں میں اسمِ ماہ۔

۴۔ "آیت" دونوں زبانوں میں سورج کا نام۔

۵۔ "سنگم" دونوں زبانوں میں رفیق اور ہمراہ کو کہتے ہیں۔

۶۔ "پاتی" ہندی میں بمعنی خط اور "پتیا" قدیم فارسی میں بمعنی پیام۔

۷۔ "دِشت" [درِشٹ] ہندی میں بمعنی نگاہ اور "دِشِشت" فارسی میں اس چیز کو کہتے ہیں جو دکھائی دے سکے۔

۸۔ "فرتاب" اور "پرتاب" دونوں میں بمعنی بزرگی، قدرت و کرامت۔

۹۔ "فرشاد" اور "پرشاد" فارسی قدیم اور ہندی قدیم دونوں میں بمعنی تبرک۔

۱۰۔ "باسن" کا لفظ بھی دونوں زبانوں میں مشترک ہے۔ زبانِ دری میں "باسن" ماضی بعید کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اہلِ ہند کی بول چال میں ماضی قریب کی طرف، جیسے گزشتہ دن یا رات کے کھانے پانی کو "باسی" کہتے ہیں۔

فائدہ "انگارہ" کے معنی ہیں نقشِ ناتمام، جیسے "گردہ"[1] اور "تہبندگ" بھی کہتے ہیں۔ اس کی ہندی "خاکا" ہے۔ وہ لوہا، پتھر یا لکڑی جس کی ابھی کوئی خاص ہیئت نہ ہو اور اس سے حسبِ منشا پیکر بنائے جا سکتے ہوں، اسے بھی "انگارہ" کہتے ہیں۔ استعارہ متاخرین کا شیوہ ہے چناں چہ انھوں نے [استعارے کے طور پر] سرگزشت کے دہرانے کو بھی "انگارہ کردنِ سرگزشت" کہا ہے اور کسی بات یا کام کے ناتمام چھوڑنے کو "انگارہ گزاشتن" لکھا ہے۔

خاتمۂ کتاب

خدا کا شکر ہے کہ "گویندۂ راز" اپنی کوشش کے سبب کامیاب ہوا، اور یہ فوائد جو ملحقاتِ قاطع برہان ہیں، "سالِ رستخیز" [۱۸۵۷ء] میں لکھے گئے۔ میں برہانِ قاطع کے معتقدوں کی ملامت اور فارسی دانانِ ہند کے خشم و عتاب سے نہیں ڈرتا، بلکہ میں تو خوش ہوں کہ اس [پیش آنے والے] جھگڑے سے میرا علم کم نہ ہوگا، البتہ [مخالفین کی] اُس [متوقع] مذمت کی وجہ سے مغفرت کے لیے میرا استحقاق بڑھ جائے گا۔ واللہ ذو الفضل العظیم۔

---

[1] "گردہ" کے لفظ سے غالب نے اپنے اس شعر میں نہایت عمدہ مضمون پیدا کیا ہے: ہے جہاں نقش کشیدہ ہائے نقشِ روئے یار — اختاب ؟ ما ہیرا گردۂ تصویر یار

تضمین

بر غزلِ مرزا غالب

کاوش بدری

حُسن اِک خواب ہے تکمیلِ نظر ہونے تک
ہے عبث عشق یہ اندازِ دگر ہونے تک
زندگی حشر سے کیا کم ہے بسر ہونے تک
"آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک"

بحرِ ذخّار ہے یا مرحلۂ تیر و تفنگ!
گویا ساحل سے ہر اک موج ہی آمادۂ جنگ
سنگ ہے موم کہیں اور کہیں موم ہی سنگ
"دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک"

اس قدر زخم میسّر ہیں کہ حد ہے نہ حساب
مکتبِ فکر میں شامل تو نہیں غم کی کتاب؟
ہے ابھی چہرۂ معنی پہ بدستور نقاب
"عاشقی صبر طلب اور تمنّا بےتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک"

دلِ برباد کا افسانہ سُنو گے، لیکن
لاکھ تسکین کا سامان بنو گے، لیکن
دُور رہ کر بھی بہت پاس رہو گے، لیکن
"ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک"

لاکھ حاصل ہے مجھے صبر و رضا کی تعلیم
لاکھ پیوستِ رگِ جاں ہے وفا کی تعلیم
تری آنکھوں کو ودیعت ہے جفا کی تعلیم
"پرتوِ خُور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک"

خوب سے خوب سہی رنگِ نشاطِ محفل
رشکِ خورشید سہی روشنیِ دیدہ و دل
حضرِ موسیٰ کی تگاپوئے دمادم سے خجل
"یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم بھی ہے رقصِ شرر ہونے تک"

ہائے! کس درجہ دگرگوں ہے زمانے کا رواج
جاں سپاری میں فقط کر رکھی شب تاب کی لاج
غالبِ خستہ کی مانند ہے کاوش کا مزاج
"غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"

جہانِ غالب

قاضی عبدالودود

باغ دودر غالب کی فارسی نظم و نثر جس میں ١٢٨٥ھ تک کی نظم ہے۔ اس کا واحد خطی نسخہ جو جناب سید وزیرالحسن عابدی کے پاس ہے، میری نظر سے گزرا ہے، اس وقت مطبوعہ نسخہ جو انھیں کا مرتبہ ہے، پیش نظر ہے۔ مجموعۂ دھلی سے غالب وغیرہ کی نثر فارسی کا وہ خطی مجموعہ مراد ہے جو نیشنل آرکائیوز دہلی میں ہے، اور جس سے میرے تعارف کا باعث جناب اکبر علی ترمذی ہوئے ہیں، اس وقت عکس پیش نظر۔ عود هندی کے نسخۂ مرتبۂ جناب فاضل سے کام لیا گیا ہے۔ پنج آہنگ کا ایک قدیم خطی نسخہ ماخذ۔ قاطع برھان و رسائل متعلقہ مرتبۂ قاضی عبدالودود اس میں قاطع برھان، سوالات عبدالکریم، لطائف غیبی، نامۂ غالب اور تیغ تیز شامل ہیں۔

١۔ راحت روح از فرزند علی، صوفی، منیری شاگرد غالب۔ ایک قصہ جس میں رموز تصوف بیان ہوئے ہیں، پہلی بار کم و بیش ٦٠ سال قبل چھپا تھا۔ طبع ثانی بتصحیح و تحشیۂ جناب محمد طیب ابدالی غالباً ١٩٨٦ء میں طبع ہوا ہے۔ متن ١٧٨ صفحات۔ راحت میں ایک طویل قصیدہ ہے جس میں یہ بیت آئی ہے:

کیا ہی اس راہ میں چلتے ہیں زماں سے شاعر — معتقد کو گئی غالب کی کرامت مجھ کو ١٧

ص ٢٦۔٢٧ میں یہ عبارات ہیں: "خسرو اقلیم سخنوری، فخر خاقانی و انوری، مشہور آفاق، اس مدح کے مصداق۔ رباعی:

سب تیغ زباں سے انھیں پہچانتے ہیں — غالب ہیں وہ سب اہل فن جانتے ہیں
یہ شیر خدا کے نام کی ہے برکت — لوہا اسداللہ کا سب مانتے ہیں

کہ آفتاب عمر ان کا لب بام بلکہ قریب سرحد شام تھا، اور اسی سبب سے اس افسانے کے اتمام میں مجھ کو ابرام تھا۔ ان کے انتقال کی خبر آئی، نامرادی کی مراد بر آئی۔ اب بندہ۔۔ میرزا اسے مرحوم کی تاریخ طرز زیب طراز کرے، غفور رحیم۔۔ خلعت مغفرت سے ان کو سرفراز کرے۔ قولہ (مصرع اول کے نیچے "١٢٧٥ف"):

اسداللہ خاں تمام ہوا — اے دریغا وہ رند شاہد باز۔

قطعہ: یگانہ شاعر رشک ظہوری عرفی — سخن پناہ اسداللہ خاں تمام ہوا
یہ اس کا مصرع مشہور سال فصلی کا — ہے خود گواہ "اسداللہ خاں تمام ہوا"
بڑھا کے رکن لکھا میں نے سال ہجری یوں — کہ آج آہ "اسداللہ خاں تمام ہوا"

"بقول مرزا اسداللہ خاں صاحب کہ تخلص ان کا کہیں اسد ہے اور کہیں غالب" ص ٣٤۔ ص ٢٥ میں صوفی نے غالب کو اپنا "استاد" اور ص ١٣١ میں "فارس جولانگاہ فارسی و پہلوان میدان پہلوی" لکھا ہے۔ ص ٣٦۔٣٧ میں غالب کے دیوان اردو کی غزل اول کے ٥ اشعار کا مخمس ہے۔ بند اول و آخر:

دادخواہ آتا ہے ہر مضمون خط تقدیر کا — وحشت ہستی میں ہر حرف ہے بندھا زنجیر کا
ہے سدا گردش میں پرکار آسمانِ پیر کا — نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

شعلہ رکھتا ہے حنا سے وہ پری وش زیرپا — آگ میں ڈالے ہے دل کو زلف دلکش زیرپا
پیری سے ہے مری صوفی کو بھی ... زیرپا — دیکھ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

اشعار مخمس سے قطع نظر صوفی نے مختلف مقامات میں غالب کے ٢ فارسی اور ٣ اردو اشعار نقل کیے ہیں۔ ص ١٢٥ میں صوفی کا یہ قطعہ ہے:

پھر بیسویں برس اسے لکھنے لگا ہوں میں ڈالا ہے غم میں دل کو مرے اس کتاب نے
افسوس میرے دل میں یہ حسرت ہی رہ گئی دیکھا نہ اس کو غالب غفراں مآب نے
یاں تک میں لکھ چکا تھا کہ وہ کوچ کر گئے پھیری سمند عزم کی باگ انقلاب نے
دل کو مگر خیال لگا تھا کہ ان دنوں قصد دہی شروع کیا فکر خواب نے

۲ - میر فسوں: راحت ود ۳ ص ۶۷: "بقول میر فسوں صاحب شاگرد غالب:
اشک لٹے جو ہے دل کو ڈبا کر چھوڑا آہ کے تیر جو پلٹے تو جگر پہ بیٹھے
ایضاً ص ۱۳۸ - ۱۳۹ "ایک طرف میر فسوں صاحب کہ آخر عمر میں مجذوب ہو گئے تھے، اللہ کی یاد میں تانیں اڑا رہے تھے، اپنی دھن میں یہ غزل گا رہے تھے۔" غزل کے ۴ شعر مگر مقطع نہیں، مطلع یہ ہے:
کیا ٹھکانا ہے کہ جب گم ہو تو ملتا تو ہے بن کے اندھے تجھے دیکھے وہ تماشا تو ہے
ص ۶۷ کی عبارت سے متعلق حاشیہ یہ ہے: "بقول میر افسوں (کذا) صاحب فرخ آبادی المشتہر بہ ستان شاہ، شاگرد غالب رحمۃ اللہ۔" یہ حاشیے میں کٹا ہوا ہے، اور مرتب نے اضافہ کیا ہے: "قلم زدہ" مرتب نے حاشیہ ص ۶۷ میں لکھا ہے: "حیرت ہے کہ .. صوفی .. کے علاوہ اب تک کسی نے ان کا تذکرہ تلامذۂ (کذا) غالب کی حیثیت سے نہیں کیا ہے۔" میر افسوں یا افسوں شاگرد غالب کا ذکر راحت کے سوا میں نے کہیں نہیں دیکھا۔

۳ - انملی - خط ۶۸ بنام مجروح میں جو مطالب سے ۱۸۵۹ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، یہ عبارت ہے: "یہ حضرت کا سوال امیر خسرو کی انملی ہے۔ "چیل بسو لاے گئی تو کا ہے سے ٹھکوں راب ؟" (ڈھونڈی) لطائف غیبی میں ہے "یہ تو امیر خسرو کی انملی ہوئی چیل الخ" "ص ۹۹ - اس کا کوئی قابل قبول ثبوت موجود نہیں کہ جو انملیاں امیر خسرو کی طرف منسوب ہیں، واقعی ان کی ہیں۔

۴ - متا یا متا جاعہ دار - خط ۶۸ بنام مجروح میں ہے: "متا جاعہ دار دس روپے مہینے کا سکہ لیبر (سک نمبر) سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔" بحث ان لوگوں کی تھی جنھیں انگریزی پنشن ملتی تھی۔ (ڈھونڈی) عود کی اشاعت اول میں متا بنوں، اردو سے معلیٰ میں متا بتا۔ جناب فاضل کے متن عود میں بتا، اور حاشیے میں متوا۔

۵ - آذری - غالب نے خط ۲۹ بنام سرور مارہروی میں فارسی شاعری کے مختلف اسالیب کے ذکر کے بعد قطعۂ ذیل نقل کیا ہے، مگر یہ نہیں بتلایا کہ کس کا ہے:

اگرچہ شاعران نغز گفتار ز یک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضی حریفاں خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم ورای شاعری چیزے دگر ہست

مصرع ۱ میں "از روے اشعار" بجائے "نغز گفتار" مصرع ۴ "فریب" یہ "خمار" مصرع ۵ "مبین یکساں" یہ "مشو منکر" بہ حسب تذکرۂ دولت شاہ، جس میں منسوب بہ آذری، اور شعر ۲ کے بعد یہ دو شعر:

زبان معنی ایشاں گہ نظم دہان از گفتۂ صورت فرو بست
ہمہ غواص دریای کمال اند کہ در بحر حقیقت افکندہ شست (ص ۱۰-۱۱)

اسی تذکرے میں نام وولدیت اس طرح ہے: حمزہ بن علی، اور سال وفات ۸۶۶ھ مندرج ہے۔ اس میں آذری کے ہند آنے کا بھی ذکر ہے، اور کسی دوسرے تذکرے میں جس کا نام اس وقت یاد نہیں مرقوم ہے کہ یہاں آکر اس نے بہمن نامہ لکھنا شروع کیا تھا، مگر یہ مکمل نہ ہو سکا۔ اس کی کتاب جواہر الاسرار (نسخۂ خدا بخش) اور بعض مثنویاں جو کلکتہ میں ہیں، میری نظر سے گزری ہیں۔ قطعۂ زیر بحث جواہر الاسرار میں بھی ہے، اور اسی طرح جیسے تذکرۂ دولت شاہ میں ہے۔ نہ جانے غالب نے جو شکل اس کی پیش کی ہے، وہ انھیں کہاں ملی۔ ایک بات اور ہے: "چیزے دگر" سے غالب کیا سمجھے، اس کے معلوم کرنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں کہ ان مثالوں پر غور کیا جائے، جو انھوں نے پیش کی ہیں۔ آذری کی مراد صریحاً متصوفانہ مضامین ہیں۔ قائم کے شعر: "قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیونکر مانوں" الخ، میں (ان اشعار میں ہے جو غالب نے مثال میں دیے ہیں) کسی طرح وہ "چیزی دگر" نہیں، جو آذری کے ذہن میں تھی۔

۶ - آذر کیوان سے متعلق معلومات کا واحد ذریعہ، غالب کے لیے دبستان مذاہب ہے، جو یقین ہے کہ اس کے بیٹے کیخسرو کی تصنیف ہے۔ اس کے اور اس کے حلقے کے لوگوں کے بارے میں جو خرافات اس میں درج ہیں، اسے دیکھ کر وہ اس کے معتقد ہو گئے تھے۔ لطائف غیبی میں ہے: "اگر زردشتیوں میں سے کسی نے فرہنگ .. لکھی ہوتی، یا مسلمان منجم نے کوئی مجموعہ فراہم کیا ہوتا، یا متاخرین میں آذر کیوان کی کوئی تحریر موجود ہوتی، اور ہم اس کو نہ مانتے، اور وہاں اپنے قیاس کو دوڑاتے تو عقل کے فتوے کے مطابق کافر

ہو جاتے" ص ۲۲۳۔ قاطع برہان کی اشاعت ثانی کے دیباچہ جدید میں ہے: "در تاآوران پارس از جکیم جاماسپ تا پنجمین ساسان و در مدالبیان تا بحر العلوم (غالب نے سہواً 'دو العلوم' کی جگہ لکھ دیا ہے) آذر کیوان' و در سخن گستران ایران آن سخن جہانگیران کہ پس از آن روشن ضمیران و بیش از ما فروغ پذیران بودہ اند' از ۔۔ رودکی ۔۔ تا ۔۔ قاآنی ہیچ کس فرہنگ طراز نگشتہ"۔ غالب نے تقریظ سفر نگ دساتیر میں آذر کیوان کا نام اس طرح لیا ہے کہ یہ گویا ہمسایۂ جاماسپ و ساسان ہے۔ عبارت دیباچہ سے دو نتیجے نکلتے ہیں: غالب کیوان کو روشن ضمیر سمجھتے ہیں۔ اس کا زمانہ رودکی سے قبل تھا۔ یقین ہے کہ دوسری بات اسلوب بیان کے سقم کی وجہ سے ہو' اس لیے کہ دبستان سے ثابت ہے کہ وہ رودکی کے سیکڑوں برس بعد فوت ہوا ہے۔ غالب جن توہمات میں گرفتار تھے' ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ چنیود وغیرہ الفاظ استیلائے اسلام کے بعد ان زردشتیوں نے گڑھے تھے' جو منافقانہ مسلمان ہوے تھے' اور یہ دکھانا چاہتے تھے کہ اسلام اور زردشتیت میں بہت سی باتیں مشترک ہیں (قاطع ص ۱۵۰)۔ غالب لطائف کی بحث چنیود میں لکھتے ہیں: "یہ جو متاخرین میں فرزانہ بہرام وغیرہ تلامذۂ آذر کیوان نے اپنی نظم میں ان الفاظ کا استعمال یا صراط کا ذکر لکھا ہے' یہ لوگ تو واضعین لغات کے اخلاف و اعقاب میں سے تھے' اور اپنے اسی عقیدۂ زردشتیہ پر ثابت قدم تھے' کیوں نہ لکھتے؟" ص ۲۲۲۔ واضعین الفاظ منافقین تھے جو دل میں زردشتی رہے' لیکن ظاہرا مسلمان ہو گئے تھے۔ بہرام علانیہ مذہب دساتیر کا تبع تھا' اور وہ خود کسی طرح منافق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بزرگ منافقین میں تھے' یا نہیں' اس کا حال غالب کو کس طرح معلوم ہوا؟ غالب کا بیان علمی مسائل سے متعلق عموماً غیر واضح ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ منافقین نے امور بالا کو صرف ظاہری طور پر عقائد میں شامل کر لیا تھا' اور زردشتیت کی تعلیم کے وقت بتا دیا کرتے تھے کہ یہ دراصل زردشتی عقائد نہیں' یا معاملہ برعکس تھا۔ "اسی عقیدۂ زردشتیہ" سے کیا مراد ہے؟ چنیود وغیرہ جب اصلی عقائد میں شامل نہیں' تو "عقیدۂ زردشتیہ" کیوں کہا؟ یہ بات توجہ طلب ہے کہ بہرام و تلامذۂ دیگر "اخلاف و اعقاب" "منافقین سے ہیں' تو اس کا اطلاق کیوان پر بھی ہو سکتا ہے۔

کیوان کا نسب نامہ دبستان میں اس طرح دیا ہے: آذر کیوان بن آذر گشسپ بن آذر زردشت بن آذر برزین' بن آذر خورین' بن آذر آئین بن آذر بہرام' بن آذر نوش بن آذر مہتر بن کہتر آذر ساسان یعنی ساسان پنجم ص ۴۳ یہ ساسان پنجم معاصر خسرو پرویز ہے۔ کیوان اور اس کے درمیان ۸ پشتوں سے زیادہ ہونی چاہئیں۔ اسی صفحے میں ساسان پنجم ابن ساسان چہارم' ابن ساسان سوم ابن ساسان دوم ابن ساسان اول ابن داراب خرد ابن داراب بزرگ ابن بہمن۔ یہاں بھی زیادہ پشتیں درکار ہیں مختصر یہ کہ یہ نسب نامہ بالکل فرضی ہے۔ پانچ ساسان یکے بعد دیگرے جس طرح دبستان میں ہے' نہیں ہوے اور ساسان پنجم (معاصر خسرو پرویز) محض فرضی شخص ہے۔ واضح رہے کہ غالب کے فرضی استاد عبدالصمد کا نسب بھی اسی پر منتہی ہوتا ہے۔ یہ دساتیر کا آخری پیمبر ہے' اور متن دساتیر کا زبان دری میں مترجم و مفسر۔ اس کے نام کا جو صحیفہ دساتیر میں ہے' اس میں دساتیری خدا نے ساسان پنجم سے وعدہ کیا ہے کہ تیری نسل میں پیمبری رہے گی دبستان ص ۳۵ و ۳۶ و ۳۲۶ میں ہے: ۵ سال کی عمر میں کم خوری و شب بیداری شروع کی' خاص ریاضت کے زمانے میں غذا ایک درم رہ جاتی تھی۔ ۲۸ سال خم میں بیٹھا' آخری زمانے میں ہند آیا' اور پٹنہ میں کچھ دن مقیم رہا۔ ۱۰۲۷ھ میں (شادستان مصنفہ بہرام ص ؟ میں ۱۰۲۸) میں موت' عمر ۸۵ سال۔ شادستان میں ہے کہ ابتدائے سلوک میں "حکمائے سترگ یونان و ہند و پارس" نے خواب میں "اقسام حکمت" اس کے سپرد کیے۔ ایک دن کسی مدرسے میں گیا (نام مدرسہ؟) ہر سوال کا جواب دیا' اور مشکلات حل کیے۔ ذو العلوم لقب ملا (کس نے دیا؟) دو متصوف کیوان کے منکر تھے۔ ان کے مرشد نے جو "عالم و عامل" اور نسباً سید تھا' ایک شب "بیخود" ہو گیا' اور اس عالم میں پیمبر صاحب نے اس سے کہا کہ مریدوں سے کہو کہ کیوان کے منکر نہ ہوں' وہ مرد کامل ہے اور مؤید بتائید الٰہی (آگے نو سطروں میں تعریف) خواب بیخودی سے بیدار ہوا تو ساوی سے مستفسر ہوا کہ کیوان کون ہے۔ اس نے جواب دیا کہ حال میں اصطخر کی طرف سے آیا ہے۔ وہ راوی کے ساتھ اس کے یہاں چلا' مگر اس کی اقامت گاہ کا پتا نہ تھا' کچھ دیر گئے تھے کہ کیوان کا ایک مرید ملا جو اس کی ہدایت سے رہنمائی کے لیے آیا تھا۔ اس کے پاس پہنچے' تو مرشد کا ارادہ سلام میں سبقت کا تھا' مگر

کیوان نے اس کا موقع نہ دیا۔ اس نے خواب کا حال کہا اور اسے چھپانے کی ہدایت کی۔ مرشد نے مرید (کذا) ''ناقص'' کو کیوان کے کمالات سے باخبر کیا اور کہا کہ اس کے منکر نہ ہو۔ کیوان اہل دنیا سے کم تعلق رکھتا، شاگردوں اور حق پژدہوں کے سوا کم لوگوں سے ملتا، اور اپنے کنڈا (؟) ہر نہ کرتا۔ بہاء الدین محمد عاملی اس سے ملنے کے بعد اپنے کو ''پژوہندۂ کیوان'' کہا کرتے تھے۔ ابو القاسم فندرسکی نے آفتاب پرستی و ترک آزار جاندار اس کے شاگردوں کی صحبت میں سیکھا تھا۔ عہد اکبر میں کیوان ''سرگروہ یزدانیان و آبادیاں'' کو خطوط لکھ کر بلایا گیا، لیکن اس نے عذر کیا اور ۱۴ اجزا کی ایک کتاب بھیجی ''در ستائش واجب الوجود و عقول و نفوس و سماوات و کواکب و عناصر و در نصائح پادشاہ.. ہر اول سطر آں پارسی بحث دری بود، و تصحیف آں.. عربی.. چوں قلب می کردند، ترکی بود، چوں تصحیف آں می خواندند، ہندی می گشت'۔ ابو الفضل کو اس سے کمال عقیدت تھی۔ اس کتاب میں کیوان کی ایک مثنوی کے چند اشعار ہیں (ص ۳۷) اور اس کی شرح جام کیخسرو کا ذکر (ص ۴۵)۔ پہلا شعر جو دبستان میں ہے، یہ ہے:

چو زابدانہا برگذشتم روان سپیدم سوے پاک فرخ روان (کذا)

صحیح نسخے میں 'ابدانہا' نہیں، 'ابدامہا' ہے۔ ابدام بمعنی بدن متن ساتیر کا لفظ ہے، اور برہان قاطع میں اسی کے لیے بدون صراحت ماخذ آیا ہے۔ غالب قاطع (ص ۳۰) میں معترض ہیں کہ ابدام کوئی لفظ نہیں، یہ اندام ہے یا ابدان۔ جو اس پر مشعر ہے کہ غالب، اس مثنوی سے واقف نہیں، یا یہ کہ وہ اسے صحیح نہ پڑھ سکے۔

بہرام (رجوع بہ بحث بہرام) کی شارستان کے ۴ چمنوں میں سے ایک جیسا کہ میں نے زردشتیوں سے سنا ہے، اور غالباً کسی کتاب میں بھی ہے، کیوان کے ذکر کے لیے مخصوص تھا، مگر یہ چمن مفقود ہے، اور شارستان طبع ۲ میں جو چمن چہارم ہے، اس کا کچھ سروکار بہرام سے نہیں، اور اس کا موضوع مختلف ہے۔ اس کتاب کے باقی چمنوں سے معلوم ہوتا ہے: کیوان کا قول ہے کہ جو ہے، جو تھا، اور جو ہوگا اس کو میں نے ''براہ الٰہی عین'' دریافت کیا ہے، اسرار الٰہی سے واقف ہوں، اور جو کہتا ہوں، اسے دیکھتا ہوں۔ میرا جسم پیرہن کی طرح ہے، میری روح جب میں چاہوں اس سے نکل جاتی ہے، اور جب چاہوں اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ امام معصوم تھا، اور صاحب ناموس اعظم (رانبیا.. بر احکام صاحب ناموس خوانند، و احکام او را ناموس)۔ ارسطو اسے ہم پایۂ فلاطون سمجھتا تھا۔ بہرام نے کیوان کو بعض انبیا کا ہمسر کہا ہے۔ اس کے نزدیک امامت و نبوت میں کچھ فرق نہیں اور بموجب تحقیق آبادیاں (دساتیر کو ماننے والے) ''امامت در آذر رسنت (آباد و اخلاف آذر کیوان) بعد از نیاگاں۔ کیوان صاحب این فرمودہ، واکنوں نوبت بفرزند نامدار ش کیخسرو اسفندیار رسیدہ''۔ اس نے موبد ہوش، تلمیذ کیوان کا قول نقل کیا ہے ''حاشا و کلا کہ ما بامامت عرب قائل باشیم، واعتقاد ما آنست کہ عرب امامت را نشاید''۔ بہرام نے عربوں کی تذلیل و تحقیر میں کتاب کے کئی صفحے صرف کیے ہیں اور زردشتیوں سے اختلاف کے باوجود، وہ ان کے متعلق لکھتا ہے ''زردشتیان کثرہم اللہ''۔ بہاء الدین محمد عاملی عہد صفوی کے نامور عالم کی زبانی کیوان کو 'امام زمان' کہا ہے، اور نبوت زردشت کی بحث میں ان کی زبان سے یہ کہا ہے کہ کیوان جب اسے تسلیم کرتے ہیں، تو ٹھیک ہے، گفتگو کی گنجائش ہی نہیں۔ ابو الفضل نے ایک دستور العمل متعلق ستارہ پرستی وغیرہ اس سے منگوایا تھا اور کبھی اس سے برگشتہ نہیں ہوا۔ بہرام نے ایک شخص کا قول نقل کیا ہے کہ دستکام یزدانی کشش (آبادی) سے ابو الفضل و فیضی نے طریقۂ آفتاب و کوکب پرستی سیکھا تھا۔ شارستان میں کیوان کی ۲ کتابوں کا ذکر ہے۔ آئینہ سکندری و زردشت فرہنگ۔ یہ دونوں مفقود ہیں۔ (صفحات کا حوالہ بحث بہرام میں ملے گا)۔

میں قطعی ثبوت تو اس کا نہیں پیش کر سکتا، مگر مجھے یقین ہے کہ دساتیر کا اصلی مصنف آذر کیوان ہے۔ دساتیر میں ۱۵ کتب سماوی جو ۱۵ پیمبروں پر نازل ہوئے اور نامۂ سکندر موجود ہیں۔ یہ سب بموجب ادعائے دساتیر آسمانی زبان میں ہیں، ان کا ترجمہ و تفسیر کی زبان دری بتائی گئی ہے۔ ان ۱۵ پیمبروں میں صاحب شریعت صرف پہلا پیمبر آباد ہے، جس کا زمانہ دساتیر کے مطابق ۲۲ ہزار مہاسنکھ سال ہے۔ اس کے بعد جو پیمبر آئے ہیں انھیں پیروی آباد کا حکم دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک زردشت ہے۔ اس کے نام کا جو صحیفہ دساتیر میں ہے وہ اوستا سے مختلف ہے۔ اوستا و دساتیر میں عقائد و احکام کے دونوں کا بڑا فرق ہے۔ دساتیر کے مطابق عالم حادث نہیں، قدیم ہے۔ اس کے خاتمے کا سوال ہی نہیں، اس لیے قیامت بے معنی ہے۔ دساتیر حشر اجساد کو نہیں تناسخ کو مانتی ہے۔ اوستا ان امور میں وہی عقائد پیش کرتی ہے

جو مسلمانوں کے ہیں، مزید یہ کہ اس نبی زردشت اس عالم کا سب سے بڑا انسان ہے۔ دساتیر میں یکے از چہاردہ پیمبران جنھیں تبع آباد کا فرمان آیا ہے۔ (تفصیل اور حوالوں کے لیے بحث دساتیر کی طرف رجوع) نامۂ ساسان پنجم میں جو پیش گوئی ہے، وہ اس لیے ہے کہ کیوان کے دعواے نبوت کے لیے زمین ہموار ہو جائے۔ اس وقت دساتیر کے سوا جو ظاہر ہے کہ اس کے نام سے نہیں ہو سکتی اس کی صرف ایک مثنوی موجود ہے جس کی تصنیف کا وہ مقر ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ دساتیر کے اردگرد جو ادب پیدا ہوا تھا، اس میں سے بہت سی کتابیں یا تو اس نے خود دوسرے ناموں سے لکھی تھیں یا لکھوائی تھیں۔ مثنوی میں دعوائے نبوت نہیں، مگر سیر افلاک کا مفصل بیان ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے دعوائے پیمبری ضرور کیا، (اس کے معتقدین کی جو بعض کتابیں کاما اورینٹیل انسٹی ٹیوٹ میں ہیں۔ ان میں اسے صراحۃً نبی کہا گیا ہے) مگر اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہو سکا۔ تقیّے کو دساتیر جائز رکھتی ہے۔ وہ مختلف اشخاص کے سامنے مختلف رنگوں میں آتا ہوگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مصنف دساتیر فریب خوردہ نہیں ہو سکتا، اس کا مقصد فریب دینا ہے۔ بہرام وغیرہ جو اس کے ماننے والے تھے، ممکن ہے کہ ان میں سے بعض اس کے ساتھ سازش میں شریک ہوں، اور بعض فریب خوردہ۔ ایک سوال یہ ہے کہ خود کیوان کا اصلی عقیدہ کیا تھا۔ کیا دساتیر کی تصنیف کے بعد بھی آبائی مذہب پر قائم تھا، یا یہ حرکت مصلحتاً کی تھی۔ اس کا قطعی جواب، پیش نظر مواد سے نہیں دیا جا سکتا۔

غالب عمر بھر اس دھوکے میں رہے کہ دساتیر زردشتیوں کی کتاب مقدس ہے، اور جو باتیں اس میں انھیں نہیں ملی، اسے وہ اصلی زردشتی عقائد کے خلاف سمجھتے رہے۔ غالب نے دبستان کا بھی بغور مطالعہ کیا ہوتا تو آبادیوں اور زردشتیوں کا فرق انھیں کسی حد تک معلوم ہو جاتا۔ اس میں دونوں کے عقائد وغیرہ کی بحث الگ الگ ہے۔

۷۔ دیوان نہال چند۔ قاطع القاطع ۱۲۸۳ھ میں ہے: چند سال قبل ایک دن میرزا غالب دیوان نہال چند کے بیٹے کی شادی کے سلسلے میں جو بزم رقص و سرود تھی، اس میں شریک تھے (ص ۱۷۹-۱۸۰)

۸۔ جوالا سہائے۔ قاطع القاطع (ص ۱۷۹ و ۱۸۰) دیوان نہال چند کے یہاں تقریب میں (وہی جس کا ذکر ۷ میں ہے) غالب جوالا سہائے سے جو اس زمانے میں "سررشتہ دار کچہری دیوانی" دہلی تھے، ہم کلام تھے کہ لفظ 'منار' بالکسر ان کی زبان پر آیا۔ جوالا سہائے نے جو اس کا اعادہ کیا تو 'منیار' کہا۔ غالب نے اس کی تصحیح کی۔ جوالا سہائے نشے میں تھا، متوجہ نہ ہوا، اور پھر یہ لفظ اسی طرح اس کی زبان پر آیا۔ غالب نے بآواز بلند کہا کہ منیار بدون یا ہے۔ امین الدین اس وقت خاموش تھا۔ اب سررشتہ دار سے مخاطب ہو کر بولا کہ میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بیائے تحتانی غلط ہے اور میم مفتوح ہے۔ غالب قدرے تامل کے بعد بولے کہ ہاں صیغۂ ظرف ہے، نور سے، بالفتح چاہیے۔

۹۔ قیصر التواریخ جلد ۲ مصنفہ سید کمال الدین حیدر مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۶ء: "نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب تخلص اولاد پشنگ افراسیاب، استاد بادشاہ فن شعر میں، اس معرکے میں بسلامت رہے لیکن اجل بھی ورلے نہ تھی۔ ایک رسالہ بھی اپنے طرز کلام پر اس معرکۂ خاص کا چھپوایا۔ حکام نے بطائف الحیل ان کا پنشن سرکاری موقوف کر دیا۔ بعد اس کے نواب یوسف علی خاں رئیس رامپور خدمت کرتے رہے، تاآنکہ دلی میں انتقال کیا۔" ص ۲۶۴۔ اس کتاب میں موقوف ہو کر جاری ہونے کا ذکر نہیں۔

۱۰۔ شیریں۔ دیوان غالب مرتبہ جناب عرشی ص ۳۱۰ میں شعر ذیل اور ص ۳۹۳ میں اس کے متعلق مرقوم ہے کہ لطائف غالب مصنفہ حکیم محمد حسن میرٹھی میں ہے کہ دلی کی ایک نامی رنڈی حج کو چلی، غالب نے یہ شعر کہا۔ شعر:

بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دلی حج کو چلی　　مثل ہے نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی

لطائف غالب کے سوا اس شعر کے غالب کی طرف انتساب کا کوئی ثبوت موجود نہیں، اور اس کتاب کا یہ حال ہے کہ جو لطیفہ بھی پسند آیا، خواہ اس کا دور کا تعلق بھی غالب سے نہ ہو، مصنف نے اسے غالب سے منسوب کر دیا ہے۔ یہ معاملہ غیر معروف لطائف تک محدود ہوتا تو مصنف کی پستی اخلاق ہی کی شکایت ہوتی۔ کمال یہ ہے کہ گلستاں تک کو نہ چھوڑا، اور اس میں کرنوم کے کسی خاص موسم میں باہر نہ نکلنے سے متعلق جو سوال و جواب ہے، وہ بھی لطائف غالب میں موجود ہے۔ شعر زیر بحث کے متعلق آب حیات کے ترجمۂ غالب میں ہے: "دلی میں شیریں ایک بڑی نامی رنڈی تھی وہ حج کو

باگ، بچالگن۔ ...

چلی، آپ (عبداللہ خاں، اوج) نے کہا: بجا ہے الخ۔" ظاہرا ترتیب دیوان کے وقت جناب عرشی کو یاد نہ رہا کہ یہ شعر آبِ حیات میں اوج کے نام سے ہے۔ یہ تو باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بحیثیت راوی میرٹھی کو مرجح سمجھتے ہیں۔

۱۱۔ سید عبداللہ۔ آبِ حیات کے ترجمۂ غالب میں ہے: "برہان ساطع کے اخیر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام سے ہیں، وہ بھی مرزا صاحب کے ہیں۔" آگے چل کر آزاد نے ساطع برہان کے متعلق بتایا ہے کہ یہ غالب کی قاطع برہان کا جواب من جانب حافظ عبدالرحیم تھا، نامۂ غالب جواب الجواب ہے: یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ غالب کی مخالفت میں جو کتاب لکھی گئی تھی، اس کے اخیر میں غالب کی تحریر کس طرح آ گئی، اور ساطع کے اخیر میں کسی دوسرے شخص کی، خواہ وہ سید عبداللہ ہوں، یا کوئی اور تحریر (قطع نظر از قطعۂ تاریخ) ہے بھی نہیں۔ قیاس مقتضی ہے کہ آزاد کی مراد ساطع نہیں، دافع هذیان مصنفۂ نجف علی خاں ہو، جو غالب کی حمایت میں لکھی گئی تھی، اور چند ورق، در اصل سوالات عبدالکریم ہوں۔ اس رسالے کے نسخ موجودہ میں نام مطبع اور سال انطباع نہیں، لیکن قرینہ ہے کہ یہ اسی وقت اور اسی مطبع میں چھپا تھا، جہاں دافع طبع ہوئی تھی، اور چونکہ بعض اصحاب کے پاس جو دافع و سوالات کے نسخے ہیں، یک جا ملے تھے، ان کا خیال ہے کہ سوالات، دافع کا جزو ہے۔ بہرحال، سید عبداللہ نام کے کسی شخص نے اس ہنگامے میں جو قاطع کی اشاعت کے بعد برپا ہوا تھا، شرکت نہیں کی۔

۱۲۔ اوج تخلص، عبداللہ خاں ساکن سردھنہ، زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ طبیعت مائل بہ کجی تھی، مضامین بلند باندھنا چاہتے تھے، مگر اس کا حق نہ ادا کر سکتے۔ بعوض حسب دلخواہ نہ ہوتی تو بہت شاکی ہوتے تھے۔ مشاعرے میں شعر ایسے لہجے میں پڑھتے کہ خلل دماغ پر دلالت کرتا۔ "بیشتر کاملان سخن بطریق ظرافت.. استاد کہتے" اور وہ اسے حقیقت سمجھتے۔ مرزا محمد، نبیرہ شاہ عالم کے نوکر اور استاد تھے، گلستانِ سخن میں جس وقت حال درج ہوا، اس سے ایک سال قبل فوت ہوئے۔ آبِ حیات کے ترجمے میں ہے: "ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لا سکتے تھے۔.. سنگلاخ.. زمینوں میں غزل کہتے.. پڑھتے اس زور شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بعض اشخاص شہر کے اور قلعے میں اکثر، شہزادے شاگرد تھے، مگر استاد سب کہتے تھے.. ذوق.. باوجود کم سخنی.. خوب خوب کہتے اور مکرر پڑھواتے تھے۔ مرزا (یعنی غالب) تو ایسے دل لگی کے مصالح ڈھونڈتے رہتے تھے.. شعر سنتے اور کہتے تھے کہ یہ سب کافر ہیں جو تمھیں استاد کہتے ہیں، شعر کے خدا ہو خدا۔ سجدے کا اشارہ کرتے اور کہتے، سبحان اللہ سبحان اللہ.. ایک دن رستے میں ملے.. کہنے لگے آج گیا تھا، انھیں بھی سنا آیا۔ میں نے کہا کیا، کہا کہ کہا: ڈیڑھ جز پہ بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب — غالبؔ سا ان نہیں صاحب دیوان ہونا پھر بیان کیا کہ ایک جلسے میں مومن خاں بھی تھے.. میں نے.. غزل.. سنائی مقطع پر بہت حیران ہوئے۔" کہ جس کو کہتے ہیں چرخ ہفتم ورق ہے دیوان ہفتمیں کا۔ پوچھنے لگے کہ کیا آپ سا توان دیوان لکھتے ہیں، میں نے کہا کہ.. اب تو آٹھواں ہے۔"

۱۳۔ میر کرار حسین۔ باغ دودر کے ایک خط بنام قطب الدولہ میں ہے: بدر مکمش، میر کرار حسین سلمہ "عمائد سادات والاتبار" سے ہیں، اور "روشناس" "بادشاہ"۔ "فرماندہانِ انگلشیہ" نے انھیں خطاب شرف الوکلا دیا ہے۔ نوشتۂ رجب ۱۲۶۵ھ گلستانِ سخن کے ترجمۂ مکمش میں نام کے بعد مرحوم ہے۔ اس سے زمانۂ وفات کی کسی حد تک تعیین ہو سکتی ہے۔

۱۴۔ شاہ غلام زکریا ان لوگوں میں ہیں جنھیں محمد علی خاں (باندا) کے نام کے خطوں میں ایک سے زیادہ بار سلام لکھا ہے۔ مجہول شد دھلی۔

۱۵۔ سفرنگ دساتیر (یعنی شرح دساتیر) از نجف علی خاں جھجری مصنف دافع هذیان (ردّ محرق قاطع برهان) مطبوعہ مطبع سراجی بفرمائش امیر مرزا دہلوی ۱۲۸۰ھ کتاب صفحہ ۲ سے شروع اور ص ۱۹۴ میں ختم ہوتی ہے۔ آخر میں جو عبارات ہیں، ان میں معذرت کی ہے کہ مسلمان ہو کر زردشتی صحیفے کی شرح لکھی۔ کتاب میں متن دساتیر جو بموجب ادعائے دساتیر آسمانی زبان میں ہے۔ ص ۹۹ اس پر ختم ہے کہ دساتیر کے ۲ نسخوں میں بعض الفاظ مختلف طور پر ہیں، مگر نجف علی خاں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ دو نسخے کون سے ہیں۔ یہ بھی غالب کی طرح اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ دساتیر زردشتیوں کی کتاب مقدس ہے، اور انھوں نے اپنے دیباچے میں بکثرت مصنوعی الفاظ جو ترجمہ و تفسیر مذکور میں ہیں، استعمال کیے ہیں۔ غالب کی تقریظ کتاب کے مابعد ۲ صفحوں میں ہے، اور اس کے بعد ان کے شاگرد سالک کی۔

عنوان تقریظ یہ ہے: "تقریظی کہ دالا فرگاہ، خردی باز آگاہ، ستودہ گفتار، سخن پرور، سرمایۂ نازش کمال ہنر، جناب مرزا اسد اللہ خان المتخلص بہ غالب المشہور بہ میرزا نوشہ ادام اللہ تعالیٰ بریں نامہ نوشتہ"۔ تقریظ اس کتاب سے آثر غالب میں نقل ہوئی، اور باغ دودر میں شامل ہے۔

اقتباسات تقریظ:

"ہنرور آفریں درخور را آفرین گستری باید کہ نیروی باز گشادانشتہ باشد، تا .. باندازہ بایست تواند ستود، نہ چون من ابلہی ... ستودن بدا باز مانست، و نادانستہ ستودن و ناستودن را یک فراز مانست، اما ذوق دانش ستای (ستایی ؟) .. زبان را خموش نگذاشت۔ بدل گفتم اگر ہمہ دگر اسمہ "بدل گفتم اگر ہمہ ذکر است" ـــ باغ دودر۔ میرا قیاس ہے کہ اسمہ دراصل "اہمہ" دساتیری لفظ ہے۔ "ہمہ" باضافۂ الف نفی) ماہم .. سخنی .. گفتہ باشیم۔ دیدہ وری کوتا بنگرد کہ امروز .. یوسفی را .. بیانزا آوردہ اند کہ زیبائی جمال باکمالش سرمایۂ نازش روزگار است، نی نی پہلوی زبان پہلوانی را .. بر روی کار آوردہ اند کہ استادان استادان را گزین آموزگار است۔ جاماسپ مایہ، ساسان (مراد از ساسان پنجم) نمایۂ آذر کیوان پایہ، مولوی نجف علی خاں .. کہ روان گویا بہ پیکر سخن بنیش از آن نازد کہ پیکرہائی دیگر بروان گویا .. غالب .. چون حسن عبارت نگریست، بچشم داشت دفع گزند چشم زخم سود مند حرزی بنشت"

اس تقریظ میں بھی دساتیری الفاظ ہیں، اور جو تعریف کی ہے اس سے زیادہ کسی دوسرے فارسی نثر لکھنے والے کی نہیں کی۔ یہ اس کے عشر عشیر کے بھی مستحق نہیں، مگر غالب کو جو مدد صاحب محرق کے خلاف ان سے ملی تھی، اس کا بدلہ دینا تھا۔ دساتیر کے اردگرد جو ادب پیدا ہوا تھا، اس سے یہ ناواقف ہیں، اور بعض معمولی الفاظ کے متعلق ان کے بیانات محل نظر ہیں۔ مویدان کے نزدیک بکسر با ہے مگر بہیر بد بضم ما، ص ۴۳، حالانکہ دونوں میں ایک ہی لاحقہ "بد" ہے، شید بہ یائے مجہول ص ۴۴، لیکن جمشید جس کا ایک جز شید ہے، بہ یائے معروف ہے۔

۱۶۔ ترک شراب۔ باغ دودر میں ایک دوازدہ بیتی قطعہ ہے جس کی بیت اول یہ ہے:

ہر شب بقدح ریختمی بادۂ گلفام　　آری زدوسی سال مرا قاعدہ این بود

اس کے بعد یہ مطالب منظوم ہوئے ہیں: ترک شراب کو ۶ دن گزر گئے ہیں، یہ بڑی اذیت میں بسر ہوئے۔ دو صاحبوں نے (نام نہیں دیا) نہ از رہ بغض، بلکہ از روئے شریعت شراب نوشی چھوڑنے کے لیے کہا تھا، مگر میں نے ان کی بات نہ مانی تھی۔ چھوٹی تو اس طرح کہ جس شراب فروش سے شراب خریدا کرتا تھا، اس کے روپے میرے ذمے معمول سے زیادہ ہو گئے، اور اس نے آئندہ ادھار دینے سے انکار کیا۔ روپے بھی پاس نہ تھے کہ دوسری جگہ خریدتا۔ غرۂ شعبان سے شراب بند ہے، تاریخ "غالب پژمردہ" (= ۱۲۹۱) سے یہ تخرجۂ شش نکالی۔ غالب کی وفات ۱۲۸۵ھ کی ذیقعدہ کو ہوئی، غالباً ۶ شعبان ۱۲۸۵ھ کے بعد بھی پینے کا اتفاق نہ ہوا۔

۱۷۔ ثنائی تخلص خواجہ حسین مشہدی (منتخب التواریخ) بعض تذکروں میں جو بارھویں صدی کے ہیں سال وفات ۹۹۶ ملا۔ یقین ہے کہ اس کی قدیم تر سند مل جائے۔ اس شاعر کا مقطع ذیل باغ دودر کے ۲ خطوں اور مجموعۂ دھلی کے ایک خط میں آیا ہے، اور غالب نے اسے اپنے حالات پر منطبق کیا ہے، غزل جس کا یہ مقطع ہے، دیوان ثنائی (خدا بخش) میں موجود ہے، مگر اس میں "زمان" بہ جائے "جہاں"۔ غالب نے دیوان شاید ہی دیکھا ہو۔ یہ علم نہیں کہ شعر کہاں سے لیا:

جہاں بمہر دگیتی دشمن و دلدار مستغنی
مرا بہ آرزو ہائے ثنائی خندہ می آید

۱۸۔ جعفر چہارم۔ سبد چین و باغ دودر میں یہ قطعہ ہے:

روزی ز رہ ستم ظریفی　　بر لاشۂ جعفر چہارم
درخواہش پاسخ سوالات　　صد بار فغاں زدم کہ قم قم
از زیست نیافتم نشانی　　جز یک دو سہ بارہ جنبش دم
از دیدن ایں شگرف رودار　　گشتند بغصہ جمع مردم
زان زمرہ یکے بمن رخ آورد　　کی کردہ طریقۂ خرد گم
ایں پیکر خاص را بہ طنبور　　البتہ روا بود ترنم
جز جنبش گوش و دم چہ خواہی　　از جعفر چارمین تکلم
در بانگ زند حذر کہ جمہور　　دانند نہیق را تبسم
انگوں نہ کساں چہ آفرینی　　اے خالق آسمان و انجم

مقتضائے مقام ہے کہ جعفر = خر ہو، اس لیے کہ "خر طنبور" ہے، لیکن تاج العروس میں یہ معنی نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی شخص کی ہجو ہے، مگر یہ شخص کون ہے، یہ معلوم نہیں، اور کسی کو جعفر چہارم کہنے کی وجہ کیا ہے یہ بھی واضح نہیں۔ دیوان مروجہ میں میرزا جعفر کی شادی کی تاریخ ہے مگر یہ قرین قیاس نہیں کہ اس قطعے کا تعلق اس شخص سے ہے۔

۱۹۔ مبتلی تخلص میر احمد حسین۔ ایک خط ان کے نام کا پنج آہنگ کی کل اشاعتوں میں ہے۔ اس میں مرقوم ہے:

اقامت ٹونک تمہارے مرتبے کے منافی ہے۔ تم نے شغل عدالت دیوانی ناحق چھوڑ دیا۔ تجمل حسین خاں، نواب فرخ آباد نے مجھے بلایا ہے اسی ہفتے آجاؤ، اور میرے ساتھ وہاں چلو۔ (اس کا ثبوت موجود نہیں کہ مبتلی دہلی واپس آئے یا نہیں۔ غالب کا فرخ آباد جانا نہ ہوا، ورنہ اس کا ذکر کہیں نہ کہیں ضرور ملتا)۔ باغ دو در میں ان کے نام کے ۱۲ خط ہیں:

(۱) میر مہدی (مجروح) سے رامپور میں ۸۰ روپے ماہانہ کی ملازمت پہ قناعت نہ کرنے، بیماری سے صحت یاب ہونے، اور آمادۂ سفر لکھنؤ ہونے کا حال معلوم ہوا۔ ایک ہفتے کے بعد نوروز علی خاں کو دوسرا خط لکھوں گا، قطب الدولہ سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں (۲) خط ملا، نواب صاحب (مراد از قطب الدولہ) قدردان شرفا ہیں، اس "امیر بے نظیر" کا ساتھ نہ چھوڑو، اور جو مشاہرہ دیں اس پر قناعت کرو۔ ۲۹ جون ۱۸۴۸ (۳) اس "قوم" (کون لوگ؟) کی بدردشتی کا رنج نہ کرو۔ میر تفضل حسین خاں کے نام مختارنامہ لکھا اور روپے خزانے سے برآمد کرکے حوالۂ فیض علی کرنا چاہیے۔ (۴) دیوان چھپ کر دور دور پہنچا؛ قصیدۂ مدح "جنت آرام گاہ" (مراد از امجد علی شاہ، پدر واجد علی شاہ) کیونکر دوسرے کے نام کردوں؟ اودھ سے کچھ وصول ہونے کی صورت..... (۵) بتاریخ ۱۳ نومبر ۱۸۴۸، اکیس روپے ۱۲ آنے کی ہنڈوی بھیج چکا ہوں (کس لیے، یہ نہیں لکھا)۔ نوروز علی خاں کو تمھارے متعلق لکھ چکا ہوں۔ شاہ اودھ سے وصول زر کی باتیں (۶) یہ دیکھو کہ قطعے اور خط میں تمھارا ذکر کس طرح ہے۔ آج جمعہ ۴ محرم ہے۔ سید اکبر علی تمھیں خط بھیج رہے ہیں، یہ خط اسی کے ساتھ ہوگا (۷) شاہ اودھ (مراد از واجد علی شاہ) مجنوں محض ہے۔ میری قسمت ہی ایسی ہے کہ بات بن بن کر بگڑ جاتی ہے۔ تمھاری طرف سے "اندیشہ ناک" اور قطب الدولہ کے لیے غمگین ہوں۔ ۵ جولائی = ۱۳ شعبان (۸) سہ شنبہ ۲۳ جنوری کو تاریخ بمبئی بھیجی، آج ۴ فروری ہے، اور اب تک رسید نہیں آئی (۹) تاریخ بمبئی اپنی جانب سے راجا امداد علی خاں بہادر کو پیش کرو، اور انھیں اپنا ممنون بناؤ۔ وہ کیا جانیں کہ میں کون ہوں، تمھاری ناموری سے میری بلند نامی ہے۔ یہ بتاؤ کہ اتنی مہربانی کے باوجود نواب نے تمھیں نوکری کیوں نہیں دی، اب تک اور تمھارا خرچ کس طرح چلتا ہے، اور آئندہ کے لیے کیا امید ہے؟ میر امام الدین (خسر مبتلی) ویسے ہی ہوں گے، جیسا لکھتے ہو مگر بزرگ ہیں، میرے سامنے تمھیں برا نہیں کہا، سمجھے ہوں گے کہ میں ایسی بات نہیں سن سکتا۔ ۲۵ صفر ۱۲۶۵ = ۲۱ جنوری ۱۸۴۹ (۱۰) خط ملا، اور سود مند نصائح دل نشین ہوئے۔ ظاہر ہوا کہ شاہ جی (ان کا نام نامعلوم۔ باغ دو در میں ایک شاہ صاحب کے نام کا خط ہے، وہ یہی ہیں) کم التفات کرتے ہیں۔ اپنی عقل خداداد سے کام لو، اور خدا سے امیدوار رہو۔ پشیمانی ہے کہ نوروز علی خاں کو تمھارے کہنے سے کیوں خط لکھا جاتا تھا کیا جواب ہوگا۔ خدا تمھیں پایۂ بلند کو پہنچائے۔ محرم ۱۲۶۵۔ (۱۱) تم جس دن سے لکھنؤ میں ہو، اور تمھاری تحریروں سے معلوم ہوا تھا کہ قطب الدولہ کو تم سے انس ہے، یقین ہو گیا تھا کہ تم جو بمنزلۂ فرزند ہو اور سعادت مند، عجب نہیں اگر قطب الدولہ کو اس پر مائل کرو کہ وہ شاہ اودھ سے میری سفارش کریں، مگر قسمت کو کیا کروں؟ میر مہدی نے تمھارا خط دکھایا، جس سے معلوم ہوا کہ تمھیں ناکام ہو کر لکھنؤ سے کہیں اور جانا ہوگا۔ خدا اور ارواح آئمہ کی قسم، اپنا حال ٹھیک ٹھیک لکھو (۱۲) حروف لفظ عربی بجائے خطی ہے۔ قطب الدولہ سے تعلق تمھیں اور مجھے مبارک۔ اس "جوانمرد صاحبدل" کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ نوشتہ ۷ ربیع الاول: ۶ مارچ (۱۳) غالب نے فرض کر لیا ہے کہ شاہ اودھ سے قصیدے کا صلہ ۵ ہزار ملے گا، اس میں سے پانچ سو وہ مبتلی کو دینا چاہتے ہیں، یہ دریافت کرتے ہیں کہ اس کی کیا صورت پسند ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ روپے دہلی کس طرح بھیجے جائیں۔ مبتلی کے بارے میں لکھا ہے: اگر تمھاری جگہ "روح الامین" (بھی) اس کام پر متعین کرتا، تو وہ اس سے بہتر نہ کرتا۔ تمھاری امید پر زندگی ہے، بیٹے پدر پیر کی خدمت کرتے ہیں، اگر صلہ اس طرح

مل گیا کہ میرے اور تمھارے سوا کسی کو اس کا علم نہ ہو تو باقی عمر تمھارے سایۂ احسان میں گزاروں گا۔ نوشتہ ۲۲ دسمبر روز عید نصاری، ۲۳ دسمبر۔ مکتوب غالب بنام قطب الدولہ مورخہ ۱ رجب ۱۲۶۵ھ/۲۴ مئی ۱۸۴۹ء (باغ دو در) میں میکش کے متعلق مرقوم ہے: انھیں مجھ سے پیوند روحانی ہے۔ ان کے والد میر کرار حسین نے انھیں ناز و نعمت سے پالا، اور علم و ادب سکھایا ہے۔ پیش گاہ حکام سے منشور وکالت عدالت بھی انھیں حاصل ہوا ہے۔ ان کی بلند ہمتی اس پر قانع نہ ہوئی، اور یہ خوان نوال شاہ اودھ کے ریزہ خوار ہونا چاہتے ہیں۔ میں ان کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ میری دو آرزوئیں ہیں، ایک یہ کہ یہ کامیاب ہوں، دوسری یہ کہ قصیدے کا صلہ ملے، مگر قطب الدولہ کی وساطت سے صلہ نہ ملا، مفصل بحث واجد علی شاہ کے ذکر میں ہوگی۔

اردوئے معلی میں میکش کے نام کے ۲ خط ہیں: (۱) "بھائی میکش .. ہزار آفریں .. خدا جانے وہ خوب کے کس مزے کے ہوں گے جن کی تاریخ ایسی ہے .. کہیں یہ .. خیال میں نہ آئے کہ یہ حسن طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو .. بفرض محال یوں ہی عمل میں لاؤ گے .. تو ہم بھی کہیں گے تازہ شے بہتر پارہ سو بہتر۔" (۲) "میکش بیمار ہیں، نہ غالب ملنے جا سکتے ہیں، نہ وہ آ سکتے ہیں۔ مکتوب بنام سرفراز حسین میں ہے: "میکش چین میں ہے، باتیں بناتا پھرتا ہے، سلطان جی میں تھا، اب شہر میں آ گیا ہے۔ دو تین بار میرے پاس آیا، پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ علی کو اور لڑکی کو بھرا پور میر منیر علی کے پاس بھیج دیا ہے۔ خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے"۔ اسی کے ایک اور خط میں ہے: "میکش کا حال .. کچھ .. معلوم ہے؟ مخنوق ہوا۔ گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں"۔ ایک خط میں چند مقتولین جنگ ۱۸۵۷ء کے ذکر کے بعد لکھا ہے: "ہائے میں بھول گیا، حکیم رضی الدین حسن اور میکش"۔ ایک میں یہ عبارت ہے "کل سے میکش بہت یاد آ رہا ہے"۔ کلیات فارسی میں ایک رباعی ہے:

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم　　شان دگر و شوکت دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست　　در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

جوہر، جواہر سنگھ ہیں، یہ اور میکش دونوں فارسی گو تھے۔

۲۰۔ شوق و ثبات تخلص شاہ امین احمد شاہ امیر الدین، دعا سجادہ نشین خانقاہ شاہ شرف الدین بہاری، بہار شریف۔ متولد ۱۲۴۸ھ۔ فارسی میں متعدد مثنویاں کہیں، غزلیں بھی ہیں، مگر دیوان فارسی مرتب نہیں۔ دیوان اردو غیر مطبوعہ ہے (نمائش ادارۂ تحقیقات اردو کے لیے آیا تھا، اور میری نظر سے گزرا تھا، اس وقت پیش نظر نہیں)۔ وفات ۱۳۲۱ھ۔ یہ حالات تاریخ شعرائے بہار جلد ۱ مصنفہ راسخ عظیم آبادی سے ماخوذ۔ اس کتاب میں ان کے جو اشعار ہیں، ان میں اشعار ذیل بھی ہیں:

خار زار عشق سے اے شوق نکلو تم کہیں　　گلشن ہستی سے ہو جاؤ گے ورنہ گم کہیں
تن سے سر کٹ گیا حل ہو گئی مشکل میری　　واہ کیا عقدہ کشا ناخن شمشیر بھی تھا

طرز غالب مجھے اے شوق بہت ہے مرغوب
ابتدا میں تو میں کچھ معتقد میر بھی تھا

★

"..... شاعری غالب کے زمانے میں تہذیبی قدر و قیمت رکھتی تھی۔ یہ داد عیش بھی تھی اور سامان تعیش بھی ... ان کے یہاں مذہبیت نہ گہری ہے نہ زیادہ اہم۔ وہ ہندوستانی تصوف کی ایک آزاد اور انسانیت اور وحدانیت تو لے لیتے ہیں مگر اس کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ ہاں ان کے یہاں جو وسیع المشربی ہے وہ ان کی انسان دوستی کو ظاہر کرتی ہے"

______ آل احمد سرور

(مطالعہ غالب)

غالب کے خطوط افرادِ خاندان کے نام

نادم سیتاپوری

غالب نے قدر بلگرامی کو ایک خط میں لکھا ہے:

" سید صاحب ۔ تم نے جو خط میں برخوردار کامگار مرزا عباس بیگ خان بہادر کی رعایت اور عنایت کا شکریہ ادا کیا ہے تم کیونکر شکر گذار ہوتے ہو ۔ جو کچھ نیکی اور نکوئی اس اقبال نشان نے تمہارے ساتھ کی ہے وہ بعینہٖ میرے ساتھ کی ہے اس کا سپاس میں ادا کروں ۔ خدا قسم دل سے دعائیں دے رہا ہوں بھائی ! اس کا جوہر طبع از روئے فطرت شریف ہے پروردگار اس کو سلامت رکھے اور دارج اعلیٰ کو پہنچا دے ۔ یہ اپنے خاندان کا فخر ہے اور چونکہ اس کی "ماں" کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور قوم اور ذات ایک ہے پس وہ فخر میری طرف بھی عائد ہوتا ہے وہ اپنے جی میں کہتا ہوگا کہ ماموں (غالب) میری بیٹی کے بیاہ میں نہ آیا اور "صرف زر" سے جی چرایا ہے۔ میں تو زر کو خاک و خاکستر کے برابر بھی نہیں سمجھتا ۔ مگر کیا کروں کہ مجھ میں دم ہی نہ تھا کاش کہ جب ایسا ہوتا جیسا اب ہوں تو سب سے پہلے پہنچتا ۔ جی اس کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے دیکھوں اس کا دیکھنا کب میسر آتا ہے میں اب اچھا ہوں ۔ برس دن صاحبِ فراش رہا ہوں چھوٹے بڑے زخم بارہ اور ہر زخم خونچکاں ۔ ایک درجن پھاہے لگ جاتے تھے جسم میں جتنا لہو تھا پیپ ہو کر نکل گیا تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے وہ کھا کر جیتا ہوں ۔ کبھی کھاتا ہوں کبھی پیتا ہوں ۔ مرض کے آثار میں اب بھی یہ نشان موجود ہے کہ دونوں پاؤں کی دو انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی ہیں سہذا متورم ہیں ۔ جوتا نہیں پہنا جاتا ۔ ضعف کا تو بیان ہو ہی نہیں سکتا مگر ــــ ہاں یہ میرا شعر ہے

ملکہ پھانگی ، و مدنگ

در کشاکش ضعفم نہ گسلد رواں از تن
ایں کہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ہاست

اب کے رجب یعنی ماہ آئندہ کی آٹھویں تاریخ سے سترواں برس شروع ہوگا ۔

چو ہفتاد آمد اعضا رفت از کار

اس لیے اب شکوۂ ضعف نادانی ہے ۔ ایمان سلامت رہے ۔

نجات کا طالب ۔ غالب

سہ شنبہ ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء

[صفحہ ۱۹۲-۱۹۳ ۔ ادبی خطوطِ غالب (طبع ہفتم) ایجوکیشنل پریس ۔ کراچی ۔ ۱۹۶۴ء]

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

" صاحب ۔ تم سے پہلے یہ پوچھنا ہے کہ جب تم جانتے ہو کہ "مرزا عباس" میری حقیقی بہن کا بیٹا ہے تو پھر میں مرزا (عباس بیگ) کی اولاد کا نانا کیونکر ہوا ۔ ؟ مرزا (عباس بیگ) کی بیوی میری بہو ۔ بیٹی نہیں ہے ۔ تم نے جو لکھا ہے کہ میرے نواسے کی شادی ہے ــــ کیا سمجھ کر لکھا ہے ؟ میں مرزا (عباس بیگ) کی اولاد کا نانا کیونکر ہوا ۔ ! بھانجے کی اولاد پوتا ہوتی ہے نہ کہ نواسہ نواسی ۔"

(صفحہ ۲۸۲ و ۲۸۳ ۔ ادبی خطوطِ غالب)

یہ مرزا عباس بیگ خان بہادر وہی ہیں جن کا ذکر احوالِ غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو (صفحہ ۱۹۰) میں "غالب کے چند اعزہ" کے تحت کیا گیا ہے اور غالب کے ان "باقیات الصالحات" کو غالب کے سسرالی رشتہ داروں میں شامل کر کے ان کی تاریخی اہمیت کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ غالب

کے پسماندگان میں ان کے سوا کوئی نہیں ہے۔

غالب اپنی صاحبزادی و اولاد کو "آغوش لحد" میں سلانے کے بعد بالکل یک و تنہا رہ گئے تھے اس دنیا میں۔ بیوی کے علاوہ ان کے ہم نسب اعزہ میں ان کی حقیقی بھتیجی عزیز النساء بیگم (دختر مرزا یوسف بیگ) کے بعد صرف ان کی حقیقی بہن "چھوٹی خانم" کی اولاد ہی ہے جسے ان کے باقیات الصالحات کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ قدر بلگرامی کے نام ان دونوں خطوط سے ظاہر ہے کہ غالب کی نظر میں ان رشتوں کی کتنی اہمیت تھی اور ہوتی بھی کیوں نہیں؟ حقیقی بہن اور وہ بھی اکلوتی بہن کی اولاد!

مرزا اکبر بیگ بدخشی (غالب کے بہنوئی) دلی کے عمائدین میں تھے جن کا سلسلۂ نسب واد اسپر پوش تک پہنچتا تھا۔ شاہان دہلی سے بھی قرابتیں تھیں۔ اکبر بیگ بدخشی کے ایک بھائی جواد الدولہ مرزا افضل بیگ اور ایک بہن خواجہ امان مترجم بوستان خیال کی والدہ تھیں جواد الدولہ کی نسل سے چوتھی پشت میں مرزا فرحت اللہ بیگ اور مرزا عظمت اللہ بیگ تھے!

غالب کی بہن چھوٹی خانم جنھیں مرزا پیار میں "بوا" کہتے تھے ان کا شجرہ درج ذیل ہے:

- مرزا اکبر بیگ بدخشی، شوہر چھوٹی خانم
  - مرزا عاشور بیگ
    - احمد بیگ
    - خداداد بیگم
    - نیج الدین بیگ
    - محمود بیگ
  - مرزا عباس بیگ خاں بہادر
    - وجیہہ النساء زوجہ محمود بیگ
  - مرزا جواد بیگ عرف مرزا افضل
    - مرزا محمد سعید خاں، وفات ۱۹۶۵ء
    - آغا مرزا بیگ سرور جنگ، وفات ۱۹۳۲ء
    - مرزا فیاض بیگ
      - مرزا فیض حسین بیگ
        - مرزا وقار علی بیگ
        - مرزا اقبال علی بیگ
        - مرزا ذوالفقار علی بیگ
        - مرزا محمود حسین بیگ
        - مرزا حسین بیگ
    - مرزا ساجد بیگ
    - مرزا واجد بیگ
  - امانی خانم زوجہ نواب علی بخش خاں لوہارو
    - نواب غلام فخرالدین خاں
      - سکندر زمانی بیگم زوجہ سرور جنگ

مرزا عاشور بیگ انقلاب سن ستاون میں "کانے ملکات" سے لڑکر شہید ہوئے۔ علاوہ اس سانحے کے بعد ہی ان کی اولاد اور مرزا جواد بیگ عرف مرزا افضل کے تمام عیال و اطفال ابور ہوتے ہوئے ڈپٹی عباس بیگ خان بہادر کے پاس سیتاپور آگئے۔ مرزا جواد بیگ سیتاپور کے افسر اسلحہ ہو گئے اور اس خاندان کے تمام بچوں کی ابتدائی تعلیم ڈپٹی عباس بیگ کی سرپرستی میں سیتاپور ہی میں ہوئی۔

غالب کے منجھلے بھانجے مرزا عباس بیگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے اور ہنگامہ سن ستاون سے پہلے علاقہ لاٹان پور (ضلع سیتاپور) کی سرکشی و بغاوت پر قابو حاصل کرنے کے لئے مامور کئے گئے تھے۔ اسی سلسلے میں انھیں ضلع سیتاپور میں ایک تعلقہ "بڑا گاؤں" انگریزوں نے دے دیا تھا اور یہ مستقلاً یہاں رہ بس گئے۔ کچھ دنوں ہردوئی میں اکسٹرا اسسٹنٹ بھی رہے اور ڈپٹی عباس بیگ کے نام سے شہرت پائی۔ سیتاپور میں ابتداً انھیں وہ عمارت بود و باش کے لئے دی گئی تھی جس میں اب زنانہ اسپتال ہے، بعد میں ریلوے اسٹیشن چھوٹی لائن کے قریب راجہ کپورتھلہ کی کوٹھی خریدی گئی اور سنہ ۱۹۰[illegible]ء میں یہ خاندان وہاں منتقل ہو گیا۔ ڈپٹی عباس بیگ کی ایک کوٹھی لکھنؤ میں۔ اس مقام پر تھی جہاں پر اب کوتوالی قیصر باغ قائم کی گئی ہے۔ کوتوالی کے حدود میں جانب جنوب ڈپٹی عباس بیگ کا امام باڑہ آج بھی موجود ہے جس کے ایک حصّہ میں ان کی اور ان کی بیوی کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ حدود کوتوالی کے باہر پورب طرف اس عمارت کا ایک چھوٹا سا حصہ اب بھی "عباس منزل" کے نام سے موسوم ہے جس میں اسی خاندان کے کچھ افراد سکونت گزیں ہیں۔

ڈپٹی عباس بڑی سوجھ بوجھ کے رئیس تھے۔ اس عہد کی تعلیمی سرگرمیوں سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ کیننگ کالج (موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی) کے قیام میں ان کا خاص ہاتھ رہا ہے۔ آدمی کچھ زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے مگر ان کی زندگی ادبی و علمی دلچسپیوں سے یکسر خالی بھی نہیں تھی۔ سید غلام حسنین قدر بلگرامی (تلمیذ غالب) ان کی زندگی بھر درباری شاعر کی حیثیت سے وابستہ رہے [illegible]ھ میں وفات پائی۔ قدر بلگرامی نے تاریخ وفات لکھی ہے:

ماہ جمادی الاول یکشنبہ دوہم — شب آفتاب کے بہ زمین پہلے فشردہ ہوئے
یعنی مرد ڈپٹی عباس بیگ خاں — ہے ہے گئے بباغ امارت فسردہ ہوئے
برخواند قدر موبہ تاریخ ہجریش — عباس بیگ خان بہادر بمردہ ہوئے

ڈپٹی عباس بیگ کے صرف ایک صاحبزادی "وجیہہ النساء" تھیں

جن کی شادی انھوں نے اپنے حقیقی بھتیجے مرزا محمود بیگ (فرزند مرزا عاشور بیگ) کے ساتھ کر دی تھی جن کے کوئی اولاد نہیں ہوئی !" وجیہہ النساء" کی شادی سیتاپور کی تاریخی شادیوں میں ایک خاص تقریب تھی جس کے تذکرے میرے بچپن تک بڑے افسانوی رنگ میں ہوا کرتے تھے۔ اس وقت تک سیتاپور کے روساء اور عمائدین کے یہاں شادی بیاہ کی تقریبات میں اودھ کے رسم و رواج ہی برتے جاتے تھے۔ دلّی کے دو ایک خاندان جو اس وقت تک یہاں پہنچے تھے ان میں اتنی شاندار تقریب اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی — یہی وہ تقریب شادی تھی جس میں عدم شرکت کا افسوس غالب نے مذکورہ بالا خط (بنام قدر بلگرامی) میں کیا ہے۔

غالبیات کا یہ ایک اہم المیہ ہے کہ غالب کا دل اپنے بھانجوں کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ انھیں ان لوگوں سے غالباً یہ شکایت تھی کہ پنشن کے مقدمہ میں وہ اپنے چچا جواد الدولہ مرزا افضل بیگ کے رویہ سے اظہار بیزاری نہیں کر سکے تھے اور کسی نہج پر غالب کے معین و مددگار نہیں ہوئے تھے۔ غالب کو اپنے بھانجوں سے توقع تھی — اور غلط نہیں تھی کہ اس بُرے وقت میں وہ ان کا ساتھ دیں گے لیکن قرائن یہ کہتے ہیں کہ اس وقت اس خاندان کے اندرونی مسائل کچھ اتنے پیچیدہ ہو گئے تھے کہ خود ان کی بہن کی اولاد ان کا ساتھ نہ دے سکی — ان پیچیدگیوں کے اور جو وجوہ رہے ہوں ان کا پتہ تو چلتا نہیں لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ جواد الدولہ مرزا افضل بیگ پنشن کے معاملے میں اپنے حقیقی بہنوئی خواجہ حاجی خاں اور ان کی اولاد کے معین و مددگار تھے — اور یہ خواجہ حاجی خان وہی بزرگ تھے جن کی اولاد پنشن کے مقدمہ میں غالب کی فریق مخالف تھی مولانا غلام رسول مہر کا بیان ہے:

"یہ بھی حقیقت ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں مرزا غالب کے مقابلے میں بڑے جہازی وسائل تھے۔ وہ انگریز ریذیڈنٹوں پر اثر ڈال سکتے تھے۔ مرزا افضل بیگ (جواد الدولہ) کلکتہ میں شاہ دہلی کا وکیل تھا اور نواب شمس الدین خاں کے لئے نہیں، لیکن اپنے بھانجوں (ابنائے خواجہ حاجی) کے لئے تمام ممکن تدبیریں کرتا رہتا تھا، یہاں تک کہ ایک مرتبہ مرزا غالب کے خلاف "جام جہاں نما" (کلکتہ) میں کوئی تحریر شائع کرا دی چنانچہ مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں:

امروز تازہ صلئے بہ شاہدہ اوراق "جام جہاں نما" روئے دادہ کہ جز بآن بے آبروئی نتوانستم کرد — غالب کہ شما ہم درآں اوراق نگریستہ باشید۔ واللہ، باللہ، ثم تاللہ، اینچہ از حال من مسکین درآں ورق مندرج است ہمہ کذب و بہتان دگر ان است "

[صفحہ ۱۳۰ - احوال غالب مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند)]

عرض کیا جا چکا ہے کہ ڈپٹی عباس بیگ انقلاب ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے سیتاپور پہنچ چکے تھے اور یہ زمانہ وہ تھا جب غالب کے عزیز دوست مولانا فضل حق خیرآبادی بھی بقید حیات تھے جو ہر سال آموں کی فصل میں خیرآباد ضرور آتے تھے اور ہمیشہ پابندی کے ساتھ غالب کے لئے آموں کا تحفہ بھیجا کرتے تھے۔ سیتاپور اور خیرآباد میں صرف پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ اگر غالب کبھی آموں کی فصل میں خیرآباد آجاتے تو اپنے بھانجوں سے بھی مل سکتے تھے اور اس خاندان کے ان بچوں میں بھی وقت گذار سکتے تھے جو ان کی بہن کے پوتے تھے — لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ تمام عمر نہ سیتاپور آئے اور نہ خیرآباد! اور اس خاندان سے رفتہ رفتہ اتنی دوری ہو گئی کہ دس سال ادھر جب میں اس خاندان کے ان معمّر افراد سے ملا جو سیتاپور میں اقامت گزیں ہیں تو انھوں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا کہ غالب اور ان کے درمیان میں کیا رشتہ ہے؟ ظاہر ہے کہ اس "کم آگہی" کے بعد اس خاندان میں غالب کا کوئی خط یا تحریر دستیاب ہونے کا امکان ہی نہیں۔

خطوط غالب کے جتنے مجموعے اس وقت تک سامنے آئے ہیں ان میں اعزہ کے نام کوئی خط نہیں ہے۔ اس سلسلے کے صرف دو خطوط اب تک مجھے دستیاب ہو سکے ہیں جو اب سے پینتیس سال قبل ماہنامہ "خیاباں" لکھنؤ کے مخصوص عنوان "گنج شائیگاں" کے تحت شائع ہوئے تھے جن پر سید شہنشاہ حسین رضوی مرحوم (اڈیٹر خیاباں) نے ایک تفصیلی نوٹ بھی تحریر فرمایا تھا:

"ذیل کے ہر دو خطوط نواب سید محمد ذکی علی خاں ہاتف لکھنوی کا عطیہ ہیں۔ پہلا خط مرزا عباس بہادر اور دوسرا خط محمود مرزا کے نام ہے۔ اور دونوں صبح شنبہ ۲۲ ذیقعدہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۸۶۰ء کو لکھے گئے ہیں اور آج سے قبل کبھی شائع نہیں ہوئے ہیں۔ مکتوب الیہم اپنے زمانے میں غیر معروف نہ تھے لیکن اب ان کے حالات سے واقفیت رکھنے والے بہت کم ہیں۔ مرزا عباس بہادر سے مراد ڈپٹی مرزا عباس بیگ مرحوم ہیں جو لکھنؤ خیالی گنج کچہری روشن الدولہ کے جانب جنوب میں رہتے تھے۔ یہ

کوٹھی امپروومنٹ ٹرسٹ لکھنؤ نے آرائش بلدہ کی اسکیم میں لے کر منہدم کرادی اور اب اس کا نشان تک باقی نہیں۔

مرزا عباس بیگ درحقیقت مرزا غالب مرحوم کے بھانجے تھے لیکن محبت و بے تکلفی سے خط میں لفظ بھائی سے مخاطب کیا ہے۔ محمود مرزا جن کے نام دوسرا خط ہے ڈپٹی مرزا محمود بیگ کے نام سے موسوم تھے اور مرزا عباس بیگ کے بھتیجے تھے۔ مرزا خداداد بیگ اور مرزا رفیع الدین بیگ جنکی خیر و عافیت محمود مرزا کے خط میں مرزا نے دریافت کی ہے، محمود مرزا کے حقیقی بھائی تھے۔ خداداد بیگ اور مرزا رفیع الدین بیگ کا بھی انتقال ہوگیا۔ نواب سرور جنگ بہادر جن کا حال میں انتقال ہوا ہے، محمود مرزا کے چچا زاد بھائی اور مرزا عباس بیگ کے بھتیجے تھے۔ اس خاندان کے بعض ارکان مختلف مقامات پر موجود ہیں اور ممتاز عہدوں پر فائز ہیں۔ خود مرزا محمود بیگ بھی ڈپٹی کلکٹر تھے۔

قدر بلگرامی کے نام مرزا (غالب) نے جو خط لکھا ہے اس میں بھی بھتیجے[1] کی شادی میں شریک نہ ہونے پر اظہار افسوس کیا ہے۔ لہٰذا جہاں تک واقعات کا تعلق ہے ذیل کے خطوط کی تصدیق قدر بلگرامی کے نام کے خط سے ہوتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرزا نے انتقال سے کچھ زمانہ قبل اپنے ہاتھ سے خط لکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن خطوط ذیل سنہ ۱۸۶۴ء میں لکھے گئے ہیں اور مرزا نے ۱۸۶۹ء[2] میں انتقال کیا لہٰذا ہر دو خطوط ان کی وفات سے پانچ سال پہلے لکھے گئے ہیں اور اس امر میں مطلق اشتباہ کی گنجائش پیدا نہیں کرتے کہ وہ مرزا (غالب) کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔

دونوں خطوط ہندوستانی قلم اور سیاہ روشنائی سے لکھے گئے ہیں اور ایک ہی ورق پر۔ پہلا خط دو صفحات پر ہے اور دوسرا تیسرے صفحہ پر ــــ چوتھا صفحہ سادہ ہے خط روشن اور پاکیزہ ہے ہم نے صرف دوسرے خط کا عکس شائع کیا ہے پہلا خط طویل بھی ہے اور جا بجا سے کرم خوردہ بھی۔

ہر دو خطوط نواب سید محمد ذکی علی خاں ہاتف کو نواب سید محمد قاسم عرف نواب ابراہیم مرزا خان خلف نواب یوسف مرزا خان مرحوم سے حاصل ہوئے تھے اور یوسف مرزا، مرزا (غالب) کے محبوب تلامذہ میں سے تھے اور ان کے نام کے اکثر خطوط اردوئے معلیٰ، عود ہندی میں شائع ہوئے ہیں ممکن ہے یوسف مرزا کو مرزا (غالب) کے خطوط جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو اور انھوں نے مرزا عباس بیگ اور محمود مرزا سے خطوط منقولہ ذیل کو حاصل کر لیا ہو۔"

(مدیر مرتب)

(ماہنامہ خیابان لکھنؤ بابت ماہ نومبر ۱۹۳۳ء جلد ۲ شمارہ ۱۱)

نواب ذکی علی خاں ہاتف لکھنوی جن کی وساطت سے یہ دونوں خطوط سید شہنشاہ حسین مرحوم کو حاصل ہوئے تھے، بہت ہی بلند علمی اور ادبی مذاق رکھتے تھے۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب نے انھیں بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ فرماتے ہیں "لکھنویات" پر انھوں نے ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے جنرل سکریٹری بھی تھے۔ قدیم لکھنؤ کے "رنگوں" پر ایک تحقیقی کتاب بھی ان کی تصانیف میں شامل ہے جو غالباً چھپی نہیں۔ ہاتف کا کتب خانہ اپنے علمی و ادبی افادیت کے اعتبار سے اپنے زمانے میں لکھنؤ کا ایک ممتاز کتب خانہ تھا۔

نصف صدی سے زیادہ زمانہ گذرا جب ہاتف نے لکھنؤ سے ایک مذہبی ماہنامہ "تبصرہ" بھی جاری کیا تھا جس کا پہلا شمارہ رجب المرجب ۱۳۲۲ھ میں نکلا تھا یہ رسالہ "انجمن مبشر الایمان لکھنؤ" کا آرگن تھا اور مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔

ذیل میں یہ دونوں خطوط ماہنامہ خیابان لکھنؤ بابت ماہ نومبر ۱۹۳۳ء سے نقل کئے جا رہے ہیں جو بلاشبہ غالبیات میں ایک "اہم اضافہ" ہیں۔

(۱)

بھائی مرزا عباس بیگ بہادر ـــــ

میں حیران ہوں کہ تم سرکار کے کام کو کیونکر انجام دیتے ہو۔؟ اور مضامین

---

[1] مرزا محمود بیگ غالب کے پوتے یا بھتیجے نہیں۔ اور ڈپٹی عباس بیگ کی صاحبزادی حبیب النساء کی رشتے میں غالب کی پوتی ہوتی تھیں جن کے ساتھ مرزا محمود بیگ کی شادی ہوئی تھی۔

[2] غالب کا سن وفات ۱۸۶۹ء ہے ۱۸۶۸ء نہیں۔

قوانین کو کس طرح سمجھ لیتے ہو۔ اور مقدمات رجوعہ کس اسلوب سے فیصل کرتے ہو۔ مجھ کو نواب گورنر جنرل بہادر کا دربار کب نصیب ہوا۔ نہ انھوں نے دلی میں دربار کیا۔ نہ میں انبالے گیا۔ میں نے تم کو لکھا کہ ادھر تو مجھ کو اپنے فرزند[1] کی شادی میں شریک نہ ہونے کا رنج رہا ادھر دربار میں حاضر نہ ہونے کا غم رہا۔ اخبار میں میں نے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب یعنی منٹ گمری صاحب (MONTGOMERY) اور ان کے سکرتر (سکریٹری) تامس ڈگلس فورسائتھ صاحب (THOMAS DOUGLAS FORSYTHE) اور ان کے میر منشی پنڈت من پھول[2] سنگھ ... مجھ ... کو اس کا سبب جانتے ہو وہ میر منشی لفٹنٹ گورنر کے ہیں ان کو گورنر جنرل کی سرکار میں کیا دخل۔ مجھ کو ہرگز دیدار نواب گورنر جنرل لارڈ الگن بہادر (LORD ELGIN) کا نصیب نہیں ہوا — ہاں جب نواب لفٹنٹ گورنر منٹگمری بہادر اس شہر میں آئے تو مجھ کو یاد کیا۔ بہت عنایت فرمائی اور ایک شال، رومال سوزن کار اور ایک گلو بند سوزن کار اور ایک الوان کی فرد چار گز لمبی — یہ تین کپڑے مجھ کو دیے۔ میں نے عرض کیا یہ میرا موجب اعزاز و افتخار ہے — مگر میری جان اٹکی ہوئی ہے لارڈ صاحب کے دربار اور خلعت میں۔ ! فرمایا۔ اچھا۔ اچھا۔

دوسرے دن لارڈ صاحب آئے ... مجھ ... تیسرے دن میں لفٹنٹ گورنر پنجاب سے رخصت ہونے گیا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ میں ہمیشہ لارڈ صاحب کے دربار سے سنہرے اساورے کی سات پارچے اور جیغہ سرپیچ بالائی مروارید تین رقم ہمیشہ پایا کیا ہوں اور اب میرا دربار اور خلعت بند ہے اس کا مجھ کو بڑا غم ہے۔ فرمایا کہ غم نہ کرو تمھارا دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جاؤگے تو خلعت پاؤگے۔ میں نے اپنا ہاتھ دکھایا اور کہا کہ حضرت بوڑھا ہوں اور زخمی ہوں انبالے کس طرح جاؤں ... مجھ ... خیر آیندہ دربار میں پاؤگے۔

جو عرضی انگریزی تم نے میری طرف سے لکھ کر مجھ کو بھیجی تھی اور میں نے اپنی مہر کر کے رجسٹری کروا کے کلکتے بھیجی تھی اس کا کچھ میں نے جواب نہیں پایا۔ شاید یہ حکم اسی عرضی پر ہوا ہو۔ لیکن اس عرضی کو گئے بہت دن ہوئے اور دربار اور خلعت کی واگذاشت کا حکم اب صادر ہوا ہے۔ چنانچہ مولوی اظہار حسین خاں میر منشی کہتے تھے کہ لارڈ صاحب تمھارے دربار اور خلعت کے واگذاشت کا حکم دے کر کلکتے سے ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ نواب گورنر جنرل بہادر کا نام لارڈ الگن بہادر ہے اور چیف سکرتر بہادر کا کرنل ڈورینڈھی بہادر نام ہے۔ ہارنگٹن صاحب شاید سال آیندہ میں سکرتر یا پرائیوٹ سکرتر ہوں یا کونسل کے ممبر ہوں۔ بہرحال۔ اگر تمھارے سبب سے یہ کام ہوا تو کیا غضب ہوا۔ گر آشنا جان لو کہ واگذاشت کا حکم سنتا ہوں کہ ہو گیا ہے۔ میرے پاس تحریر اس حکم کی نہیں پہنچی اور تعمیل بھی ابھی نہیں ہوئی — یعنی نہ میں دربار میں گیا نہ خلعت پایا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی ملاقات اور ان کا خلعت اور امر ہے۔ اور بات ہے اور اس بات سے اس کو علاقہ نہیں۔ !

اب میں نے جناب کرنل ڈورینڈھی بہادر چیف سکرتر کو فارسی خط بھیجا ہے اور دو کاغذ انگریزی آمدہ ولایت اس خط کے ساتھ بھیجے ہیں جاننا چاہیے کہ گورنمنٹ سے میرے واسطے تین دستور مقرر کی جا رہی ہے۔ دربار۔ خلعت۔ خط۔ بعد غدر کے یہ تینوں دستور بند ہو گئے۔ اب دربار اور خلعت کی واگذاشت کی خبر سن کر سکرتر صاحب کو خط لکھا ہے۔ جواب کے آنے پر دلجمعی کا مدار ہے اگر جواب آیا تو تم کو ضرور اطلاع دوں گا — ۱۲

واسطے خدا کے ان سطروں کو غور سے دیکھنا اور مطالب کو اچھی طرح سمجھ لینا اور غلط نہ سمجھنا۔ دوسرا ورق بنام محمود[3] مرزا کے ہے اس کو دینا اور اگر تمھارے پاس نہ ہو تو جہاں ہو بھیج دینا — ۱۲

راقم — غالب

مرقومہ صبح پنجشنبہ ۲۲۔ ذی قعدہ ۱۲۶۹ھ

مطابق ۱۲۔ مئی ۱۸۶۳ء

ضروری جواب طلب !

---

[1] انبالہ۔ [2] مرزا محمود بیگ اور وجیہہ النساء کی شادی کی طرف اشارہ ہے [3] پنڈت من پھول سنگھ اپنے عہد کی بڑی پراسرار شخصیت تھے۔ ۱۸۶۵ء کی جنگ کریمیا کے سلسلے میں انگریزوں نے ڈاکٹر لائیٹنر کی سرکردگی میں تاشقند و بخارا جو خفیہ سیاسی مشن بھیجا تھا اس میں محمد حسین آزاد کے ساتھ پنڈت من پھول بھی گئے تھے۔ ان لوگوں نے بھیس بدل کر بہت دنوں تک اس روسی علاقے کی سیاحت کی جس کے بارے میں انگریز فوجی معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ ۴، ۵، ۶ ۔ کرم خوردہ۔ [illegible] مرزا محمود بیگ خلف عاشور بیگ

(۲)

برخوردار اقبال نشان محمود مرزا کو دعا پہونچے ـــ

بھائی ـــ میں تمھارا خط دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ خط تمھارا اچھا ہے
خدا کرے "خط سرنوشت" بھی اچھا ہو۔
خدا کی قسم تمھارے سہرے کے دیکھنے کی بہت خوشی تھی ـــ مگر نہ آسکا!
اگر جیتا رہا اور اسباب نے مساعدت کی تو اکتوبر۔ نومبر یعنی جاڑوں میں آؤں گا
اور تم لوگوں کو دیکھوں گا ـــ ۱۲
پھوڑا اب اچھا ہو گیا ہے۔ خاطر جمع رکھو۔ چھ مہینے کے دن رات میں نے
جو روح تحلیل کی ہے اب بڑھاپے میں وہ کہاں سے آئے۔
بیٹا ـ تیرے سر کی قسم! اگر میں لنگ باندھے ہوئے ننگا بیٹھا ہوں تو
میری شکل "آکھ" کی بڑھیا کی سی ہو گی۔ شاید ہوا کے جھونکے (سے) اڑ جاؤں۔
جب مجھ کو دیکھو گے تب جانو گے کیا حال ہے ۔ ۱۲
تمھارے چچا (ڈپٹی عباس بیگ) اللہ میاں کے "مست خود پرست" بندے
ہیں۔ بات ہے کچھ ـــ سمجھتے ہیں کچھ ـ نہ اخبار کا مطلب سمجھے نہ میرا حال ـ نہ
میرا مقدمہ۔ نہ جو کچھ واقع ہوا اس کو سمجھے۔! اب میں نے ان کو ایک خط
جداگانہ لکھا ہے۔ اپنی طرف سے اظہار حال میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا ـــ
خدا کرے سمجھ جائیں لیکن مجھ کو توقع نہیں کہ سمجھیں۔!
تم نے اپنی والدہ کی اور اپنی بھاوج کی اور خدا داد[۱] اور رفیع الدین[۲] کی ۔۔۔[۳]
نہ لکھی۔ اب جو خط لکھو تو ان سب کی "خیر و عافیت" لکھو۔

غالب۔ سہ شنبہ ۲۳۔ ذی قعدہ
۱۲۔ مئی سنہ حال۔

ان دونوں خطوط سے غالب کی اس فطری گیرائی و گہرائی کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں
نے اپنے اعزہ، احباب اور تلامذہ سے خوشگوار تعلقات استوار رکھنے کے لئے کیسے
کیسے صبر آزما لمحات کا سامنا کیا۔ ان کے صاحب ثروت بھانجوں نے اپنے
بوڑھے ماموں کی کبھی کوئی خبر گیری نہیں کی لیکن ان کے لب پر کبھی کوئی حرف
شکایت نہیں آیا۔ ڈپٹی عباس بیگ کے علاقہ "بڑاگاؤں" کی آمدنی پچیس
تیس ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ ساٹھ روپیہ ماہانہ قدر بلگرامی کو بلا کسی صلہ خدمت
کے ہمیشہ دیتے رہے لیکن غالب کے ساتھ کبھی سلوک نہیں ہوئے۔ غالب کی
ضبط آزما صلح پسندی اور صلح جوئی ان کا خاصہ مزاج تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب پنشن
کے مقدمہ کا فیصلہ ان کے خلاف ہو گیا تو انھوں نے خواجہ حاجی خاں کے بیٹے
بدرالدین اماں سے مواخاتی رشتے کی تجدید کر لی۔ مولانا غلام رسول مہر تحریر فرماتے ہیں:

"البتہ یہ درست ہے کہ جب جھگڑے مٹ گئے۔ پنشن کے مقدمہ کا فیصلہ
مرزا غالب کے خلاف صادر ہو گیا تو خواجہ حاجی کے بیٹے بدرالدین (اماں) کے
ساتھ ربط ضبط نئے سرے سے پیدا ہو گیا اور مرزا انھیں اپنا بھتیجا کہنے لگے۔"
(صفحہ ۱۳۲۔ احوال غالب)

مرزا محمود بیگ کے خط میں غالب نے ڈپٹی عباس بیگ کی "کج فہمی" کا
تذکرہ کیا ہے؟ جو صحیح نہیں ہے۔ وہ حد درجہ معاملہ فہم اور دور اندیش انسان
تھے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ڈپٹی عباس بیگ کے خط میں جن باتوں کو
پھیلا کر مکرر سہ کرر لکھا گیا ہے وہ ایسی باتیں نہیں ہیں جنھیں ڈپٹی عباس بیگ
آسانی کے ساتھ نہ سمجھ سکے ہوں۔ اس کا سبب صرف ایک ہی تھا، غالب کا
بڑھاپا اور مسلسل بیماریاں۔

★

---

[۱] خداداد بیگ بن عاشور بیگ، [۲] رفیع الدین وحشی بن عاشور بیگ، [۳] کرم خوردہ۔

شہنشاہِ سخن

درشن سنگھ دُگل

بیاں کیا وصفِ غالب ہو کہ غالب
فروغِ آفتابِ فکر و فن تھا

ہجومِ رنج و غم میں تیشہ کاری
غزل تھی بے ستوں، وہ کوہ کن تھا

اُسے حاجت نہ تھی سیرِ چمن کی
کہ اپنی ذات سے وہ خود چمن تھا

غزل دیکھو تو یہ ہوتا ہے معلوم
دھنک تھا، شمع تھا، گل تھا، کرن تھا

نوائے شبنم آلودہ میں اُس کی
خلوصِ جذبۂ گنگ و جمن تھا

قد و گیسو کی رکھتا تھا تمنا
کچھ ایسا عاشقِ دار و رسن تھا

بنائے تازہ ڈالی فکر و فن کی
عجب اک صاحبِ طرزِ سخن تھا

نہ تھا رشتہ کوئی دیر و حرم سے
مگر ممدوحِ شیخ و برہمن تھا

اُتر جاتی تھی دل میں بات اُس کی
وہ ایسا شاعرِ جادو سخن تھا

خیال اِس کا نشاط انگیز حکمت
دماغ اس کا تفکر پیرہن تھا

خبر رکھتا تھا سترِ رنگ و بو کی
کچھ ایسا محرمِ سرو و سمن تھا

نقوشِ جاوداں اُس نے تراشے
وہ کہسارِ ادب کا تیشہ زن تھا

رئیسِ نغمہ سنجانِ بہاراں
امیرِ خوش نوایانِ چمن تھا

جہاں گیری تھی اُس کی گوشہ گیری
وہ تھا خلوت میں لیکن انجمن تھا

غزل کے نغمۂ دلکش سے غالب
دلِ عشاق پر ناوک فگن تھا

میسّر اب کہاں دُنیا کو درشن
وہ غالب جو شہنشاہِ سخن تھا

غزل

(نذرِ غالب)

وقار خلیل

سایۂ زلف میں اِک شام سُہانی مانگے
عشق مہکے ہوئے خوابوں کی جوانی مانگے

ہجر وہ شعلۂ بے دود کہ جو شام و سحر
ایک اک گام پہ اشکوں کی روانی مانگے

کس سے کہیے کہ پئے نقشِ تمنائے وفا
خامہ عاجز ہے، سخن شعلہ بیانی مانگے

فکر کے، پیار کے، زخموں کے اُجالوں کے سوا
زندگی صبح کی اِک اور نشانی مانگے

ہم نے وہ حُسن سرِ بام وفا دیکھا ہے
نگہِ ناز کی تلوار بھی پانی مانگے

یہ شبِ ماہ، یہ فطرت کا سجیلا درپن
وقت بیدار خیالوں کی روانی مانگے

ساقیا! لا وہی غالبؔ کے زمانے کی شراب
آج ہر رند بلا نوش پرانی مانگے

اب تو ماحول کے جلتے ہوئے صحرا میں وقار
دل کسی صبحِ بہاراں کی کہانی مانگے

غالب ـــ چراغِ دیر کی روشنی میں

ڈاکٹر امرت لعل عشرت

مرزا غالب دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے اپنی جوانی میں بنارس ٹھہرے تھے۔ یہ ۱۸۲۶ء کے موسمِ سرما کا زمانہ تھا اور اس وقت مرزا کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس سفر میں اُنھوں نے مختلف شہروں میں قیام کیا اور ان کے مدّاحوں نے اکثر اُن کی پذیرائی میں دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیئے لیکن یہ افتخار صرف بنارس ہی کو حاصل ہے کہ اپنے مختصر قیام میں مرزا غالب اس دیارِ دلبراں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مثنوی "چراغِ دیر" لکھ کر اس شہرِ نگاراں کو ایک انمول چراغِ تحسین پیش کیا۔ مرزا نے لکھنؤ اور کلکتہ کا ذکر بھی اپنے اشعار میں کیا ہے۔ لکھنؤ جاتے وقت جادۂ راہ اُن کے لیے "کششِ کافِ کرم" تھا لیکن "ہوسِ سیر و تماشا" سے اُنھیں کوئی وابستگی محسوس نہ ہوئی۔ کلکتے کا ذکر اور وہاں کی رنگینیوں کی توصیف ان کے کلام میں محفوظ ہے لیکن ان دونوں شہروں یعنی لکھنؤ اور کلکتہ کی یاد سے بہت سی تلخیاں بھی وابستہ ہو کر رہ گئی تھیں اس لیے اُن بزم آرائیوں کا نقش دیگر طاقِ نسیاں ہو کر رہ جانا ہی مرزا کے حق میں مفید تھا۔ صنم کدۂ بنارس کو اُنھوں نے ایک نظر دیکھا اور بار بار دیکھنے کی تمنا لے کر گئے۔ اس کی یاد بڑھاپے تک اُن کے دل و دماغ کو مسحور کرتی رہی۔ احباب کو خط لکھتے وقت برسوں کے بعد بھی اُنھوں نے ہمیشہ کے لیے بنارس میں مقیم ہو جانے کی آرزو کا اظہار کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "چراغِ دیر" میں اُنھوں نے جس والہانہ جوش و خروش اور سرمستی و پاکوبی کا مظاہرہ کیا ہے وہ اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ اس مثنوی کے روپ میں مرزا نے اس کعبۂ ہندستان کو اپنے دھڑکتے ہوئے دل کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ مرزا سے پہلے اور بعد میں بنارس اور صبحِ بنارس کی دلربا آفرینیوں اور رنگینیوں کی تفسیر بہت سے شعرا نے کی ہے۔ یہ سلسلہ شیخ علی حزیں اصفہانی سے جاں نثار اختر اور دیر معز فطرت سے نذیر بنارسی تک چلا آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو چراغ اس بتکدے میں مرزا غالب نے روشن کیا ہے اُس کی روشنی میں اس کا ماحول اور بھی سحر انگیز نظر آنے لگا ہے۔ اس چراغِ دیر کے سامنے کسی اور چراغ کا جلنا مشکل دکھائی دیتا ہے ـــ

مرزا بنیادی طور پر فارسی گو تھے۔ غزلیات اور قصائد کے علاوہ چھ مثنویاں بھی اُن کے کلیاتِ فارسی میں موجود ہیں۔ ان کے عنوانات "بادِ مخالف" "رنگ و بو" "درد و داغ" "سرمۂ بینش" "ابرِ گہربار" اور "چراغِ دیر" ہیں۔ ان چھ کے علاوہ پانچ چھوٹی بڑی مثنویاں اور بھی دکھائی دیتی ہیں جو مختلف کتابوں کی تقاریظ اور تہنیتِ عیدِ شوال وغیرہ سے متعلق ہیں۔

"بادِ مخالف" ہنگامۂ کلکتہ کی یادگار ہے، جس میں مرزا نے اپنی غریب الوطنی کا واسطہ دے کر کلکتہ سے دامن چھڑانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں حقیقتِ حال زیادہ ہے اور شاعری کم۔ چنانچہ وجدانِ حسن اور شعریت سے یہ مثنوی یکسر عاری ہے۔

"درد و داغ" کا موضوع وہی دقیانوسی خیال ہے کہ آدمی لاکھ چاہے نوشتۂ تقدیر کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ اس بات کو مرزا نے ایک فرضی کہانی سے ثابت کرنا چاہا ہے جس میں بوڑھی ماں، بوڑھا باپ اور جوان بیٹا مفلسی سے تنگ آ کر ایک خدا رسیدہ درویش کے تکیے میں پناہ گزیں ہوتے ہیں۔ درویش اُن کے حق میں خدا سے دعا کرتا ہے اور خدا ان تینوں کی ایک ایک دُعا قبول کر لینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ بڑھیا دعا کے زور سے ایک حسین و جمیل دوشیزہ بن کر ایک نوجوان شہزادے کے ساتھ اُس کے گھوڑے پر فرار ہو جاتی ہے۔ بوڑھا غصے میں اس کے سؤر

بن جانے کی دعا مانگتا ہے اور شہزادہ عورت کے بجائے سوز کو پاکر اُسے گھوڑے سے پھینک دیتا ہے۔ بیٹا ماں کی یہ حالت برداشت نہیں کر سکتا اور اپنی دعا کے اثر سے اُسے دوبارہ بڑھیا بنا دیتا ہے۔ گویا وہ لوگ جیسے تھے ویسے رہے کیونکہ اُن کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ کہانی بہت مُزخرف ہونے کے باوجود یہ مثنوی شاعرانہ محاسن سے خالی نہیں۔ محاکاتی انداز کہیں کہیں بہت دلکش ہے ـــــ

"سرمۂ بینش" میں غالب نے بہادر شاہ ظفر کی مدح کے ساتھ ساتھ تصوف و اخلاق کو بھی موضوع قرار دیا ہے لیکن یہ غیر واضح نقوش قاری پر چنداں گہرا اثر نہیں چھوڑتے۔ اسی طرح "مثنوی رنگ و بو" بھی کسی غیر معمولی خصوصیت کی حامل نہیں۔ ایک بادشاہ کے مثالی کردار کے توسّل سے یہ بات ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ منزلِ حق تک پہنچنے کے لیے اس جہانِ گزراں میں صرف ہمتِ مردانہ ہی کام آسکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں زر و مال اور رعب و اختیار سب ہیچ ہیں۔ ندرتِ خیال بعض مقامات پر بجلی کی طرح آنکھوں کے آگے کوندجاتی ہے لیکن مجموعی تاثر کے لحاظ سے "رنگ و بو" کو بھی مرزا کی مثنوی نگاری کا بہت اچھا نمونہ قرار نہیں دیا جاسکتا ـــــ مثنوی "ابرِ گہر بار" غالباً مرزا کی آخری عمر کی یادگار ہے اور ان کی زبردست شاعرانہ صلاحیتوں کی مظہر ہے۔ تقریباً ایک ہزار اشعار پر مشتمل اس نامکمل مثنوی میں مرزا نے حمد، نعت، منقبت، ساقی نامہ، مغنّی نامہ، معراج نامہ اور مناجات وغیرہ کے عنوانات قائم کرکے اپنے دینی معتقدات کا اظہار کیا ہے۔ سپاس گزاری اور مدح کے بعد مرزا نے مناجات ہی میں خدا سے اپنی محرومیوں اور بدبختیوں کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ مثنوی کا یہ حصہ ہندستانی فارسی شاعری کے شاہکاروں میں شامل کیے جانے کے قابل ہے۔ اپنی زندگی کی تلخیوں کو مرزا نے نہایت غم انگیز پیرائے میں بیان کرتے ہوئے شدتِ احساس، جذباتیت اور شعری محاسن کا اتنا موثر امتزاج پیش کیا ہے کہ اس مثنوی کے مصنف کی حیثیت سے اُن کی فارسی گوئی کے دعوے کا جواز پیدا ہو گیا ہے، لیکن "چراغِ دیر" کے مقابلے میں "ابرِ گہر بار" کو اس لیے ترجیح نہیں دی جاسکتی کہ اول الذکر زدمان، عنائیت اور شعریت کی قوسِ قزح ہے اور آخر الذکر میں مشتر مرزا کے دینی معتقدات کا بیان ملتا ہے۔ "چراغِ دیر" شاعر کی جوانی کا ثمرہ ہے اور "ابرِ گہر بار" پیری کی نشانی۔ یہی سبب ہے کہ پہلی مثنوی میں ایک پہاڑی ندی کا سا جوش و خروش ہے اور دوسری میں مشق و مہارت کی ایک سنبھلی سنبھلی ٹھہری ٹھہری کیفیت۔

"چراغِ دیر" بظاہر بنارس کی توصیف میں لکھی گئی ہے لیکن باطن بہت سی ایسی خصوصیات کی حامل ہے جن کا تعلق براہِ راست مرزا کے غیر معمولی دل و دماغ، مخلصانہ شخصیت اور منفرد فکر و نظر سے ہے۔ ایک سو آٹھ اشعار کی حامل اس مختصر مثنوی میں مرزا نے اپنے جمالیاتی احساس کے خزانے جی کھول کے لُٹائے ہیں۔ ۱۸۲۷ء کا زمانہ مرزا کے شباب کا زمانہ تھا۔ اُن کی طبعِ جواں دنیا کی جوانی اور حسن و جمال کی تفسیر پر مائل تھی۔ وہ اپنی نفس زنی کو نفخِ صور سے کم نہ سمجھتے تھے اور اُن کی خاموشی محشرِ راز کے انداز لیے ہوئے تھی۔ احباب اور یارانِ بے تکلف روحِ صحبت اور جانِ محفل تھے۔ وطن سے دور مرزا کو اُن کی بزم آرائیوں کی یاد اور بھی زیادہ تڑپاتی تھی۔ دور کے دوستوں کا ذرا سا تغافل بھی بہت ناگوار گزرتا تھا۔ سفر میں اگر انھیں اپنے احباب کی طرف سے خطوط کا جواب نہ ملتا تو وہ بگڑ بگڑ جاتے اور اپنے دوستوں کو بے وفا اور بے مہر کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے۔ "چراغِ دیر" چونکہ جوانی کی انھی گھڑیوں کی یادگار ہے اس لیے یہ تمام کیفیات اس مثنوی میں موجود ہیں۔ مرزا کی طبعِ شرر بار بنارس پہنچ کر اپنے دہلوی احباب کے شکوۂ تغافل میں شعلہ نوائی پر آمادہ ہوتی ہے۔ "چراغِ دیر" کے ابتدائی بیس اشعار اسی ماحول کے ہیں۔ مرزا کی منفرد فکر نے اظہار و بیان اور تشبیہہ و استعارہ کی انوکھی مثالیں تو حسبِ معمول پیش کی ہی ہیں، ایک خاص بات جو شروع ہی سے قاری کے ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے وہ مرزا کی "بیدلانہ" تراکیب و طرزِ تخیل ہے۔ مرزا بیدل کی یہ چھاپ اتنی گہری ہے کہ یہ نازک کاری اور باریک اندیشی تقریباً ہر مصرعے میں دکھائی دے جاتی ہے۔ "سبکِ ہندی" کی یہ وہی فضا ہے جس کو ایرانی آج بھی "خیلی ہندی است" کہہ کر اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کرتا ہے اور ہزار کوشش کے باوجود اس دقیق النظری کی لطافتوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ "چراغِ دیر" کے شروع کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

رگِ سنگم شرارے می نویسم کفِ خاکم غبارے می نویسم

(شرار نوشتن غبار نوشتن مرزا کا "بیدلانہ" اجتہاد ہے)

درآتش از نوای سازِ خویشم کبابِ شعلۂ آواز خویشم
(اپنی آواز کے شعلے کا کباب بن جانا بھی طرزِ بیدل والی قیامت ہے)
نفس ابریشم سازِ فغان است بسانِ نی تپم در استخوان است
(اپنے سانس کو سازِ فریاد کے تار سے انوکھی تشبیہ دی ہے فرماتے ہیں میری ہڈیوں میں بانسری کی طرح بخار کی آگ بھری ہوئی ہے۔ "تپ در استخوان بودن" بہت تیز بخار ہونا) جن دہلوی احباب کی فرقت بہت شاق گزر رہی ہے مرزا اُن کو یکے بعد دیگرے ان اشعار میں یاد کرتے ہیں۔
ز اربابِ وطن جویم سہ تن را کہ رنگ و رونق اند این سہ چمن را
یعنی اہل وطن میں سے مجھے ان تین آدمیوں کی تلاش ہے کیونکہ یہ تینوں باغِ وطن کے لیے باعثِ زینت ہیں ——
چو خود را جلوہ سنجِ ناز خواہم ہم از حق فضلِ حق را باز خواہم
چو حرز بازوی ایمان نویسم حسام الدین حیدر خان نویسم
چو پیوندِ قبای جان طرازم امین الدین احمد خان طرازم
فضل حق خیرآبادی، حسام الدین حیدر خان اور امین الدین احمد خاں مرزا کے ہمعصر اور عزیز ترین دوست تھے جن سے نامہ و پیام کا سلسلہ منقطع ہونے پر وہ اس قدر برہم ہیں کہ بے مہریٔ یاراں کے پیشِ نظر وطن کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے پر آمادہ ہو رہے ہیں۔
گرفتم کز جہان آباد رفتم مرا اینان را چرا از یاد رفتم
(مانا کہ میں نے دہلی کو خیر باد کہہ دیا لیکن ان دوستوں نے مجھے کیوں فراموش کیا؟)
کجو داغِ فراقِ بوستان سوخت غمِ بی مہریِ این دوستان سوخت
(یہ وطن کی جدائی کا داغ نہیں بلکہ احباب کی بے مہری کا غم ہے جو مجھے جلا رہا ہے)
ان حالات میں نئے وطن کی جستجو میں مرزا کی نگاہِ انتخاب بنارس پر پڑتی ہے۔ دہلی کے آباد ہونے یا اُجڑنے کا انھیں اب کوئی غم نہیں۔ کسی گلستان میں ایک مختصر سا آشیانہ بنانے کے لیے ایک شاخِ گل کی تلاش کیا مشکل ہے اور اس کے لیے انھیں دور بھی نہیں جانا پڑے گا۔ گریز کے ان اشعار میں مرزا نے دہلی اور بنارس کا مقابلہ کیا ہے اور بنارس کو دہلی سے افضل قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:
بخاطر دارم اینک گل زمینی بہار آئین سواد دلنشینی
(ایک ایسی سرزمین میرے تصور میں ہے جو پھولوں سے پُر ہے، بہار کے سے انداز رکھتی ہے اور نہایت دل نشین ہے) ——
کہ می آید بدعوی گاہِ لافش جہان آباد از بہرِ طوافش
(یعنی بنارس کے طواف ہی سے دہلی کو بزرگی حاصل ہوتی ہے)
بنارس کی توصیف میں رطب اللسان ہوتے ہیں تو بے ساختہ منہ سے نکل جاتا ہے۔
تعالی اللہ بنارس چشمِ بد دور بہشتِ خرم و فردوسِ معمور
اب نادر، انوکھی اور لطیف تشبیہوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے اور مرزا کا ابتکار و اجتہاد اس انداز سے منظر کشی میں مصروف ہو جاتا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس طوفانِ رنگ و نور میں ڈوب کر روحانی مسرت محسوس کرتا ہے۔
بنارس را کسی گفتہ کہ چین است ہنوز از گنگ چینش بر جبین است
فرماتے ہیں یہ گنگا جو بہہ رہی ہے دراصل بنارس کی پیشانی کی شکن ہے اور اس شکن پڑنے کا سبب یہ ٹھہرایا ہے کہ ایک دفعہ کسی نے خوبصورتی میں بنارس کو نگارخانۂ چین سے تشبیہہ دے دی تھی بنارس نے اس مشابہت کو سخت ناپسند کر کے ماتھے پر شکن ڈال رکھی ہے ——
مگر گوئی بنارس شاہدی ہست ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست
بنارس کی مثال ایک معشوق کی سی ہے جس نے صبح و شام گنگا کے روپ میں ایک آئینہ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا ہے۔ بناؤ سنگار کے لیے معشوق آئینہ لیے رہتے ہیں۔ بنارس کے لیے گنگا کا آئینہ قدرت کا عطیہ ہے۔
بہ گنگش عکس تا پرتو فگن شد بنارس خود نظیرِ خویشتن شد
بنارس بے نظیر تھا لیکن جوں ہی گنگا میں اس کا عکس ہویدا ہوا، بنارس اپنی نظیر آپ بن گیا۔
چو در آئینہ آتش نمودند گزند چشمِ زخم از وی ربودند
یعنی بنارس اگر بے نظیر رہتا تو اس کو نظر لگ جانے کا خطرہ تھا۔ پانی کے آئینے میں ایک اور بنارس ظاہر ہو جانے سے یہ خطرہ جاتا رہا۔
شہر کے بعد جب اہلِ شہر پر غالب کی نظر پڑتی ہے تو رہی سہی تاب بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ یہاں کے پریزاد کیا ہیں نزاکت اور لطافت میں سراپا تجلی ہیں۔ اُن کے چہرے ہمارے بتوں کے لیے باعثِ رشک ہیں اور:
بہ لطف از موجِ گوہر نرم رو تر بناز از خونِ عاشق گرم رو تر
لطافت میں موجِ گوہر کی زیادہ نرم رو اور ناز میں خونِ عاشق سے زیادہ گرم رو ہیں۔
بنارس کے معشوقوں کی بلند قامتی اور اُن کے اندازِ خرام نے انوکھے منظر

تراشتے ہیں۔ جب وہ محوِ خرام ہوتے ہیں تو اُن کے اندازِ خرام سے وجود میں آنے والے نقش ایک جال کی صورت نظر آتے ہیں۔ اُن کی بلند قامتی پھولوں کی جھاڑی کا منظر پیش کرتی ہے جن کے دامن میں پھیلے ہوئے یہ جال بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔

زانگیز قد اندازِ خرامی بپای گلبنی گسترده دامی

ان پریزادوں کو "بہارِ بستر" اور "نورِ آغوش" کہہ کر غالب نے اپنے جنسی ہیجان کا اظہار انتہائی شاعرانہ انداز میں کیا ہے لیکن خود معشوقوں کے سراپا میں مادی کثافت کا کہیں نشان تک نہیں —— ان "بُتانِ بُت پرست و برہمن سوز" کے جلوے آتش افروزی میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ وہ تو اپنی چمک دمک کے سبب گنگا کے کنارے رکھے ہوئے چراغ نظر آتے ہیں۔

بسامانِ دو عالم گلستان رنگ ز تابِ رُخ چراغانِ لبِ گنگ

یہ پری چہرگاں جب دریا میں اُترتے ہیں تو ہر موجِ آب کو اپنے جسم کے لمس کا افتخار بخشتے ہیں۔ ان کی لطافت اور مستی کا کیا کہنا۔

بہ مستی موج را فرمودہ آرام ز نغزی آب را بخشیدہ اندام

اتنے مست ہیں کہ مستی میں موج بھی اُن کے روبرو ساکن معلوم ہوتی ہے، اتنے لطیف ہیں کہ ان کے مقابلے میں پانی بھی جسم رکھتا ہے یعنی مستی میں موج سے زیادہ مست اور لطافت میں پانی سے زیادہ لطیف ہیں۔ ان حسینوں کے جلوے خود دریائے گنگا کو بھی بیتاب کررہے ہیں۔ دریا کے پانی کے جسم میں ہلچل پیدا ہو چکی ہے، مچھلیوں کی صورت میں لاکھوں دل پانی کے سینے میں بیتاب نظر آتے ہیں۔ دریا اپنی تمناؤں کا اظہار کرنا چاہتا ہے اور موجوں کی شکل میں اپنا آغوش ان کے لیے وا کررہا ہے۔

فتادہ شورشی در قالبِ آب ز ماہی صد دلش در سینہ بیتاب

مچھلیوں کو پانی کے جسم میں سیکڑوں دلوں سے تشبیہ دے کر حُسنِ تعلیل کا حق ادا کردیا ہے۔

ز بس عرضِ تمنا می کند گنگ ز موج آغوشہا وا می کند گنگ

ان ماہ پاروں کے جلوے موتیوں سے زیادہ آبدار ہیں۔ اس بات سے خجل ہو کر موتی سیپوں میں پانی پانی ہوئے جارہے ہیں۔

ز تابِ جلوہ ہا بے تاب گشتہ گہرہا در صدف ہا آب گشتہ

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جو انسان کاشی میں پران تیاگ دیتا ہے، وہ آواگون کے چکر سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتا ہے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر ہندو مرد اور عورتیں آخری عمر میں جوق در جوق کاشی میں آکر بس جاتے ہیں تاکہ جسمانی پیوند سے سدا کے لیے نجات مل جائے۔ اس سلسلے میں ایک اصطلاح بھی سننے میں آتی ہے جس کو "کاشی کروٹ" کہتے ہیں۔ ایک پرانے خیال کے مطابق اگر کوئی انسان اپنے آپ کو گنگا جی کی نذر کردے اور کاشی میں آکر یہ کروٹ لے تو اُس کو مُکتی مل جاتی ہے۔ یہ موت انسان کو زندۂ جاوید کردیتی ہے۔ مرزا صاحب نے اس اعتقاد کو بڑی صحت کے ساتھ درجِ ذیل اشعار میں یوں نظم کیا ہے:

تناسخ مشربان چوں لب کشایند بہ کیشِ خویش کاشی را ستایند

آواگون میں یقین رکھنے والے اپنے اعتقاد کے مطابق کاشی کی یوں توصیف کرتے ہیں:

کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد دگر پیوندِ جسمانی نگیرد

جو شخص اس باغ یعنی بنارس میں مرتا ہے وہ زندگی اور موت کے چکر سے آزاد ہو کر دوبارہ جسم سے پیوست نہیں ہوتا یعنی اُسے دوسروں کے مانند چوراسی لاکھ جنم نہیں لینا پڑتے۔

چمن سرمایۂ اُمید گردد بگردن زندۂ جاوید گردد

اُس کا سرمایۂ اُمید پھلتا پھولتا ہے، یہ موت اُسے امر کردیتی ہے لیکن بنارس کی آب و ہوا میں ایسی تاثیر ہے کہ قالب کے فنا ہو جانے کے بعد بھی روح یہاں سے نقل مکانی پسند نہیں کرتی اور ہمیشہ کے لیے یہیں رہنا چاہتی ہے۔ دنیا کے اس قدیم ترین صنم کدے کا ماحول سدا بہار ہے۔ بہار کا موسم ہو یا خزاں کا، سردی ہو یا گرمی بنارس کی فضا ہر موسم میں بہشت کا سماں پیش کرتی ہے اور یہی نہیں ساری دنیا کی بہاریں "قشلاق" اور "ییلاق" کے لیے بھی یہیں آتی ہیں یعنی بہاریں اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جب دنیا کے دوسرے حصوں میں گرمی برداشت نہیں کرسکتیں تو بنارس چلی آتی ہیں۔ اسی طرح سردیوں سے بچنے کے لیے بھی بہاروں کے لیے بنارس سے بہتر کوئی روح افزا مقام نہیں۔

چہ فروردین چہ دیماہ و چہ مرداد بہر موسم فضایش جنت آباد

بہاراں در شتا و صیف ز آفاق بکاشی می کنند قشلاق و ییلاق

اس مقدس شہر میں آکر بہاروں نے بھی زنّار پہن لیا ہے۔ یہ زنّار

معمولی زنار نہیں ہے بلکہ موجِ بوئے گل کا زنار ہے۔

بہ تسلیم ہوای آن چمن زار　　زموجِ گل بہاران بستہ زنار

اسی مثنوی میں بنارس اور یہاں کے مہوشوں کی تعریف کے بعد غالب کی ملاقات ایک پیرِ جہاندیدہ سے ہوتی ہے جو آسمانی گردشوں کے راز سے بخوبی واقف ہے۔ غالب اس سے دنیا کی بے وفائی اور بے مہری کا تذکرہ کرتے ہیں کہ اس قدر بد اخلاقی اور گنہگاری کے باوجود قیامت کے آنے میں تاخیر کیوں ہے کیا یہ آخرِ زماں کی علامات نہیں ہیں؟ بوڑھے کے جواب کے پردے میں مرزا نے بنارس کی عظمت کو جس خوبی سے اُجاگر کیا ہے وہ اُن ہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں:

سوی کاشی باندازِ اشارت　　تبسم کرد و گفتا این عمارت
کہ حقا نیست صانع را گوارا　　کہ از ہم ریزد این رنگین بنارا
بلند اُفتادہ تمکینِ بنارس　　بود بر اوجِ او اندیشہ نارس

(بوڑھے نے کاشی کی طرف اشارہ کرکے مسکراتے ہوئے کہا کہ خدا کو اس خوبصورت عمارت یعنی بنارس کی تباہی منظور نہیں اسی لیے قیامت بپا ہونے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ درحقیقت بنارس کا وقار اتنا بلند ہے کہ اس کی بلندی پر خیال کی بھی رسائی نہیں)

مثنوی کے آخری حصے میں گویا غالب اپنے آپ میں آجاتے ہیں۔ صنم کدۂ بنارس کی سحر انگیزیوں سے مسحور ہونے پر اپنے آپ کو ملامت کرتے ہیں۔ اُن کو تو طریقِ معرفت کا سالک ہونا چاہیے۔ ہمیشہ کے لیے کاشی ہی کا ہو کر رہ جانا راہِ طریقت کے مسافر کو زیب نہیں دیتا کیونکہ جذبِ کامل کے سامنے کاشی سے کاشان تک کی مسافت بھی نیم گام سے زیادہ نہیں۔ اس کے علاوہ وہ تو اپنی منزل کی جستجو میں نکلے ہیں انھیں راہوں کے پیچ و خم میں گم نہیں ہونا چاہیے اس لیے:

فرو ماندن بہ کاشی نارسائیست　　خدا را این چہ کافر ماجرائیست

کاشی میں مقیم ہونا نارسائی کی دلیل ہے اور غالب ایسے مومن کے لیے یہ باتیں ناروا ہیں۔

مثنوی چراغِ دیر مرزا غالب نے اُس زمانے میں تحریر کی جب انھیں اپنے ایرانی اُستاد عبدالصمد سے فارسی زبان و ادبیات کی تعلیم حاصل کیے ہوئے فقط سولہ سترہ سال کا عرصہ گزرا تھا۔ مرزا کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے اپنے ایرانی معلم سے ایرانِ قدیم کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کی تھیں اور ساری عمر وہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں اپنی فارسی دانی کو اسی لیے افضل سمجھتے رہے کہ انھوں نے اہلِ زبان سے سیکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ اُن کی مختلف تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم ایرانی کلچر سے ان کی واقفیت ایک حد تک بالکل سرسری ہے، باقی رہا اہلِ زبان سے سیکھنے کا سوال تو مرزا کا یہ دعویٰ بھی سچا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر عبدالصمد کے نام سے ان کا کوئی ایرانی استاد موجود تھا تو وہ اپنے دور کے جدید فارسی روزمرہ اور محاورہ سے تھوڑی بہت واقفیت کا اظہار ضرور کرتے۔ انھوں نے اپنے ہمعصر قاآنی کا دیوان ہمیشہ اپنے تکیے کے نیچے ضرور رکھا لیکن خود فارسی گوئی کے وقت ان تمام لسانی خصوصیات کو بالائے طاق رکھ دیا جو اس وقت کے باکمال ایرانی شعرا کی شہرت کے لئے بال و پر کا کام دے رہی تھیں۔ ایرانیوں کے مداح ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے معاصر ایرانی فن کاروں کی رواں دواں جدید زبان اور عام فہم اور موثر اسلوبِ سخن سے کوئی اثر قبول نہیں کیا بلکہ بیدل، شوکت، نظیری، ناصر علی سرہندی وغیرہ کی تقلید کو اپنے لئے باعثِ افتخار خیال کیا۔

غالب کے ہمعصر ایرانی نقادوں نے اسی زمانے میں "ادبی بازگشت" کی تحریک کو بڑے جوش و خروش سے تقویت دی تھی۔ اسلوبِ ہندی کو جب بیدل اور شوکت جیسے شعراء نے گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیا تو ایران میں اصفہانی شاعروں نے اس روش کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور پھر سے فرخی، حافظ، سعدی اور دیگر قدیم ایرانی فن کاروں کے تتبع کو رواج دیا۔ غالب کے معاصرین میں نشاط اصفہانی، وصال شیرازی، سروش اصفہانی اور قاآنی شیرازی نے اپنی زبردست مشق اور خداداد صلاحیتوں سے اپنی شاعری میں ایسی دلکشی، موسیقی، رنگینی اور تاثیر پیدا کر دی کہ اسلوبِ ہندی کی ایہام پروری اور دماغ سوزی کا ماحول خواب و خیال ہو کر رہ گیا۔ افسوس ہے کہ غالب نے اس روش کو قابلِ اعتنا خیال نہیں کیا یا یہ کہ انھیں ان شعرا سے مفصل طور پر شناسائی حاصل نہیں ہوئی ورنہ ان سے تعلق پیدا ہونے کے بعد جس طرح غالب نے اپنی منفرد قوتِ فکر کو ذوق اور ظفر کے سے ٹھیٹھ اردو روزمرہ اور محاورہ میں ڈھال لیا تھا، اسی طرح اگر وہ اپنی فارسی گوئی میں بھی اپنے زبردست تخلیقی جوہر کو رواں دواں معاصر فارسی زبان میں جلوہ گر ہونے کا موقع دیتے تو مثنوی چراغِ دیر میں "کتانِ خویشتن می شویم بمہتاب"

"سخن را نازشِ مینوستانی"

"نگہ را دعویٰ گلشن ادائی"

جیسے مصرعے موجود نہ ہوتے۔

غالب کی خودداری

ڈاکٹر سلام سندیلوی

کارل یونگ (CARL JUNG) کا قول ہے کہ انسان کی غیر شعوری سطح کے نیچے اس کی ماضی کی باقیات کا ذخیرہ جمع رہتا ہے۔ چنانچہ انسان اپنے بچپن کی بہت سی باتوں کو اپنی ذہنی تہوں کے اندر غیر شعوری طور پر محفوظ رکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی ذات پر اس کی نسل کے اثرات بھی ثبت ہو جاتے ہیں۔[1]

اس قول کی روشنی میں ہم غالب کی خودداری کا بھی جائزہ لے سکتے ہیں۔ غالب کی نسل کا سلسلہ تور ابن فریدوں تک پہنچتا ہے جس کا تعلق پیشدادیان خاندان سے تھا اور جس کی بنیاد کیومرس نے ۵۰۰ قبل مسیح ڈالی تھی۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ کا نام ذاب تھا۔ پیشدادیوں کے زوال کے بعد ایران میں کیانیوں کا عروج ہوا۔ مگر پیشدادیان خاندان کے افراد بالکل نیست و نابود نہیں ہوئے بلکہ توقاق نے ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈالی اور اس کے بیٹے سلجوق نے اس بنیاد کو مضبوط کر کے سلجوقی خاندان کو شہرت دی۔ سلجوقی خاندان کو جب زوال ہوا تو اس خاندان کے ایک شہزادے ترسم خاں نے سمرقند میں اقامت اختیار کی۔ اس کا بیٹا توقان بیگ خاں اپنے باپ سے ناراض ہو کر بقول حالی شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندستان آ گیا۔[2]

توقان کے بیٹے کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا جو غالب کے پدر بزرگوار تھے۔ اس طرح غالب کا نسب ایران کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کی رگوں میں شاہی خاندان کا لہو دوڑ رہا تھا۔ ہندستان کے کم شعرا ایسے ہوں گے جن کا تعلق شاہی خاندان سے رہا ہے۔ غالب کو اپنے شاہی نسب پر فخر تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنے مختلف اشعار میں کیا ہے۔ چنانچہ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں۔

غالب از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعت اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست — مرزبان زادۂ سمرقندیم

غالب کا ایک دوسرا قطعہ ان کی خاندانی برتری کا ثبوت پیش کرتا ہے:

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم — دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ می بود اکنون بمن سپار — زاں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

دراصل غالب کی خاندانی برتری نے ان کو خودداری بخشی تھی۔ اس

---

[1] THEORY OF LITERATURE BY RENE WELLEK AND AUSTIN WARREN P. 84

[2] خلیل الرحمٰن داؤدی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ توقان بیگ محمد شاہ کے عہد میں ہندستان آیا۔ اس نے پہلے لاہور میں آ کر نواب معین الملک کی ملازمت اختیار کی۔ جب نواب معین الملک کا انتقال سنہ ۱۷۵ میں ہو گیا تو وہ دہلی شاہ عالم کے دربار میں آیا۔ محمد شاہ نے سنہ ۱۷۱۹–۱۷۴۸ء تک حکومت کی اور یہی نواب معین الملک کا زمانہ ہے۔ اور شاہ عالم کی حکومت سنہ ۱۷۵۹ سے سنہ ۱۸۰۶ء تک رہی ہے۔ (یادگار غالب مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۲)

یات کا فخر ان کو زندگی بھر رہا اس لیے وہ خاندانی حیثیت سے خود کو بہادر شاہ ظفر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ غالب کے مقابلے میں ذوق خاندانی حیثیت سے پست تھے کیوں کہ ان کے والد شیخ رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ذوق کے یہاں خودداری اور انانیت کا عکس بہت کم ملتا ہے۔ مومن کی ذات میں ذوق سے زیادہ خودداری پائی جاتی ہے کیوں کہ ان کے دادا حکیم نامدار خاں مغل حکومت میں شاہی طبیب تھے۔ غالب کی خاندانی خودداری عرفی کی خودداری سے مشابہ ہے۔ عرفی کے والد زین الدین علی شیراز میں شعبۂ عرف میں ملازم تھے اسی مناسبت سے ان کے بیٹے نے عرفی تخلص اختیار کیا۔ عرفی کا یہ حال تھا کہ وہ شاہی آداب سے بھی بے نیاز تھا۔ اس کا ثبوت مآثر رحیمی سے ملتا ہے۔

"در ایام ملازمت تسلیم و کورنشے کہ در ہندوستان متعارف است کہ بعوض سلام بہ صاحباں می کنند، بہ صاحب خود نمی کرد و بہ ہر طرز و طور و رسمے کہ می خواست در مجالس می نشست و اہل عالم تقدیم او را قبول می نمودند"

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب میں عرفی جیسی جرأت نہیں تھی کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حسب خواہش کسی مقام پر بیٹھ سکتے یا آداب و رسوم دربار سے بے نیاز ہو جاتے، تاہم غالب میں خودداری فطری طور پر ان کی نسلی برتری کی وجہ سے بڑی حد تک موجود تھی۔

غالب کے یہاں خودداری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کا بچپن عیش و عشرت میں گذرا۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ کے انتقال کے بعد الور کے راجا بختاور سنگھ نے دو گاؤں اور کسی قدر روزینہ مرزا غالب اور مرزا یوسف کے لیے مقرر کر دیا کیوں کہ مرزا عبداللہ بیگ راجا الور کی حمایت میں مارے گئے تھے۔ اس کے علاوہ مرزا غالب کے چچا مرزا نصراللہ بیگ کو لارڈ لیک نے سونک اور سونسا کے علاقے بخش دیے تھے کیوں کہ انھوں نے ریاست ہلکر کے سپاہیوں سے ان علاقوں کو چھین لیا تھا۔ مرزا نصراللہ بیگ کی وفات کے بعد یہ علاقے ان کی ملکیت سے نکل گئے۔ اب نصراللہ بیگ کے سالے نواب احمد بخش خاں نے فیروز پور جھرکہ اور لوہارو سے ان کے متعلقین کی پرورش کی ذمے داری لی۔ انھوں نے لارڈ لیک سے ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ معاوضہ معاف کرا لیا اور یہ طے کیا کہ وہ ۱۵ ہزار روپیہ سالانہ اپنے فوجی دستے پر خرچ کریں گے اور باقی دس ہزار روپیہ سالانہ مرزا نصراللہ بیگ کے متعلقین پر صرف کریں گے۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد انھوں نے لارڈ لیک سے مل کر مرزا نصراللہ بیگ کے ورثا پر خرچ ہونے والی رقم کو ۵ ہزار روپیہ سالانہ کرا لیا اور اس کا بٹوارہ یوں کیا کہ ۲ ہزار روپیہ سالانہ خواجہ حاجی کو ملیں اور باقی ۳ ہزار میں سے ۱½ ہزار روپے سالانہ مرزا نصراللہ بیگ کی ماں اور تین بہنوں کو ملیں اور ۱½ ہزار روپے سالانہ مرزا غالب اور مرزا یوسف کو ملیں۔ اس طرح غالب کو ۷۵۰ روپے سالانہ کی رقم بطور پنشن مل جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مرزا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان کے پاس کافی جائداد تھی۔ مرزا غالب نے اپنا بچپن آگرے میں اپنے ننھیال میں گذارا اور وہاں ان کی پرورش بہت ناز و نعم سے ہوئی۔ اس عیش و عشرت نے مرزا غالب کے انا کو ہوا دی اور ان میں ایک قسم کی بے نیازی اور خودداری پیدا کر دی۔

مرزا غالب کی خودداری کا ہم ایک اور سبب دریافت کر سکتے ہیں۔ مرزا غالب ایک کامیاب عاشق تھے۔ انھوں نے آغاز شباب میں ایک ڈومنی سے عشق کیا تھا۔ اور وہ ڈومنی بھی غالب پر جان چھڑکتی تھی۔ غالب اپنے ابتدائی عہد میں ایک مال دار انسان تھے۔ اس لیے طوائف کا غالب کی طرف متوجہ ہونا فطری بات ہے۔ یہی نہیں بلکہ غالب ایک حسین و جمیل انسان تھے۔ مولانا حالی کا قول ہے کہ عنفوان شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین اور خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اس سے ہم اس بات پر یقین کر سکتے ہیں کہ وہ طوائف بھی غالب سے بے پناہ محبت کرتی ہوگی جب اس کا انتقال ہو گیا تو غالب نے ایک پر درد مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

چونکہ غالب محبت کے معاملے میں مطمئن اور آسودہ تھے اس لیے ان کے انا نے سربلندی اختیار کی اور ان میں خودداری کی کیفیت پیدا کر دی۔ اس موقع پر ایک امر کی وضاحت ضروری ہے۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ غالب کو ڈومنی کی یاد زندگی بھر ستاتی رہی مگر جب انھوں نے ڈومنی سے عشق کیا تھا تو بقول شیخ محمد اکرم ان کی عمر بیس بائیس سال کی تھی[1] غالباً اس کے بعد غالب نے کسی سے سنجیدگی کے ساتھ محبت نہیں کی۔ دراصل غالب محبت کو بھی شطرنج اور چوسر کی طرح ایک کھیل سمجھتے تھے، یہی نہیں بلکہ وہ عشق کو دماغی خلل سے بھی تعبیر کرتے تھے۔ وہ نظیری کی طرح جانباز عاشق تھے اور نہ اپنی ذات کو عشق میں فنا کردینے کے قائل تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے ایک خط میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے:

"ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں اور ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رکھو کہ مصری کی مکھی نہ بنو، شہد کی مکھی بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی، منا جان سہی۔"

غالب کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ معشوق ان کی نظر میں کچھ اہمیت نہیں رکھتا ہے، بلکہ عاشق کی ذات زیادہ اہم ہے۔ یہ نظریہ نہ صرف غالب کی خودداری کو ثابت کرتا ہے بلکہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان میں نرگسیت کے بھی جراثیم موجود تھے۔

غالب کی عزت اور قدردانی دہلی میں کافی ہوئی اور ان کا شمار عمائدین شہر میں کیا جاتا تھا۔ اس لیے غالب کو اپنی عزت و آبرو کا بہت خیال رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی خودداری پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔ جب غالب اپنی پنشن کے تصفیہ کے سلسلے میں کلکتہ گئے تو واپسی میں لکھنؤ میں بھی قیام کیا۔ بقول مولانا حالی لوگوں نے غالب کی آمد کا ذکر نائب سلطنت روشن الدولہ سے کیا۔ غالب پریشانی کی وجہ سے کوئی قصیدہ نہ کہہ سکے اس لیے انھوں نے ایک مدحیہ نثر صنعت تعلیل میں روشن الدولہ کے لیے لکھی۔[2] مگر ملاقات کرنے سے پہلے انھوں نے دو شرطیں رکھیں، پہلی شرط یہ تھی کہ نائب سلطنت میری تعظیم کریں دوسری شرط یہ تھی کہ وہ مجھے نذر سے معاف کردیں۔ روشن الدولہ نے یہ شرطیں منظور نہیں کیں اس لیے غالب بغیر ان سے ملاقات کیے ہوئے دہلی واپس آگئے۔ اس واقعہ سے غالب کی خودداری پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔

غالب کی خودداری کا ایک اور واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند کو دہلی کالج کے لیے ایک فارسی مدرس کی ضرورت تھی۔ اس ملازمت کے لیے مرزا غالب، مومن اور امام بخش کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے مرزا غالب کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ مرزا صاحب اپنی پالکی پر سوار ہوکر سکریٹری کے ڈیرے پر پہنچے اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ سکریٹری صاحب ان کو لینے کے لیے پالکی تک آئیں۔ جب سکریٹری کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ مرزا صاحب کی پالکی تک گئے اور کہا کہ جب آپ گورنر کے دربار میں مدعو کیے جائیں گے تو اس وقت آپ کا دستور کے موافق استقبال کیا جائے گا مگر اس وقت تو آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس موقع پر وہ دستور نہیں برتا جاسکتا ہے۔ مرزا غالب نے کہا کہ میں نے سرکاری ملازمت کا ارادہ اس وجہ سے کیا تھا کہ اعزاز میں اضافہ ہو لیکن ملازمت سے اعزاز میں اور کمی واقع ہو رہی ہے۔ سکریٹری صاحب نے کہا کہ ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا غالب نے جواب دیا تو پھر مجھے خدمت سے معاف رکھا جائے۔ اس کے بعد مرزا غالب اپنے گھر واپس آگئے۔ غالب کی خودداری کی یہ ایک بیّن مثال ہے۔

مرزا غالب کی خودداری کو ایک بار زبردست صدمہ پہنچا۔ وہ اکثر چوسر کھیل رہتے تھے کہ دشمنوں نے شہر کوتوال کو اطلاع کردی اور مجسٹریٹ نے مرزا غالب کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ عدالت کو چھ ماہ کی قید کی سزا ہوگئی مگر پھر مجسٹریٹ نے دیگر حکام کی سفارش پر تین ماہ کے بعد

---

[1] حکیم فرزانہ ۔ شیخ محمد اکرام صفحہ ۱۲۶ ۔ [2] خلیل الرحمٰن داؤدی کا قول ہے کہ اس وقت نائب سلطنت روشن الدولہ نہیں تھے بلکہ معتمد الدولہ آغا میر تھے اور انھیں کے لیے غالب نے صنعت تعلیل میں مدحیہ نثر لکھی تھی ۔ یادگار غالب صفحہ ۳۷

مرزا کی رہائی کا حکم دے دیا۔ اگرچہ مرزا صاحب قید خانے میں آرام سے دن گذارتے رہے مگر یہ ذلت ان پر نہایت شاق گذری جیسا انھوں نے ایک فارسی خط میں اس واقعہ کا ذکر کیا جس کا ترجمہ مولانا حالی نے یادگار غالب میں پیش کیا ہے:

"میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ اللعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بہ صحرا نکل جاؤں۔"

چونکہ انسان سماج کا ایک فرد ہوتا ہے وہ دیگر افراد کی تنقیدوں اور تبصروں سے گریز نہیں کر سکتا ہے۔ بقول مکڈوگل چوں کہ انسان کو خیر و شر کے روایتی معیار پر جانچا جاتا ہے۔ اس لیے جب اس کا مقابلہ شر سے پڑتا ہے تو اس کی خودداری مجروح ہوتی ہے۔ اس لیے غالب کی خودداری کو صدمہ پہنچا یہاں تک کہ انھوں نے موت کو ترجیح دی۔

مرزا غالب کو اس وقت بھی بہت ذلت اٹھانا پڑی جب انھوں نے برھان قاطع کی غلطیوں پر گرفت کی اور ان غلطیوں کو یک جا کر کے قاطع برھان کے نام سے شائع کرا دیا۔ اس قاطع برہان کے جواب میں محرق قاطع، قاطع قاطع، مویدِ برھان اور ساطع برھان وغیرہ رسالے شائع ہوئے۔ مرزا غالب نے ایک فارسی رسالے کے مولف پر جس نے قاطع برھان کا جواب لکھا تھا ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی مگر ان کو کامیابی نہیں ہوئی اس لیے راضی نامہ داخل کر دیا۔ مقدمہ داخل دفتر ہونے کے بعد مرزا غالب کے نام گمنام خطوط آنے لگے جن میں فحش گالیاں لکھی ہوتی تھیں۔ مرزا غالب کو ان باتوں نے سخت صدمہ پہنچایا اور ان کی خودداری پاش پاش ہو گئی۔

ے یادگار غالب میں غالب کی خودداری کا ذکر کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا مگر خودداری اور حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امراء و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے وہ بھی کبھی ان کے مکان پر نہیں جاتے تھے اور جو شخص ان کے مکان پر آتا تھا وہ بھی اس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے مکان پر آئے، میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب نے کہا "آپ مکان سے سیدھے یہیں آئے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا" مرزا نے کہا "مجھ کو ان کا ایک آنا دینا تھا، اس لیے اول وہاں گیا تھا۔ وہاں سے یہاں آیا ہوں۔"[۱]

اس واقعہ سے بھی مرزا غالب کی خودداری کا کھلا ہوا ثبوت ملتا ہے۔ حالی نے یادگار غالب میں ایک جگہ مرزا غالب کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان خوبیوں میں انھوں نے ان کی خودداری کو بھی شامل کیا ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:

"غریبوں اور محتاجوں کی خبر لینی، نوکروں اور لگے ملازموں کو عسرت کے وقت اپنے سے علیحدہ نہ کرنا۔ درماندگی میں دوستوں کی امداد کرنی اور ان کی مصیبت میں مثل یگانوں کے افسوس اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنا۔ ہر حال میں پاس وضع اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دینا۔ مذہبی تعصبات سے پاک ہونا اور ہر مذہب اور ہر ملت کے دوستوں کے ساتھ یکساں صفائی اور خلوص سے ملنا، یہ اور اسی قسم کی خوبیاں جو دارالخلافہ کی قدیم سوسائٹی کا زیور سمجھی جاتی تھیں، ان کی ذات میں جمع تھیں۔"[۲]

غرض مختلف واقعات اور حالی کے بیانات کی روشنی میں ہم غالب کو ایک خوددار انسان قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ غالب کے کردار پر ایک بدنما داغ نظر آتا ہے جس سے ان کی خودداری پر شبہہ ہونے لگتا ہے۔ اس کی طرف ڈاکٹر عبداللطیف نے بھی اشارہ کیا ہے۔[۳] وہ یہ کہ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد غالب نے ملکہ وکٹوریہ، ایلن بیاؤن

۱، ۲؎ یادگار غالب مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ص ۹۹، ۷۵ ۔ ۳؎ غالب۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف مطبوعہ جہانگیر بکڈپو دہلی ص ۸۶ تا ۸۹

اور میکلوڈ وغیرہ کی تعریف میں قصائد کہے۔ اس سے غالب کی وطن پرستی اور ان کی خودداری پر حرف آتا ہے مگر دراصل ۱۸۵۷ء کے بعد غالب کی معاشی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ پنشن بند ہو جانے کے بعد انھوں نے گھر کا اثاثہ یہاں تک کہ کپڑے بیچ کر زندگی گذاری۔ اسی لیے غالب انگریزوں کی مدح سرائی کے لیے مجبور تھے۔ اس کے علاوہ غالب متعصب انسان نہیں تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں مسلمان، ہندو اور انگریز سبھی شامل تھے۔ شاید اسی وجہ سے انگریزوں کی مدح سرائی کو انھوں نے معیوب نہیں سمجھا۔ بہرحال مجموعی طور پر ہم غالب کو ایک غیور انسان تصور کر سکتے ہیں۔

مختلف واقعات اور شواہد کے علاوہ خود مرزا غالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ان کی خودداری پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً فارسی کے چند اشعار میں غالب کی خودداری کا صاف عکس نظر آ رہا ہے۔

غرقہ بہ موجہ تاب خورد، تشنہ ز دجلہ آب خورد
زحمت ہیچ یک نہ داد، راحت ہیچ یک نخواست
خونِ جگر بہ جائے مے، مستیِ ما قدح نہ داشت
نالۂ دل نوائے نے، بانشِ ما نچک نہ خواست
گشتہ در انتظار پور، دیدۂ پیر رہ سفید
در رہِ شوق ہم رہی، دیدہ ز مردمک نہ خواست
سہل شمارد سرسری، تا تو ز نخسہ نشمری
غالب اگر بداوری، داد خود از فلک نخواست

غالب کے دیوان اردو میں بھی جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جو ان کی خودداری کے نازک آبگینے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی کہ کبھی — گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے — مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا
دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں — جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا
کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا — رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیرِ درد — زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سراپا نمک
گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب — ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ — اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
صد جلوہ رو بہ رو ہے جو مژگاں اٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے
ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے — تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے — وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے — اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب — کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

غالب کے یہاں خودداری کی ایک اور شکل نظر آتی ہے جس کو ہم وضع داری کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

غالب کی خودداری کبھی کبھی آزادروی کی شکل میں بھی نمودار ہوتی ہے

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

غالب کی خودداری کے مختلف روپ ہیں ہم ان کی خودداری کو بے دماغی کے روپ میں بھی دیکھ سکتے ہیں:

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے — کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

(بقیہ صفحہ [illegible])

تو پھر اے سنگِ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

وجاہت علی سندیلوی

مرزا غالبؔ نے ایک بہت مرصع غزل جس کا مطلع ہے ؎

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں، تو پھر منہہ میں زباں کیوں ہو

۱۸۵۲ء میں کہی تھی۔ اس کے متعلق انھوں نے منشی نبی بخش حقیر کو اسی سال جون میں لکھا ہے کہ "میں نے ان دنوں میں دو غزلیں لکھی ہیں۔ ایک تو در یا نہ ہو، صحرا نہ ہو سو وہ آپ کے پاس بھیج چکا۔ دوسری غزل، رواں کیوں ہو اور گماں کیوں ہو وہ اب بھیجتا ہوں۔" اس غزل میں گیارہ شعر ہیں اور یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کے دو قافیے جو مرزا صاحب نے اپنے خط میں لکھے ہیں ان کا کوئی بھی شعر اس غزل میں موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو سہو ہوا ہو، اور یہ بھی امکان ہے کہ پہلے انھوں نے ان قافیوں کے شعر بھی کہے ہوں اور بعد میں قلم زد کر دئے ہوں، لیکن وہ ان کے ذہن میں کھٹکتے رہے ہوں۔ یہ غزل ہر حیثیت سے بڑی معرکہ آرا ہے اور اس کا ایک ایک شعر منفرد اور منتخب ہے اور مختلف شارحین اور ناقدین نے اس کی نہ صرف بہت تعریف کی ہے بلکہ اس کو مرزا صاحب کا کارنامہ بتایا ہے۔

اسی غزل کے دو شعر مرزا صاحب نے مہرؔ کو ایک خط میں لکھے ہیں۔ یہ خط بہت ہی پر لطف ہے۔ فرماتے ہیں:

"تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوط میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے پس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجائش ہے بلکہ یہ غم تو درخورِ افزائش ہے بقول غالبؔ علیہ الرحمہ ؎

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں، تو پھر منہہ میں زباں کیوں ہو؟

ہے، ہے! حسنِ مطلع!

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

افسوس ہے کہ اس غزل کے اور اشعار یاد نہ آئے۔ اور اگر خدا نخواستہ باشد غم دنیا ہی تو بھائی ہمارے ہمدرد ہو۔ ہم اس بوجھ کو مردانہ وار اٹھا رہے ہیں تم بھی اٹھاؤ اگر مرد ہو بقول غالبؔ مرحوم ؎

دلا! یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے"

اسی غزل میں ایک بے پناہ شعر ہے ؎

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

حضرت طباطبائیؒ نے اس شعر کی یوں تشریح کی ہے:

"کیسی وفا اور کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں ہونا کیا ضرور ہے جہاں جی چاہے گا سر پھوڑ لیں گے۔"

اور اس کے متعلق فرمایا ہے: "یہ شعر رنگ و سنگ میں گوہر تاب ہوا ہے۔" اسی طرح صاحب ۔۔۔ نے اس شعر کی تعریف میں فرمایا ہے: "اس شعر کی بندش میں وہ چستی ہے جس کی تعریف غیر ممکن ہے۔" دیگر شارحین مثلاً مولانا حسرت موہانی، حضرت بیخود دہلوی، حضرت تنہا، حضرت جوش ملسیانی وغیرہ نے بھی اس شعر کا قریب قریب وہی مطلب بیان کیا ہے جو اوپر حضرت طباطبائیؒ کے نام سے لکھا جا چکا ہے اور اس شعر کی بہت تعریف اور توصیف کر کے اسے ایک شاہکار قرار دیا ہے۔

شعر کے اس مطلب کو پڑھ کر جو بات فوراً ہی کھٹکتی ہے وہ یہ کہ اس میں اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ شاعر یہ کیوں اور کن حالات میں کہہ رہا

ہے۔ وفا اور عشق سے وہ متنفر کیوں ہو گیا اور پھر اس کے بعد بھی اُسے سر پھوڑنے کی کیا ضرورت باقی رہ گئی؟ کیونکہ سر پھوڑنا تو وفا اور عشق ہی کے لوازمات میں سے سمجھا جاتا ہے ــــ

پروفیسر سلیم چشتی نے اپنی شرح میں اس شعر کے معنی یوں بتائے ہیں:

" شعر کا مطلب بالکل واضح ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے وفا کی لیکن تو نے جفا کی۔ ہم نے تجھ سے محبت کی، تو نے ہم سے نفرت کی ــ نتیجہ تیری بے اعتنائی کا یہ نکلا کہ ہم نے سر پھوڑ کر مر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اچھا جب سر پھوڑنا ہی ٹھہرا تو پھر ہم پاس وفا یا پاس عشق کیوں کریں یعنی تیرے ہی سنگِ آستاں سے اپنا سر کیوں پھوڑیں؟ تیرے ہی دروازے پر جان کیوں دیں؟ جب تو نے جیتے جی ہماری قدر نہ کی تو ہمارے اس فعل کے بعد ہمارے لاشے کی بھی تیری نگاہ میں کوئی قدر نہیں ہوگی، تو ہم تذلیل نفس کیوں کریں؟ دنیا میں پتھروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ جہاں دل چاہے گا سر پھوڑ لیں گے۔

سچ تو یہ ہے کہ بندش کی چستی، الفاظ کے انتخاب، دوسرے مصرع کے تیور، زبان کی خوبی اور مضمون کی دل کشی کی بدولت یہ شعر سحرِ حلال کے مرتبے کو پہنچ گیا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ شعر غالب کے نشتروں میں سے ہے ــــ"

فاضل شارح نے معشوق کے سنگِ آستاں پر عاشق کے سر پھوڑنے سے اجتناب کی جو یہ وجہ بتائی ہو کہ اُسے خوف ہے کہ اس کی لاش کی بے حرمتی کی جائیگی، وہ نہ تو دل کو لگتی ہے نہ شعر کے الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے اور نہ امر واقعہ ہو سکتی ہے۔ سر پھوڑنے سے موت کا وقوع پذیر ہو جانا کوئی لازمی بات نہیں ہے۔ زندگی میں کئی دفعہ سر پھوڑا جا سکتا ہے۔ اس تشریح میں اس بات کی ضرور وضاحت کی گئی ہے کہ معشوق کی ناقدری کے باعث عاشق وفا اور عشق سے تائب ہو گیا ہے اور اس کی بے اعتنائی کی وجہ سے اُس نے سر پھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں عرض کیا جا سکتا ہے کہ شعر کے اس فقرے "جب سر پھوڑنا ٹھہرا" کے قامت پر اس تشریح یعنی " نتیجہ تیری بے اعتنائی کا یہ نکلا کہ ہم نے سر پھوڑ کر مر جانے کا فیصلہ کر لیا" کی قباہت ڈھیلی ڈھالی نظر آتی ہے اور مصرع ثانی "تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو" سے بات بالکل ہی بے ربط ہو کر رہ جاتی ہے۔ معشوق کی بے اعتنائی سے سر پھوڑ کر مر جانے کا فیصلہ تو عاشق کا کمالِ عشق ظاہر کرتا ہے۔ لیکن پھر معشوق سے یہ جرح کرنا کہ میں تیرے لیے جان تو دوں گا مگر تیرے دروازے پر نہیں، میرے خیال سے تو ایک خلط مبحث ہی پیدا کرتا ہے ــــ غالباً چشتی صاحب نے خود بھی اس تشنگی کو محسوس کیا تھا اور اسی وجہ سے انھوں نے عاشق کی لاش سے معشوق کے برتاؤ کی بات چھیڑ دی ورنہ شعر کے الفاظ سے تو اشارتاً اور کنایتاً بھی ایسی کوئی بات نہیں نکلتی۔ ایک عاشق صادق کی معراج تو یہی ہو سکتی ہے کہ وہ جس سے عشق کرتا ہے اُسی کے دروازے پر اپنی جان بھی دیدے۔

مرزا صاحب نے ایک جگہ خود کہا ہے ؎

> مر گیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی، ہے ہے !
> بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

اور محض اپنی لاش کی بے حرمتی کے خیال سے معشوق کے سنگِ آستاں پر جان دینے کی نعمت سے محروم رہنا عاشقی کے رسمی تصورات کے بالکل منافی ہے۔ مرزا صاحب نے ایک دوسری جگہ کہا ہے ؎

> گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
> جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

بہرکیف چشتی صاحب کی تشریح اس حیثیت کو ضرور قابل پذیرائی ہے کہ اُنھوں نے شعر زیر بحث کا ایک مربوط بنیادی تصور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر اور قیاس آرائی سے قطع نظر شعر کے مطلب کو اس کے الفاظ سے قریب تر لانے کے لیے یوں بھی کہا جا سکتا ہے:

"جب اس کی وفا کا جواب مسلسل ناقدری اور عشق کا صلہ مستقل نفرت کے سوا کچھ نہ ملا تو عاشق جس میں اب بھی کچھ عزتِ نفس باقی ہے، اپنے معشوق کو یوں جلی کٹی سُناتا ہے ہمیں وفا سے کیا مطلب اور ہم کیا جانیں کہ عشق کس کو کہتے ہیں۔ تیری بے اعتنائی کے ہاتھوں اب ہم ان دونوں کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ لیکن کیا کریں سر پھوڑنے کی اپنی جبلی عادت سے مجبور ہیں، لیکن جب تو ہم سے بالکل ہی بے تعلق ہو چکا تو پھر ہم اپنا سر پھوڑنے کے لیے بھی تیرے سنگ آستاں کے رہین منت کیوں بنیں، اُسے کہیں بھی پھوڑ سکتے ہیں، وہی بات کہ تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی ــــ"

یہ مطلب شعر کے جملہ الفاظ پر حاوی ہے اور اس میں کوئی بات محض اپنے قیاس کی بنا پر گھٹائی بڑھائی نہیں گئی ہے لیکن "سر پھوڑنا ٹھہرا" کے فقرے سر پھوڑنے کو عاشق کی جبلی عادت قرار دیا گیا ہے، جو محل اعتراض ہو سکتی ہے۔

جب عاشق "وفا" اور "عشق" سے ہاتھ دھو چکا یا کم سے کم ایسا کہہ رہا ہے تو پھر سر پھوڑنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی؟ اور اگر اس سے معشوق کو جلی کٹی سُنانے کے بعد بھی اعتراف عشق دکھانا مقصود ہے تو پھر معشوق کے سنگِ آستاں پر سر پھوڑنے سے احتراز کیوں ہے۔ عشق کی اضطراری کیفیت میں سر پھوڑنا تو ایک معنی رکھتا ہے لیکن محض جبلی عادت سے سر پھوڑنا ایک لاحاصل سی بات معلوم ہوتی ہے۔ محض سر پھوڑنے کے لیے سر پھوڑنا شعر زیرِ بحث کی معنویت کو صدمہ پہنچاتا ہے ——— مرزا صاحب نے ایک شعر میں کہا ہے ؎

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

لیکن اس سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ میں لڑکپن ہی سے عاشقی کے رسوم سے واقف تھا یا اپنے میں عشق کی صلاحیتیں محسوس کر کے جانتا تھا کہ ایک دن مجنوں کے سر کی طرح میرے سر کو بھی پتھر سے دوچار ہونا پڑے گا ——— بہرصورت اس شعر میں بھی سر اور پتھر کو عشق سے علٰحدہ کر کے نہیں پیش کیا گیا ہے ———

خلاصہ کلام یہ کہ شعر زیرِ بحث کا بنیادی تصور اگر وہی صحیح مانا جائے جو شارحین نے اب تک بیان کیا ہے یعنی شاعر اپنی عزتِ نفس کی خاطر اپنے معشوق تک سے دست بردار ہونے کے لیے آمادہ ہے تب بھی یہاں اس کی تشریح پچھلی روش کو ترک کر کے ایک نئے انداز سے کرنا پڑے گی کیوں کہ اب تک اس کے جتنے بھی مطلب بیان کئے گئے ہیں وہ اس کے الفاظ کا پوری طور سے احاطہ نہیں کر پاتے اور ان میں یا تو کچھ کمی رہ جاتی ہے یا کچھ اپنی طرف سے بڑھانا پڑتا ہے ———

اس شعر کے طرزِ ادا میں بلا کی بے ساختگی اور غضب کا تیکھا پن ہے۔ پہلے مصرعے کے ایک ایک لفظ میں طعن اور تشنیع کے نشتر چھپے ہوئے ہیں۔ صاف پتا چلتا ہے کہ یہ خود عاشق کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ وہ تعجب و ناگواری سے معشوق ہی کے الفاظ بڑے تلخ لہجے میں دُہرا رہا ہے ——— معشوق طعنہ دیتا ہے ——— کہ تم وفا کیا جانو اور تم نے مجھ سے عشق کیا ہی کہاں ؟ تم تو صرف عالمِ دیوانگی میں اپنا سر پھوڑتے پھرتے ہو ——— شعر زیرِ بحث میں عاشق اس طعنے کا جواب دیتا ہے ———

"میری وفا اور عشق تیری نظر میں بالکل ہی بے وقعت ہیں اور تو مجھ سے پوچھتا ہے کہ وفا کیسی ؟ کہاں کا عشق ؟ اور میں صرف عالمِ دیوانگی میں اپنا سر پھوڑتا پھرتا ہوں ؟ بہت اچھا یہی سہی اب میں تیرے سنگِ آستاں پر نہیں بلکہ کسی دوسری جگہ کے پتھر سے اپنا سر پھوڑوں گا ——— یعنی اب کہیں اور دل لگا کر اپنی عاشقی کے جوہر دکھاؤں گا" ———

گویا کہ معشوق کے چھٹنے پر مرزا صاحب نے وہی بات ذرا زیادہ بانکپن سے کہی ہے جو انھوں نے میکدے کے چھٹنے پر کہی تھی ؎

جب میکدہ چھُٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

مذکورہ بالا مطلب اپنی جگہ پر بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس میں سر پھوڑنے کی جبلی عادت والا نقص بھی موجود نہیں ہے کیونکہ یہ تو محض معشوق کا طعنہ ہے اور عاشق اُسی کا طنز یہ جواب دیتے ہوئے ساری بساط ہی اس پر پلٹ دیتا ہے ——— لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر کا ایک دوسرا مطلب بھی ہو سکتا ہے جو کھینچ تان کر نہیں بلکہ بلا تکلف، بہت واضح طور سے، شعر کے الفاظ سے نکلتا ہے ——— اس سے عاشق کی عزتِ نفس تو نہیں ظاہر ہوتی لیکن اس کے انوکھے استدلال سے شعر کے اندازِ بیان کی بلاغت اور لطافت میں اور بھی چار چاند لگ جاتے ہیں ———

مرزا غالب کے متعلق یہ ایک عام اور بالکل صحیح خیال ہے کہ انھوں نے تہہ دار اور ذو معنی اشعار جن کے ایک سے زیادہ مطلب اور مفہوم نکل سکتے ہیں، دوسرے شعرا سے مقابلتاً زیادہ کہے ہیں ——— ایک خیال ہے کہ ایسے اشعار کہنا جن کی ایک سے زیادہ تشریحیں کی جا سکتی ہوں، شاعر کا عجزِ بیان ہے کیونکہ بیان کی خوبی تو یہ ہونا چاہئے کہ کہنے والا جو کچھ کہنا چاہتا ہو وہ بجنسہٖ سُننے والے کی سمجھ میں آ جائے اور کئی مطالب کے درمیان وہ اس کھوج میں نہ بھٹکتا پھرے کہ کہنے والا دراصل کہہ کیا رہا ہے ——— یہ خیال ایک حد تک درست ہے لیکن جب کوئی ندرت یا نکتہ پیدا کرنے کی غرض سے ارادتاً کوئی ایسی بات کہی جائے جس کے ایک سے زائد مطالب نکلتے ہوں اور ان میں سے ہر مطلب کسی خاص خوبی کا حامل ہو، اور اس کو اخذ کرنے کے لئے بیان میں کسی قسم کی بھی کوئی خامی یا کمی نہ پائی جاتی ہو، تو اس کو عجزِ بیان سے نہیں اعجازِ بیان سے تعبیر کیا جاتا ہے ——— مرزا صاحب کے بیشتر تہہ دار اور ذو معنی اشعار کی اساس اس پر ہے کہ وہ بڑی فن کاری اور چابک دستی سے بعض الفاظ محذوف رکھتے ہیں اور چونکہ یہ الفاظ مختلف ہو سکتے ہیں لہذا بعض اشعار

کے معنی بھی مختلف ہوجاتے ہیں ـــــ

شعر زیر بحث میں بھی کچھ الفاظ اور فقرے محذوف ہیں لیکن دوسرے الفاظ اور شعر کی بندش کے ربط اور حوالے سے وہ بڑی آسانی سے ذہن میں آجاتے ہیں۔ ان کو شامل کر کے شعر کی نثر کی جائے تو یوں ہوگی:

(تو مجھ سے کہتا ہے!) وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ (اور تیرے خیال میں ہمارا شیوہ) جب (محض) سر پھوڑنا ٹھہرا ـــــ تو پھر (یہ تو بتا) اے سنگ دل (کہ ہمارے سر پھوڑنے کے لیے صرف) تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو (تا ہے)

اب شعر کا مطلب بالکل صاف ہوجاتا ہے۔ معشوق کے طعنے کے جواب میں عاشق بہت تلملا کر کہتا ہے کہ تیری محبت میں اتنا کچھ کر ڈالنے کے بعد بھی تو مجھ سے پوچھتا ہے کہ وفا کیسی؟ کہاں کا عشق اور میں صرف عالم دیوانگی میں اپنا سر پھوڑتا پھرتا ہوں ـــ اچھا یہی سہی ـــ لیکن آخر اس بات کا تیرے پاس کیا جواب ہے کہ اگر میں تیرا عاشق صادق نہ ہوتا تو میں دنیا بھر کے حسینوں کے سنگِ آستاں چھوڑ کر صرف تیرے ہی سنگِ آستاں پر اپنا سر کیوں پھوڑتا؟ جس کو تو میری دیوانگی قرار دیتا ہے کیا اس میں بھی ایک قرینہ اور سلیقہ نہیں ہے اور جو تجھ سے میرے عشق کا ایک ناقابل انکار ثبوت ہے ـــــ

★

غالب کی خودداری

(بہ سلسلۂ ص ۹)

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

جب غالب کی خودداری حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو وہ تعلّی کی شکل اختیار کر لیتی ہے:

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

رکھتا ہوں اسد سوزش دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

یہی نہیں بلکہ غالب کی خودداری کبھی کبھی تکبر میں بدل جاتی ہے:

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

غالب کی زندگی کے مختلف واقعات اور ان کے گوناگوں اشعار سے ان کی خودداری پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ غالب کے علاوہ میر کی خودداری میں بھی ایک بانکپن موجود ہے مگر میر کی خودداری اور غالب کی خودداری میں فرق ہے۔ میر کی خودداری فقیرانہ ہے، غالب کی خودداری شاہانہ ہے۔ میر کے خاندان کی وابستگی درویشی سے ہے، غالب کے پیشۂ آبا کا تعلق سپہ گری سے ہے۔ میر کے والد علی متقی ایک برگزیدہ انسان تھے، غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ ایک جری سپاہی تھے۔ میر فاقہ مستی میں بھی خوش رہتے تھے۔ غالب کو اگر ایک وقت شراب نہیں ملتی تھی تو وہ آزردہ ہوجاتے تھے۔ دراصل میر اور غالب کی خودداری کا فرق دونوں کے متضاد ماحول پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر کی خودداری میں ایک شان پائی جاتی ہے مگر غالب کی خودداری میں بھی ایک کشش موجود ہے۔

★

غالب دل و دماغ پہ غالب ہے آج بھی

کملا بیت سہائے ماتھر بلگرامی

شاعر کہوں، خطیب کہوں، فلسفی کہوں
غالب کو کیا کہوں نہ اگر منتہی کہوں
آئینہ دارِ غم، ہمہ تن شاعری کہوں
جو کہہ گیا ہو یہ، اُسے کیا جُز ولی کہوں

فطری مشاہدات کی، آفاقیت کی بات
ذکرِ خلوص، آشتی و عافیت کی بات
غالب کی شاعری میں ہے انسانیت کی بات
سچ ہے تو کیا ہی کہہ گیا حقّانیت کی بات

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

تخئیل نو ہے، طرزِ ادا میں اچھوتا پن
سج دھج کے جیسے نکلی ہو گھر سے نئی دُلھن
مرزا نے گُل کھلائے ہیں کیا کیا چمن چمن
شاہد ہے زورِ خامہ کی رنگینیٔ سخن

اُردو زبان کا وہی قالب ہے آج بھی
غالب دل و دماغ پہ غالب ہے آج بھی
جو شعر اُس نے کہہ دیا جالب ہے آج بھی
دُنیا یہ شعر سننے کی طالب ہے آج بھی

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

جو بات میرزا کی ہے وہ والہانہ ہے
رنگِ مزاج شاہد طرز شہانہ ہے
گویا بھری بہار کا رنگیں فسانہ ہے
واللہ جو سخن ہے وہی عاشقانہ ہے

غالب ہے ہمہ وقت کا شاعر زمانے میں
سب سے اہم کڑی ہے یہی کل فسانے میں
بے مثل "فن" ہے اُس کے یہ ہر اک ترانے میں
کیا لطف نغمہ دیتا ہے سُننے سُنانے میں

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی

محدودِ وقت و جا نہیں ماتھر یہ ہستیاں
بعد فنا بھی رہتے ہیں شہ کارِ جاوداں
غالب کی موت کو ہوئے سو سال بے گماں
یہ آرزو ہے اُس کی مگر آج بھی جواں

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

غالب کا تصوف

سید حرمت الاکرام

دورِ قدیم کے بیشتر اردو شعرا تصوف کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ملتے ہیں۔ چنانچہ زاہد و واعظ کی پگڑی اچھالنے اور محتسب و ملا کو ہدفِ ملامت بنانے کا موجب محض روایت پرستی یا پیش رووں کی تقلید کا جذبہ ہی نہ تھا بلکہ ظاہرداری ان کے لیے عملاً بھی مذموم تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ امیر خسرو سے فانی تک (علاوہ چند شعرا کے) سبھی کے شعری سرمائے، متصوفانہ عناصر کا خاصا حصہ رکھتے ہیں جس میں بازگشت، اعادہ اور تکرار کی کیفیت ہے مگر تازگی و نمو کی بھی کمی نہیں۔ غالب بھی اسی مذاقِ سخن کے امین ہیں جسے تصوف سے ان کی فطری مناسبت نے زیادہ سے زیادہ چمکایا اور نکھارا۔ ذیل کا شعر

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

عذرِ طلب ضرور ہے مگر غالب کی ولایت کی حد کہاں تک پہنچتی ہے، اس کا فیصلہ انھوں نے خود کر دیا ہے۔ البتہ مسائلِ تصوف سے ان کا شغف چھپانے کی چیز ہے نہ اسے چھپایا جا سکتا ہے۔ ان کی بادہ خواری اس امر میں تو حائل ہو سکتی ہے کہ انھیں ولی سمجھا جائے لیکن ان کے تصوف کو خواہ اس کا تعلق عمل سے ہو یا نظریے سے، کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

خواجہ حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں:

"علم تصوف سے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ برائے شعر گفتن خوب است، ان کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گزرے تھے اور سچ پوچھیے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعرا میں ممتاز بنا دیا تھا۔"

غالب کی سماجی، خانگی اور ذاتی زندگی کے واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تصوف ان کے خیال و تصور کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکا اور وہ صوفی سے زیادہ رند و قلندر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک معنی میں درست بھی ہے کیوں کہ وہ دردؔ کی طرح کے صوفی نہ تھے جو شاعری سے زندگی اور گفتار سے کردار تک اپنے عقیدے کی نمائندگی کرتے رہے جب کہ غالب

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کا نعرہ لگا کر در رجا کھڑے ہوئے لیکن غالب سے اس کی توقع رکھنا بجائے خود عبث ہے۔ وہ ان معنوں میں یقیناً صوفی نہ تھے کہ ان کے عقیدے کو عمل کی کسوٹی پر پرکھا جا سکے۔ یہ ضرور ہے کہ غالب نے ریاکاری کو شعار نہیں بنایا اور نہ اُن کی زندگی و شاعری میں کوئی ایسا تفاوت پایا جاتا ہے جو ظاہر و باطن کے درمیان دیوار یا خلیج بن سکے۔ تصوف سے غالب کے لگاؤ کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک طرف مذہبی و معاشرتی ضوابط کی سخت گیریوں سے بیزار تھے تو دوسری جانب ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ (اسی موقع پر ان کا وہ لطیفہ "آدھا مسلمان ہوں۔ شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا") یاد آتا ہے۔ انھوں نے زندگی بھی اس انداز سے گزاری کہ اسے حقائق و لطائف کا دل چسپ تصادم بنا دیا۔ کون نہیں جانتا کہ غالب ایک بے نظیر دماغ کے مالک تھے جس میں اختراع کوشی، ندرت پسندی اور جدت آفرینی کی نیرنگیاں پورے طور پر پیوست تھیں۔ چنانچہ انھوں نے شاعری کی طرح زندگی میں بھی رسمیات کے بتوں کو توڑا اور ع　ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم

خلد بہ غالب سپار زانکہ بدان روضہ در

نیک بود عندلیب خاصہ نوآئین نوا

مرزا غالب کی تحریروں کے عکس

بعض
فارسی تصنیفات
کے
سرورق

چند اُردو دیوان
اور
عودِ ہندی
کے سرورق

آگرہ کا مکان جہاں غالب پیدا ہوئے

مقبرۂ غالب

کی آواز بلند کرنے کے ساتھ ساتھ ملتوں کو اجزائے ایمان بنانے کا بھی دعویٰ کیا مگر یک گونہ بے خودی ان کا مقصودِ حیات بن گئی، اگرچہ ذوقِ مے کشی حصولِ نشاط کا وسیلہ نہ بن سکا لیکن "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" ان کے کام ضرور آیا۔ خواجہ حالی عملاً بھی مذہب سے بڑی قربت رکھتے تھے اور ان کا چہرہ جس پر داڑھی بھی تھی، (غالب کی طرح) مسلک کی غلط ترجمانی نہیں کرتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ غالب کم از کم آخری عمر میں اس راہ پر آجائیں جو نجات کی منزل تک پہنچا سکے اور حالی نے اس کی کوشش بھی کی جس کی تفصیل انھیں کے الفاظ میں سنیے:

"یہ وہ زمانہ تھا کہ خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے۔ خدا کی عام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے اہلِ سنت کو اور اہلِ سنت میں سے صرف حنفیہ اور ان میں سے بھی صرف ان لوگوں کو جو صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکامِ ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں، نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے۔ گویا دائرۂ رحمتِ الٰہی کو ٹن وکٹوریہ کی وسعتِ سلطنت سے بھی جس میں ہر مذہب و ملت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں، زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے۔ جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا تھا، اسی قدر اس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اس کا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات اور مغفرت کے لیے ناگزیر ہے۔ چوں کہ مرزا کی ذات کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجۂ غایت تھا اس لیے ہمیشہ ان کی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضۂ رضواں میں ہمارا ان کا ساتھ چھوٹ جائے گا اور مرنے کے بعد پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ ایک روز مرزا کی بزرگی، استادی اور کبرِ سنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھ کر خشک مغز واعظوں کی طرح ان کو نصیحت کرنی شروع کی۔ چونکہ ان کا ثقلِ سماعت انتہا کے درجے کو پہنچ گیا تھا اور ان سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعے کی جاتی تھی، نمازِ پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا جس میں ان سے اس بات کی درخواست تھی کہ آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے، نمازِ پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز ترک نہ ہو۔"

حالی آگے لکھتے ہیں:

"مرزا کو یہ تحریک سخت ناگوار گزری اور ناگوار گزرنے کی بات ہی تھی، خصوصاً اس وجہ سے کہ انھیں دنوں میں لوگ گمنام خطوں میں ان کے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کر رہے تھے اور بازاریوں کی طرح کھلم کھلا گالیاں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب نے اپنی لغو تحریر کو دیکھ کر جو کچھ فرمایا، وہ سننے کے لائق ہے۔ انھوں نے کہا "ساری عمر فسق و فجور میں گزری۔ نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں۔ اب اگر چند روز بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہو سکے گی؟ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں، میرے عزیز اور دوست میرا منھ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں اور کووں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ لا موجود الا اللہ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔"

یہ سطور بتاتی ہیں کہ غالب کا تصوف فی الاصل کچھ اور تھا جس کی معنوی عملی صورت گری خود ان کے ذہن نے کی تھی۔ ان کا مفکرانہ شعور جس کی بلندی و بیکرانی ان کی تحریروں سے ظاہر ہے، رسمِ عام سے کوئی ربط نہ رکھتا تھا جسے وجہِ استعجاب نہ ہونا چاہیے بلکہ ایسا ہوتا تو حیرت کی بات تھی۔ بلاشبہ مذہبی ضوابط کی بجا آوری کا تقاضا محض علمائے دین سے نہیں کیا جا سکتا (اور نہ یہ قرینِ دانش مندی ہے) لیکن غالب جیسے کسی شاعر کا انفرادی کردار، معاشرہ سے بعض مستثنیات و مراعات کا طالب ضرور ہو سکتا ہے جبکہ پورا معاشرہ کسی مربوط و متوازن اخلاقی نظام کا پابند نہ ہو۔ ظ۔ انصاری کی تصنیف غالب شناسی کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"غالب کی بڑائی اسی میں ہے کہ وہ محض ایک خوش گو، خوش فکر شاعر نہیں بلکہ زندگی میں آزادانہ فکر و عمل کا زبردست حامی ہے۔

بامن میاویز اے پدر فرزندِ آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

اس نے اپنی فنی زندگی کے کم و بیش ساٹھ سال غور و فکر، تلاش، تجربے، رد و قبول میں بسر کیے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے نہ تو ادبی، مذہبی روایات کی پابندی کی ہے اور نہ اندھا دھند ان سے بغاوت کی ہے۔ اس نے بزرگوں کے رسمی عقائد سے انکار کیا تو ایک زمانے تک چھان بین کر کے ایسے عقائد چن بھی لیے جو خالق اور مخلوق کے رشتے کو براہ راست سمجھتے ہیں"۔

حالی کی تحریر سے یہ بات پہلے ہی روشن ہو چکی ہے کہ غالب کو زندگی کے آخری حصے میں اپنے اعمال و عقائد کی بنا پر جو دینِ بزرگاں کے مطابق نہ تھے، بڑا مطعون ہونا پڑا۔ وہ اپنے اشعار اور خطوط کے ذریعے ان خیالات کا اظہار اکثر کرتے رہے تھے اور کرتے رہتے تھے جن کا رائے عامہ کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت حاصل کرنا ممکن نہیں، بلکہ بے دینی و گمراہی کے فتووں کی یورش ہوتی ہے۔ عوام اور غیر تعلیم یافتہ افراد ہی نہیں، بعض اوقات (خصوصاً مذہبی معاملات میں) خواص اور پڑھے لکھے اشخاص بھی انتہا پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ غالب کے نام آنے والے بعض خطوط میں ایسی گالیاں بھی ہوتی تھیں جن کی 'بے محلی اور مکتوب نگاروں کی کم عقلی' کا مذاق خود غالب نے اڑایا ہے اور ان تمام باتوں کا سبب ان کی رندمشربی و آزادہ روی ہے جس کی ترجمانی انھوں نے بایں انداز کی ہے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

شاعری کی حد تک (یا شاعری کی شکل میں) عوام اور خواص سبھی بہت کچھ گوارا کرتے بلکہ ایسے اشعار کی داد بھی دیتے آئے ہیں جنھیں خلاف عقیدہ تصور کیا جاتا ہے لیکن جب کوئی شخص اپنے شب و روز کے مظاہر ہی سے نہیں، دوسرے ذرائع سے بھی اس کا اعلان کرے اور اسے اپنے عقیدے پر اصرار بھی ہو تو اہل ظاہر اس کی تاب کہاں لا سکتے ہیں؟ علاوہ ازیں مخالفین کے اس رویے کو بعض دوسرے امور نے بھی جن کا مذہبیات سے کوئی خاص تعلق نہیں، ہوا دینے میں مدد کی اور غالب کے خلاف ایسی فضا وجود میں آگئی جو کسی بھی حساس شخص کے لیے (اور وہ بھی زندگی کے آخری دنوں میں) شدید ترروحانی کرب کا موجب ہو سکتی ہے۔

یہ نہیں کہ غالب نے ان خطوط میں پیش کردہ مشوروں کو مطلقاً درخورِ اعتنا نہ تصور کیا ہوگا اور ایک بد دماغ رئیس کی طرح ہر حال میں اپنی ضد برقرار رکھنے کی خواہش کے آگے ان کے ذہن نے کلیتہً سپر ڈال دی ہوگی بلکہ انھوں نے اپنے لیے جو مسلک وضع کیا تھا، اسے ان کے شعور و وجدان کی کامل تائید حاصل تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کو اپنے رویے پر کوئی تاسف نہ تھا بلکہ وہ ارکانِ دین کی پابندی کو ظاہر دارانہ رسم پرستی سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب نے وحدت الوجود کی راہ کو اختصارِ سفر کا ذریعہ بنا لیا تھا کیونکہ ان کی "منزل" "نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا" کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ چناں چہ اپنی روش پر شرمساری یا شرمسارانہ نگاہ ثانی کا سوال اٹھتا ہی نہیں۔

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

غالب کے اس مطلع کو ان کی خوش عقیدگی کی دلیل بنایا جا سکتا ہے لیکن میرے نزدیک اس سے ان کے مسلک کو مزید تقویت پہنچتی ہے نیز اس کی توضیح میں یک گونہ مدد ملتی ہے۔ ایک اور مطلع دیکھیے:

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

میرا خیال ہے کہ اس کا بنیادی مضمون بھی مصرعۂ اولیٰ پر ختم ہو جاتا ہے جس میں ساقی کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اندیشۂ فردا کو شراب کی مقدار میں تخفیف کا حیلہ نہ بنائے۔ دوسرا مصرعہ غالب کی مخصوص شوخیِ طبع کا مظہر ہے جس کی مثالیں ان کی شاعری میں عام ہیں اور جو ان کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔ شراب کے باب میں وہ کتنے بے اختیار اور کس قدر حریص ہیں یا شراب کس حد تک ان کا جزوِ حیات بن چکی تھی، اس کے اندازے یا تعین کے لیے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

کافی ہے، خواہ اسے غلو ہی کیوں نہ تصور کیا جائے۔ اسی غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

جس کے معنی یہ نہیں کہ وہ اپنے کو واقعی گمراہ یا بے دین متصور کرتے ہیں اور کعبے کو پس پشت چھوڑ کر اپنے کو ایمان سے دور ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ انھوں نے ایمان و کفر کو ظاہری معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے بلکہ ایمان کے معنی ان کے نزدیک وہ عقیدہ ہے جس کا تعلق محض ظاہر اور اہل ظاہر سے ہے اور کفر سے مراد وہ مسلک ہے جسے انھوں نے برحق سمجھ کر اختیار کیا ہے نیز اس پر عامل رہنا پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے تو مشاہدۂ حق کی گفتگو میں بادہ و ساغر کا ذکر آ جانا ان کے مشرب میں نا روا نہیں لیکن ماحول نے ان کے سامنے جو سوالیہ نشانات کھڑے کر دیے تھے، ان کی خلش انگیزی برابر کام کرتی رہی اور کبھی وہ

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے　　ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

کہہ کر جمعیتِ خاطر کی صورت پیدا کرتے تو کبھی بے اختیار کہہ اٹھتے :

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

مگر اس سوال کا جواب (آسان ہونے کے باوجود) اتنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ وہ غالبؔ جس نے کتنے نازک مواقع کا سامنا طنز کے محض ایک وار سے کیا، اس کا جواب مدتوں دیتے رہے بلکہ عمر کا اچھا حصہ اس کی نذر کر دیا، اگرچہ مثالی خود اعتمادی کے باوجود وہ اپنے کو کما حقہٗ کبھی مطمئن نہ کر سکے۔ یہ سوال تھا ہی ایسا کیوں کہ اس کی تہوں میں گرد و پیش سے اٹھنے والی نگاہیں اور بلند ہونے والی آوازیں اپنی تمام تر زہرناکیوں کے ساتھ گھلی ہوئی تھیں۔

بات صرف یہیں تک نہیں کہ "غالب کا ہے انداز بیان اور" بلکہ انھوں نے شاعری سے زیادہ کردار کو اس کا جواب بنانے کی سعی کی نیز اپنی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کی انفرادیت کو بیش از بیش نمایاں کرتے رہے۔

ظ۔ انصاری نے غالب شناسی میں ایک اور مقام پر یہ رائے دی ہے :

"اپنے کلام کی ترتیب میں بھی وہ (غالب) آزادانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ قطعہ، مثنوی اور قصیدے کو وہ اول مقام دیتا ہے کیونکہ یہ ایسی اصناف سخن ہیں جن میں ایک مربوط، مسلسل خیال منطقی انداز سے ترتیب دے کر فنی حسن سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ غزل کو غالب نے سب سے آخر میں جگہ دی ہے۔"

غالبؔ کا یہی رویہ دوسرے امور میں بھی تھا۔ چناں چہ ظ۔ انصاری آگے لکھتے ہیں :

" اس نے منقولات پر معقولات کو ترجیح دی۔ دوستوں اور شاگردوں کو ہدایت کی کہ وہ منطق اور فلسفہ حاصل کرنے پر محنت کریں، دینیات پر نہیں۔ اس نے بعض قدر داں حلقوں کو زبان و ادب کے معاملے میں آزادانہ رویہ اختیار کرنے کی وجہ سے ناراض کیا اور جن ہندستانی اہل لغت یا شعرا کو ہندستان میں فارسی کے لیے مسلم الثبوت سمجھا جاتا تھا، ان پر آزادانہ نکتہ چینی کر کے بہت بڑے حلقے کی مخالفت مول لی۔"

اس نے اپنے اعمال و نظریات پر خوشنما پردے نہیں ڈالے۔ شراب پی تو کھل کر، مذہبی شدت پسندی کی مخالفت کی تو کھل کر، علم و فن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تو کھل کر۔ جن نوابوں اور راجاؤں سے قدر دانی کی امیدیں تھیں، ان کی تعریف میں قصیدے تو لکھے مگر روش عام سے ہٹ کر اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کیا اور اس بات کا خیال رکھا کہ دولت کی بارگاہ میں علم کا سر اونچا رہے۔ ان تذکروں میں بھی اپنے تذکرے کی گنجائش اور اپنی فنی برتری کا اعلان کیا۔"

غالبؔ کے مکتوبات میں موقع بہ موقع ان باتوں کا ذکر آتا رہا ہے اور ان کے نظریات پر بھی روشنی پڑتی رہی ہے۔ میر مہدی مجروحؔ کو لکھی ہوئی یہ سطور کتنی بے باکانہ و آزادانہ ہیں، دیکھیے :

"میاں کس قصے میں پھنستا ہے، فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب، نجوم، ہیئت، منطق و فلسفہ پڑھ جو آدمی بنا چاہے۔"

شعرا کا عام دستور تھا (اور اب بھی ہے مگر اتنا نہیں) کہ وہ زیادہ سے زیادہ کہتے تھے نیز کئی کئی دیوان مرتب کر ڈالتے تھے اور اس پرگوئی کو دیرینہ مشق اور قدرت کلام کا ثبوت بنا کر وجہ افتخار متصور کیا جاتا تھا، خواہ ان دیوانوں کا بڑا حصہ ناقابل توجہ ہی کیوں نہ ہو لیکن غالب نے اپنے احباب و تلامذہ کو واضح مشورے دیے کہ وہ دفتر کے دفتر سیاہ کرنے کے بجائے کم کہیں مگر جو کچھ کہیں اس میں وزن و وقار ہو۔ اس کی پشت پر بھی ان کی مخصوص مزاجی کیفیت کارفرما تھی۔ چناں چہ وہ مذہب کو (جس کے خط و خال عمل کی دنیا میں

(بقیہ ص ۱۲۱ پر)

کلامِ غالب کا ایک ہم عصر شارح درگا پرشاد نادرؔ دہلوی

نثار احمد فاروقی

شعرائے اردو میں بشمول علامہ اقبال، کسی شاعر کے کلام کی اتنی شرحیں نہیں لکھی گئیں جتنی غالب کے اردو دیوان کی لکھی گئی ہیں۔ اُن کے عہد سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ کلامِ غالب کے سب سے پہلے شارح تو خود مرزا غالب ہی ہیں، جنھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو وقتاً فوقتاً اپنے اشعار کے معانی اور مطالب خود لکھ کر بھیجے ہیں اور یہ اُن کے خطوط میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشیؔ نے دیوان غالب نسخۂ عرشی کے حواشی میں ایسی تقریباً کل عبارتیں فراہم کر دی ہیں جو غالبؔ نے اپنے ہی شعروں کی تفسیر یا دلیل کے سلسلے میں لکھی تھیں۔

غالبؔ کے ہم عصروں میں اُن کے کلام کی شرح جزوی طور پر مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء — ۱۹۱۴ء) نے بھی لکھی ہے۔ یعنی یادگارِ غالب میں جہاں انھوں نے کلامِ غالب کی لفظی و معنوی خوبیوں اور خصوصیتوں سے بحث کی ہے، مثال میں اُن کے اشعار پیش کیے ہیں، اور ان اشعار کی ندرت یا معنوی نزاکت کو بہت دل نشین پیرائے میں سمجھایا ہے۔ بعض اشعار کا وہ مفہوم جو آج سمجھا جاتا ہے سب سے پہلے مولانا حالیؔ ہی نے بیان کیا تھا۔ مثلاً :

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق

ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

حالیؔ نے اس کے بیان کی خوبی اور ندرت کی طرف اشارہ کر دیا ہے تو اب خواہ ہر شخص اِسے سمجھتا ہو اور سامنے کی بات کہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر حالیؔ اس شعر کی وضاحت نہ کرتے تو شاید ہی کسی کا ذہن اُدھر منتقل ہوتا، یعنی دوسرے مصرعے میں لفظ ''مکرّر'' شعر کے معنوں کی کلید ہے، کہ پہلا مصرع ایک بار بطور صلائے عام پڑھا جائے اور اسی کو دوبارہ اعتراف کے طور پر پڑھیں کہ فی الواقع کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کی اور بھی مثالیں ہیں جنھیں مولانا حالیؔ نے اس طرح پیش کیا ہے کہ غالب کے فن کی عظمت کا گہرا نقش دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ مولانا حالیؔ کے بیان کردہ مطالب کو پڑھ کر ہی عام طور پر یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ غالبؔ کا کلام شرح و تفسیر کا محتاج ہے اور پھر مختلف شارحین نے بقدرِ حوصلہ اس کی معنوی تہوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔

غالب کے دوسرے ہم عصر شارح خواجہ قمر الدین راقمؔ (۱۸۳۲ء - ۱۹۱۰ء) ہیں۔ انھوں نے بھی دیوان غالب کی ایک شرح لکھی تھی، لیکن یہ اب دستیاب نہیں ہوتی۔[1] تیسری معاصر شخصیت درگا پرشاد نادرؔ دہلوی کی ہے[2] جسے اس مضمون میں پہلی بار شارحِ کلامِ غالب کی حیثیت میں روشناس کرایا جا رہا ہے۔ غالب کی وفات کے بعد دیوان غالب کی شرحیں مختلف مدارج کی لکھی گئیں۔ کچھ علمی انداز کی، کچھ درس و تدریس کے مقصد کو پورا کرنے والی اور بعض محض چربہ اور نری نقالی۔ پھر ان کی دو حیثیتیں ہیں بعض شارحین کا مقصد وہی کلام غالب کی شرح لکھنا تھا انھوں نے دیوان غالب کے

---

[1] راقم کے حالات کے لیے رجوع کریں: احوال غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد ص ۲۹۰ - ۲۹۴

[2] نادر دہلوی کے حالات کے لیے: دھلی کالج میگزین (دلی نمبر) ۱۹۵۹ء ص ۳۷۷ - ۳۸۲

آغاز سے اختتام تک ہر شعر کا مطلب بیان کیا اور وضاحت کی خواہ وہ شعر صاف اور سہل ہی کیوں نہ ہو۔ بعض نے ضمناً اور جزوی شرح لکھی اور اُن کا مقصد یا تو محض مشکل اشعار کا مطلب بیان کرنا تھا یا غالب کے فکر و فن کا جائزہ پیش کرنا تھا۔ اس ضمن میں جن شارحین کے نام لیے جاسکتے ہیں وہ یہ ہیں :

احمد حسین شوکت میرٹھی، علی حیدر نظم طباطبائی، مولانا حسرت موہانی، بیخود موہانی، بیخود دہلوی، عبدالباری آسی، جوش ملسیانی، آغا محمد باقر، نیاز فتح پوری، خلیفہ عبدالحکیم، مولانا سہا مجددی، اثر لکھنوی، وغیرہ۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے چناں چہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی تفہیم غالب کے عنوان سے اشعار غالب کی شرح لکھ رہے ہیں جو رسالہ شب خون الہ آباد میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے اور ڈاکٹر گیان چند نے دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ کی شرح لکھی ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

(۲)

کلامِ غالب کی جزوی شرح کرنے والوں میں مرزا غالب کے ہم عصر منشی درگا پرشاد نادر دہلوی بھی ہیں۔ یہ کپل منی کی اولاد گیلش گوت کے کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پردادا منشی ہردے رام بھی شاعر تھے، دادا منشی لکھپت رائے اور والد منشی منسا رام ناتواں بھی شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے۔ اصل وطن سرہند تھا لیکن نادر شاہ کے حملے میں وہاں سے اجڑ کر دہلی میں آباد ہو گئے تھے یہیں ۱۲ جمادی الاول ۱۲۴۹ھ مطابق ۲۱ ستمبر ۱۸۳۳ء کو بدھ کے دن درگا پرشاد پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرکے ۱۸۵۲ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں منشی ذکاء اللہ، مولانا امام بخش صہبائی اور ماسٹر رام چندر دہلوی سے تعلیم حاصل کی اور ۱۸۵۷ء کے واقعات سے قبل ہی ضلع رہتک میں محرر کیاس ہو گئے۔ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۳ء تک ضلع گڑگانواں میں فارسی کے مدرس رہے اور ۱۸۶۴ء میں دہلی کے محلہ تیلی واڑہ کے اسکول میں تبادلہ ہو کر آ گئے۔ فروری ۱۸۷۷ء میں انھوں نے شادی کی اور اسی سال اپریل میں لاہور چلے گئے۔

پنڈت درگا پرشاد نادر دہلی سوسائٹی کے بھی ممبر تھے اور اس کی پیارے لال آشوب ہی کی فرمائش سے انھوں نے شعرائے دکن کا تذکرہ خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم تیار کیا تھا، جو مطبع مفید عام لاہور سے طبع ہوا۔ نادر کی دوسری تصانیف میں تذکرۃ النسائے نادری عرف چمن نادر بھی ہے جس میں ۴۴ شاعرات کا حال اور کلام درج ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۸۴ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا۔ نادر کے بیشتر مسودات ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں غتر بود ہو گئے۔ بعد کو ایک مختصر دیوان نظم مطلب غیب (= ۱۲۹۳ھ) فراہم کرلیا تھا۔

نادر ہی کی ایک تصنیف کا مطبوعہ نسخہ راقم الحروف کے ذخیرے میں ہے جس کے ابتدائی دو صفحات اور سرورق غائب ہے، آخر سے بھی کچھ ورق ضائع ہو گئے ہیں۔ بظاہر اس کتاب کا نام چمن نادر ہے اور اس کی یہ ترتیب ہے :

پہلا چمن : شعر کی خوبی اور شعر فہمی میں شعراء کی فضیلت اور غرض۔
اس میں اقسام شعر کے تحت لکھا ہے :

اوّل قسم : عارفانہ　　دوسری قسم : عاشقانہ
تیسری قسم : نصیحتانہ　　چوتھی قسم : شاعرانہ

ان میں سے ہر قسم کی مثالیں اساتذہ کے کلام سے فراہم کی گئی ہیں اور اُن اشعار کے بین السطور میں یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ یہ کون سی قسم کے شعر ہیں۔ پہلا چمن صفحہ ۴۶ پر تمام ہو جاتا ہے۔ آخر میں تاریخ تالیف خزینۃ العلوم مصنفہ لالہ درگا پرشاد نادر دہلوی میر مقصود علی رافع کی ہے :

لکھا نادر یہ تذکرہ نادر　　اب یہ حاسد کو چاہیے غم سے
قلب رنجور رافعا زخمی　　دگنا اور تگنا چوگنا کرلے
۱۲۹۶ھ

حاشیے پر بتایا ہے کہ قلب بمعنی دل، لفظ رنجور کا دل یا قلب ج ہے اس کو ترتیب وار اس نے ۳ کے ہندسے کو دگنا کیا تو ۶ ہوئے اور تگنا کیا تو ۹ نے اور تین کو چوگنا کیا تو ۱۲ ہوئے یہ صنعت ریاضی جمع و ضربیہ سے

دوسری تاریخ کا عنوان یہ ہے :

"تاریخ کتاب ہذا بطور اختصار قطعہ مندرجہ کتاب ہذا صفحہ ۲۵۱
حلم مولف شاگرد مصنف موصوف"

اس قطعہ تاریخ میں ۵ شعر ہیں جن میں آخری دو یہ ہیں :

شوق تھا یہ شاعری میں کون سی سیکھوں کتاب
جس سے آجائیں مجھے اس علم کے طرز و رسوم
عیسوی مصرع میں ہجری کہہ صلاح ہاتف نے دی
علم جو چند جی لگاکر پڑھ خزینۃ العلوم (۱۲۹۶ھ)

اس کی تشریح حاشیے پر یوں کی گئی ہے: "ہاتف نے جو صلاح دی کہ عیسوی مصرع میں ہجری کہہ اس سے ثابت ہے کہ کل مصرع عیسوی سنہ کا ہے جس کے حرفوں سے ۱۸۷۹ء نکلے۔ اس مصرع کے اندر ہجری سنہ اس طرح کہیے کہ خزینۃ العلوم پر جس کے حرفوں سے ۱۲۴۴ھ نکلتے ہیں جو چند جی لگایا۔ جی کے ۱۳ ہیں اس کا چو چند ۵۲ ہوئے، ۵۲ کو ۱۲۴۴ھ پر لگانے سے ۱۲۹۶ھ ہوگئے۔ اس کو صنعت حسابیہ کہتے ہیں۔"

اس کے بعد "پہلے چمن کا حل" پیش کیا ہے اور گزشتہ ابواب میں جو اشعار مثالوں میں آئے ہیں ان کے معانی و مطالب بیان ہوئے ہیں۔ یہ ۶۴ صفحوں کو محیط ہیں۔

دوسرا چمن: اشعار محاورات میں ہے۔ یہ ۲۷ صفحوں پر مشتمل ہے اور ساتھ ہی اس کے اشعار کا حل ۵۰ صفحوں میں ہے۔

تیسرا چمن: ضرب الامثال میں ہے اس کے تحت ضرب الامثال اور ان کی تشریح کی گئی ہے۔ ہمارے نسخے میں یہ صرف س تک ہے۔ اس حصے میں اشعار نہیں ہیں۔

(۲)

اس کتاب کے پہلے اور دوسرے چمن میں غالب کے جو اشعار پیش ہوئے ہیں اور ان کا مطلب بیان کیا گیا ہے وہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ یہاں حاشیوں پر وہ عبارت دی گئی ہے جو ان اشعار کے حواشی میں درج ہے اور اشعار کے نیچے وہ مطلب لکھا گیا ہے جو شرح ابیات کے تحت علیحدہ حصے میں بیان ہوا ہے:

اسد اللہ خاں غالب دہلوی

ان کے اشعار اس وجہ سے ادق ہوتے ہیں کہ بہت سے قابل ذکر الفاظ کو محذوف کرتے ہیں۔ بعیدہ قرینہ و اشارہ و ایما پر مدار رکھتے ہیں:

۱- نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا[1]

پہلے زمانے میں دستور تھا کہ جس کو عدالت ماتحت کا اپیل کرنا ہوتا تھا وہ عدالت ماتحت کی نقل حکم اپنے جامے پر ٹانک کر عدالت عالیہ کے سامنے جا کھڑا ہوتا تھا۔ یہ فریادی کی نشانی تھی۔ اس کو لباس فریاد کہتے ہیں۔ غالب نے وہی رواج اب ذکر کیا ہے۔ تصویر جو کاغذ پر کھنچی ہوتی ہے تو یہ کاغذ گویا اس کا لباس فریاد ہے اور فریاد اس امر کی ہے کہ مصور نے مجھے لوٹ لیا کہ میری گویائی، بینائی، رفتار اور تمام قدرتی اسباب چھین کر بے زبان اور بے حرکت بنا کر، اصلی صورت بگاڑ کر اس کاغذ میں قید کر دیا۔ اس میں معرفت و تعریف خدا یہ ہے کہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا کمال اور صنعت صانع حقیقی کے مقابلے میں کمال عیب اور نقص ہے حالانکہ اپنی دانست اور ظاہری خیال سے مصور تصویر کو اصلی صورت سے عمدہ نقش کرتا ہے، مگر قدرتی اسباب مثلاً گویائی، بینائی، رفتار، حرکت نہ ہونے سے اصلی صورت بالکل بگڑ گئی۔ مصور کو جو گمان تھا کہ تصویر میری تعریف کرے گی اس لیے درحقیقت تصویر اس کی فریاد کرتی ہے کہ گستاخی کی۔

۲- عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا (دیوان/۸۰)

یہ طب کا مسئلہ ہے کہ جب رگوں میں ہوا بھر جاتی ہے تو خون میں بلبلے ہو جاتے ہیں۔ اس کو ریح کی بیماری کہتے ہیں۔ قطرے کو یہ درد ریح ہو کر یعنی ہوا بھر کر بلبلہ بن گیا۔ بلبلے کی ہوا جب تک بلبلے کی حد میں رہے تب تک یہ ہوا کا درد درمیان ہے اور جب یہ ہوا حد سے بڑھی یعنی پھیل کر باہر کو سر نکالا پس اسی دم درمیان سے نکلی اور درد کو آرام ہوا اس لیے درد ہی کا حد سے نکل جانا قدرتی دوا ہے۔ ہوا نکلنا یعنی مر جانا ہے۔ بلبلے کے واسطے فنا ہونا عشرت ہے کہ دریا میں مل کر دریا بن گیا۔ بقول ذوق:
کیونکر حباب ہو سکے دریائے بیکراں دریا سے جب تلک نہ ملے ٹوٹ پھوٹ کے
مراد یہ ہے کہ عارف فنا ہو کر خدا کی ذات میں مل کر خدا ہو جاتا ہے۔ فنا ہونے کی تکلیف کا انجام اس کے لیے راحت ہے اس کی تاکید میں انھیں کا یہ شعر ہے۔

---

[1] دیوان غالب /۱۱۴ (مرتبہ مالک رام) آئندہ تمام اشعار میں اسی دیوان کے حوالے دیے گئے ہیں۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے (دیوان/۱۹۵)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
۳۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا (دیوان/۶۷)

اول بھی خدا ہے، آخر بھی خدا ہے، جسم انسان کی ہستی بیچ میں حائل ہو گئی، اگر یہ وجود انسانی نہ ہوتا تو میں خدا ہوتا۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
۴۔ جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا (دیوان/۵۸)

ذوق کے پہلے شعر[1] اور اس شعر کا ایک مضمون ہے۔ پہلے اس کی شرح دیکھو پھر اس کو۔ اپنا جلوہ انسان کو دکھانے کے واسطے پہلے اس میں آپ بینائی بنا، اگر وہ آپ ہی بینائی نہ بنتا تو پھر دیکھنے کی کس کو تاب تھی پس وہ بینائی بن کر ہر ایک میں ہے جیسا کہ قرآن شریف میں فرمایا کہ فَنَحْنُ فِي أَنْفُسِكُمْ یعنی ہم تمھارے نفسوں میں ہیں۔ دوسری آیت یہ ہے کہ نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيد۔ یعنی ہم تمھاری شاہ رگ سے بھی نزدیک ہیں۔ اس میں دوئی کی بو نہیں، یعنی وہ اپنے سوا کسی دوسرے کی نظر نہیں پڑتا، انسان کو جو دکھائی دیتا ہے اس وقت دیتا ہے جب کہ اس کی انسانی ہستی کو مٹا کر آپ بن جاتا ہے۔ جب دیکھنے دکھانے والا آپ ہی آپ ہے تو دوئی کا کیا ذکر ہے۔ اگر وہ دوئی پسند ہوتا تو ضرور کبھی نہ کبھی کسی کو اس کی اصلی حالت انسانی میں ملتا چوں کہ وہ انسان کو اس کی ہستی مٹا کر آپ بنے بدوں کبھی دکھائی نہیں دیا اس وجہ سے وہ سب میں یگانہ ہے دوئی کی اس میں بو نہیں۔ مولف نے دردیشی نور سے مختصر طور پر اس عقدے کو کھولا ہے ورنہ یہ تصوف کا ایسا باریک مسئلہ ہے کہ خود غالب اس کے بیان پر آگے کے شعر میں فخر کرتا ہے:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا (دیوان/۵۸)

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
۵۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا (دیوان/۵۰)

حجاب یہاں دو معنی دیتا ہے۔ ایک چھپانے کا پردہ، دوسرے ساز کا پردہ۔ نوا بمعنی گانے کی آواز۔ یہ شعر ذوق کے دوسرے شعر کے مضمون سے موافق ہے[2]۔ ذوق نے برگ سے ہر شے مراد لی ہے۔ انھوں نے پردے سے حجاب یا پردہ ستار و طنبورا و سارنگی وغیرہ کے تاروں کو کہتے ہیں جو آواز ہی ہوتے ہیں۔ جب یہ بجتی ہے تو تمام اندرونی حالات آواز دل در شرح کو ظاہر کر دیتی ہے۔ اسی طرح جتنے بھید خدا تعالےٰ نے مخلوقات کے پردے میں چھپائے ہیں وہ پردے ہیں ظاہرا خود بخود زبانِ حال سے اپنے اندرونی حالات بآواز بتا رہے ہیں۔ دیکھو ذوق کے دوسرے شعر کی شرح۔

---

[1] ذوق: آپ آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف — ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا
اس لیے ہر آئینہ میں تیرا ہی عکس ہے یعنی تو ہی ہے۔ جب ہر شے میں تو ہے اس قوت کے باعث کہ تو اپنی تجلی سہارنے کے واسطے اس میں موجود ہے آئینۂ ہستی تیری تاب نہ لاسکا اگر اس میں تو نہ ہوتا تو آئینۂ ہستی کی کیا ہستی تھی جو تیری تجلی کی تاب لاسکتا۔ ذرا سی تجلی کوہ طور پر پڑی تھی وہ جل کر خاک ہو گیا تھا، خلاصہ مطلب یہ ہے کہ عارف جو تجھے دیکھ لیتا ہے پہلے اس میں تو سمایا ہوا ہے اس وجہ سے عارف تجھے نہیں دیکھ سکتا بلکہ تو ہی اس کے نام سے اپنی ذات آپ دیکھ رہا ہے جیسا کہ ناسخ فرماتے ہیں: آئینہ یہ دوراں ہے اس میں عکس جاناں ہے — آپ اپنا حیراں ہے آپ ہی اپنا ثانی ہے

[2] ذوق: گوش شنوا نہیں ہے باغ جہاں میں غافل — ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا
اے غافل تجھ کو معرفت کے کان نہیں ورنہ ہر ایک پتّا اس کی تعریف گاتا ہے۔ پتّے سے مراد ہر شے۔ آدمیوں کی عبادت تو ظاہر ہے، پہاڑوں کا اس کے عشق میں یہ حال ہے، رونے سے دریا جاری ہیں دل میں آگ بھری ہوئی ہے، درخت اس کی نماز میں کھڑے ہیں، پتوں سے جو آواز آتی ہے وہ ذکر و تسبیح کرتے ہیں۔ چوپائے رکوع میں ہیں، زمین کے کیڑے سجدے میں ہیں (پرندے) اس کی یاد گاتے ہیں چناں چہ قمری کہتی ہے حق سرہ، فاختہ کہتی ہے حق ہو، تیتر کہتا ہے سبحان تیری قدرت چڑیاں بے چوں بے چوں کرتی ہیں بقول نظیر —
شام سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بے چوں چوں کرتی ہیں

دوسرے یہ ہے جیسے کہ ساز کے مثلاً سارنگی کے بہت سے پردے ہوتے ہیں ناواقف کو ان میں اکثر فضول نظر آتے ہیں مگر ساز والے کے نزدیک اگر ایک تار بھی کم ہو جائے تو سلسلے میں فرق آجائے۔ دیکھو حیوانات کا سلسلہ ہاتھی سے لے کر اس کیڑے تک جو پتھروں میں ہیں اور بذریعہ خوردبین کے نظر آتے ہیں اور نباتات کا سلسلہ کلاں درخت مثلاً بڑھ کے درخت سے لے کر اس کائی تک ہے جو پتھر میں سے نکل کر پتھر پر جم جاتی ہے جس کے سبب پاؤں رپٹتا ہے، یا چونے والے فرش پر اور دیواروں پر ہوتی ہے جس سے سیاہی آجاتی ہے۔ اسی طرح اجرام فلکیہ کا جس کو نظام شمسی کہتے ہیں اگر ایک ستارا کم ہو جائے تو کشش اور گردش کا انتظام بگڑ کر سب ایک جگہ غٹ پٹ ہو جاویں، وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ سب کے سب زبان حال سے اس کی تعریف گاتے ہیں کہ ہم کو اس نے کمال صنعت اور حکمت سے اس فائدے کے واسطے پیدا کیا ہے۔ بقول نظامی ؎

دریں پردہ یک رشتہ بے کار نیست
سر رشتہ بر ما پدیدار نیست

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا
۶۔ یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا (دیوان ۶۸)

جادہ بمعنی رستہ۔ لالہ کا داغ سیاہ ہوتا ہے جس کو اندھیرا جانا گیا ہے، اس اندھیرے کی روشنی کے واسطے جو اس میں پتیاں وہ گویا روشن شمعیں ہیں۔ اسی طرح باغ گل لالہ کے مشابہ ہے۔ باغ میں تمام زمین سرسبز ہوتی ہے صرف روشیں یعنی راستے سبزی سے محروم ہیں، مگر باغ میں جتنے راستے ہیں وہ باغ میں ایسے خوشنما اور روشن ہیں جیسے کہ لالہ کے اندر فتیلے۔ اس وجہ سے باغ میں زمین کا ایک ذرہ بھی بیکار نہیں۔ مراد یہ کہ جہاں کا ایک ذرہ بھی بیکار نہیں، جیسا کہ اوپر کے شعر میں گزرا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (دیوان ۱۳۶)

بموجب قول فلاسفہ کے کلّ شیءٍ یرجع الیٰ اصلہ۔ اس لیے تمام چیزوں کی مٹی بن جاتی ہے اور پھر وہ مٹی پہلی صورت پر آنے کی کشش کرتی ہے — چوں کہ حسینوں کو لالہ و گل سے تشبیہ ہے، پس حسینوں کی مٹی نے کشش کر کے گل اور لالہ کے روپ میں ظہور پکڑا، یعنی جو خوب صورت چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں وہ خوب صورتوں کی خاک وجود میں آتی ہے جیسا کہ ناسخ فرماتے ہیں:

باغ میں گلبن ہیں گلدستے مزاروں کے تمام
خاک میں کیا کیا ہی گل رخسار پنہاں ہو گئے

یعنی باغ میں جتنے پھولوں کے بوٹے ہیں سب خوب صورت مُردوں کی مٹی سے اٹھ کر قبروں کے گلدستے بن گئے ہیں۔

شوق[1] ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
۸۔ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا (دیوان ۲۱۲)

پردۂ تصویر یا مرقع وہ چادر ہوتی ہے جس میں بہت سی تصویریں ہوتی ہیں۔ ان میں لیلےٰ مجنوں کی بھی تصویر ہوتی ہے۔ سب تصویروں کو قسم قسم کے رنگوں سے لباس اور زیور سے سجایا ہوا ہوتا ہے لیکن مجنوں کی تصویر سوکھی، کبڑی پھنسلیاں (کذا) نکلی ہوئیں، لاغر اور ناتواں اور ننگی ہوتی ہے، اس واسطے لکھا ہے کہ ہر رنگ کا شوق سر و سامان کا دشمن نکلا۔ مجنوں کو جو تصویر کے رنگ میں لیلےٰ کے دیکھنے کا شوق ہوا تو جیسا کہ زندگی میں دیوانگی سے کپڑے پھاڑ کر ننگا رہتا تھا تصویر میں بھی شوق نے ننگا ہی رکھا۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
۹۔ اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا (دیوان ۵۷)

جب تک انسان زندہ یا اپنی ہستی اور ہوش و حواس میں ہے تب تک وصال یار ہونا یعنی خدا کی ذات میں ملنا ناممکن ہے اگر قیامت تک اس انتظاری میں جیتے رہیں تو انتظاری کا عذاب ہی سہی مگر ذات میں ملنا مرنے یا فنا ہونے بدون ممکن نہیں، بقول مست ؎

خود فنا ہو کے ذات میں ملنا یہ تماشا حباب میں دیکھا

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
۱۰۔ نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا (دیوان ۵۸)

قاعدہ ہے کہ جیتے جی آدمی کی قدر اور شہرت نہیں ہوتی، مرنے کے بعد جو جنازہ اٹھا تو کوچہ و بازار میں انگلیاں اٹھتی چلی گئیں کہ یہ فلاں عاشق

---

[1] ہر رنگ میں یار کے دیکھنے کا شوق۔ رقیب بمعنی دشمن۔

کا جنازہ جا رہا ہے اور تمام جگہ شہرہ پھیل گیا کہ فلاں عاشق مر گیا اور پھر قبر نے مشہور کیا کہ یہ فلاں عاشق کی قبر ہے۔ اگر دریا میں غرق ہو جاتا تو نہ جنازہ اٹھانے کی ضرورت پڑتی اور نہ کہیں قبر بنتی۔ سب طرح کی رسوائیوں سے بچ جاتے۔ مطلب یہ کہ عاشقانِ خدا مر کر زیادہ شہرت پاتے ہیں اور ہمیشہ تک مشہور اور زندۂ جاوید رہتے ہیں جیسا کہ ذوق کے پانچویں شعر میں ہے۔[له]

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
۱۱۔ میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا (دیوان/۷۳)

میں نے ابھی کچھ بھی گناہ نہ کیے تھے کہ گناہ ختم ہو چکے۔ گناہ کرنے کے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ مذاق یہ کہ شریعت والے گناہوں کو بہت برا بتاتے ہیں۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے بلکہ خدا کا دریائے مغفرت بہت بڑا ہے اور عاشق لوگ بہت گناہوں کو اس واسطے دوست رکھتے ہیں کہ ایک تو گناہ گار کو خدا سامنے بلا کر پوچھے گا تو اس بہانے سے خدا کا جمال دیکھیں گے دوسرے بخشش کے قابل بھی گناہ گار ہی ہے:

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو
کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
۱۲۔ لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر (دیوان/۹۲)

شراب سے حسن زیادہ آب و تاب پر ہو جاتا ہے جو عاشق کو زیادہ قتل کرتا ہے۔ چوں کہ یہ تیز تلوار صراحی میں سے نکلی اس لیے عاشقوں کا خون صراحی کی گردن پر پڑا، یعنی وہی معاون قتل ہوئی، اس خوف سے صراحی سے آتی ہوئی شراب کی موج تھرتھراتی ہے کہ جس طرح رنگ کی مشابہت میں صراحی پکڑی گئی کبھی ایسا نہ ہو کہ حسن کی رفتار کی مشابہت سے میں پکڑی جاؤں کیوں کہ جس طرح اس کا رنگ قتل کرتا ہے اسی طرح اس کی رفتار کرتی ہے حسن کی رفتار کو موجِ شراب سے تشبیہ ہے۔ خدا کا ہر رنگ اور ہر چال دیکھ کر عشق ولولے مارتا ہے۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
۱۳۔ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں (دیوان/۱۳۹)

اگر دوست کا ملنا مشکل کے ساتھ ہو تو آسان بات ہے کیوں کہ ہے تو سہی۔ مشکل تو وہ بات ہے کہ مشکلوں سے بھی ملنا نصیب نہ ہو یعنی ناممکن ہو۔ طالبوں کے واسطے شئے کی طلب میں ہر ایک مشکل بہت آسان ہے۔ وہ تو مشکل اس بات کو جانتے ہیں کہ مشکلیں جھیل کے بھی مطلوب نہ ملے یعنی ملنا ناممکن ہے۔

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں
۱۴۔ بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے (دیوان/۲۲۱)

جب آئینہ سامنے ہوتا ہے تو اپنا آپ نظر آتا ہے تو وہ آئینہ دیکھنے والا خود بیں ہوتا ہے یعنی اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ چونکہ آئینے جیسی پیشانی والا بت یعنی خدا عاشقوں کے سامنے ہے اور اس میں وہ اپنے آپ کو دیکھ کر مست ہیں اس مستی کو شریعت یا ظاہر والے خود بینی تصور کرتے ہیں۔

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
۱۵۔ فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے (نسخۂ اکرام/۱۶۴)

سایہ سیاہ ہوتا ہے اور ہندوستان بھی سیاہی سے منسوب ہے اس مذاق سے ہندوستان آیا۔ چونکہ یار کا قرب طالبوں کو بادشاہت ہے اس وجہ سے دیوار کے سائے کو بادشاہت ٹھہرایا۔

بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار
۱۶۔ کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے (دیوان/۲۱۲)

کان میں روئی ڈالنے سے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ گل کے کان میں یعنی گل پر شبنم پڑ کر حسن کو زیادہ کر دیتی ہے اس غرور میں وہ بلبل کی فریاد نہیں سنتے۔ یعنی حسن اپنے غرور سے عشق کی آہ و زاری پر ترس نہیں کھاتا۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
۱۷۔ بے نیازی تری عادت ہی سہی

عشق حسن سے تنگ آ کر اس کے جور و جفا سہنے کی عادت کر لیتا ہے جب اس کو برداشت پر قائم اور مضبوط پاتا ہے تو ناچار ملنا ہی سوجھتا ہے۔ مضبوط شوق جتانے کو کہا جاتا ہے۔

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
۱۸۔ تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر (دیوان/۹۷)

اس میں یہ مثال ہے آئینے کی حیرت کی صفائی اس کے تغیر کا سامان ہے جیسا کہ کھڑے پانی کا رنگ بدل جاتا ہے۔

له　جس کی نظر پڑھ جاتی ترا رخسار آتشیں　ان کا چراغ گور نہ تا حشر گل ہوا

الفت گل سے غلط ہے دعویٰ وارستگی

۱۹۔ سرو ہے با وصف آزادی گرفتار چمن

الفت میں پھنس کے آزادی کا دعویٰ غلط ہے جیسا کہ سرو باوجود اپنی آزاد کی صفت کے چمن کی الفت میں قید ہوا کھڑا ہے۔ اس کو تمثیل کہتے ہیں۔

دردمنت کش دوا نہ ہوا

۲۰۔ میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا (دیوان/۶۴)

اگر دوا کھا کر اچھا ہوتا تو دوا کا احسان ہوتا۔ اب جو دوا نہ کھائی اور اچھا نہ ہوا تو یہ بات یعنی میرا بیمار رہنا کچھ برا نہ ہوا بلکہ اچھا ہوا کہ دوا کے احسان کے بوجھوں نہ مرا۔

تھی وطن میں شان کیا غالب جو ہو غربت میں قدر

۲۱۔ بے تکلف ہوں وہ مشت خس جو گلشن میں نہیں (کہ گلخن میں دیوان/۱۱۶)

باغ میں باغباں کا دستور ہے کہ پودوں کی پاس کی گھانس کو نکال دیتا ہے تاکہ پودوں کو نقصان نہ پہنچے اور باغ سے باہر پھینک دیتا ہے۔ پس جب گھانس وطن یعنی باغ میں تھی جب ہی ایسی بے قدر تھی کہ اس کو نکمی ہونے کے باعث باغ سے نکال کر پھینک دیا تھا۔ اب باغ سے باہر بے اصل سوکھی گھانس کی تو کیا قدر و قیمت ہوتی تھی۔ اسی طرح جب انسان کی قدر وطن میں نہ ہو تو پردیس میں بھی نہیں ہوتی۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا

۲۲۔ رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو (دیوان/۱۴۹)

مالدار کو سفر میں مال کے اندیشے سے نیند نہیں آتی اور جب اتفاقاً راہ میں راہزن لوٹ لیتے ہیں تو مال کی حفاظت کا اندیشہ جاتا رہتا ہے اور بے فکر ہو کر سوتا ہے تو ظریفانہ رہزنوں کو دعا دیتا ہے کہ مال لوٹ کر دل کو اندیشے کی قید سے رہا کیا اور نیند بھر سلایا۔ مطلب یہ کہ زردار کو نیند اور چین نہیں، بے زری میں چین اور آرام ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

۲۳۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا (دیوان/۴۵)

آدمی ایک تو ظاہر ہے دوسرے معنی خدمت گار۔ مراد دوم سے ہے۔[1]

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا

۲۴۔ ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے لاچار ہے (نا چا دیوان/۱۶۹)

جب آگ کو پانی میں ڈالتے ہیں تو بجھتے وقت سوں سوں کی آواز یعنی رونے کی نکلتی ہے۔ یعنی آگ جو اپنے سوز اور دھوئیں سے جہاں کو رلاتی ہے آفت مصیبت پڑنے کے وقت وہ بھی رو پڑتی ہے۔ اسی طرح دشمن سے مغلوب ہو کر ناچاری میں ہر ایک گریہ وزاری کرتا ہے۔

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوس زر

۲۵۔ کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے

مال کا لالچ توقیر کو کھو دیتا ہے، جس طرح کہ باغ میں گل معشوق بنا ہوا تھا جب زر کا لالچ ہوا تو بکنے کے لیے بازار میں آیا۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے

۲۶۔ ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی (دیوان/۱۶۲)

پرنیاں ریشمی باریک کپڑا ہے جو آگ کی ذرا سی آنچ سے جل جاتا ہے۔ تو اس صورت میں شعلے کا پرنیاں میں چھپا رہنا بہت مشکل ہے، لیکن اس سے زیادہ محال دل میں غم کی آگ کا چھپانا ہے یعنی جس طرح ریشمی کپڑے میں نہیں چھپتا اسی طرح دل میں غم نہیں چھپتا اور پھونک ڈالتا ہے۔

رفتار عمر قطع رہ اضطراب ہے

۲۷۔ اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے (دیوان/۱۷۴)

عمر کی چال بے قراری کے راستے کو کاٹتی ہے، یعنی بے قراری کو طے کرتی ہے، یہ عمر کا جھٹ پٹ گزر جانا بجلی کے کوندہ جانے سے آسانی سے ایسا سمجھ میں آجاتا ہے جیسا کہ جنتری میں سال بھر کا حساب آفتاب کی رفتار سے۔ مطلب یہ کہ جس طرح بجلی بھڑک کر کوند کے ذرا سی دیر میں غائب ہو جاتی ہے

[1] شرح: آقا لوگ آدمی پیش خدمت یا گھر کے نوکر کو کہتے ہیں۔ وہ تمام گھر کے مشکل کاروبار کہ آقا سے نہ ہوسکیں آسانی سے کر لیتا ہے مگر آقا والے کاروبار انسانیت یعنی علوم و فنون اور صنعت کمالات خدمت گار سے ہونے بہت ہی دشوار ہیں جب ان سے لڑکپن میں نہ ہو سکے جوان ہو کر خدمت گاری کی ذلت میں پڑے۔ مطلب یہ کہ ہر ایک انسان خاص ایک ایک کام کے واسطے پیدا کیا گیا ہے۔ اس سے اپنا کام آسانی سے ہو سکتا ہے اور دوسرے کا کام اس کو دشوار ہے جیسے کہ سرمایہ خود میں ہے۔ کلٌ میسّر لما خلق لہ۔ یعنی جو شخص جس کام کے واسطے پیدا کیا گیا ہے وہی اس کے واسطے آسان ہے۔

اسی طرح تھوڑی سی دیر میں عمر تمام ہو جاتی رہتی ہے۔

۲۸- نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے (دیوان/۱۷۷)

دنیا نقد ہے سو فانی ہے، اور آخرت اُدھار ہے، حقیقت میں دونوں بے اعتبار ہیں، جو عارف لوگ ہیں وہ دونوں کو کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ خدا کو حاصل کرتے ہیں اور خدا اپنے آپ کو حاصل کرنے سے حاصل ہوتا ہے یعنی جس نے اپنے نفس کو کما لیا اس نے خدا کو پا لیا، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا پس اس لیے میری عالی ہمت نے دونوں عالم کو بے حقیقت سمجھا اور مجھ سے مجھ کو خرید لیا کیوں کہ مجھ میں یعنی انسان میں ذات الٰہی ہے۔

۲۹- ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے (دیوان/۱۸۷)

ہمارا ہونا ہی اس امر کی کافی دلیل ہے کہ فنا ہونے والی شے ہے یعنی ہونے ہی سے ہم فنا ہوئے جس طرح انسان اپنی قسم کھا کے آپ مر جاتا ہے، گویا آپ ہی نے اپنے آپ کو فنا کیا۔

۳۰- سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے (دیوان/۱۶۶)

اس قدر پریشانی ہے کہ زندگی کی امید نہیں، جب امید نہ رہی تو دل کو بے قراری ہوئی۔ اب دل کے قرار کے واسطے ایک نہ ایک امید رکھنی چاہیے تو ناچار دل کی تسلی کے لیے مرنے کی امید باندھی تاکہ اگر اور امیدیں پوری نہ ہوئیں تو یہ ضرور پوری ہوگی جب کوئی امید پوری نہ ہو تو مرنا یاد کر کے دل کی تسلی کر لینی چاہیے۔

۳۱- مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی (دیوان/۱۶۰)

گردوں یعنی آسمان کو ساقی ٹھہرایا چونکہ یہ سات ہیں اور ۱ + ۲ + ۴ سات ہوتے ہیں، اس واسطے اس کے سات جام ٹھہرائے چونکہ آسمان اُلٹے پیالے کی صورت ہے اور اُلٹا پیالہ خالی ہوتا ہے کسی کو اس سے قطرہ نہیں ملتا اس واسطے آسمان سے کسی کو عشرت کے قطرے کی امید نہیں کیوں کہ وہ تو خود اوندھے اور خالی پیالے ہیں۔

۳۲- ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے (دیوان/۲۲۱)

شریعت تو عشق الٰہی سے ہٹاتی ہے اور کفر یا بُت پرستی یعنی عشق الٰہی عشق کی طرف یعنی بُت خانے کی طرف کھینچتا ہے اور میں عاشق حق کعبے کو پیچھے چھوڑ کر عشق کے بُت خانے کی طرف یعنی خدا کی طرف جا رہا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ عاشقان خدا کعبے اور ایمان کی طرف پیٹھ کرتے ہیں اور بُت خانے یعنی دل کی طرف منھ ہوتا ہے۔ وہ اسی گھر میں خدا کو دیکھتے ہیں۔

۳۳- واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب[۱] (دیوان/۲۷۸)

سونا سوگند ایک قسم کا خالص سونا ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ سونا قسم ہو گیا ہے۔ مراد اوّل سے ہے کہ بیداری سے رنگ زرد ہو گیا ہے۔

۳۴- جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا (دیوان/۶۴)

مصدر دنیا سے جان دی یعنی مر گئے اور دی ہوئی اسم مفعول مشتق ہیں۔

۳۵- شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو[۲] (دیوان/۱۵۰)

نازک بدنی کا مبالغہ ہے کہ خواب میں آنے سے بھی پانو دکھتے ہیں۔

۳۶- بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں[۳] (دیوان/۱۴۰)

میرا گھر ایسا اندھیرا ہے کہ اگر اس کے دیواروں کے سوراخ میں روئی کا پھول رکھ دیں تو وہ چاند بن جائے اور اس کی چاندنی سے گھر چاندنا ہو جائے یہ معاملہ ہے کہ سیاہی میں سفیدی زیادہ چمکتی ہے اور تھوڑی سی بھی بہت دکھائی دیتی ہے جیسے کہ تھوڑا سا پانی رات کو بہت اور زیادہ سفید نظر

---

[۱] اگر آدمی رات بھر جاگتا رہے تو رنگ زرد ہو جاتا ہے اور سونے کا رنگ بھی زرد ہوتا ہے، اس لیے رات کو نیند نہ آنے سے خالص سونے جیسا پیلا رنگ ہو گیا۔

[۲] اس درجے کے نازک کی نزاکت کی تعریف ہے کہ اگر وہ کسی کے خواب میں بھی آ جائے تو اس کے پانو اس طرح دکھنے لگ جاتے ہیں جس طرح کسی کے اصلی سفر میں۔

[۳] اندھیرے کا مبالغہ۔

آتا ہے اور کلر زمین ایسی چمکتی ہے کہ پانی نظر آتا ہے۔

۳۷۔ وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے [1]

ہم سب سے ملنے جلنے والے آدمی ایسے زندہ ہیں کہ تمام کو دکھائی دے رہے ہیں سب ہم کو پہچانتے ہیں، خضر کی طرح زندہ نہیں کہ آب حیات پی کر لوگوں سے چور بنا پھرتا ہے یعنی چھپا پھرتا ہے، خلاصہ یہ کہ نعمت وہی لطف دیتی ہے جو یاروں کے شامل ہوتی جائے جیسے کہ پنجابی مقولہ ہے "یاراں نال بہاراں ہیں"، اور اکیلے اعلیٰ سے اعلیٰ نعمت نہایت بے لطف ہے جیسے کہ مثل ہے اکیلا روتا بھلا نہ ہنستا۔

۳۸۔ ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا [2] (دیوان/۸۰)

واقعہ یہ ہے کہ فزکس یعنی علم طبیعات کا مسئلہ ہے کہ پانی گرمی پاکر بخارات بھاپ بن کر اوپر چڑھ جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اجزا میں پھیل کر ہوا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کثرت سے رو کر ضعف آجاتا ہے اور آنسو خشک ہو جاتے ہیں پھر رونے میں آنسو نہیں نکلتے صرف ٹھنڈی آہیں نکلتی ہیں اور وہ جو اندر گرم خون تھا وہ آنکھوں کے رستے آنسو بن کر نکل چکا اس سبب سے ٹھنڈے سانس نکلتے ہیں (خواجہ غالب کو تمام علوم میں کمال تھا)۔

۳۹۔ نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
اگر گل ہوں تو گلخن میں اگر خس ہوں تو گلشن میں [3]

گل گلشن میں چاہیے اور خس یعنی تنکے بھٹی میں۔ یہاں زمانے کے خلاف سے الٹا حال ہے کہ نیکوں کو ذلت اور بدوں کو عزت۔ زمانے کے خلاف کی شکایت۔

۴۰۔ مری تعمیر میں مضمر ہے صورت اک خرابی کی
ہیولا برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا (دیوان/۴۸)

تعمیر سے مراد وجود، مضمر بمعنی پوشیدہ داخل۔ ہیولیٰ بمعنی مجسم شے۔ دہقان نادانی اور جلدی اور کوشش سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دکان داروں اور اہل حرفہ اور سوداگروں وغیرہ کے کاروبار اپنے اختیار میں ہوتے ہیں جس قدر جلدی اور کوشش کریں اسی قدر فائدہ ہے اور کسانوں کی کھیتی اپنے اختیار میں نہیں، آسمانی اختیار میں ہے یعنی جب بارش ہوگی تب ہی بوویں گے اور جلدی کر کے تھوڑی سی بوندوں میں بودیں تو بیج بھی جاوے اور فصل بھی۔ اور جب تک کھیتی اچھی طرح نہ پک جائے کاٹ نہیں سکتا، اگر جلدی کاٹ لیوے تو اناج مرجھایا اور سوکھا نکلے۔ علیٰ ہذا القیاس کسان جس قدر جلدی کرے اسی قدر اس کا نقصان ہے۔ پس خون گرم دہقان یعنی دہقان کی جلدی اس کے کھلیان پھونکنے کو بجلی کا شعلہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ جلدی انسان کو خراب کرتی ہے کہ تعجیل کار شیاطیں بود۔

۴۱۔ غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا (دیوان/۶۵)

دوست عزیز کی جدائی کے غم میں بڑی دل چسپ جگہ باغ کی سیر بھی بری لگتی ہے، یہاں تک کہ گلوں کا ہنسنا جو نہایت مرغوب دل ہے، مثل رونے کے ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ سیر و تماشا بھی یاروں اور دل کی خوشی کے ساتھ ہی اچھا لگتا ہے ورنہ حسرت و افسوس ہے۔

۴۲۔ ہے سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا (دیوان/۴۶)

اس میں حرفی صنعت ہے یعنی "بت مشکل پسند" میں بھی دس حرف ہیں اور تسبیح کے شمار میں بھی دس دانے ہوتے ہیں اپنے لقب کے حرفوں کی تعداد اور صفات سے شمار کو پسند کیا یعنی جس طرح آپ ایک ایک وار میں سو سو دل کو اڑا لیتا ہے اسی طرح سبحہ کے سو سو دانے کو شمار کا ایک ایک دانہ اڑا لیتا ہے۔ ورد و وظیفے والوں کا دستور ہے کہ جب سو دانے کی پوری تسبیح پھیر لیتے ہیں تو شمار کا ایک دانہ سرکا دیتے ہیں۔ انھیں شمار کے دانوں کے حساب سے بیسیوں تسبیح پھیر لیتے ہیں۔ چوں کہ ایک ایک ہاتھ میں سو سو دل کا اڑا لینا اس کثرت سے خوں ریزی بہت مشکل ہے اس واسطے مشکل پسند کہا اور حسن دلوں کا شکاری ہے، دلوں کو مفت کا مال سمجھتا ہے بقول وزیر

کہتا ہے دل مرا کف رنگیں پہ رکھ کے یار
کیا مال مفت آیا ہے دزد حنا کے ہاتھ

---

[1] خضر کے آب حیات کا قصہ ہے، روشناس یعنی سب کی جان پہچان [2] یہ فزکس یعنی علم طبیعی کا مسئلہ ہے کہ پانی بھاپ کی شکل ہوا ہو جاتا ہے
[3] نیک کے واسطے گل اور بد کے لیے خس یعنی تنکا۔

اور جو لوگ شمار سبحہ کے معنی تسبیح پھرانے کے لیتے ہیں وہ علاوہ صنائعی اور مطلبی غلطی کے ایک بڑی غلطی محاورے کی کرتے ہیں کہ محاورے سبحہ کے ساتھ گرداننے اور پھرانے کے ہیں مثلاً: اس کے نام کی سبحہ گردانی کرتا ہوں۔" تمھارے نام کی تسبیح پھیرتا ہوں۔ صنعت زدفی میں ان کا ایک شعر پہلے بھی نصیحتانہ اشعار میں آخر کا آچکا ہے اور تین حرف سے اصطلاح لعن کی اور چار حرف سے لعنت کی عام اشعار میں بہت ہے۔ دیوان ظفر کی ردو میں پوری غزل ہے۔ اسی صنعت میں دصاف کا یہ شعر ہے۔

آرسی میں عکس اپنا دیکھ کر لائے غرور
چار دن کی زندگی میں خود نمائی کر گئے

آرسی میں چار حرف ہیں اس خوبی سے اگلے مصرع میں چار دن کہا۔ چار حرفی آرسی زبانِ حال سے بتا رہی ہے کہ میرے حرفوں کی تعداد کے موافق تیرا حسن جوانی چار دن کا ہے اس پر غرور عبث ہے۔

۴۳۔ گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر (دیوان/۹۳)

انسان خود ذات باری ہے اور (اس میں) سما گیا ہے اور کوہ طور پر اس نے ذری اپنے نور کی تجلّی ڈالی تھی وہ کم ظرفی سے جل گیا۔ پس اس کی تجلیات بلکہ خود اس کی ذات کو اپنے میں سما لینے والا انسان ہی ہے اور کو اس کی ذری سی بھی چمک کی تاب نہیں۔ بقول درد:

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

۴۴۔ غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم (دیوان/۱۱۱)

آزاد لوگ دنیاوی سامان کے نہ ہونے سے غرض نہیں رکھتے اگر کچھ دل میں خیال آکر غم ہوتا بھی ہے اس غم کے گھر کو وہ بجلی کی چمکارے سے روشن کر لیتے ہیں یعنی جانتے ہیں کہ زندگی کا عرصہ بہت قلیل ہے جیسے کہ بجلی کا چمکا۔ بس بجلی کی چمک دیکھ کر زندگی کی ناپائداری کا خیال کر کے غم کے اندھیرے کو روشن کر لیتے ہیں گویا بجلی ہی ان کے اندھیرے کی روشنی ہے کہ اس کی ناپائداری سے ان کا غم دور ہوتا ہے۔

۴۵۔ ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہ ہمّت مردانہ ہم (دیوان/۱۱۱)

تلاش مال اور مرتبے کا ترک کرنا نامردی اور ناتوانی اور نادانی سے ہے جس کا نام دل کی تسلّی کے لیے قناعت اور توکل رکھ لیا ہے۔ قناعت اور توکل کے بہانے سے ہم مردانہ ہمّت کے آسرے کا دبال بن گئے ہیں یعنی قناعت سے کم ہمّت اور نامرد بن کر سست اور نکمّے نہ ہونا چاہیے بلکہ مردانہ ہمّت کر کے ہر امر میں تلاش اور کوشش کرنی چاہیے کسی پر اپنا بوجھ ڈالنا نامردوں کا کام اور اوروں کا بوجھ اپنے سر پر لینا عالی ہمت مردوں کا کار ہے۔

۴۶۔ دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے (دیوان/۲۰۵)

انسان کی اصلی غرض دوست یعنی خدا کا حاصل کرنا ہے مگر انسان نے اس اصلی مطلب کو جہالت سے فوت کیا کہ انسانوں کی دشمنی میں اُلجھ گیا۔ اس الجھاؤ اور عداوت و دشمنی میں پڑ کر دوست کی طلب اور ملاقات سے محروم رہا اور اگر چشمِ معرفت ہوتی تو دوست کی طلب تلاش کے سوا اور طرف دھیان نہ کرتا اور کسی کو دشمن نہ جانتا بلکہ دشمن کو بھی دوست ہی جانتا، بقول درد:

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ

جب کہ سب چیز میں دوست ہے تو کوئی بھی غیر اور دشمن نہیں۔ بقول ناسخ

صفحۂ ہستی میں صورت ہی نہیں اغیار کی
ہر مرقع میں ہیں تصویریں بس اپنے یار کی

۴۷۔ ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے (دیوان/۱۴۴)

دوست جو ہمارے پر نامہربان ہے یعنی جور و جفا کرتا رہتا ہے اس میں اس کو ہماری وفاداری کا پورا پورا بھروسہ ہے کہ ہمارے ہر جور و جفا کو خوشی سے سہے گا، اس لیے ہم اس کے جور و جفا کو خوشی سمجھتے ہیں کہ شکر ہے اس کو ہماری وفاداری کا پورا بھروسا ہے۔

۴۸۔ گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے (دیوان/۱۴۸)

جب کہ عام فہم یہ بات ہو گئی کہ جو شخص رازِ عشق رکھتا ہے وہ خاموش رہتا ہے تو خاموشی میں اخفائے راز نہ ہوا بلکہ افشائے راز ہوا۔ اس نازک خیالی سے میں بولتا رہتا ہوں تا کہ کسی کو اخفائے راز کا گمان گذرے

پس میرا بات کرنا عام سمجھ کے نزدیک حال کا چھپانا ہے اس وجہ سے میں بولنے اور بات کرنے میں خوش ہوں کہ میرا مطلب سمجھنا بہت مشکل ہے کہ بھید چھپانے کو بولتا رہتا ہوں۔ اس مضمون کی تائید میں انھیں کا یہ شعر ہے۔

بےخودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے (دیوان/۱۸۵)

مومن : مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
کچھ حال ہی ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

یعنی خاموشی کی حالت کہہ رہی ہے کہ کچھ رازِ عشق کا اخفا ہے۔

۴۹۔ عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے (دیوان/۲۲۱)

محبوب اس بات میں خوش ہے کہ سوائے عاشق اور معشوق کے کوئی ان کے عشق سے واقف نہ ہو، سو یہ بات ہمارے میں ہے کہ ہجر و غم کے ہزارہا صدمے جھیلتے ہیں۔ پر اس راز کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتے اور سب عاشقوں میں نامی مجنوں گزرا ہے مگر اس سے صدموں کی برداشت نہ ہو سکی، چلا اٹھا اور جنگلوں دیوانہ ہو کر لیلیٰ لیلیٰ کہہ کے اپنی مٹی اٹھائی اور پردہ نشین لیلیٰ کی خاک اڑائی۔ اس راز کی پاسداری سے لیلیٰ مجھ کو عشق میں اچھا اور مجنوں کو برا کہتی ہے۔ بھید کے چھپانے والے کی بڑی قدر اور ہیبت ہوتی ہے۔

۵۰۔ تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا[۵] (دیوان/۶۱)

مذاق اس میں ہے کہ عاشق کا اپنے پرزے اڑتے دیکھنا ایک آسان کھیل اور عمدہ تماشا ہے کہ قاتل کی صورت تو دیکھیں گے اور ہاتھ اور تلوار کے مزے لیں گے۔

۵۱۔ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا (دیوان/۴۴)

خدا نے دنیا اپنی ایک ایسی دل چسپ محفل لگائی ہے کہ جو شے یہاں سے جاتی ہے، روتی چلاتی اور پریشان جاتی ہے۔ مرنا اس واسطے کٹھن ہے کہ اس کی بزم دنیا اچھی ہے جیسے کہ ناسخؔ کا پہلا یہ عارفانہ شعر گویا

طرفہ گل اس باغ میں ہے اور شبنم ہے عجیب
ہنس کے بیٹھا جو تری محفل میں وہ رو کر اٹھا

(۴)

دوسرا چمن "اشعار محاورات میں" ہے، اس کے آغاز میں مولف نے لکھا ہے:

"ابتدا اردو زبان کی شاہ جہاں شاہ دہلی کے عہد سے ہے اور شاہ عالم ثانی کے عہد میں یہ مشہور شاعر دہلوی صاحب دیوان مستند استاد ہوئے ہیں جن سے اردو زبان کا زور و شور ہوا۔ میر تقی، میرزا رفیع السودا، خواجہ میر دردؔ، ان کے بعد غلام ہمدانی مصحفی، انشاءاللہ خاں، قلندر بخش جرأت، پھر بہت سا اکبر شاہ ثانی کے زمانے سے ظفر کے زمانے تک۔ اردو زبان کو ان مستند اساتذہ صاحب دیوان ابراہیم ذوق، میرزا اسداللہ غالب، حکیم مومن خاں، شاہ ظفر دہلوی، امام بخش ناسخ وحیدر علی آتش لکھنوی نے مانجھا ہے اس لیے اشعار محاورات ان مستند اساتذہ کے بہ ترتیب لیے گئے۔ اور چوں کہ اردو زبان دہلی میں لال قلعے کی فصیح تھی۔ خاص کر اس میں شاہزادوں کی بموجب اس کے کہ کلام الملوک ملوک الکلام۔ اس لیے شاہ ظفر کا کلام زیادہ لاگیا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دیوان ظفر دراصل شاہ ظفر کے استاد کامل حضرت ذوق کا ہے کیونکہ انھوں نے اکثر آپ غزلیں کہہ کے شاہ ظفر کا تخلص ڈال دیا ہے جیسا کہ آب حیات میں مذکور ہے اور باقی غزلیں ان کی اصلاح سے ہیں....."

۵۲۔ بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا[۶] (دیوان/۴۱)

موئے آتش دیدہ کنڈلی دار بال کو کہتے ہیں جیسا کہ ناسخؔ کے اس شعر سے ثابت ہے:

ہجر میں میرا بدن کاہیدہ ہے سوزِ غم سے موئے آتش دیدہ ہے

اس وجہ سے یہاں موئے آتش دیدہ سے مراد زلف کے کنڈلی دار بال

---

[۵] ہم متکلم ہے۔ اور غالب کو غائب جانا ہے۔ مراد دونوں جگہ غالب سے ہے۔ ۔۔۔ کو پریشانی میں رسالہ لکھا ہے۔

[۶] موئے آتش دیدہ = آگ کی سینک لگا ہوا بال، مراد زلف کا کنڈلی دار بال جو آتشین رخ کی سینک سے مڑ گیا ہے۔

ہیں جو ر دسے آتشیں کی سینک سے مڑ گئے ہیں۔ ہم زلف کے سودائی وائی ہو کر قید میں آئے تو یہاں بھی پانْو کی زنجیر کنڈلی دار زلف کی صورت ملی۔ اس لیے ہم یہاں بھی زلف کی زنجیر میں اسیر بے قرار ہیں بقول ظفر:

اور سودا ہوگا افزوں یاد آئے گی وہ زلف — لاؤ مت آہن گرد زنجیر میرے روبرو

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو

۵۳۔ لیا دانتوں میں[1] جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا (دیوان/۴۷)

نیستاں بمعنی بانسوں کا بیٹر۔ نیستاں کا ریشہ ہونے سے مراد الغوزہ مثل بنسری بن جانا جیسے کہ الغوزے سے نالے کی آواز نکلتی ہے اسی طرح تنکے سے آواز نکلی۔

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے

۵۴۔ مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سرو چراغاں[2] کا (دیوان/۴۷)

فرصت کے لفظ میں یہ خوبی ہے کہ سرو چراغاں ہمیشہ روشن نہیں ہوتا صرف محرم کے عشرے میں اس کی روشنی کا تماشا ہوا کرتا ہے اور یہ روز غمی کے کہلاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا دل ماتم سرا کا سرو چراغاں ہے اگر ہمارا یار کسی موقع پر دیکھنا چاہے گا تو دکھلا دیں گے۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی[3] ہوا ہوگا

۵۵۔ قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا میری[4] مژگاں کا (دیوان/۴۸)

کس کس سے مراد دل اور جگر ہیں کہ آنسو ان کے خون سے بنے ہیں۔

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل

۵۶۔ کھیل لڑکوں[5] کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا (دیوان/۶۱)

اس شعر میں گریہ کا مبالغہ ہے، دیدۂ بینا بمعنی عارف کی آنکھ۔ عارفوں کو ایک دانے میں خرمن اور قطرے میں دریا یعنی جزو میں کل نظر آتا ہے کہ جزو ہی سے بڑھتے بڑھتے اس کا کل بن جاتا ہے۔ یہ شعر ذوق کے اس شعر کے مضمون پر ہے جس کی شرح ذوق کے عارفانہ شعر میں گذر رہی[6]۔

سرمۂ مفت نظر[7] ہوں، مری قیمت یہ ہے

۵۷۔ کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا (دیوان/۴۸)

مفت چیز کا احسان مول کی چیز سے بھاری ہے اور بیش قیمت ہے مذاق یہ ہے جس خریدار کو سرمہ فروش ایک دو سلائی بطور بانگی کے مفت دیتا ہے وہ اس مفت کے احسان میں دب کر کچھ نہ کچھ خرید ہی لیتا ہے۔

لو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں

۵۸۔ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج[8]

بیمار دار۔ بیمار کے علاج کرنے والے کو اور ٹہل کرنے والے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ عشق کا مرض مسیحا سے بھی نہیں جاتا ثبوت یہ کہ بت پرستوں کو بتوں کے عشق سے ہر چند بڑے بڑے معجزے دکھا کر ہٹایا مگر وہ نہ ہٹے یعنی ان کا مرض عشق نہ گیا۔ بلکہ مریض عشق ہی ان کی جان کے دشمن ہو گئے یعنی سولی دینے لگے یہ مشکل سے جان بچا کر چوتھے آسمان پر جا چڑھے۔ ذوق:

چرخ پر بیٹھا رہا جان بچا کر عیسیٰ — ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ[9]

۵۹۔ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر (دیوان/۹۲)

جب قاتل نے دیکھا کہ میرے قتل سے مقتولوں کو لذت آتی ہے تو قتل ہی چھوڑ دیا ہے یعنی اس کو اپنے شوق سے سروکار نہیں۔ ہماری بے لطفی و محرومی ایذا سے کا ہے۔ کس لطف سے قاتل کو قتل سے ہٹا کر اپنی قوم کو بچایا ہے۔

اچھل کے دیکھ نہ چل[10] اس قدر تو لے سرکش

۶۰۔ کہ تیرے ساتھ ہے فوارہ ساں نشیب و فراز (یہ شعر دیوانِ غالب میں نہیں)

جس طرح فوارے کا پانی اوپر چڑھ کے نیچے آ پڑتا ہے اسی طرح سرکش اچھل کے سر کے بل گر جاتا ہے۔

---

[1] دانتوں میں تنکا لینا = جان کی پناہ یا امان چاہنا۔ رحم دلانے کو عاجزی کرنا کہ میں تیری گائے ہوں۔ [2] سرو چراغاں = ایک لوہے کا جھاڑ ہوتا ہے جس میں صدہا لوہے کے دیے بنے ہوتے ہیں۔ جن میں تیل بتی ڈالتے ہیں۔ [3] لہو پانی ہونا = سخت مصیبت جھیلنا رنج و غم میں جان کھپانا۔ [4] اصل میں 'میری' ہی ہے، مگر 'تیری مژگاں' ہونا چاہیے اور اس صورت میں شارح کا مفہوم باطل ہو جائے گا۔ [5] لڑکوں کا کھیل = بہت آسان کام سمجھنا، سرسری جاننا۔ [6] ذوق: دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو — جزو میں آتا ہے نظر کل کا تماشا ہم کو۔ [7] سرمۂ مفت نظر = وہ سرمہ جو سرمہ فروش بانگی کے طور پر ایک دو سلائی لگانے کے واسطے خریدار کو مفت دیتا ہے مراد مفتی نعمت۔ [8] کیا علاج = کیا سزا۔ [9] ہاتھ کھینچنا = ہٹ جانا، بند ہو جانا۔ [10] اچھل کر چلنا = اپنی بنیاد سے بڑھ کے چلنا، اپنی حیثیت سے بڑھ کر چلنا۔

ایسا آساں نہیں لہو رونا[1]

۶۱۔ دل میں طاقت جگر میں حال کہاں (دیوان/۱۱۳)

رونے کے واسطے دل میں طاقت اور جگر میں حال یعنی وجد کی طاقت ہونی چاہیے جب یہ نہ ہوں تو رویا نہیں جاتا یعنی اب ایسے ناتواں ہو گئے ہیں کہ رونے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

سر کھجاتا[2] ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے

۶۲۔ لذت سنگ باندازۂ تقریر نہیں (دیوان/۱۲۰)

عشق کے پتھر کی چوٹ میں وہ مزا ہے کہ بیان نہیں کیا جاتا اگر اچھا ہو جاتا ہے تو پھر چوٹ کھانا چاہتا ہے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ[3] لوگ

۶۳۔ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں (دیوان/۱۲۲)

زندگی قائم رکھنے کے لیے امید کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ہم زندگی سے بیزار ہیں اس کے لیے امیدوں کی انتظاری کے عذاب کیوں دیکھیں۔ الانتظار اشدّ من الموت۔

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
دل نہ دوں اپنا کبھی میں ترے کافر ہاتھ میں

۶۴۔ تو کلام اللہ[4] بھی گر آئے لے کر ہاتھ میں (یہ شعر دیوان غالب میں نہیں)

تو دل کو لے کر صاف مکر جانے والا ہے اس لیے قسم و سوگند سے تیرا اعتبار نہیں۔ سنگدلی کی رو سے کافر کہا اور کافر کو قرآن پر ایمان نہیں ہوتا جب اس کو اس کا خود ایمان ہو تو دوسرا اس کی اس قسم پر جس پر اسے خود ایمان نہیں کیوں کر ایمان لائے۔

رو میں[5] ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے

۶۵۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (دیوان/۱۲۵)

عمر کا گھوڑا سرپٹ جا رہا ہے نہ تو سوار کے ہاتھ میں باگ ہے اور نہ پاؤں رکاب میں جس سے روکے یعنی کوئی اختیار نہیں ہے منزل موت پر ہی جا کر تھمے گا یعنی ٹھہرے گا۔

جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں

۶۶۔ جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد[6] نہیں (دیوان/۱۳۳)

مسلمانوں میں رسم ہے کہ جب مہمان یا کوئی سفر سے آتا ہے تو مرحبا کہتے ہیں اور جب جاتا ہے تو خیر باد کہتے ہیں۔ یہاں آنے کی خوشی اور نہ گئے کا غم۔

تیری فرصت کے مقابل اے عمر

۶۷۔ برق کو پا بہ حنا باندھتے[7] ہیں (دیوان/۱۳۳)

جب پاؤں کو حنا لگاتے ہیں تو چلتے پھرتے نہیں ایک جگہ ٹکے بیٹھے رہتے ہیں اس واسطے پا بہ حنا کے معنی ٹکے ہوئے کے ہیں یعنی عمر ایسی تیز رفتار ہے کہ اس کے مقابل میں بجلی کو قیام معلوم ہوتا ہے یعنی بجلی تو کچھ دکھلائی بھی دیتی ہے یہ دکھلائی بھی نہیں دیتی اور جھٹ پٹ گذر جاتی ہے۔

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو

۶۸۔ کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے[8] چلا کیے (دیوان/۱۴۴)

عاشقان خدا پر ہمیشہ تہمتیں اور جور و جفا ہوتے چلے آئے ہیں دیکھو حضرت زکریا پیغمبر کو آرے سے چروا، منصور کو سولی چڑھایا، شمس تبریز کی کھال اتروائی۔

ہاں بھلا کر[9] ترا بھلا ہوگا

۶۹۔ میں نہیں جانتا دعا کیا ہے[10] (دیوان/۱۸۲)

اپنی بہبودی کی دعا مانگنا اور لوگوں سے منگوانا کچھ فائدہ نہیں، فائدہ مند اگر ہے تو یہی بات ہے کہ اگر تو اپنا بھلا چاہے تو کسی کا بھلا کر اس کے عوض میں ضرور تیرا بھلا ہوگا۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں

۷۰۔ ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے[11] (دیوان/۱۸۶)

اس شعر کا مطلب بھی وہی ہے جو پیچھے ۶۸ ویں شعر میں سر پہ آرے چلنے کا ہے۔

---

[1] لہو رونا = نہایت زار زار رونا، اندوہ و غم میں ایسا رونا کہ سرخ آنسو ٹپکنے لگیں۔ [2] سر کھجانا = پٹنے کو جی چاہنا، زخمی ہونے کی خواہش کرنا۔ [3] امید پہ جینا = تنگ دستی میں فراخی اور غمی میں خوشی کی امید پر دل کا تسلی کرنا۔ تسلی دینے کے موقع پر بولتے ہیں۔ [4] کلام اللہ ہاتھ میں لے کر آنا = قرآن شریف کی قسم کھانا۔ [5] رو میں ہونا = گھوڑے کا سرپٹ دوڑنا۔ [6] خیر باد = کلمہ دعائیہ، کسی عزیز کی رخصت کے وقت کہتے ہیں۔ [7] باندھنا = شعر میں لانا، نظم میں لانا، کسی سے تشبیہ دینا۔ [8] آرے چلنا = آفتیں مصیبتیں جھیلنا، زخم، صدمے رنج اٹھانے۔ [9] کر بھلا ہو بھلا = ہر ایک سے بھلائی اور نیکی کرنے کی نصیحت پر بولتے ہیں۔
[10] اصل میں دوسرا مصرع غلط لکھا گیا ہے، یوں ہونا چاہیے: ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا اور درویش کی دعا کیا ہے [11] قلم ہونا = کٹنا۔

۷۱۔ خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ (کیا شکوہ کریں)
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے[1] (نسخۂ مالک رام/۲۰۰)

سیاہ رنگ آدمی کی برائی میں کہا کرتے ہیں کہ جیسے یہ اوپر سے سیاہ ہے ویسا ہی اندر سے ہے پس آسمان اندر باہر سے سیاہ ہمارا دشمن ہے جس نے ہم کو تم سے زخمی کرایا۔

۷۲۔ اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے[2]
کہا جو اس نے ذرا میرے پانو داب تو دے (دیوان/۲۰۹)

جب اس عزیز نے مجھے اپنے پانو دبانے کی خدمت کو کہا تو مجھے شادی مرگ ہو گئی کہ میرے کم بخت ہاتھ پانو پھول گئے، اگر مراد کو پہنچا تو بد قسمتی دیکھو کہ مراد ہاتھ آنے سے رہ گئی۔

۷۳۔ اے پرتو خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے[3] (دیوان/۲۳۵)

سایہ سیاہ ہوتا ہے اور جس پر وقت پڑتا ہے وہ بھی رنج و غم سے سیاہ پڑ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کا پرتو آپڑ جائے تو ہم بھی روشن ہو جائیں۔

۷۴۔ واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی[4] (دیوان/۲۳۶)

واعظ، زاہد وغیرہ بہشتی شرابِ طہور کی تعریف ایسے مبالغے سے کرتے ہیں کہ سن کر منھ میں پانی بھر آتا ہے مگر ہے خیالی پلاؤ۔

اس طرح اس کتاب میں (۴۷) اشعار کی شرح ملتی ہے، بعض اشعار کا مطلب شارح نے غلط بھی بیان کیا ہے اور بعض جگہ سیدھا اور سامنے کا مفہوم چھوڑ کر دور از قیاس مطلب پیدا کیا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ شرح ابیات دل چسپ ہے اور اس سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ خود غالب کے ہم عصر اور قریب العہد لوگ اس کے کلام کو کس طرح سمجھتے تھے اور لفظی و معنوی خوبیوں کی کنہ کو کہاں تک پہنچتے تھے۔

★

[1] ہتھکنڈے = چالاکیاں، داؤ گھات فند و فریب۔ [2] ہاتھ پانو پھول جانا = خوشی یا خوف کے مارے ہاتھ پانو کا بیکار ہو جانا۔ ہاتھ پانو کا نہ چلنا۔ غالب کا دوسرا تخلص اسد ہے۔ [3] وقت پڑنا = آفت پڑنا، مصیبت پڑنا۔ [4] کیا بات ہے' طنزاً' کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ کیا کہنے۔ کیا خوب واہ وا۔ مراد یہ کہ کچھ بھی نہیں، دھوکے کی بات ہے، فرضی اور خیالی پلاؤ ہے۔

★

غالب کا تصوّف

(بہ سلسلۂ ص ۱۰۷)

واقعی سنخ ہو چکے ہیں) کس طرح بخش دیتے۔ ان کی آزادہ روی کیا ہے؟ دیکھیے:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں، کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

دو شعر اور سنیے:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے؟

اور جب صورتِ حال یہ ہو کہ طاعت حق میں مے و انگبیں کی لاگ بھی باعثِ حظ ہو نیز بہشت کی پسندیدگی کا معیار بادۂ گلفام کی دستیابی ٹھہرے تو کہا بھی کیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ غالب نے (میر کی طرح 'ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی' کا شکوہ کرنے کے بجائے) حق ترک و اختیار کو بروئے کار لا کر اپنا علیحدہ مسلک بنایا جو بعض دوسرے افراد کا مسلک ہونے کے باوجود بھی غالب اور صرف غالب کا مسلک ہے کیونکہ اس کی تشکیل میں ایک مخصوص شخصیت و طبیعت کی عہد آفرین ندرت کاریاں پوری قوت سے کام کر رہی ہیں۔ اسے آپ غالب کی رندی و قلندری کہہ لیں یا ان کا تصوف، بات ایک ہی ہوگی۔

زمانے اور غالب سے

ندرت کانپوری

اس میں تو شک نہیں کہ پریشاں ضرور تھا	لیکن بنامِ وقت غزل خواں ضرور تھا
شاعر کی حیثیت سے سخن داں ضرور تھا	کردار کے لحاظ سے انساں ضرور تھا
غالب کا نام اہلِ قلم کے فسانے میں
نغمات ہیں کہ گونج رہے ہیں زمانے میں

تیری حیات ادب کے لیے سازگار تھی	تھی، اور تیرے دم سے سخن کی بہار تھی
اک وقت تھا کہ ساری فضا خوشگوار تھی	گویا ترے قلم کی ادا نغمہ بار تھی
آئینۂ بہار تھا تیرے سخن کا دور
اب تک نگاہ میں ہے وہی علم و فن کا دور

کیوں کر کہوں کہ صاحبِ فہم و ذکا ہے کون	اس دورِ انحطاط میں رمز آشنا ہے کون
فکر و نظر کے حسن میں ڈوبا ہوا ہے کون	جو صاف یہ کہے، اُسے پہچانتا ہے کون
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

بیدار اس قدر تو شعورِ دفا نہ تھا	عالی دماغ تجھ سا کوئی دوسرا نہ تھا
یہ عہد تیرے عہد کا گو آئنہ نہ تھا	لیکن تری نگاہ ترقی میں کیا نہ تھا
اس حسن، اس ادا سے کوئی ریختہ کہے
ایسی زبان میں، کہ زبان آج کی لگے

راہِ ادب میں کوئی مقابل نہ آسکا	گویا معاصرین سے آگے قدم رہا
غالب سا راہرو تھا جو منزل پہ آگیا	آخر گواہ بن کے زمانے نے خود کہا
اس راہرو کا نام تو زندہ ہے آج بھی
غالب نہیں، کلام تو زندہ ہے آج بھی

آئینہ دارِ حسن ہے غالب ترا کلام	تسلیم ہے یہ بات، کہ صدیوں چلے گا نام
خالی نہیں ہے، بادۂ کہنہ سے تیرا جام	یعنی بلند تر ہے، تری فکر کا مقام
بندش اگر ہے چست، تو نازک خیال ہے
جو لفظ ہے، وہ شاہدِ حسن و جمال ہے

میں جانتا ہوں، "جھوٹ کی عادت نہیں" تجھے	کہتا ہے کون یہ کہ فضیلت نہیں تجھے
حاصل کہاں "ذریعۂ عزت" نہیں تجھے	مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں تجھے
"کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام" ہے
تو ہر نظر میں قابلِ صد احترام ہے

ماگھ، پھاگن ۱۸۹۰ شک

عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ

یوسف سرسوی

اے تو کہ تھا رہینِ ستم ہائے روزگار
دستِ جنوں سے تیرا گریباں تھا تار تار
اک زخم تھا اگر، تو نمک داں تھے صد ہزار
خامہ تھا خوں چکاں، کہ رہیں انگلیاں فگار
گو وقفِ آزمائشِ دار و رسن رہا
خونِ جگر سے اپنے کھلاتا چمن رہا

لب ریزِ آبگینۂ دل جس سے تھا ترا
وہ دردِ آبروے متاعِ سخن ہے آج
اے عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ، دیکھ
تیری نوائے خستہ ہی جانِ چمن ہے آج

چھٹکی ہوئی ہے تیرے خیالوں کی چاندنی
تو نغمہ زن ہے، دور ستاروں کے ساز پر
لہرا رہی ہے زلفِ طرح دارِ زندگی
تیری غزل چھڑی ہے بہاروں کے ساز پر

مزاحیہ

مرزا غالب زندہ دلانِ لکھنؤ میں

غلام احمد فرقت کاکوروی

خاں صاحب: اماں یار میر صاحب! کچھ بتا سکتے ہو کہ غالب صاحب کی جو صد سالہ برسی منائی جارہی ہے وہ فروری کی کن تاریخوں میں پڑ رہی ہے؟

میر صاحب: بھائی! جو لوگ غالب کی برسی منا رہے ہیں ان نسوڑھیوں کا میرے سامنے نام نہ لو۔

خاں صاحب: کیوں خیر تو ہے میر صاحب! اردو کے اتنے بڑے شاعر کی برسی منانے میں کون سا نسوڑھیا پن ہے؟

میر صاحب: حضت! معاف کیجئے۔ یہ نسوڑھیا پن نہیں تو اور کیا ہے کہ جو صاحبان غالب کی الف بے سے بھی واقفیت نہیں رکھتے وہ آج انھیں لگتے پر چڑھائے چڑھائے پھر رہے ہیں اور جن کے یہاں کہنا چاہیئے کہ ان کا بچپن اور ان کی شاعری بڑھی پلی بلکہ جوان جہان ہوئی ان کو کوئی گھاس ڈالنے کو تیار نہیں۔

خاں صاحب: ارے بھئی وہ تو اکبرآباد کے تھے جسے آج کل آگرہ کہتے ہیں۔ اور پھر تھوڑا بہت پڑھ لکھ کر وہاں سے دلّی چلے گئے تھے جہاں ان کو بحیثیت شاعر شہرت حاصل ہوئی۔ ہم لکھنؤ والوں کا ان سے کیا تعلق؟

میر صاحب: اور اکبرآباد میں وہ کہاں پیدا ہوئے تھے؟

خاں صاحب: اکبرآباد کے ہی کسی محلہ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

میر صاحب: واہ خاں صاحب کیا معلومات ہیں آپکے۔ اور ایک آپ پر کیا موقوف ہے بڑے بڑے پڑھے لکھوں کو جنھوں نے غالب پر تحقیقی مقالے لکھے ہیں ان تک کو اس کا پتہ نہیں کہ مرزا صاحب پیدا کہاں ہوئے تھے اور ان کا اصلی وطن کیا تھا۔

خاں صاحب: بھئی میں نے تو ابھی تک جہاں جہاں پڑھا ہے اور جن جن لوگوں سے سنا ہے اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ اکبرآباد ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

میر صاحب: اچھا اب تو آپ نے کہہ دیا۔ مگر اب آئندہ سے میرے یا میرے کسی خاندان والے کے سامنے یہ بات نہ کہیئے گا ورنہ قسم قرآن کی وہ آپکا منہ نوچ لے گا۔ اے حضور آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس وقت آپ جس کمرے میں بیٹھے ہیں مرزا صاحب اسی میں پیدا ہوئے تھے اور یہ کمرہ ان کی جائے پیدائش ہے بلکہ یہ سامنے جہاں پر چوکی بچھی ہوئی ہے وہیں پر اللہ بخشے ہماری دادی جان کی منہ بولی ماں کو پان کھاتے کھاتے اچانک تکلیف شروع ہوئی تھی جس کے بعد ہمارے باپ کی دادی نے ان کا پلنگ یہیں بچھوا دیا تھا جہاں دوسرے روز سویرے مرزا صاحب ٹھہیوں ٹھہیوں کرتے عالم وجود میں آئے۔ واللہ پیدا ہونے میں نہ پوچھیئے کیا اذیت پہنچائی ہے۔ ہماری دادی جن کا ابھی اسّی برس کی عمر میں پچھلے سال انتقال ہوا ہے، فرماتی تھیں کہ مرزا صاحب چونکہ ستواسے پیدا ہوئے تھے اور ستواسے بچے بڑی دشواری سے پیدا ہوتے ہیں، بہت کم زندہ رہتے ہیں اس لیے وہ شروع ہی سے گھر بھر کی آنکھ کا تارا تھے۔

خاں صاحب: میر صاحب! گستاخی معاف! یہ تو یار کچھ اوکل معلوم ہوتی ہے۔

میر صاحب: واللہ خاں صاحب! جو میں آپ سے جھوٹ کہتا ہوں بلکہ ہماری نانی اپنی دادی کی کانوں سنی کہتی تھیں کہ جب مرزا پیدا ہوئے ہیں تو اتنے دبلے اور کمزور تھے کہ نہلانے کے ایک گھنٹے بعد تک تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خدانہ کردہ مرزا صاحب مردہ ہیں۔ پھر جب دائی نے روئی کے پہل میں ذرا لٹالا اور بدن ذرا گرم ہوا تو ایسے زور کی چیخ ماری کہ گرد و پیش جو لوگ بیٹھے تھے وہ اچھل پڑے اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ کوئی آسیب زدہ ہے کیونکہ اتنا کمزور بچہ اتنی زور سے رو ہی نہیں سکتا۔

خاں صاحب: تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مرزا صاحب کی آواز بڑی کرخت رہی ہوگی۔

میر صاحب: ارے صاحب! آپ کرخت کہتے ہیں۔ ہماری پردادی کہتی تھیں کہ وہ بولتے کیا تھے ڈکتے تھے اور وہ جو لاولد مرے اس میں سب سے بڑا دخل ان کی آواز کو تھا۔ ورنہ ان کے ملا جلا کر یوں تو کئی اولادیں ہوئیں جن میں سے تین تو سال سوا سال زندہ رہیں۔ البتہ دو بچے پیٹ ہی سے مرے پیدا ہوئے۔

خاں صاحب: میری دانست میں جو بچے پیٹ ہی میں مر گئے وہ بہ وقت باہر سے ڈکنے کی آوازیں جوان تک پہنچی ہونگی، ان سے دہل کر مر گئے ہوں گے۔

میر صاحب: اب جو بات بھی رہی ہو مگر تین بچے جو سال سوا سال کے ہوکر مرے ان میں ایک کے تو دونوں کانوں کے پردے غائب تھے اور دو بچے دسترخوان پر کھانا کھاتے کھاتے گذر گئے۔

خاں صاحب: یہ کیسے؟

میر صاحب: ارے صاحب اسے شدنی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں ایک دن مرزا صاحب جب کھانا کھانے بیٹھے تو ماں نے دونوں بچوں کو بھی بٹھا لیا۔ اتنے میں نہ جانے کس چیز میں نمک کم تھا۔ اس پر مرزا صاحب مارے غصہ کے جو نوکرانی پر بگڑے تو ایک بچے کی تو دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے حرکت قلب بند ہوگئی اور دوسرا اتنا خوفزدہ ہوا کہ تین روز تک کانپتے کانپتے اللہ کو پیارا ہوگیا۔

خاں صاحب: ہے۔ ہے۔ بھئی اسی لئے تو اسلام میں غصہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اب دیکھئے کہ ایک ذرا سی آواز کے زیر و بم نے مرزا کو لاولد بنا کر رکھ دیا۔

میر صاحب: ارے صاحب ان کے بچپن کی ایک دو باتیں ہوں جو بیان کی جائیں۔ مگر اللہ بخشے خوش قسمت بچپن ہی سے تھے بلکہ دادی بیان کرتی تھیں کہ ان کے پیٹ پر پیدائش کے وقت ایک سفید ہیرے سے بڑا دودھ تھا جو اس درجہ چمکتا تھا کہ کوہِ نور ہوتا تو اس کے سامنے لونڈا معلوم ہوتا ——— چنانچہ ایک برہمن جس نے ان کی کنڈلی بنائی تھی پیشین گوئی کی تھی کہ یہ بچہ شہرہ آفاق ہوگا۔ چنانچہ آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کے گوشے گوشے میں ان کے ڈنکے پٹ رہے ہیں، بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ روس کے کسی صاحب نے یہ تک کہا ہے کہ اگر مرزا صاحب کی قبر کھودنے کی اجازت دے دی جائے تو میں ان کی ہڈیاں جمع کرکے ان کو ہو بہو مصنوعی گیس کے ذریعہ چلتا پھرتا دکھا دوں گا۔

خاں صاحب: اماں قسم قرآن کی، اگر ایسا ہو جائے تو کہنا چاہیئے کہ ہم لوگوں کو بھی مرزا صاحب کا دیدار میسر آجائے اور ایسے ایسے انکشافات ہوں کہ قسم قرآن کی لوگ دانتوں میں انگلی داب کر رہ جائیں گے۔

میر صاحب: اماں اگر ایسا ہوگیا تو واللہ میں ایک بات کی تصدیق خود مرزا صاحب کی زبان سے کر لوں گا جو دادی اماں بیان کرتی تھیں۔

خاں صاحب: وہ کیا؟

میر صاحب: اماں وہ یہ کہ دادی اماں مرحومہ فرماتی تھیں کہ مرزا صاحب کی جن محترمہ سے شادی ہوئی ہے سنا ہے کہ وہ مرزا صاحب کے چھوٹے بھائی پر عاشق تھیں۔ اور کسی طرح مرزا صاحب سے نکاح پڑھوانے پر راضی نہ تھیں مگر نہ مرزا صاحب کے بھائی کی کچھ چلی اور نہ ان محترمہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی شادیوں کا جو حشر ہوتا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

خاں صاحب: یعنے؟"

میر صاحب: اے یعنے یہی کہ زندگی بھر مرزا صاحب سے اور ان سے اَن بن رہی اور مرزا صاحب کے چھوٹے بھائی کے دماغ پر اثر ہوگیا جو مرتے دم تک رہا۔

خاں صاحب: تو کیا مرزا صاحب کے کوئی چھوٹے بھائی بھی تھے؟

میر صاحب: تھے نہیں تو کیا۔ اے! وہی صاحب جن کو "غدر" میں تلنگوں نے گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔ بھئی بات یہ ہے کہ ان کو تو محبت میں اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ سڑکوں پر پاگلوں کی طرح گھوما پھرا کرتے تھے اور مرزا صاحب کی شان میں بڑی گستاخی کے کلمات زبان پر لاتے رہتے تھے۔ ان کو نہ تو اتنا ہوش تھا کہ ان ہنگاموں میں گھر سے نکلنا چاہیئے یا نہ نکلنا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی شقی نے گولی مار کر ان کا قصہ پاک کر دیا۔ اماں سنتے ہیں کہ ان کی لاش تک دستیاب نہ ہوسکی۔

خاں صاحب: ہے۔ ہے! واللہ۔ سچی محبت کا یہی انجام ہوتا ہے میں کہتا ہوں کہ جب مرزا صاحب کی بیوی کو اس کی خبر پہنچی ہوگی تو لاکھ بیاہتا سہی پھر بھی پرانی محبت تو عود ہی کر آئی ہوگی۔

میر صاحب: اے! آپ عود کر آئی کہتے ہیں تین روز تک تو وہ بے ہوش پڑی رہیں اور ہفتوں ایک کھیل زبان پر نہیں گئی۔ جب ذرا ہوش آتا تھا کہتی تھیں۔ "ہائے مجھے اٹھا لیا ہوتا۔ انھیں نہ اٹھایا ہوتا" چنانچہ ایک تو اس بات کی تصدیق کرنی تھی اور دوسرے ان کے استاد عبد الصمد صاحب کے بارے میں دریافت کرنا

تھا کہ آیا وہ ہندستانی تھے یا واقعتاً ایران سے آئے تھے۔

خاں صاحب: اماں ہاں میر صاحب! یہ بات تو ضرور تحقیق طلب تھی۔

میر صاحب: تحقیق طلب یوں تھی کہ دادی اماں کہتی تھیں کہ عبد الصمد صاحب وہ سامنے کھڑنجے والے مکان ہی میں تو رہتے تھے اور وہی مرزا صاحب کو فارسی پڑھاتے تھے۔ مگر خدا کی قسم ایسے ظالم تھے کہ مرزا صاحب کو پڑھانے میں چوٹی چار چوٹ کی مار دیتے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو مرزا صاحب کو اتنی زور سے طمانچہ مارا تھا کہ بے ہوش ہو گئے تھے، اور وہاں سے اٹھا کر گھر لائے گئے تھے۔ مگر مرزا صاحب کے ماں باپ بھی اللہ بخشے خوب تھے یعنی یہ کہ بجائے غصہ گری کرنے کے انھوں نے عبد الصمد صاحب سے کہہ دیا تھا کہ لڑکا میرا اور ہڈی گوشت آپ کا۔

خاں صاحب: تب ہی تو مرزا صاحب اپنے زمانے کے سب سے بڑے فارسی داں سمجھے جاتے تھے اور بڑے بڑے فارسی دانوں کو دھیان میں نہ لاتے تھے۔

خاں صاحب: ہاں صاحب! اس زمانے کے ماں باپ اپنے بچوں کے استادوں کا جو احترام اور جو خدمت کرتے تھے وہ تو آج کل قصہ کہانی بن کر رہ گیا ہے۔

میر صاحب: اماں اگر سائنس والے مرزا صاحب کو ایک گھنٹے سوا گھنٹے کے لئے زندہ کر دیں تو واللہ مزا آجائے۔ اماں سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ وہ چونکہ خدائے سخن میر تقی میر سے ملے تھے اور یہی عبد الصمد صاحب ان کو لے کر گئے تھے اس لئے ان سے میر تقی میر کی شکل و صورت کا پتہ بھی چل جائے گا اور کچھ عجب نہیں جو مرزا صاحب یہ بھی بتا دیں کہ میر صاحب لکھنؤ میں کس اکھاڑے کے پاس دفن ہیں کیونکہ میر صاحب مرزا صاحب کی زندگی ہی میں تو مرے تھے۔ لاکھ بچہ سہی مگر کچھ تو انھوں نے سنا ہی ہوگا کہ میر صاحب کی تجہیز و تکفین کہاں ہوئی اور کون کون لوگ ان کی مٹی میں شریک تھے۔

خاں صاحب: بھئی میر صاحب! اگر ایسا ہو گیا تو واللہ بہت سے لوگ جو میر تقی میر کے بارے میں عقلی گدے لگائے بیٹھے ہیں ان کا تو کہنا چاہئے کہ جلوس ہی نکل جائے گا۔

میر صاحب: دادی اماں بیان کرتی تھیں کہ مرزا صاحب جب نو سال کے تھے تو اس درجہ حسین اور جامہ زیب تھے کہ جب عبد الصمد صاحب میر تقی میر صاحب سے ملنے دلی جانے لگے تو مرزا صاحب بھی مچل گئے کہ میں بھی جاؤں گا چنانچہ جس دن دلی جا رہے ہیں اس دن چوڑی دار پاجامہ اس پر سیاہ کامدار ٹوپی اور پیر میں شاہ جہاں پوری جوتا پہن کر گھر سے نکلے ہی تھے کہ نظر لگ گئی جس کی وجہ سے عبد الصمد صاحب کو اپنا جانا دو روز کے لئے ملتوی کرنا پڑا۔

خاں صاحب: مگر میر صاحب! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس زمانے میں بھلا ریلیں تو ایجاد ہوئی نہیں تھیں پھر عبد الصمد صاحب ان صاحبزادے کو لے کیسے گئے تھے۔

میر صاحب: ارے بھئی! اس زمانے میں سفر اونٹ گاڑیوں بیل گاڑیوں اور گھوڑوں پر ہوتا تھا۔ چنانچہ عبد الصمد صاحب جن کے بارے میں سنا ہے کہ ان کے پاس ریس کے گھوڑے بھی تھے، انہی میں سے کسی گھوڑے پر بٹھا کر لے گئے ہوں گے، اور لکھنؤ سے اتنے سویرے چلے ہوں گے کہ سورج غروب ہوتے ہوتے دلی پہنچ گئے ہوں گے۔ ریس کے گھوڑے مری حالت میں بھی پچاس میل فی گھنٹہ تو دوڑتے ہی ہیں۔ پھر میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر رستے میں دو تین گھنٹے آرام بھی کیا ہوگا تو حد سے حد پانچ چھ بجے شام تک دلی پہنچ گئے ہوں گے۔

خاں صاحب: ہاں اور کیا۔ اور اگر سانڈنی پر بیٹھ کر گئے ہوں تو اس سے بھی پہلے دلی پہنچ گئے ہوں گے۔

میر صاحب: سنا ہے کہ جب میر صاحب نے مرزا صاحب کو عبد الصمد صاحب کے ساتھ دیکھا تو پوچھا کہ یہ کن کے صاحبزادے ہیں؟ اس پر عبد الصمد صاحب نے تفصیل سے مرزا صاحب کا حسب نسب بتاتے ہوئے کہا کہ حضور! آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہ بچہ فطری شاعر ہے۔ اس پر میر صاحب نے مرزا صاحب سے کہا اچھا بیٹا کسی مصرعے پر فی البدیہہ مصرع لگا سکتے ہو۔ اس پر مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا کہ آپ کوئی مصرع دیجئے۔ میر صاحب نے کہا کہ اچھا "اس مصرع پر گرہ لگاؤ۔

بخش دو گر خطا کرے کوئی"

اس پر مرزا صاحب تھوڑی دیر خاموشی کے بعد بولے کہ حضور! آپ نے جو مصرع فرمایا ہے اگر میں اس کو قطعہ کر دوں تو کوئی حرج تو نہ ہوگا۔ میر صاحب بولے کہ نہیں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس پر مرزا صاحب نے گنگنا کر یہ قطعہ پڑھا ؎

نہ سنو گر برا کہے کوئی   نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی   بخش دو گر خطا کرے کوئی

یہ سن کر میر صاحب نے مرزا صاحب کو دونوں ہاتھوں سے گود میں اٹھا کر گلے لگا لیا اور فرمایا کہ "یہ بچہ کسی زمانے میں اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا" مگر خاں صاحب! یہ جو شراب کی عادت مرزا صاحب کو لگی وہ دلی پہنچ کر لگی جب ماشاء اللہ ان کی شادی ہو چکی تھی۔ اور اس کی ساری ذمہ داری مرزا آغا بیگ

صاحب پر دائر ہوتی ہے جو اپنے زمانے کے بلا نوش تھے اور مرزا صاحب کے پیچھے ہر وقت پھل پیری کی طرح لگے رہتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب بھی بلا کے شرابی ہوگئے اور پھر آپ جانتے ہیں کہ ؎

"چھٹتی نہیں ہے منہ کو یہ کافر لگی ہوئی"

اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ شرابی کو اگر قارون کا خزانہ بھی دے دیا جائے تو وہ بھی چار دن میں اڑا کر رکھ دے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب مغلیوں تک سے قرض لینے لگے۔

خاں صاحب: یہ مغلیے بھی تو بلا کے ہوتے ہیں ـــــ قرض خواہ کا کفن تک نہیں چھوڑتے۔

میر صاحب: اب ایک لطیفہ سنیئے۔ وہ مرزا صاحب کا جو شعر ہے نہیں کہ ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

اس کا بھی اسی قرض کے لین دین سے تعلق ہے۔ جس کی اطلاع آج تک اتنی شرحیں لکھنے والوں میں سے کسی کو نہیں۔

خاں صاحب: بھئی یہ بات تو آپ نے عجیب بتائی۔

میر صاحب: اجی صاحب! اس شعر کے دیکھیے تو ایک بہت بڑی تلمیح ہے جو سوائے ہمارے خاندان والوں کے کسی کو نہیں معلوم۔

خاں صاحب: ارے بھئی ہم بھی تو سنیں؟

میر صاحب: جناب ہوا یہ کہ مرزا صاحب یوں ہی تھا سبھوں سے قرض لے لیا کرتے تھے۔ لیکن ان سے ایک مرتبہ غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے دلی کے یار محمد خاں مغلیے سے بھی قرض لے لیا اور یہ مغلیہ بلا کا بگٹ تھا اور کسی بدمعاشی میں بند نہ تھا۔ چنانچہ اس نے مرزا صاحب سے بار بار قرضے کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور جب وہ نہ دے سکے تو ایک دن جب مرزا صاحب حوض قاضی کے پاس سے گذر رہے تھے تو اس نے مرزا صاحب کو آدھرا۔ اور سر راہ ان سے ہاتھا پائی کر کے ان کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس پر ایک خلقت جمع ہو گئی۔ اتفاق سے اسی درمیان میں مرزا صاحب کی ڈومنی بازار سیتارام سے کتر دار تری خرید نے نکلی تھی۔ اس نے جو مجمع لگا دیکھا تو چیرتی پھاڑتی اندر پہنچ گئی اور دیکھا کہ وہ مردود مغلیہ مرزا صاحب کے سینے پر سوار ہے۔ جب مرزا صاحب کی نظر اس پر پڑی تو چونکہ طبیعت ہر حال میں موزوں رہتی تھی، انھوں نے فی البدیہہ ڈومنی کو مخاطب ہو کر کہا:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

مطلب یہ کہ غالب تو ان کا تخلص تھا مگر اس وقت مغلیہ ان پر غالب تھا اس لئے مغلوب ہونے کی صورت میں انھوں نے ڈومنی سے کہا کہ ان حالات میں بتاؤ ہم کیا کہیں

خاں صاحب: (قہقہہ لگا کر) بھئی بات تو پتے کی کہی اور مرزا صاحب کچھ ایسے ادب میں تھے کہ اپنے کو غالب بھی نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ اس وقت دنیا کسی قیمت پر ان کو غالب ماننے کے لئے تیار نہ ہوتی۔

واللہ میر صاحب! یہ تلمیح تو کسی کے باپ کو بھی نہیں معلوم ہوگی۔ وہ چاہے ایک نہیں ہزار صد سالہ برسی منائیں۔

میر صاحب: اجی صاحب یہی تو میں کہتا ہوں کہ یہ تمام حضرات جو اپنے آپ کو "غالبیات" کا ماہر سمجھتے ہیں وہ ابھی غالب کی تحقیقات کے سلسلے میں برسہا برس ہمارے خاندان والوں کے آگے پانی بھریں۔

خاں صاحب: مگر میر صاحب آپ کی دادی سے ایک چوک ہو گئی۔ کاش انھوں نے دلی سے واپسی پر مرزا صاحب سے یہ پوچھا ہوتا کہ خدائے سخن میر تقی میر صاحب کس وضع قطع کے تھے؟

میر صاحب: ارے صاحب پوچھا کیوں نہیں مرزا صاحب بتاتے تھے کہ جسمانی اعتبار سے میر صاحب بالکل سینک سلائی تھے اور چہرے پر محبت کے مارے ہوؤں پر جو افسردگی برستی ہے وہی افسردگی ان کے چہرے پر برستی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد باتیں کرتے کرتے غنودگی سی طاری ہو جاتی تھی۔

خاں صاحب: یعنی اپنی محبوبہ کو یاد کر کے غوطہ میں پڑ جاتے ہوں گے؟

میر صاحب: ہاں خاں صاحب! محبت کی نہ پوچھئے۔ اس کے ہاتھوں کیسے کیسے جوان رعنا مجنوں، فرہاد اور وامق جیسے ہلاک ہوئے ہیں ہے ہے!

خاں صاحب: ائے! وہ تو کہئے کچھ عرصہ جنون طاری رہا اور کائنات عالم کی ہر چیز میں ان کو محبوبہ نظر آتی رہی، ورنہ ان کے بھی تیشہ مار لینے میں کون سی کسر باقی تھی۔ جہاں فرہاد نے مار لیا تھا وہاں ان سے کیا بعید تھا سچ ہے میر صاحب ؎ عشق ازیں بسیار کردست و کند

میر صاحب: ان حالات میں میرا تو خیال ہے کہ میر صاحب زندگی بھر

(بقیہ صفحہ ۱۳۳ پر)

مرزا غالب کا واقعۂ اسیری

امیر حسن نورانی

مرزا غالب کی اسیری کا واقعہ اس لیے اہم سمجھا جاتا ہے کہ وہ اردو فارسی دونوں زبانوں کے بلند پایہ ادیب اور ممتاز شاعر تھے، لیکن اہمیت کا یہ سبب خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ دنیا کی بہت سی زبانوں کے بعض بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے قید و بند کے مصائب جھیلے ہیں، یہ ضرور ہے کہ قید کے اسباب اپنی نوعیتیں مختلف ہیں، غالب کو جس سبب سے اسیر ہونا پڑا وہ نہ باعثِ تعجب ہے نہ خلافِ توقع، ایسا بلند مرتبہ شاعر جس جرم کا مرتکب ہوا، اس کی مثال کم ملے گی۔ غالب کو قمار بازی کے شوق نے برا دن دکھایا اور ان کو اپنے اعزا اور احباب کے سامنے رسوائی کا منھ دیکھنا پڑا، اسی لیے ابتدا میں اس واقعہ کی پردہ پوشی کی کوشش کی گئی۔ غالب اگر اخلاقی اقدار کی حمایت و حفاظت یا قوم و ملک کی اصلاح و بیداری کی خاطر قید ہوتے تو، بہ حیثیت ایک انسان کے ان کا مرتبہ اتنا ہی اونچا ہوتا جتنا شاعر کی حیثیت سے ہے۔ لیکن انھوں نے ایک سماجی اور اخلاقی جرم کا ارتکاب عمداً کیا تھا۔ غالب کو بچپن ہی سے شطرنج اور چوسر کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا، چچا نے یتیم بھتیجے کو ناز و نعم میں پالا مگر جلد ہی غالب ان کے ظلِ عاطفت سے بھی محروم ہو گئے۔ بچپن کا پورا زمانہ بے فکری اور ہر طرح کی آسائش میں بسر ہوا، اسی لیے ربط و ضبط بھی بے فکرے امیر زادوں سے رہا، جس کی بدولت ان میں بے راہ روی پیدا ہو گئی، جس کا اثر کسی نہ کسی صورت میں زندگی بھر باقی رہا۔

مولانا حالی، غالب کے پہلے سوانح نگار ہیں، ان کو اپنے استاد سے گہری عقیدت تھی، اس لیے جب انھوں نے یادگارِ غالب میں قید کا واقعہ لکھا تو اس میں غالب کو بے خطا ثابت کرنے کا انداز اختیار کیا اور قید کا سبب کوتوال شہر کی مخالفت قرار دیا ان کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے:

" غالب کو چوسر اور شطرنج کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اور برائے نام بازی بد کر کھیلتے تھے، کوتوال دشمن تھا۔[1] اس نے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا۔ مجسٹریٹ ان کی حیثیت اور مرتبہ سے ناواقف تھا اس نے چھ ماہ قید کی سزا دے دی۔ سشن میں اپیل کی گئی، جج اگرچہ غالب کا دوست تھا لیکن اس نے بھی تغافل برتا اور سزا بحال رکھی، صدر میں اپیل کی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ تین ماہ گزرنے کے بعد مجسٹریٹ نے خود ہی رہائی کے لیے رپورٹ صدر میں بھیج دی اور غالب رہا ہو گئے۔"[2]

حالی نے غالب کے جرم کی نوعیت کچھ اس انداز میں بیان کی ہے کہ گویا یہ ایک معمولی واقعہ تھا، کوئی خاص بات نہ تھی، اور غالب محض تفریح کے لیے شطرنج اور چوسر کھیلتے تھے، برائے نام بازی بد لیا کرتے تھے۔ حالاں کہ ایسا نہ تھا۔ اصل حقیقت کا اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کی اس تحریر سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے حالی کی رنگ آمیزی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ:

"غالب کی قید کے متعلق حالی کا بیان خلافِ حقیقت ہے۔ وہ سوانح نگاری کو مدحت طرازی سمجھتے تھے اور کوئی ناخوش گوار واقعہ لکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ حالی نے یہ واقعہ رنگ آمیزی سے بیان کیا ہے گویا کوئی بات نہ تھی محض چوسر و شطرنج کے شوق میں بازی بد لیا کرتے تھے اور کوتوال دشمن تھا

---

[1] سید ناصر نذیر فراق نے لکھا ہے کہ دہلی کے مجسٹریٹ کنور زور دار علی خاں تھے جو ضلع بلند شہر کے ایک تعلقدار اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے معتمد تھے اور میرٹھ سے بدل کر دلی آئے تھے (غالب، از غلام رسول مہر)۔ [2] یادگارِ غالب ص ۲۶ مطبوعہ لاہور۔

اس لیے قمار بازی کا مقدمہ قائم کر دیا۔ حالاں کہ اصلیت اس کے خلاف ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا قمار بازی کا معاملہ تھا۔ بہ قول نواب امیرالدین مرحوم مرزا نے اپنے مکان کو جوئے بازی کا اڈا بنا رکھا تھا۔ . . . . غالب کا وظیفہ جو قلعہ سے ملتا تھا پچاس روپیہ تھا۔ اور پنشن کی رقم اور تھی (غالباً ساٹھ روپیہ) زندگی امیرانہ بسر کرتے تھے، آمدنی کم تھی، مقروض اور پریشان رہتے تھے اس زمانہ میں دہلی کے بے فکروں اور چاندنی چوک کے جوہری بچوں نے گذرانِ وقت کا شغلہ قمار بازی ٹھیرا لیا تھا۔ شہر کے کئی دیوان خانوں میں جواریوں کی نشستیں تھیں، مرزا بھی شوقین تھے، رفتہ رفتہ ان کا گھر بھی اڈا بنا کیوں کہ جس کے گھر میں قمار خانہ ہوتا تھا اس کو کچھ فی صدی جیتنے والوں سے ملتا تھا۔ مرزا صاحب مجلس ہوتے اور بلا محنت خاصی رقم وصول ہونے لگی اس کے علاوہ خود اچھے کھلاڑی تھے اس لیے کچھ اور بھی کما لیتے تھے[1]

اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو جوا کھیلنے کی عادت پڑ گئی تھی، اور حصول زر کی خاطر انھوں نے اپنے مکان کو جواریوں کا اڈا بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے جوا کھیلنا ایک اخلاقی و سماجی جرم بھی ہے اور اپنی مضرت کے باعث اس کو قانونی جرم بھی قرار دیا جاتا ہے۔ انگریزی قانون میں بھی قمار بازی جرم قرار پائی تھی۔ غالب دلی کے معزز شہریوں میں شمار ہوتے تھے، انگریزی حکام سے بھی ان کے تعلقات اچھے تھے، قلعہ معلیٰ میں بھی رسائی تھی، اس لیے حکام شہر کو عرصہ تک ان پر کسی قسم کا شبہ نہ ہوا، کسی کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ غالب جیسا آدمی بھی جواریوں کے زمرہ میں باقاعدہ شامل ہو سکتا ہے، اکثر کوتوالِ شہر ایسے رہے جن سے غالب کے تعلقات تھے، اس لیے نہ ان پر کسی قسم کا شبہ کیا گیا نہ کسی کارروائی کا خوف ہوا، عرصہ تک دہلی کے کوتوال مرزا خانی[2] رہے جو خود فارسی کے شاعر تھے اور قتیل کے شاگرد تھے، غالب سے ان کے اچھے تعلقات تھے، لیکن ۱۸۴۵ء میں ایک نیا کوتوال دلی آیا۔ وہ نہ شاعر تھا نہ شاعر نواز، اس لیے غالب سے اس کے تعلقات بالکل نہ تھے، یہ کوتوال آگرہ سے تبدیل ہو کر آیا تھا۔ اور اس نے انسداد قمار بازی کی مہم باقاعدہ چلائی تھی۔

خواجہ حسن نظامی نے اپنی مشہور کتاب "دھلی کا آخری سانس"[3] میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں حکام انگریزی کی توجہ انسداد قمار بازی کی طرف زیادہ تھی کیونکہ یہ وبا بہت پھیل گئی تھی۔ خواجہ صاحب نے قمار بازوں کی گرفتاری اور ان کی سزایابی کے بہت سے واقعات بھی لکھے ہیں۔ غالب کی گرفتاری اور مقدمہ کا ذکر سب سے پہلے ۲۵ رجون ۱۸۴۷ء کے حالات میں اس طرح آیا ہے:

> مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں قید کیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر ریزیڈنٹ کے نام سفارشی چٹھی (بہادر شاہ ظفر کی طرف سے) لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ یہ معززین شہر میں سے ہیں اور جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے، عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر (ریزیڈنٹ) نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے، ایسی حالت میں قانون سفارش کرانے کی اجازت نہیں دیتا[3]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب ۲۵ رجون ۱۸۴۷ء سے چند دن قبل گرفتار ہوئے تھے، اور یہ کہ بہادر شاہ ظفر اور ان کے بعض مصاحبین کا بھی یہ خیال تھا کہ غالب قمار بازی کے جرم میں غلط ماخوذ ہوئے ہیں، یہ گرفتاری ان کے مخالفوں اور حاسدوں کی غلط اطلاعات کے باعث عمل میں آئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غالب کے جوا کھیلنے کا حال بادشاہ کو نہ معلوم ہو اور وہ تمام حالات سے بے خبر ہوں، یا پھر اس کا بھی امکان ہے کہ غالب کے عیبوں کی پردہ پوشی اور رسوائی سے بچانے کی خاطر ان کو بے گناہ ثابت کیا ہو۔

ان حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب پر قید و بند کی یہ مصیبت خود

---

[1] یہ بیان نواب امیرالدین خان کا ہے، جن سے مولانا ابوالکلام آزاد نے سنا تھا، نواب صاحب نے غالب کے حالات بچشم خود دیکھے تھے اور تمام باتوں سے واقف تھے، مولانا آزاد کی یہ تفصیلی تحریر غلام رسول مہر کی کتاب "غالب" میں نقل کی گئی ہے۔ (غالب از مہر مطبوعہ مبارک علی لاہور)

[2] مرزا خانی، مرزا محمد عسکری لکھنوی کے دادا تھے، جیسا کہ مرزا عسکری (مترجم تاریخ ادب اردو) نے اپنی مختصر کتاب 'غالب کی شاعری' میں لکھا ہے۔ [3] یہ کتاب حسن الاخبار فارسی کے مضامین کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۵۷ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ [3] دہلی کا آخری سانس صفحہ ۱۷۱ مطبوعہ دہلی

ان کی اپنی لائی ہوئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ قماربازی جرم ہے، مگر اطمینان یہ تھا کہ وہ ایک معزز شہری ہیں، حکام رس ہیں۔ ان پر اول تو کسی کو شبہ بھی نہ ہوگا اور ہوا تو ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوگی۔ اس خیال میں وہ انجام سے بے خبر رہے، اور آخر کار وہ انہونی ہو کر رہی جس کے متعلق ان کے احساسات کا پتہ دس دسمبر ۱۸۴۷ء کے ایک خط کی عبارت سے چلتا ہے جو ہرگوپال تفتہ کے نام لکھا تھا:

"سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا اور پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔" (مکاتیب غالب خطوط بنام تفتہ)

مولانا الطاف حسین حالی کے بیان کے مطابق غالب کے تاثرات قید سے رہائی کے بعد یہ تھے۔

"اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑ نہیں سکتا، جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو، خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانۂ رحمۃ اللعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو اپنی گرفتاری اور سزایابی پر بے حد رنج و ملال تھا اور وہ شرمندگی و ندامت کا اپنے سر پر ایک بڑا بوجھ محسوس کرتے تھے۔ ظاہر ہے ایک شریف و غیرت مند انسان کے لیے یہ بڑی ذلت کی بات ہے کہ وہ ایک مخرب اخلاق اور سماجی قدروں کی بیخ کنی کرنے والے جرم کا ارتکاب کرے اور دنیا پر اس کا یہ غیر پسندیدہ فعل ظاہر ہو جائے۔ پھر غالب علاوہ معزز شہری ہونے کے بہت بڑے فن کار تھے، ان کی شاعری کی ملک میں شہرت ہو چکی تھی۔ اس لیے بدنامی کا یہ داغ درحقیقت ایک گہرا زخم تھا جس نے ان کو عرصے تک درد و کرب میں مبتلا رکھا ہوگا۔ انہیں پریشان حالی میں ان کو خدا بھی یاد آیا اور مکہ و مدینہ پہنچنے کی آرزو بھی دل میں انگڑائیاں لینے لگی۔ جب تاریخ بتوں نے تو خدا یاد آیا۔

غالب کی گرفتاری اور سزایابی کا ذکر زبانوں پر تو رہا لیکن کسی نے باقاعدہ قلم بند نہیں کیا۔ خود غالب نے بعض خطوں میں کچھ ذکر کیا ہے۔ ایک فارسی خط میں ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس خط کا مضمون حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے مگر اصل فارسی خط کا کوئی پتہ نہیں چلتا نہ وہ شایع ہوا ہے، ممکن ہے کسی کو دستیاب ہوا ہو۔ البتہ اس زمانے کے بعض اخبارات میں مرزا کی سزایابی کی خبر شایع ہوئی تھی۔ چنانچہ ۱۸۴۷ء کے حالات میں احسن الاخبار (فارسی) نے مقدمہ اور سزایابی کا حال اس طرح شایع کیا تھا:

"مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا اس کا فیصلہ سنا دیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ نہ ادا کریں تو چھ ماہ قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپیہ زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو جائے گی۔"[2]

سب سے پہلی کتاب جس میں غالب کی گرفتاری اور قید کا ذکر کیا گیا وہ یادگار غالب ہے۔ غالب کی گرفتاری کے سلسلے میں نواب سر امیر الدین (مرحوم) سے مولانا ابو الکلام آزاد نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کو مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالب میں تفصیل سے لکھا ہے۔ امیر الدین مرحوم ان واقعات کو دیکھنے والوں میں تھے اس لیے ان کا بیان زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے۔ ان کے بیان کی روشنی میں واقعہ گرفتاری اس طرح ہے کہ غالب کے مکان پر قماربازی کا باقاعدہ اڈا بن گیا تھا، ان کے اعزا و احباب نے کئی بار ان کو فہمائش کی کہ اس سلسلے کو ختم کر دیں لیکن غالب نے کسی کی بات نہ مانی اور قمارخانہ آباد رہا۔ ایک دن جب محفل قماربازی گرم تھی اور روپیہ کی ڈھیریاں چنی ہوئی تھیں اچانک کوتوال جا پہنچا اور دروازے پر دستک دی، اور لوگ تتر بتر ہو گئے اور مکان کے پچھواڑے سے بھاگ نکلے اور مرزا غالب ننگے ہاتھوں دھر لیے گئے۔ اس سے قبل چند جوہری پکڑے گئے تھے مگر وہ روپیہ دے دلا کر بچ گئے، مقدمہ چلنے کی نوبت آئی، غالب کے پاس دینے کے لیے روپیہ نہیں تھا اس لیے مقدمہ چلا۔ اعزا و احباب نے سفارشیں کیں بادشاہ نے بھی سفارش کی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا اور غالب کو سزا ہو گئی۔ کوتوال سخت تھا۔ حکام اعلیٰ پر اس کا اثر تھا اور اس نے اس بات کو منوا لیا تھا کہ اس کے کاموں میں سفارشوں سے مداخلت نہ کی جائے گی۔[3]

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۹۰ و ۹۱ مطبوعہ مبارک علی لاہور [2] دہلی کا آخری سانس صفحہ ۱۰۳ مطبوعہ دہلی۔ [3] ماخوذ از غالب مرتبہ غلام رسول مہر مطبوعہ لاہور

غالب کے لیے یہ سزا بہت سخت تھی، ان کے احباب و اعزا کا خیال تھا کہ چونکہ ان کی صحت خراب ہے اس لیے اتنی سخت سزا برداشت نہ کر سکیں گے، مگر غالب نے اس مصیبت کو چار و ناچار برداشت کیا۔ تین ماہ جیل میں رہے۔ پچاس روپیہ ادا کر کے مشقت سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا، اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسو روپیہ جرمانہ بھی ادا کر دیا ہوگا۔ حالی نے قید کے حالات پر جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیل خانے میں ان کو کسی قسم کی مشقت نہیں کرنی پڑتی تھی، کھانا اور کپڑے گھر سے جاتے تھے، لکھتے ہیں:

یہ واقعہ مرزا پر نہایت شاق گذرا تھا، اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو اُن کو قید خانے میں گزرے ان کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی وہ بالکل قید خانے میں اسی آرام سے رہے، جیسے گھر پر رہتے تھے، کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسب دل خواہ گھر سے ان کو پہنچتی تھیں، ان کے دوست ان سے ملنے جاتے تھے اور وہ صرف بطور نظر بندوں کے جیل خانے کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے، مگر چونکہ اس وقت تک شہر کے شرفا و اعیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ اس کو بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے[1]

حالی کا یہ بیان یا تو سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے یا محض غالب سے خوش عقیدگی کے باعث ہے، کیونکہ جیل خانے میں گھر جیسا آرام ممکن نہ تھا۔ قید میں غالب کو جو تکلیفیں ہوئیں ان کا اظہار اس حبسیہ نظم سے ہی ہوتا ہے جو انھوں نے قید کے حالات سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ دوست احباب نے آنکھیں پھیر لی تھیں کوئی خبر لینے والا نہ تھا اعزا و اقربا سے اپنا تعلق ظاہر کرنا بھی باعث بدنامی سمجھنے لگے تھے۔ پھر جیل خانے میں ان سے ملنے کون جاتا ہوگا۔ اگر دوست اور اقارب ان کی خبر گیری کرتے تو غالب ان کا ذکر ضرور کرتے بخلاف اس کے انھوں نے خود حبسیہ نظم میں دوستوں کا گلہ کیا ہے اور صرف نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی تعریف کی ہے کہ انھوں نے ہر قسم کی ممکن خبر گیری کی۔

خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسش وے / پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی
مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غم خوار من است / گر بہ میرم چہ غم از مرگ عزادار من است

عجیب بات یہ ہے کہ مولانا حالی نے یادگار غالب میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تردید ان کے اس زبانی بیان سے ہوتی ہے جو انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے سامنے ان کے استفسار پر دیا تھا اور جسے غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالب میں اس طرح نقل کیا ہے:

اس سلسلے میں واقعہ کا ایک پہلو نہایت عبرت انگیز ہے۔ جس کی تفصیلات مجھے خواجہ حالی مرحوم سے معلوم ہوئیں، جونہی مرزا گرفتار ہوئے اور رہائی کی طرف سے مایوسی ہو گئی، نہ صرف دوستوں اور جلیسوں نے بلکہ عزیزوں نے بھی یک قلم آنکھیں پھیر لیں اور اس بات میں شرمندگی محسوس کرنے لگے کہ مرزا کے عزیز قریب تصور کیے جائیں۔ اس باب میں لوہارو خاندان کا جو طرز عمل رہا وہ نہایت افسوس ناک تھا۔ میں نے نواب امیرالدین مرحوم سے اشارۃً تذکرہ کر کے ٹٹولنا چاہا تو ان کے جوابات سے بھی اس کی پوری تصدیق ہو گئی[2]

اس بیان سے خود غالب کے ان اشارات کی بھی تصدیق ہوتی ہے جو انھوں نے حبسیہ ترکیب بند میں دوستوں اور عزیزوں کی بے مہری کے متعلق کیے ہیں مثلاً دوستوں کو مخاطب کیا ہے کہ،

روزے از مہر نہ گفتید فلانے چون است / بارے از لطف بگوئید جہا یند ہمہ

قید سے رہائی

مرزا غالب آخر ماہ جون ۱۸۴۷ء کو گرفتار ہوئے تھے، اور ان کو چھ ماہ قید کی سزا ہوئی تھی لیکن تین ماہ کی سزا پوری ہونے پر رہا کر دیے گئے۔ مجسٹریٹ نے خود ہی رہائی کی رپورٹ صدر میں پیش کر دی تھی، غالباً اس کے لیے ان کو حکام بالا سے اشارہ ملا ہوگا۔ رہائی قید کی تاریخوں کے حساب سے آخر ماہ ستمبر ۱۸۴۷ء کو عمل میں آئی۔ عید الفطر جیل میں ہوئی اور عید الاضحیٰ سے چند دن قبل رہا ہوئے۔ قید کی سزا کے زمانے میں غالب کی عمر تقریباً باون سال تھی تذکرہ نگاروں نے اسیری کے حالات مختلف انداز میں معمولی طور پر لکھے ہیں، ان بیانات میں تضاد ہے۔ مولوی کریم الدین نے تذکرہ شعرائے اردو میں جو اسی سال لکھا تھا جس سال غالب قید ہوئے تھے، صرف یہ لکھا ہے کہ

ان ایام میں یعنی درمیان ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ ان پر جانب سرکار سے پڑا جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق حاصل ہوا، عمر ان کی اس سال قریب ساٹھ کے ہو گی[3]

[1] یادگار غالب صفحہ ۲۰ مطبوعہ لاہور [2] غالب از غلام رسول مہر صفحہ ۲۶۸ و ۱۸۰۔ مطبوعہ لاہور [3] تذکرۂ شعرائے اردو مطبوعہ مطبع العلوم دہلی صفحہ [illegible]

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں قید کا سبب نہیں لکھا صرف یہ لکھا کہ

حضرت یوسفؑ کی طرح مرزا صاحب کو بھی چند روز قید میں رہنا پڑا۔[1]

مرزا حیرت دہلوی نے چراغ دہلی[2] میں لکھا ہے:

ایک مرتبہ مرزا صاحب قمار بازی کی علت میں گرفتار ہو گئے تھے۔[3]

حیرت ہوتی ہے کہ کریم الدین اور آزاد غالب کے ہم عصر تھے، تمام حالات سے ان کا باخبر ہونا یقینی ہے، لیکن واقعہ اسیری کو چند جملوں میں سرسری طور پر بیان کر کے آگے بڑھ گئے، گویا اس واقعہ میں کوئی اہمیت نہ تھی، یا پھر جان بوجھ کر اس تلخ واقعہ کو بیان کرنے سے گریز کیا ہے، ممکن ہے غالب کی عیب پوشی مقصود ہو، مگر یہ ایک عظیم فن کار کی زندگی کا اہم ترین واقعہ تھا اس کو نظر انداز کرنا ایک ادبی اور تاریخی جرم تھا۔ اور ان تذکرہ نگاروں کے چھپانے یا اہمیت نہ دینے سے نہ تو اصل واقعہ چھپ سکا نہ اس کی اہمیت کم ہوئی۔ خود مرزا غالب نے اپنی حبسیہ نظم میں سب کچھ ظاہر کر دیا۔ اس نظم کی اشاعت میں بھی غالب کے احباب اعزا نے رکاوٹ ڈالی تھی۔ کلیات کے دوسرے ایڈیشن میں بھی شامل نہ ہونے دیا۔ اس کے بعد سبد چین کے نام سے جو انتخاب غالب نے شایع کرایا اس میں یہ ترکیب بند شامل کر دیا تھا۔

حبسیہ نظم (ترکیب بند)

غالب نے عہد اسیری میں ایک ترکیب بند فارسی میں لکھا تھا جو ان کے فارسی کلام میں ایک شاہکار نظم کی حیثیت رکھتا ہے، اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر غالب قید نہ ہوتے تو ادبی دنیا اس بے مثل نظم سے محروم رہ جاتی جس کا ہر شعر درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے اور شاعر کے غم زدہ دل کی آہوں کا پرتو ہے۔ اس نظم میں گرفتاری اور قید خانہ میں پیش آنے والے حالات کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ ترکیب بند کا پہلا شعر یہ ہے،

خواہم از بندہ بہ زندان سخن آغاز کنم　　غم دل بردہ دری کرد فغان ساز کنم

میں چاہتا ہوں کہ قید خانے میں اپنی قید کا حال بیان کرنا شروع کروں۔ دل کا غم قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ اب فریاد کرتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ راگ چھیڑتا ہوں۔

ذیل میں چند ایسے اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن میں کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے یا جن سے قید کی حالت میں مرزا غالب کے مختلف حالات و کیفیات پر روشنی پڑتی ہے۔

قید میں غالب کو کوئی مشقت نہیں کرنا پڑتی تھی، ان کا مشغلہ شعر گوئی کے سوا کچھ اور نہ تھا، انھوں نے اس کو بھی اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے اور شعر گوئی کو مشقت سے تعبیر کیا ہے

بے مشقت نبود قید، بہ شعر آویزم　　روز کے چند رسن بافی آوازکنم

قید بغیر مشقت کے نہیں ہوتی ہے، اس لیے مناسب ہے کہ یہاں شعر کہوں کہوں اور چند روز آواز کی رسی بٹوں" (اس زمانے میں قیدیوں سے بطور مشقت رسی بٹنے کا کام بھی لیا جاتا تھا)۔

قید خانے میں داخل ہوتے وقت ان پر جو کچھ گزری اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے، اور اس کا پتہ بھی چلتا ہے کہ شاید جیل جاتے وقت ان کے گرد کافی مجمع ہو گیا تھا:

پاسبانان ہم آیند کہ من می آیم　　در زندان بگشائید کہ من می آیم

پہرہ دارو، مجھے لے چلنے کے لیے اکٹھے ہو جاؤ، قید خانے کا دروازہ کھول دو کہ میں اس کے اندر داخل ہوتا ہوں۔

جادہ نشناسم و از انبوہ شما می ترسم　　راہم از دور نمائید کہ من می آیم

مجھے قید خانے کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ مگر میں تمھارے ہجوم سے ڈرتا ہوں، دور سے مجھے راستہ بتا دو میں خود ہی آیا جاتا ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیل خانے جاتے ہوئے سپاہیوں نے کچھ سختی کا برتاؤ کیا تھا، فرماتے ہیں

رہرو جادۂ تسلیم درشتی نکند　　سخت گیرندہ چرا ئید کہ من می آیم

راہ تسلیم و رضا کا رہرو کسی کے ساتھ مزاحمت نہیں کرتا تم سختی کیوں کرتے ہو میں خود قید خانے میں چل رہا ہوں۔

حالی نے لکھا ہے کہ غالب کو علیحدہ ایک کمرہ جیل خانے میں رہنے کو ملا تھا۔ غالب نے خود اس کا حال اس طرح بیان کیا ہے

لرزم از خوف درین حجرہ کہ از خشت و گل است　　ورنہ در دل خطرہ از کام نہنگم نبود

میں اینٹ گارے کی بنی ہوئی اس کوٹھری میں خوف سے کانپتا ہوں، ویسے مجھے گھڑیال کے منہ میں جانے سے بھی خوف نہیں کھاتا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوٹھری کے دروازے پر دو سنتری برابر پہرہ دیتے تھے

---

[1] آب حیات حالات غالب مطبوعہ لاہور [2] چراغ دہلی صفحہ ۳۲ مطبوعہ دہلی

زیں دو سرہنگ کہ بویند بہم می ترسم ہیچے از شیر و ہراسے ز پلنگم نبود

یہ دو سنتری جو ساتھ ساتھ (کوٹھری کے باہر) پہرے کے لیے گشت کرتے ہیں میں ان سے خوف کھاتا ہوں، ویسے تو مجھے شیر اور چیتے سے بھی ڈر نہیں لگتا۔

رات میں غالب کی کوٹھری کے باہر چراغ جلتا تھا اور اندر اندھیرا رہتا تھا۔

تا چہانم گزرد روز بہ شبہا دریاب از چراغے کہ عسس بر سرِ زندانم سوخت

غور کیجیے مری راتیں (ان دنوں) کس طرح گزر رہی ہیں، صرف اس چراغ کی روشنی میسر ہے جو درِ زندان پر پہرے والا روشن کر دیتا ہے۔

آہ ازیں خانہ کہ روشن نشود در شب تار جز بدان خواب کہ در چشم نگہبان سوزد

افسوس اس گھر کے اندر اندھیری میں چراغ تو جلایا نہیں جاتا، ہاں، پہرہ دار کی آنکھ میں نیند جلتی رہتی ہے۔ یعنی پہرے والے ساری رات جاگتے رہتے ہیں۔

قید خانے کی اس کوٹھری میں ہوا بھی صاف نہیں پہنچتی تھی ورنہ غالب یہ نہ کہتے

آہ ازیں خانہ کہ در وے نتواں یافت ہوا جز سموے کہ خس و خار بیاباں سوزد

افسوس اس گھر میں ہوا کا نام بھی نہیں سوا اس گرم ہوا کے جو بیابان کے خس و خار کو بھی جلا کر رکھ دے۔ (غالب جون میں قید ہوئے تھے اور یہ موسم لو چلنے کا تھا) جیل کی تاریک کوٹھری سے پریشان ہو کر کہتے ہیں۔

اے کہ در زاویہ شبہا بہ چراغم شمری دلم از سینہ بروں آر کہ داغم شمری

تم یہ خیال کرتے ہوگے کہ اس گوشۂ تنہائی میں رات کو میرے پاس چراغ ہوگا (ایسا نہیں ہے اس لیے) مرے دل کو سینے سے نکال کر دیکھو تاکہ میرے داغوں کو شمار کر سکو۔

مولانا حالی نے لکھا ہے کہ جیل میں غالب کے لباس اور کھانا گھر سے بھیجا جاتا تھا، مگر خود غالب کے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے

شادم از بند کہ از بند معاشش آزادم از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

میں قید میں اس لیے خوش ہوں کہ فکرِ معاش سے آزادی حاصل ہو گئی ہے، روٹی اور کپڑا مجھے جیل خانے کے داروغہ کے ہاتھوں ملتا ہے۔

جیل میں ان کو بہت تکلیف تھی جس کا اندازہ خود ان کے اشعار سے ہوتا ہے۔ نیند بھی نہیں آتی تھی اور بے چین رہتے تھے۔ کتنے انوکھے انداز میں کہتے ہیں:

آمہ و جامہ بیارید و سجل بنویسید خواب از بختِ ہمی وام ستانم در بند

قلم دوات لاؤ اور دستاویز لکھو میں اس قید خانے میں اپنے سوئے ہوئے نصیبہ سے نیند بطور قرض لینا چاہتا ہوں۔

غالب نے اپنے احباب و اعزا کی بے مہری پر ایک نئے ڈھنگ سے طنز کیا ہے اور ساتھ میں دہلی والوں پر بھی چوٹ ہے۔

اہلِ زندان بہ سرِ چشم خودم جا دادند تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم

قیدیوں نے مجھے اپنے سر آنکھوں پر بٹھایا، اس صدر نشینی پر کہاں تک ناز کروں۔

ہلہ دزدانِ گرفتار وفا نیست بہ شہر خو نیتی برا پہ شما ہمدم و ہمراز کنم

اے چوری کے الزام میں گرفتار ہونے والو اس شہر (دہلی) میں وفاداری غنقا ہے اب میں تمھارا دوست اور ہمراز بنتا ہوں، (کیونکہ تم میں وفاداری اور رازداری کی صفات موجود ہیں جو میرے احباب و اعزا اور دوسرے دہلی کے لوگوں میں نہیں)

غالب ندامت کے باعث نہیں چاہتے تھے کہ قید خانے میں ان سے کوئی ملنے آئے کہتے ہیں

نہ پسندم کہ کس آید، نتوانم کہ روم جانب در بہ حسرت نگرانم در بند

میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے پاس آئے اور خود میں بھی کہیں جا نہیں سکتا بڑی حسرت کے ساتھ دروازے کو تکتا ہوں۔

یارِ دیرینہ قدم رنجہ مفرما کاینجا آن نہ گنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم

میرے پرانے دوستو! یہاں آنے کی زحمت نہ کرو مجھے یہاں اتنی اجازت بھی نہیں کہ تم دروازہ کھٹکھٹاؤ اور میں اٹھ کر کھول سکوں۔

غالب کے ان اشعار سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان سے ملنے قید خانہ میں کوئی نہیں جاتا تھا اور نہ وہ کسی کا آنا پسند کرتے تھے ان کو قید سے زیادہ اپنی رسوائی اور احباب کے طعن و طنز کا غم تھا۔

ہمدماں دارم امید رہائی در بند دامن از بعد رہائی تہ سنگم نبود

جورِ اعدا رود از دل بہ رہائی لیکن طعنِ احباب کم از زخمِ خدنگم نبود

اے میرے ہمدم قید سے رہائی کے بعد اگر میرا ہاتھ پتھر تلے نہ ہے تو البتہ قید خانے میں رہائی کی امید رکھتا (ورنہ ایسا نہ ہو کہ رہائی کے بعد بھی مقید رہوں)۔

دشمنوں کے ظلم و ستم کا خیال تو رہائی کے بعد دل سے نکل سکتا ہے مگر دوستوں کے طعن و طنز تیر کے زخم سے کم نہ ہوں گے۔

راز دانا! غمِ رسوائی جاوید بلاست ورنہ آزار غم از قید فرنگم نبود

اے میرے راز دار دوست، قید فرنگ میں جو تکالیف میں نے اٹھائی ہیں ان کا مجھے رنج نہیں ہاں عمر بھر کی ذلت و رسوائی کا غم ایک بلا ہے۔

زمانہ قید میں عام احباب کا ذکر کیا ان کے گہرے دوست بھی ان سے

ملنے نہیں گئے، انھیں کے متعلق کہتے ہیں۔

ہمدماں در دلم از دیدہ نہانند ہمہ		غالبِ غم زدہ را روح و روانند ہمہ

مرے دوستو، تمھاری یاد مرے دل میں ہے اگرچہ تم نظروں سے نہاں ہو، تم اسی طرح غالب کے لیے روح رواں ہو۔

روزے از مہر نکفتید فلانے چوں ست		بارے از لطف بگوئید چہ ایند ہمہ

ایک دن بھی تم نے محبت سے نہ پوچھا کہ فلاں شخص (غالب) کس حال میں ہے۔ خیر نہ سہی اب مہربانی کرکے یہ تو بتاؤ کہ تم سب تو اچھے ہو۔

غالب کا ایک ایک شعر درد و اثر کا نمونہ ہے، چوں کہ اس اشعار کے اس ترکیب بند کو ان کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ طوالت کے خیال سے صرف چند اشعار پیش کیے گئے۔

قید و بند کی مصیبت کے زمانہ میں جب سب عزیزوں، دوستوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں اس وقت صرف ایک علم پرور ادب نواز دوست نے غالب کی ہر طرح خبر گیری کی، اور جو ممکن ہو سکا وہ کیا۔ یہ دوست نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تھے۔ انھوں نے اس عظیم شاعر اور اپنے مخلص دوست کے ساتھ پوری ہمدردی اور تعاون کیا۔ اور ثابت کر دیا کہ ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست		در پریشاں حالی و درماندگی

غالب نے شیفتہ کی مدح میں قصیدہ بھی لکھا تھا۔ ترکیب بند میں ان کے خلوص اور محبت کا پر زور طریقہ پر اعتراف کیا ہے :

خود چرا خوں خورم از غم کہ بہ غم خواری من		رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی

خواجۂ ہست دریں شہر کہ از پرسش دے		پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفےٰ خاں کہ دریں واقعہ غم خوارِ من است		گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادارِ من است

میں اپنی قید پر خود کیوں غم کروں مری غم خواری کو خدا کی رحمت انسان کے بھیس میں آئی ہوئی ہے۔ اس شہر میں ایک ایسا سردار ہے جس کی وجہ سے میں نے اپنے مرتبہ کو پہچانا۔ یعنی میں بھی ایسی ہستی ہوں جس کی خبر گیری ایسی زبردست ہستی کر رہی ہے۔ چوں کہ مصطفےٰ خاں مری غم خواری فرما رہے ہیں اب میں مر بھی جاؤں تو غم نہیں کہ میرا عزادار موجود ہے۔

مصطفیٰ خاں شیفتہ نے غالب کے ساتھ حسن سلوک کر کے اپنے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دیا۔ آج غالب پر جو بھی لکھنے والا شیفتہ کا ذکر بھی ضرور کرتا ہے اور انھیں اس قدر و منزلت کا مستحق قرار دیتا ہے۔

صورت اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

غالب کے قید خانہ کے واقعات کے سلسلے میں بعض تذکروں میں کچھ ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو غیر مستند معلوم ہوتی ہیں اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں مگر چوں کہ ان کا حوالہ دیا جاتا ہے اس لیے چند واقعات کا ذکر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آب حیات میں آزاد نے لکھا ہے کہ جب مرزا صاحب جیل میں تھے تو ان کے کپڑوں میں جوئیں پڑ گئی تھیں اور وہ ایک دن بیٹھے ہوئے ان کو صاف کر رہے تھے کہ دہلی کے ایک معزز رئیس ان سے جیل خانہ میں ملنے گئے اس وقت غالب نے برجستہ یہ شعر پڑھا۔ ؎

ہم غم زدہ جس دن سے گرفتارِ بلا ہیں		کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

نظامی بدایونی شارح دیوان غالب نے بھی اسی واقعہ کو نقل کیا ہے، لیکن اس کی صحت مشتبہ ہے۔ غالب جیسے خاندانی رئیس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ان کے کپڑے اتنے میلے ہوتے کہ ان میں جوئیں پڑتے، پھر وہ کسی رئیس کے آنے پر اس کا اظہار کرتے۔ یہ شعر غالب کا نہیں معلوم ہوتا کسی نے تفریحاً ان کے نام منسوب کر دیا ہے، جیسا کہ مولانا غلام رسول مہر اور بعض دوسرے اہلِ تحقیق اور ماہر غالبیات نے لکھا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں یہ لکھا ہے کہ غالب جس دن جیل سے رہا ہوئے تو لباس تبدیل کیا اور جیل کا کرتہ وہیں پھاڑ کر پھینک دیا اور برجستہ یہ شعر پڑھا۔ ؎

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب		جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

اگر حالی کے قول کے مطابق مکان سے کپڑے پہنتے تو پھر جوئیں کیوں پڑتے اور چلتے وقت کرتہ نہ پھاڑنا پڑتا۔ جوئیں پڑنے والا واقعہ تو یوں بھی من گھڑت معلوم ہوتا ہے۔

مرزا غالب جس قید خانہ میں رکھے گئے تھے وہ دہلی دروازے کے باہر ہندوؤں کے قبرستان کے پاس تھا، اب اس جگہ کی تمام عمارتیں مسمار ہو چکی ہیں اور اس جگہ مولانا آزاد میڈیکل کالج کی عمارات تعمیر ہو گئی ہیں۔ پرانے جیل خانے کے پھاٹک کی تصویر اور عمارت کے بعض حصوں کی تصاویر "ارمغان غالب" غالب نمبر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں شائع ہوئی ہیں۔

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ غالب کے زمانۂ اسیری کے حالات پورے طور پر محفوظ نہیں رہے نہ کسی نے ان کو تفصیل سے لکھا۔ اس وقت کسی کو کیا اندازہ تھا کہ ایک دن جب یہ عظیم فن کار شہرت و عظمت کی انتہائی بلندیوں پر جلوہ گر ہوگا اس وقت اس کی زندگی کے ایک ایک گوشے کو روشنی میں لانے کی کوشش کی جائے گی اور ان کی زندگی کے اہم اور غیر اہم واقعات سے ان کے افکار و نظریات کو جانچا جائے گا۔

غالب کی زندگی کے اہم واقعات میں یہ واقعہ بہت نمایاں ہے، یہ ایک اخلاقی و قانونی جرم کی پاداش تھی۔ بہ قول مولانا روم۔ ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو از مکافاتِ عمل غافل مشو

غالب نے ارتکاب جرم کیا تو اس کی قانونی سزا ملی۔ لیکن ان کے شاعرانہ کمالات کو جانچنے اور پرکھنے کے وقت ایک محقق یا نقاد اس واقعہ سے شاعر کی زندگی اور اس کے کلام کے نفسیاتی پہلوؤں کا جائزہ اس عہد کے سماجی اخلاقی پس منظر میں لے گا۔

غالب کو نہ بہ قول آزاد، حضرت یوسف سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، نہ ایک صاحب کے بہ قول یوسفِ ہندی کہنا بجا ہے، نہ اس قسم کے الفاظ و القاب استعمال کر کے ان کے اخلاقی و قانونی جرم کو خوش نما بنایا جا سکتا ہے۔ غالب کی عظمت و شہرت کی بنیاد ان کے اردو فارسی کلام پر ہے اور اس کی عمارت بہت مستحکم ستونوں پر قائم ہو چکی ہے۔

مرزا غالب زندہ دلانِ لکھنؤ میں

بسلسلۂ صفحہ ۱۲۶

کہلاتے رہے ہوں گے اور میر کلو عرش جنھیں لوگ میر صاحب کی اولاد بتلاتے ہیں وہ ان کے متبنیٰ رہے ہوں گے۔

خاں صاحب: میرا بھی یہی خیال ہے کیونکہ ان حالات میں اول تو شادی بیاہ کا خیال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، دوسرے کس کی لڑکی ایسی فاقہ کشی جو میر صاحب کے سر منڈھ کر جیتی مکھی نگلنے کو تیار ہو جاتا۔ پھر جو شخص اس عاشقی معشوقی کے سلسلے میں دیوانہ رہا ہو اُسے ساری زندگی بے روزگاری کا منھ دیکھنا پڑا ہوگا اور ایسے بے روزگاروں کو لڑکی دینا تو بڑی چیز ہے، کوئی لٹیے کو کھٹیا تک دینے کو تیار نہ ہوا ہوگا۔

میر صاحب: دوسرے خاں صاحب! اس نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر کلو عرش کوئی کالے کلوٹے صاحبزادے رہے ہوں گے جو کلو کلو کہہ کر پکارے جاتے ہوں گے۔ میر صاحب نے ازراہ محبت ان کو رکھ لیا ہوگا ورنہ میر صاحب جو کہنا چاہیئے کہ نجیب الطرفین سید تھے، وہ جوانی میں کیا کچھ سُرخ و سپید نہ رہے ہوں گے۔ دوسرے مرزا صاحب جب ان سے ملے ہیں اُس وقت وہ خاصے عمر رسیدہ تھے مگر مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں بڑے طرحدار رہے تھے۔

خاں صاحب: مگر ایک بات اگر عبدالصمد صاحب چاہتے تو میر صاحب سے اور دریافت کر لیتے کہ آیا اُن کی محبوبہ خان آرزو صاحب کی لڑکی تھی یا سالی کیونکہ اس کی ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکی۔

میر صاحب: ارے صاحب! خان آرزو صاحب کی لڑکی نہ ہوتی تو وہ میر صاحب کو گھر سے نکالتے کیوں۔ چنانچہ عبدالصمد صاحب نے میر صاحب سے باتوں باتوں میں جب اس طرف اشارہ کیا کہ وہ کون محترمہ تھیں تو دادی اماں کہتی تھیں کہ میر صاحب کچھ جھینپ سے گئے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خانِ آرزو صاحب کی صاحبزادی ہی رہی ہوں گی ورنہ اگر سالی کا معاملہ ہوتا تو خانِ آرزو کو ہمزلف بنا لینے میں زیادہ پس و پیش نہ ہوتا۔

خاں صاحب: اچھا صاحب! چھوڑیے ان باتوں کو اب تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مرزا صاحب کی صد سالہ برسی منانے والے کس شان سے یہ تقریب مناتے ہیں اور کون کون سی باتیں منظر عام پر لائی جاتی ہیں۔ کلبی اب گیارہ کا عمل ہے اجازت دیجئے۔ یار زندہ صحبت باقی۔

شاغل ادیب

آبروئے فن ہے تو، عظمتِ ہنر ہے تو
شہرِ فکر و فطرت کا، اک پیامبر ہے تو
فکر کا نیا سورج، ہے ہر اک سخن تیرا
ہے غزل غزل تیری، شاہکار جدّت کا
تجرباتِ دنیا کو، شعر میں سمویا ہے
شاعری کے سانچے میں زندگی کو ڈھالا ہے
وارداتِ قلبی کا، تجھ کو ترجماں کہیے
نفسیاتِ انساں کا، ایک رازداں کہیے
بخشی کس قدر رفعت، تو نے پیار کے غم کو
لذّتِ نشاطِ غم، تجھ سے ہے ملی ہم کو
تو نے خوب چھلکائے، ساغرِ تصوّف بھی
ہے ترے تغزّل میں، اک کمالِ سرمستی
فکر کا ہر اک عنواں، تو نے کر دیا روشن
ہے سخن ترا بے شک، کائنات کا درپن
تو عظیم ہے غالبؔ، ہے عظیم فن تیرا
ہے کلام سے تیرے، سربلند اردو کا

غالب کہیے

رؤف خیر

عرفیؔ و بیدلؔ و شیرازیؔ و صائبؔ کہیے
اپنے غالبؔ کو ہر اک سمت سے غالب کہیے
لذّتِ کربِ دروں سے جو مناسب کہیے
ایک ناخن جسے ہر زخم کا طالب کہیے
ایسی آواز کہ بے گونج نہ ہونے پائے
ایسا انداز کہ ہر دل سے مخاطب کہیے
اپنا ماضی بھی رہا، حال بھی، مستقبل بھی
ہائے وہ دور، کہ ہر دور پہ غالب کہیے
ایک بے ربط سے چیخوں کے گھنے جنگل میں
ایک نغمہ کہ جسے رُوح کا طالب کہیے
چور ہر دل کا سلیقے سے پکڑ لیتا ہے
حسرتیں دل کی جو گن بے وہ محاسب کہیے
دے گیا ہے ہمیں احساس کے جلتے سائے
اُف! وہ حساس پیمبر جسے غالبؔ کہیے
خیر وہ بات جو غالبؔ کی زباں سے نکلی
سر جھکائے ہوئے ہر بات پہ غالب کہیے

بھوپال اور غالب

عبدالقوی دسنوی

پیرانہ سال غالبؔ بیکش کرے گا کیا؟
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

یہ غزل اپریل فول کے سلسلے کی کڑی سہی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے پیچھے ریاست بھوپال کی مرزا غالبؔ کو بھوپال بلانے کی خواہش کا اظہار ہے۔ یہاں ہمیشہ اہل علم اور اہل فن کو بلایا گیا اور ان کی سرپرستی کی گئی۔ چنانچہ مرزا غالبؔ کو بھی یہاں آنے کی دعوت دی گئی اور بڑی زور کوشش کی گئی کہ وہ یہاں تشریف لائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی شکست کے بعد دہلی کی سرزمین باشندگان دہلی کے لئے سرچھپانے تک کے لئے تنگ ہوگئی تھی۔ لوگ موقع پا کر دہلی چھوڑ رہے تھے اور ہندوستان کے مختلف مقامات میں پناہ حاصل کر رہے تھے۔ مرزا غالبؔ کے لئے بھی یہ زمانہ بہت ہی پریشان کن تھا جس کا اظہار ان کے خطوط اور کلام سے ہوتا ہے۔ نومبر ۱۸۵۹ء کا ایک مکتوب ملاحظہ ہو جو حکیم غلام نجف کے نام ہے،

"میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لٹا نہیں، کسی محکمے میں بلایا نہیں گیا، معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں،

"اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے، رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔"

اس سلسلے کے چند شعر بھی بڑے دردناک ہیں:

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے — گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا کن مصیبتوں کے شکار تھے اور کس قدر پریشان تھے۔ شاید انھیں حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ نے اپنے ماموں فوجدار محمد خاں کو تحفے اور نذرانے کے ساتھ دہلی بھیجا تھا اور ان کو بھوپال آنے کی دعوت دی تھی۔ سید امجد علی اشہری اپنی کتاب "ایشیائی شاعری" میں تحریر کرتے ہیں:

"مجھکو دلی کی آبادی اور شاعری کی دنیا میں ایک مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کو دیکھ لینا، اس وقت سے ولی و سودا تک سب کو دیکھ لینے کے برابر ہے۔ ۱۸۵۹ء میں میں نے حضرت میرزا صاحب کو الہ آباد میں بابو بینی پرشاد صاحب وکیل ہائی کورٹ کے دیوان خانے میں دیکھا اور ان کی شیوا بیانیوں سے بھی مستفیض ہوا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی اور میں بھوپال میں ملازم تھا۔ جناب نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشین والیۂ سابق، ریاست بھوپال نے بہت چاہا کہ حضرت میرزا صاحب بھوپال تشریف لائیں اور یہیں قیام فرمائیں مگر مرزا سے دلی چھٹنا مشکل تھا۔" (ص ۱۲۸)

سید امجد علی اشہری (امجد ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۵ء) میں پیدا ہوئے۔ مشرقی علوم میں کمال حاصل کیا۔ نواب سکندر جہاں کے آخری زمانہ حکومت میں بھوپال آکر ملازم ہوئے ۱۳۰۴ھ میں بھوپال سے حیدرآباد چلے گئے۔ شعر و شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ نواب صدیق حسن خاں سے بڑے اچھے تعلقات تھے "ایشیائی شاعری" حدیقہ شاہجہانی، گلدستۂ اردو، گلدستۂ سلطانی وغیرہ ان

کی تصانیف ہیں۔ ملنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "طبقۂ شعرا میں میرزا غالب۔ میر انیس، میرزا دبیر، نواب میرزا داغ، منشی امیر احمد امیر مینائی، منشی اسمٰعیل حسین منیر، جیسے لاثانی سخن طرازوں کے دیکھنے اور ان کی زبان سے ان کے کلام سننے کا فخر حاصل ہوا۔" (خمخانۂ جاوید جلد اول۔ تقاریظ صفحہ ۶۴)

نواب صدیق حسن خاں بہادر قنوج کے رہنے والے تھے بھوپال آئے اور سرکار میں ملازمت حاصل کی۔ ان کا عقد نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کے ساتھ ہوا۔ عربی فارسی کے باکمال عالم تھے، شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ فارسی میں نواب تخلص کرتے تھے اور اردو میں توفیق تخلص تھا۔ کئی اچھی کتابوں کے مصنف تھے۔ غالب سے ان کی ملاقات کے سلسلے میں سید محمد علی حسن مآثر صدیقی میں تحریر کرتے ہیں:

"زمانۂ آغاز ملاقات میں والاجاہ ایک بار مرزا غالب مرحوم کے دولت خانہ پر زمانۂ بے تکلفی سمجھ کر بلا اطلاع سابق یکایک پہنچ گئے۔ اس وقت یاران رنگین طبع کی محفل گرم تھی مرزا صاحب نے ان کو دیکھ بے ساختہ یارانہ لہجہ میں کہا ع

بیا برادر، آ، ڈ ر سے بھائی

اس وقت آپ کی کیا دعوت کروں۔ پہلے سے مجکو آپ کے آنے کا علم بھی نہ تھا خیر بیٹھیے میں ضیافت طبع کئے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر مرزا صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی جو انھیں دنوں میں شاہی دربار کی فرمائش سے لکھی تھی اس کا مطلع یہ ہے ؎

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

والاجاہ اکثر اوقات کہا کرتے تھے کہ میرزا صاحب کا وہ دل آویز لب و لہجہ اور ان کے فصیح و بلیغ اشعار کی حسن ترتیب و ادا اور لطافت شعریہ اور جزالت معنی کی تاثیر کچھ ایسی دل میں پیوست ہو گئی ہے کہ جب کبھی اس کی یاد آجاتی ہے تو دل میں ایک عالم وجد و حال پیدا ہو جاتا ہے اور ہر وقت تازہ بہ تازہ نو بہ نو لطف حاصل ہوتا ہے ع

"تازہ تر از تازہ ترے می رسد"

مرزا غالب بھوپال تشریف نہیں لائے لیکن نواب سکندر جہاں بیگم فوجدار محمد خاں کو ان کی خدمت میں بھیجتی رہیں۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں:

"پھر بھی وقتاً فوقتاً اپنے ماموں میاں فوجدار محمد خاں کو غالب کی خدمت میں نذرانے کی رقوم دے کر بھیجا کرتی تھیں۔ اس آمد و رفت کا نتیجہ تھا کہ فوجدار محمد خاں کو غالب نے اپنے اصل دیوان کا نسخہ اپنے قلم سے تصحیح کر کے نذر کیا جو ان کے کتب خانے کی زینت بنا۔" (اردو کی ترقی میں بھوپال کا حصہ ص۷)

فوجدار محمد خاں بڑے علم دوست بزرگ تھے ان کے کتب خانے کے بارے میں یوسف قیصر صاحب لکھتے ہیں:

"فوجدار محمد خاں کا کتب خانہ ہندوستان کے ان کتب خانوں میں تھا جن کو آج تک انگلیوں پر گنا کرتے ہیں بے شمار قلمی نسخے تھے۔ فوجدار محمد خاں کو کتابوں سے عشق تھا۔ ہندوستان بھر میں جہاں کہیں بھی اچھی کتاب سُن پاتے تھے بے قرار ہو جاتے تھے اور جب تک وہ کتاب یا اس کی نقل ان کے کتب خانے میں نہ آجائے ان کو چین نہیں آتا تھا۔ ان کی دولت و امارت کا یہی ایک مصرف تھا ...... ان کے یہاں بہت سے خوش نویس اور خطاط مستقل ملازم تھے جو کتابت کا کام کیا کرتے تھے۔ کوئی موضوع علم و فن کا ایسا نہیں تھا، جس کے دو چار نسخے ان کے یہاں نہ ہوں۔ غرضیکہ کتب خانہ لاجواب تھا۔ فوجدار محمد خاں کو کتابیں جمع کرنے کا شوق ہی نہیں تھا بلکہ ان کے اوقات فرصت کا مشغلہ ہی ایک کتب بینی تھا۔" (غالب کے پانچ شاگرد قسط نمبر ۱۔ روزنامہ ندیم بھوپال ۵ فروری ۱۹۵۶ء)

دیوان غالب کا وہ قلمی نسخہ جسے خود مرزا نے فوجدار محمد خاں کو عنایت کیا تھا اس کے بارے میں یوسف قیصر بتاتے ہیں:

"ان قلمی کتابوں ہی میں غالب کا وہ مکمل دیوان بھی تھا، جس کا اس وقت انتخاب نہیں ہوا تھا، نہایت ہی خوش خط ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ غالب کا خط ہے مگر ایسا کہنے والوں کا محض ظن ہے۔ فوجدار محمد خاں نے اپنے ایک خوش نویس کو بھیج کر اس کی نقل کرائی تھی۔ اسی نقل کو غالب نے بطریق اصلاح دیکھا جہاں غلطی دیکھی اور دیکھتے وقت کسی مصرعہ یا شعر کا کوئی اچھا سا مضمون ذہن میں آگیا تو خوش خط

کو بات کر اپنے قلم سے پورا شعر یا مصرعہ لکھ دیا یا کوئی غزل لکھنے سے رہ گئی یا دورانِ کتابت میں کوئی تازہ غزل لکھی تو وہ ردیف کے اعتبار سے خوش خط دیوان کے صفحہ کے حاشیہ پر اپنے قلم سے لکھ دی۔" ("مرزا غالب کے پانچ شاگرد" ندیم بھوپال۔ ۱۵ر فروری ۱۹۵۶ء)

یہی نسخۂ فوجدار محمد خاں جو کہ ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا ہے، ۱۹۷۱ء میں نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے، جس میں متداول دیوان بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اسے مفتی انوار الحق صاحب نے جو اس زمانے میں ناظم تعلیمات تھے، مرتب کر کے شائع کیا ہے جس میں "سر نامہ" کے عنوان سے نواب حمید اللہ خاں نے اپنی مسرت کا اظہار اس طرح کیا ہے :

" اداے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

میں دلی مسرت سے مرزا غالب دہلوی کے دیوانِ اُردو کا یہ جدید نسخہ ابنائے ملک کے سامنے پیش کرتا ہوں اور مجھے اپنی اس سعادت پر فخر ہے کہ اس شہنشاہ اقلیم سخنوری کے عہد شباب کی نازک خیالی اور نکتہ سنجی کے یہ نقش اول جو سو برس سے کنج خمول اور گوشہ ذہول میں پڑے تھے آج میرے ذریعہ سے ملک میں رونما اور جلوہ پیرا ہوتے ہیں اردو جو بلا اختلاف مذہب و ملت ہم سب کی مشترکہ زبان ہے اور جس پر ہماری ساری ترقیوں کا انحصار ہے، اپنے مجموعہ ادب میں اس بے بہا اضافے پر جتنا ناز کرے بجا ہے اور ارباب فہم و نظر جو بلا امتیاز قوم و وطن اس خلاق معانی کی نغمہ سرائی اور مضمون آفرینی کے دلدادہ ہیں اس کی جس قدر قدر کریں زیبا ہے کیونکہ اس میں کلام نہیں کہ

از تازگی بہ دہر کہن می شود
نقشے کہ کلک غالب خونیں رقم کشد"

(دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ ص ۱)

صفحہ ۳ سے تمہید ہے جو مفتی انوار الحق صاحب مرتب نسخۂ حمیدیہ نے تحریر فرمائی ہے۔ صفحہ ۲۵ پر "عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم" کے عنوان سے مرتب نسخۂ حمیدیہ کا ہی مضمون ہے۔ صفحہ ۳۳ سے عبدالرحمٰن بجنوری کا وہ مضمون ہے جسے انجمن ترقی اردو کے ایما سے انھوں نے لکھا تھا اور جو ان کے انتقال کے بعد اردو جنوری ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا اور پھر محاسن کلام غالب کے نام سے الگ سے کتابچہ شائع ہوا۔

مفتی انوار الحق صاحب "نسخۂ فوجدار محمد خاں" کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

" اس نایاب کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانہ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہے یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوان یہاں کیوں کر پہنچا لیکن تاریخ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیس وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا۔ چناں چہ اس کے شروع میں ایک صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے :

" دیوان ہذا من تصنیف مرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہ قلمی خوش خط" اور اس کے سامنے ان کی مہر ہے اور خاتمہ پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر موجود ہے ": دیوان من تصنیف مرزا صاحب قبلہ المتخلص بہ اسد غالب سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ھ من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت"۔ اس کا خط پاکیزہ اور نظر فریب ہے۔ جگہ جگہ فوجدار محمد خاں کی مہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۴۸ھ اور بعض ۱۲۶۱ھ کی ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے۔ انھوں نے خود جا بجا اصلاحیں کی ہیں"۔ (نسخۂ حمیدیہ ص ۵)

اس دور میں عبدالرحمٰن بجنوری کا شمار ان چند نوجوانوں میں ہوتا تھا جنھوں نے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس سے صحیح فائدہ اٹھانے کے خواہش مند تھے۔ مسئلہ تعلیم سے انھیں بے حد دلچسپی تھی۔ یورپ سے واپسی پر ایک کالج کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے۔ بھوپال کی بیگم صاحبہ نے بھی اس سے دلچسپی لی اور ایک اچھی رقم اکٹھا کر دی۔ شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن صدیقی دونوں ان کے ہم خیال تھے۔ بجنوری مرحوم کی شخصیت کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی ابتدا ہونے والی تھی تو اس کے پرنسپل کے لیے بجنوری مرحوم کا انتخاب ہوا تھا۔

محاسن کلام غالب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی نظر غالب پر کیسی تھی۔ جب نسخۂ فوجدار محمد خاں کا انھیں علم ہوا تو انھیں کس قدر خوشی ہوئی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

"ڈاکٹر صاحب پہلے ہی سے غالب کے شیدائیوں میں سے تھے۔ مکمل دیوان دیکھ کر اچھل پڑے بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا۔ سر پر رکھا اور اپنے بنگلے پر لے آئے۔ ایک کاتب کو نوکر رکھا اور اس سے دیوان کی کتابت کرائی۔" (مرزا غالب کے پانچ شاگرد' قسط نمبر ۱۔ ۵ فروری ۱۹۵۷ء ندایم بھوپال)

یہ ہاشمی صاحب نسخۂ حمیدیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس نایاب کلام کے مل جانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو نہایت خوشی ہوئی اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے خاکسار نے بھوپال جاکر اس قلمی نسخے کی زیارت کی جو ۱۲۳۷ھ میں (جب کہ مرزا غالب کی عمر صرف ۲۵ برس کی تھی) تحریر کیا گیا تھا۔ لوح اور خاتمہ کتاب کی عبارت نیز اشعار پر ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ مرزا غالب مرحوم ہی کا کلام ہے اور چونکہ بالکل ابتدائی زمانہ میں نقل کرایا گیا تھا لہذا گو بعد کی غزلیں اس نسخے میں نہیں درج ہوئیں تاہم وہ ابتدائی کلام تمام و کمال محفوظ رہ گیا جسے مرزا صاحب نے دیوان چھپواتے وقت خارج اور تلف کر دیا تھا۔" (سہ ماہی اردو ۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس نسخے کو بہت اہتمام سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ اس کی کتابت کا کام شروع کر دیا تھا اور اس کی طباعت کے سلسلے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ طاعون جیسا موذی مرض پھیلا اور عبدالرحمٰن بجنوری اس مرض کے شکار ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۹۱۸ء کا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق رقمطراز ہیں :

"جب مرزا غالب کے کلام کا قدیم نسخہ جو مرزا صاحب نے بھوپال کے فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا مرحوم کی نظر پڑا تو مارے خوشی کے بے تاب ہو گئے اور اس اصل نسخے کی طباعت کے لیے بڑے بڑے سامان کیے، اعلیٰ قسم کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب طباعت کے لیے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کی تشریح کے لیے چابک دست مصوروں سے تصویروں کی فرمائش، ان کا یہ انہماک دیکھ کر ان کے بعض دوست بھی اس شاہ کار کی تکمیل میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے تھے لیکن افسوس موت نے اتنی مہلت نہ دی اور یہ سب ٹھاٹھ یوں ہی پڑے کا پڑا رہ گیا۔" (مقدمات عبد الحق ۔ اضافہ شدہ اڈیشن ۔ ص ۳۷۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ نسخۂ فوجدار خاں کا دریافت ہونا غالبیات کے سلسلے میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس پر دنیائے اردو اور خاص طور سے سرزمین بھوپال جس قدر ناز کرے بجا ہے چونکہ اس نسخے کی اشاعت کا انتظام نواب حمید اللہ خاں نے کیا اور اگرچہ اس طرح شائع نہیں کیا جا سکا جیسا ہونا چاہیے تھا یا جس طرح سے عبدالرحمٰن بجنوری چاہتے تھے پھر بھی اس کی اہمیت کا اعتراف بجا طور پر سارے ہندستان نے کیا۔ محمد عبدالرحمٰن چغتائی نے نقش چغتائی "نذر" کرتے ہوئے نواب حمید اللہ خاں کی علم دوستی کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

"غالب کے نسخۂ حمیدیہ کو مدنظر رکھتے ہوئے میں اپنی اس کوشش کو افتخار الملک ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں بہادر فرمانروائے بھوپال خلد اللہ ملکہ کی علم دوستی و ادب نوازی کو نہایت خلوص کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔"

مرزا غالب کے تقریباً نو شاگردوں کا تعلق بھوپال سے رہا ہے جن کا تعارف مختصراً حسب ذیل ہے :

مولوی ابوالفضل محمد عباس رفعت

محمد عباس رفعت کی پیدائش ۱۴ جنوری ۱۸۲۶ء کو بنارس میں ہوئی۔ ان کے والد احمد شروانی عربی زبان کے عالم بزرگ تھے۔ رفعت نے بھی عربی فارسی کی بڑی اچھی تعلیم پائی تھی۔ عربی کی تعلیم اپنے والد محترم سے اور فارسی میر خیرات علی خاں مشتاق خیرآبادی سے حاصل کی تھی۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے مرزائی خانی اور ابوالفضل دوراں کے خطابات ملے تھے۔ دہلی میں قیام کے دوران مرزا غالب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے شاگرد ہوئے اور اپنے فارسی کلام پر ان سے اصلاح لی۔ غالب ان کی عزت اور ان کی صلاحیتوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ کافی رہا مگر افسوس کہ وہ خطوط یک جا نہیں ہو سکے۔ ایک مرتبہ رفعت نے ان سے فارسی خط لکھنے کی فرمائش کی۔ مرزا نے فارسی میں جواب دیا جو انشائے نودچشم اور کلیات نثر میں درج ہے۔ عباس رفعت اپنی تصنیف نو دیدہ

ہیں مرزا کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"...... راقم الحروف غائبانہ بدید کلام بینش معتقد گشت واز دوٗ سرفرودہ آوردہ در حلقہ شاگردان زانوشکست جناب ممدوح ازراہ اخلاق بے پایاں مانند حکمائے اشراقیان چند مرتبہ توجہ دلی فرمودہ اشعار بندہ راکہ ذریعہ نیائش نامہ ہا فرستادہ بودم اصلاح نمود....."

رفعت نے ۱۳۱۵ھ میں بھوپال میں وفات پائی۔

یار محمد خاں شوکت

یار محمد خاں شوکت کی پیدائش ۱۶ جولائی ۱۸۳۳ء (۲۷ صفر ۱۲۴۹ھ) کو ہوئی۔ اپنے والد فوجدار محمد خاں کی طرح غالب کے شیدائیوں میں سے تھے۔ مختلف اساتذہ سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی، ماہرین سے فنون ادب، آداب مجلس، آئین سیف زنی، اسپ سواری سیکھی۔ نواب سکندر جہاں ۱۸۶۶ء کو شاہ جہاں آباد (دلی) پہنچیں۔ ان کے ساتھ یار محمد خاں شوکت بھی تھے۔ اسی سفر میں شوکت کو مرزا غالب سے ملنے کا موقع ملا۔ دوران ملاقات انھوں نے مرزا غالب سے اصلاح لینے کی خواہش ظاہر کی۔ مرزا نے انھیں اپنا شاگرد بخوشی بنالیا لیکن ساتھ ساتھ یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ مولانا عباس رفعت سے اصلاح لے کر اپنا کلام میرے پاس بھیجا کریں۔ چنانچہ شوکت نے ایسا ہی کیا۔ اپنے غالب کے شاگرد ہونے کے بارے میں انشائے نودچشم میں وہ لکھتے ہیں:

"جناب ممدوح (مرزا) کے صدہا شاگرد رشید ہیں سب سے کم تر یہ راقم اثم ہے۔"

انشائے نودچشم، شہنشاہ نامہ، تذکرۂ فرح بخش، فسانۂ حشمت، مراسلات شوکت وغیرہ تقریباً پندرہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ۸ راگست ۱۹۱۲ء کو بھوپال ہی میں انتقال ہوا۔

حافظ خان محمد خاں شہیر

یہ غلام محمد خاں کے فرزند تھے، ہوش سنبھالا تو طبیعت کی موزونی کی وجہ سے کسی اچھے استاد کی نگرانی کی ضرورت محسوس کی۔ ان کی خوش نصیبی تھی کہ غالب جیسا استاد انھیں مل گیا۔ عرصے تک ان سے اصلاح لیتے رہے۔ شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال کو جب کراؤن آف انڈیا (C R O W C)

(۸/۱۸۷۵ ۱۲۹۲ھ) کا خطاب ملا تو شہیر نے ایک قصیدہ کے ذریعہ اظہار مسرت کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے قصیدہ پسند فرمایا اور شہیر کو افتخار الشعرا کا خطاب دیا۔

شہیر بھوپال آکر عام طور سے فارسی میں شاعری کرنے لگے تھے۔ نواب صدیق حسن کے صاحبزادے نورالحسن کلیم اور علی حسن کے اتالیق بھی رہے تھے۔ ان کے علاوہ یہاں شہیر کے اور شاگرد تھے۔

ان کا انتقال ۱۹۰۰ یا ۱۹۰۱ میں ہوا اور سیفیہ کالج کے جانب شمال قلندر شاہ کے تکیہ میں مدفون ہوئے۔

منشی ارشاد احمد میکش، محوی

میکش شیخ عبدالقادر کے فرزند تھے۔ قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر کے باشندے تھے۔ ابتدائی عمر دہلی میں گزاری۔ فارسی میں محوی اور اردو میں میکش تخلص کرتے تھے۔ غالب اور بعد میں صہبائی سے اصلاح لیتے تھے۔ آخری زمانے میں بھوپال چلے آئے تھے۔ یہاں نواب والیہ کے یہاں ملازم رہے۔

حکیم محمد معشوق علی خاں جوہر شاہجہاں پوری

جوہر اصغر علی خاں کے فرزند تھے۔ ۱۸۵۹ء میں شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ پہلے گھر پر، پھر دہلی اور لکھنؤ میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۰ء میں بھوپال تشریف لائے۔ یہاں طبابت اور پھر وکالت شروع کی۔ ۱۹۰۸ء تک ان کا قیام بھوپال ہی میں رہا، پھر حیدرآباد چلے گئے جہاں سے ۱۹۲۵ء میں اپنے وطن شاہجہاں پور گئے۔ ۱۹۲۸ء میں انتقال ہوا۔

بھوپال میں جوہر کے بہت سے شاگرد تھے۔ یوسف قیصر صاحب انھیں میں سے تھے۔ ان کی وجہ سے یہاں شعر و شاعری کا بہت اچھا مذاق پیدا ہو گیا تھا۔ لالہ سری رام خمخانۂ جاوید حصہ دوم میں ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"عنفوان شباب میں دہلی آکر نواب اسداللہ خاں غالب کے فیض صحبت سے بہرہ ور ہوئے اور فخر تلمذ بھی حاصل کیا تھا۔ کئی ماہ تک ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اصلاح لی... "

مرزا یوسف علی خاں عزیز

عزیز بنارس کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ مرزا غالب کے عزیز شاگردوں میں تھے۔ کافی عرصے تک مرزا کی خدمت میں رہے اور ان

ہی کے ذریعے قلعہ تک رسائی ہوئی۔ لالہ سری رام لکھتے ہیں:

"احترام الدولہ حاذق الزماں حکیم احسن اللہ خاں صاحب ثابت جنگ نے حضرت بہادر شاہ سے بہ نذر مرثیہ و قصیدہ، خلعت چار پارچہ گوشوارہ و خطاب سراج الشعرا و سلطان الذاکرین دلوایا تھا۔"

(خمخانۂ جاوید، جلد پنجم، ۵۰۷)

مرثیہ گوئی کو بے حد دلچسپی تھی۔ بڑے پُر گو تھے۔ زندگی کے آخری زمانے میں بہ تلاش روزگار بھوپال تشریف لائے۔ یہیں ان کا انتقال (۱۸۷۲ء) ۱۲۸۹ھ میں ہوا۔

سید احمد حسن قنوجی۔ عرشی

نواب صدیق حسن خاں کے بڑے بھائی تھے۔ تاریخ پیدائش ۱۹ رمضان ۱۲۴۶ھ ہے۔ ابتدائی تعلیم قنوج میں ہوئی پھر مختلف جگہوں میں مختلف اساتذہ سے تعلیم پائی۔ لالہ سری رام لکھتے ہیں:

"فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے اور حضرت غالب سے مشورہ سخن کرتے۔" (خمخانۂ جاوید)

حج بیت اللہ کے لیے اکیلے نکل پڑے اور بڑودہ میں بیمار ہو کر ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا۔ ان کا کلام فصیح اور بلیغ ہوتا تھا۔

مولوی محمد ولایت علی خاں عزیز

صفی پور میں ۸ مارچ ۱۸۴۳ء کو پیدا ہوئے اور ۲ جولائی ۱۹۲۸ء کو صفی پور ہی میں انتقال کیا۔ فارسی میں مرزا غالب سے استفادہ کیا تھا جس کا اقرار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

ممنون میں نہیں ہوں کسی کے کمال کا　　　شاگرد اس زباں میں ہوں اس ذوالجلال کا
ہاں نظم فارسی میں ہوں غالب سے مستفید　　　منت گزار لطف ہوں، دو تین سال کا
بھیجی تھی ایک نثر معقول بھی چار جزو　　　ہوں معتقد میں دونوں میں ان کے کمال کا
پس نثر میں بھی مجھ کو تلمذ جو ہے تو کیا　　　اس میں بھی معترف ہوں خدا کے نوال کا

اُردو نظم میں طور تجلی، نور ولایت، نظم دل فریب کتابیں موجود ہیں۔ اُردو اور فارسی نثر میں بھی مختلف چیزیں تحریر کی ہیں۔ ان میں ایک "پیش کش شاہجہاں" ہے جو انھوں نے والیہ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم کی خدمت میں پیش کی تھی۔ (تلامذۂ غالب۔ مالک رام)

حکیم اشفاق حسین زکی مارہروی

زکی، ۱۸۶۳ء میں مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر دوسرے مقامی اساتذہ سے بھی تعلیم پائی۔ آپ ۱۹۰۱ء میں بھوپال تشریف لائے اور محکمہ بند و بست اور پھر جمع بندی کے دفتر سے وابستہ ہوئے۔ لیکن ۱۹۱۵ء میں ملازمت سے علیحدہ ہو گئے۔ چودہ، پندرہ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو انتقال ہوا اور بھوپال میں تکیہ بھولا شاہ میں سپرد خاک ہوئے۔ عبدالقدیر آزاد ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"حکیم صاحب (زکی) ممدوح ان بزرگ ہستیوں میں سے ہیں جن کی زیارت کے لیے لوگ ترستے ہیں۔ آپ حضرت غالب کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے ہیں... آپ کی قادر الکلامی کا اندازہ ذیل کی غزل سے لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت غالب کی دشوار گزار زمینوں پر غزل سرائی آپ ہی کا حق ہے۔"

(ماہنامہ ندیم، ذرہ نگار بھوپال۔ مارچ ۱۹۲۹ء۔ غالب نام آورم ص ۳۹)

ملاقاتی

مولوی جمال الدین خاں گمنام

گمنام نے ابتدائی تعلیم شاہ عبدالعزیز سے حاصل کی۔ شاہ رفیع الدین کے حلقۂ درس میں رہے، اس لیے ان کی زندگی مذہبی تھی۔ شاہ صاحب کے کہنے پر بھوپال آئے اور نواب سکندر جہاں کے دربار میں تیس روپے ماہوار پر رکھ لیے گئے۔ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ۱۲۶۰ھ میں مدار المہام کے عہدے پر پہنچے۔ چالیس سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ ذوق اور مرزا اسد اللہ خاں غالب سے خصوصی تعلقات تھے۔ ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے تاریخ وفات کہی:

"بود مہر آسمان علم و دین عدل و شرع"

مطالب الغالب (شرح دیوان غالب)

ممتاز احمد تنہا مجددی نے غالب کی یہ شرح بفرمائش مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری بازار لاہور تحریر کی تھی جو کریمی پریس سے شائع ہوئی۔ یہ شرح $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۳۹۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں صفحہ ۳ سے ۱۳ تک تنہا صاحب کا لکھا ہوا مبسوط مقدمہ ہے۔ سنہ طباعت ۱۹۴۱ء ہے۔

ممتاز احمد مجددی ۹ فروری ۱۸۹۴ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ اور جہانگیریہ بھوپال میں ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں بلند شہر چلے گئے۔ وہیں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر علی گڑھ میں

انٹر تک تعلیم حاصل کی۔ تقریر کرنے کا فن بھی حاصل کیا۔ ان کی ذہانت دیکھ کر نواب وقار الملک نے تین سو روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ علی گڑھ سے حیدرآباد چلے گئے پھر ۱۹۲۱ء میں بھوپال واپس آگئے یہیں مطالب الغالب تحریر کی۔ ۱۹۲۲ء میں حکیم شجاع کی خواہش پر لاہور گئے اور رسالہ ہزار داستان میں کام کرنے لگے۔ لاہور سے خیرپور گئے جہاں نواب صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں بھوپال واپس آگئے مالی پریشانی سے مجبور ہو کر لکھنؤ چلے گئے پھر ۱۹۴۱ء میں بھوپال آئے ۱۹۴۴ء میں ان کی شادی ہوئی لیکن چند سال بعد یعنی ۲۷ دسمبر ۱۹۴۴ء کو معمولی علالت کے بعد وفات پائی۔

سہا مجددی کا شمار اچھے شاعروں میں ہوتا تھا۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ان کا کلام تلف ہو گیا۔ البتہ ان کے کلام کا کچھ حصہ مختلف رسائل میں ملے گا۔

بھوپال والی غزل

بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو ... کیا لطف ہو جو ابلق دوراں بھی رام ہو
تا گردش فلک سے یونہی صبح و شام ہو ... ساقی کی چشم مست ہو اور دور جام ہو
بیتاب ہوں بلا سے کن انکھیوں سے دیکھ لیں ... اے خوش نصیب کاش قضا کا پیام ہو
کیا شرم ہو جریم ہی محرم کا راز دار ... میں سر بکف ہوں تیغ ادا بے نیام ہو
میں چھیڑنے کو کاش اسے گھور دوں کبھی ... پھر شوخ دیدہ بر سر صد انتقام ہو
وہ دل کہاں کہ حرف تمنا ہو لب شناس ... ناکام بد نصیب کبھی شاد کام ہو
گھس جائیں کے چشم شوق قدم بوس ہی سہی ... وہ بزم غیر ہی میں ہوں پہ اژدہام ہو
اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اٹھوں ... مجھ پہ جو چشم ساقی بیت الحرام ہو

پیرانہ سال غالب منکشف کرے گا کیا ... بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

یہ غزل ابوالارشاد مولوی محمد ابراہیم خلیل صاحب نے جو سابق نارمل ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بھوپال کے اردو عربی اور فارسی شعبہ کے صدر تھے، کہی تھی اور گوہر تعلیم بھوپال کے اپریل ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر اپریل فول لکھ دیا گیا تھا۔ جوہر قریشی نے اسے ماہنامہ دین و دنیا دلی میں "مرزا صاحب کی ایک غیر مطبوعہ غزل" کے عنوان سے شائع کرائی۔ اس سے اپریل ۱۹۳۹ء میں ہمایوں نے لیا اور جناب مالک رام نے ہمایوں سے اپنے مرتب کردہ دیوان غالب میں شامل کر دیا اور یہاں سے نسخہ عرشی میں بھی شامل ہو گئی اور اس طرح ایک لطیفہ ادبی تحقیق کے لیے ایک حادثہ بن گیا۔

آخر میں ایک لطیفہ اور سن لیجیے۔ یہ لطیفہ بھوپال کے ایک صاحب کی غالب سے ملاقات کے سلسلے کا ہے جسے ایچ۔ ایم حنیف صاحب نے اپنے مضمون GHALIB[1] میں پیش کیا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

(ترجمہ۔ ایک مرتبہ بھوپال کے ایک صاحب مرزا سے ملنے آئے۔ حسب معمول وہ شغل مے کر رہے تھے۔ انھوں نے مہمان کی طرف بھی گلاس بڑھایا۔ مہمان کو علم نہ تھا کہ مرزا شراب بھی پیتے ہیں چنانچہ انھوں نے اسے کوئی بے ضرر مشروب سمجھ کر گلاس لے لیا حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ یہ شراب ہے۔ بھوپالی مہمان نے فوراً ہی گلاس رکھ دیا اور معذرت کے انداز میں بولے کہ غلط فہمی میں میں نے اسے ہاتھ لگا دیا۔ مرزا صاحب مسکرائے اور فرمایا کہ "آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کی غلطی آپ کی نجات کا ذریعہ بن گئی۔")

★

[1] الہ آباد ریویو (انگریزی) اکتوبر ۱۸۹۱ء

غالب ــــ ماحول اور ردِّ عمل

نجم الدین شکیب

اُنیسویں صدی عیسوی ہندستان کی تاریخ میں ایک ڈوبتی ہوئی تہذیب اور ایک اُبھرتی ہوئی ثقافت کا سنگم ہے۔ جو حالات پچھلی صدی سے زمانے کی تبدیلی کی پیشین گوئی کر رہے تھے ان کی آخری کڑیاں کھل کر لگ بھگ سو سال کے بعد انقلاب کی علمبردار ثابت ہوئیں۔ مکمل شاہنشاہی کا سر بفلک ایوان جب تک بالکل ڈھے نہیں گیا، شرابِ تقدیر کے ماتے اُسی سے لَو لگائے رہے۔ کچھ منچلے مغل سلطنت کے گرتے پڑتے ملبے سے اپنی کوٹھیاں تعمیر کر رہے تھے لیکن اُن کو اس تبدیلی کی خبر نہ تھی جو چند سال کے بعد مغل سلطنت کو اُس کے ملبے سمیت سمیٹ لے جانے والی تھی۔ قدیم شاہی نظام کو دکن کی اُبھرتی ہوئی طاقتوں، اودھ کی خود مختاری اور لال قلعہ کی سازشوں نے جڑ بنیاد سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن قلعہ ہندستان کی عظمت کا قدیم بتکدہ تھا۔ اس لیے عزت والے اب بھی نام و نشان کی تلاش میں اسی کا توسل ڈھونڈھتے تھے۔ قلعہ کی خود کوئی سیاسی یا فوجی اہمیت نہ تھی لیکن اُس کا نام اب بھی مردہ تمناؤں میں جان ڈال سکتا تھا۔ جو لوگ اپنے ذاتی اور خاندانی عروج کے لیے لڑ رہے تھے، وہ جہاں تک بن پڑتا تھا، برکت لال قلعہ ہی سے حاصل کرتے تھے۔ لوگوں کے ذہنوں میں قومیت اور وطنیت کا واضح اور ہندستان گیر تصور نہ تھا۔ لال قلعہ کی عظمت کا سکہ تو سب کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا لیکن ذاتی مفاد اور مصالح کے پیشِ نظر اربابِ غرض ان درباروں سے بھی رشتہ استوار رکھتے تھے جو لال قلعہ کی اینٹوں سے اپنے محل تعمیر کرنے کی فکر میں تھے۔ غالب نے غلط نہیں کہا تھا ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ   پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

جو کبھی ہواؤں کے ان تھپیڑوں میں غالب کے لڑکپن نے آنکھ کھولی۔ ان کے دادا مرزا قوقان بیگ ہندستان میں تازہ وارد تھے۔ اُنھوں نے توسل تو دربار شاہی سے ہی حاصل کیا لیکن قلعہ کے حالات ایسے نہ تھے جو کسی حوصلہ مند ترک کے لیے قناعت کا موجب ہوتے، اُنھوں نے بھی تلاشِ معاش میں مختلف میدان دیکھے۔ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ بھی لال قلعہ سے دور ریاست الور کی فوج میں شامل ہوئے اور وہیں ایک لڑائی میں کام آئے اور راج گڈھ میں دفن ہوئے۔ غالب کہتے ہیں ؎

کاتی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست   در خاکِ راج گڈھ پدرم را مزار بود

مرزا غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے حاکم تھے لیکن ۱۸۰۳ء میں اُنھوں نے لارڈ لیک سے مصالحت کر کے شہر بغیر لڑے بھڑے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے احسان مانا اور ان کو جاگیر اور مراتب سے سرفراز کیا اور ان کے انتقال کے بعد ان کی جوانمرگی پر ترس کھا کر ان کے متعلقین کے لئے پنشن مقرر کی جو مختلف مدارج طے کر کے غالب کی قسمت میں ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ آئی۔ مرزا کو بھی ان کے باپ کی وفات کے بعد ریاست الور سے جاگیر ملی تھی لیکن ان کی تقدیر کی گردش کی وجہ سے یہ جائداد بھی ان کی دسترس سے دور ہی رہی۔

خواجہ غلام حسین کمیدان، جو آگرے کے رئیس تھے، مرزا کے نانا تھے۔ مرزا کے باپ عبداللہ نے کہیں گھر نہیں بنایا۔ وہ بھی جب تک زندہ رہے، سسرال ہی کو اپنا گھر سمجھتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد نانی نانا کے ہاتھوں مرزا کی پرورش ہوئی۔ مرزا کی والدہ بھی سارہ

زندگی میکے ہی میں رہی اور یہیں طرح مرزا کا لڑکپن بڑے ٹھاٹھ اور آرام کے ساتھ گزرا۔ وہ اپنے اس دورِ رنگیں کی تصویر ایک قصیدہ کی تشبیب میں یوں کھینچتے ہیں۔

آں بلبلم کہ در چمنستان بشاخ سار | بود آشیان من شکنِ طرۂ بہار
ہر غنچہ از دمم بقضائے شگفتگی | فیض نسیم و جلوۂ گل داشت پیش کار
ہر جلوہ را زمن بہ تقاضائے دلبری | از غنچہ بود محمل ناز سے بہ رہ گزار
ہم سینہ از بلائے جفا پیشہ شاہداں | فہرست روز نامۂ اندوہِ انتظار
ہموارہ ذوقِ مستی و لہو و سرود و شعر | پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مئے و قمار

شانِ ریاست، جس نے زندگی بھر مرزا کا ساتھ نہیں چھوڑا، ان کو ننہال ہی سے ورثہ میں ملی تھی اور اُس کو اُنھوں نے ایک قدر کے طور پر اپنی زندگی میں اپنائے رکھا۔ اسی قدر نے ان کی زندگی کی مشکلات کو بڑھایا اور اسی نے مشکلات میں ان کے حوصلے کو بلند بھی رکھا۔ رئیسانہ ٹھاٹھ سے زندگی گزارنے کی ہوس نے اور ایک رئیس خاندان کے چشم و چراغ ہونے کے امتیاز نے ان کو بہت سے معیار دیئے جو نہ کبھی پورے ہوئے اور نہ کبھی ان کے حصول کی جدوجہد سے مرزا باز ہی آئے۔ زندگی کی دار و گیر کے میدان میں مرزا کا رجز ہے:

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم | لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی | بسترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعتِ اتراک | در تمامی زِ ماہ دہ چندیم
ہم بتابش ببرق ہم نفسیم | ہم بخشش بہ ابر پیوندیم

غالب نے اس نسلی اور خاندانی امتیاز کی بنا پر قسام ازل سے بیش از بیش حصہ مانگا اور اپنی اس حق طلبی میں کبھی نہیں ہچکچائے۔ وہ مطالبہ کرتے ہیں ؎

ساقیا چو من تشنگی و افراسیابیم | دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ مے بود اینک بمن سپار | زیں پس سہ بہشت کہ میراثِ آدم است

غالب قضا و قدر سے اپنا حق اس لئے طلب کرتے ہیں کہ وہ ان کا حق ہے اور حق بھی اس بنا پر ہے کہ وہ دودمانِ جمشید سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانیت کا مرتبہ بھی کچھ کم نہیں ہے لیکن جمشیدیت وہ بلند تر مقام ہے جو صرف ان کا حق ہے۔ ان کو اشیا کی حقیقت سے انکار نہیں لیکن ان میں حقیقت کا مرتبہ اُس وقت قابلِ تسلیم ہوگا جب وہ کسی بلند ایوان سے امتیاز حاصل کرے گی ؎

ترے جواہر طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں | ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

غالب کی شادی نے بھی، جو تیرہ برس کی عمر میں ہوئی، ان کی زندگی کے لیے ایک موڑ فراہم کی۔ وہ غالباً سات سال کی عمر سے دہلی آتے جاتے رہے تھے لیکن شادی کے دو تین سال کے بعد وہ وہیں کے ہو رہے۔ ان کی بیوی، امراؤ بیگم، نواب احمد بخش خاں رئیس فیروز پور جھرکہ کے بھائی الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی تھیں۔ معروف خود بھی شاعر تھے اور ان کے یہاں شاعروں کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ غالب نے غالباً شادی سے پہلے ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ سسرال کے ماحول نے اس جوہر کو اور تابندگی بخشی۔ ان کی طبیعت نے شاعری کے میدان میں ان کا نرالا پن قائم رکھا۔ روایت پرست شعرا اور عوام نے اس نوجوان کی مشکل پسندی کو نہیں سراہا لیکن اس کی طبیعت کا رجحان غوغائے عوام سے بدلنے کے بجائے کچھ اور تیز ہو گیا۔

غالب اور لال قلعہ کا تعلق شاعری ہی کے رابطہ سے قائم ہوا۔ مرزا کی حوصلہ مند طبیعت چاہتی تھی کہ ان کے علمی مرتبہ کا لحاظ کر کے دربار میں ان کی جگہ متعین ہو۔ لیکن دربار ہیئت اور روایت کی بندشوں میں جکڑا ہوا تھا۔ غالب کے فن کو، جس میں فکر کا عنصر غالب تھا، اُس وقت قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا۔ غالب کے خاندان کا صد سالہ پیشۂ سپہگری اب شعر و سخن کی شکل میں اپنے جوہر دکھانا چاہتا تھا لیکن قلعہ کے گھٹے ہوئے ماحول میں ان کے فن کی نشو و نما ممکن نہ تھی۔ ذوقؔ، مرزا کے لڑکپن سے استادِ شاہ تھے۔ ان کی زندگی میں غالب کا ملک الشعرائی کا خواب پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ذوقؔ کے بعد بادشاہ نے غالب کو اصلاحِ سخن کا اعزاز بخشا لیکن یہ بس اعزاز تھا۔ غالب جیسے حوصلہ مند شاعر کو اس اعزاز سے زیادہ کچھ اور بھی چاہیئے تھا کہ وہ اپنے علمی مرتبہ کے ساتھ ساتھ خاندانی ریاست کے وقار کو بھی قائم رکھ سکتا۔

غالب دربارِ شاہ سے وابستہ تو ہو گئے تھے لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریزی اقبال کا ستارہ طلوع ہو چکا ہے اور یہ نئی تہذیب پرانی مغل تہذیب کی جگہ لینے والی ہے۔ پرانے معاشرہ کی چولیں ڈھیلی ہو چکی ہیں اور اب ان کو پرانے ہاتھوں اور پرانے ساز و سامان سے کسا نہیں جا سکتا

ـ اس احساس کی وجہ سے مرزا نے انگریزوں کی طرف بھی ان کو نئے
ـنے کا نقیب سمجھ کر دیکھا۔ ان کی مدح سرائی کی اور ان کے کارناموں
ـول کھول کر سراہا۔

غالب کے مالی حالات ابتدائے شباب سے استوار نہ تھے۔ ان کی
ـ بلند تھی، عادتیں رئیسانہ تھیں اس لیے ان کو ایک عام آدمی کے
ـابلے میں زیادہ روپیہ کی ضرورت تھی۔ جب تک مہاجنوں کو امید
ـن کہ مرزا کی پنشن کی بقایا رقم، جو مرزا کے حساب سے لاکھوں تک پہنچتی
ـ مل جائے گی، وہ ان کو قرض دیتے رہے۔ دن گذرتے گئے اور قرض
ـ ادائیگی کا بندوبست نہ ہوا تو قرض خواہوں نے پریشان کرنا شروع
ـیا۔ غالب امیر زادے اور رئیس مزاج تھے۔ امرائے دربار میں ان کا
ـرہوتا تھا۔ شہر کے عمائدین سے ان کے برابری کے تعلقات تھے۔
ـست احباب سب کی خدمت کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اندر باہر خدمت
لیے کئی نوکر مامور تھے۔ ظاہر ہے قرض خواہوں کا دباؤ اور دن رات
ـتقاضے ان کے لیے سوہان روح تھے۔ ضروریات زندگی کا کیا ذکر
ـراب تک ادھار آتی تھی اس لئے یہ نوبت بھی پہنچی کہ غالب قرض
ـعلت میں شراب کے دو کاندا[illegible] دعوے پر گرفتار ہوئے۔
ـم جہاں نما نمبر ۳۸۷، جون ۱۸۳۷ء کی یہ خبر اس حادثہ پر روشنی ڈالتی ہے:

"عرض شد کہ مرزا اسد اللہ برائے ملاقات یوسف خاں رفتہ بود۔
در اثنائے راہ چپراسی عدالت بابتہ نالش دو صد و پنجاہ روپیہ
ہیکفرسن صاحب امدہ گرفتار نمودہ، در مکان ناظر بردہ، قید
نمودہ۔ امین الدین خاں چہار صد روپیہ مع اصل و سود دادہ اورا
رہا کنید"۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا کا لڑکپن "شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود" میں بسر
ـا تھا اس لیے ان کے مزاج میں رندانہ آزادی اور لاپروائی تھی۔ اس
ـت کے رئیس زادوں کی طرح ان کو بھی کچھ کھیلنے کھلانے کا شوق تھا۔ کچھ جوہری
لڑکے اور کچھ مرزا کے ہم مشرب امیر زادے ان کے گھر میں اکٹھا ہوتے
۔ مرزا کو "کھیل کی سرپرستی" کی آمدنی سے کچھ مالی منفعت بھی ہو جاتی
جوا کھیلنا اور کھلانا اس وقت بھی جرم تھا لیکن مرزا کا شمار شہر کے اونچے

طبقے کے باعزت لوگوں میں ہوتا تھا اس لئے ان کو اطمینان تھا کہ ان کی طرف
کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ لیکن ہونے والی ہو کر رہی اور مرزا ۱۸۴۱ء
میں جوا کھیلنے اور کھلانے کے جرم میں ماخوذ ہوئے۔ دو سو روپیہ جرمانہ ہوئی اور
سو روپیہ جرمانہ دے کر چھوٹے۔ رندی اور سرمستی جو مرزا کے مزاج کا خاص
رنگ تھی، اس حادثہ سے شکست نہ کھا سکی اور مرزا کا دربار تھوڑے وقفے
کے بعد، پھر گرم رہنے لگا۔ ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو پھر قمار بازی کے الزام میں
گرفتار ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر کی سفارش کے باوجود ریزیڈنٹ کی نگاہ نرم
نہ ہوئی اور مرزا کو چھ مہینے کے لیے با مشقت قید بھگتنی پڑی۔ پچھلی سزایابی کے
بعد مرزا لوٹ کر گھر آئے تھے اس لیے وقتی شرمندگی کچھ زیادہ ساتھ نہ دے
سکی۔ اس مرتبہ قید و بند میں برملا گرفتار ہوئے۔ رسوائی نے ریاست پر بٹہ
لگایا۔ مرزا کو اپنی بلند دودمانی پر جو ناز تھا وہ مجروح ہو کر رہا۔ اس حادثہ سے
ان کے دل پر بڑی چوٹ لگی۔ لیکن زخمی ہونے کے باوجود ان کی ترکانہ نوک
میں کوئی فرق نہیں آیا۔ رئیس غالب کی سرمستی نے شاعر غالب کو گوشۂ زنداں
تک پہنچا دیا تھا۔ جیل میں اس حادثہ کا ردعمل ایک لازوال شعری کارنامے
کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس ترکیب بند میں شاعر کی روح نے اس کے حالات
کے خلاف فریاد کی ہے۔ اس کی آواز ہر اس دکھے دل کی فریاد بن جاتی ہے
جو حالات سے مجروح تو ہو جاتا ہے لیکن شکست تسلیم کرنے کا نام نہیں لیتا۔
غالب نے فریاد کا آغاز یوں کیا ہے ؎

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم
غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

اس ترکیب بند میں بھی مرزا کی انا ناقابل شکست معلوم ہوتی ہے۔
اس قید و بند نے انھیں ایک عالم کی نگاہ میں رسوا کر دیا تھا لیکن ان
کی فکر رسا نے گوشۂ زنداں میں ان کے سربلند ہونے کی راہ نکال لی۔ وہ
کہتے ہیں ؎

اہل زنداں بسر و چشم خودم جا دادند
تا درین صدر نشینی چہ قدر ناز کنم

بہ دنداں گرفتار، و فانیست بشہر
خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم

مرزا کی انا آگے چل کر اس ترکیب بند میں رجز کی شکل اختیار کر لیتی ہے ؎

پاسبانان ہمہ آئید، کہ من می آیم
در زنداں بکشائید کہ من می آیم

ہر کہ دیدی بسر خویشتن سیاہم گفتی
خیر مقدم بسرائید کہ من می آیم

جادہ نشناسیم و زانبوہ تماشی ترسم
راہم از دور نمائید کہ من می آیم

رہرو جادۂ تسلیم درشتی نہ کند — سخت گیرندہ چرا ئید کہ من می آیم
خستِ تن دردرِ تعذیب ہمنزلست اینجا — نمک آرید و بسائید کہ من می آیم
حلد من خاک بپاشیدن خون تا نہ کنید — رونقِ خانہ خزا ئید کہ من می آیم
اں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید — بختِ خود را بستائید کہ من می آیم
چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من است — بہرہ از من بر بائید کہ من می آیم

قید و بند کی مصیبت کتنی ہی سخت رہی ہو لیکن غالب کی فطری شگفتہ مزاجی نے غم کے اس اندھیرے میں بھی سکون اور اطمینان کا پہلو نکال لیا۔

شادم از بند کہ از بندِ معاش آزادم — از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

غالب زنداں سے تو چھوٹے لیکن ان کے لیے "قیدِ حیات" اور "بندِ غم" دونوں ہم معنی تھے اور زندگی میں ان کو غم سے رہائی پانے کی اُمید نہ تھی پھر بھی جد و جہد سے ہاتھ کھینچ لینا ان کے مسلک تر کانہ کے خلاف تھا۔ دلی کالج کی فارسی پروفیسری کی پیش کش وہ صرف اس لیے ٹھکرا چکے تھے کہ ملازمت کے بعد انگریز حاکموں سے ہم حیثیتی و برابری کی امید نہ تھی۔ وہ محض غربت کی وجہ سے اپنے آپ کو کم مایہ سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مرزا کو اپنے مرتبہ اور اپنی عزت کا کتنا ہی احساس سہی لیکن روٹی کے بغیر جان و تن کا تعلق قائم نہیں رہ سکتا تھا اس لیے ان کے دوستوں نے ان کے لیے لال قلعہ میں ملازمت کی شکل پیدا کی اور وہ تاریخ تیموری لکھنے پر مامور ہوئے۔ وہ قلعہ کے لیے نئے نہ تھے لیکن ابھی تک بندگانِ دوست میں ان کا شمار نہیں ہوتا تھا۔ ان کی طبیعت ملک الشعرائی سے کم مرتبہ پر قانع نہ تھی لیکن اُستاد ذوقؔ (غالب کی گیارہ سال کی عمر سے) اُستادِ شاہ کے مرتبہ پر فائز تھے۔ ان کی زندگی میں غالب کو یہ مرتبہ نہیں مل سکتا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے چند سال پہلے ذوقؔ نے غالب کے لیے جگہ خالی کی۔ دربار اودھ سے بھی غالب کے لیے وظیفہ مقرر ہوا لیکن اودھ کے الحاق اور انقلاب نے یہ ذرائع پھر مسدود کر دیئے اور غالب برس دو برس قدرے آرام سے رہ کر پھر مصائب کا شکار ہو گئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء سے کچھ دن پہلے مرزا دربار رامپور سے بھی متعلق ہو گئے تھے اس لیے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد اُنھوں نے والیٔ رامپور نواب یوسف علی خاں ناظم سے بار بار مدد کی درخواست کی اور شاگرد نے اپنے قابلِ احترام اُستاد کی خدمت سے کبھی انکار نہیں کیا اور سو روپیہ ماہوار وظیفہ کے علاوہ غالب کی طلب پر وہ وقتاً فوقتاً ان کی خدمت کرتے رہے۔

غالب کے حوصلہ اور طلب کے مطابق نہ سہی لیکن بقدر سد رمق روٹی کا بندوبست ہو گیا تھا۔ لیکن غالب صرف روٹی کے سہارے زندہ رہنے والے آدمی نہ تھے۔ وہ اپنی خاندانی عظمت اور دودمانی مرتبہ کا بڑا شدید احساس رکھتے تھے۔ زمانے کی تبدیلی نے نسب اور خاندان کی عظمت تو خاک میں ملا دی تھی اب صرف علم و فن کی راہ سے دنیا میں وجاہت حاصل کی جا سکتی تھی۔ غالب نے "غدر" کا ہنگامہ ایک تماشہ بیں کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ اُنھیں سلطنت مغلیہ کے زوال سے عبرت تو ضرور ہوئی تھی لیکن کچھ کھونے کا غم نہیں ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے سماج میں غالب حسب دلخواہ کوئی جگہ نہیں پیدا کر سکے تھے۔ یہ حسرت ابھی تک ان کے دل میں پھانس کی طرح کھٹک رہی تھی۔ اب بدلے ہوئے حالات میں اُنھوں نے اپنے علم و فن کے بوتے پر انگریزوں سے اپنی شخصیت اور حیثیت تسلیم کرانی چاہی۔ اُنھوں نے جاگیر اور وظیفہ کی بحالی کے لیے کلکتہ تک کی خاک چھان ڈالی۔ انگریز حاکموں کی شان میں قصائد لکھے اور انگریزی دربار میں ملک الشعرائی کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ جب اس طرح کام نہ چلا تو ملکہ وکٹوریہ کی شان میں بھی قصیدہ لکھا اور اس طرح جو مرتبہ وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں نہیں حاصل کر سکے تھے وہ اُنھوں نے انگریزی دربار میں حاصل کرنا چاہا۔ غالب نے پنشن اور وظیفہ کے اجرا کے لیے کوششیں تو ۱۸۵۷ء کے واقعات سے پہلے سے شروع کر رکھی تھیں لیکن پوری کامیابی اُنھیں اس کے بعد بھی نہ ہو سکی اور ملک الشعرائی کی تمنا تو بعض انگریز حاکموں کی سفارش کے باوجود اس زمانے میں بھی پوری نہ ہوئی۔ ہاں، اُن کی وفاداری کے صلے اور قابلیت کے اعتراف میں ان کو انگریزی دربار میں داہنی طرف نشست ملی اور خلعت و انعام سے سرفرازی کا حکم ہوا لیکن غالب کی حوصلہ مند اور اولوالعزم طبیعت کو ان عطیات سے بھی سیری نہ ہوئی اور اُنھوں نے خواہش کی کہ ان کے خطابِ خان دربار میں بعد اونچی جگہ دی جائے لیکن یہ آرزو بھی شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی ــــ غالب کو اعتراف ہے کہ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

حالات کی ناہمواری اور تمناؤں اور عزائم کی طوفان خیزی غالب کی زندگی میں بسے ہوئے تضاد اور اس تضاد کی بنیاد پر پیدا ہونے والی کشاکش کی ذمہ دار ہے۔ اس کشاکش میں پڑ کر غالب نے زندگی کے ان گنت پہلوؤں کا تجربہ کیا ہے۔ یہی تجربہ غالب کی شاعری کو فکری تقلید سے آزاد کرتے ہیں اور

اُس کی نظر میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کرتے ہیں۔ اگر وہ حالات کے سامنے ہتھیار رکھ دیتے تو اردو شاعری کو ایک دوسرا میرؔ تو ضرور مل جاتا لیکن غالبؔ نصیب نہ ہوتا۔ اس کو اپنی عظمت کا احساس ہے لیکن حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر وہ در در کی خاک پھانکتا ہے۔ اُس کے مزاج کی شگفتگی مصائب کے اس اندھیرے میں بھی اُس کو چراغ دکھاتی ہے۔ وہ روتے روتے ہنس دیتا ہے اور اس طرح زندگی کے غموں پر فتح پانے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

غالبؔ صاف ذہن اور واضح فکر کا ادیب ہے۔ وہ دوسرے فن کاروں اور ادیبوں کے مطالعہ سے اپنے ذہن کو جلا اور اپنی فکر کو گہرائی عطا کرتا ہے۔ فن کے قدیم نمونوں کی تقلید کر کے جمود کے تودے میں صرف چند اینٹوں کے اضافے پر بس نہیں کرتا بلکہ نئی تعمیر کا حوصلہ رکھتا ہے اپنی تخلیقات سے، جس میں عہدِ قدیم کا رکھ رکھاؤ اور روحِ عصر کی تپش شامل ہے، تاریخ ادب میں ایک نئے دور کا آغاز کرتا ہے۔

غالبؔ نے جس زمانہ میں آنکھ کھولی ہے فن انسانی سطح سے بلند تر وجود رکھتا تھا۔ اُس کا انسان کی زندگی سے کم تعلق تھا۔ غالبؔ نے فن سے انسان کے نفس کی ترجمانی، اُس کی فطرت کی عکاسی اور اس کی زندگی میں پیش آنے والے حوادث و آلام کی تصویر کشی کا کام لیا ہے۔ غالبؔ انسان ہے فرشتہ نہیں ہے۔ اُس کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ انسان ہی نظر بھی آئے ـــــ گوشت و پوست کا پُتلا ـــــ انسانی عظمتوں اور کمزوریوں کا شاہکار ـــــ گرنے، اُبھرنے اور پھر چلنے والا وجود ـــــ ہواؤں کے تھپیڑوں سے بل کھانے اور پہلو بدلنے والا اور اس طرح طوفانوں سے اپنی ہستی تسلیم کرانے والا فن کار۔

غالبؔ کو زندگی کی تمام حسین چیزوں سے محبت ہے۔ لیکن یہ محبت انسان کی محبت ہے۔ دیوتاؤں کی پرستش نہیں ہے۔ وہ حُسن کو چاہتا ہے اور اُسے ایک تندرست انسان کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کی طلب کرتا ہے وہ روایتی مریضانِ محبت کا مذاق اُڑاتا ہے۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار　　　کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں؟

یہ خواہش زندگی کی تمام حسین چیزوں کی خواہش ہے۔ اسی خواہش کے برملا اظہار میں غالبؔ کے فن کی نمود ہے۔ غالبؔ کی زندگی بھی ریاکار اور تصنع پسند سماج کے لیے ایک چیلنج تھی۔ اُس نے جرأتِ اظہار کے جو نمونے چھوڑے ہیں وہ بڑے فکر انگیز ہیں اور فکر و خیال کی جولانی کے لیے نئے میدان مہیا کرتے ہیں۔ غالبؔ کو زمانے نے توڑ مروڑ کر رکھ دیا لیکن اُس سے ہتھیار نہیں رکھوا سکا۔ اُس نے بعض اوقات مخالف حالات سے بیچ میدان میں مصالحت کر لی لیکن میدان کسی حال میں خالی نہیں کیا۔ وہ دُنیا سے اگر پوری طرح فتحمند نہیں گیا تو اپنی پیشانی پر مکمل پسپائی کا داغ بھی نہیں لے گیا۔ اُس کے اشعار اُس کی زندگی کی سرگذشت ہیں۔ اس کے فکر و خیال کی توانائی ذیل کے اشعار میں جو سرسری طور پر منتخب کئے گئے ہیں، دیکھی جا سکتی ہے:

ہرگز اے ناداں برسوائی نہ بندی دل کہ من　　　ماہ را در ثور و کیواں را بہ میزاں دیدہ ام

مرا دلیست بہ پس کوچہ گرفتاری　　　کشادہ روئے تر از شاہدانِ بازاری

زطوطیان شکر خا مگوئے و از من جوئے　　　نشاطِ زمزمہ و لذتِ جگر خواری

دیوانہ وجہ رشتہ ندارد مگر ہماں　　　تارے کشد ز جیب کہ جائے رفو کند

دل درا فروختنش منّتِ دامن نہ کشید　　　شادم از آہ کہ ہم آتش و ہم باد آمد

تا نہ دانی جگر سنگ کشودن ہنر است　　　تیشہ داند کہ چہا بر سرِ فرہاد آمد

دارم دلے ز آبلہ نازک نہاد تر　　　آہستہ پا نہم کہ سرِ خار نازک است

غم لذتیست خاص کہ طالب بند آں　　　پنہاں نشاط ورنہ دو پیدا شود ہلاک

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی　　　پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی　　　عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم　　　اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے　　　عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ　　　لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد　　　ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　　گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں　　　ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب　　　ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　　لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت　　　یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ　　　تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

★

غالب — خطوط کے آئینے میں

رئیس مینائی

خطوط چونکہ آدمی کی داخلی اور خارجی زندگی کا ایک بے تکلف مرقع ہوتے ہیں اس لئے ان میں آدمی کے افکار و احساسات پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن (DR. JHONSON) کے اس قول سے ہمیں پوری طرح اتفاق ہے کہ "انسان کی روح اس کے خطوط میں عریاں ہوتی ہے" اس آئینہ میں ہم انسان کی نفسیات کا عکس دیکھ سکتے ہیں، اس سے ہماری بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں، اور بہت سے دھندلے نقوش ہمیں نظر آتے ہیں۔

کارل بیکر نے لکھا ہے کہ "انسانوں نے کیا کارنامے انجام دئے ہیں اس کا ریکارڈ تو مل جاتا ہے لیکن ان واقعات کے رونما کرنے میں دلی جذبات اور دماغی کیفیات کا کتنا حصہ ہے، اس کا علم صرف خطوط کے ذریعے ہوتا ہے" جذبات اور جبلتوں کے پوشیدہ و پیچیدہ رازوں کو خطوط ہی میں سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ ہر الجھے ہوئے مسئلے کو خطوط ہی کی روشنی میں سلجھایا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ خطوط اس کی زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ یہاں انسان تکلف کو برطرف کر دیتا ہے اور آورد کو بہت کم جگہ دیتا ہے بلکہ اس کے خطوط میں آمد ہی آمد ہوتی ہے۔ مہدی حسن افادی نے ایک مقام پر لکھا تھا:

"رقعے کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا یعنی اظہارِ خیال میں صنعت گیری طلب کی جگہ صرف آمدِ جذبات ہوتی ہے اس لئے لٹریچر کا یہ ضروری حصہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبۂ انشا پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے۔"

مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں ہم یہی نتائج اخذ کر سکتے ہیں کہ نامہ نگاری میں اہتمام اور رکھ رکھاؤ کا عمل دخل نہیں ہے۔ خطوط ہر انسان کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ انسان اثر آفرینی، حقیقت نگاری اور اظہار مافی الضمیر سے تلخ حقائق میں شکر گھول دیتا ہے۔ اردو ادب میں اس صنعت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

یوں تو اردو ادب میں بہت سے مشاہیر ادبا نے خطوط نویسی اور نامہ نگاری کو فروغ دیا ہے اور اس کو نئے تقاضوں اور نئے ادبی شعور سے ہم آہنگ کیا ہے۔ شبلی نعمانی اور مہدی افادی کے خطوط اردو ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ لیکن اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں صاف دکھائی دے گا کہ وہ صرف انشا پردازی اور نثر نگاری کا اعلیٰ نمونہ بن کر رہ گئے ہیں۔

اس کے بعد ابو الکلام آزاد نے زنداں کے تاریک گوشوں میں بیٹھ کر ذوقِ مخاطبت کی طلب گاریاں کی ہیں۔ اس طرح آزاد نے اپنے دل کش اور موثر طرزِ نگارش سے ایک منفرد انداز اور خاص اسلوب کی طرح ڈال دی اور ان کے خطوط کو عوام میں مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

نیاز فتح پوری نے غالب کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا اور اپنے کامیاب مکاتیب کی بنیاد بذلہ سنجی اور ظرافت پر رکھی اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر ایں ہمہ اصل اور نقل روپ اور بہروپ میں کہاں توازن قائم رہ سکتا ہے؟ مجنوں گورکھپوری نے "پردیسی کے خطوط" اور صفیہ اختر نے "حرف آشنا" اور "زیرِ لب" لکھ کر ادب میں اپنے لئے ایک الگ مقام بنا لیا۔ اس طرح خطوط نویسی اردو ادب کا ایک مستقل فن بن گئی۔ مگر غالب کی طرزِ تحریر اس کی سادگی و پرکاری، اس کی جاذبیت، دل کشی اور اثر انگیزی کو کوئی بھی نہ اپنا سکا۔ جذبات کی عکاسی ایسے بہترین پیرائے میں غالب نے کی ہے کہ وہ خطوط نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان کی خود نوشت سوانح عمری (AUTOBIOGRAPHY) معلوم ہوتے ہیں۔

ایں گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اس نادرِ روزگار ہستی، اس تاجدارِ اقلیمِ سخن نے جو خطوط لکھے وہ تکلف اور تصنع آرائی سے بالکل پاک ہیں۔ جس طرح وہ شعر و شاعری کے میدان میں چیز دگر

حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح وہ اس میدان میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ اردو نثر کے میدان میں غالب کے اشہب خامہ نے وہ جولانیاں دکھائی ہیں گویا زبان کو تحریر کا جامہ پہنایا اور اس میں اپنی ظرافت اور موثر طرزِ بیان سے بہت سی گلکاریاں کیں۔

مرزا ۱۸۵۰ء تک صرف فارسی ہی میں خطوط لکھتے رہے مگر سن مذکور میں یعنی آغازِ تصنیف مہر نیمروز کے تین سال بعد غالب نے اردو میں خط و کتابت کی اور اپنی جدت سے مکاتبہ کو مکالمہ بنا دیا۔ چنانچہ مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"زبان فارسی میں خطوط کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے
ہو گئے مضمحل قویٰ غالب ۔ اب عناصر میں اعتدال کہاں"

پہلے پہل مرزا غالب نے اردو میں نامہ نگاری کو باعث ننگ و عار سمجھا لیکن دیر تک اپنی اس رائے پر قائم نہیں رہ سکے۔ حالات نے کچھ اس طرح پلٹا کھایا کہ وہ زمانے اور ماحول کا ساتھ نہ دے سکے۔ جو چیز پہلے باعث ننگ و عار تھی وہی اب مقبولیت و شہرت کا موجب بنی اور جن اردو خطوط سے مرزا کو خدا واسطے کا بیر تھا وہی اب مرزا کے ایوانِ شہرت کے مضبوط ترین ستون اور ان کے تاجِ مقبولیت کے آبدار موتی ہیں۔ چنانچہ مرزا کے خطوط میں اسلوبِ بیان کا تیکھاپن، جدت و ندرت، شوخیِ تحریر، خوش طبعی، سنجیدگی، گہرائی و گیرائی سب کچھ ہے۔

غالب نے خطوط نویسی میں جدید اسالیب کی بنیاد ڈالی۔ ان کی طرزِ نگارش میں نادرہ کاری اور جدت طرازی کا پہلو نمایاں تھا۔ وہ ہر زہرہ گداز واقعہ کو قدرتی بے تکلفی کے ساتھ اس طرح جوڑ دیتے تھے کہ خود بخود اس واقعہ میں روانی اور شگفتگی پیدا ہو جاتی اور روانی مرزا کی شوخیِ تحریر کو اور نکھار دیتی ہے۔

غالب میں جو انفرادیت پائی جاتی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ مروجہ طرز اور عام اسالیب سے ہٹ کر انھوں نے ایک خاص اسلوب اور طرزِ بیان اختیار کیا اور اس نو آئین طرازی نے غالب کے تمام معاصرین کو چراغ پا بنا دیا مگر چونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے افکار و امیال کا بدلنا بھی ضروری ہے اس لئے اس طرزِ نگارش سے لوگوں نے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ اسی جدت نے غالب کو پرانی ڈگر سے ہٹا کر نئی راہوں پر چلنا سکھا دیا۔ ہر قدیم چیز میں انھوں نے تجدید کی روح پھونکی

بجھے بجھے خاکوں اور دھندلے نقوش کو غالب نے نیا رنگ روپ دیا۔

قدامت پرستی اور روایت کے ان طوق و سلاسل کو غالب نے توڑ دیا جن میں ہر شخص کی شخصیت بری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ طبیعت چونکہ فطرتاً رسم و تقلید سے آزاد تھی اس لئے ایک ممتاز لہجہ اور ایک منفرد انداز اختیار کیا اور عام راہوں سے الگ اپنی راہ نکالی۔ فرسودہ و پامال اور پیش پا افتادہ القاب و آداب جن کو متاخرین نے لوازمِ نامہ نگاری قرار دے رکھا تھا مرزا نے یک قلم ترک کر دیا۔

[illegible]

وہ کبھی میاں کبھی برخوردار کبھی بندہ پرور اور کبھی بھائی صاحب جیسے مانوس اور مناسب الفاظ سے خط کا آغاز کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی آہنگ میں خود فرماتے ہیں:

"خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لئے قلم اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے پکارتا ہوں جو اس کی حالت کے مطابق ہو اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں۔ القاب و آداب اور شکر و شکوہ شادی و غم کا پرانا طریقہ میں نے بالکل ترک کر دیا۔"

مرزا جو کچھ لکھتے ہیں تصنع اور بناوٹ ان کی تحریر میں نام کو بھی نہیں بلکہ ان کے خطوط میں روزمرہ کی عام بول چال ہے جو آورد اور تکلف کے بوجھ سے گرانبار نہیں۔ ان میں شیرینی اور گھلاوٹ، ٹھہراؤ اور بہاؤ، سادگی اور واقعیت ہے۔ ادائے مطلب کا طرز ان خطوط میں بڑا اچھوتا اور انوکھا اختیار کیا گیا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ گفتگو کر رہے ہوں۔ ایک خط میں حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں:

"مرزا صاحب! میں نے وہ طرزِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

اور یہی بات مرزا تفتہ کے ایک خط میں بھی لکھتے ہیں:

"بھائی تم میں مجھ میں نامہ نگاری کاہے کو ہے مکالمہ ہے۔"

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اردو نثر کا مستقبل فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوا لیکن مرزا صاحب نے اپنے مخصوص و منفرد اسلوبِ تحریر و طرزِ نگارش اور قدرتی بے تکلفی سے اس کو اور پروان چڑھایا۔ اس طرح اردو نثر کی ذہنی پرداخت فورٹ ولیم کالج سے نہیں بلکہ قلعۂ دہلی سے وابستہ تھی جہاں تمام شوخ گفتاریاں

لئے نجّس کیا اردو میں ایک نیا انداز ایجاد ہو بقول مولانا آزاد:

"مرزا غالب کے بہت سے رجحانات وامیال کی طرح یہ تاثر بھی ایک خاص جذبہ کا نتیجہ تھا"

نواب امین الدین احمد خاں باصرار غالب کو لوہارو بلوا رہے تھے مرزا انھیں لکھتے ہیں:

"واللہ نہیں آسکتا بالکل نہیں آسکتا دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں دوست نہ سہی دشمن بھی تو نہ ہوں گا محبت نہ سہی عداوت بھی تو نہ ہوگی"

مرزا صاحب ہمیشہ شراب نوش فرماتے تھے اور یہ نا و نوش کا سلسلہ ان کی گھٹی میں سما گیا تھا اس کی کیفیت ایک مرتبہ میر مہدی کو لکھ بھیجی اس باب میں جو طرز بیان مرزا نے اختیار کیا وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

"صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے انگیٹھی سامنے رکھی ہے دو حرف لکھتا ہوں اور ہاتھ تاپتا جاتا ہوں آگ میں گرمی نہیں ہائے وہ آتش سیال کہاں کہ دو جرعے پی لئے فوراً رگ رگ دپے میں دوڑ گئی دل توانا ہوگیا دماغ روشن ہوگیا نفس ناطقہ کو تو اجد بہم پہونچا ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب ہائے غضب! ہائے غضب!!

مرزا صاحب یوسف مرزا کے والد کے انتقال پر تعزیت نامہ لکھتے ہیں لیکن تحریر میں کتنی اثر انگیزی سی ہے ملاحظہ فرمائیے۔

"یوسف مرزا کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر کر یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے تعزیت یونہی کیا کرتے ہیں صبر کرو ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی، دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں پہلے بیٹا مرا پھر باپ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو"

اس حادثۂ روح فرسا اور سانحۂ جانکاہ نے مرزا کے دل پر چوٹ کر لگایا وہ مذکورہ خط کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے گویا ہر لفظ غم و الم کا مرقع ہے۔ مرزا حاتم علی مہر نے اپنی تصویر بھیجی ان کی رسید ان الفاظ میں ارسال کرتے ہیں:

"حلیۂ مبارک نظر افروز ہوا تھا۔ حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما تھا تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ میں جب جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کرتے تھے اب جب کبھی مجھ کو وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی گھٹی ہوئی ہے وہ مزے یاد آگئے کہ کیا کہوں جی پر کیا گزری۔

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے تو تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسّی بھی چھوڑی اور داڑھی بھی مگر یاد رکھیے اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، حافظ، ملّا، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ بھٹیارہ، منہ پر داڑھی، سر پر بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اس دن سر منڈایا"

خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"حضرت اب میں چراغ سحری ہوں رجب ۱۲۸۲ھ کی آٹھویں تاریخ سے اکہترواں سال شروع ہوگیا، طاقت سلب، حواس مفقود، امراض مستولی"

ان احوال وکوائف کو دیکھئے اور مرزا صاحب کے مکتوب الیہم کو جانچئے تو بقول نیاز فتح پوری آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ:

"وہ (یعنی مرزا غالب) کس قدر مزاج داں اور نبض شناس فطرت واقع ہوئے ہیں غیظ و غضب کی حالت ہو کیف و سرور ہو مزاج کا غلبہ ہو غم ہو خوشی ہو مصیبت ہو غرض کچھ ہو یہ ممکن نہیں کہ کوئی لفظ ان کے قلم سے ان کے مکتوب الیہ کی شان کے خلاف نکل جائے اور وہ ایک انچ دائرہ مزاج شناسی سے ہٹ جائیں صرف یہی نہیں کہ مدارج کو ملحوظ رکھیں صرف یہی نہیں کہ کوئی لفظ زائد یا خلاف طبع بھی استعمال نہ ہو یہ بھی ہے کہ مکتوب الیہم کی شان مزاج اور افتاد طبیعت پر بھی ہر فقرہ روشنی ڈالتا ہے اور اپنا رنگ طبیعت بھی ظاہر کرتا ہے"

قلم را آں زباں نبود کہ سرّ عشق گوید باز
بروں از حدّ تقریر است شرح آرزومندی

سوانحی نقطۂ نظر سے یہ خطوط بہت کارآمد ہیں خواہ کیسے ہی حالات کے

(بقیہ ص ۱۵۳ پر)

عظمتِ ہندوستاں ہے تو

ریاض اختر ادیبی کندر کوی

اے مشرقِ ادب کے درخشندہ آفتاب ! مغرب بھی تیری فکر کے جلووں سے فیض یاب
تیرا سلوک مظہرِ بیداریِ حیات تیرا مزاج گرمیِ احساسِ انقلاب
تو نے لٹائی بادۂ انوارِ حُسن و عشق اے سربراہ و ناظمِ مے خانۂ شباب
وجہِ فروغِ حُسنِ غزل تیری فکرِ خاص تیرا ہر اک خیال ظفر مند و کامیاب
بزمِ سخن کو، جشنِ طرب کو، خدا گواہ مہکا رہے ہیں اب بھی تری فکر کے گلاب
ہاں ! کر چکی ہے میرزا نوشہ بصد خلوص روزِ ازل عروسِ ادب تیرا انتخاب
ہر عہد میں بڑھے گی تری قدر و منزلت ہر دور میں رہے گا ترا ذکر کامیاب
پیرِ مغانِ مے کدۂ شعر، جھوم اُٹھے بخشی وہ تو نے جامِ غزل کو نئی شراب
محفل میں ذکرِ شاہد و مشہود چھیڑ کر تو نے عروسِ فکر کو بخشا نیا رباب

تیرا کلام روح نشاط و نشاطِ روح
حسن و جمالِ لالہ رخاں تیرا انتخاب

فخرِ ادب ہے، نازشِ اُردو زباں ہے تو دلّی کا دل ہے، عظمتِ ہندوستاں ہے تو
نقش و نگارِ عرشِ ادب میں ترے خطوط جدّت طرازیوں کا عجب آسماں ہے تو
نازاں ہے تجھ پہ آج بھی سوز و گدازِ میر سُوز و گدازِ میر کا وہ پاسباں ہے تو
آئینہ دارِ بزم تری انفرادیت تنہا سہی پہ انجمن و کارواں ہے تو
عرشِ غزل کے چاند ستارے ہیں تیرے شعر شامِ غزل کی کاکلِ عنبر فشاں ہے تو
حسّاس و خوش مزاج، سخن سنج و وضع دار نازک خیال و نکتہ رس و نکتہ داں ہے تو
جشنِ طرب میں رندِ بلا نوش و بذلہ سنج راہِ طلب میں عارفِ دردِ نہاں ہے تو
پھر منتظر ہے شیخ و برہمن کی چشمِ شوق اے رہ نمائے راہِ طریقت کہاں ہے تو
پامال ہو رہی ہے زباں، مٹ رہے ہیں نقش ان حادثات میں بھی ابھی تک جواں ہے تو

فردوسِ رنگ و بو ہے ترا جشنِ یادگار
یادش بخیر، طوطیِ باغِ جناں ہے تو

غالب نما

عبدالمجیب سہالوی

ہمارے ایک جاننے والے ہیں جنھیں ہم لوگ 'غالب نما' کہتے ہیں کیونکہ وہ غالب کے معاملہ میں ہمارے لئے جامِ جہاں نما کا کام دیتے ہیں اور کلام غالب کے ہر پہلو پر روشنی ہی نہیں بلکہ فلیش لائٹ ڈال سکتے ہیں۔

ایک دن میں نے کہا کہ آپ جیسے 'غالب نما' دوست کی موجودگی میں غالب کے طنز و مزاح کی تلاش میں اگر مجھے ان کے دیوان کی ورق گردانی کرنی پڑے تو یہ نہ صرف میرے لئے تکلیف دہ بلکہ آپکے لئے توہین آمیز بھی ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ غالب کے ایک دو نہیں پچاسوں اشعار ملیں گے جن میں ایسا بھرپور طنز و مزاح پایا جاتا ہے کہ سن کر طبیعت پھڑک اٹھتی ہے اور شعر کے کوزے میں طنز و مزاح کا دریا بہتا نظر آتا ہے۔

میں نے محض چھیڑنے کے لئے کہا مگر غالب صاحب نے مزاح نگار ہونے کے بجائے اپنے متعلق ولی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور کہا ہے ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

انھوں نے کہا معاف کیجئے گا میرا خیال تھا کہ آپ مزاح کا اچھا خاصا ذوق رکھتے ہوں گے مگر اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ آپ اس معاملے میں بالکل کورے ہی ہیں۔ اجی حضت! بادہ نوشی کے ساتھ مسائل تصوف کا بیان بجائے خود ایک گہرا طنز اور بھرپور مذاق ہے۔ دیکھئے نا! کس خوش اسلوبی سے غالب صاحب نے بادہ نوشی کا بہانہ ڈھونڈھ کر ولی ہونے کی پابندیوں سے اپنے کو صاف بچا لیا۔

غالب صاحب ان آزاد منش بزرگوں میں سے ہیں کہ بندگی میں بھی اپنی آزادی اور آن پر آنچ نہیں آنے دیتے اور دل میں بندگی کا شوق بے پایاں لئے ہونے کے باوجود اگر درِ کعبہ کھلا نہ ملا تو الٹے پاؤں واپس آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو کس آن بان کا شعر کہا ہے ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

میں نے کہا جناب والا! غالب کی آن و شان کے متعلق کس کافر کو شبہ ہے۔ میں نے تو آپ سے ان کے طنز و مزاح پر روشنی ڈالنے کے لئے عرض کیا تھا۔

وہ بولے روشنی اس چیز پر ڈالی جاتی ہے جو ڈھکی چھپی ہو۔ غالب کے کلام میں شوخی اور شگفتگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اب اگر کسی کو نہ دکھائی پڑے تو یہ کلام کا نہیں نظر کا قصور ہے۔

میں نے کہا کہ جاں بخشی ہو تو عرض کر دوں کہ غالب کے اس شعر میں مجھے میٹھا درد تو محسوس ہوتا ہے لیکن طنز و مزاح کی چاشنی کا دور دور پتہ نہیں چلتا ؎

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

انھوں نے کہا کہ قربان جائیے آپ کی سمجھ کے۔ کیا غالب کے کلام میں طنز و مزاح کی چاشنی کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے کلام میں سوائے طنز و مزاح اور کسی جذبے کا اظہار ہی نہ ہوگا۔ شاعر کوئی گاڑی کا بیل تو ہوتا نہیں کہ ایک ہی لیک پر سر جھکائے چلا جائے۔ وہ گرد و پیش کے حالات، خیالات اور جذبات سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے ڈھنگ سے اس تاثر کا اظہار کرتا ہے۔ غالب صاحب نے کہا نہیں کہ ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

غالب کے شوخ اور شگفتہ طرز بیان ہی نے اس شعر میں جان ڈال دی ہے ورنہ رازداں کے رقیب بن جانے کا واقعہ کوئی نیا نہ تھا۔ جہاں تک غالب کا تعلق ہے ان کا کلام تو ایک بحرِ بےکراں ہے جس کی تہہ میں ہر قسم کے لعل و گہر پائے جاتے ہیں۔ شوخی اور شگفتگی بھی، درد اور ٹیس بھی۔ دردمند دل یہ شعر پڑھ کر ؎

مختصر مرنے پہ ہو جس کی امید   ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

ایسا محسوس کرتا ہے کہ جیسے غالب نے اس کا درد دل زبان شعر سے ادا کر دیا ہے اور تڑپ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بے دھڑک عاشق آداب عشق سے منہ موڑ کر اظہار درد عشق کے بجائے دست درازی پر اتر آتا ہے تو پھر اس کا جو رد عمل معشوق پر ہوتا ہے اس کی نقشہ کشی بھی ایسے دلچسپ پیرائے میں کی ہے کہ عاشق ہی کی نہیں شعر پڑھ کر ہماری آپ کی چند یا میں بھی گدگدی ہونے لگتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوا نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

میں نے کہا اب آپ آئے ہیں ڈھرے پر۔ خدا کے لئے اب بہک کر کلام غالب کے بحر بے کراں میں ڈبکیاں نہ لگانے لگئے گا ورنہ مجھے غوطہ خوروں کو بلانا پڑے گا اور میرا اور آپ کا دونوں کا وقت ضایع ہوگا۔

اس کے بعد انھوں نے موج میں آکر کہا کہ طنز و مزاح کی موٹی موٹی کتابیں بھی اس شعر کے پاسنگ بھی نہیں ہو سکتیں۔ سنو! اور یاد رکھو! کہ بزم یار میں کبھی بھولے سے بھی غیر کی موجودگی کا شکوہ نہ کرو گے ورنہ وہی حشر ہوگا جو غالب صاحب کا ہوا۔ کس بے بسی سے فرماتے ہیں ؎

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

میں نے کہا جی ہاں! غالب صاحب کی اسی بے بسی پر مجھے بھی یاد آگیا کہ وہ خود دار طبیعت جس نے در کعبہ بند ہونے پر غالب صاحب کو الٹے پاؤں واپس ہونے پر مجبور کر دیا تھا عشق کے ہاتھوں اس کا یہ حال ہو گیا کہ در یار بند دیکھ کر واپس ہونے کے بجائے پاسباں کے پاؤں پکڑنے پر آمادہ ہو گئی اور بچارے غالب صاحب کے لینے کے دینے پڑ گئے' فرماتے ہیں ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

وہ بولے ارے بھئی! عشق کی خانہ خرابی کا تو بچارے غالب صاحب نے خود ہی بڑی صفائی سے اقرار کیا ہے اور کہا ہے ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میں نے کہا کہ اگر آپ 'دخل در غالبیات' کو برا نہ مانیں تو عشق کی خرابی کے ساتھ لگے ہاتھوں اعتبار عشق کی خانہ خرابی بھی دیکھتے چلئے جس کے نتیجے میں غیر کی آہ پر غصہ غالب صاحب کو سہنا پڑا ؎

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ سے ہوا

وہ بولے بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر غالب صاحب ظریف تھے اور ان کا محبوب ستم ظریف اسی لئے جور و جفا کے ایسے انوکھے اور اچھوتے ڈھنگ نکالتا کہ گلے اور شکوے کے بجائے بے اختیار اس کی ستم ایجادی کی داد دینی پڑتی۔ دیکھئے نا! غالب صاحب کے چپکے چپکے رونے پر کیسا کچوکا لگایا ہے ؎

چپکے چپکے مجھ کو روتا دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست

سچ کہئے اس شوخی پر صدمہ ہوگا یا صدقے ہونے کو دل چاہے گا۔

میں نے کہا آپ اس کی شوخی پر صدقے ہونے کو کہتے ہیں غالب صاحب تو اس کی سادگی پر مرتے ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

انھوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ ہاتھ میں تلوار ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ غالب صاحب نے ایسا دھان پان نازک محبوب ڈھونڈھ نکالا تھا کہ ہاتھ آنے پر بھی ہاتھ لگاتے ڈر لگتا تھا ؎

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

میں نے کہا غالب صاحب کا محبوب نازک ہونے کے باوجود تھا بڑا ظالم۔ وہ تلوار ہاتھ میں نہ رکھتا لیکن جلاد کو ساتھ ضرور رکھتا تاکہ غالب صاحب تلوار کے گھاؤ سے مرنے کے بجائے اس کی آواز پر مرنے لگیں چنانچہ یہی ہوا ؎

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

انھوں نے کہا بھئی! اس کی آواز ہی کچھ ایسی رسیلی تھی کہ غالب صاحب کیا رقیب کے منہ میں بھی ڈھیروں پانی آجاتا اور گالیاں کھانے کے بعد بے مزا ہونے کے بجائے اس ذوق و شوق کے ساتھ زبان چاٹنے لگتا کہ معلوم ہوتا تھا کہ گالیاں نہیں رس گلے کھا رہا ہے۔ غالب صاحب نے کیا کہا ہے ؎

کتنے شیریں ہیں اس کے لب کہ رقیب   گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

میں نے کہا رقیب چٹورا تھا کہ لبِ شیریں سے گالیاں سن کر زبان چاٹنے لگا۔ غالب صاحب کو دیکھئے کہ انھیں اس بات کا صدمہ ہے کہ وہ اس کی گالیوں کا جواب دعاؤں سے نہ دے سکے کیونکہ ساری دعائیں صرفِ درباں ہو چکی تھیں۔ فرماتے ہیں ؎

اُس نے گیا بھی تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

وہ بولے غالب صاحب تو بڑے میاں آدمی تھے ان کے منہ سے دعا کے بجائے گالی نکل ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ تو دل کے رہزن کا معاملہ تھا' وہ بچارے تو چور اور ڈاکوؤں کو بھی گالی کی جگہ دعا ہی دیتے۔ کہتے ہیں۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

میں نے کہا شرافت کی وجہ سے گالی تو نہ دیتے لیکن بخشتے نہ تھے اور یہاں کا بدلہ وہاں چکانے کا منصوبہ بنا لیتے اور کہتے ؎

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

انھوں نے کہا بات یہ ہے کہ غالب صاحب درِ کعبہ بند دیکھ کر الٹے پاؤں لوٹ تو آئے لیکن کعبہ سے دلی لگاؤ کی بنا پر کعبہ سے نکالے ہوئے بتوں کی تلاش میں یہ کہتے ہوئے چل کھڑے ہوئے ؎

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

لیکن جب بتوں کی ہنسی بتوں کے پاسبان کی مایوسی پر جان بچانی مشکل ہو گئی تو بے بس ہو کر خدا کے گھر سے نکالے ہوئے بتوں سے خلد میں بدلہ لینے کی ٹھان لی۔

میں نے کہا مگر میں نے تو بڑے معتبر نانی سے سنا ہے کہ ع

جب کیا ظلم بتوں نے تو خدا یاد آیا

اور پھر جب غالب صاحب کے دل نے بتوں سے منہ موڑ کر کعبہ کا رُخ کرنے کو کہا تو غالب صاحب نے منہ پیٹ لیا اور کہا ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب   شرم تم کو مگر نہیں آتی

اس کے بعد' غالب نما' صاحب یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے ؎

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

★

غالب خطوط کے آئینے میں

(بسلسلہ ص ۱۵۰)

تحت کیوں نہ لکھے گئے ہوں۔ چنانچہ دہلی میں ۱۸۵۷ء کا جو خونچکاں اور دل دوز ڈرامہ ہوا اس کی صحیح اور موثر داستان انھیں خطوط میں ملتی ہے اور پھر ان خطوط میں مرزا کی سوانح عمری اور ذاتی حالات حرف بحرف موجود ہیں۔ اس صاف و شفاف آئینہ میں ہم مرزا کی نفسیات کے خد و خال کا عکس دیکھ سکتے ہیں ان کے ادبی اور نجی زندگی کے اکثر پہلوؤں کو تولنے اور ناپنے کے بہت سے پیمانے معلوم ہوتے ہیں اور ان خطوط کے مطالعے کے بغیر غالب کی پیچیدہ' تہ دار' اہم اور پہلو دار شخصیت کا سمجھنا تقریباً محال ہے۔

نظم و نثر کے تمام کرشمے غالب کی طبعی شوخی' فطری مزاح' جدت طرازی اور بذلہ سنجی کا نتیجہ ہیں یہ خطوط ہمیں اس دور کے تاریخی واقعات کے بارے میں بہت کچھ معلومات بہم پہنچاتے ہیں بقول رشید احمد صدیقی:

"دہلی کے شعر و ادب اور تاریخ و تہذیب کے محققین کے لئے یہ خطوط اپنے اندر بڑی بصیرت رکھتے ہیں"

جن مخصوص دمنفرد اسلوب تحریر اور طرز نگارش کو غالب نے رواج دیا اور جس طرح انھوں نے اپنے قلم اعجاز رقم سے عروسِ سخن کی مشاطگی کی اردو اس کے احسان سے کبھی سبکدوش نہ ہو گی ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

غالب کی فارسی غزلیں اور فلسفیانہ مسائل

ایک سرسری جائزہ

ڈاکٹر انوار الحسن

بقول شبلی نعمانی "شاعری میں فلسفہ تصوف کے راستہ سے آیا چوں کہ اکثر تصوف کی سرحد فلسفہ سے ملتی ہے اس لیے صوفی شعرا فلسفہ کے مسائل بھی ادا کیا کرتے تھے"۔ سب سے پہلے فارسی شاعروں میں "ناصر خسرو" نے فلسفیانہ خیالات نظم کیے لیکن اس کا انداز بیان شاعرانہ نہیں۔ ناصر کے بعد نظامی گنجوی نے فلسفیانہ شاعری کو ترقی دی اور اس وقت سے شاعری میں فلسفیانہ مضامین کا بیان عام ہو گیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس میں اتنی اور تبدیلی ہوئی کہ مسائل فلسفہ کی پیچیدگیوں کے بجائے فلسفیانہ رنگ کے خیالات نظم کیے جانے لگے۔ اس ضمن میں سحابی، عرفی، نظیری، اور جلال اسیر وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ہندستان کے فارسی گو شعرا میں نظیری، عرفی، فیضی، ظہوری، جلال اسیر، طالب، کلیم، صائب، ناصر علی سرہندی، شیخ علی حزین، بیدل اور مرزا غالب نے فلسفیانہ رنگ اختیار کیا۔

جلال اسیر کا فلسفیانہ رنگ ان کی خیال بندی اور لفظی صناعی سے بوجھل نظر آتا ہے۔ بیدل اور ناصر علی سرہندی بھی انھیں کے متبع ہیں۔ صائب نے تمثیلی انداز اختیار کیا اور اسے اخلاقی مضامین کے لیے مخصوص کر دیا۔ فیضی اپنے جوش بیان اور استعارات کی شوخی کے لیے ممتاز ہوئے۔ عرفی کی غزلوں میں فلسفیانہ خیالات بکثرت ملتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ شاعرانہ طرز ادا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ نظیری خشک فلسفیانہ مضامین کو اپنی جدت ادا، حسین ترکیبوں، اور انوکھی بندشوں سے اس طرح پیش کرتا ہے کہ خشک ناگوار بھی گوارا بن جاتا ہے۔ غالب، عرفی و نظیری کے ہم زبان ہی نہیں اس خصوصیت کے استعمال میں شریک غالب رہے۔ "لا" اور "الا" نفی و اثبات کے علامات ہیں۔ غیر خدا کا انکار اور خدا کا اقرار اہم فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ غالب توحید کے اس اہم مسئلہ کو یوں حل کرتے ہیں ؎

چاکِ "لا" اندر گریبانِ جہات افگندہ ایم   بے جہت بیروں خرام از پردۂ پندار ما

سراغ وحدت ذاتش تواں ز کثرت جست   کہ سائرست در اعداد بے شمار یکے

عقل در اثبات وحدت خیرہ می گردد چرا   ہر چہ جز ہستی ست ہیچ و ہر چہ جز حق باطل است

بر کمال تو در اندازۂ کمال تو محیط   بر وجود تو در اندیشۂ وجود تو دلیل

غالب الف ہماں علم وحدت خود ست   بر "لا" چہ بر فزود اگر "الا" نوشتہ ایم

ذات باری تعالیٰ کو پہچاننے کی کوشش ہر شخص اپنی بساط کے مطابق کرتا ہے۔ جس کی نگاہ جہاں تک پہنچتی ہے، دیکھتا ہے۔ کسی کو صاف دکھائی دیتا ہے تو کسی کو دھندلا۔ کوئی دور سے دیکھتا ہے تو کوئی قریب سے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہچاننے کے دعویدار اسے پہچان نہ سکے، جلوہ کے طلب گار جلووں کے ہجوم میں آنکھیں خیرہ ہو جانے کے سبب دیکھ نہ سکے۔ پھر بھی جس نے جتنی جھلک دیکھ لی اسی کو بہت کچھ سمجھا اور اسی پر رائے قائم کر لی۔ غالب اس حقیقت کی اس طرح پردہ کشائی کرتے ہیں:

آخر اے بو قلموں جلوہ کجائی کاینجا   ہر چہ دادند نشان تو غلط بود غلط

خوں چکاں ست نسیم از اثر نالۂ من   کیست کز بے نظریئے بہ دیار برد؟

نشان دوست ندانم ہمیں کہ پردہ دست   زد ر سپردہ زنِ در می تواں فریفت مرا

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر ست   خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردہ ای

اور انتہائے شوق میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محبوب کی نشانیوں ہی کو عاشق

آنکھوں سے [illegible] ہے۔ اُسے اُنھیں اشیاء میں اپنے محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ لیکن یہ صورت صرف وقتی تسکین کا ذریعہ بنتی ہے۔ حسن حقیقی کی متلاشی اور جلوۂ تمام کے لیے بیتاب نگاہیں اس وقتی تسکین سے مطمئن نہیں ہوتیں۔ اسے غالب کی زبان سے سُنیے:

ہجومِ گل بہ گلستاں ہلاکِ شوقم کرد ۔ کہ جانہ ماندہ و جائے تو ہم چناں خالی ست

آفتابِ عالم شرگشت گیہائے خودیم ۔ می رسد لیئے تو از ہر گل کہ می بوئیم ما

او رہ وجود حقیقی کا متلاشی انسان تلاش و جستجو کی تگ و دو میں تھک کر کبھی اپنی ہی ذات کے محور پر گردش کرتا ہے۔ پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی ہستی ہستیٔ کامل یا وجود حقیقی کا ایک جزو ہے، سمندر کا ایک قطرہ ہے، صحرائے ناپیدا کنار کا ایک ذرہ ہے:

از وہم قطرگیست کہ در خود گمیم ما ۔ اما چو وا رسیم، ہماں قلزمیم ما

پنہاں بہ عالمیم ز بس عین عالمیم ۔ چوں قطرہ در روانیٔ دریا گمیم ما

اور یہ قطرہ جب سمندر میں مل جاتا ہے تو اس کی ہستی گو بظاہر فنا ہو جاتی ہے لیکن درحقیقت اس میں ثبات و قرار پیدا ہو جاتا ہے ؎

سرمایۂ ہر قطرہ کہ گم گشت بہ دریا ۔ سود یست کہ ما نا بہ زیاں ست و زیاں نیست

موجہ از دریا شعاع از مہر حیرانی چراست؟ ۔ محوِ اصلِ مدعا باش و بر اجزائش مپیچ

قدیم صوفیائے کرام نے نفی خودی کی تعلیم دی اور ان کا عقیدہ تھا کہ انسان خودی کو فنا کر کے خدا کو پا سکتا ہے جو منتہائے آرزو ہے۔ غالب اسے یوں پیش کرتے ہیں ؎

کم خود گیر و بیش شو غالب ۔ قطرہ از ترکِ خویشتن گہر ست

انسان کا وجود اس کائنات میں بہت مختصر اور بظاہر بہت کم ہے لیکن تخلیق کائنات کا منشا اسی کی ذات ہے۔ غالب کی نکتہ آفریں زبان سے سُنیے ؎

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشیم ۔ ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

اور وجود انسانی سے نظریں ہٹا کر جب وہ کائنات کی حقیقت پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ؎

ہر چہ بینی بجہاں حلقۂ زنجیرے ہست ۔ ہیچ جا نیست کہ ایں دائرہ باہم نہ رسد

غالب کا خیال ہے کہ انسان کے اجزائے ترکیبی میں سب سے اہم جزو "دردِ دل" ہے ؎

کمال دردِ دل اصل ست در ترکیب انسانی ۔ بخوں آغشتہ اند اندر بُن موئے جانے را

غم لذتیست خاص کہ طالب ذوق آں ۔ پنہاں نشاط در رگ و پیدا شود ہلاک

اور ان کے نزدیک "مرد" وہ ہے جو ہجوم تمنا میں ہلاک ہو جائے کیونکہ تمنا زندگی کی نشانی ہے ؎

مرد آں کہ در ہجوم تمنا شود ہلاک ۔ از رشک تشنہ کہ بہ دریا شود ہلاک

ہجوم تمنا میں ہلاکت کا درس دینے کے ساتھ قطع خواہشات کے مسئلہ پر غالب صاف گوئی اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قطع خواہش ارادۃً آسان نہیں ؎

ہم بہ خواہش قطع خواہش خواستند ۔ عذر خواہش ہائے بے جا خواستیم

کیونکہ دنیا میں ذوق کا مجوئی کو ترک کرنا امر مشکل ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس عالم اسباب میں رہتے ہوئے بھی اس کے اسباب سے نظر ہٹا کر مسبب الاسباب کو اختیار کرنا چاہیے ؎

بہ گیتی ترکِ ذوقِ کامجوئی مشکل ست اما ۔ تو بہ خرمی آں را اگر گیرد دلی زاسباب بش

انسان اپنے ارادہ و عمل میں مجبور ہے کہ مختار، فلسفی اسے "مسئلہ جبر و اختیار" سے تعبیر کرتے ہیں۔ صدیوں سے یہ مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا ہے۔ موافق و مخالف دونوں گروہ مضبوط دلائل پیش کرتے ہیں۔ شعراء نے بھی اس موضوع پر قلم اُٹھایا اور خوب خوب گل فشانی کی۔ خیام "جبر" کا قائل تھا یعنی انسان اپنے ہر عمل میں مجبور محض ہے جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے، اس کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے خیر و شر کی تمام ذمہ داری بھی اسی پر ہے۔ غالب اس پیچیدہ مسئلہ اور مشکل عقدہ کو صرف دو مصرعوں میں یوں حل کرتے ہیں ؎

در آں چہ من خواہم ز احتیاط چہ سود؟ ۔ بداں چہ دوست نہ خواہد ز اختیار چہ حظ

یہ دنیا دارالعمل ہے۔ یہاں کی کوئی شئے بے سبب نہیں، بے ضرورت نہیں، بیکار نہیں ـــــ عمل کے بغیر یہاں کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، کوئی غرض پوری نہیں ہوتی اور کوئی کام انجام نہیں پاتا ؎

ماہ و خورشید در ایں دائرہ بیکار نیند ۔ تو کہ باشی کہ بہ خود ز حمت کارے نہ دہی

زندگی حرکت و عمل کا نام ہے، جمود و قرار موت کی نشانی ہے

مالگہ، بھاگلپور ۹۰۱۸ اشک

اسی لیے غالبؔ حرکت و عمل کی تعلیم دیتے ہیں جسے بعد میں اقبال نے زیادہ واضح صورت میں پیش کیا ؎

نشانِ زندگیٔ دل دویدن ست ، ألبتہ   جلائے آئینۂ چشم دیدن ست ، مخسپ

وہ صرف حرکت و عمل کا ہی درس نہیں دیتے۔ مشکل پسندی ان کی فطرت تھی ؎

فراغت برنہ تابد ہمتِ مشکل پسندِ من   ز دشواری بجاں می افتدم کارے کہ آساں شد

گر بود مشکل مرنج اے دل کہ کار   چوں رود از دست آساں می رود

رفتن بہ بلا دہ کہ دگر بیم بلا نیست   مرغِ قفسی کشمکشِ دام ندارد

فارسی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق   باشد بہ قدر ہمت تو اعتبار تو

اسی مضمون کو عربی کے ایک مشہور شاعر متنبی نے یوں ادا کیا ہے ؎

علیٰ قدر اھل العزم تأتی العزائم
وتأتی علیٰ قدر الکرام المکارم

(یعنی لوگوں کے عزم و حوصلے کے بموجب عزائم انھیں پیش آتے ہیں اور بلند مرتبہ لوگوں کے مجد و شرف کے بموجب انھیں مراتب حاصل ہوتے ہیں) غالبؔ کی زبان سے انھیں خیالات کو سنئے :

قضا در کارہا اندازۂ ہر کس نگہ دارد   بہ قطعِ وادیٔ غم می گمارد تیز گاماں را

ہائے پرکاریٔ ساقی کہ بہ اربابِ نظر   مئے اندازہ ز پیمانہ بہ اندازہ دہد

ہر رشحہ بہ اندازۂ ہر حوصلہ ریزند   میخانۂ توفیق خم و جام ندارد

دنیا انقلابات کی جگہ ہے۔ یہاں ہمیشہ کسی کا ایک حال نہیں رہتا۔ نشیب و فراز اس جہانِ فانی و گذراں کی خصوصیت ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ کبھی ہم بھی سرسبز و شاداب تھے مگر اب زمانے کے ہاتھوں خس و خاشاک بن چکے ہیں لیکن شعلوں کی طلب باقی ہے اور شعلوں کو بھی چاہئے کہ مجھے خس و خاشاک سمجھ کر مجھ سے کنارہ کشی نہ کریں بلکہ ان کا مسکن تو یہیں ہے ، آئیں اور میری آغوش میں رقص کریں ؎

سرسبز بودہ بہ چمنہا چمیدہ ایم   اے شعلہ درگذر از خس و خار ما برقص

نکتہ آفرینی ، بذلہ سنجی اور شوخی غالبؔ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا نیز الفاظ کی صورت گری اور صناعی ان کا ادنیٰ کھیل ہے۔ چند نمونے دیکھئے۔ یہاں بھی ان کی فلسفیانہ ژرف نگاہی برقرار اور حکیمانہ اندازِ بیان قائم ہے :

محتشم زادۂ اطرافِ بساطِ عدمیم   گوہر از بیضۂ عنقاست بہ گنجینۂ ما

زحمتِ عام ست دائم خاص را   عشرتِ خاص ست ہر دم عام را

بادہ اگر بود حرام بذلہ خلافِ شرع نیست   دل نہ نہی بہ خوبِ ما طعنہ مزن بہ زشتِ ما

با اضطرابِ دل ز ہر اندیشہ فارغم   آسائشے ست جنبشِ ایں گاہوارہ را

پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا منہ   در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش است

برقِ تمثالِ سراپائے تو می خواست کشید   طرزِ رفتار ترا آئینہ دار آمد و رفت

الفاظ کی معمولی تبدیلی سے معنی آفرینی ان کا دلچسپ مشغلہ ہے جو ان کی زبان دانی اور قادر الکلامی کا بیّن ثبوت ہے :

رہ بہ فرو ماندگی داد فرو ماندگاں   سایہ در افتادگی وقفِ ہر افتادہ است
مستیٔ دل دیدہ را محرمِ اسرار کرد   بیخودیٔ پردہ دار پردہ در افتادہ است

مو برنتابد ایں ہمہ پیچ و خم و شکن   زلفِ تو روزنامۂ بختِ سیاہ کیست ؟

ظالم ہم از نہادِ خود آزار می کشد   بر فرق از دہ ازدہ تشدید بودہ است

چرخ ہر روز م غمِ فردا بخوردن می دہد   تا قیامت فارغ از فکرِ معاشم کردہ اند

تا گل برنگ و بوئے کہ ماند کہ در چمن ؟   گل در پئے گل آمدہ در جستجوئے گل

دور افتادم ز یار ماہی بے دجلہ ام   نیست دلم دو کنارِ دجلۂ بے ماہیم

دیوانہ وحشتہ نہ دارد مگر بہار تا سے کشد ز جیب کہ چاکے رفو کنند

دشوار بود مردن و دشوار تر از مرگ آنست کہ من میرم و دشوار نہ داند

دانم کہ نہ دانست و ندانم کہ غم من خود کمتر از آنست کہ بسیار نہ داند

چشمے سیاہ دارد یعنی بہ مانہ بیند روئے چو ماہ دارد امّا بہ ما نہ دارد

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرماں روائے وقت نمرود نے آگ میں ڈال دیا تھا کیونکہ انھوں نے بتوں کی بے حرمتی کی تھی لیکن آگ گلزار بن گئی اور حضرت ابراہیمؑ پر کوئی اثر نہ کر سکی۔ اکثر شعراء اس تلمیح کو نظم کرتے رہے ہیں۔ غالب کی نکتہ آفریں زباں سے بھی سُنئے۔ کہتے ہیں "تم نے سُنا ہے کہ آتش نمرود حضرت ابراہیمؑ کو جلا نہ سکی لیکن اس سے زیادہ محیر العقول بات تو یہ ہے کہ میں شعلوں اور انگاروں کے بغیر جل رہا ہوں ؎

شنیدۂ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیمؑ ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

ناصح کا کام تلخ نصیحتیں کرنا ہے وہ رندوں کو تلخ و ترش نصیحتیں کرتا ہے لیکن غالب اسے جواب دیتے ہیں کہ جاؤ جاؤ مجھے تمھاری تلخ نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس سے زیادہ تلخ شراب میرے پاس موجود ہے ؎

نگفتہ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند ست

جلوؤں کا طلبگار عاشق چاہتا ہے کہ کسی طرح اپنے محبوب کے جمالِ جہاں آرا کی ایک جھلک ہی دیکھنے کو مل جائے۔ اس کے لیے وہ نئی تدبیریں کرتا ہے لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ آخر وہ ایک دن اپنے محبوب کو یہ کہہ کر غصہ دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ "باغ میں تو پھول ہی اچھے لگتے ہیں" یعنی پھولوں کا حسن محبوب کے حسن سے بڑھ کر جاذبِ نظر اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محبوب کو اپنے عاشق کی یہ اہانت آمیز اور طنزیہ گفتگو پسند نہیں آسکتی وہ جھنجھلا کر اپنے چہرے کی نقاب اُٹھا دے گا کہ لو دیکھ لو پھول اچھے ہیں یا میرا چہرہ۔ اسے غالب کی زبان سے سُنئے ؎

بے پردہ شوز غصہ و الزام دہ مرا گفتم کہ گل خوش ست بہ گلشن دریں چہ بحث؟

محبوب عاشق کے سامنے اپنے چہرہ کی نقاب اُٹھانے کو تیار نہیں اور عاشق ایک جھلک دیکھنے کو بے قرار ہے۔ منتوں اور سماجتوں کا محبوب پر کوئی اثر نہیں۔ عاشق نئی نئی تدبیریں کرتا ہے لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ اب وہ اسے اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ میری آنکھیں تو آئینہ کی طرح ہیں جس میں سب اپنا عکس دیکھ سکتے ہیں لیکن وہ خود کسی کو نہیں دیکھ سکتا اس لیے میرے سامنے بے نقاب ہو جانے میں کوئی ڈر کی بات نہیں۔

بے پردہ شو ز ناز و میندیش کہ مارا چوں آئینہ چشمے ست کہ دیدن نہ شناسد

نیا چاند نکلتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بڑھ کر محبوب کی جبین نازیں جائے لیکن چودھویں تاریخ تک عروجِ ماہ کی یہ ساری کوششیں رائگاں ہوتی نظر آتی ہیں اور وہ دیکھتا ہے کہ ناکامی کا سامنا ہے تو شرم و ندامت سے پندرہویں تاریخ سے گھٹنا شروع ہوتا ہے ؎

چوں بہ سجد کہ نہ آنست بکاہد از شرم ماہ یک چند ببالد کہ جبینِ تو شود

ساز کے پردوں کو چھیڑیئے تو اس سے نغموں کی بارش ہوتی ہے۔ جام ٹوٹتا ہے تو اس کی جھنکار کانوں میں مترنم صدائیں بھر دیتی ہے۔ دل بھی جام اور ساز کے مانند ہے۔ جب دوست کی طرف سے اس پر ظلم و ستم کیے جاتے ہیں تو اس سے نشاط انگیز نغمے پھوٹتے ہیں ؎

دل چو بیند ستم از دوست نشاط آغازد شیشہ سازے ست کہ تا بشکند آواز دہد

حالتِ وضو میں اگر جسم کے کسی حصہ سے خون کی ایک بوند بھی نکل آئے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اور دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ مگر غالب کا کہنا ہے کہ ہم عشاق اپنی پلکوں سے روزانہ خون کا سیلاب بہاتے رہتے ہیں پھر بھی طہارت نہیں جاتی ؎

تو بہ یک قطرۂ خوں ترک وضو گیری و ما سیلِ خوں از مژہ رانیم و طہارت نہ رود

★

غالبؔ کی غزل

سعادت نظیر

اصنافِ سخن میں غزل بڑی ہی من موہن اور بڑی ہی البیلی صنف ہے، رس رنگ کی شاعری ہے، دل کے تاروں کو چھوتی، لطیف احساسات کو گدگداتی، بھولی بسری باتوں کو چھیڑتی، حسین یادوں کو اکساتی، خون کی گردش کو بڑھاتی، دل کی دھڑکنوں کو تیز کرتی، تنہائی میں تصورات کی محفل آراستہ کرتی، ہجومِ غم میں تسکینِ خاطر بنتی اور بزمِ نشاط میں جان ڈالتی ہے۔ اسی لیے تو یہ اتنی من موہن اور اتنی البیلی ہے۔ بے ساختہ اس کے عشوؤں اور اداؤں پر مرنے کو جی چاہتا ہے۔ غزل ایک جان دار صنفِ سخن ہے، ہزار مخالفتوں کے باوجود بھی ہر دور میں زندہ رہی ہے اور رہے گی۔ اس میں ایک بے پناہ قوت موجود ہے، ارتقا پذیری اور حالات و ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی فطری صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس کے اپنے مخصوص حرف و صوت، نازک لب و لہجہ اور لطیف اشارات و علامات کے دل کش پیمانے ہوتے ہیں جن میں معنی و مفہوم کی ایسی رنگ برنگی صہبا چھلکتی ہے جو کیف آگینی اور روح پروری کا سبب ہوتی ہے۔

غزل کی اساسی قدر جذبہ ہے مگر جذبے کے ساتھ ساتھ اس میں تخیئل کی گلکاری بھی ہوتی ہے۔ جذبہ ایک طلسمی کیفیت ہے اور تخیئل یا جذبہ و تخیئل دونوں بہ یک وقت متحرک ہوتے ہیں گویا غزل جذبہ و تخیئل کے حسنِ امتزاج کا نام ہے جو موسیقیت کے رنگین پیراہن میں نمودار ہوتا ہے اور اس حسنِ امتزاج میں احساس کی پرچھائیاں بھی ہوتی ہیں۔ عشق، تصوف اور آزادہ روی کا میلان تو غزل کے نمایاں عناصر ہیں۔ تخیئل ایک بصیرت افروز قوت — جذبہ و تخیئل شاعر کی دروں بینی کے اہم اجزا ہیں البتہ کسی خارجی یا داخلی تحریک سے کبھی یہ جذبہ ابھرتا ہے

عناصر ہیں۔ اور یہ باتیں اردو کے جس شاعر کے یہاں زیادہ ملتی ہیں، وہ ہیں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ جو سنِ تمیز ہی سے اردو میں سخن سرائی کرنے لگے۔ پچیس سال کی عمر تک اردو ہی میں زیادہ تر کہتے رہے مگر فارسی سے فطری لگاؤ کے باعث بعد میں فارسی غزل گوئی کی طرف بھی توجہ کی اور اتنی توجہ کی کہ ان کا فارسی کلام "نقش ہائے رنگا رنگ" کا ایک بے صورت البم ہو گیا اور اس خوب صورت البم پر ان کو اتنا ناز تھا کہ وہ اس کے مقابلے میں اپنی اردو شاعری کو "بے رنگ" سمجھتے رہے لیکن ظرفگی تو دیکھیے کہ ان کی شاعرانہ عظمت، کمالِ فن اور شہرتِ دوام کا مظہر ان کی اردو غزل ہی ٹھہری جس میں حیات و کائنات کے سربستہ رازوں کی کچھ عرفانی جھلکیاں ہی نہیں دکھائی دیتیں بلکہ انسانی دل کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

آگرہ (اکبر آباد) جہاں لافانی محبت کی شہرہ آفاق یادگار تاج محل جلوہ طراز ہے، اسی مردم خیز خطے میں غالبؔ نے اپنی ننھیال میں ۱۷۹۷ء میں جنم لیا۔ مگر بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ چچا نے سرپرستی کی لیکن وہ بھی کسی معرکے میں کام آئے۔ اب ان کا کوئی بڑا ایسا نہ تھا جو ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دیتا، اس کے باوجود خوش حال گھرانے، علمی ماحول اور ذاتی شوق کی بنا پر علومِ متداولہ میں درک حاصل کیا اور فارسی زبان و ادب میں مہارت پیدا کر لی۔

ان کی چچی نے اپنی ایک نیک نفس اور سلیقہ مند بھتیجی، دخترِ الٰہی بخش خاں معروفؔ سے دہلی میں ۱۸۱۰ء میں ان کی شادی کر دی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دہلی کے ہو رہے۔ ان کے اولاد ہوئی مگر کسی کو بھی حیات نہ ملی۔ اپنے چچا نصر اللہ بیگ کی جاگیر سے کچھ حصہ پایا لیکن اس کی وجہ سے

نواب شمس الدین احمد خاں سے جھگڑا مول لینا پڑا، نوبت مقدمے تک پہنچی اور مقدمے کی پیروی کے لیے انھیں کلکتہ جانا پڑا۔ مگر ناکامی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا البتہ نواب کے بعد کلکٹری سے پنشن ملنے لگی۔ جب ذوقؔ کا انتقال ہوا تو بہادر شاہ ظفرؔ اور کچھ شہزادوں کی غزلیں دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ معاشی حالت کچھ بری نہ تھی لیکن شاہ خرچ ہونے کے باعث جو کچھ ملتا، اڑا دیتے اور تنگ دست ہو جاتے، پھر بھی دن بھلے بُرے گزر رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ چھڑ گئی۔ دلی اجڑی، انگریز غالبؔ کو سازشی سمجھنے لگے مگر دربار رام پور کے توسط سے صفائی ہو گئی، البتہ بڑھاپے میں رام پور کا سفر مہنگا پڑا، صحت بگڑ گئی، دلی لوٹے اور بہت دنوں تک صاحب فراش رہے، بہت کچھ تدبیر کی مگر شفا کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور آخر کار ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے احاطے میں پیوند خاک ہو گئے۔

جس شعری ماحول میں مرزا نے آنکھ کھولی، وہ لکھنؤ زدہ تھا۔ اگرچہ وہ پہلے پہل ناسخؔ کے رنگ میں شعر کہنے لگے لیکن ان کے جدت پسند مزاج پر لفظی بازی گری گراں گذری، پامال علامات اور فرسودہ تصورات نے غزل کو تنگ داماں کر دیا تھا جس کا شدید احساس غالبؔ کو ہوا اور انھوں نے غزل کو نئے فکر و معنی کے ساتھ زبان و بیان کی نئی وسعتوں سے آشنا کیا، نیا رنگ اور نیا آہنگ دیا، دس بارہ سال تک طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہا مگر ثقیل الفاظ و تراکیب نے ان کی اس دور کی شاعری کو گنجلک کر دیا۔ جب شعور جاگا تو عرفیؔ، نظیریؔ اور پھر میرؔ کی راہ اختیار کی لیکن فکر و اظہار پر آخر تک بیدلؔ کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور رہا، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے والے کا ذہن بڑی کد و کاوش کے بعد اس کے معنی و مفہوم تک پہنچتا ہے۔ اس پیچیدہ اور پہلو دار اسلوب میں مومنؔ کے سوا ان کا اور کوئی مقابل نہیں۔ غالبؔ فکر و نظر کی ندرت و رفعت کے باعث مشکل گوئی کے لیے مجبور تھے اور ان کے بلند و نادر افکار کے اظہار کی گنجائش پیرایۂ بیدلؔ ہی میں نکل آئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ طرزِ غالبؔ طرزِ بیدلؔ ہے یا اس کا خاکہ، البتہ ان کے انفرادی طرز کی تشکیل میں اور شاعروں کے علاوہ بیدلؔ کا زیادہ حصہ ہے مگر ان کی تیز درایت نے انھیں روایتی بننے نہ دیا اور نہ کسی کا اندھا مقلد ہی۔ اسی بات نے ان کو ایک ایسے شعری آہنگ کا موجد بنا دیا جو دنیا کے لیے اجنبی ضرور تھا لیکن ناگوار نہیں۔ آخر آخر میں تو ثقیل و پیچیدہ الفاظ و تراکیب کے اجتناب نے ان کی غزل کے صوری حسن کو کچھ اور نکھار دیا اور معنوی حسن کے رمزی اشکال بہت ہی جاذب نظر ہو گئے۔

مرزا کے زمانے میں غزل حدیثِ دلبراں تھی اور یہ دلبر پردہ نشیں نہیں، شاہدانِ بازاری تھے۔ شاہدانِ بازاری کی محبت شرافت و تہذیب کے بلند معیار کی غماز نہیں بلکہ پستیٔ کردار کا ثبوت ہے اور محبت کا کم و بیش یہی معیار غالبؔ کے پاس بھی ملتا ہے مگر اس معیار کا پردہ داری کا اپنا طرزِ ادا اور حرف و صوت کا وقار ہے اور اسی پردہ داری کے سبب محبت کبھی کبھی ذوقِ پرستاری معلوم ہوتی ہے اور ان کے اس ذوقِ پرستش کے اظہار میں بلا کی رنگا رنگی اور غضب کی وسعت پائی جاتی ہے:

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کے

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

غالبؔ کا دل جس حسنِ پرکشش کا گھائل ہے، وہ جنت نگاہ کوئی پری یا حور نہیں، وہ تو اسی دنیائے آب و گل کی ایک پیکرِ جمال ہے، اس کے بال گھنے، قد لمبا، بدن لچکیلا ہے، چال جیسی کڑی کمان کا تیر، رفتار ایسی متوالی کہ موج بھی لرز جائے، طبیعت میں نازِ دلبرانہ کی آمیزش ہے، آرائشِ خمِ کاکل کا وہ آہنگ کہ اندیشہ ہائے دور و دراز کے پہلو نکل آئیں، وہ خود مبتلائے عشق ہو کر کچھ اور بھی بلائے جان ہو جاتی ہے اور اس کا تصور رعنائیٔ خیال کا خالق بن جاتا ہے ؎

ہو کے عاشق وہ پری رُو اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

تھی جو اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

عشق انجام بینی نہیں ہوتا، یہ ایک دبی آگ ہے جس کی لپٹوں میں والہانہ شیفتگی اور سرشاریٔ خود فراموشی کے جو عناصر ملتے ہیں، وہ جذبۂ سپردگی کی

دین ہوتے ہیں اور اسی جذبۂ سپردگی کے حسنِ اظہار سے غزل میں تڑپ، سوز و گداز، معصومیت اور پاکیزگی آتی ہے ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تری عادت ہی سہی

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

محبوب کے ظلم و ستم سہنا، اس کی بے رخی اور تغافل کو برداشت کرنا مگر حرفِ شکایت زبان پر نہ لانا بلکہ اس کے ناز اٹھانا اور اس کی رضا جوئی کا خیال رکھنا، یہ سب محبت کے تقاضے ہیں اور غالب ان تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور سراپا عجز و نیاز بنے نظر آتے ہیں کہ ع وفاداری بشرطِ استواری عینِ ایماں ہے

مگر ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا　　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

نقشِ وفا کے وجہِ تسلی نہ ہونے کے باعث غالب کا پندارِ عشق جاگ اٹھتا ہے اور ان میں رنجش، سرکشی اور بغاوت کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا　　تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

اور محبوب کو کسی طرح بھی راہ پر آتا نہ دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ؎

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر　　دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے

عشق جذب و کشش کی انتہا کا نام ہے اور جذب و کشش کا قانون فطری ہے اسی لیے وہ کائنات میں جاری و ساری ہے، اجسامِ ارضی ہوں کہ اجرامِ فلکی سب کے سب عشق کے مظاہر ہیں، جنھیں کہیں بھی سکون نہیں، ایک اضطراب سا ہے اور یہ اضطراب دین ہے جذب و کشش کی، اور یہی بات محرک ہے ارتقائے حیات کی چناں چہ ہر قطرہ دریا میں فنا ہو کر دریا ہو جاتا ہے ع

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

عشق دماغ کا خلل ہے نہ انسان کو نکما کر دینے والی کوئی کیفیت بلکہ ایک طوفان خیز جذبہ ہے، اسی کی بدولت کائنات میں ہنگامہ آرائی ہے، امید و یاس، نشاط و غم، تعمیر و تخریب اور حیات و موت کے تصادم میں اسی کی لہر ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

عشق ہی حوصلوں کو جوان کرتا ہے، امنگوں اور ولولوں کو برانگیختہ کرتا ہے، آدمی کو گرمِ جستجو رکھتا ہے، راہِ دشوار کو سہل بناتا اور ہر قدم پر زندگی کا لطف بخشتا ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

غالب کے حسن و عشق کے حکایات میں مجاز و حقیقت ہر دو کی باتیں ملتی ہیں چناں چہ کبھی وہ مادہ پرست نظر آتے ہیں تو کبھی مادیت سے گزر کر روحانیت تک جا پہنچتے ہیں اور کبھی کثافت و لطافت کے تانے بانے سے دھوپ چھاؤں کا ایسا لباس بنتے ہیں جو شاہدِ حقیقی ہو کہ شاہدِ مجازی دونوں پر پھبتا ہے ؎

جذبۂ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز　　پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست　　لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب کبھی کبھی زندگی کی عام سطح سے کچھ دیر کے لیے بلند ہوتے اور رازِ ازل کی نقاب کشائی کرتے معلوم ہوتے ہیں مگر دوسرے ہی لمحے "جیسے گئے تھے ویسے ہی چل پھر کے آ گئے" کے مصداق نظر آتے ہیں کیونکہ ان کو ارضی زندگی سے نہایت لگاؤ ہے اور اسی لگاؤ کی وجہ سے ان کا دل محشرستانِ بے قراری ہو جاتا ہے اور دنیا ان کو خواہشات کی ایک پُر فریب وادی دکھائی دیتی ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

سچ تو یہ ہے کہ غالب تمناؤں کے رنگا رنگ ہجوم میں گھرے رہتے ہیں کوئی تمنا بر آئے نہ آئے، انھیں پروا نہیں کہ وہ تو فقط نیرنگیٔ تمنا کے تماشائی ہیں اور اس تماشے میں ایک لطف سا محسوس کرتے ہیں اور تمناؤں کے اس رنگا رنگ ہجوم میں زیادہ تر لذت طلبی، عیش کوشی اور رندی کی خواہشیں ملتی ہیں۔ وہ "بہ یک کرشمہ دو کار" کے قائل ہیں چناں چہ ان کی نگاہِ شوق میں ارضی حسن بھی ہے اور سماوی حسن بھی، جلوت میں گرمیٔ عشرت کے طلب گار ہیں تو خلوت میں ذہنی عرفان و آگہی کے، کبھی ان کے دل میں عقلِ فعال سے فیض اٹھانے کا ارمان مچلتا ہے کبھی دشتِ جنوں کی خاک چھاننے کو جی چاہتا ہے اور کبھی ایک ایسے سدا بہار چمن کی آرزو پیدا ہوتی ہے جہاں ان کے لیے اغیار سے دور ایک کنجِ عافیت ہو تاکہ ان کا آئینۂ دل رنج و ملال کے غبار سے محفوظ رہ سکے اور اس کنجِ عافیت میں کبھی بیدلی و بے ہوشی کا عالم ہو تو کبھی کیف و مستی کا، دن سخن آرائی میں گزرے اور رات شیخِ عقل کے حضور رموزِ حکمت کے اکتساب میں، کبھی وہ اس منزل پر نظر آتے ہیں جہاں ایک

[illegible]

طرف کوئی ارمان دامنِ دل کھینچتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو دوسری طرف نیا نیا تمنائیں ایک سراب معلوم ہوتی ہیں، کبھی وہ سراپا رہنِ عشق اور طالبِ فنا ہوتے ہیں اور کبھی الفتِ ہستی کو عینِ فطرت سمجھتے ہیں سے

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی   عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

رہِ حیات میں غالبؔ مسلسل گرمِ سفر ہیں، کئی مرحلے اور کبھی منزلیں طے کر جاتے ہیں مگر حد درجہ ماندگی کے باوجود بھی ان کی صحرا نوردی کے ذوق و شوق میں کمی نہیں آتی، ذوق و شوق تمنا ہی کی شکلیں ہیں اور جب تک دم میں دم ہے، تمناؤں کا ساتھ نہیں چھوٹ سکتا، اور ہر تمنا زندگی کی دلیل ہے، زندگی حرکت و گفتار کا نام ہے اور ہر قدم میں حرکت و رفتار ہے، راہِ ہستی پر نقشِ قدم اس طرح ابھرتے جاتے ہیں جس طرح موج پر حباب اور چونکہ حباب موج ہی کی تخلیق ہے اس لیے وہ پھوٹ کر بھی موج ہی کا ایک حصہ بن جاتا ہے گویا نقشِ قدم درماندگی اور سکون کی علامت نہیں بلکہ حرکت و تازگی کا اظہار ہے اس لیے کثرتِ ماندگی صحرا نوردی شوق میں مانع نہیں ہو سکتی اور نہ ذوقِ زندگی ہی مٹ سکتا ہے بلکہ ہر قدم پر ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے سے

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم اپنا   حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم اپنا

یہی ذوق و شوق جو آرزوؤں کی انجمن آراستہ و پیراستہ کرتا ہے، غالبؔ کے لیے ایک پیہم تقاضا بن جاتا ہے سے

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ   اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

غالبؔ کی زندگی جس دور سے گزری، وہ حادثوں اور مصیبتوں کا دور تھا، قدم قدم پر ناکامیاں اور غم و الم ان کے گلے کا ہار ہوئے۔ پھر خاندانی جھگڑے، معاشی پریشانی، قرض خواہوں کے تقاضے، بھائی یوسف مرزا کی علالت، ناقدریٔ کمال اور یاوہ سرایانِ دہلی کے طعن و تشنیع بیس سالہ غالبؔ کی دل گرانی کا سبب بنے جس کے باعث ان کو ہر طرف یاس و حرماں کا عالم نظر آنے لگا اور چارۂ رنجِ بے دلی نہ پاکر کہہ اٹھے سے

بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے، نہ دیں

اسی منزل پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالبؔ غم کو شہر بہار کی طرح جزوِ حیات سمجھ بیٹھے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کے نزدیک غم و حیات لازم و ملزوم تھے سے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

مگر یہ کیفیت پایۂ تاثر دیر پا نہیں رہا اور ان کی بلند ہمتی نے ان کو سنبھالا اور قنوطی بننے نہ دیا، یہی وجہ ہے کہ وہ آنسوؤں کے ہجوم میں بھی مسکرانے لگے سے

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس   برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے   آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

غالبؔ کے یہاں قنوطیت سے زیادہ رجائیت کی عشوہ طرازیاں ہیں کیوں کہ ان کی شخصیت میں انفعالیت نہیں، توانائی ہے، اسی لیے ہر حادثہ ان کے لیے ایک آفت یا ایک بلائے بے درماں نہیں بلکہ ایک بصیرت افروز درسِ حیات ہے سے

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب   لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

غالبؔ کی یہی وہ فعّال حیثیت ہے جس کا ایک روشن پہلو شوخی و ظرافت بھی ہے جو ان کی زندگی میں اٹکھیلیاں کرتی نظر آتی ہے چونکہ ان کی زندگی ان کی شاعری اور ان کی شاعری ان کی زندگی ہے اس لیے شوخی و ظرافت کی چاشنی بھی ان کی شاعری میں ملتی ہے سے

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے   ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے   بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی   سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ   مر گئے پر دیکھیے، دکھلائیں کیا

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر   نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

مرزا کی ظرافت میں غضب کی لطافت اور قیامت کی دل آویزی ہے اور یہ بات بہت کم کسی کو میسر آتی ہے۔ مرزا کی ظرافت اپنا ہو کہ پرایا، دوست ہو کہ دشمن، سب کو اپنے تیروں کا نشانہ بناتی ہے، غم کا موقع ہو یا خوشی کا، ہر موقع پر ان کی زبان سے پھول جھڑتے نظر آتے ہیں۔ غم کی بات کو وہ کبھی کبھی لطیفہ بنا دیتے ہیں، ظرافت و شوخی کا یہ رنگ اس وقت کچھ اور چوکھا ہو جاتا ہے جب کہ وہ واعظ کی ریاکاری پر چوٹ چلتے ہیں مگر اس کے باوجود تہذیب و شائستگی کے حدود کو توڑتے نہیں بلکہ سنجیدگی و متانت سے کام لیتے ہیں سے

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ؟   پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

طاعت و زہد بے غرض ہونا چاہیے مگر زاہد و واعظ کا تقویٰ و پرہیزگاری تو محض صلے کی توقع پر تھا اور اس بات کی بے نقابی مرزا کی خوبینی و آزادہ روی

(بقیہ ص ۱۶۹)

ماگھ، پھاگن ۱۸۹۰ شک

حضرتِ غالب

سیف بجنوری

کہاں ممکن ہے شرحِ مطلعِ دیوانِ یزدانی
خرد ادراک سے عاجز ہے با وصفِ ہمہ دانی

یہ قدرت کا کرشمہ ہے دبی چنگاریاں تو دیں
چراغِ زیرِ داماں سے عیاں ہو شعلہ افشانی

حقیقت پھر حقیقت ہے اُجاگر ہو کے رہتی ہے
کثافت سے کبھی چھپتی نہیں جوہر کی تابانی

ترب تاب نگیں مٹی میں مل کر بھی نہیں جاتی
اندھیری رات میں دیتا ہے ضو یاقوتِ رمانی

وہی اک شاعرِ شیوا بیاں شیریں زباں غالبؔ
کہ اسلوبِ بیاں سے جس کی ظاہر ہے سخن دانی

فقط اک بسترا تھا زندگی میں مسندِ شاہی
پسِ مردن بھی ٹوٹی قبر اور نگِ سلیمانی

زمانے کی نگاہیں اہل سے محروم تھیں جب تک
ہوئی ظاہر نہ اس جوہر کی دنیا پر درخشانی

لیا اہلِ نظر نے جانچ جب لفظ و معنی کا
نظر آنے لگی فکر و تخیل کی ہمہ دانی

فصاحت میں، بلاغت میں، سلاست میں، طلاقت میں
تمام اصنافِ علم و فن میں یکتا اور لاثانی

تکلم میں، تفکر میں، تاثر میں، تبحر میں
ہمہ سنجی، ہمہ فہمی، ہمہ گیری، ہمہ دانی

ہویدا لفظ لفظِ نظم سے دریا معانی کا
نمایاں پردۂ اشعار سے اسرارِ پنہانی

علومِ ظاہری آئینہ دارِ جلوۂ باطن
کمالِ بندشِ مضموں سے پیدا فلسفہ دانی

مزین معرفت سے بھی تصوف سے مرصع بھی
طبیعت میں روانی، نطق میں اسلوبِ جولانی

اصولِ حکمت و اخلاق و مابعد الطبیعت میں
کوئی فن ہو ہر اک فن میں ہے دریا کی سی طغیانی

سلیقہ بات کرنے کا، قرینہ بات کہنے کا
سخن فہمی، سخن سنجی، سخن گوئی، سخن دانی

بیاں میں سحر اگر جادو تو حکمت شعر گوئی میں
حدیثِ حسن و الفت میں ہر اک مضمر کیفِ وجدانی

تو غالبؔ تیرا فن غالب، ترا حسنِ بیاں غالب
ترے شہکار لاثانی ترے افکار لاثانی

صفاتِ غالبؔ مرحوم کوئی سیفؔ کیا سمجھے
حقیقت میں نظر کب ہے شعورِ مرتبہ دانی

رُباعیات

(نذرِ غالب)

محمدی بیر ثاقب گڑھی

ذرّے کو بنا دیا ستارا تو نے
گیسوئے غزل کو یوں سنوارا تو نے
دھندلا نہ سکی گردشِ مہ و سال اُسے
الفاظ سے جو نقش اُبھارا تو نے

شوشے شوشے ہیں فکر و فن کی تنویر
نقطہ نقطہ ہے علم و حکمت کا سفیر
اشعار میں صد گنجِ معانی پنہاں
الفاظ ہیں مظہرِ شعورِ تعمیر

غزلیں ہیں تری فکر و بصیرت کا پیام
اے غالبِ نکتہ دان و عرش مقام
وہ مے جو ترے ساغرِ سرجوش میں تھی
بخشا اُردو کو اُس نے حسنِ دوام

محرابِ غزل سے جب اذاں دی تو نے
ترتیبِ صفِ خوش فکراں دی تو نے
اک "شوخیٔ بیدار" ہر اک شعر میں ہے
نغموں میں ڈھلی طرزِ فغاں دی تو نے

غالب ــــ اپنی شکست کی آواز

ڈاکٹر سید محمود الحسن

کسی شاعر و ادیب کی شخصیت سے اس کے فن کی مختلف منزلوں کو سمجھنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا اس کے فن کے ذریعہ شخصیت کی گتھیوں کو سلجھانا. یہ دشواری اس لئے زیادہ شدید محسوس ہوتی ہے کہ عموماً فنی اظہار میں اس حقیقت نگاری سے کام نہیں لیا جاتا جس سے اس کے فن اور ذات میں ہم آہنگی و تعلق پایا جا سکے. اردو شعر و ادب میں خارجی اور داخلی روایات کی تقسیم کی وجہ سے صحت مندی کا یہ تصوّر اور بھی دور معلوم ہوتا ہے. البتہ جن شعراء نے اپنے ذاتی احساسات کے ہر موڑ کو جگہ دے کر فنی قدروں کو آگے بڑھایا، ان کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور شاید یہ کہنا زیادہ غلط نہ ہوگا کہ غالبؔ سے بڑھ کر اس تقاضے کو کوئی دوسرا شاعر پورا نہ کر سکا. غالبؔ کی جن بنیادی خصوصیات پر نقاد برابر زور دیتے آئے ہیں ان میں خاص طور سے یہ ہیں کہ انھوں نے جذبہ کی شدت کو اپنے تفکر کی گہرائی اور مشاہدہ کی تیزی سے ہمکنار کر لیا، دل کی آواز کو دماغ کی گہرائی سے ہم آہنگ بنا دیا. خارجی و باطنی عوامل کی عکاسی کو ایک دوسرے سے پیوست کر دیا تخیل و ذہانت لازم و ملزوم بن گئے اور فنی تقاضوں کے ساتھ اندرونی کیفیات کو اس طرح ممزوج کر دیا کہ یہ فرق کرنا مشکل ہو گیا کہ حسنِ مضمون اور حسنِ اظہار میں کس چیز کو زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن عظمت کے ان عناصر کو گرفت میں لانے کے لئے جہاں ان کی شخصیت کا ہاتھ ہے وہاں ان حادثات و سانحات کا بھی جنھوں نے غالبؔ کو کسی منزل پر چین لینے نہ دیا۔ غالبؔ اگر ان مصائب و آلام سے عاجز آ کر افسردگی بے حسی اور مایوسی کا شکار ہو جاتے تو ان کو یہ عظمت نصیب نہ ہوتی لیکن ان کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیات کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ انھوں نے زندگی کی ہر شکست پر تلملانے کے باوجود اپنے میں یہ قوت پیدا کر لی تھی کہ اگر ایک منزل پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو کیوں نہ دوسرا راستہ اختیار کر کے زندگی کے سفر کو زیادہ بہتر، آرام دہ اور پر سکون بنا دیا جائے یعنی کبھی یہ جدوجہد کرتے رہے کہ قد و گیسو کے حصول کے لئے دار و رسن کا تجربہ کر لیا جائے، کبھی یہ اظہار کیا کہ کوئی امتحان باقی نہ جائے، کبھی یہ کہا کہ اپنے دل کی تپش سے بھی گلستاں کے خس و خاشاک میں چراغاں ہے اور چونکہ ان کو کشمکشِ حیات اور سعیِ بے حاصل میں بھی ایک لذت محسوس ہوتی تھی، یہ منزل آ چکی تھی کہ اگر دل کے آتش کدہ کے رازوں کو ظاہر کر دیتے تو نہ معلوم دنیا میں کس قدر مایوسی اور بے بسی پھیل جاتی، پھر بھی ذوقِ فنا سے اتنی انسیت تھی کہ ان کی سانس میں جتنی گرمی بھی ہو وہ خود نہیں جلتے تھے ـــــ اور یہی بلندیٔ ذوق تھا جس کے ذریعہ چاہے ذاتی زندگی کی پابندیاں اور مایوسیاں ہوں، چاہے شعر و فن کی روایات کسی ایک تک اپنے کو محدود نہیں رکھا. چنانچہ اگر ابتدا ہی سے ذاتی مشکلات کو دور کرنے کی جدوجہد جاری رکھی تو اسی کے ساتھ یہ سلسلہ بھی قائم رہا کہ شعری روایات یا اردو فارسی کے کسی شاعر کی تقلید کرنا گوارا نہ کیا اور یہی ان کی غیر معمولی کامیابی اور عظمت کا راز ہے۔

جدید نفسیات کے مطالعے کی بنیاد پر یہ بتانا مشکل ہے کہ غالبؔ میں حدسے زیادہ احساسِ امتیاز کی وجہ سے انفرادیت پیدا ہوئی یا انفرادیت کی وجہ سے ان کے فن میں امتیازی خصوصیات کا وجود ہوا لیکن اس مطالعے کا یہ پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ تخلیقی شعور کی بیداری میں اس ردِ عمل کا ہاتھ ضرور رہتا ہے جو جذبات اور پے در پے تجربات کی بنیاد پر ایک مستحکم شکل اختیار کر لیتے ہیں. غالبؔ کے سمجھنے کے لئے الفاظ مشاہدہ، تخیل، استدلال اور ذوقِ جمال ہر قوت کے پیچھے ان عناصر کی کارفرمائی کا تجزیہ ضروری ہے جن کے نتیجے میں ذہن، ادراک اور تفکر کی بلندی کے ساتھ وہ حسّی تصورات ابھر کر سامنے آ گئے ہیں جہاں تک کوئی دوسرا نہ پہنچ سکا. کہا جا

ہے کہ شاعر و ادیب اپنی قوت اظہار سے انتقال معنی یا ابلاغ کا کام لے کر اگرچہ دوسروں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے لیکن درحقیقت یہ ادبی اظہار مقصود بالذات ہوتا ہے یعنی اسی کے ذریعے وہ خود اپنے احساسات و تجربات کی بھرپور ترجمانی کر کے ایک قسم کی فطری تسکین حاصل کرتا ہے۔ یہ نظریہ کسی اور فنکار کے متعلق چاہے صحیح نہ ہو لیکن غالب کے فن اور شخصیت کے رشتے کو دیکھ کر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی فنی انفرادیت میں داخلی کیفیات اور زندگی کے نشیب و فراز کی مختلف نفسیاتی الجھنوں کا اثر ضرور شامل رہا ہے۔ البتہ یہاں نفسیاتی الجھنوں کی اصطلاح اس حیثیت سے مراد نہیں لی گئی ہے جس میں غیر متوازن یا دبی ہوئی جنسی خواہشات کا بالواسطہ اظہار مقصود ہے پھر بھی ان کے اشعار میں یہ عناصر ضرور پائے جاتے ہیں جن سے ان کی ناآسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لئے غالب کے مطالعہ کے اس پہلو کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جس میں انفرادی، اجتماعی اور زمانے کی کشمکش کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور جب تک ان کی شخصیت کے ان ہنگامی محرکات کو گرفت میں نہ لایا جائے، شاعر کی فنی صلاحیت اور اس کے تخلیقی امتیاز کی بنیاد کو نہیں پہچانا جا سکتا۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ غالب کے شعور نے اپنے زمانے کی کشمکش اور عام سماجی و سیاسی انتشار سے کیا حاصل کیا، یہاں صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ ان کی ذات جن حادثات کا سامنا کرتے ہوئے مایوسی اور اداسی کے ہجوم میں کبھی کبھی شکست و بیچارگی کی اس منزل تک پہنچ گئی تھی جہاں یہ کیفیت ہو چکی تھی کہ ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

پھر بھی غم و آلام اور شکست خوردگی کی شدت میں بھی اپنے فن کی آب و تاب قائم رکھنا اور بے حسی دور کر کے تابناکی اپنا لینا اس چیز کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ اپنے ذاتی غموں اور اپنی تمناؤں کی بربادی کا اظہار ان کی ذاتی شکست کے اظہار تک محدود نہیں رہا بلکہ اس میں دوسروں کے دکھ درد اور غم و الم بھی شامل ہو گئے۔

غالب اپنی زندگی کی مختلف منزلوں میں جن مصائب سے دوچار ہوئے، اپنے خطوط میں جگہ جگہ ان کا ذکر کر کے اپنی بدقسمتی کا رونا روتے ہیں۔ کہیں اس بیچارگی و تنہائی کا ذکر ہے جس کا سلسلہ بچپن ہی سے شروع ہو چکا تھا، کہیں [illegible] اور گھریلو الجھنوں کا ذکر ہے۔ کسی جگہ یہاں تک لکھ دیا کہ "ایسے طائع مرغِ گلشن اور حسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں"۔ کسی منزل پر یہ نوبت آئی کہ روزمرہ کا خرچ پورا کرنے کے لئے صبح کی تبرید متروک کر دی، چاشت کا گوشت آدھا کر دیا، رات کی شراب و گلاب موقوف کر دی اور ایک جگہ جھنجھلا کر یہاں تک لکھ گئے کہ:

"یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو غیر تصور کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے تو غالب کے ایک اور جوتی لگی، بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں، لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا ...... آیئے نجم الدولہ بہادر! ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار کو بھوگ سنا رہا ہے میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب کیسے، اوغان صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو، بولے کیا بے حیا بے عزت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے، یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دیا جائے گا۔"

یہ جملے غالب کی اس مجبوری اور بے بسی کا اعلان کر رہے ہیں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ تھا۔ اسے جن جن ذریعوں سے عظمت و برتری حاصل ہو سکتی تھی ان سب کے نشانات معدوم ہو چکے تھے۔ خاندانی بلندی، علم و فن کی شہرت، شاہی خطابات، کسی چیز سے اسے سہارا نہ مل سکا۔ ہو سکتا ہے اگر میر کی طرح امید کا دامن غالب چھوڑ بیٹھتے تو اشعار میں یہ تنوع نظر نہ آتا، نہ زندگی کو آگے بڑھانے کا جذبہ موجزن رہتا۔ لیکن یہ بیچارگی اس لئے زیادہ گہرے طور پر ابھری کہ وہ بے حسی، بے بسی اور مایوسی کے ہر ہجوم کو دور کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ اپنی ذاتی زندگی میں ان مشکلات سے وہ کہاں تک نجات پا سکے، یہاں اس سے بحث نہیں ہے لیکن اپنے اوپر طنز کر کے، اپنی کسمپرسی کا مرثیہ کہہ کے یہ ضرور کر دیا کہ دوسروں کی زندگی کو بہتر بنانے کا ذریعہ پیدا کر دیا۔ اپنے غم میں اپنے دور کے سارے عوام کے دکھ درد کو اجاگر کر کے اسے اجتماعی آہنگ بنا دیا۔

غالب کی شخصیت اور ان کی شاعری کے رشتوں کے مطالعے کے سلسلے میں یہ پہلو خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ جس طرح ان کی زندگی نے اتار چڑھاؤ کا سامنا کیا، ان کو جس طرح شاہراہِ حیات کی شادکامیوں اور مایوسیوں کا سابقہ پڑا، اسی طرح شاعر دل کے مشاہدات، اقدار اور تصورات کے ذخیرے میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ کرب و نشاط کے تجربات سے مختلف منزلوں میں ذہن و جذبہ میں جس طرح فرق پیدا ہوتا رہا انہی آہنگ میں بھی وہ فرق نمودار

[illegible] ۱۸۹۰ [illegible]

ہوگیا اور جس طرح انفرادی کشمکش اور خیال و خواب تہذیبی اور سماجی تقاضوں سے مربوط ہوتے گئے، اسی طرح فن کے موضوع کو وسعت اور تفکر و جذبے کی ہم آہنگی بڑھتی گئی۔ یہ صلاحیت ہر شاعر کی فطرت میں موجود نہیں ہوتی اور شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اردو شاعری میں اس خصوصیت کے لحاظ سے غالب سب سے منفرد حیثیت کا مالک ہے۔

غالب کی زندگی اگر بچپن ہی سے مصائب و آلام کا شکار رہتی تو شاید بعد میں درپیش آنے والے سانحات کی تلخی انھیں اتنی شدت سے محسوس نہ ہوتی کہ جن کا اظہار ان کے اشعار میں کیا گیا۔ پانچ سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا لیکن چچا کی شفقت نے لاوارث نہ محسوس ہونے دیا۔ آٹھ سال کی عمر میں چچا کی مفارقت کا داغ بھی سہا لیکن ننہال کی خوشحالی اور وہاں کے عیش و عشرت کے ماحول نے ان کو لہو لعب کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ اس طرح ۱۵، ۱۶ برس کی عمر میں جب دہلی آئے اس سے پہلے خود انھیں کے الفاظ میں ان کے چاروں طرف غنچے شگفتہ ہوتے تھے، آس پاس نسیم کے فیض سے جلوۂ گل بکھرتا رہتا تھا، ہر رہگذر پر حسن و دلبری کے جلوے نظر آتے تھے، سارا ماحول شاہد و محبوب، سرود و مستی اور شعر و شراب کے کیف و رنگینی سے معمور رہتا تھا۔ ان حالات میں نہ تو تنہائی و بے بسی کا احساس ملتا ہے نہ ایسے کرب کا جو انھیں تڑپا دیتا، چنانچہ زندگی کی اس اعتدالی کیفیت میں فن میں کسی قسم کی انفرادیت پیدا کرنے کا شعور نہیں پایا جاتا بلکہ مشکل پسندی اور بیدل کی پیروی کرنے کے باوجود یہ تصور نہیں پیدا ہوا تھا کہ شعر میں جذبہ اور تفکر کو ایک کرکے پیش کر سکیں۔ رفتہ رفتہ عمر کی منزلیں بڑھنے کے ساتھ شدائد زمانہ کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا گیا اور یہ محسوس ہوا کہ خاندانی عظمت، نسلی امتیاز، ماضی کی خوشحالی اور سکون کچھ بھی باقی نہ رہا بلکہ "ذوق صحبت احباب" بھی مٹ گیا۔ اس کے بعد ہی اگر بے کسی و بے بسی کا احساس شدت پکڑتا گیا تو یہ شعور بھی بیدار ہوا کہ اپنی خودداری اور انفرادیت کو کسی نہ کسی طرح ضرور برقرار رکھنا ہے اور اس کے لئے سوائے شعر و فن کے کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہ تھا کیونکہ نہ تو اس نسل کی عظمت کے نقوش باقی رہ گئے تھے جن پر غالب کو فخر تھا نہ خاندانی جاہ و جلال باقی رہ گیا تھا اور نہ سپہ گری کے اس پیشہ کو اختیار کرنا ان کے بس میں تھا جو ان کے آبا و اجداد میں سو پشت سے رائج تھا۔ ان چیزوں کے حصول کی تمنا رہ رہ کر غالب کے دل میں ضرور انگڑائیاں لیتی رہی ہوگی۔ اگر لڑکپن کی رنگ رلیوں اور ذہنی فراغت کا احساس لاشعور میں برقرار نہ رہا ہوتا تو اپنی تمناؤں کا ماتم اس قسم کے اشعار کے ذریعے نہ کرتے:

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے — کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو — توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال — دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے — متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے — جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالب اگر اکبر آباد ہی میں رہ گئے ہوتے تو نہ ذاتی شدائد کا شائد اتنا شدید احساس ہوتا نہ افسردگی و بے بسی میں اتنا کرب ملتا، نہ غم دوراں اور تلخیٔ حیات کے ان سانحات سے دوچار ہونا پڑتا جس نے نوجوانی سے زندگی کی آخری سانس تک کسی لمحہ چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ان تجربات نے ان کے جذبات ہی کو وسعت نہیں بخشی، فکر کو بھی گہرائی عطا کی۔ انھیں حقائق نے ان کو یہ احساس دلایا کہ ؎

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

اور اس طرح اسی منزل سے انھوں نے اس طرف توجہ دینا شروع کر دی کہ اگر شاعری کی مقبولیت کے لئے آرائش خم کاکل کے ذکر کے بغیر فن تکمیل نہیں پا سکتا تو اندیشہ ہائے دور و دراز کی شمولیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی اور نہ ذاتی احساسات کے ساتھ تہذیبی قدروں کا ماتم۔ یہ چیزیں جب ایک ہو کر سامنے آگئیں تو اس کے بعد ہی ان کے کلام میں وہ فضا چھا گئی جس سے ہر ایک اپنے ذوق اور تقاضہ کی

تسکین حاصل کر سکتا ہے:

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے　　　کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ　　　سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے　　　مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں　　　چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ان اشعار کے ذریعے اگر ایک طرف خود شاعر کی ذہنی کشمکش کا پتہ چلتا ہے تو دوسروں کے احساسات کی ترجمانی بھی ہو جاتی ہے اور یہ ہمہ گیریت غالبؔ کے ہر شعر میں پوشیدہ رہتی ہے۔

غالبؔ ماں کی زندگی ہی میں اکبر آباد چھوڑ کر دلی آ کر کیوں بس رہے، اس کے پیچھے محض یہ احساس کارفرما نہ رہا ہو گا کہ اپنے وطن میں ان کے فن کو وہ شہرت اور قبولیت نہیں مل سکتی تھی جس کے وہ متمنی تھے۔ اکبر آباد کی سرزمین سے غالبؔ کو جو وابستگی اور وہاں کے در و دیوار سے جو جذباتی لگاؤ تھا اس سے جدائی اختیار کرنے میں معاشی الجھنوں کا سب سے بڑا ہاتھ رہا ہو گا جس کو حل کرنے کے لئے اس وقت دلی کے علاوہ ملک میں کوئی دوسرا مرکز نہ تھا ورنہ غالبؔ کو کسی جگہ پیر ٹکانے کا سہارا ہی مل سکتا تھا۔ ان کے دلی میں آنے میں یہ جذبہ بھی شامل نہیں رہا ہو گا کہ اپنے فن کو ذریعۂ معاش بنا سکیں گے۔ یہ زمانے کے حادثات، دلی کی فضا غالبؔ کا ماحول اور سب سے بڑھ کر ان کی اختراع پسند طبیعت اور فطری صلاحیت کا اثر تھا کہ انھیں وہ سب کچھ مل گیا جس سے چاہے وہ خود اپنی زندگی میں کبھی مطمئن نہ ہو سکے ہوں، انھیں زندگی میں یہ اطمینان حاصل ہو بھی کیسے سکتا تھا جبکہ ہر منزل پر وہ یہ محسوس کرتے رہے کہ ان کی جو قدر و منزلت ہونا چاہیے وہ نہیں مل سکی جس سے ان کی معاشی پریشانیاں دور ہو سکتیں۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ جیسے جیسے ان کی معاشی کشمکش بڑھتی رہی، جیسے جیسے ان کی ذہنی الجھنوں میں اضافہ ہوتا رہا اور جیسے جیسے وہ ان سے نجات پانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہے ویسے ہی ویسے ان کا یہ شعور پختہ اور مضبوط تر ہوتا رہا کہ اچھے بیان کے لئے تنگنائے غزل کو محض حسن و عشق کی کیفیات کے اظہار تک محدود نہ رکھ کر اسے اور زیادہ وسعت دی جائے۔ غالبؔ کو زمانے نے نہ تو اس کی فرصت دی، کہ وہ اپنی سربلندی کو قائم رکھ سکیں اور نہ اس کی کہ وہ محفل کو سجا سکیں۔ تمنائے تماشا کا جلوہ دکھانے کی خواہش کے باوجود آبگینے نے ساتھ نہ دیا، خس و خاشاک کے چراغاں کے لئے انھیں نگہِ گرم کی آگ کا سہارا لینا پڑا۔ دل کے راز دل کو معرضِ اظہار میں لانے کو اسی لئے روکتے تھے کہ اس آتشکدہ کو خاموش رکھنا ہی بہتر تھا۔ اپنے دل میں داغ پیدا کر لئے لیکن یہی بہتر سمجھا کہ اسے لب تک نہ لایا جائے اور کبھی کبھی کھل کر ان کیفیات کا اظہار بھی کیا کہ:

جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت　　　میں یوسفِ بہ قیمتِ اوّل خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ　　　ہوں میں کلامِ نغز و لے ناشنیدہ ہوں

پھر بھی ان میں انسانیت سے ہمدردی، زندگی سے محبت، عمل کی تلقین اور جد و جہد کی کاوش ملتی ہے، امید کی کرن جلائے رکھنے کا احساس دلایا جاتا ہے، کائنات کو وسعت دینے کی خواہش پائی جاتی ہے، سیلِ حوادث کا مقابلہ کرنے پر اکساتے رہتے ہیں، حسرتوں، تمناؤں، مصائب و آلام کے درمیان بھی مسرت و شادمانی، شگفتگی و مسکراہٹ اور آسودگی و اطمینان کے عناصر چھائے نظر آتے ہیں، درماندگی و بیچارگی میں جلوۂ بہار نظر آتا ہے، آزار میں ایک لذت محسوس کرتے ہیں، شور کے تلاطم میں ایک قسم کا سکون اور ہمواری ملتی ہے، چنگاری کی گرمی میں روشنی و چمک بھی شامل رہتی ہے، حیات کی کشمکش سے مقابلہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، سیلاب کے بہاؤ میں نئی زندگی کے عناصر بھی دکھائی دیتے ہیں —— تو ان تمام متضاد کیفیات کے پائے جانے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ان کو اپنے فن کی عظمت پر ایسا بھروسہ تھا کہ اس کے ذریعے انھیں شہرت اور قدر و منزلت ضرور حاصل ہو گی۔ یہی اعتماد تھا جس نے ان کے ذوق و شوق کو ناکامی، مایوسی اور بے حسی کی منزل تک پہنچنے سے روک کر اس حد تک مطمئن کر دیا کہ چاہے زندگی میں نہ سہی "شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن"۔

غم و آلام کے اس منجدھار میں اگر کسی چیز نے ان کو قنوطیت اور بے حسی سے باز رکھا تو ان کا وہ تہذیبی شعور بھی تھا جو قدم قدم پر دوسروں کے مقابلے میں ان کو اپنی برتری کا احساس دلاتا رہا اور اسی نے کلام میں تجربوں کی وہ وسعت اور حقائق شناسی کا وہ شعور پیدا کر دیا جس سے حیات و کائنات کا ہر شعبہ سمٹ کر ایک جگہ آ گیا۔ اپنے دور کی رو بہ زوال تہذیبی زندگی اور سماجی کشمکش میں غالبؔ نے دیکھا کہ ایسی شخصیتیں تباہ اور برباد ہو رہی تھیں، قدم قدم پر [illegible] جن کا قدم چھاتا اور جو بڑی بڑی شہرت و عظمت، نام و نمود رکھنے والے [illegible]

[illegible]

تھے کہ کوئی ان کا نام لیوا نہ تھا۔ غالب کے لئے کم سے کم ذہنی کی یہ شاخ تو تسکین کا باعث تھی کہ مالی و معاشی زبوں حالی کے بعد بھی ان کا فن زندگی بخشنے کے لئے کافی ہے۔ انھیں مختلف تجربات کا نتیجہ ہے کہ غالب کے کلام میں جگہ جگہ مختلف فضاؤں کے نغمے ملتے ہیں۔ ان کے ذاتی سانحات میں عمومی مسائل اور اپنے ذہن کی کیفیات میں سارے ماحول کی اداسی نظر آتی ہے، چنانچہ اپنے فن کو اس دور کی سماجی، تاریخی، تہذیبی اور اجتماعی کشمکش سے قریب کرکے ایک طرف اس کے ذریعے اپنے غموں کو ہلکا کرنے کا احساس پیدا کیا اور دوسری طرف وہ حوصلہ مندی پیدا کر دی کہ ایک نقاد کے الفاظ میں "حسرتوں کو مسرتوں کا لباس، موت کو زندگی، کانٹوں کو پھول، تشنگی کو سیرابی، ذرہ کو صحرا، چنگاری کو شعلہ، اور قطرہ کو دریا" مان کر آسودگی حاصل کر لی۔ اسی لئے اپنی محرومی قسمت کی شدت سے موت کی خواہش اور ان خیالات کے باوجود کہ:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں　　　تیرے سوا بھی اور بھی مجھ پر ستم ہوئے

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ　　　کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　　ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

ہمیشہ کسی نہ کسی طرح اپنے کو تسکین دے کر آگے بڑھاتے رہے، شکست و ناکامی کو مجبوری نہ بنایا اور کبھی یہ کہہ کر تقویت حاصل کی کہ:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے　　　غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا　　　وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

اُگ رہا ہے درو دیوار پہ سبزہ غالبؔ　　　ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اور کبھی انسانی احساسات، فنی قدروں اور خونِ جگر کے ساتھ اپنی شخصیت کو اس قدر مستحکم، مضبوط اور بلند بنا کر پیش کر دیا کہ انسانیت کو آگے بڑھانے کے لئے زمانے کی تلخی میں بھی شیرینی شامل ہو گئی۔ یاس و ناامیدی کا استقبال کرکے زندگی کو بہتر بنانے کا جذبہ ابھارا اور سارے عوام کے دل و دماغ کو حوصلہ اور برتری کا سبق دیا:

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں　　　ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی　　　وہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

ان اشعار میں جن نفسیاتی حقائق کا احساس ملتا ہے وہ محض خیالی اور روایتی نہیں بلکہ ان میں تجربات کی گہرائی پوری طرح نظر آتی ہے اور زندگی کے مسائل کا مطالعہ جیسے جیسے گہرا ہوتا گیا، جیسے جیسے ذہنی شعور میں پختگی آتی گئی، جیسے جیسے انسانیت کی زبوں حالی کا احساس بلند ہوتا گیا اسی رفتار سے غالب کے احساسات اور ان کے فن میں ہم آہنگی بڑھتی گئی اور رفتہ رفتہ وہ بلند ترین مرتبہ تک پہنچ گئے۔

غالب کو جن ذاتی صدمات و حادثات کا سامنا کرنا پڑا، اس کے بعد بھی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کی جد و جہد کرتے رہنا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کو معاشی پریشانیوں نے اسی وقت سے گھیرے رکھا تھا جب دہلی آنے کے بعد ابھی وطن کی جدائی اور ماں کی آغوش سے بچھڑنے کی یاد باقی ہی رہی ہوگی بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ تلاش معاش ہی کے سلسلے میں گھر چھوڑ کر قسمت آزمانے کے لئے نکلے ہوں گے، ممکن ہے اپنے اس مقصد میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ ملی ہو لیکن چند ہی سال میں دہلی کے علماء، شعراء اور مشاہیر کے دلوں میں اپنے فن کی جگہ بنالی اور یہی استحکام ان کی عظمت کے لئے بعد میں بہت معاون ثابت ہوا۔

غالب کی ذہنی بلندی اور شعر و ادب سے فطری لگاؤ کے لئے یہی جان لینا کافی ہے کہ چاہے آلام و مصائب کے کتنے ہی سخت تھپیڑے لگے ہوں، وہ فن کی قدروں کو ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ منزل تک پہنچانے کے لئے جد و جہد کرتے رہے۔ نوجوانی سے بڑھاپے تک اس کوشش میں لگے رہے کہ اپنی مالی زبوں حالی کو خوشحالی میں بدل سکیں۔ اسی لئے تین سال تک وطن سے دور، کبھی اودھ کے دربار کا منہ دیکھا اور کبھی کلکتہ کے انگریز حاکموں سے دستگیری چاہی لیکن نہ لکھنؤ کے اس دربار میں باریابی ہو سکی جو عیش و عشرت کا منبع تھا نہ کلکتہ کے اس مرکز سے جہاں وہ بڑی امید لیکر پہنچے تھے۔ مسافرت کے اس عالم بیچارگی میں تو غالب اتنا ہی کہہ کر اپنے کو تسکین دیتے رہے کہ:

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ　　　ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر　　بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ　　تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں　　ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور　　رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

لیکن اس کے بعد جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان کے تصور ہی سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ قرض خواہوں سے بچنے کے لئے قید خانہ نشینی اختیار کرنا پڑی ۱۸۴۷ء میں جیل جانے کے بعد جو را عدا ہی نہیں احباب کے طعنے بھی ڈنک لگاتے رہے، عزیز و اقارب کنارہ کشی کرنے لگے، بہت سے دوستوں کی جدائی کا داغ سہنا پڑا، عارف ایسے چہیتے کی موت کا زخم برداشت کیا جو غالبؔ ہی کے الفاظ میں "ان کی کامرانی کے لئے زور بازو اور ان کی ناتواں روح کے لئے راحت تھے"۔ ۱۸۵۷ء کی اس تباہی، بربادی اور اس نفسی نفسی کو دیکھا جس کا ذکر کر کے غالبؔ ایک قسم کی رقت طاری کر دیتے ہیں اور اسی ابتری کے عالم میں اپنے چھوٹے بھائی کی موت کا صدمہ سہا جبکہ کوئی سہارا اور یار و مددگار موجود نہ تھا۔ انھیں شدائد سے بے چین ہو کر انھوں نے کہا ہوگا ؎

ہفت آسماں بہ گردش و ما درمیانِ او　　غالبؔ دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود

لیکن اس عالم بیچارگی و بے بسی میں بھی انھوں نے ایسے خطوط لکھے جو کیف و دلکشی سے پوری طرح معمور ہیں۔ اسی دوران میں قاطع برہان لکھ کر زبان کے بڑے عالموں سے ٹکر لی، اسی دور میں مہرِ نیمروز کا ایک حصہ مکمل کیا، انھیں حالات میں ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد دستنبو لکھی لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زندگی کی اس منزل میں بھی — یہ احساس ان سے جدا نہیں ہوا کہ کلام میں ایسی جدت اور ندرت پیدا کر دیں کہ علم و فن کا وہ اعزاز مل جائے جو کسی دوسرے کو نصیب نہ ہو سکا۔ غالبؔ کو اپنے مقصد کے حصول میں زندگی میں کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی میں ہر شکست کے بعد ان کا یہ خیال صحیح رہا ہوگا کہ ؎

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ　　جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

لیکن آج انھیں وہ سب کچھ مل گیا جس کی ان کو تمنا تھی اور اپنی شکست ہی کی وجہ سے انھوں نے اردو شاعری میں ایسا نغمہ بھر دیا جس کی گونج ہمیشہ سنائی دیتی رہے گی کیونکہ انسانی دلوں کی اس دھڑکن اور سانسوں کی اس گرمی کے ساتھ نکہتِ گل کی وہ نرمی، نزاکت اور شگفتگی بھی ملتی ہے جسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا

غالبؔ کی غزل (بسلسلہ ص ۱۶۲)

کے ہاتھوں ہوتی ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

غالبؔ ایک خود بین و آزادہ رو انسان ہیں، اس میں شک نہیں کہ فن اور لوازمِ فن کے قید و بند کا لحاظ رکھتے ہیں اور ایسے میں آزادی کو ایک طرح کی پابندی سمجھتے ہیں، لیکن فنِ شعر یا زندگی کے کسی معاملے میں بھی کسی کی اندھی تقلید ان کو پسند نہیں اور نہ ان کو آتی سماجی، معاشرتی یا مذہبی رسم و رواج کی پابندی کبھی قبول نہیں جو ان کی زندگی کو پابہ زنجیر کر دے، فکر و نظر کی جولانی کے لیے سدِ راہ ہو جائے اور خودداری کو پامال کر دے۔ ان کی یہی آزادہ روی کبھی ندرت آفرینی کا باعث بن جاتی ہے تو کبھی بے راہ روی کا سبب۔ وہ قلندری و رندمشربی کے دلدادہ ہیں، قلندری و رندمشربی ہی وہ صفت ہے جس کو رسوم و قیود سے آزادی کہہ سکتے ہیں اور آزادہ روی اور خودداری کی برقراری کو وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کا تعلق دیر و حرم سے ہو اور نہ کسی کے در و آستاں سے کیونکہ یہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کو وسیع النظر ہونے سے روکتی ہیں، البتہ کسی عام رہ گزار پر جادہ نشیں ہونے کی وجہ سے زندگی کے نت نئے تماشوں سے ان کو بصیرت حاصل ہوتی ہے اور ان کے ذکر و عمل کی قوت ارتقائی منازل سے گزرتی ہے ؎

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں　　بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ　　سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم　　الٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

مختصر یہ کہ غالبؔ نے اردو غزل کو حدیثِ دلبراں ہی نہیں رکھا بلکہ اس کو فکر و احساس کے لیے نئے رجحانات، مادی اور روحانی تسکین کا نعمتِ تجسس، اظہار کی نئی وسعتیں، زندگی کی تازگی اور رعنائی و شگفتگیٔ حال کا شعور، خوش آئند مستقبل کا نظریہ یا تصور اور بہارِ رفتہ کی صحت مند روایتیں دے کر اس کے دامن کو وسیع تر کر دیا۔

غالب کی الم پسندی کا نفسیاتی تجزیہ

علی رضا حسینی

غالب کا کلام اسی چادرِ آب کے مانند ہے جو سایۂ شفق میں دور تک پھیلی ہوئی ہے اور جس پر شفق کے مختلف رنگوں کا عکس پڑ رہا ہو۔ کلام کی طرح غالب کی شخصیت بھی گنجینۂ مخفی کا ایک خزینہ ہے۔ پہلو در پہلو اور تہہ در تہہ۔ غالب نے زندگی سے کبھی شکست نہیں مانی بلکہ زندگی کو اپنے حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری صحت مند ہے۔ وہ ایک حساس انسان تھے۔ یعنی سماج کے باشعور فرد۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شاعر ہی نہ ہوتے۔ شاعر کا شعور اجتماعی سے بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت اور اس کے پیرایۂ اظہار سب پر اس کی چھاپ ہوتی ہے۔ زمانے کے نشیب و فراز کا اثر اس کی شاعری اور شخصیت دونوں پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری رنجیدگی اور سنجیدگی دونوں کا آمیزہ ہے۔ وہ دماغ سے سوچتے تھے اور دل سے فیصلہ کرتے تھے۔ ان کا وجدان فکری زیادہ اور جذباتی کم تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ سرسید احمد خاں کی مرتب کردہ آئینِ اکبری پر یہ تنقید نہ کرتے۔

مردہ پروردن مبارک کار نیست خود بگو کان نیز جز گفتار نیست

دماغ اور دل کے اس امتزاج نے غالب کی فکر کو جان دار، ان کے مزاج کو توانا اور ان کی شاعری کو صحت مند بنا دیا تھا۔ وہ سرسید کو نصیحت کرتے ہیں "صاحبانِ انگلستان را نگر"۔ ان کی ہمہ رنگ، ہمہ گیر شخصیت اور فن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر ابھی بہت کچھ لکھنے کو باقی ہے۔

اس دور میں اردو کے کسی شاعر نے اتنا سفر نہ کیا ہوگا جتنا کہ غالب نے۔ غالب کو جو سفر کرنا پڑے وہ کشائشِ روزگار کے لیے۔ کلکتہ پنشن کی اجرائی کے لیے، رام پور حقِ وظیفہ گوئی اور وظیفہ خواری ادا کرنے کے لیے، بنارس اور لکھنؤ کلکتہ سے واپسی پر کچھ اعزا اور احباب سے ملنے کے لیے اور میرٹھ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملنے کے لیے تاکہ اپنے مذاقِ سخن کی تسکین ہو سکے۔ غالب کے دور ہی میں فارسی کے سمجھنے والے قریب قریب ختم ہو گئے تھے مگر چونکہ جاگیرداری نظام باقی تھا اور پرانا طرزِ فکر قائم تھا اس لیے اہلِ مذاق زندہ تھے اور فارسی دانی تہذیبی زندگی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے غالب کا یہ سفر آسودگیِ خاطر کی تلاش میں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر غالب کو آسودگیِ خاطر کی یہ تلاش ہی کیوں تھی؟ اس کی ایک وجہ تو ان کی خود پسندی تھی۔ دوسری الم پسندی۔ ان کا فن دراصل ان کی شخصیت کا آئینہ ہے جس میں نا آسودگی کا دخل ہے۔ اس نا آسودگی پر کچھ تو زمانے کے کیف و کم کا اثر تھا اور کچھ ان کے ماحول کا۔ ان کے باپ میر تقی میر کی طرح صوفی صافی یا درویش صفت نہ تھے کہ وہ اس مقولے پر عمل کرتے "درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست"۔ ان کے خاندانِ افتخارِ نسبی کا ایک پیمانہ تھا جس کی حفاظت ان کا فرض تھا۔ ایک کھاتا پیتا گھرانا جو سمرقند سے ہندوستان آیا اور یہاں آ کر اعزازات کے منصبوں پر فائز ہوا۔ غالب کی عزت نفسی دراصل ان کی خود پسندی کا عکس ہے۔ ان کی انانیت شکست خوردہ ہونے کے بعد بھی قناعت پسند نہ تھی۔ باپ بچپن میں مر گئے۔ چچا جوانی کی منزل تک آتے آتے داغِ مفارقت دے گئے۔ ننہیال میں پرورش ہوئی۔ ددھیال فضا کا لطف ان کو نہ مل سکا۔ غالب پدر مردہ تھے۔ اس لیے اس لطافتِ تربیت سے محروم رہے جو باپ کے دامنِ شفقت میں ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ تھا پھر بھی فراغت نصیب تھی۔ لیکن جوانی سے بڑھاپے تک آتے آتے اس نظام نے بھی دم توڑ دیا جس کا نتیجہ یہ فراغت اور عیش و آرام تھا۔ کشمکش کے اس دور میں ان کے پاس صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ حقیقتوں سے انکار بھی

نہ کریں اور زندگی کو حسن و خوبی سے گزارنے جائیں۔ غالب کی سلیم الطبعی اور بذلہ سنجی نے انھیں محرومیوں میں آسرا تو دیا مگر جس چیز نے ان کو یاس پرست ہونے سے بچایا وہ ان کی خود اعتمادی تھی۔ اگر وہ یاس پرست ہوتے تو صرف ماضی کی طرف دیکھتے۔ ماضی پرست انسان کو چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی دکھلائی دیتی ہے۔ ماحول کی تاریکی سے تو غالب کو بھی انکار نہ تھا مگر مایوسی کا اظہار اور چیز ہے اور مایوس ہو کر ہاتھ پیر ڈال دینا اور چیز۔ کسی فن کار کا یہ احساس ہی بڑی چیز ہے کہ وہ نامساعد حالات میں بھی فکر و فن کی شمع روشن رکھے۔ یہی چیز غالب کی خود اعتمادی پر دلیل ہے کہ اس نے اپنے اظہار فن کے لیے اس زبان کا انتخاب کیا جو سکہ کا سد بھی تھی اور طنز و تعریض کا شکار بھی۔ طرز بیدل میں ریختہ کہنا اور فارسی کو سرمایۂ افتخار سمجھنا یہی دو باتیں ایسی تھیں جو یہ بتاتی ہیں کہ غالب کو حالات سے لڑ کر زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ یہ محض شاعری نہیں ؎

بہ وادی کہ در آں خضر را عصا خفت است ٭ بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفت است

"بہ سینہ می سپرم راہ" کا نتیجہ تھا کہ غالب کی شاعری محض تلخی کام و دہن نہیں بلکہ زندگی بسر کرنے کا سلیقہ ہے۔ غم زندگی کی ارزانی نہیں بلکہ گرانجانی ہے۔ اگر کوئی شخص اس بات کو سمجھ لے اور زندہ بھی رہنا چاہے تو نشاط زندگی کا سرمایہ بھی اسی غم کی بہ دولت حاصل ہوتا ہے۔ ایک فن کار کے لیے یہ نشاط و کیف نشاط سخن کا سرمایہ بن جاتا ہے۔ ان اشعار میں غالب نے انھیں حالات کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں ایک طرف ماحول کی تصویر ہے تو دوسری طرف اپنی خود اعتمادی کا اظہار ؎

چہ گوید زباں آور بے نوا ٭ چہ آید بہ ہیلاج بے کد خدا
شبے کایں ورق راکشودم نورد ٭ بہ ہر کار اندیشۂ تیز گرد
شب از تیرگی اہرمن روئے بود ٭ ز سودا جہاں اہرمن خوئے بود
بخلوت ز تاریخیم دم گرفت ٭ نشاط سخن صورت غم گرفت

زمانے کی شکایت کے ساتھ ان اشعار میں کتنی شگفتگی ہے۔ دنیا کی "اہرمن خوئی" کے بعد بھی نشاط سخن کا احساس اور نشاط سخن کا صورت غم میں تبدیل ہونا، سماجی زندگی کا عمل اور رد عمل ہے جس میں شخصیت کی خود اعتمادی اور خود پسندی کی لذت بھی شامل ہے۔ غم کی یہ اثر پذیری غالب کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی ؎

مرا جنگ در من اثر کردہ غم ٭ بہ مرگ طرب مو بہ گر کردہ غم
نظامی بحرت از سر دوش آمدہ ٭ زلالی از و در خروش آمدہ
من از خویشتن با دل دردمند ٭ نوائے غزل برکشیدہ بلند

غزل را چوں از من نوائے رسید ٭ زوالا سپی بجائے رسید
بنا شم اگر گنجہ گنجم بس است ٭ بہ غم گر چنیں پردہ سنجم بس است

غالب کے پاس غم کا جذباتی پہلو بھی تھا اور فکری پہلو بھی۔ غم کیا ہے؟ غم کیوں ہے؟ غم کا اثر کن لوگوں پر شدید ہوتا ہے۔ غالب نے اپنے ایک شعر میں متاع بردہ اور عیش رفتہ کی ترکیبوں کا استعمال کیا ہے۔ یہ ترکیبیں اگر محض تازہ کاری ہوتیں تو بھی قابل قدر تھیں مگر ایسا نہیں ہے یہ ترکیبیں ان کی داخلی کیفیت کا خارجی اظہار ہیں۔ غم ایک فلسفہ نہیں بلکہ ایک تاریخ ہے۔ وہ تاریخ جس سے فلسفۂ حیات کی ابتدا ہوتی ہے۔ ابن آدم کا لہو اگر زمین پر نہ گرتا تو آدم کے آب و گل میں سوز دروں نہ ہوتا۔ غالب کی اگر ان ترکیبوں پر غور کیا جائے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے اشعار میں استعمال کی ہیں تو محض یہ جدت پسندی اور اپنی راہ الگ بنانا نہیں ہے بلکہ ان تاریخی حقائق کا اظہار ہے جن سے غالب انفرادی اور سماجی طور پر متاثر تھے۔ ان ترکیبوں کے پیچھے ان کی زندگی کی پوری تاریخ ہے ؎

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ٭ میں ہوں اپنی شکست کی آواز

گل نغمہ ہو یا شکست ساز ان کے پس پردہ سماجی اور تاریخی عوامل ہی کام کرتے ہیں۔ لیکن غالب زندگی کے اس تاریک خلوت کدے میں بھی اپنا چراغ دل جلا کر روشنی حاصل کرتے ہیں ؎

در آں کنج تاریک شب ہولناک ٭ چراغے طلب کردم از جان پاک
چراغے کہ بے روغن افروختم ٭ دلے بود کز تاب غم سوختم

یہ چراغ بے روغن کیا تھا؟ غالب کا دل نہیں بلکہ غالب کی زندگی اور اس کی پوری تاریخ۔ آخر یہ غالب کی انانیت پسندی تھی یا ماضی پرستی کہ وہ اپنا رشتہ بار بار افراسیاب اور پشنگ سے جوڑتے ہیں اور سمرقند و ماوراء النہر سے اپنا تعلق قائم کرتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ نہ انانیت پسندی تھی اور نہ ماضی پرستی بلکہ ماضی کی روشنی میں مستقبل کے لیے راستہ پیدا کرنا۔ اعزاز انھیں ہر قیمت پر عزیز تھا چاہے وہ سپہ گری سے حاصل ہو یا شاعری سے۔ وہ سپاہی بننا چاہتے تھے مگر اس کے لیے حالات سازگار نہ تھے۔ ان کے زمانے کے سماجی ماحول میں شاعری ذریعۂ عزت تھی۔ شعراء کی قدر علماء سے زیادہ ہوتی تھی۔ لہٰذا غالب کو یہی راہ اختیار کرنا پڑی۔ وہ اس پر راضی نہ تھے مگر مجبور تھے ؎ شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن من۔ قصیدہ خوانی غالب کا منصب نہ تھا بلکہ وقت کا تقاضا۔ انھوں نے قصیدے کہے۔ اعزاز و اکرام کی خاطر کم، اظہار جذبات اور خلوص و عقیدت کی ترجمانی کے لیے زیادہ۔ ان کے

قصیدے فارسی میں [illegible] اور اردو میں کم ہیں۔ ان میں خلوص و عقیدت کا جذبہ بھی شامل ہے مثلاً حضرت عباسؑ، امام حسینؑ اور ائمہ معصومین کے قصیدوں میں۔ اعزا اور اکرام کی طلب بھی ہے مثلاً لارڈ ایلن برو اور ملکہ وکٹوریہ کے قصائد میں۔ تاہم قصیدہ خوانی ان کا منصب خاندانی نہ تھا بلکہ حقیقتاً یہ ان کے اعزاز و اکرام خاندانی سے متصادم تھا۔ اس لئے غالب کے قصیدوں میں نہ تو وہ زور ہے جو خاقانی اور انوری کے قصیدوں میں ہے اور نہ ان کی وہ اہمیت ہے جو اردو میں سودا اور ذوق کے قصیدوں کو حاصل ہے۔ خاقانی اپنی فکر کا زندانی تھا۔ انوری مبالغہ کا اسیر، دونوں صلہ و بخشش کے لالچی۔ سودا ذہین و طباع تھے مگر خوش مزاج بھی۔ وہ "اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی" کے قائل تھے۔ ذوق معمولی سپاہی کے لڑکے تھے۔ استاد شاہ ہونا ان کے لئے بڑا منصب تھا۔ غالب کو اپنی ذہانت پر بھی اعتماد تھا اور اپنی فارسی دانی پر بھی ناز۔ وہ کسی طرح اپنے کو صائب و کلیم سے کم نہ سمجھتے تھے۔ ان کی انانیت یزداں گیر اور یزداں شکار تھی ؎

نہ کچھ تھا تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

عظمت انسانی کا یہ راگ اردو میں اقبال کے علاوہ کسی نے نہیں چھیڑا ؎

ہم نہ ہوتے تو خدائی کے بھرم کھل جاتے
تیری ہستی کا پتہ ہے مرا انساں ہونا

مگر مور ناچتے ناچتے جب اپنے پیروں پر نظر کرتا ہے تو افسردہ ہو کر ٹھٹھک جاتا ہے۔ یہ افسردگی فریب سادہ دلی نہیں بلکہ حقیقت بینی اور رازہائے سینہ گداز ہیں۔ کلیم کو شاہجہاں مل گیا تھا جس نے ایک قصیدہ لکھنے پر اس کا منھ موتیوں سے بھر دیا تھا۔ غالب کی قسمت میں قلعۂ معلی کی آخری یادگار تھی جس کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ شاہ شطرنج مہرۂ بیجان ہے۔ شعر خوانی آلۂ تفریح، شعر گوئی ضیاع وقت۔ فکر و فن کی اس پائمالی اور اپنی ناقدری کا احساس غالب کو شدت سے تھا ورنہ وہ یہ نہ کہتے ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

ماحول کا یہ جبر، اندر کی یہ گھٹن دو باتوں کی متقاضی تھی بے لگام انانیت یا بے پناہ مایوسی۔ یہ دونوں راہیں خطرناک ہیں اور ان راہوں پر پڑ کر جو شخصیت بنتی ہے وہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے انتہائی کج بین و کج فہم اور عملی نقطۂ نظر سے انتہائی غیر متوازن اور غیر متدل۔ غالب کے سامنے اتفاق سے یہی دو راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ غالب کو توازن و اعتدال کی منزل تک پہنچنے کے لئے اس راستہ سے گذرنا تھا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز تھا۔ لیکن جس چیز نے ان کو غلطاں روی سے بچایا وہ ان کا احساس انفرادیت اور آرزومندی ہے۔ ان کی انانیت میں "نشاط سخن" کی آمیزش ہے اور شکست خوردگی میں "نشاط کار" کی لذت۔ یہ ایک فنکارانہ شخصیت کی تعمیر ہے جو ہر لحاظ سے منفرد اور ممتاز تھی ـــــ اپنے زمانہ میں اور اپنے زمانہ کے بعد بھی۔ غالب الم دوست اور الم پسند ضرور ہیں ؎

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

لیکن یہ حوصلہ مندی ہمیں زندگی سے مایوس و ہراساں نہیں کرتی بلکہ ناموافق حالات میں بھی زندہ رہنے کا سلیقہ بخشتی ہے۔ غالب کے یہاں گلشن ناآفریدہ سے زیادہ عندلیب گلشن ناآفریدہ کا تصور حیات بخش ہے۔ یہ انفرادی بھی ہے اور سماجی بھی۔ نیا انسان، نیا سماج ـــــ کوئی عمل ضائع نہیں جاتا، محنت برباد نہیں ہوتی۔ نیکیوں کی قدر بہرحال ہوتی ہے صرف آج اور کل کا فرق ہے۔ یہ فرق شعور کی تبدیلیوں کا فرق ہے ؎

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

درد و غم میں اگر نشاط کار کی لذت نہ ہو تو جینا بیکار، لیکن یہ بات ہر ایک کے بس کی نہیں۔ اس لئے فلسفی کی نگاہ اور شاعر کا دل ہونا چاہیئے۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کا آخر اور انیسویں صدی کے شروع کا ہندستان ایک بھیانک تصویر ہے۔ نہ مستحکم سلطنت نہ منظم حکومت۔ انتشار، طوائف الملوکی، سماجی نراج اور افراتفری۔ زوال پذیر سماج آخری ہچکیاں لے رہا تھا ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گذار باد یاں

ان حالات میں کسی حساس انسان کے زندہ رہنے کی صورت کیا ہو سکتی تھی۔ سر لشکری، صوفی گری، درویشی، دانش وری، شاعری۔ زمانہ کے رنگ کو دیکھ کر غالب نے قلم کو علم بنا لیا۔ اس لئے کہ بزرگوں کے شکستہ نیزوں کی نوکیں گھس چکی تھیں۔ علم کو قلم بنا لینے کی وجہ ظہوری، نظیری، عرفی اور امیر خسرو کی مثالیں بھی تھیں تو ساتھ ہی ساتھ غالب کا احساس انفرادیت اور حوصلہ مندی بھی ؎

بیا ور ید گر اینجا بود زباندانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

لیکن غالب کی اس آزادہ روی اور علو ہمت کے لئے میدان تنگ تھا غالب کی عربدہ جوئی وسعتوں کی متلاشی تھی مگر حالات کا اقتضا ران کے حوصلوں کے مطابق نہ تھا ؎

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا　　عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا

نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضموں غالب　　گرچہ دریا کو بھی دل کھول کے ساحل باندھا

یاس و امید کی اس کش مکش میں غالب نے حقیقت پسندی کی راہ اختیار کی یعنی زندگی سے محبت چاہے وہ کتنی ہی شکستہ اور زار و نزار کیوں نہ ہو اور اگر وہ حقیقت پسندی کی راہ اختیار نہ کرتے تو اپنی انفرادیت اور آرزومندی دونوں کو ختم کر لیتے۔ پھر ادب کا طالب علم ان کو ذوق اور مومن کے ہم عصر سے زیادہ وزن نہ دیتا مگر اس کی وسعت نظر کا تقاضا بصارت نہیں بلکہ بصیرت تھی۔ مرنے میں جینے کا لطف لینا، ہوس کو نشاط کار میں تبدیل کر دینا غالب ہی کے ایسے انسان کا کام ہو سکتا تھا جو حقیقتوں سے انکار بھی نہ کرے مگر پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر بھی نکال لے۔ جس کے لئے زخم تیغ دلکشا بن جائے وہ زندگی کے سامنے سپر انداختہ نہیں ہو سکتے

زیزدان غم آمد دل افروز من　　چراغ شب و اختر روز من

الم پسندی غالب کے فلسفۂ جمالیات کا وہ حسین نقطہ ہے جہاں شگفتگی بھی ملتی ہے اور ندرت بھی ہے۔

دگر ز ایمنئ راہ و قرب کعبہ چہ حظ　　مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفت است

لیکن اس کے بعد بھی یہ ان کا مزاج تھا کہ وہ چوٹ کھا کر ہنس لیتے تھے۔ وہ غیر مطمئن زندگی کے قائل تو نہ تھے مگر انھیں غیر مطمئن زندگی گزارنا پڑی۔ ان کے حوصلوں کی وسعت اور ماحول کی تنگی، مزاج کی رجائیت اور حالات کی ابتری۔ یہ ایک ایسا تضاد تھا جسے غالب عمر بھر حل نہ کر سکے۔ اسی چیز کا نتیجہ وہ حرماں نصیبی اور الم پسندی ہے جو ان کی ساری شخصیت اور فن پر چھائی ہوئی ہے ؎

سوزم از حرمان مے با آنکہ آبم در سبو است
تا چہ می کردم اگر بخت سکندر داشتم
ہیچ میدانی کہ غالب چوں بسر بردم بہ ہر
سنگ طبع بلبل و شغل سمندر داشتم

مگر اس "حرمان مے" اور "شغل سمندر" میں نہ یاس ہے نہ قنوطیت، نہ احساس پستی ہے اور نہ اقرار نکبت۔ بلکہ حوصلہ مندی اور عزم۔ جو شخص طبع بلبل، شغل سمندر، حرمان مے، بخت سکندر کا ذکر ایک ہی نے اور ایک ہی لہجہ میں کر سکتا ہے وہ کتنی پرشکوہ شخصیت کا مالک ہوگا۔ بذلہ سنج، ظریف مزاج، آزادہ رو، زندہ دل، رند مشرب۔ کتنی پرکشش شخصیت ہے۔ ایسی شخصیت ہر پست و بلند کو پیس کر اپنے ہی سانچہ میں ڈھال لے گی کبھی رشک کے توسط سے کبھی طنز و تعریض کے ذریعے سے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم　　فلک بہ گردش رطل گراں بگردانیم

غالب کی پرشکوہ اور پرکشش شخصیت اور اس کے فن کی عظمت کا راز یہی ہے کہ اس نے ذاتی غم کو صفاتی، سماجی اور کائناتی غم بنا دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی فن کار اس وقت تک عظیم ہو ہی نہیں سکتا جب تک یہ راستہ اختیار نہ کرے فردوسی کا المیہ اس کا ذاتی غم بھی تھا جس کا نتیجہ وہ ہجو ہے جو شاہنامہ کے ختم ہونے کے بعد اس نے محمود کو بھیجی تھی مگر یہاں بھی اس کا ذاتی غم ذاتی سے زیادہ صفاتی اور سماجی ہے ؎

بسے رنج بردم دریں سال سی　　عجم زندہ کردم بدیں پارسی

اس ذاتی غم کا دوسرا رخ اس کا وہ شاہنامہ ہے جہاں تاریخی آویزش اور سماجی کشمکش ہے یعنی غم زندگی کا وہ حصہ جہاں سے اس کے ملک کی تاریخ بدل رہی تھی اور وہ خود بدل رہا تھا:

زشیر شتر خوردن و سوسمار　　عرب را بجائے رسید ست کار

کہ تخت کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو
منیژہ منم دخت افراسیاب
برہنہ ندیدش تنم آفتاب
برائے یکے بیژن شور بخت
فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

غالب کا الم پسند ہونا اس کی ذاتی زندگی کا کیف و کم تھا۔ شاید ہی اس دور کے کسی فن کار کو اتنی تکلیفیں اٹھانی پڑی ہوں جتنی کہ غالب کو۔ یہ تکلیفیں جسمانی بھی تھیں، روحانی بھی تھیں اور مادی و اقتصادی بھی۔ پنشن کی اجرائی کے لئے دہلی سے کلکتہ کا سفر انھوں نے کیا، مقروض وہ ہوئے، دوسروں کی خوشامدیں انھوں نے کیں، اپنے علم و فضل پر رکیک حملے انھوں نے برداشت کئے، کلکتہ کے قیام کے دوران قتیل اور اس کے شاگردوں کا ہنگامہ بپا اور وہ بھی اس کتاب پر جو آنے والی نسلوں کو اغلاط زبان و بیان سے آگاہ کرنے کے لئے لکھی گئی ہو۔ یہ واقعہ بجائے خود علم و ادب کی دنیا کا ایک عظیم سانحہ ہے لیکن اس سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ مرزا کو معذرت کرنا پڑی۔ مثنوی "باد مخالف" کا یہ اعتذاری انداز ایک عالم اور اہل زبان کی انانیت پر تازیانہ ہے

اور اس کے علم و فضل کا مذاق۔ لیکن غالب نے اسے محض حوصلگان مرنج ہونے کی وجہ سے برداشت نہیں کیا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے بلکہ اس لئے کہ مخالفین کو بات کرنے کا سلیقہ آ جائے گویا مرزا کا ذاتی فعل ایک سماجی عمل تھا جو اس تناؤ میں ہمواری پیدا کر رہا تھا۔ غالب کے ذاتی غم کی داستان بڑی طویل ہے اور ہر غم ایک ضرب ہے غالب کی انانیت اور خود پسندی پر۔ لیکن یہ بھی غالب کا ظرف نظر تھا کہ اس نے ہر ذاتی غم کو تحلیل کر کے یا تو اس کو سماجی عمل بنا دیا یا کائناتی اور آفاقی حقیقت ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

اردو کے شعراء میں سودا اپنی طباعی اور خوش مزاجی کے لئے مشہور ہیں مگر وہ بھی یا تو زمانہ کے حالات کے سامنے سپر انداختہ ہو گئے ہیں یا چڑچڑانے ؎

فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا، کیا کرے

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو کب تک

حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یہ بھی تو پھر تو کب تک

کیفیت مزاج (۵۰۰۰) کی یہ تبدیلی نہ تو زندگی کا حرکی عمل ہے اور نہ متوازن سماجی فعل۔ حرکت ہو یا توازن اس کے لئے غم عشق و غم روزگار دونوں کو ایک ہی سانچہ میں ڈھال کر زندگی کو سنوارنا پڑتا ہے "غم عشق" اور "غم روزگار" دونوں زندگی کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں ورنہ نہ تو انفرادی زندگی میں جوش پیدا ہوتا اور نہ ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی۔ غم زندگی کا ایک تسلسل ہے۔ بسیط اور محیط۔ اس میں "تھا" "ہے" اور "ہوگا" تینوں زمانے شامل ہیں۔ غالب کا غم "ہے" کی دنیا تک محدود نہ تھا اس کی الم پسندی "تھا" سے عبارت ہے۔ "تھا" جو زندگی کا ایک تسلسل ہے اور ماضی، حال اور مستقبل سب کو ایک دائرہ میں سمیٹ لیتا ہے ؎

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

غالب کے پاس غم کی ایک تاریخ تھی۔ زمانہ کا نشیب و فراز، سماجی ڈھانچہ کا شکست و ریخت سے دوچار ہونا، غیر واضح مستقبل، مبہم امیدیں، تذبذب و انتشار یعنی ماضی سے مستقبل تک غم کی ایک واضح لکیر جو کبھی آثار و علامات پر خط کھینچتی ہوئی گذری ہے تو کبھی ان آثار و علامات میں زندگی کی تپش اور تڑپ بھرتی ہوئی۔ غالب کے نغمات میں ہر جگہ پیچ و خم ہیں ورنہ اتنی تشریحات ہی نہ ہوتیں۔

جتنی اب تک غالب کے کلام پر ہو چکی ہیں۔ ان کے یہاں پست و بلند بھی ہے مگر کسی جگہ قوت کی کمی نہیں چاہے وہ ڈھول دھپا والا شعر ہو یا جوں پاس والا ؎

بہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں کوئی جو فتح و ظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

شریک غالب کا تصور غالب کے لئے حقیقت ہے۔ یہ اعتراف شکست بھی ہے اور حالات پر طنز بھی۔ شاعر نغز گو و خوش گفتار کے لئے دوسروں کی خوشامد کرنا زیب نہیں دیتا اور غالب کی انانیت اس کی اجازت بھی نہ دیتی مگر شریک غالب الغ بے یہ سب کچھ کرا رہا تھا: "ماہ صیام میں سلاطین و امراء خیرات کرتے ہیں اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اس مہینے میں ہو جائے اور اس بڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے تو اس مہینہ میں تیاری ہو رہے اور شوال میں رسم نکاح عمل میں آئے اور چونکہ اس ماہ میں در فیض باز اور سال انگریزی کا آغاز ہے۔ وہ پچیس روپے مہینا جو زبان مبارک سے نکلا ہے جنوری ۱۸۶۹ء سے بنام حسین علی خاں نکو جاری ہو جائے تو گویا مجھے دونوں جہان مل گئے۔" یہ حسین علی خاں زین العابدین کے صاحب زادے تھے جن کو مرزا صاحب کی بیوی نے گود لیا تھا۔ بیوی کی خواہش تھی سہرا دیکھنے کی۔ اس کے لئے یہ گڑگڑاہٹ، یہ لجاجت۔ یہ خط نواب رام پور کے نام ہے۔ اس خط کے سرفہرست جو شعر ہے وہ بھی قابل غور ہے ؎

روز روزہ است و روز ناپیداست
غلظت ابر و شدت سرماست

روز ناپید، غلظت ابر، شدت سرما، لفظ و معنی کے ان نہاں خانوں کو اگر ٹٹولا جائے تو معلوم نہیں کتنے رستے ہوئے ناسور ملیں گے۔ غالب نے اظہار بیان کے لئے غزل کا فارم اختیار کیا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ وہ غزل سے گھبراتے تھے اور اس کی تنگنائی سے شکوہ سنج تھے۔ یہی کوزہ کہیں بنا دینے کا فن غزل سے زیادہ کسی کے پاس نہیں۔ ایک خوددار اور انانیت پسند شاعر کے لئے بات کہنے کا اس سے بہتر طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا ہر شعر ایک جہان معنی ہے مزاج کی یہی کیفیت۔ تکلیف دہ حالات پر ہنس لینا۔ خواہ وہ ذاتی ہوں یا سماجی، رجائیت کی فتح اور قنوطیت کی شکست ہے۔ غالب نہ رزم کے شاعر تھے اور نہ بزم کے سخنور مگر زندگی کے المیہ کو انہوں نے اپنے ظرف نظر کی کھڑ اوپر چڑھا کر ایک نشاط آور کیفیت بنا لیا تھا ؎

(بقیہ صفحہ ۱۸۴ پر)

غالب کا تنقیدی شعور

شمس تبریزی خاں

غالب کا کہنا تھا کہ "شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں" (خطوط غالب ۱/۸۴) میر کے بعد غالب دوسرے شاعر ہیں جن کے کلام کے پس منظر میں ان کا شعری سلیقہ، اور تنقیدی شعور صاف اور بیدار نظر آتا ہے۔ ان کے کلام کی خوبی یہی ہے کہ جدت و جودت، انفرادیت اور عبقریت کے ساتھ انھوں نے اپنے ادب میں تنقید حیات کا کام لیا ہے۔ اقبال کی طرح ان کا ذہن و شعور حد درجہ حساس نہ تھا لیکن ان کی بالغ نظری، دور بینی، ژرف نگاہی کی داد دینا پڑتی ہے کہ ان کے آئینۂ ادراک میں پردۂ افلاک کے وہ حادثے بھی عکس ریز ہو گئے تھے جنھیں ۲۰ ویں صدی کے روشن خیال بھی نہیں دیکھ سکے۔

انھوں نے مغل تہذیب کو مٹتے اور مشرقی تمدن کا چراغ گل ہوتے دیکھا مگر نئی صبح کے آثار اور "آفتاب تازہ" کے انوار کی جھلکیاں دیکھ کر وہ ڈوبتے ہوئے تاروں کے ماتم سے بچے رہے۔ غالب کا فلسفۂ حیات مکمل اور ہمہ گیر نہ سہی مگر اس میں انسانیت کی بنیادی قدروں کے نقوش بہت واضح ہیں۔ زندگی اور زمانہ یا غم جاناں و غم دوراں کے تمام احوال و مقامات، اسرار و نکات ان کے شعروں میں کھل گئے ہیں۔ زندگی سے بے پناہ محبت، رجائیت اور امید پسندی کا (OPTIMISM) غم کو نشاطِ غم بنا لینے کا سلیقہ، محبت اور وفا، انسان دوستی، اور دوسری تعمیری اخلاقی قدروں پر ان کا بھرپور ایمان ہی ان کی شاعری کے وہ بنیادی عناصر ہیں جن سے انھیں بقائے دوام اور قبولِ عام ملا ہے۔

ظاہر ہے کہ حیات و کائنات سے متعلق ایسا دوامی اور عظیم نظریہ ان کے بلند ذوقِ نظر، رچے ہوئے ادبی مزاج، اور گہرے تنقیدی شعور ہی کا نتیجہ تھا یہ ان کی نرگسیت یا انانیت نہ تھی کہ وہ میر و میرزا اور اپنے معاصرین کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، بلکہ ان کی انفرادی عبقریت اور بلند نظری کا تقاضا تھا کہ ان کا معیارِ نظر اسے جنس کم عیار سمجھے۔ فارسی کے متعدد اچھے شاعروں میں بھی جن کی تعداد ایک درجن سے زائد ہے، ان کی نظر صائب، عرفی، نظیری، اور حزیں سے آگے نہیں بڑھتی، اور اردو میں سچ پوچھئے تو وہ صرف اپنی اداؤں کے قتیل ہیں۔ ہاں کبھی نگاہِ غلط انداز سے دوسروں کی بات رکھنے کے لئے میر کی طرف بھی دیکھ لیتے ہیں۔ غالب کی تنقیدی فکر میں تنوع اور گوناگونی (VARIETY) کا بہت عمل دخل ہے۔ دراصل اسی پیٹرن سے ان کے ذہنی افق کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے جہاں اپنی تہذیب کے کمزور پہلوؤں پر نظر ثانی کی اور ان پر احتجاج کیا وہیں انھوں نے اپنی دیدہ وری سے نئی صالح اور تعمیری قدروں کا عرفان بھی بخشا۔ یہ ایک مستقل اور وسیع موضوع ہے کہ غالب کے ذہنی سرمایہ کا جائزہ لیتے ہوئے اقدار کی ان قندیلوں پر نظر ڈالی جائے جو انھوں نے زندگی کی راہوں میں فروزاں کیں۔

حسرتِ تعمیر، لذتِ آزار، ہنگامہ پسندی، نشاطِ غم، ذوقِ تماشا، رشک، خودداری، اور صحت مند و توانا ذہنی رجحان و امید پروری جیسی حیات بخش قدریں ان کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے کتنا زرخیز و شاداب ذہن پایا تھا اور ان کی ادبی تنقیدوں (POETICS) میں کتنی گمبھیرتا، ہمہ گیری، اور گہرائی ہے۔ ان کے افکار گوناگوں سہی لیکن ان کا اثر دیر اور دور تک ہمارے ادب نے محسوس کیا اور ان کی لذت تقریر کی دل آویزی کا یہ عالم ہے کہ ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے پر بھی جو سنتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

ہمارے ادب میں ابدیت، دوام، اور آفاقیت کے جو چند نمونے ہیں، ان میں

غالب کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب ذہنی طور پر ہمیشہ ہمارے رفیقِ سفر رہیں گے اور ہر نئی منزل پر ان کا اندازِ خرام یاد آتا رہے گا۔ اس ایک صدی میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچی، صنعتی انقلاب ہوا، بین الاقوامی اسٹیج پر اشتراکیت، قومیت اور جمہوریت کے مناظر آئے، ادب میں ترقی پسندی آئی، اور اب جدیدیت (MODERNITY) اور رمزیت (SYMBOLISM) کی پیچیدگیاں اس پر چھا رہی ہیں مگر غالب نے کہیں ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ہر موڑ پر ہم نے غالب سے حرکت و حرارت کی توانائیاں حاصل کیں۔ آج بھی شاید ہم سب سے زیادہ غالب سے متاثر ہیں اور ان میں اپنائیت اور یگانگت محسوس کرتے ہیں۔ اقبال نے قصۂ قدیم و جدید کو کم نظری کی دلیل ٹھہرایا تھا، مگر اس کا عملی نمونہ ہمیں غالب کے ہاں بہت پہلے ملتا ہے۔ غالب کی دنیا میں ہمیں بارہا ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان کے ذہنی سنگم پر مشرق و مغرب کی سرحدیں مل گئی ہیں اور قدیم و جدید دنیا کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ غالب اپنی بلند پردازی میں انسانیت کی بلندی پر ہیں جہاں وہ صرف انسان نظر آتے ہیں۔ دراصل ان کی انسان دوستی ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ انسان کے رنج و راحت، اس کی کامرانیاں اور محرومیاں، اس کے سوز و ساز بیانِ غالب میں جلوہ گر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کا انسان بھی اپنی ذہنی تسکین، روحانی اور وجدانی تسلی اور ذوق کی تشفی ان کے یہاں پاتا ہے۔

"شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن"! غالب کا ادعائی آہنگ نہیں تھا بلکہ "انا" کی ترنگ تھی۔ جو روح کی گہرائیوں سے نکلی تھی ـــــ غالب کی یہ پیشنگوئی حرف بہ حرف ثابت ہوئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ غالب شناسی کا ذوق و شوق ان کے بعد تدریجاً بڑھتا اور ارتقائی منزلیں طے کرتا رہا ہے، اور غالب کی صد سالہ سالگرہ کے بعد امید یہی ہے کہ اس رجحان میں اور زیادہ ترقی ہوگی اور غالب کی آواز دنیا کے کانوں سے ٹکرائے گی۔

اس بسیط دراز نفسی کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود غالب کی نثر سے ان کے تنقیدی اشاروں کو جمع کیا جائے اور ان جزئیات سے ان کے تنقیدی ذہن تک پہنچا جائے۔ غالب نے شعر و سخن کی تعریف کرتے ہوئے اپنے فارسی دیوان کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ "سخن را دو شیزگی نہاد، و پاکیزگی گوہر، و برجستگی مضمون، و گداختگی نفس، و چاشنی سپاس، و نمک شکوہ، و نشاط نغمہ، و اندوہ شیون، و رسائی کار، و رسائی بار، و پردہ کشائی راز، و جلوہ فروشی نوید، و سازگاری آفرینا و دل خراش ـــــ و ہمواری صلا، و درشتی دورباش، و گزارش وعدہ و سپارش پیام، و بازنامۂ بزم و ہنگامۂ رزم حاصل" (کلیاتِ فارسی)۔ اس سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اردو تنقید کو غالب نے کتنی نئی اور خود آفریدہ قدروں سے روشناس کرایا تھا۔ ان قدروں میں قدرِ مشترک معنی خیزی، حقیقت پسندی، واقعہ نگاری، اور سچی تصویر کشی کا سوز و گداز ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کس شدت سے ان رجحانات کو پسند کرتے اور برتتے تھے۔ غالب نے ایک شریف اور متوسط زندگی گزاری، یار باشی اور دوست نوازی، ہمدردی اور انسان پروری ان کا شیوہ رہا۔ رواداری اور صلحِ کل ان کی پالیسی رہی، تدبیر اور حکمتِ عملی ان کا طرزِ حیات رہا۔ جس طرح ہندوؤں سے ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ منشی ہرگوپال تفتہ کو کاشانۂ دل کا ماہِ دو ہفتہ سمجھتے تھے، اور منشی نول کشور سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی، اسی طرح انگریز حکام بھی ان کی نفرت کا نہیں، توجہ کا مرکز بن گئے۔ انھیں کسی انسان کی ذات سے نفرت نہ تھی ع

ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

یہ سب باتیں شخصیت کی پرچھائیاں بن کر ان کے کلام اور اندازِ نظر پر عکس فگن ہوئیں۔ اور اس طرزِ زندگی نے ان کے تنقیدی مزاج کے ساتھ تاثیر و تاثر کا عمل جاری رکھا۔ غالب کا تنقیدی شعور بہت بیدار نہ سہی لیکن ہمہ گیر بہت ہے، یہ شعور نہ ہوتا تو وہ بھی اپنے دور کے شیوۂ عام کے مسافر ہوتے لیکن ذوق و مومن، آتش و ناسخ کے درمیان ان کی عبقریت کا جوہر اور اس کی چمک اسی فراواں انتقامی احساس کا نتیجہ ہے۔

غالب جس طرح فارسی نظم و نثر میں اپنے عہد میں سب سے آگے تھا، اسی طرح اردو نظم و نثر میں بھی امامت و اجتہاد کا درجہ اسے ملا اور موجودہ نثر کی بنیاد بھی غالب کی ڈالی ہوئی ہے۔ اردو نثر باوجود ترقی کے غالب کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکی ہے۔ خطوط نگاری میں تو وہ یکتا و یگانہ ہی رہے۔ مگر ان کی نثر منظوم کا اتباع شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بڑی حد تک کیا، اور ایک حد تک نیاز فتح پوری اور سید سلیمان نے بھی۔ اس لئے خطوط نگاری میں بھی ان "عناصرِ اربعہ" کا نام اردو دنیا میں بالترتیب لیا جا سکتا ہے۔ ان ادیبوں نے غالب کے "اندازِ بیان" میں "وسعتِ بیان" کے نئے نئے پھول کھلائے۔ پھر ان چاروں حضرات میں بھی مولانا آزاد کو امتیازِ خاص حاصل ہے اور وہ فکر و خیال کی عبقریت میں غالب سے بہت قریب ہیں۔ انھیں خود بھی اس کا شدت سے احساس تھا، اور ان کے بھتیجے اول نے اس کا اعتراف کیا۔ انھوں نے کہا تھا کہ "غالب مرحوم کو تو صرف اپنی شاعری کا

دیتا تھا مگر معلوم نہیں میرے ساتھ قبر میں علم و ادب، شعر و سخن، فقہ و حدیث، تفسیر و کلام کیا کیا چیزیں چلی جائیں گی۔"

مولانا آزاد کے طرز تحریر کی ایک بڑی خصوصیت (علاوہ ان کی بلند آہنگی کے) یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ شعر کا اتنا صحیح برجستہ اور برمحل استعمال کرتے ہیں کہ خود شعر میں جان پڑ جاتی ہے۔ شعر مضمون کا جز بن جاتا ہے اور ایسا یقین ہونے لگتا ہے کہ شاعر نے گویا اسی مقام کے لیے کہا تھا۔ مگر اردوئے معلی اور عود ہندی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ طرز بھی غالب ہی کے انداز بیان کا ایک حصہ ہے اور اس کا سر رشتہ بھی غالب کے سلسلۂ سخن سے جا ملتا ہے۔ میں نے اردوئے معلی اور عود ہندی سے وہ فقرے منتخب کئے ہیں جہاں غالب نے کسی شعر کا استعمال کیا ہے، یا کسی شعر پر داد سخن دی ہے۔ اس سے ان کے مسلّم ذوقِ شعری کے علاوہ ان کی شعر فہمی، سخن رسی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ انقلاب زمانہ اور حالی و سر سید کی لائی ہوئی سادگی کی وجہ سے غالب و آزاد کا یہ طرز سخن گو سکۂ رائج الوقت نہ ہو سکے مگر ٹکسال باہر بھی نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ وہ دلکش اسلوب ہے جو ادبیات عالیہ کی روح ہے اور "اہلِ دل کے لیے سرمایۂ جاناں" یہ وہ ابدی نقوش ہیں جن کا دامن دامنِ قیامت سے بندھا ہوا ہے۔ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اب ہم غالب کی دونوں کتابوں سے اس قسم کے اقتباسات پیش کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے شعر کے حسن استعمال کا حیرت انگیز سلیقہ ظاہر ہوتا ہے۔ بنام نواب غلام بابا خاں: "نواب میر جعفر علی خاں جیسا امیر روشن گہر نام آور روشناس ایاں ہند و انگلینڈ وسط جوانی یعنی ۴۰ برس کی عمر میں یوں مر جائے ع نخل چمن سروری افتادہ نہ پایا ہے"

بنام میاں ادخاں سیاح: "میں تم سے توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگذشت لکھی ہے اسی طرح آیندہ بھی لکھتے رہوگے۔ میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں ؎

اگر بدل نخلد ہر چہ در نظر گذرد   زہے روانی عمرے کہ در سفر گذرد

خیر اگر سیر و سیاحت میں نہیں — نہ سہی ذکر العیش نصف العیش پر قناعت کی۔"

"بڑا سفر دور و دراز در پیش ہے زاد راہ موجود نہیں خالی راہ جاتا ہوں اگر ناپرسیدہ بخشے گئے تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے، ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔"

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے۔ غالب ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء

"میں سادات کا نیاز مند اور علی کا غلام ہوں ؎

بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما

بہر حال فکر میں ہوں اگر اسباب نے مساعدت کی فہو المراد ورنہ ع

آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست"

"منشی صاحب! یہ کیا اتفاق ہے کہ میری بات کوئی نہیں سمجھتا ع

کس زبانِ مرا نمی فہمد، بعزیزاں چہ التماس کنم"

بنام ذکا: "ہر شخص نے بقدر حال ایک ایک قدر داں پایا غالب سوختہ اختر کو اس کی داد بھی نہ ملی ؎

کسم بجود نہ پذیرفت دہر باز مبرد   چو نامہ کہ بود نہ نوشتہ عنوانش"

بنام مرزا ہر گوپال تفتہ: بہر حال ع

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

میری جان کیا سمجھے ہو سب مخلوقات غالب و تفتہ کیونکر بن جائیں ع

ہر یکے را بہر کارے ساختند

"میاں مرزا تفتہ ہزار آفریں کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے واہ وا چشم بد دور تسلسل معنی سلاست الفاظ! ایک مصرع میں تم کو شوکت بخاری سے توارد ہوا، یہی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا وہاں تم پہنچے وہ مصرع یہ ہے ع

چاک گردیدم و از جیب بداماں رفتم"

"میرا عجب حال ہے حیران ہوں کہ تمہیں میرا کلام کیوں نہیں باور آتا ؎

گمان زیست بود بر منت ز بیدردی

بدست مرگ وے بدتر از گمان تو نیست!"

"اختیار ہو تو کچھ کیا جائے کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے مرزا بیدل خوب کہتا ہے ؎

رغبت جاہ چہ دلبست اسباب کدام

زیں ہوسہا بگذر یا مگذر میگذرد"

"میرا حال بدستور ہے ع

نہ نوید کامیابی نہ نہیب ناامیدی"

دیکھو حیف کشتر کیا لکھتے ہیں اور گوہر کیا فرماتے ہیں ؎

تا تہمال دوستی کے برد ہد   حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

"سرور نے جو فسانۂ عجائب لکھا ہے آغاز داستان کا شعر اب ہم کو مزا دیتا ہے ؎

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ — یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرع ثانی کتنا گرم ہے اور یاد رکھنا فسانے کے واسطے کتنا مناسب!

میرا حال بدستور ع — ہماں پہلو ہماں بستر ہماں درد!"

اب میرا حال سنو ۔ — در نومیدی بسے امید ست

پایانِ شب سیہ سپید ست"

بنام سرور: "...... ہائے گویا انوری میری زبان سے کہتا ہے ۔

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوار مدیح

اے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل"

.... بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے ۔

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ"

اس رقعہ میں ایک میزان عرض کرتا ہوں حضرت صاحب ان صاحبوں کے کلام کو یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے لے کر بیدل اور ناصر علی تک اس میزان میں تولیں، رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے، پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے فغانی اور ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا، خیال ہائے نازک و بلند لایا اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری و نظیری، عرفی و نوعی نے سبحان اللہ! قالب سخن میں جان پڑ گئی اس روش کو بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربہ دیا۔ صائب و کلیم و سلیم قدسی و حکیم شفائی اس زمرہ میں ہیں! رودکی، اسدی، فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کی طرز نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج کو پایا، فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے تو سب طرزیں تین ٹھہریں، خاقانی اس کے اقران، ظہوری اس کے امثال، صائب اس کے نظائر...." چیز دگر" پارسیوں کے حصے میں آئی ہے ہاں اردو میں اہلِ ہند نے وہ پیر پائی ہے (میر، قائم، مومن کے اشعار) ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ تیر نشتر ہیں۔

کس حسنِ ایجاز کے ساتھ غالب نے پوری فارسی شاعری کا عہد وار جائزہ پیش کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے انہی خاکوں میں رنگ بھر کر شعر العجم کا نگار خانہ تیار کر دیا۔ اسی کے ساتھ بیک جنبش قلم اردو شعراء پر بھی یک گونہ تنقیدی اشارے کر گئے، جو سخن فہم اور بالغ نظر نقاد ہی کر سکتا ہے۔

بنام مجروح: "مولانا! غالب ان دنوں بہت خوش ہیں..... دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں ۔

کسے کیں مرادش میسر بود — اگر جم نباشد سکندر بود"

"سنو میاں سرفراز حسین ہزار برس میں تم نے مجکو ایک خط لکھا وہ بھی اس طرح کا جیسا جلال اسیر کہتا ہے ع

بغیر درشکر آبست رو بما دارد"

اہلِ اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد تینوں مردود و مطرود محروم و مغموم ۔

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا

آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے"

بنام نساخ:

"چشم کشودہ اند بکردارہائے من — ز آیندہ ناامیدم و از رفتہ شرمسار

ایک کم ۷۰ برس دنیا میں رہا اب اور کہاں تک رہوں گا، ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا ایک فارسی کا دیوان، ۱۰ ہزار کئی سو بیت کا، تین رسالے نثر کے، یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے، اب اور کیا لکھوں گا مدح کا صلہ نہ ملا غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی بقول طالب ۔

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی — دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد

بنام عضد الدولہ: "... صورت اجرائے پنشن میں سوچتا ہوں اور وہ موہوم ہے، بیدل کا شعر مجکو مزا دیتا ہے ۔

نہ شام ما را سحر نویدے نہ صبح ما را دم سپیدی — چو حاصل است ناامیدی غبار دنیا بفرق عقبیٰ"

بنام شفق: "..... در صورت مرگ نیم مردہ، اور در حالت حیات نیم زندہ ہوں ۔

درکشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن — اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست"

"..... میں جو اپنا کلام آپ کے پاس بھیجتا ہوں گویا اپنے پر احسان کرتا ہوں ع

وائے بر جانِ سخن گر بسخنداں نرسد"

حضرت کیوں آپ نے مراسلہ اور میرے مکتوب کا حال پوچھا ع

ایں ہم کہ جوابے ننویسند جوابست

سمجھ لو اور چپ رہو"

بنام منشی شیو نرائن: "ہم نے اپنی تصویر اور اردو کا دیوان تم کو بھیجا میرے

پیارے دوست ناظر حسین! دھر کے تم یادگار ہو ع

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری "

بنام امین الدین احمد خاں: "تمہارا شہر میں رہنا موجب تقویت دل تھا۔

ع گو نہ ملتے تھے پر اک شہر میں تو رہتے تھے "

نہ تم یہاں آسکتے ہو نہ مجھ میں وہاں آنے کا دم ع

اے وائے زمحرومیٔ دیدار دگر ہیچ!"

"جو شخص اپنے جان و تن ننگ و نام کے امور میں آشفتہ و سرگرداں بلکہ عاجز و حیران ہو دوسرے کو اس سے کیا گلہ، ہائے نظیری ؎

با ما جفا و ناخوشی با خود غرور دلکشی ‌‌‌‌ از ناز از خود نہ آخر زآن کیستی "

بنام علائی: "عرفی عرفا میں سے ہے بیشتر اس کے کلام میں مضامین حقیقت گیر ہیں۔

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا ‌‌‌‌ نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

یہ زمین قدسی علیہ الرحمۃ کے حصہ میں آگئی ہے میں اس میں کیونکر تخم ریزی کروں اور اور اگر بے حیائی سے کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤں تو اس شعر کا جواب کہاں سے لاؤں۔

ہرگز نتواں گفت دریں قافیہ اشعار ‌‌‌‌ بیجاست برادر اگر از من گلہ دارد "

یہاں لا موجود الا اللہ کی بادۂ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام نور و نار کا فرق مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں ع

کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر!"

"عرفی قدما میں اور عرفا میں ہے جیسا عراقی ان کا کلام دقائق و حقائق تصوف سے لبریز، قدسی شاہجہانی شعرا میں صائب و کلیم کا معصر اور ہم چشم ان کا کلام شور انگیز ان بزرگوں کی طرز و روش میں زمین آسمان کا فرق "

بنام منشی ہیرا سنگھ: "......ناحق کیوں الجھو اس الجھنے سے کیا فائدہ خاطر جمع رکھو۔ ع ‌‌‌‌ کہ رحم گر نکند مدعی خدا بکند

میں ویسا ہی ہوں جیسا تم دیکھ گئے ہو، اور جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔ غالب ۱۴ ، ۱۰ ، ۶۸ ، ۱۸ ء"

عودِ ہندی

بنام سرور: "اپنا ایک شعر لکھتا ہوں اور یہ نہیں لکھتا کہ یہ شعر میں نے کیوں لکھا

وہ شعر یہ ہے ؎ ‌‌‌‌ مرا بغیر ز یک جنس در شمار آورد

فغاں کہ عیسیٰ ز پروانہ فرق ناگشت

بہر حال حضرات کو یہ معلوم ہے کہ میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں، جب تک قدما و متاخرین مثل صائب و کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم و نثر میں نہیں لکھتا۔ نظیری علیہ الرحمۃ کا شعر ایک کاغذ پر لکھ کر میرے گلے میں ڈال دیجئے اور زمرۂ شعرا میں سے مجکو نکال دیجئے شعر یہ ہے ؎

جوہر بینش من در تہ زنگار بماند ‌‌‌‌ آنکہ آئینۂ من ساخت نپرداخت دریغ ؎

بنام بے خبر: "ایک شعر استاد کامل کا مدت سے تحویل حافظہ میں چلا آتا ہے۔

ظالم تو مری سادہ دلی پر تو رحم کر ‌‌‌‌ روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ ہی من گیا

میں نے از راہ تصرف اس شعر کی صورت بدل ڈالی ؎

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے

روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

تم اخوان الصفا میں سے ہو تمہاری آزردگی اوروں کی مہربانی سے خوشتر ہے"

بنام مصنف ساطع برہان: "جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ رہا ہے اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے معقول و راست نہیں لیکن واللہ مجکو عرصۂ محشر میں باز خواست نہیں ؎

زمین عشق بکونین صلح کل کردیم ‌‌‌‌ تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

غالب کے شعری سلیقہ اور اس کے حسن استعمال سے جہاں ان کی سخن فہمی پر بڑی روشنی پڑتی ہے وہیں ان کا شعری نظریہ بھی روشنی میں آجاتا ہے۔ غالب کا نظریۂ شعر ایک اہم موضوع ہے جس کے لئے فرصت درکار ہے، اردو نثر کے علاوہ فارسی نثر پنج آہنگ اور قاطع برہان وغیرہ میں بھی ان کے شعری حسن استعمال کے بہترین نمونے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب جس درجہ کا سخن گو تھا اس سے کم سخن سنج نہ تھا ؎

نظم و نثر شورش انگیزے کہ می باید بجواہ

ایکہ می پرسی کہ غالب در سخن یکتاست ہست

★

غالبِ رنگین بیان

اعجاز فاطمہ

تو نے بخشا شعر کو حسنِ بیان و فکر و فن
خود سجائی تو نے انداز و نظر کی انجمن
نکہتِ گل کو زباں، غنچوں کو اندازِ سخن
کاغذی جب شوخیِ تحریر کا تھا پیرہن
تو نے ہر نقشِ محبت کو سکھایا بانکپن

زندہ باد! اے میرِ اُردو، غالبِ رنگیں بیاں
ساری دُنیا میں ہے تو، اے نازشِ ہندوستاں

تو ہے اقلیمِ سخن، تو کشورِ لفظ و بیاں
تو وفا کا کارواں ہے، اے امیرِ کارواں!
تو جنوں کا رازداں، تو آگہی کا نبض داں
تو امینِ عشق تھا، اور تو سراپا داستاں
فخرِ عرفی و نظیری، محرمِ سود و زیاں

تیری حکمت، تیری دانش کا ہر اک نقشِ حسیں
زیست کی شرحِ مکمل جیسے خاتم کا نگیں

تو نے سمجھا ہے حقیقت میں نظامِ رنگ و بو
تو نے کی ہے رند ہو کر معرفت کی گفتگو
تو نے رکھ لی بادہ و ساغر کی شان و آبرو
عمر بھر تجھ کو غمِ ہستی رہا اور جستجو
تیرا ہر اک شعر ہے تیرا مآلِ آرزو

تو ہر اک محفل میں تھا، اور تو ہر اک محفل میں ہے
سوچنے والا سمجھتا ہے کہ یہ بھی دل میں ہے

خراجِ غالب

ماتا پرشاد استھانہ نبیب بلوی

ہر ہر نفس میں بوئے محبت بسی ہوئی
شمعِ خیال حسنِ ادا سے جلی ہوئی
بزمِ شعور و ہوش ادب سے سجی ہوئی
چھیڑا تھا جس میں سازِ محبت کے تار کو
قائم کیا تھا تو نے ادب کے وقار کو

اہلِ ادب کو تجھ سے عقیدت ہے اس لیے
اہلِ نظر کو تجھ سے محبت ہے اس لیے
ہر نقطہ تیرا فن سے عبارت ہے اس لیے
مصرع کو جامِ شعر کو صہبا بنا دیا
تو نے غزل کو ساقیِ رعنا بنا دیا

حسنِ بیاں میں رنگ ہے حسنِ شباب کا
نکہتِ ادا میں رنگ ہے جیسے گلاب کا
اب تک ہے لطف شعر میں موجِ شراب کا
ہر لفظ تیرا ساغرِ صہبا ہے آج بھی
تیرا کلام ساقیِ رعنا ہے آج بھی

تھا مرکزِ خیالِ وفا تیرے سامنے
رہتی تھی فکر نغمہ سرا تیرے سامنے
حاضر تھا حسنِ طرزِ ادا تیرے سامنے
چھایا ہوا تھا دشت و چمن انجمن پہ تو
غالب تھا، ہر طرح سے بساطِ سخن پہ تو

★

غالب اپنے دور سے آگے

کاظم علی خاں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں (غالب)

غالب ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے، اس اعتبار سے تو وہ عہدِ رفتہ کے شاعر ہیں لیکن جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے دور کے شاعر ہیں۔ غالب خود کو اپنے دور میں اجنبی سا پاتے ہیں انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ ان کے ہم عصروں نے نہ تو ان کو سمجھا اور نہ ان کی قدر کی۔ ساری عمر انھیں اس بات کی شکایت رہی کہ "کس زبانِ مرا نمی فہمد"۔ اپنے دور میں اپنی بے قدری کا احساس ان سے بار بار کہلواتا رہا کہ ؎

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

تمام عمر ان کو اس بات کی آرزو رہی کہ کاش لوگ انھیں سمجھ پاتے اس آرزو کی شدت کا اندازہ اس شعر سے بھی ہو سکتا ہے ؎

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

لیکن اپنی زندگی میں جب انھیں اپنی یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہ آئی تو انھوں نے اپنے کلام کے متعلق پیشین گوئی کی کہ ؎

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

یعنی میرے شعر کی شہرت اور قدر میرے مرنے کے بعد ہوگی اور اپنے کلام کے متعلق ان کی یہ پیشین گوئی ان کی وفات کے بعد بالکل سچ نکلی۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"غالب ان اہلِ کمال میں ہیں جن کو بقائے دوام کے کشور میں داخل ہونے کے لئے موت کے دروازے سے گذرنا پڑتا ہے۔ غالب کا کلام اب مقبول ہوا ہے اور آئندہ نسلیں اس امر کا موازنہ کریں گی کہ ان کی ترقی میں غالب کے کلام کا وجودِ اعظم کہاں تک معاون ہے۔"

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب اپنے دور سے زیادہ ہمارے دور کے شاعر ہیں اور ان کے کلام میں ایک عجیب وصف ہے جو انھیں کے الفاظ میں پیش کرنا لطف سے خالی نہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب کی وفات کے بعد ان کی اس قدر مقبولیت اور ان کی زندگی میں ناقدری توجیہہ کی طالب ہے۔ غالب کے ناقدوں نے ان کی زندگی یعنی ان کے کلام کی ناقدری کے کئی سبب بتائے ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم کی رائے میں غالب کی ناقدری غالب کی زندگی میں اس بنا پر ہوئی کہ وہ اردو سے زیادہ فارسی کے شاعر تھے اور فارسی ہندوستان کے اس دور میں زوال پر تھی۔ اس کے علاوہ اگر انھوں نے اردو میں شاعری کی بھی تو ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ بیدل کی معمہ گوئی اور مشکل پسندی کی نذر ہو گیا۔ اور واقعی یہ اسباب قابلِ اعتنا بھی ہیں لیکن غالب کے عہد میں ان کی ناقدری کی ایک اور وجہ نظر آتی ہے اور وہ ہے ان کی جدت پسندی جو غالب کو پرانی ڈگر پر چلنے سے روکتی اور پرانے رسوم کو توڑنے پر اکساتی رہی۔ یہی جدت پسندی جب اور آگے بڑھتی ہے تو غالب اپنے دور کی روایات سے انحراف کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی اس انحراف میں شدت پیدا ہو جاتی ہے جو غالب کو اپنے دور اور روایات کا باغی بنا دیتی ہے اور وہ اپنے دور کی عام فرسودہ روایات سے بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ بہت سے

خامیوں پر بیباکی سے تنقید کرتے ہیں اور اپنے قدامت پسند بلکہ قدامت پرست ہم عصروں کو ترقی پسندی کا سبق دیتے ہیں۔ غالب کی دور رس نظر انھیں اپنے والے دور سے آگاہ کرتی ہے اور وہ نئے دور کا خیر مقدم کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ لیکن ان کے ہم عصر اپنی کوتاہ نظری کے باعث آنے والے دور کو دیکھ پاتے ہیں اور نہ سمجھ پاتے ہیں۔ وہ اپنے ہی دور میں الجھے رہتے ہیں اور جب وہ غالب کے منھ سے نئے دور کی بات سنتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ بات کو سمجھ نہیں پاتے بلکہ وہ ان کی تنقید سے بیزار ہو کر اس معاملے پر غور بھی نہیں کرتے۔ یہ بیزاری کبھی کبھی غالب دشمنی کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور اسے رشک و حسد سے مزید تقویت ملتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بجائے ان کی بات کو ٹھنڈے دل سے سننے کے اور اس کی اہمیت کو سمجھنے کے، ان سے دشمنی اور حسد پر اتر آتے ہیں۔ دراصل غالب کی ان کے دور میں ناقدری کی یہی حقیقی وجہ ہے جس کا غالب کو شدید احساس رہا ہے اور جسے انھوں نے طرح طرح سے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے؛

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

غالب کے ہم عصروں نے ان کی قدر ان کی جس ترقی پسندی کی بنا پر نہ کی وہی ترقی پسندی آج غالب کو ہمارے دور میں مقبول بنا رہی ہے۔ احتشام حسین نے غالب کی اسی ترقی پسندی کو "بت شکنی" کا نام دیا ہے جو غالب کو ان کے دور سے بلند کرتی ہے۔ رسوم و روایاتِ کہنہ سے غالب کے انحراف کے جذبے نے ان کے کلام پر جابجا چھاپ لگائی ہے مثلاً

بغیر مرنہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

روایات سے انحراف کی مثالیں غالب کے کلام میں بکثرت مل سکتی ہیں جن کا ذکر یہاں مقصود نہیں۔ البتہ روایت سے انحراف یا "بت شکنی" کے جذبے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی قومی، عمرانی، ثقافتی، سیاسی اور ادبی قدروں کا مختصر جائزہ لیا جائے، جس میں غالب پلے بڑھے تھے اور جس کی روایات سے غالب نے انحراف کیا تھا۔

غالب کی پیدائش ۱۷۹۷ء میں ہوئی اور وفات ۱۸۶۹ء میں۔ اس دوران ہندستان نے بڑے بڑے انقلابات اور اہم تاریخی تبدیلیاں دیکھیں۔ دراصل تاریخی اعتبار سے یہ ہندستان کا ایک اہم دور تھا۔ غالب کی پیدائش کے دو ہی سال بعد یعنی ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دی۔

۱۸۱۸ء تک مرہٹوں کی بھی طاقت ختم ہوگئی۔ ۱۸۳۵ء میں انگریزوں نے اس قدر اقتدار حاصل کر لیا کہ دربار سے فارسی زبان بھی ختم کر دی گئی۔ ۱۸۴۹ء میں پنجاب بھی انگریزوں کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ ۱۸۵۳ء میں جھانسی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا اور ۱۸۵۷ء تک نہ صرف سلطنت مغلیہ ختم ہوئی بلکہ اودھ جیسی سونے کی چڑیا بھی ہندستانیوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اپنا سب کچھ کھو کر ہندستان کو ملا کیا؟ افلاس، انتشار، احساس شکست، تباہی اور غلامی۔ غرض اس دور میں سارے ہندستان پر ایک بحرانی کیفیت چھائی نظر آتی تھی۔ زوال صرف مغل حکومت پر ہی نہ تھا بلکہ تہذیبی، ادبی اور دوسری تمام قدریں نئی قدروں سے ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ بقول ایک ناقد "یہ جدید وقدیم کی جنگ کا دور تھا۔ تہذیبوں کے مٹنے اور بننے کا دور تھا۔" اس دور میں ایک تہذیب مٹ رہی تھی اور دوسری جنم لے رہی تھی۔ پرانی روایات رفتہ رفتہ تاریخ کے نئے تقاضوں کے طوفان کا مقابلہ نہ کر کے ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ اور نیا دور اپنی آغوش میں نئی قدریں لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ تاریخ کی قوتیں انگریزوں کی تائید میں نظر آ رہی تھیں حکومت مغلیہ کا چراغ مغرب سے آنے والی تیز سیاسی ہواؤں سے ٹمٹما کر بجھنے والا تھا۔ ہندستان کی دولت، مغلیہ حکومت اور دیسی ریاستوں کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے قبضہ میں آ رہی تھی۔ ہندستان کے سونا اگلنے والے زرخیز علاقے رفتہ رفتہ انگریزوں کے ہاتھ لگتے جا رہے تھے۔ اس معاشی بدحالی نے ہندستان کی قدیم اخلاقی قدروں کو بھی کمزور کر دیا تھا۔ نفسی نفسی کا عالم تھا۔ کیا بڑا کیا چھوٹا، جو جس کو کمزور پاتا دبا لیتا۔ قدیم جاگیردارانہ نظام مٹتا جا رہا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا نظام انگریزوں کے زیر سایہ ابھر رہا تھا۔ غرض رفتہ رفتہ اس قدیم وجدید کی جنگ میں قدیم قدریں ٹوٹ کر نئی قدروں کو جگہ دیتی گئیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہوا۔ ہندستانی عوام اور ہندستانی ریاستوں کی انگریزوں کے خلاف آزادی حاصل کرنے کے لئے یہ جنگ بھی ملک گیر پیمانے پر ناکام ہوئی اور ملک پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا۔ واضح رہے کہ ان تمام واقعات وحالات کو غالب نے بچپن سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک کی ۷۲ سالہ زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پرکھا۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء کے انقلاب کو جس نے ہندستانیوں کو بلحاظ اقدار، قدیم اور جدید دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ غالب کے ذہن پر نئی قدروں کا اثر زیادہ ہوا لیکن یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ انھوں نے ساری کی ساری قدیم قدروں کو ٹھکرا دیا تھا۔ انھوں نے نئی قدروں کو اپنایا ضرور لیکن اس کے ساتھ انھوں نے تمام قدیم اقدار کو ترک نہیں کیا بلکہ ان میں سے مثبت اور مفید قدروں کو اپنائے رہے اور دوسری طرف انگریزی حکومت سے بھی بیزار نہ تھے۔ گویا ایک اعتبار سے وہ نئے تھے تو دوسرے اعتبار سے پرانے۔ اسی بات کی طرف خواجہ احمد فاروقی نے بھی اشارہ کیا ہے کہ یونان کے دیوتا ۵۵۵۵ کی طرح غالب کا ایک رخ ماضی کی طرف تھا اور دوسرا رخ مستقبل کی طرف۔

غالب کے یہاں قدیم وجدید کے اس امتزاج کو اکثر تضاد سے تعبیر کیا جاتا ہے بعض نقادوں نے اس تضاد کی وجہ غالب کے دور کی عام کشمکش میں تلاش کی ہے اور یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے لیکن غالب کے یہاں اس تضاد کی اصل وجہ ان کی حقیقت پسندی میں پوشیدہ ہے۔ وہ قدروں کو قدیم وجدید کی کسوٹی پر پرکھنے کے بجائے افادیت اور مضرت کی ترازو پر تول کر ان کو قبول یا رد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کے یہاں مفید اور کارآمد نئی قدروں کا اثر ہے وہاں صحت مند قدیم اقدار کی بھی گنجائش ہے۔ مختصر یہ کہ قدیم وجدید کا یہ امتزاج غالب کی حقیقت پسندی ہی کا ثبوت ہے، اسے تضاد کہا جائے یا کچھ اور لیکن سچ یہ ہے کہ غالب روایت پرست بھی ہیں، روایت شکن بھی ہیں اور روایت گر بھی۔ اس طرح غالب اپنے عہد کی روایات کے باغی اور ہمارے دور کی بیشتر ادبی روایات کے بانی کہے جانے کے مستحق ہیں۔

حساس غالب اپنے عہد کے عام حالات سے بے تعلق نہ تھے اور ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کا ثبوت ان کے خطوط ہیں جو موجودہ اور آنے والے دور کے ادبی مورخوں کے لئے گراں قدر تاریخی سرمائے سے کم نہیں، حالانکہ غالب بقول خود ۱۸۵۷ء کے "ہنگاموں" میں اپنے گھر میں بند رہے، لیکن پھر بھی دستنبو لکھ کر اس بات کا ثبوت دے دیا کہ وہ حالات سے بے خبر نہیں ہیں۔ وہ تاریخ کی منطق سے آگاہ نظر آتے تھے اور اسی بنا پر وہ ماضی سے چپٹے رہنے کے بجائے حال کے نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مستقبل کو ماضی کی تمام بے جان اور فرسودہ روایات سے چھٹکارا دلانا چاہتے تھے۔ انھوں نے دہلی کی بربادی کا ماتم ضرور کیا لیکن نئی غیر ملکی حکومت سے وہ بیزار نظر نہیں آتے۔ گویا ان کو یقین ہو چکا تھا کہ مغلیہ حکومت جس زوال سے دوچار ہے وہ اب کسی قیمت پر رک نہیں سکتا۔ اسی لئے وہ اپنے ان ذاتی نقصانات کی بھی زیادہ فکر نہیں کرتے جو حکومت مغلیہ کے زوال کی وجہ سے ان کو ہوئے۔ اس سے بھی غالب کے دوررس ذہن اور حقیقت بیں نظر کا پتہ چلتا ہے۔

غالب کے روایت سے انحراف کے سلسلے میں ایک اہم بات ان کا سفر کلکتہ بھی

ہے۔ غالب کا کلکتے کا سفر گو معاشی نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوا لیکن اس سفر نے ان کے تجربات میں بیش بہا اضافے کئے۔ اس سفر میں انھوں نے انگریزی حکومت کے زیرِ سایہ سائنسی ایجادات کی مدد سے رونما ہونے والا خوش کن انقلاب دیکھا۔ بقول پروفیسر احتشام حسین صاحب غالب کا کلکتے کا سفر "غالب کی ذہنی تشکیل میں ایک اہم جگہ رکھتا ہے ۔۔ پنشن کے قضیے کے سلسلے میں ۔۔ انگریزی عدالتوں کے ساتھ انگریزوں کے طرزِ حکومت کا اندازہ غالب کو ہوا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں بنگال میں نشاۃ ثانیہ کی پھوٹتی ہوئی کرن اور نئی زندگی کے بنتے ابھرتے ہوئے نقوش دیکھنے کا موقع ملا۔ غالب نے وہاں جو پہل پہل دیکھی، جو عمارتیں دیکھیں، جو حسین و جمیل عورتیں دیکھیں، جو ایک نیا بنتا ہوا تمدن دیکھا اس نے ان کا دل موہ لیا۔ غالب کو اس سفر کی یادیں عمر کے آخری حصے میں بھی بڑی عزیز رہیں۔ سفرِ کلکتہ نے گو ان کو بنیادی طور پر نہیں بدلا لیکن وہاں سے وہ " ایسے خیالات اور تصورات ضرور لائے جو ان کے دہلی کے حریفوں اور ہم عصروں کے سرحدِ ادراک سے بھی باہر تھے۔" غالب کے سفرِ کلکتہ کے تاثرات کا جائزہ لینا ہو تو سرسید کی کتاب آئینِ اکبری کی تصحیح کے سلسلے میں جو تقریظ انھوں نے لکھی ہے اسے دیکھئے۔ اس سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے

کردہ انگریزی حکومت کے زیرِ سایہ سائنسی ایجادات کی برکات سے زندگی میں ہونے والے خوش کن انقلاب سے اتنے متاثر ہیں کہ زندگی کے ان نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پرانی اور فرسودہ قدروں کو چھوڑنے پر تیار ہیں۔ اس طرح غالب سرسید جیسے ترقی پسند کو بھی ترقی پسندی کا سبق دیتے نظر آتے ہیں۔

غالب ان ہی ترقی پسندانہ خیالات اور روایت سے انحراف کے باعث اپنے دور میں ناقدری کا شکار ہوئے۔ لیکن دورِ حاضر میں ان کی جو قدر و منزلت ہو رہی ہے اس کا سبب یہی روایت سے انحراف اور ان کے یہی ترقی پسندانہ خیالات ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کی اپنے کلام کے متعلق یہ پیشین گوئی بالکل درست تھی:

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

غالب نے انتہائی حسین اور شاعرانہ انداز میں اسی بات کو ایک جگہ یوں کہا ہے ع

میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

غالب کی الم پسندی کا نفسیاتی تجزیہ

(بسلسلہ صفحہ ۱۶۷)

عنوانِ روزنامۂ امید سادہ بود — سطرِ شکست رنگ بہ سیما نوشتہ ایم
در ہیچ نسخہ معنیٔ لفظِ امید نیست — فرہنگ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم
آئندہ و گذشتہ تمنا و حسرت است — یک کاشکے بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم

یہی "کاشکے" غالب کی سب سے بڑی دین ہے جو مایوس کن حالات میں بھی نشاطِ کار اور نشاطِ سخن کا حوصلہ بخشتی ہے۔ یہ کاشکے نہ تو ماضیٔ مطلق ہے اور نہ مستقبل بعید۔ بلکہ حال و استقبال کے درمیان عینیت پرستی (IDEALISM) کی ایک کڑی عینیت پرستی بری شے نہیں۔ زندگی آئیڈیل کے سہارے ہی بسر ہوتی ہے۔ آئیڈیل ہر مفکر اور فن کار کے پاس ہوتا ہے کہیں واضح اور کہیں غیر واضح۔ کارل مارکس کے پاس اگر آئیڈیل واضح تھا تو دستو کے پاس غیر واضح۔ ٹیگور کے پاس غیر واضح تھا تو اقبال کے پاس واضح۔ اقبال کی نظروں میں اگر عالمِ نو کی سحر بے حجاب تھی تو اس لئے کہ حالات کا رخ بھی واضح تھا۔ غالب کے سامنے زندگی کا نظام شکست ہو رہا تھا مگر حالات کا رخ واضح نہ تھا۔ داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ایک شمع باقی رہ گئی تھی مگر وہ بھی خاموش۔ گویا غالب کو زندگی کا خواب رات کے اندھیرے میں دیکھنا پڑ رہا تھا۔ لیکن غالب کے لئے یہی "کاشکے" ان کا سرچشمہ حیات تھا، جہاں تمنا و حسرت بھی تھی اور آنے والی زندگی کا اعلان بھی۔ اس "کاشکے" میں شکست کی رنگ آمیزی بھی ہے اور لہجے کی بلند آہنگی بھی۔ یہ نور نہ افسردہ ہے، نہ مردہ اور نہ بے ذوق ہے

ہو رہا کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

★

غالب اور "لذّت آزار"

اخلاق حسین عارف

ہر شاعر کو سمجھنے کے لیے اس کی ذہنیت اور اس کے فن سے آگاہی ضروری ہے۔ غالب کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے اپنے فن کا اظہار بالعموم شاعری اور بالخصوص غزل کی صورت میں کیا ہے۔

شاعری ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے اسی لیے اس کی جامع اور مانع تعریف مشکل ہے۔ البتہ چند اشارات کی مدد سے اس کا مفہوم ذہن نشین کیا جا سکتا ہے مثلاً شاعری نام ہے انسانی تجربات، خیالات اور جذبات کے اظہار کا یا یہ کہ شاعری کہتے ہیں موزوں الفاظ میں حقائق کی تصویر کشی کو۔ بقول میتھو آرنلڈ شاعری زندگی کی تفسیر ہے اور اس تفسیر یا ترجمانی میں شعریت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس میں تخیل اور جذبات دونوں پائے جائیں۔ شیلے کے قول کے مطابق شاعری تہذیب، آئین اور مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ اور موزوں الفاظ میں جذبات قلبی کے اظہار کا نام ہے۔ فلپ سڈنی کا قول ہے کہ شاعری جملہ فنون کی دایہ ہے۔ کیٹس کہتا ہے کہ شاعری ہمیں انتہائی درجے کی حیرت سے ہم آغوش کرتی ہے۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ شاعری وہ فن ہے جس کی بدولت شاعر دوسروں کے جذبات و احساسات کو ابھار سکتا ہے۔ اسے ذرا تفصیل سے پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے الفاظ میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ شاعری وہ ملکۂ فطری ہے جس کی بدولت ایک شاعر معمولی سی بات کو ایسے موثر اور دل کش انداز میں ادا کرتا ہے جسے سن کر ہر صاحب دل بے اختیار تڑپ اٹھتا ہے، اس پر ایک عالم کیف و سرور طاری ہو جاتا ہے اور وہ بلا کوشش اس کے صفحۂ دل پر نقش ہو جاتا ہے۔

غزل کی شاعری بڑی حد تک داخلی شاعری ہے یعنی شاعر اپنے موضوع کی تلاش خود اپنی ذات سے کرتا ہے اور بقول پروفیسر آل احمد سرور غزل میں صد درجہ کی دروں بینی پائی جاتی ہے یعنی غزل گو شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ اپنے میں ڈوب کر کہتا ہے۔ غزل، شاعر کے اندرونی تجربوں کا دل کش انداز اظہار ہے۔

کسی خیال کا اظہار چونکہ دو مصرعوں میں کرنا ہوتا ہے اس لیے غزل میں تفصیل کے بجائے رمز و ایما سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ ایمائیت جس قدر سلیقہ اور صداقت کے ساتھ برتی جائے گی کلام میں اسی قدر وسعت، تاثیر، گیرائی اور گہرائی پیدا ہوگی۔

غزل کی دل کشی کا دار و مدار زیادہ تر انداز بیان پر ہے۔ اسی کو طرز ادا بھی کہا گیا ہے اسی انداز کی بدولت غزل میں تغزل پیدا ہوتا ہے جس کو بلاشبہ روح غزل کہہ سکتے ہیں۔ غزل اور تغزل لازم و ملزوم ہیں۔ اگر غزل میں تغزل نہ ہو تو وہ ایک بے روح جسم ہے۔ تغزل کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ عبارت، اشارات اور ادا کے رنگ سے تخیل اور جذبے کی تصویر کو دل کش بنایا جائے۔ شعر میں اشارے کی خوبی، عبارت کی ادا میں دل کشی پیدا ہونا لازمی ہے۔ غالب نے اس کا اظہار ایک جگہ یوں کیا ہے ؎

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

کلام غالب کی پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت ان کا وہ انداز بیان ہے جس پر ان کی شاعرانہ عظمت کا قصر تعمیر ہوا اور جس کی طرف خود انھوں نے بھی اشارہ کیا ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اسی سلسلے کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

اندازِ بیاں کو ناقدینِ فن کی تصریحات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس بات کو غالب نے اندازِ بیان سے تعبیر کیا ہے وہ دراصل ان کی وہ جدت طرازی ہے جو زبان، تراکیب، خیالات، محاکات، الفاظ، تشبیہات، استعارات، کنایات، غرضیکہ تمام لوازمات شاعری میں پائی جاتی ہے۔

غالب کے کلام کے مطالعے کے بعد ان کا یہ مطمح نظر دریافت کیا گیا ہے کہ پیش پا افتادہ فرسودہ اور معمولی مضامین کی بندش کچھ ایسے ڈھنگ سے کی جائے کہ قاری آسانی سے مطلب تک نہ پہنچ سکے بلکہ اسے خوب غور و فکر کرنا پڑے تاکہ نفس مضمون چاہے وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو اس کی نظروں میں وقیع ہو جائے کیونکہ جو چیز بڑے غور و خوض، بڑی جستجو یا محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ بہت قیمتی سمجھی جانے لگتی ہے۔ جدت طرازی اسی بے پناہ جذبے کا منطقی نتیجہ ہے جسے غالب نے "انداز بیان" اور "ادائے خاص" سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کو کسی نے غالبیات کے نام سے پکارا اور کسی نے تکنیک کہا۔

اس بیان کی صداقت کے لیے غالب کے سب سے بڑے نبض شناس مولانا حالی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ کہتے ہیں کہ "مرزا کی طبیعت اس قسم کی واقع ہوئی تھی کہ وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ عامیانہ خیالات اور محاورات سے حتی الوسع اجتناب کرتے تھے (یادگار غالب صفحہ ۱۲۱)

غالب کی غزلیں مختلف رنگ مثلاً فلسفیانہ، سماجی، اخلاقی، شوخی و ظرافت عشق و محبت، رشک وغیرہ میں رچی ہوئی ہیں۔ یہاں صرف ان کے عشق و محبت کے ضمنی کلام سے وہ منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو ایذا پسندیٔ عشاق پر مبنی ہیں۔ ان سے واضح ہوگا کہ غالب کی نگاہوں میں محرومیٔ وصل سے پیدا شدہ لطف و مسرت اور عاشق کے زخم جگر پر نمک پاشی میں کتنی لذت تھی۔ اس کے اظہار کے لیے جن استعارات و تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے وہ انھیں کی جودت طبع کا حصہ ہے۔

ملاحظہ ہو:

(۱) عشرتِ پارۂ دل زخم تمنا کھانا لذت ریش جگر، غرق نمک داں ہونا

عاشق صادق کی نگاہوں میں محرومیٔ وصل باعث عشرت ہے۔ اگر محبوب اس کے زخم جگر پر نمک پاشی کرے تو اس کے اس فعل سے اسے لذت محسوس ہوتی ہے۔

(۲) کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اے دلربا! تیری نیچی نظروں کے تیر نے میرے جگر میں پیوست ہو کر خلش مسلسل کا سامان مہیا کر دیا۔ مجھے اس خلش سے جو لذت مل رہی ہے اس سے محظوظ ہی ہوتا ہوں۔ خوب ہی ہوا۔ اگر یہ جگر کے پار ہو جاتا تو یہ لذت کہاں میسر ہوتی؟

(۳) ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

عاشق نے راستے میں کانٹے بچھے دیکھے تو باغ باغ ہو گیا کیوں کہ آبلوں میں خار چبھیں گے تو اذیت میں شدت ہوگی اور جس قدر شدت ہوگی اسی قدر زیادہ لذت ملے گی۔

(۴) فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

اگر میرے لخت جگر ایک ساتھ مل کر نمک پاشی کیا کرتے تو مجھے مرہم کی جستجو اور فکر نہ ہوتی۔

(۵) جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا جوئے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے بعد

اگرچہ محبوب کی خاطر صحرا میں کوئی خار باقی نہ بچا جو میرے تلوؤں میں چبھا نہ ہو اس کے باوجود میرے ذوقِ ایذا طلبی میں کمی واقع نہ ہوئی۔

(۶) زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

ناسمجھ بچوں میں اتنا شعور کہاں کہ سنگ سار کرنے کے بعد میرے زخموں پر نمک بھی چھڑک دیتے۔ کاش پتھروں میں ہی نمک ہوتا تو ان کی ضرب سے پیدا ہونے والے میرے زخموں کی اذیت میں لذت پیدا ہو جاتی۔

(۷) چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

اے محبوب! کتنے افسوس کا مقام ہے کہ محض جسم کو زخمی کر کے تو چلا جا رہا ہے۔ ابھی نہ تو نے میرے دل کو مجروح کیا ہے نہ زخموں پر نمک ہی چھڑکا۔

(۸) یاد ہیں غالب مجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

اے غالب مجھے وہ دن اب تک یاد ہیں جب میری ایذا طلبی کا یہ عالم تھا کہ اگر زخم سے نمک ٹپک پڑتا تھا تو اسے پلکوں سے چن کر دوبارہ زخم میں رکھ لیا کرتا تھا۔

(۹) زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن غیر سمجھا کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

رقیب اپنی نادانی کی وجہ سے مجھے چارہ جوئی کا طعنہ دیتا ہے کیونکہ وہ اس راز سے واقف نہیں کہ زخم سلوانے سے میرے جو سوئیاں پے در پے چبھوئی جا رہی ہیں ان سے مجھے لذت محسوس ہوتی ہے۔

(۱۰) ہر چند جاں گدازیٔ قہر و عتاب ہے ہر چند پشت گرمیٔ تاب و تواں نہیں

پشت گرمی۔ یعنی طاقت برداشت

جاں مطربِ ترانۂ ہَل مِن مزید ہے لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

اگرچہ محبوب کے ظلم سے جان پر آ بنی ہے اور جسم ناتواں میں طاقت برداشت باقی نہیں مگر میری آن اس کی ملتجی نہیں کہ اس سے ترک ظلم کے لئے کہوں بلکہ اس کے

میں کہتا جاتا ہوں کہ تجھ سے جتنا بن پڑے ظلم ڈھائے، میں برداشت کروں گا۔

(۱۱) خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم　　دل میں چھری چبھو مژہ گر خوں چکاں نہیں

اگر میرا دل رنج و غم سے دو ٹکڑے نہیں ہوا ہے تو سینے میں خنجر بھونک دے اور اگر پلکوں سے خون نہیں ٹپک رہا ہے تو دل میں چھری چبھو دے تاکہ تقاضائے عاشقی پورا ہو جائے۔

(۱۲) جاں ہے بہائے بوسہ، ولے کیوں کہے ابھی　　غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

ابھی وہ مجھ سے کیوں کہے کہ جان دے کر بوسہ لے لے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھ میں جان باقی ہے۔ جب میں ادھ مُوا ہو جاؤں گا تب وہ اعلان کرے گا کہ بوسہ کی قیمت جان ہے۔

(۱۳) حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے　　جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

جی تو یہی چاہتا ہے کہ عشق کے آزار میں جو لذت ہے اس سے جی کھول کر سیر ہو جاؤں مگر چونکہ راہِ وفا سراسر تلوار کی دھار ہے اس لئے پہلی ہی منزل پر موت نظر آنے لگی ہے۔ افسوس! کہ حسرتِ لذتِ آزار دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

(۱۴) سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے　　لذتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں

ادھر سر کا زخم اچھا ہوا ادھر میرا سر کھجانے لگتا ہے یعنی پھر زخمی ہو جانے کو دل چاہتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ جب پتھر لگتے ہیں تو زخمی ہونے کے بعد مجھے اس قدر لذت محسوس ہوتی ہے کہ الفاظ کے ذریعہ اس کا اعادہ ممکن نہیں۔

(۱۵) دل کہیں درد مجھے دل، محو وفا رکھتا ہے　　کس قدر ذوقِ گرفتاریٔ ہم ہے ہم کو

ذوقِ گرفتاریٔ ہم یعنی آرزوئے مبتلائے رنج و الم۔

یعنی اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ معشوق سے وفا قائم رکھنے میں سوائے رنج و الم کے کچھ نہیں پھر بھی ہمیں مبتلائے الم رہنے میں اس قدر لذت محسوس ہوتی ہے کہ ہم ہمیشہ دل کو ترغیبِ وفا دیتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دل بھی مجھے راہِ وفا میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کیا کرتا ہے۔

(۱۶) کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک　　ہر مُوئے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

مطلب یہ کہ غمِ عشق میں جو لذت محسوس ہو رہی ہے اس کا اظہار بذریعہ تقریر کس طرح کروں۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس تپِ غم کا شکر ادا کرنے کے لئے جسم کا ہر بال زبان بن گیا ہے۔

(۱۷) رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی　　سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

میں اپنا زخم صرف اس لئے سلوا رہا ہوں کہ سوئیوں کے چبھنے سے لذت لے سکوں ورنہ دردِ عشق کی قدر میرے دل میں پہلے کی طرح باقی ہے۔

(۱۸) نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا　　کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

ریزۂ الماس زخم کو مندمل کرنے کے بجائے اور بڑھا دیتا ہے۔ عاشقِ صادق اس کا ہرگز متمنی نہیں کہ اس کا زخمِ دل اچھا ہو جائے۔ اس لئے وہ کہتا ہے تو مجھ سے جراحتِ دل کے مرہم کا نسخہ کیا پوچھتا ہے! بس یہ سمجھ لے کہ ریزۂ الماس اس کا جزوِ اعظم ہے تو دوسرے اجزا بھی اسی طرح کے ہوں گے۔

(۱۹) نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں　　وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

عاشق کو زخمِ پیکاں سے لذت نہیں حاصل ہوتی اس لئے کہ وہ جسم میں پیوست ہو جاتا ہے لیکن زخمِ شمشیر گہرا بھی ہوتا ہے، دل کو شق کر دیتا ہے اور لذت دیرپا دیتا ہے اس لیے ہم اسے دل کشا کہتے ہیں۔

★

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح　　ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
اہلِ انصاف غور فرمائیں　　ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت
(حالیؔ)

غالب کے کلام میں اخلاقی قدریں

اور

قومی ہم آہنگی کے عناصر

معین الدین حسن کاکوروی

غالب ان معدودے چند شعرا میں ہیں جن کے حسنِ خیال اور حسنِ عمل میں پرخلوص، سچی اور حقیقی مطابقت ہے۔ ان کے حیات کے اوراق واضح اور ان کی کتاب دل میں اُن کے تصورات، ان کے مسلک اور ان کے کردار کی ایک جامع، شفاف اور درخشاں تصویر نظر آتی ہے۔ وہ ثواب طاعت و زہد سے ناآشنا نہیں لیکن وہ ایک نظرآزاد ہیں۔ ان کی طینت باوصف وابستگیِ زہد اُس طرف مائل نہیں ہوتی۔ وہ جنت کی حقیقت جانتے ہیں لیکن اس کو دل بہلا دے کے لیے ایک گلدستۂ رنگیں سمجھتے ہیں جسے اُنھوں نے زیب طاقِ نسیاں کر دیا ہے۔ وہ صرف خلوص، اخلاص اور انسان دوستی کے مسلک پر پائدار عزم سے تاعمر گامزن رہے اور وفاداری بشرط استواری اصل ایماں، بلکہ جانِ ایمان سمجھتے رہے۔ وہ کفر و اسلام کی سرحدوں سے گذر کر اوہام مذہب سے اپنے ذہن کو صاف کرکے اور اختلاف عقائد کے محدود دائروں اور چکروں سے آزاد ہو کر فصل و جدائی ڈالنے والے طریق و مسلک سے متنفر ہیں۔ وہ ترکِ رسوم کرکے ایک حقیقی موحد کی طرح ملتوں کو مٹا کر اجزائے ایماں بنانے پر مُصر اور انسانی محبت کے رشتوں کو استوار کرنے کے بے چین نظر آتے ہیں۔ وہ انسان میں باہمی یگانگت، میل جول اور ربط و ارتباط کو سرمایۂ حیات سمجھتے ہیں۔

چنانچہ کہتے ہیں۔ ؎

زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال　　رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

وہ ردّ و قبول کی کش مکش سے آزاد ہو کر نہ حرم کے سنگ و آستاں کے پابند ہیں اور نہ دیر و کنشت کی چوکھٹ پر سر گھسنے کا قائل۔ وہ تو حسنِ حقیقی کے محرم ہو کر "حریم ناز" پہ دھونی رما بیٹھے ہیں۔ انھیں کوئے یار کی راہ مل گئی ہے اور وہ دیر و حرم کی پناہ گاہیں جو کم نظر اور کوتاہ بیں انسانوں نے تراش رکھی ہیں، ان سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ غالب کے مشرب کی بلندی ان کی وسیع النظری اور رواداری بالآخر عرش کے منظر کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کہتے ہیں ؎

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے　　عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

ظاہری عبادات، قیود و رسوم، طاعت جو شکستگی دل سے عاری، ذوقِ حق جو شوقِ محبت اور سوزِ عشق سے محروم ہو، اُن کی نظر میں ہیچ اور بے حقیقت ہے۔ ان کا ذہن سرگشتۂ سجود و قعود نہیں۔ ان کے روشن دماغ میں تعصب، تنگ نظری کے چور خانے نہیں، وہ دیر میں بھی حسنِ ازل کی جھلکیاں دیکھتے رہے اور حرم میں شانِ اصنام کی تمکنت کا آئینہ حیراں بن کر تماشائی رہے۔ کہتے ہیں ؎

مفلس بزم کرے ہے گنجفۂ بازِ خیال　　ہے ورق گردانیِ نیرنگ یک بت خانہ ہم

یہ تصویر خانۂ دنیا ہی عکس رخ یار ہے اور اس کی صد ہزار رعنائیوں میں محو ہو کر ایک عرفان آشنا دل نہ بستۂ تسبیح صد دانہ رہ سکتا ہے اور نہ پابند زنّار و ناقوس، وہ تو سوئے کعبہ جاتے ہوئے بھی اہلِ کنشت کے حقوق سے غافل نہیں۔ کس شاعرانہ انداز سے اس مسلک رفق و محبت کا اظہار کرتے ہیں ؎

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں　　بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

وہ اپنی طویل زندگی میں خالص انسانیت دوستی کو کلیجے سے لگائے رہے، ذات پات اور فرقہ واریت کی دیواروں کو اپنے عمل و کردار کی بلندی سے ڈھاتے رہے، اور ایک یگانہ و یکتا محبوب کو مانتے ہوئے ساری انسانیت کو ایک رشتۂ محبت میں پرونے کے قائل رہے۔ کہتے ہیں ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ان کی شاعری اور وجدانِ صحیح کو وسیع اور ہمہ گیر محبت کی وہ منزل ملی جس کی بلندی اور رفعت رہ کہکشاں اور گذرگاہ مہر و ماہ سے بھی بلند ہے۔ وہ ایک ذات جو منبع حسن ہے اس کے پرستار ہیں۔ اسی لیے ملت و مذہب

کی مصنوعی تفریق ان کے سامنے بے معنی ہیں اور اختلافِ عقائد ان کی نگاہ فلک پیما کے سامنے ہیچ و پوچ نظر آتا ہے۔ وہ روایتی اور کہنہ تصورات پر طنز کے نشتر چلاتے رہے اور صاف صاف کہتے ہیں کہ اگر عبودیت اور عبادت میں شمہ بھر تمنائے جزا ہو تو ایسی عبادت محض بیکار ہے۔ طاعت برائے طاعت، اور ذوقِ عبادت صرف عبادت کے لیے قابلِ قبول ہے۔ چنانچہ وہ اس بہشت کو جو عبادت کی مزدوری کے سلسلے میں حاصل ہو، دوزخ میں جھونک دینا پسند کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

کبھی کبھی وہ تفریقِ عقائد اور اختلافاتِ دین و مذہب سے تنگ آجاتے ہیں۔ اِن کی وسیع المشربی اور ان کی وسیع الخیالی اس بُعد پر ملول دل گیر ہے کہ انسانیت کی راہ میں انسان کی خود ساختہ دیوار میں حائل ہیں۔ کہیں صحنِ حرم کا حصار غیر اہلِ حرم پر پابندیاں لگائے ہے اور انھیں اذنِ باریابی دینے پر تیار نہیں۔ کہیں صومعہ اور بُت کدہ میں قدم دھرنے کی ممانعت۔ انسانی ذہنوں میں اجنبیت، خیالات میں اختلاف اور تعلقاتِ باہمی میں اس طرح کی کشیدگی کہ رواداری کا کہیں نام نہیں، نہ آزادروی ہے اور نہ مسلک میں اندازِ آشتی و مروت ـــــ اور وہ اس سلسلے میں یہ پیغام دیتے نظر آتے ہیں ؎

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل　　　ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

احباب کے لیے غالب تا زندگی سایہ دیوار بنے رہے۔ ان کے تلامذہ میں منشی ہرگوپال تفتہ بھی تھے اور میجر جان جاکوب بھی۔ اور ان یارانِ باصفا اور اخلاص کیش احباب کو وہ اُسی پیار و محبت سے یاد کرتے ہیں جیسے میر سرفراز حسین یا میر مہدی مجروح کو۔ وہ مہر و وفا کے پیکر اور خلوص کے پتلے ہیں۔ ان کے کلام میں علوئے صفات کی تلقین اور محبت کا پیغام ملتا ہے ـــــ آفاقی اور ہمہ گیر محبت جو زمان و مکان کی قید سے بلند ہے۔ اُن کے کلام میں اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ ستودہ کا ایک بلند تصور ملتا ہے۔ جس طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے اُسی طرح ایک اچھی صفت دوسری صفت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور تشکیلِ کردار جو ایک صبر آزما مجاہدہ ہے آدمی کو انسان بنا دیتا ہے۔ اُن کا دعویٰ حبِ انسان و انسانیت محض کھوکھلا اور بے عمل دعویٰ نہیں تھا بلکہ انھوں نے اس حیاتِ آب و گل میں اسے برت کر بھی دکھا دیا۔ ان کے کلام میں وہ خاکساری ملتی ہے جو دنائت سے پاک ہے۔ لیکن انھوں نے خودداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دہلی کالج میں فارسی کے استادِ اعلیٰ کی اسامی انھیں ملتی ہے لیکن جب اربابِ حل و عقد میں کوئی ان کی پیشوائی کے لیے نہیں آتا تو وہ اس اسامی کے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ یہی نظریہ انھوں نے اپنے شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے جس سے تاثیرِ کلام میں ایک زور پیدا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم　　　اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب کے لیے دیر و کلیسا کی کشش بھی جذبِ حرم سے کم نہیں۔ اُن کا وسیع المشرب قلب دونوں راستوں کی جانب برابر کھنچ رہا ہے۔ وہ ردّ و قبول کی کشمکش سے دامن کشاں ہو کر کہتے ہیں ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر　　　کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

انھیں یقین ہے کہ سبحہ و زنار کے پھندوں میں نہ وسعت ہے اور نہ پائداری کہ وہ ان کے حبِ انسانیت سے دھڑکتے دل کو مائل بہ دام کر سکے۔ یہ حرم و دیر کی دیواریں انسانی برادری کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ یہ حدیں فکرِ انسانی کو محدود دائروں میں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس خیال کو کتنے پُراثر انداز میں بیان کرتے ہیں ؎

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی　　　وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

یا مثلاً خاکسارانِ دیر و حرم پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں　　　پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

زہد بہ شرکتِ ریاکاری، ان کے مسلکِ خلوص میں ایک گناہِ عظیم ہے ؎

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی　　　پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

وہ طاعت و زہد کی اجرت کے طالب نہیں وہ تو حسنِ خیال اور حسنِ عمل میں ہم آہنگی کے قائل ہیں کہ جس سے حیاتِ دنیوی بنتی ہے، حیاتِ اُخروی سجتی ہے اور آسائشِ دو گیتی کا سرمایۂ راحت فراہم کرتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال　　　خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

انسان دوستی انسانیت کے بلند اقدار اپنانے سے حاصل ہوتی ہے۔ غالب اعلیٰ سماجی اقدار کے بڑے پُرجوش معاون تھے۔ علاوہ ازیں

اور انفرادی اخلاقی اقدار کے جو روح کو رفعت اور بلندی عطا کرتے ہیں،
ان کے کلام میں سماجی اوصاف کی تلقین بھی عکس فگن ہے حسن معاملت،
رواداری، ایثار، پاس وضع کے درس ان کے کلام میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے
نظر آتے ہیں وہ دشمن کو بھی دکھ دینا پسند نہیں کرتے۔

یونہیں دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

علوئے نفسی کی ان بلندیوں سے وہ محو کلام نظر آتے ہیں جہاں برا کہنا
اور برا سننا بھی گناہ ہے۔ کہتے ہیں

نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

دوسروں کے عیب چھپانا، دوسروں کی خطاؤں سے درگزر کرنا ہی
انسان دوستی ہے جس سے معاشرتی زندگی نکھرتی، سنورتی اور خوش گوار
بنتی ہے۔ وہ حسن عمل کی ان ہی بلندیوں کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں۔
دشمن کی دشمنی کا جواب رفق و مدارا سے اور دوسرے کے جفائے بیجا
کا جواب وفا و خلوص سے دینا دشمنی کے ہتھیار کو کند کر دیتا ہے۔ اس
خیال کو کس دل کش انداز سے ادا کرتے ہیں ؎

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے — جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے — کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

درحقیقت وہ اخلاق کے معیار کو اتنا بلند کرنا چاہتے ہیں کہ جہاں ستم زدہ
اپنے ظرف کی بلندی کے ماتحت ستمگر کی ادائے قاتل اور جفا و سفاکی
پر صدائے تحسین و آفرین بلند کرتا ہے اور ان ستم رانیوں پر خوش اور
مسرور ہوتا ہے۔

غالب کے یہاں ان تمام صفات حسنہ کا مرکز "جذبۂ عشق" اور
والہانہ "انداز محبت" ہے۔ وہ اپنی ذات کی تمام کلفتوں کو غم انسان
آلام انسانیت میں سمو دینے کے قائل رہے۔ زیست کا لطف انھیں
غم محبت سے حاصل ہوا اور اس راز الفت کو پا کر وہ کہہ اٹھے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

ان کے نزدیک محبت داروئے نیش غم بھی ہے اور مداوائے خلش غم
بھی۔ یہی وہ کسک ہے، یہی وہ نیش ہے جو دل کو شکستگی کی دولت عطا
کرکے آنکھوں کو خوں بار اور قلب کو حسن ازلی کی جلوہ گاہ بناتی ہے۔ اور
پھر شکست شیشۂ دل کی صدا وہ صدائے بے آواز ہے کہ نہ وہ شرمندۂ نغمہ
ہے اور نہ رہین نالہ و فریاد۔ یہی غم جاناں جب غم انسانیت میں بدل
جاتا ہے تو خون جگر پلکوں پر ستارے کی طرح چمک اٹھتا ہے اور
زندگی کے راز ہائے سربستہ کی جھلکیاں اس غم کی تیرگی میں نظر آنے لگتی
ہیں۔ وہ رگوں میں دوڑنے پھرنے والے لہو کے قائل نہیں وہ تو گہری تشنہ
اور ہمہ تن عمل میں کارفرما ہونے والی محبت کے قائل ہیں۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

ان کی تکمیل محبت اس وقت ہوتی ہے جب یہ عالم ہو جائے کہ

دیدۂ خوں بار ہے مدت سے ولے آج ندیم! — دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

ایک فرد کی محبت میں انھوں نے ٹھوکر کھائی، سنبھلے اور اس محبت کو
عام کر دیا۔ شیشۂ قلب چور چور ہوا اور اس کے ذرے غالب نے انسانیت
کی محبت میں منتشر کر دیے۔ اک نو بہار ناز کو تاکنے کے بعد وہ ہر غم زدہ
دل کے احساسات کو محسوس کرنے لگے، ان کے عشق کے مارے ہوئے
دل نے زندگی میں نمک، تلخ اور کڑوے اوقات حیات میں شیرینی اور
زخم دل میں لذت عطا کی جس کے سہارے انھوں نے نسخۂ تالیف قلب
ڈھونڈھ نکالا۔ ان کا مجروح دل روتا رہا لیکن وہ محفل احباب میں بذلہ سنجی
اور فطری خوش دلی کو بروئے کار لا کر لطائف کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے۔
الغرض غالب کے کلام میں روش عام سے ہٹ کر ایک صد رنگ
اور صد بہار زندگی کا بلند، گہرا اور ہمہ گیر تصور ملتا ہے۔ ان کے کلام میں
صرف بزم نائے و نوش کی عشرت سامانیوں کا بیان نہیں ہے، صرف
شکوہ و شکایت کی سرگرانیوں کا ذکر نہیں ہے، صرف قد و گیسو کی قدح
کا دفتر نہیں ہے، صرف گل عارض کی مست آگیں نکہت کا تذکرہ نہیں
ہے بلکہ دار و رسن کی ہمت دلانے والی داستان بھی ہے اور کشمکش
حیات کو عزم اور حوصلے کے ساتھ جھیلنے کا سلیقہ بھی۔ انھیں اپنی آبلہ پائی
کا ڈر نہیں بلکہ وہ تو راہ کو پُر خار دیکھنے کے تمنائی ہیں۔ ان کی نظر تفسیر اشک
میں اس تیرہ خاکدان کا ذرہ ذرہ مے خانۂ نیرنگ کا ساغر ہے۔
ملک و وطن کی محبت سے ان کا دل مملو ہے اور ہندوستان

(بقیہ صفحہ ۱۹۵ پر)

مرزا غالب کے لطیفے

والی آسی.

ہم اگر باقاعدہ طور پر اردو زبان کے ادبی لطائف کی تاریخ مرتب کرنے بیٹھیں تو سرِ فہرست نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ مرزا اسد اللہ خان غالب کا نام نامی نظر آئے گا، جنھیں اگر خواجہ الطاف حسین حالی نے "حیوانِ ظریف" ٹھہرایا تو مولانا عبدالباری آسی نے "لطیفۂ قدرت" قرار دیا ہے۔

یہ مرزا غالب ہی ہیں جو کہیں فقیروں کا بھیس بنا کر اہلِ کرم کا تماشہ دیکھتے ہیں اور کہیں روزہ نہ رکھ کر بھی اپنی روزہ داری کا ثبوت یوں بہم پہنچاتے ہیں کہ حقیقت جانتے ہوئے بھی یقین کئے بغیر نہیں رہا جاتا اور کہنا پڑتا ہے کہ کیا نظم اور کیا نثر اُن سے بہتر ظرافت سے اور کوئی کام نہ لے سکا۔ اُن کی غیر فانی عظمت کا راز اُن کی فطری ذہانت، حاضر جوابی اور بے ساختگی ہی میں پوشیدہ ہے ــــ واقعات کے بیان میں اُنھیں وہ کمال حاصل ہے کہ روتوں کو ہنستے ہی بن پڑے ــــ کسی معمولی سی بات کو بھی وہ طرزِ بیان کے زیور سے سجا کر یوں پیش کر دیتے ہیں کہ قاری یا سامع کو ضبطِ تبسم دشوار ہو جاتا ہے۔

مرزا غالب نے اب سے ایک صدی قبل اپنی شوخی و شگفتگیٔ گفتار سے جو ظرافت کا چراغ جلایا وہ حالات اور حادثات کی تند و تیز آندھیوں میں بھی اپنی تابشوں سے نگاہوں کو خیرہ کئے رہا اور راس مشینی اور تھکا دینے والے ماحول میں بھی اُسی آب و تاب کے ساتھ دنیا کو روشنی بخش رہا ہے۔

حیاتِ تیز رو سے اگر ایک لمحے کی بھی فرصت مل جائے تو پناہ اسی "حیوانِ ظریف" اور "لطیفۂ قدرت" کے عشرت کدے میں ملے گی۔

مرزا غالب نے لطیفہ کو کثیفہ نہیں بنایا بلکہ تمسخر میں بھی ایک خاص قسم کی متانت کو جگہ دی جو اور کہیں نہیں ملتی۔ اُن پر رندی و سرمستی کی کیفیت طاری ہو یا ہجومِ غم و الم کے بادل چھائے ہوں، کسی بھی حالت میں وہ شوخی، شگفتگی اور تفنن کی راہ سے فرار اختیار نہیں کرتے، کیونکہ اُن کے بیان میں شاعری، مبالغہ اور ظرافت اس طرح گھل مل گئی ہے کہ آسانی سے کوئی اُن کی تہہ دار شخصیت کا عرفان حاصل نہیں کر سکتا۔

وہ اپنے مصائب کا بیان بھی لوگوں کے سامنے یوں کرتے ہیں کہ سننے والا کلام واقعات سے لاشعوری طور پر چشم پوشی کرتا ہے اور ان کے بیان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جب مصائب میں مرزا کا یہ عالم ہے تو خوشی کا پوچھنا کیا کہ خوشی و مسرت تو ایسی شے ہے جو ظرافت کی تلوار کا جوہر بن کر اُس کی چمک کو اور دوبالا کر دیتی ہے۔

مرزا کی شوخی، شگفتگی اور رجائیت اُنھیں متقدمین، متوسطین، متاخرین اور عہدِ حاضر تک کے تمام مزاح نگاروں میں ممتاز و منفرد بھی کرتی ہے اور مقبول بھی ــــ ! اُن کی لافانی عظمت کا راز بھی اُن کی رندی و سرمستی، شوخی و شگفتگی، خوشدلی و زندہ دلی، ذہانت و ذکاوت اور بے ساختگی و حاضر جوابی میں نہاں ہے۔ یہ ہمیں ایک ایسے زعفران زار میں پہنچا دیتی ہے جہاں مسکراہٹیں اور قہقہے ہیں، زندگی اور زندہ دلی ہے اور سکون و اطمینان بھی ــــ !

ذیل میں مرزا نوشہ کے چند لطیفے درج کئے جاتے ہیں:

وہ بھی کوٹھری ہے

مرزا غالب جس مکان میں رہتے تھے اُس کے دروازے کی چھت پر ایک کمرہ تھا۔ اسی کمرہ کے ایک طرف ایک تنگ و تاریک کوٹھری بھی تھی جس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں اکثر لُو دھوپ سے بچنے کے لئے مرزا صاحب اس میں سہ پہر کے تین چار بجے تک بیٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق سے رمضان کے مہینے میں مرزا اسی کوٹھری میں بیٹھے کسی کے ساتھ شطرنج یا چوسر کھیل رہے تھے کہ مفتی صدرالدین آزردہ اُدھر آنکلے۔ مرزا غالب کو اس طرح رمضان کے مہینے میں شطرنج یا چوسر کھیلتے دیکھ کر کہنے لگے ــــ "مرزا صاحب ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے۔ مگر آج اس حدیث کی صحت پر کچھ شبہہ سا ہو رہا ہے" ــــ

مرزا صاحب نے برجستہ جواب دیا۔

"قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر بات یہ ہے کہ وہاں شیطان مقید رہتا ہے

وہ کوٹھہ کا تو بہی ہے۔"

لَم یَلِد وَلَم یُولَد

ایک بار مرزا غالبؔ نے نواب امین الدین احمد خاں کو اپنے ایک خط میں اس طرح لکھا:

"آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ اور میں لَم یَلِد وَلَم یُولَد ہوں۔"

اخبار کے خریدار اور گیہوں

منشی شیو نرائن نے ایک دفعہ مرزا غالبؔ کو لکھا کہ:

"میرے اخبار کے کچھ خریدار پیدا کیجئے۔"

مرزا صاحب نے دلی کی تباہی پر آنسو بہاتے ہوئے اُنھیں جواب دیا کہ:

"یہاں آدمی کہاں کہ اخبار کا خریدار ہو۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں ___"

روزہ مرا ایمان ہے

ایک سال مرزا صاحب کے بعض احباب نے اُن سے اصرار کیا کہ:

"مرزا صاحب اس سال تو روزے رکھ ہی لیجئے۔"

لیکن اُس سال ایسا اتفاق ہوا کہ بہت شدت کی گرمی پڑی اور رمضان شریف کا مہینہ مئی جون کی سخت گرمیوں میں پڑا۔ چنانچہ مرزا نے روزے نہیں رکھے اور اصرار کرنے والے احباب کو یہ رباعی نذر کر دی۔

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے، غالبؔ لیکن خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

بیٹھ ری مائی

مولانا فضل حق خیرآبادی ہر چند کہ اپنے عہد کے ایک بڑے عالم تھے مگر چونکہ اُن کی اوائل عمری کا زمانہ شہزادوں کی صحبت اور امیرانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گزرا تھا اور اُس زمانے کے رواج کے مطابق مولانا کا تعلق بھی طبقۂ اربابِ نشاط سے وضع داری کے طور پر تھا۔ یہ وضع داری نبھانے کے لیے اُن کے ساتھ بھی ایک علت لگی ہوئی تھی۔

مولانا اور مرزا غالبؔ کے بڑے گہرے اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ مولانا کی عادت تھی کہ جب اُن سے اُن کا کوئی بے تکلف دوست ملنے آتا تو جوشِ محبت میں خالق باری کا ایک مصرعہ پڑھا کرتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ مرزا غالبؔ مولانا سے ملنے گئے چنانچہ حسبِ عادت مولانا نے اُنھیں دیکھتے ہی فرمایا:

بیا برادر آؤ رے بھائی

اور مرزا کی تعظیم کو اُٹھ کر کھڑے ہو گئے ___ مرزا نوشہ آئے اور بیٹھے ہی تھے کہ اتنے میں مولانا کی منسلکہ بھی دالان سے اُٹھ کر آئی اور مرزا صاحب کے پاس بیٹھ گئی تو مرزا نوشہ نے مولانا سے مخاطب ہو کر کہا:

"___ ہاں! مولانا اب دوسرا مصرعہ بھی فرما دیجئے۔

بنشیں مادر بیٹھ ری مائی ___"

یہ سُن کر مولانا جھینپ گئے اور مسکرا دیئے۔

گدھے اور آم

حکیم رضی الدین خاں، مرزا غالب کے خاص دوستوں میں تھے اور دِلّی کے نامی گرامی طبیب تھے لیکن اُنھیں آم مرغوب نہ تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ حکیم صاحب، مرزا صاحب کے یہاں بیٹھے تھے۔ آموں کا موسم تھا چنانچہ باہر گلی میں آموں کے کچھ چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اُسی وقت ایک گدھے والا اپنے گدھوں کو لے اُدھر سے گزر رہا تھا۔ ایک گدھے نے رک کر آم کے چھلکوں کو سونگھا اور آگے بڑھ گیا۔ یہ دیکھ حکیم صاحب نے مرزا صاحب سے کہا کہ:

"___ دیکھو مرزا! تم آموں کی بہت تعریف کرتے ہو مگر آم ایسی چیز ہے کہ اسے گدھے بھی نہیں کھاتے ___"

مرزا صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"___ جی ہاں، بیشک گدھے آم نہیں کھاتے ___"

دھوکے دھوکے میں نجات

ایک بار ایک صاحب بھوپال سے دِلّی کی سیر کو تشریف لائے۔ وہ صاحب مرزا غالبؔ کے بھی مشتاقِ ملاقات تھے۔ چنانچہ مرزا صاحب سے ایک دن ملنے گئے۔ صاحب موصوف کی صورت شکل اور وضع قطع سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آدمی متقی اور پرہیز گار ہیں ___ مرزا صاحب حسبِ معمول اُن سے نہایت خوش اخلاقی سے ملے۔ لیکن جس وقت یہ صاحب مرزا صاحب سے ملنے گئے تھے وہ مرزا کے شغلِ جام و مے کا وقت تھا چنانچہ معمول کے مطابق شراب کا شیشہ اور گلاس سامنے رکھا تھا۔ اُن صاحب کو یہ خبر کہاں تھی کہ مرزا غالبؔ کو یہ شوق بھی ہے۔ اتفاقاً اُنھوں نے باتوں باتوں میں شراب کا شیشہ ہاتھ میں اُٹھا لیا تو قریب ہی بیٹھے ہوئے کسی آدمی نے کہا:

"ـــــ جناب یہ شراب ہے ـــــ"

یہ سنتے ہی ان بھوپالی صاحب نے جھٹ سے شراب کا شیشہ رکھ دیا اور بولے:

"ـــــ میں نے تو اسے مشروب کے دھوکے میں اٹھایا تھا ـــــ"

مرزا صاحب نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"ـــــ زہے نصیب دھوکے دھوکے میں نجات ہوگئی ـــــ"

صہبائی

ایک روز کسی محفلِ شعر و سخن میں مولانا صہبائی کا ذکر آگیا تو مرزا غالب نے کہا:

"ـــــ مولانا نے بھی کیا عجیب و غریب تخلص رکھا ہے۔ عمر بھر میں ایک چُلّو بھی پینا نصیب نہیں ہوئی اور صہبائی تخلص رکھا ہے۔ سبحان اللہ قربان جایئے اس اِتقا کے اور صدقے جایئے اس تخلص کے۔"

آدھا مسلمان

جنگ ۱۸۵۷ء کے بعد جب پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو مرزا غالب بھی طلب کیے گئے اور کرنل براؤن کے روبرو پیش کیے گئے۔ وضع کے مطابق کلاہ پپاخ جو یہ پہنا کرتے تھے ان کے سر پر تھی جس کی وجہ سے کچھ عجیب قطع معلوم ہو رہی تھی۔ اُنھیں دیکھ کر کرنل براؤن نے کہا،

"ـــــ وِل مرزا صاحب تم مسلمان ہے؟"

مرزا غالب نے متانت سے جواب دیا:

"ـــــ آدھا مسلمان ہوں ـــــ"

کرنل نے کہا:

"وِل یہ آدھا مسلمان کیا؟ اس کا مطلب؟"

مرزا صاحب بولے:

"آدھا یوں کہ شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا ـــــ"

یہ سن کر کرنل براؤن بہت محظوظ ہوا اور مرزا غالب کو اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔

لعنت خدا کی

ایک بار ایک صاحب بنارس سے دِلّی تشریف لائے۔ چونکہ مرزا غالب سے ملاقات کا اشتیاق رکھتے تھے اس لیے ایک دن مرزا صاحب سے ملنے کے لیے گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے جاتے اور ساتھ ہی ساتھ مرزا غالب سے اُن کے ایک شعر کی بے انتہا تعریف بھی۔ پہلے تو مرزا غالب چُپ رہے مگر جب تاب نہ رہی تو اُن سے دریافت کیا:

"ـــــ حضرت وہ کون سا شعر ہے ـــــ؟"

اُن صاحب نے فوراً میر امانی اسد شاگرد مرزا رفیع سودا کا یہ شعر سنا دیا:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی   مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

مرزا صاحب نے یہ شعر سن کر اُن سے کہا کہ:

"ـــــ اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اُس کو رحمت خدا کی ہو اور اگر مجھ اسد کا یہ شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی ـــــ"

گدھے کی لات

مرزا غالب نے جب قاطع برہان لکھی تو مخالفین کا ایک سیلاب برطرف سے اُمڈ آیا اور تمام لوگوں نے جوابات لکھے۔ ان ہی جواب لکھنے والوں میں ایک شخص امین الدین نامی بھی تھے۔ جنھوں نے قاطع برہان کے جواب میں قاطع قاطع لکھی تھی۔ چونکہ اس کتاب کی بنیاد صرف بدگوئی اور فحش گوئی پر رکھی گئی تھی لہٰذا مرزا غالب نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش بیٹھے رہے۔ مرزا کے ہم نواؤں میں سے کسی نے اُن سے کہا کہ:

"ـــــ حضرت، آپ نے قاطع قاطع کا کوئی جواب نہیں دیا ـــــ؟"

مرزا نے اُنھیں جواب دیا کہ:

"ـــــ حضرت اگر کوئی گدھا آپ کے لات مار دے تو آپ کیا جواب دیں گے ـــــ؟"

خدا کو سونپا

جب نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کا انتقال ہو گیا تو مرزا بھی رام پور تشریف لے گئے۔ نواب یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے تھے۔ اتفاق سے ایک روز نواب موصوف لفٹنٹ گورنر سے ملنے کے لیے بریلی جا رہے تھے۔ روانگی کے وقت جہاں اور لوگ الوداع کہنے کو موجود تھے، مرزا غالب بھی حاضر تھے۔ مرزا غالب کو رخصت ہوتے ہوئے رسماً نواب صاحب نے فرمایا:

"ـــــ اچھا مرزا خدا کو سونپا ـــــ"

مرزا صاحب نے عرض کیا:

"حضور غضب ہے ـــــ خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا آپ پھر خدا کے سپرد کیے دے رہے ہیں ـــــ"

★

غالب ـــــ ایک فن کار

ایم حبیب نصری

مرزا اسداللہ خاں غالب المعروف بہ مرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ، شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۶ء کو آگرہ میں جہاں اب پیپل منڈی کی سڑک پر کالا محل ہے، پیدا ہوئے۔ میرزا کے والد عبداللہ بیگ عرف مرزا دولھا کی شادی خواجہ غلام حسین کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ یہ آگرہ کے عمائد شہر میں اور اچھے جاگیردار تھے۔ مرزا کی عمر ابھی پانچ سال کی تھی کہ ۱۲۱۶ھ میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ تعلیم و تربیت ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ کے سپرد ہوئی جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے۔ جب ۱۲۲۱ھ میں ان کا بھی انتقال ہوا تو مرزا نوشہ کی عمر نو برس کی تھی۔ اب ان کی پرورش ننہال میں ہونے لگی جو ایک امیر گھرانہ تھا اور چچا کی جاگیر کے عوض پنشن بھی ملتی تھی۔ یہ مرزا کے عیش و عشرت کا زمانہ تھا جس میں ان کو سیر چشمی و خوش وقتی کی عادت پڑ گئی جو عمر بھر نہ گئی۔ مرزا کے چچا کا رشتہ نواب فخرالدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا اس لئے مرزا کی شادی نواب کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش معروف کی لڑکی سے تیرہ سال کی عمر میں ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو ہو گئی اور وہ دہلی میں سکونت پذیر ہو گئے اور یہیں آخر عمر تک رہے۔ غالباً ۱۲۴۱ھ میں غالب آگرہ چھوڑ کر دہلی آ رہے لیکن کوئی ذاتی مکان نہ بنایا، ہمیشہ کرایہ کے مکانوں میں رہا کیے۔ سب سے آخر میں حکیم محمود خاں کے مکان کے قریب مسجد کے عقب میں رہتے تھے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ ؎

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے   یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

مرزا نہایت متواضع ملنسار، بے تعصب اور زندہ دل انسان تھے۔ ہندو مسلمان سب سے یکساں تعلقات تھے۔ ان کے دوستوں میں منشی نول کشور، بابو گوبند سہائے، ماسٹر پیارے لال آشوب، منشی شیو نرائن اور شاگردوں میں منشی بہاری لال مشتاق، دیبی پرشاد ناجی، رائے بہادر شیو نرائن آرام، لالہ بال مکند بے صبر، آشوب جوہر وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ شاگردوں میں منشی ہرگوپال تفتہ جو فارسی اشعار موزوں کرنے میں خاص ملکہ رکھتے تھے اور کلام چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، ان کے لئے مرزا کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

سواد ہند گر فتی بہ نظم خود تفتہ   بیا کہ نوبت شیراز دوقت تبریز است

اپنے خطوط میں غالب ازراہ خلوص منشی ہرگوپال کو مرزا تفتہ لکھا کرتے تھے۔ ان کے نام مرزا کے ۱۲۳ خطوط ہیں۔ "اتنے خطوط انھوں نے کسی دوسرے کو نہیں لکھے۔"

مرزا نے نوعمری ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ ابتدا میں ان پر بیدل کا رنگ غالب رہا جس نے ان کے کلام کے خاصے حصے کو چیستاں بنا دیا۔ ان کی اس رنگ کی شاعری پر کھلے عام اعتراضات ہوئے چنانچہ حکیم آغا جان عیش نے یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے   مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے   مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس کے جواب میں غالب نے یہ تو ضرور کہا کہ:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے   خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے   ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

مگر اپنے ان کے مخلص دوست مولانا فضل حق خیرآبادی کے مخلصانہ مشورے، مفتی صدرالدین آزردہ کی دوستانہ اصلاح یا خود غالب کی بیداری فکری وہ دور بینی اور زمانے کی نبض شناسی کا نتیجہ کہئے کہ انھوں نے بہت جلد بیدل کی تتبع گوئی ترک کر دی۔ البتہ انھوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ مرزا جدت پسند تھے اس لئے انھوں نے اپنی راہ سب سے الگ بنائی اور اپنے دور کی فرسودہ اور غیر صالح روایات سے بغاوت کی۔

غالب کی زندگی میں ان کی مخالفت میں ان کی مشکل پسندی کا پہلو جتنا بھی بڑا رہا ہو لیکن اسے اصل سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مخالفت کا اصل سبب مذاق و خیال کا تصادم تھا، فکر و نظر کا اختلاف تھا، جدت و قدامت کی ٹکر تھی۔ اس زمانے کے عام

ادبی رجحانات کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا ہر شاعر زلف و شانہ پر شاہد اتھا ا ہو ٹی و تیلما کی گرمی و چاشنی ذہنی اور ادبی فضا پر حاوی تھی اور یہی انداز جانِ سخن سمجھا جاتا تھا۔ اس روایت سے ہٹنے کے لئے ایک خاص دل و دماغ اور ایک زبردست فن کار کی ضرورت تھی جو اپنے دور کے افکار و محرکات اور عوامل پر گہری نظر رکھتا ہو اور آنے والے دور کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہو۔ قدرت نے غالبؔ کی شکل میں وہ باشعور فن کار مہیا کر دیا جس کی نظر نہ صرف اپنے دور کی بدلتی ہوئی قدروں پر تھی بلکہ اس کی دور بیں نگاہیں آنے والے دور کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب ہم اس کا کلام پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہمارے دل کی بات کہہ دی ہے۔

یورپ کے شاعروں میں جو شعرا مرزا کے ہم عصر یا قریب العہد تھے ان میں صوفی منش رابرٹ براؤننگ کا نام لیا جا سکتا ہے جو اسی عہد کا ایک فلسفی شاعر تھا۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ روح کا تجزیہ کرتا تھا۔ مرزا تجزیہ کم کر کے رموزِ روحانی کے عمق تک زیادہ پہنچے۔

حزن و یاسیت میں ان کا مقابلہ جرمنی کے شاعر ہین (HIEN) سے خوب ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی بلند پایہ فلسفی شاعر ان کا مدّمقابل گذرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف شاعر گوئٹے ہے۔

نغمۂ زندگی اور غم و الم کے لازم و ملزوم ہونے کے متعلق مرزا کے اشعار سُن کر براؤننگ کی روح بھی مسرور ہوتی ہوگی :

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

گویا وہ ایک ایسے چابک دست مصور ہیں کہ جس کی صنعت پُرکاری یا پُرکاری فن ہو، یا ایک ایسے صنم گر جس کے تراشے ہوئے بتوں کا حُسن حسنِ ازل ہو۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

کبھی وہ غم کو آفاقی بنا کر پیش کرتے ہیں ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے　　غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
حیف اب میں خیال کو تھا تجھ سے معاملہ　　جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

خیالی پیکر اور شعار کی پیکر سازی ملاحظہ ہو ؎

حیف اس کی ہو دماغ ایسا پراگندہ کہ ہیں　　تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میرؔ کی طرح مرزا بھی مصائب و آلام سے دوچار رہے جس کی وجہ سے کلام میں ایک خاص درد و اثر ہے۔ پھر بھی لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی کو کسی وقت ہاتھ سے نہ جانے دیا اور تکلیفوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلنے کا خوگر بنا لیا ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

فی زمانہ مزاحیہ نگاری ایک مستقل ادبی صنف میں شمار ہونے لگی ہے لیکن یہ زیادہ تر ترتیب دی ہوئی مزاح نگاری ہے۔ غالب کی ظرافت فطری تھی جو آج بھی اسی طرح ہنساتی اور مسرور کرتی ہے جس طرح ان کی زندگی میں ان کے مخاطب کو خوش کرتی تھی۔ مثلاً ایک دفعہ شاہی باغ کے آموں کو ٹھہر کر گھورنے لگے اور شاہ ظفرؔ کے استفسار پر برجستہ کہا کہ پیر و مرشد دیکھ رہا ہوں کہ ان آموں پر میرا بھی نام کہیں لکھا ہے یا نہیں بقول بیدلؔ ؎

بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں　　کائی، فلاں ابن فلاں

باغ حیات بخش اور مہتاب باغ کا آم سوائے سلاطین و بیگمات کے کسی کو نہ ملتا تھا۔ مرزا نے ایک چٹکلے سے ایک بہنگی عمدہ آموں کی وصول کر لی۔

اٹھارہ سو ستاون کے واقعات کی تحقیقات کے لیے کرنل براؤن کے سامنے پیش ہوئے۔ اُس نے حلیہ دیکھ کر پوچھا کہ 'تم مسلمان ہو' جواب دیا جی ہاں مگر آدھا۔ کرنل نے متعجب ہو کر کہا کیا مطلب؟ بولے شراب پیتا ہوں مگر سور نہیں کھاتا۔ اس لطیفہ کی بدولت مزید سوال و جواب سے بچ گئے۔ یادگارِ غالب میں اس طرح کے لطائف بہت ہیں۔

مرزا کی گوناگوں جدتوں، رنگا رنگ ظرافتوں نے خطوطِ غالب میں ایسی دل کشی و انفرادیت پیدا کر دی کہ یہ طرز ان سے شروع ہو کر انھیں پر ختم ہو گیا۔ بہت سے لوگوں نے ان کی تقلید کی لیکن ان کی ہمسری نہ کر سکے۔ ہاں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ سادہ اور بے تکلف خطوط نویسی رواج پا گئی۔ خط کو مکالمہ بنا دینے کے موجد بھی مرزا تھے گویا سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔

یہ بات عجیب ہونے کے علاوہ عدیم المثال بھی ہے کہ جو شخص نظم کی وادی میں مشکل پسند ہو وہ نثر کے میدان میں سادگی، لب و لہجہ، سلاست اور شیرینی کا ایسے دلدادہ ہو گیا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ چونکہ اس زمانے میں تصنع آمیز مقفیٰ عبارت مستعمل تھی اور غالب جدت پسند تھے اس لیے انھوں نے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔

بہرحال مرزا کی انشا پردازی ہو یا نثر نگاری یا ان کی شاعری ہو ان سب کی مستحکم بنیاد ان کی جدت طرازی پر قائم ہے جس میں حسنِ ادا، تشبیہات و

استعارات، محاکات، ترتیب الفاظ، تخئیل غرض ہر قسم کی جدت شامل ہے۔ اردو کے شعرا نیز بعض شعرائے فارسی میں اور غالب میں یہ فرق بہت نمایاں ہے کہ مرزا کے یہاں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں جس سے تصنع پیدا نہیں ہونے پاتا۔ ان کے یہاں شاعری صرف ردیف قافیہ کی پابندی کا نہیں بلکہ خیال آفرینی کا نام ہے۔ ان کے اشعار محسوسات کا صحیح بیرومیٹر (BARO METER) ہیں جس میں زندگی اور متعلقہ کیفیات کا سوز بھی ہے اور ساز بھی۔ کہیں ہجوم ناامیدی نظر آتا ہے تو کہیں نوک جھونک اور ظرافت، حد یہ ہے کہ خدا سے بھی چھیڑ چھاڑ سے باز نہ آئے یعنی جو بھی کیفیات قلبی وقتاً فوقتاً وارد ہوتے رہے ان کو الفاظ کا جامہ پہنا کر زیب قرطاس کر گئے۔ مثلاً

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ خیال اچھا ہے

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

کبھی بہ حیثیت ایک فلسفی کے برگساں سے یوں چشمک زنی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

شاہ میراں جی، شاہ برہان الدین جانم دکنی اور امیر خسرو سے لے کر ولی دکنی خان آرزو، ظہور الدین حاتم اور بیدل تک اردو غزل کا جو ترکہ رہا ہے اس کا بہترین جز مرزا کے حصہ میں آیا۔ ان کے اسلوب میں جو دلکشی و لطافت اور صدیوں کی رچی ہوئی بلاغت کلام میں جو طرفگی اور نکھار اور انداز بیان میں جو فلسفیانہ متانت، گہری سنجیدگی، ابلیغ شگفتگی اور شعریت ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہو سکی۔ مرزا کے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا جس کے یہاں مستقل فکر انگیزی ہو اور جس کے کلام کے مطالعے سے ہمارا ذہن فوراً یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ شاعر مسائل حیات کے متعلق ایک سوچا سمجھا ہوا نظریہ رکھتا ہو جس میں مطالعہ کی گہرائی اور مشاہدے کی گیرائی ہے۔

دنیا کے ادبی شہ پاروں کے عام پسند اور غیر فانی ہونے کا راز یہی ہے کہ ان کے خالق اپنے دور اور ماحول کی حقیقتوں کو ان کی سطح سے بلند کر کے نئے طرز پر از سر نو ترتیب دیے گئے اور ارتقائی تخلیق کے بانی ہوئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہومر، شیکسپیر، گوئٹے، سعدی، مولانا روم یہ سب صرف الماریوں کی زینت ہوتے۔

غالبؔ نے فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات کا اردو شاعری میں سنگ بنیاد رکھا جس کا اثر اس وقت کم مگر بعد کو بڑی شدت سے محسوس کیا گیا۔ خیالات کے تنوع اور طرز ادا کی جدت اسی وقت لوگوں کے سامنے آگئی تھی جس سے ہل نظر چونک اٹھا گو یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں ان کے الفاظ کی ترکیبیں ان کے مفہوم کو پورا نہیں کرتیں اور پڑھنے والے کا ذہن ان کے خیال تک نہیں پہنچتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ خیال کی بلندی، مضامین کی ندرت اور تشبیہوں کی نادرہ کاری کو مرزا نے اپنا حصہ بنا لیا جس کا ایک زمانہ گرویدہ نظر آتا ہے۔ تنگنائے غزل میں جو وسعت غالبؔ نے پیدا کی وہ کسی اور نے نہیں کی حسن و عشق کے چھوٹے چھوٹے مسائل زندگی کا راز معلوم ہوتے ہیں۔ غالبؔ کو واردات قلب کے بیان کرنے میں ایسا ملکہ تھا کہ ہر شخص محسوس کرنے لگا گویا یہ اسی کی داستان ہو۔

غالبؔ کے متداول دیوان کے مطلع اول سے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کو لے لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے سرمایۂ کلام کا راز اس مطلع میں پوشیدہ ہے۔ نقش فریادی کے ساتھ شوخیٔ تحریر کی ترکیب میں مرزا کی نادرہ گفتار حکمت بیان کا فسوں سا نہ تشبیہی عمل پایا جاتا ہے۔ نقش فریادی کے سمجھنے کے لیے غالبؔ کے ماحول اور پس منظر کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ مختلف شارحین نے جو کچھ سعی کی ہے اس میں صرف لفظی مطالب بیان کیے گئے ہیں۔ اصل شرح تو سخن فہموں کے ذوق سلیم پر منحصر ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ طباطبائی نے اس شعر کو مہمل قرار دیا ہے حالانکہ ایک مکمل شرح مع کوائف صرف اس مطلع کے لئے درکار ہے تاکہ یہ مطلع اول مقطع دیوان بن جائے۔ اگر یہ قفل نہ ٹوٹا تو دیوان غالب وہ عمارت ہفت آسماں ہے جس کے گرد پھر لیجئے اندر قدم رکھنا محال ہے۔ نقش شوخیٔ تحریر کا فریادی ہو یا نہ ہو، غالبؔ کی شوخیٔ فکر کا بلاشبہ آئینہ دار ہے۔

عام شعرا کی طرح دیوان کا آغاز گو حمد باری سے کیا ہے مگر شوخی مطلع سے عیاں ہے گویا حمد کے پردے میں خدا سے گلہ کیا ہے، مٹا نا تھا تو پیدا ہی کیوں کیا! غم ہستی؟ وہ فسانہ کہ سنائے نہ بنے؟ ہستی غم کس سے ہو جز مرگ علاج، غم ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔

کائنات عالم میں جتنے بھی نازک رُخ ہیں ان کو نظم کر کے مرزا نے ہم کو "گم کیا ہوا پایا" کی دشواریوں سے سبکدوش کر کے راز بہار سے آشنا کیا۔ زندگی کی راہوں میں کچھ ایسے پیچ و خم ہیں جس کے سُراغ میں انسان گم گشتہ راہ تھا، مرزا تنگنائے غزل کا شکوہ کرتے ہوئے بھی اس کی نشاندہی کر گئے۔ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ بقول ظہوری "لوح سے تحت تک سو صفحات ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس ساز زندگی کے

روان پر بیدار یا خوابیدہ یا موجود نہیں" مختصر دیوان غالب وہ آئینہ
یاں نما ہے جس میں روح کا سوز، تڑپ، غم دوراں، قلقل مینا اور
لوۂ جاناں سبھی کچھ موجود ہے۔ محبت کی آگ وہ آگ ہے جو "لگائے
نہ لگے" اور "بجھائے نہ بجھے" مرزا سے ایک ہی شعر میں سمجھا گئے۔

اردو میں بھرپور اور رنگا رنگ شخصیت غالب کی ہے۔ وہ ادبی تاریخ
ں ایک نئے دور اور ایک نئی روایت کے خالق ہیں۔ دیوان غالب کو
ہی نسل کی مقدس صحیفہ کہہ سکتے ہیں۔

کلیات شیکسپیر جذبات انسانی کا مرقع اور زندگی کے مماثلات
تخیلات سے رنگین ہے، یہی وہ طرز ہے جو شیکسپیر کے کلام اور اس کے
بیان کو لاثانی بناتا ہے۔ رشک شیکسپیر مرزا کی مصوری بعض حیثیتوں سے
س سے بہتر ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ "ہندوستانی
روح تمدن کا عکس پیش کرتی ہے۔ شاعری کا کمال یہ ہے کہ پھولوں کے
ذکر سے خوشبو آنے لگے اور کانٹوں کی داستان سے خلش پیدا ہو جائے۔ جیسا
کہ اس مصرع میں اشارہ کیا گیا ہے ع نگاہ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو اور
سچ پوچھئے تو مرزا کی شاعری ایک چلتا جادو ہے۔ وہ جوان ہے اور ہمیشہ جوان رہے گی۔

غالب ایک ذہین فنکار اور حسن آفریں شاعر ہے۔ وہ ایک
عندلیب گلشن ناآفریدہ تھا اسی لئے رفتہ رفتہ لوگ اس کی قدر کر سکے۔
غالب کے فکری نقش و نگار گلستاں در گلستاں تنقید کی کسوٹی سے گزر کر
جلوہ افروز ہوتے آئے ہیں۔ شیفتہ، حالی اور آزاد سے لے کر امتیاز علی عرشی
اور سالک رام تک اسرار و رموز کلام اور مرزا کی شخصیت کے مختلف
گوشوں تک ہماری رہنمائی کرتے رہے ہیں پھر بھی کتنے ہی گوشے ابھی تحقیق
طلب ہیں۔ کاروان تحقیق سرگرم سفر ہے اس لئے آئندہ بھی ان کی شاعری، فن
اور شخصیت کے یہ گوشے اجاگر ہوتے رہیں گے۔

بیدل کے اثر سے قطع نظر غالب نے اپنے سامنے جو مقصد حیات رکھا
تھا وہ ایک حکیم و مفکر کا تھا۔ شاعری ان کے لئے دل لگی کا سامان نہ تھا۔ بلکہ
وظیفہ حیات تھا اور اصل مقصد شاعری قانون راز کی نواسنجی۔

★

غالب کے کلام میں اخلاقی اقدار اور قومی ہم آہنگی کے عناصر

(بسلسلہ صفحہ ۱۹)

جنت نشاں کی جو عظمت اور محبت ان کے دل میں ہے اسے اس قطعہ
میں کتنے والہانہ انداز میں بیان کیا ہے:

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے — جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے — اخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور
ہے اصل تخم ہند سے اور اس کی میوے — پھیلا ہے سب جہاں میں میوہ یہ دور دور

یہ بلند نظری، یہ وسیع المشربی، یہ رندانہ آزاد خیالی، یہ آسمان کی
رفعت کو شرمندہ کرنے والی بلندیِ تخیل، زندگی کے یہ اعلیٰ اقدار غالب کے
کلام کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں اور اسے حیات جاودانی کا پیغام دے
رہے ہیں۔ وہ اپنے اس دعوے میں سچے ثابت ہوئے کہ ؎

مت ہو جیو اے سیل فنا ان سے مقابل
جانبازِ الم نقش بداماں بقا ہیں

غالب حقیقتاً جانبازان الم میں شامل ہیں جن کی خاکی عبا اور فانی زندگی
کے دامن پر بقا کے گل بوٹے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ اس قافلہ ہستی گذراں
کے میر کارواں ہیں کہ جس نے ریگ زار حیات پر پائندہ اور تابندہ تخیلات
اور تصورات کے گلہائے سدا بہار اشعار کی شکل میں کھلائے ہیں۔ ان کی بلند
خیالی اور صاحب نظری، ان کی فکر کی بلندی اور ان کی علو ہمتی تاثیر و اثر کا
سرمایہ بہم فراہم کرتی رہے گی اور امروز کی شورشیں اور الجھنیں فردا کی امید
مسرت میں تبدیل ہو کر زندگی کی بہت کٹھن منزل کو آسان بناتی رہے گی۔

★

غالب کی کہانی غالب کی زبانی

(مرزا کی یہ کہانی اُن خطوط سے ترتیب دی گئی ہے جو اُنھوں نے اپنے دستوں، شاگردوں اور چاہنے والوں کو لکھے تھے)

بارہ سو بارہ ۱۲۱۲ ہجری میں پیدا ہوا ہوں۔ میں قوم کا سلجوقی ہوں ــ دادا میرا ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندستان آیا تھا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے، جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا، وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد میں چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصراللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی، مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبیدار تھا۔ اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبیداری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا بریگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا، لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ۔ سال بھر نرد بانی کی تھی کہ بہ مرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہوا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔

حلیہ

میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ کیا کہوں جی پر کیا گذری جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا، منھ پر داڑھی سر پہ بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈا دیا۔

شادی

۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس کا صادر ہوا۔ ایک بیڑی (بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔

اولاد

بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ چوہتّر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔

رہائش

دس گیارہ برس سے اس تنگنائے میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپیہ دیے گیا۔ تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو بیگھت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا۔ جس نے لیا ہے اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا ــ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو میں اٹھوں۔ بیدرد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز عرض اور دس گز طول اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، پاڑ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ کٹگھرہ ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزریں۔ دوشنبہ ۲۹ جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آ گیا۔ وہاں جا رہا، جان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اس مکان کے بہتر ہے۔ نہ مجھے خوف مرگ ہے، نہ دعویٰ صبر ہے۔ میرا مذہب بخلاف عقیدۂ قدریہ جبر ہے۔ تم نے میاں بخیہ گری کی۔ بھائی نے برادر پروری

کی۔ تم جیتے رہو وہ سلامت رہیں۔ ہم اس حویلی میں تا قیامت رہیں۔

فارسی زبان و ادب سے لگاؤ

بد و فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھے ملے۔ بارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان فارسی کے معلوم کئے۔ اب مجھے اس امر میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں ہے۔

نظم و نثر

بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اسی شیوے کی ورزش میں گزرے۔ ابتدائی سن تمیز سے اردو زبان میں سخن سرائی کی، بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اس روش پر خامہ فرسائی کی۔ نظم و نثر فارسی کا عاشق ہوں۔ ایک اردو کا دیوان۔ ہزار بارہ سو بیت کا، ایک فارسی کا دیوان۔ ۱ ہزار دس سو بیت کا، تین رسالے نثر کے یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا لکھوں گا۔ مدح کا صلہ نہ ملا، غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی۔

واقعۂ اسیری

کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے بارے میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کا برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا، اس نے بھی اغماز اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعادِ قید گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور میری خاکساری اور آزردہ حالی سے اس کو مطلع کیا، یہاں تک کہ خود بخود اس نے میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔ میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کوئی منزل مقصود قرار دوں، سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جس کا میں آرزو مند ہوں۔

قلعہ کی ملازمت

دلی کی سلطنت سخت جان تھی۔ سات برس مجکو روٹی دے کر بگڑی۔ بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا تھا۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپیہ سال، ولی عہد اس تقرری کے دو برس بعد مر گئے۔

جب بادشاہ دہلی نے مجھے نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجکو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی مقطع اس کا یہ ہے۔

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا　　وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل۔ اس کا نام "مہر نیم روز" ہے اور سلاطین تیموریہ کی تاریخ ہے اب وہ بات بھی گئی گذری بلکہ وہ کتاب اب چھاپنے کے لائق ہے نہ چھپوانے کے قابل۔

دربار رام پور سے تعلق

نواب یوسف علی خاں بہادر والیٔ رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں اس سال یعنی ۱۸۵۷ء میں میرے شاگرد ہوئے ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجتے ہیں۔ اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری انگریزی پنشن کھلا ہوا ان کے عطیا تھا گنے جاتے تھے جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگانی کا مدار ان کے عطیے پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے میں عذر کرتا تھا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات

پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگرے کھلے

ہیں باقی سب اٹ لیا۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازہ تک میدان ہوگیا ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے پاس سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔

کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو، دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

مسجد جامع واگذاشت ہوگئی۔ چپلی قبر کی طرف سیڑھیوں میں کبابیوں نے دوکانیں بنا لیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگے۔ عشرہ مبشرہ یعنی دس آدمی مہتمم ٹھیرے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی صدر الدین، تفضل حسین خاں ابن فضل اللہ خاں تین یہ اور سات اور۔ ۷ نومبر ۱۴ رجمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہاں شہر ڈھے رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ کشمیری کٹرہ گیا۔ وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دور دیے نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔ آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہگذر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔

لو سنو تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔ چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کی کئی دوکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان صاف ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام گنج، سعادت کا کٹرہ۔ جرنیل کی بیوی کی حویلی۔ رام جی داس گودام والے کے مکانات۔ صاحب رام کا باغ۔ حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر کہ شہر صحرا ہو گیا تھا، اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے۔ پون ٹوٹی کوئی چیز ہے وہ جاری ہوئی ہے۔ سوائے اناج اور اپنے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔

جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دوکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گا۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔

اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے:
"ٹکٹ آبادی درون شہر دہلی بہ شرط ادخال جرمانہ"

آخری ایام

ناتوانی زوروں پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر در پیش ہے، زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے، ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید اور ہم ہیں۔

اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔ پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں حواس کھو بیٹھا حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں کہ جتنی دیر میں ایک قد آدم دیوار اٹھے۔

آپ کی پرسش کے قربان، جب تک میرا مرنا نہ سنا میری خبر نہ لی۔

میرے محب، میرے محبوب تم کو میری خبر بھی ہے؟ آگے ناتواں تھا اب نیم جاں ہوں۔ آگے بہرہ تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رعشہ ضعف بصر جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں۔ حروف سوجھنے سے رہ گئے اکہتر برس جیا اب زندگی برسوں کی نہیں مہینوں اور دنوں کی ہے۔

وفات سے ایک دن قبل

میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں میرے ہمسایوں سے پوچھنا

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

سینکڑوں عصری مسائل میں اُلجھ کر رہ گئے
ورنہ تاباں حسرتِ تعمیر بھی رکھتے ہیں ہم

آج کی مجبوریاں، معذوریاں اپنی جگہ
دل میں فردا کی حسیں تصویر بھی رکھتے ہیں ہم

علم و دانش بے حقیقت دستِ محنت کے بغیر
خواب بھی رکھتے ہیں ہم، تعبیر بھی رکھتے ہیں ہم

اہلِ دل کرتے ہیں جن سے ماہ و پرویں کا شکار
اپنے ترکش میں کچھ ایسے تیر بھی رکھتے ہیں ہم

رفتہ رفتہ جو بدل دے خود زمانے کا مزاج
شوق کے جذبوں میں وہ تاثیر بھی رکھتے ہیں ہم

اپنے قاتل آپ ہیں، اپنے مسیحا آپ ہیں
زہر بھی رکھتے ہیں ہم، اکسیر بھی رکھتے ہیں ہم

غلام ربانی تاباں

اتحادِ ملک اے اہلِ وطن وہ ساز ہے
جس کا ہر نغمہ حیاتِ قوم کی آواز ہے

ہیں ابھی اپنے تصور میں ہزاروں منزلیں
دورِ تعمیر و ترقی کا ابھی آغاز ہے

آج ویرانوں کے دامن میں بھی رقصاں ہے بہار
جذبۂ سعی و عمل کا یہ حسیں اعجاز ہے

گلشنِ امید میں اِٹھلا رہی ہے زندگی
زندگی کی جلوہ سامانی پہ ہم کو ناز ہے

نفرت و تفریق کا دل پر نہ آنے دو غبار
سب کی خاطر ارتقا کا ضوفشاں در باز ہے

ظلمتِ فرقہ پرستی کو مٹانا ہے ہمیں
یہ تقاضائے وطن، یہ وقت کی آواز ہے

دوستانِ امنِ عالم ہیں ہمارے ہم نوا
نغمہ سنجانِ وفا کا ایک ہی انداز ہے

عزمِ محکم سے رواں ممتاز ہے یہ کارواں
عزمِ محکم ہی ہماری زندگی کا راز ہے

عزیز ممتاز مرزا

کیفی اعظمی

بہروپنی

ایک گردن پہ سیکڑوں چہرے
اور ہر چہرے پر ہزاروں داغ
اور ہر داغ بند دروازہ
روشنی اِن سے آ نہیں سکتی
روشنی اِن سے جا نہیں سکتی

تنگ سینہ ہے حوضِ مسجد کا
دل وہ دونا پجاریوں کے بعد
چاٹتے رہتے ہیں جسے کتّے
کتّے دونا جو چاٹ لیتے ہیں
دیوتاؤں کو کاٹ لیتے ہیں

جانے کس کوکھ نے جنا اس کو
جانے کس صحن میں جوان ہوئی
جانے کس دیش سے چلی کم بخت
ویسے یہ ہر زبان بولتی ہے
زخم کھڑکی کی طرح کھولتی ہے
اور کہتی ہے جھانک کر دل میں
تیرا مذہب ترا عظیم خدا
تیری تہذیب کے حسین صنم
سب کو خطروں نے آج گھیرا ہے
بعد ان کے جہاں اندھیرا ہے

سرد ہو جاتا ہے لہو میرا
بند ہو جاتی ہیں کھلی آنکھیں
ایسا لگتا ہے جیسے دنیا میں
سب دشمن ہیں کوئی دوست نہیں

مجھ کو زندہ نگل رہی ہے زمیں

ایسا لگتا ہے راکشس کوئی
ایک کاگر کمر میں لٹکا کے
آسماں پر چڑھے گا آخرِ شب
نور سارا نچوڑ لائے گا
میرے تارے بھی توڑ لائے گا

یہ جو دھرتی کا پھٹ گیا سینہ
اور باہر نکل پڑے ہیں جلوس
مجھ سے کہتے ہیں "تم ہمارے ہو"
میں اگر ان کا ہوں تو میں کیا ہوں
میں کسی کا نہیں ہوں اپنا ہوں

مجھ کو تنہائی نے دیا ہے جنم
میرا سب کچھ اکیلے پن سے ہے
کون پوچھے گا مجھ کو میلے میں
ساتھ جس دن قدم بڑھاؤں گا
چال میں اپنی بھول جاؤں گا

یہ اور ایسے ہی چند اور خیال
ڈھونڈنے پر بھی آج تک مجھ کو
جس کے ماں باپ کا ملا نہ سراغ
ذہن میں یہ اُڑ ہل دیتی ہے
مجھ کو مٹھی میں بھینچ لیتی ہے

چاہتا ہوں کہ قتل کر دوں اسے
وار لیکن جب اس پہ کرتا ہوں
میرے سینے پہ زخم ابھرتے ہیں
میرے ماتھے سے خون ٹپکتا ہے
جانے کیا میرا اس کا رشتہ ہے

آندھیوں میں اذان دی میں نے
سنکھ پھونکا اندھیری راتوں میں
گھر کے باہر صلیب لٹکائی
ایک اک در سے اس کو ٹھکرایا
شہر سے دور جا کے پھینک دیا

اور اعلان کر دیا کہ اٹھو
برف سی جم گئی ہے ہونٹوں پر
گرم بوسوں سے اس کو پگھلا دو
کر لو جو بھی گناہ وہ کم ہے
آج کی رات جشنِ آدم ہے

یہ مری آستین سے نکلی
دوڑ کے رکھ دیا چراغ پہ ہاتھ
مل دیا پھر اندھیرا چہرے پہ
ہونٹ سے دل کی بات لوٹ گئی
در تک آ کے برات لوٹ گئی

اس نے مجھ کو الگ بلا کے کہا
آج کی زندگی کا نام ہے خوف
خوف ہی وہ زمین ہے جس میں
فرقے اُگتے ہیں فرقے پلتے ہیں
دھارے ساگر سے کٹ کے چلتے ہیں
خوف جب تک دلوں میں باقی ہے
صرف چہرہ بدلتے رہنا ہے
صرف لہجہ بدلتے رہنا ہے
کوئی مجھ کو مٹا نہیں سکتا
جشنِ آدم منا نہیں سکتا